الجامع لاحکام القرآن
معروف بہ
تفسیر قرطبی
امام ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی

الجامع لاحکام القرآن

معروف بہ

تفسیر قرطبی جلد دوم

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ

متن قرآن کا ترجمہ: جسٹس حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجمین

مولانا ملک محمد بوستان　مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی

مولانا محمد انور مگھالوی　مولانا شوکت علی چشتی

زیر نگرانی

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ۰ پاکستان

نام کتاب	تفسیر قرطبی معروف بہ الجامع لاحکام القرآن (جلد دوم)
مفسر	امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبی رحمۃ اللہ علیہ
متن قرآن کا ترجمہ	حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ گیلانی
	مولانا محمد انور مگھالوی، مولانا محمد شوکت علی چشتی
	معاون دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
زیر اہتمام	ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
سال اشاعت	اکتوبر 2012ء، بار اول
کمپیوٹر کوڈ	QT54

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 37247350۔ فیکس 042-37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411 فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

"اور (خوب) یاد کرو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں اور جو جلدی کرکے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو بعد دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ پرہیزگار ہو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا"۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ کوفیوں نے کہا ہے کہ معدودات میں الف اور تا عدد کی قلت کو بیان کرنے کے لیے ہیں اور بصریوں کا موقف ہے کہ یہ دونوں قلیل و کثیر کے لیے آتے ہیں اور اس پر دلیل رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝ (سبا: 37) اور غرفات کثیر ہیں۔ (یعنی غرفات میں الف اور تا کثرت کے بیان کے لیے ہیں اور مَّعْدُوْدٰتٍ میں قلت کو بیان کرنے کے لیے۔ معلوم ہوا یہ دونوں قلیل و کثیر کے لیے آتے ہیں۔)

اور علماء کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس آیت میں اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ایام منیٰ ہیں اور یہی ایام تشریق ہیں، اور یہ تینوں اسماء انہی پر واقع ہوتے ہیں۔ اور یہی رمی جمار کے ایام ہیں، اور ان کا اطلاق ان تینوں دنوں پر ہوتا ہے جن میں حاجی یوم نحر کے بعد دو دنوں میں جلدی کرکے کوچ کر سکتا ہے۔ یہی قول اس پر موقوف رہا۔

ثعلبی اور ابراہیم نے کہا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ دس دن ہیں اور ایام معلومات ایام نحر ہیں۔ اسی طرح مکی اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد دس دن ہیں۔ ابو عمر بن عبدالبر وغیرہ سے نقل کرنے کی بنا پر جو ہم نے اس بارے میں اجماع ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ (اجماع) یا تو کتابت کی غلطی کی بنا پر ہے یا پھر وہ دس دن مراد ہیں جو یوم نحر کے بعد ہیں اور یہ حقیقت سے بہت دور ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں اپنے بندوں کو اپنے ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور یہ یوم نحر کے بعد والے تین دن ہیں، یوم نحر ان میں شامل نہیں۔ کیونکہ اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یوم النفر کو کوئی بھی (وہاں سے) کوچ نہیں کر سکتا اور یوم النفر سے مراد یوم القر کا دوسرا دن ہے (یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن)۔ اگر یوم نحر اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں شامل ہوتا تو پھر یہ جائز ہوتا کہ جو کوئی یوم نحر کو جلدی (وہاں سے) کوچ کرنا چاہتا وہ کر سکتا کیونکہ اس طرح وہ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں سے دو دن وہاں ٹھہر چکا ہوتا۔ (لیکن ایسا کرنا درست نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ یوم نحر اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ میں شامل نہیں۔)

دارقطنی اور ترمذی وغیرہما نے عبدالرحمٰن بن یعمر الدیلی سے روایت بیان کی ہے کہ اہل نجد میں سے کچھ لوگ رسول اللہ

نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ عرفات میں تھے تو انہوں نے اس کے بارے میں آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے منادی کو حکم ارشاد فرمایا۔ پس اس نے یہ اعلان کیا: "حج تو عرفات میں ہے۔ پس جو کوئی مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہلے یہاں آگیا اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ تین ہیں پس جو کوئی جلدی کرکے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو پیچھے رہ گیا (ٹھہرا رہا) تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔(1)" یعنی حاجیوں میں سے جو کوئی ایام منیٰ میں سے دو دنوں میں ہی جلدی کرکے چلا گیا تو اس کا قیام بھی منیٰ میں یوم نحر سمیت تین دن ہوگیا۔ اور وہاں کی چھوٹی رمی اس کی کنکریاں ہو جانے کی اور تیسرے دن کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی اور جس کسی نے تیسرے دن کے آخر میں وہاں سے کوچ کیا تو یوم نحر کے سبب اس کے لئے چار دن منیٰ میں قیام ہوگیا اور اس نے رمی کی تعداد پوری کرلی۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ ایام منیٰ تین دن ہیں اس کے بارے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک دلیل عرجی کا یہ قول بھی ہے۔

ما نلتقي [illegible] ثلاث منى حتى يفرق بيننا النفر

ہم منیٰ کے تین دن مل کر اکٹھے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ وہاں سے کوچ ہمیں متفرق کر دیتا ہے۔

یہی ایام رمی اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ کہلاتے ہیں اور ایام نحر معلومات کہلاتے ہیں۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور ایام معلومات مجموعی طور پر چار دن ہیں۔ ایک یوم نحر اور تین اس کے بعد۔ ان میں سے یوم نحر (دسویں ذی الحجہ کا دن) یوم معلوم ہے معدود نہیں۔ اور بعد والے دو دن (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کا دن) معلوم بھی ہیں اور معدود بھی اور چوتھا دن (یعنی تیرہویں ذوالحجہ کا دن) فقط یوم معدود ہے معلوم نہیں۔ اور یہی حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب ہے۔

اور بلاشبہ اسی طرح ہے کیونکہ پہلا دن ان دنوں میں سے نہیں ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق منیٰ کے ساتھ خاص ہیں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ اور نہ ان میں سے ہے جنہیں حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں متعین فرمایا ہے: ایام منی ثلاثۃ ایام منیٰ تین ہیں (پس اس سے معلوم ہوا کہ) پہلا دن معلوم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج: 28)

(اور وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپایوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد قربانی ہے اور قربانی پہلے دن ہوتی ہے اور اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن ہوتی ہے۔ (یعنی گیارہویں اور بارہویں ذوالحجہ کے دن) اور چوتھے دن قربانی نہیں ہوتی اس پر ہمارے علماء کا اجماع ہے۔ (پس اس سے معلوم ہوا کہ) ارشاد باری تعالیٰ: فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ میں چوتھا دن مراد نہیں ہے کیونکہ اس میں قربانی نہیں کی جاتی اور چونکہ اس میں رمی کی جاتی ہے پس رمی کے سبب ایام معدودات میں سے ہے اور قربانی نہ ہونے کے سبب وہ یوم معلوم نہیں ہے۔

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فیمن ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج، حدیث نمبر 815، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مختصر میں ہے: عورتیں نمازوں کے بعد تکبیر نہ کہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے کیونکہ احرام کا حکم مردوں کی طرح انہیں بھی لازم ہے۔ "مدونہ" میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جو کوئی نماز کے پیچھے تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہہ لے اگر وہ قریب ہو اور اگر دور چلا جائے تو اس پر کوئی شے (کفارہ وغیرہ) لازم نہیں ہوتی۔ ابن الجلاب نے یہی کہا ہے اور حضرت امام مالک نے "المختصر" میں کہا ہے: وہ تکبیر کہے جب تک اسی مجلس میں رہے اور جب اپنی مجلس سے اٹھ کھڑا ہو تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں اور مدونہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے: اگر امام تکبیر بھول جائے تو اگر وہ قریب ہی ہو تو وہ بیٹھ جائے اور تکبیر کہے اور اگر وہ دور ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے نہیں اور اگر وہ چلا گیا اور اس نے تکبیر نہ کہی اور ساتھ والے لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ تکبیر کہہ لیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ مدت تکبیر کی دونوں طرفوں میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ (آدمی) نویں ذی الحجہ کی صبح کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن (یعنی تیرہویں ذی الحجہ کے دن) کی عصر تک تکبیر کہے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کی صبح سے لے کر یوم نحر کی نماز عصر تک (ہر نماز کے بعد) تکبیر کہے گا۔

صاحبین (حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد رحمہما اللہ) نے ان دونوں سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے پہلا قول یعنی حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہی لیا ہے۔ پس انہوں نے ابتدائے مدت میں تو اتفاق کیا ہے لیکن انتہا میں نہیں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ (آدمی) یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق میں سے آخری دن کی نماز صبح تک تکبیر کہے گا۔ امام شافعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اور یہی حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی قول ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ وہ یوم نحر کی ظہر کی نماز سے لے کر ایام تشریق کے آخر تک تکبیر کہے۔

ابن عربی نے کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ وہ یوم عرفہ کو تکبیر کا آغاز کرے گا اور یوم نحر کی عصر کے وقت ختم کر دے گا تو ان کا یہ قول ظاہر کلام سے خارج ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ** اور یہ ایام تین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے کہا ہے: وہ دو دنوں میں تکبیر کہے گا تو اس طرح انہوں نے ظاہر کلام کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے یہ کہا ہے (تکبیر کہنے کے) ایام (ایام عرفہ) اور ایام تشریق ہیں تو انہوں نے کہا: بلاشبہ رب کریم نے ارشاد فرمایا: **فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ** (البقرہ: 198) تو اس میں عرفات کا ذکر ایام کے ذکر میں داخل ہے۔ یہ نظریہ صحیح ہو سکتا تھا اگر وہ یہ کہتے کہ وہ عرفہ کے دن مغرب کی نماز سے تکبیر کہے گا کیونکہ عرفات سے واپس لوٹنے کا وقت تو وہی (مغرب کا وقت) ہے اور جو وقت اس سے پہلے ہے بظاہر لفظ اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ آٹھویں ذی الحجہ (یوم ترویہ) منیٰ سے ہو جو کہ منیٰ میں اترنے کا وقت ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ تکبیر کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے بعد

تین بار تکبیر کہے گا۔ اسے زیاد بن زیاد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ اور ایک مذہب میں ایک روایت یہ ہے کہ تین بار تکبیر کہنے کے بعد یہ کہا جائے گا: لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر وللہ الحمد اور المختصر میں امام مالک سے یہ الفاظ مروی ہیں: اللہ اکبر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ، واللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد۔

قول باری تعالیٰ: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں اکیس مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ اس مقام پر تعجّل (جلدی کرنا) بلاشبہ ان کے آخری حصہ میں ہوگی اور اسی طرح یہ تیسرے دن ہوگی۔ کیونکہ ان ایام میں رمی جمار کا وقت زوال کے بعد ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ کے سوا کسی پر رمی نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو اس کے سوا کسی جمرہ پر رمی نہیں کی۔ اور اس کا وقت طلوع شمس سے لے کر زوال تک ہے اور اسی طرح اس پر بھی اجماع ہے کہ ایام تشریق میں جمرات پر رمی کرنے کا وقت زوال کے بعد سے لے کر غروب شمس تک ہے۔ البتہ اس کے بارے اختلاف ہے جس نے جمرہ عقبہ پر رمی طلوع فجر سے پہلے کی یا طلوع فجر کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے کی۔

حضرت امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے: فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے جمرہ عقبہ کی رمی جائز ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ہم تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر طلوع ہونے سے پہلے کسی کو رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہو۔ بعد الفجر سے پہلے اس کی رمی جائز نہیں اور جو کوئی فجر سے پہلے رمی کرے تو وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ اسی طرح امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جمرہ عقبہ کی رمی (طلوع فجر سے پہلے) جائز نہ ہوگی اور اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور ایک گروہ نے طلوع فجر سے پہلے رمی کرنے کی رخصت دی ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: وہ رات کے وقت رمی کرتی تھیں اور یہ کہتی تھیں: بلاشبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایسا کرتی تھیں۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے(1)۔ اور یہی قول حضرت عطا، ابن ابی ملیکہ اور عکرمہ بن خالد سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت امام شافعی نے فرمایا ہے بشرطیکہ رمی نصف رات کے بعد ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: سورج طلوع ہونے سے پہلے رمی نہیں کی جائے گی۔ یہ مجاہد، ثوری اور نخعی نے بھی کہا ہے۔ اور ابو ثور نے کہا ہے: اگر کسی نے طلوع شمس سے پہلے رمی کی تو اگر (علماء نے) اس میں اختلاف کیا تو پھر یہ جائز نہیں ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اتفاق کر لیا یا اس میں کوئی سنت موجود ہو تو پھر یہ جائز ہوگی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک ثوری اور ان کی اتباع کرنے والوں کا قول ہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے بعد جمرہ کی رمی کی اور فرمایا: خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ (احکام حج مجھ سے سیکھ لو) اور ابن منذر نے کہا ہے: سنت یہ ہے کہ رمی جائز نہ ہوگی۔ اگر کسی نے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔

1۔ سنن ابی داؤد، باب التعجیل من جمع، حدیث نمبر 1659، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس کی طرف سے جائز ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ ایام تشریق کی راتیں منیٰ کے علاوہ مکہ مکرمہ یا کہیں اور گزارنا جائز نہیں ہے کیونکہ تمام کے نزدیک ایسا
کرنا جائز نہیں ہے سوائے چرواہوں کے اور آل عباس کے ان افراد کے جنہیں پانی پلانے کی ولایت حاصل ہے۔ امام بخاری
نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منیٰ کی راتیں (حاجیوں
کو) پانی پلانے کے لئے مکہ مکرمہ میں گزارنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی (1)۔
ابن عبد البر نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پانی پلانے بارے نگرانی کرتے تھے اور اس کے معاملے کا اہتمام کرتے
تھے اور پھر ایام حج میں حاجیوں کو اس کا پانی پلاتے تھے۔ سو اسی لئے آپ کو منیٰ کی بجائے مکہ مکرمہ میں رات گزارنے کی
رخصت دی گئی جیسا کہ اونٹ چرانے والوں کو ان کی حاجت کے پیش نظر رخصت دی گئی، کیونکہ انہیں اونٹ چرانے کے لئے
چراگاہ کی طرف نکلنے کی ضرورت ہوتی تھی جو کہ منیٰ سے دور تھی۔

منیٰ کا نام منیٰ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں خون بہایا جاتا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ اس کا
نام منیٰ رکھا گیا ہے کیونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو کہا: آپ تمنا اور آرزو کیجئے۔ تو آپ نے کہا:
"میں جنت کی تمنا کرتا ہوں۔" پس اس کا نام منیٰ رکھ دیا گیا۔ اور فرمایا: اس کا نام جمع بھی رکھا گیا ہے کیونکہ اس میں حضرت حوا
اور حضرت آدم علیہما السلام جمع اور اکٹھے ہوئے ہیں (یعنی ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ہے۔) اور جمع مزدلفہ کا بھی نام
ہے۔ اور یہ المشعر الحرام بھی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ فقہاء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جنہیں رخصت دی گئی ہے حاجیوں کے لئے منیٰ کی
راتیں منیٰ میں گزارنا حج کے شعائر اور اس کے احکام میں سے ہے۔ حج اور اس کے تمام احکام پر قیاس کرتے ہوئے عقل (نظر
وفکر) حج کے احکام میں سے کسی حکم کو ساقط کرنے والے پر دم واجب کرتی ہے۔ اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان
فرمایا: حاجیوں میں سے کوئی بھی منیٰ کی راتیں عقبہ کے پیچھے نہیں گزارے گا۔ اور وہ عقبہ جس کے پیچھے رات گزارنے سے
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا ہے یہ وہی عقبہ ہے جو اس جمرہ کے پاس ہے جس پر لوگ یوم نحر کو کنکریاں مارتے ہیں، ان میں
سے جو مکہ کے قریب ہیں۔ ابن نافع نے حضرت مالک رحمۃ اللہ علیہ سے "المبسوط" میں اسے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ
حضرت مالک نے فرمایا: اور جس نے منیٰ کی راتوں میں سے کوئی رات اس کے پیچھے بسر کی تو اس پر فدیہ ہوگا۔ اس لئے کہ
اس نے منیٰ کی راتیں منیٰ کے سوا (دوسری جگہ) بسر کی ہیں۔ اور حج میں ایسا کرنا مشروع ہے لیکن اسے ترک کرنے کے سبب
اس پر دم لازم ہوگا، جیسا کہ مزدلفہ کی رات کا حکم ہے۔ اور یہاں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فدیہ سے مراد ہدی (قربانی کا
جانور) ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ ہدی ہے جسے حل سے حرم کی طرف ہانک کر لایا جائے گا (2)۔

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4731

2۔ احناف کے نزدیک یہ راتیں وہاں گزارنا حاجی صاحبان کے لئے سنت ہے لیکن اگر کوئی وہاں نہیں رہتا تو اس پر دم واجب نہیں۔ ہدایہ

مسئلہ نمبر 7۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ابو البداح بن عاصم بن عدی نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی رخصت عطا فرمائی۔ وہ یوم نحر کو رمی کرتے تھے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ اور بارہویں دو دنوں کی رمی کرتے تھے، اور پھر یوم النفر (یعنی تیرہویں ذی الحجہ) کو بھی رمی کرتے تھے۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے: حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے مقتضا کے مطابق قول نہیں کیا، اور وہ کہتے تھے۔ وہ یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرتے، پھر دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کو رمی نہ کرتے تھے اور جب بارہویں ذی الحجہ کا دن آتا اور یہ ایام تشریق میں سے دوسرا دن ہے اور یہی وہ دن ہے جس میں وہ لوگ جلدی کوچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو نفر (جلدی چلے جانا) چاہتے ہیں یا جن کے لئے تعجیل جائز ہوتی ہے تو وہ اس دن گیارہویں اور بارہویں دونوں کی رمی اکٹھی کرتے تھے، کیونکہ اس طرح وہ اسے ادا کرتے تھے جو ان پر لازم تھا، اور آپ کے نزدیک کوئی بھی کسی شے کی قضا نہیں کرتا مگر اس کے بعد کہ وہ اس کے ذمہ واجب ہوتی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں اس حدیث کی جو تفسیر بیان کی ہے اس کا بھی مفہوم ہے۔ اور آپ کے سوا کوئی اور کہتا ہے: جو کچھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے اس کی بنا پر اس تمام میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ قوم نے تمام رمی کے یہ ہیں۔ البتہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چرواہوں کے لئے رمی کو مقدم کرنا جائز نہیں کیونکہ جو چرواہے نہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے۔ وہ ایام تشریق میں زوال سے پہلے رمی جمار کریں۔ پس جس نے بھی زوال سے پہلے رمی کی تو وہ اس کا اعادہ کرے، ان کے لئے تقدیم جائز نہیں۔ بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دوسرے اور تیسرے دن (یعنی بارہویں اور تیرہویں) کی رمی کے بارے میں رخصت عطا فرمائی۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ جو کچھ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں کہا ہے وہ ابن جریج کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ مجھے محمد بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے اپنے باپ کے واسطہ سے خبر دی ہے کہ ابو البداح بن عاصم بن عدی نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت عطا فرمائی کہ وہ واپس چلے جائیں۔ پس وہ یوم نحر کو رمی کرتے، پھر ایک دن اور ایک رات چھوڑ دیتے، پھر دوسرے دن رمی کرتے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور تیسرے جمرہ کی رمی اس سے ساقط ہو جائے گی جس نے چلے جانے میں جلدی کی۔

ابن ابی زمنین نے کہا ہے: جب کوئی جلدی چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ نفر اول کے دن (یعنی بارہویں ذی الحجہ) کی رمی کرے گا۔ ابن المواز نے کہا ہے: جلدی کوچ کا ارادہ کرنے والا دو دنوں میں اکیس کنکریاں مارے گا، ہر جمرہ پر سات کنکریاں۔ تو اس طرح اس کی کل رمی انچاس کنکریاں ہو جائے گی، کیونکہ اس نے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں پھینکیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور تیسرے دن کی رمی ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ نمبر 8۔ مالک نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے حضرت عطاء بن ابی رباح سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے یاد کرتے ہوئے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چرواہوں کو رخصت دی ہے کہ وہ رات کے وقت رمی کر لیں۔ وہ کہتے

ہیں: "زمانہ اول میں" باجی نے کہا ہے کہ قولہ فی الزمن الاول حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ پر اپنے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ وہی اس شریعت کا زمانہ اول ہے۔ پس اس بنا پر یہ روایت مرسل ہے اور یہ قول یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلا زمانہ ہے جسے حضرت عطا نے پایا ہو تو پھر یہ روایت موقوف مسند ہوگی۔ واللہ اعلم۔

میں (مصنف) کہتا ہوں کہ یہ روایت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن النبی ﷺ کی حدیث سے مسند ہے، اسے دارقطنی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اور ہم نے اسے المقتبس فی شرح موطا مالک بن انس میں ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ ان (چرواہوں) کے لئے رات کے وقت رمی جمار کو مباح کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ انتہائی نرم رویہ ہے، اور اس میں ان کے لئے انتہائی زیادہ احتیاط ہے جو وہ اونٹ چرانے کا قصد کرتے تھے۔ کیونکہ رات کے وقت نہ وہ چرتے ہیں اور نہ وہ منتشر ہوتے ہیں، پس وہ اس وقت میں رمی کرلیں۔

تحقیق ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جس کی رمی رہ گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو اس بارے میں حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: اونٹ چرانے والوں کے سوا رات کے وقت کسی کے لئے رمی جائز نہیں، رہے تجار تو ان کے لئے بھی جائز نہیں۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: جس کی رمی فوت ہو گئی یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، تو پھر اسے چاہیے کہ وہ رمی نہ کرے یہاں تک کہ دوسرے دن کا سورج طلوع ہو جائے۔ اسی طرح امام احمد اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت امام مالک نے فرمایا ہے کہ جب کوئی دن کے وقت رمی چھوڑ دے تو وہ رات کے وقت رمی کرلے اور اس پر ابن القاسم کی روایت کے مطابق دم لازم ہوگا۔ اور آپ نے موطا میں یہ ذکر نہیں کیا کہ اس پر دم ہوگا۔

امام شافعی، ابو ثور، یعقوب اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے: جب کوئی رمی بھول جائے یہاں تک کہ شام ہو جائے تو وہ رمی کرے گا اور اس پر دم نہیں ہوگا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رات کے وقت رمی جمار کرنے کی رخصت دیتے تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا ہے: وہ رمی کرے گا اور اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی، اور اگر اسے رات کے وقت بھی رمی یاد نہ آئی یہاں تک کہ دوسرا دن آ گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ رمی کرلے اور اس پر دم لازم ہوگا۔ اور امام ثوری نے کہا ہے: جب کسی نے بھول کر یا عمداً رمی کو رات تک مؤخر کر دیا تو وہ خون بہائے (یعنی جانور قربانی کرے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: چرواہوں میں سے یا پانی پلانے والوں میں سے کسی نے رات کے وقت رمی کی تو اس پر دم واجب نہ ہوگا۔ (یہ حکم حدیث کے مطابق ہے۔) اور اگر ان کے علاوہ کسی اور نے ایسا کیا تو عقل و نظر دم واجب کرنے کی جگہ پر پہنچاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نحر کو اپنی سواری پر جمرہ عقبہ پر رمی کی۔ اور امام مالک

وغیرہ نے مستحب قرار دیا ہے کہ اس پر رمی کرنے والا سوار ہو، حالانکہ حضرت ابن عمر، حضرت ابن زبیر اور حضرت سالم بن عمر پیدل حالت میں رمی کرتے تھے اور چاہیے کہ ہر روز تینوں جمروں پر اکیس کنکریاں رمی کرے، اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہے، اور رمی کرتے وقت اس کا چہرہ قبلہ شریف کی طرف ہو، اور جمرات ترتیب کے ساتھ رکھے، نہ انہیں اکٹھا کرے اور نہ ہی انہیں متفرق کرے اور نہ انہیں اوندھا رکھے، وہ جمرہ داولی سے ابتدا کرے اور اس پر سات کنکریاں مارے، وہ انہیں اس کے پاس رکھ نہیں دے گا۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، ابوثور اور اصحاب رائے نے کہا ہے۔ پس اگر اس نے انہیں پھینک دیا تو اصحاب رائے کے نزدیک جائز ہے۔

ابن قاسم نے کہا ہے: دونوں صورتوں میں تمام کنکریاں پھینک دینا جائز نہیں ہے۔ یہی صحیح ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ کنکریاں مارتے تھے۔ جن کے نزدیک ایک ہی بار دو یا دو سے زیادہ کنکریاں نہیں پھینکی چاہئیں۔ پس اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اسے ایک کنکری شمار کرے۔ اور جب وہ ایک جمرہ سے فارغ ہو جائے تو وہ اس کے سامنے کی طرف آگے بڑھے اور طویل وقت تک دعا کے لئے کھڑا رہے اور جو میسر آئے (وہی مانگے) بعد ازاں دوسرے جمرہ پر رمی کرے، اور یہ جمرہ وسطی ہے اور وہ اس سے وادی کے بطن میں شمال کی طرف پھر جائے اور اس کے پاس بھی دعا کے لئے طویل وقت تک وقوف کرے۔ پھر تیسرے جمرہ پر کنکریاں مارے اور یہ جمرہ عقبہ ہے، اس پر بھی سات کنکریاں مارے گا اور اس کے نیچے کی جانب سے اس پر کنکریاں پھینکے گا اور اس کے پاس کھڑا نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے اس پر اس کی اوپر کی جانب سے رمی کی تو وہ بھی اسی طرف سے جائز ہے اور وہ رمی کے دوران ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہے گا۔ رمی جمار کے دوران سنت ذکر تکبیر ہے نہ کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذکر اور وہ پیدل رمی کرے گا بخلاف یوم نحر کے جمرہ کے۔ یہ سب کا سب (حکم) اتفاقی ہے۔ نسائی اور دارقطنی نے اسے حضرت زہری سے مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اس جمرہ پر رمی کرتے تھے جو مسجد منیٰ کے ساتھ متصل ہے تو آپ اس پر سات کنکریاں مارتے تھے اور جب بھی ایک کنکری پھینکتے تو ساتھ تکبیر (اللہ اکبر) کہتے تھے۔ پھر اس سے آگے بڑھتے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے اور آپ طویل وقت تک کھڑے رہتے تھے۔ پھر آپ ﷺ دوسرے جمرہ کے پاس آتے تھے اور اسے سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ پھر آپ بائیں جانب اس جگہ کی طرف نیچے اترتے جو وادی کے ساتھ متصل ہے اور قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے۔ پھر آپ ﷺ اس جمرہ کے پاس آتے جو عقبہ کے پاس ہے اور اس پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت تکبیر کہتے، پھر واپس پھر جاتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ زہری نے کہا ہے: میں نے حضرت سالم بن عبداللہ کو اپنے باپ سے اور انہیں حضور نبی رحمت ﷺ سے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کیا کرتے تھے۔ یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 10۔ کنکریوں کا حکم یہ ہے کہ وہ پاک ہوں، ناپاک نہ ہوں اور نہ ہی ان میں سے ہوں جو پہلے رمی جا چکی

1۔ بخاری شریف، باب رفع الیدین عند الجمرة، حدیث نمبر 1634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں۔ سو اگر کسی نے ایسی کنکری سے رمی کی جو پہلے ماری جا چکی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ جائز نہیں۔ تحقیق ان سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے: اگر ایسا ایک کنکری میں ہوا تو آپ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اور میں ابن قاسم کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے بارے فتویٰ دے دیا۔

مسئلہ نمبر 11۔ اہل علم نے مستحب قرار دیا ہے کہ وہ کنکریاں مزدلفہ سے اٹھائے نہ کہ وہ جو مسجد میں پڑی ہیں اور اگر کسی نے ضرورت سے زیادہ کنکریاں اٹھالیں اور رمی کرنے کے بعد وہ اس کے پاس باقی بچ رہیں تو وہ انہیں دفن کر دے، انہیں پھینکے نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ جمہور کے نزدیک کنکریوں کو دھویا نہیں جائے گا۔ طاؤس نے اس میں اختلاف کیا ہے حالانکہ یہ روایت موجود ہے کہ اگر اس نے ناپاک کنکریوں کو نہ دھویا یا ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی جو پہلے ماری جا چکی تھیں تو اس نے گناہ کیا اور آپ نے اس کی طرف سے رمی کو جائز قرار دیا۔

ابن منذر نے بیان کیا ہے: یہ مکروہ ہے کہ وہ ان کنکریوں کے ساتھ رمی کرے جن کے ساتھ پہلے رمی کی جا چکی ہو۔ اگر ایسی کنکریوں کے ساتھ رمی کی گئی تو وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی، کیونکہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسا کرنے والے پر رمی کا اعادہ واجب قرار دیا ہو اور نہ ہی ہم اخبار میں سے کوئی ایسی خبر جانتے ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہو کہ آپ ﷺ نے کنکری کو دھویا ہو اور نہ ہی آپ نے اسے دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ تحقیق ہم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ وہ کنکریاں دھوتے تھے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رمی جمار میں مٹی کا ڈھیلا پھینکنا جائز نہ ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسی شی جو پتھر نہ ہو۔ امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خشک مٹی کا ڈھیلا جائز ہوگا۔ اسی طرح ہر وہ شے جو اس نے پھینکی اور اس کا تعلق زمین سے ہو تو وہ جائز ہوگی۔

امام ثوری نے کہا ہے: جس نے مٹی کے ڈھیلے اور ٹھیکری کے ساتھ رمی کی تو وہ رمی کا اعادہ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے: پتھر کے سوا رمی جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم پر انگلیوں سے کنکریاں پھینکنا لازم ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی رمی کنکریوں کے ساتھ تھی۔

مسئلہ نمبر 14۔ کنکری کی مقدار میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: وہ طول اور عرض میں پورے سے چھوٹی ہوگی۔ اور ابو ثور اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: ٹھیکری کی کنکری کی مثل ہوگی۔ اور ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ بکری کی مینگنی کے برابر کنکری کے ساتھ رمی کرتے تھے۔ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا کوئی معنی نہیں ہے: اس سے بڑی میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے: کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ٹھیکری کی کنکری کی مثل کے ساتھ رمی کی سنت قائم فرمائی ہے۔ البتہ جس پر حصاۃ کا نام واقع ہو سکے اس کے ساتھ رمی کرنا جائز ہے اور سنت کی اتباع کرنا افضل ہے۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: وہ صحیح قول (یا عمل) جس کا خلاف کرنا اس کے لئے جائز نہیں ہوتا جو ہدایت یافتہ ہو اور اقتدا کرے (وہ یہ ہے کہ) امام نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقبہ کی صبح ارشاد فرمایا: درآنحالیکہ آپ اپنی سواری پر تھے: میرے لئے کنکریاں چن کر لاؤ۔ چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کنکریاں چنیں وہ ٹھیکری کی کنکریوں کی مثل تھیں۔ پس جب میں نے انہیں آپ کے دست مبارک میں دیا تو فرمایا: ہاں انہی کی مثل (یعنی رمی کے لئے اتنی مقدار ہی مناسب اور موزوں ہے۔) اور تم دین میں غلو کرنے سے بچو۔ بلاشبہ جو تم سے پہلے تھے انہیں دین میں غلو کرنے نے ہلاک کر دیا (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ بڑی کنکریوں کے ساتھ رمی کرنے کی کراہت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ یہ غلو میں سے ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 15۔ وہ آدمی جس کے ہاتھ میں کنکری باقی ہو وہ نہ جانتا ہو یہ کون سی کنکریوں میں سے ہے تو وہ اسے پہلی میں سے بنائے (یعنی اسے جمرہ اولیٰ پر مارے) اور اس کے بعد پھر وسطیٰ اور آخری پر رمی کرے۔ اور اگر زیادہ وقت گزر جائے تو پھر مکمل رمی نئے سرے سے کرے۔

مسئلہ نمبر 16۔ امام مالک، امام شافعی، عبد الملک، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ نے اس کے بارے کہا ہے جس نے ایک جمرہ پر دوسرے جمرہ کو مقدم قرار دیا: وہ رمی اس کی طرف سے جائز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ پے در پے اور لگاتار رمی کرے۔ حسن، عطا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ اس کی طرف سے جائز ہوگی اور بعض لوگوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا ہے کہ "جس کسی نے ایک عمل کو دوسرے عمل پر (جو کہ متصل اس کے بعد ہو) مقدم کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں"۔ اور فرمایا: یہ اس آدمی سے زیادہ نہیں ہوگا جس پر کئی نمازیں اور روزے جمع ہو گئے اور اس نے بعض کو بعض سے پہلے قضا کر لیا۔ پہلے قول میں احتیاط زیادہ ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 17۔ مریض کے رمی کرنے اور اس کی طرف سے رمی کیے جانے کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ایسے مریض اور بچے کی جانب سے رمی کی جائے گی جو رمی کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور مریض ان کی رمی کے وقت کوشش کرے کہ وہ ہر جمرہ کے لئے سات تکبیریں کہے اور اس پر ہدی (قربانی) ہوگی، اور جب مریض رمی کے ایام میں تندرست ہو جائے اور وہ خود اپنی طرف سے رمی کر لے، اس کے باوجود اس پر امام مالک کے نزدیک دم واجب ہوگا۔

امام حسن، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مریض کی طرف سے رمی کی جائے گی اور انہوں نے ہدی کا ذکر نہیں کیا۔ اور وہ بچہ جو رمی پر قدرت نہیں رکھتا اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کی طرف سے رمی کی جائے گی۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 18۔ دارقطنی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 3248

کی: یا رسول اللہ ﷺ! یہ کنکریاں جو یہاں ہر سال پھینکی جاتی ہیں تو ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ کم ہو جاتی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ ان میں سے جو قبول کر لی جاتی ہیں وہ اٹھائی جاتی ہیں اور اگر اس طرح نہ ہوتا تو انہیں پہاڑوں کی مثل دیکھتے (1)۔

مسئلہ نمبر 19۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ حاجیوں میں سے جو منیٰ سے نفر اول کے دن اپنے شہر کی طرف واپس جانے کے لئے نکلنے کا ارادہ کرے اور آ نکلے وہ (منیٰ) حرم سے باہر ہو اور وہ مکہ مکرمہ میں مقیم نہ ہو تو اسے چاہیے وہ زوال شمس کے بعد کوچ کرے، بشرطیکہ وہ یوم نحر سے متصل دن میں شام سے پہلے پہلے رمی کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ "اور جو جلدی کرے دو دنوں میں ہی چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں" یعنی جو وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ کوچ کرے جب تک کہ ابھی دن موجود ہو۔ تحقیق ہم نے حضرت نخعی اور حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: ایام تشریق کے دوسرے دن جسے عصر کی نماز کا وقت منیٰ میں ہو گیا تو وہ آنے والے دن کی صبح تک وہاں سے کوچ نہ کرے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ دونوں نے یہ قول بطور استحباب کیا ہے اور پہلا قول جو ہم کہتے ہیں وہ ظاہر کتاب و سنت کے مطابق ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ اہل مکہ کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا نفر اول کے دن (منیٰ سے) جا سکتے ہیں؟ تو ہم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: تمام لوگوں میں سے جو چاہے نفر اول کے دن وہ وہاں سے جا سکتا ہے سوائے آل خزیمہ کے وہ صرف نفر ثانی کے دن ہی وہاں سے کوچ کر سکتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھے اس آدمی پر کوئی تعجب نہیں جس نے کوچ کے پہلے دن وہاں سے کوچ کیا تاکہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم ہو جائے۔ مزید فرمایا: اہل مکہ تو نسبتاً زیادہ جلدی کرتے ہیں۔

امام احمد اور اسحاق نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول الا آل خزیمہ کا معنی یہ بیان کیا ہے کیونکہ وہ اہل حرم ہیں۔

اور حضرت امام مالک اہل مکہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جس کے لئے کوئی عذر ہو اس کے لئے تو جلدی کرے دو دنوں میں وہاں سے چلے جانا جائز ہے، اور اگر کوئی امور حج میں سے کسی کے بارے میں محض اپنے لئے تخفیف کا ارادہ کرے تو پھر اس کے لئے جائز نہیں ہے۔ تو گویا آپ نے تعجیل کا حکم ان کے لئے قرار دیا جن کا علاقہ دور ہو۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت اپنے عموم پر ہے، رخصت تمام لوگوں کے لئے ہے، چاہے وہ اہل مکہ ہوں یا دوسرے، کوئی منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ کرے یا اپنے شہر کی طرف جانے کا قصد کرے۔ حضرت عطا نے کہا ہے: یہ آیت عام لوگوں کے لئے ہے۔ ابن منذر کا قول حضرت امام شافعی کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، اور وہی کے مطابق ہم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور نخعی جیسے علماء نے ارشاد فرمایا ہے: ایام معدودات میں سے دوسرے دن جس نے منیٰ سے کوچ کیا تو اس پر کوئی حرج (گناہ) نہیں اور جو تیسرے دن تک وہاں ٹھہر گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ پس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ سب مباح ہے۔ اور اس کی اس تقسیم کو اہتمام اور تاکید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ

1۔ سنن دار قطنی، جلد 2، صفحہ 300

عربوں میں سے کچھ تھے جو جلدی کرنے وہاں سے چلے جانے والے کی مذمت کرتے تھے اور اس کے برعکس کچھ ایسے تھے جو تاخیر کرنے والے کی مذمت کرتے تھے، تو ان تمام سے گناہ کو اٹھانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ (یعنی جس نے جو طریقہ بھی اپنایا چاہے جلدی کی یا تاخیر کی کسی کے لئے بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔)

حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہم اللہ نے بھی کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جس نے جلدی کی تحقیق اسے بخش دیا گیا اور جس نے تاخیر کی تحقیق اسے بھی بخش دیا گیا، اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: "جس نے اس بیت اللہ شریف کا حج کیا اور اس نے رفث و فسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح پاک ہو گیا جیسا کہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا"۔ (1)

اور ارشاد باری ہے: فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ یہ بھی نفی عام ہے اور یہ بات مطلق ہے۔

اور مجاہد نے بھی کہا ہے: آیت کا معنی ہے جس نے جلدی کی یا جس نے تاخیر کی تو اس پر آنے والے سال تک کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اس قول میں اختلاف بیان کیا گیا ہے۔

ابو العالیہ نے آیت کے بارے میں کہا ہے: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنی بقیہ عمر متقی بن کر رہا اور حج کرنے والے کے لئے یقیناً مغفرت ہے یعنی اس کے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اگر وہ اپنی بقیہ عمر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا۔

ابو صالح وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے "اس پر کوئی گناہ نہیں ہے جو شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا اور ہر اس شے سے جس سے اجتناب کرنا حج کے دوران اس پر واجب ہوتا ہے" اور یہ بھی کہا: اس پر کوئی گناہ نہیں جو اپنے حج میں بچتا رہا (اور) اسے مکمل ادا کر دیا یہاں تک کہ وہ ہر قسم کے قبیح اور برے امور سے پاک تھا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قول باری تعالیٰ فَمَنْ تَعَجَّلَ میں معنی جمع ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ خبر ہے۔ اور قرآن کے علاوہ فلا اثم علیھم پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ مَن جمع کے معنی کے لئے ہے، جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (یونس: 42) یہ مَن جمع کے لئے ہے۔ اور وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ میں بھی اسی طرح ہے اور لِمَنِ اتَّقٰى میں لام غفران سے متعلق ہے، اور تقدیر کلام اسی طرح ہے المغفرۃ لمن اتقی یعنی مغفرت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق ہے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلا شبہ مغفرت اس کے لئے رکھی گئی ہے جو حج سے واپس لوٹنے کے بعد تمام گناہوں سے بچتا رہا۔

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے ذلك لمن اتقى یعنی یہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا، اور بعض نے کہا ہے: اس کے لئے (مغفرت ہے) جو حالت احرام اور حرم میں شکار کو قتل کرنے سے بچتا رہا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہے الاباحۃ لمن اتقی، اباحت اس کے لئے ہے جو بچتا رہا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج، حدیث نمبر 1691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منافقین کی ایک قوم کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں باتیں کیں جو غزوہ رجیع میں شہید کر دیے گئے تھے یعنی حضرت عاصم بن ثابت اور حضرت خبیب وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ منافقین نے کہا: ان لوگوں پر افسوس ہے کہ نہ تو یہ اپنے گھروں میں بیٹھے اور نہ ہی یہ اپنے صاحب (مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کا پیغام پہنچا سکے۔ پس یہ آیت منافقین کی صفات کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر غزوہ رجیع میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا ذکر اس طرح فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ: 207) (اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے۔)

حضرت قتادہ، مجاہد اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس (بندے) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس کے باطن میں کفر، نفاق، کذب یا اضرار (کسی کو نقصان اور ضرر پہنچانا) چھپا ہو اور وہ اپنی زبان سے اس کے خلاف اظہار کرتا ہو۔ پس یہ آیت عام ہے اور یہ اس حدیث سے مشابہت رکھتی ہے جو ترمذی میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض کتب میں ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک قوم ہوگی جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں ہوں گی اور ان کے دل صبر سے زیادہ کڑوے ہوں گے۔ وہ نرمی سے بھیڑوں کے چمڑے لوگوں کو پہنائیں گے اور وہ دین کے عوض دنیا خریدیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: کیا وہ مجھے دھوکہ دیتے ہیں اور وہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں؟ مجھے قسم ہے میں ضرور بالضرور ان پر ایسا فتنہ مسلط کر دوں گا جو ان میں سے حلیم کو بھی حیران و ششدر کر چھوڑے گا (1)۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَيُشْهِدُ اللّٰهَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ جانتا ہے بلاشبہ میں حق کہہ رہا ہوں۔ ابن محیصن نے اسے وَيَشْهَدُ اللّٰهُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ یعنی يشهد میں یاء اور ہاء کو مفتوح اور لفظ اللہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے "اس کی بات تجھے پسند آتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے قول کے خلاف کو جانتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون) (لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت وَاللّٰهُ يَشْهَدُ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ اور جماعت کی قراءت مذمت میں زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اس نے اپنے نفس پر اچھا کلام لازم کرنے کی قوت رکھی اور پھر اس کے باطن سے اس کے خلاف ظاہر ہوا۔ اور حضرت ابی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے وَيَسْتَشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ پڑھا ہے۔ اور یہ جمہور کی قراءت کی دلیل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان امور کے بارے میں انتہائی احتیاط برتنے پر دلیل اور تنبیہ ہے جو دین اور دنیا کے امور سے متعلق ہیں اور گواہوں اور قاضیوں کے احوال کے بارے میں طلب براءت پر دلیل ہے۔ بلاشبہ حاکم لوگوں کے ظاہر احوال پر اور جو کچھ ان کے ایمان اور صلاح میں سے ظاہر ہو اس پر عمل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ ان کے باطن کے بارے میں بحث کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے احوال بیان فرما دیے ہیں۔ اور بلاشبہ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو بظاہر انتہائی خوبصورت اور حسین بات کرتے ہیں حالانکہ وہ نیت قبیح کرتے ہیں (یعنی ان کی نیت میں خرابی اور برائی ہوتی ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، بحوالہ ترمذی

اس میں بھی خصماً الد سخت جھگڑالو کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

آیت میں الخصام مخاصمہ کا مصدر ہے۔ امام خلیل نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خصم کی جمع ہے۔ یہ قول زجاج کا ہے جیسا کہ کلب کی جمع کلاب، صعب کی جمع صعاب اور ضخم کی جمع ضخام ہے۔ اور اس کا معنی ہے جھگڑا کرنے والوں میں سے سخت اور شدید جھگڑا کرنے والا یعنی وہ سخت جھگڑالو جب وہ تجھ سے بات کرے اور تجھے بات لوٹائے اور اس کے کلام کو خوبصورت اور حسین دیکھے درآنحالیکہ اس کے باطن میں باطل ہو۔ یہ (آیت) اس پر دلالت کرتی ہے کہ جھگڑا کرنا جائز نہیں ہوتا مگر ایسے سبب سے جس کا ظاہر اور باطن برابر ہو۔ اور صحیح مسلم (1) میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔"

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ۗ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

"اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سرتوڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کردے اور تباہ کردے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

ارشاد باری تعالیٰ: وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا کے تحت کہا گیا ہے کہ تولّٰی اور سعٰی قلب کے فعل ہیں۔ پس تولّٰی، ضلّ، غضب اور انف فی نفسہ کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی وہ گمراہ ہو گیا، غصے ہو گیا اور اس نے اپنے دل میں بات کو پختہ کر لیا۔ اور سعٰی کا معنی ہے اس نے اپنے حیلہ اور ارادہ کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام پر مصائب لانے کی کوشش کی۔ یہ ابن جریج وغیرہ سے منقول ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ دونوں آدمی کے فعل ہیں۔ پس تولّٰی کا معنی ادبر (پیٹھ پھیرنا) آتا ہے۔ یعنی اے محمد ﷺ! اس نے پیٹھ پھیری اور وہ آپ سے چلا گیا اور سعٰی کا معنی ہے: اور وہ اپنے قدموں کے ساتھ چلا اور اس نے راستے کے ... کو پامال کیا۔

حضرت ابن عباس ؓ وغیرہ سے مروی ہے: دونوں کوششیں فساد ہیں۔ کہا جاتا ہے: سعی الرجل یسعی سعیا یعنی آدمی نے دوڑ لگائی۔ اور اسی طرح جب وہ کام کرے اور کمائے تو کہا جاتا ہے: فلان یسعی علی عیالہ یعنی فلاں اپنے گھر والوں کے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وَ يُهْلِكَ یہ لِيُفْسِدَ پر معطوف ہے۔ اور حضرت ابی ؓ کی قراءت میں وَ لِيُهْلِكَ ہے۔ حسن اور قتادہ نے اسے وَ يُهْلِكُ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان سے رفع کے بارے میں کئی اقوال ہیں۔ اس کا عطف يُعْجِبُكَ پر ہے (اس لئے مرفوع ہے) اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ سعٰی پر معطوف ہے کیونکہ اس کا معنی ہے "وہ سرتوڑ کوشش کرتا ہے اور

1۔ بخاری شریف، قول اللہ تعالیٰ وھو الد الخصام، حدیث نمبر 2277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تباہ کرتا ہے۔" اور ابو اسحاق نے کہا ہے: یہ اصل عبارت و هو يُهلك ہے یعنی وہ تباہ کرتا ہے۔ اور ابن کثیر سے و يَهلِكُ یعنی یاء کے فتحہ اور کاف کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے۔

اور الحَرثُ وَالنَّسلُ، يَهلِكُ کے سبب دونوں مرفوع ہیں۔ اور یہی حسن، ابن ابی اسحاق، ابو حیوہ اور ابن محیصن کی قراءت ہے۔ اور عبدالوارث نے اسے ابو عمرو سے روایت کیا ہے۔

اور ایک قوم نے اسے وَيَهلَكُ یعنی یاء اور لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الحرث کو رفع دیا ہے۔ اور لغوی طور پر هَلَكَ يَهلَكُ یہ رَكَنَ يَركَنُ، أَبَى يَأبَى، سَلَى يَسلَى، قَلَى يَقلَى اور ان کے مشابہ افعال کی مثل ہے۔ اور آیت میں مراد اخنس کا کھیتی کو جلانا اور گدھوں کو قتل کرنا ہے۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مفسرین نے کہا: لیکن اب یہ آیت تمام لوگوں کے لئے عام ہو گئی ہے۔ پس جو بھی اس کے عمل کی طرح عمل کرے گا وہی اس لعنت اور سزا کا مستحق ہو گا۔

بعض علماء نے کہا ہے: بے شک جو گدھے کو قتل کرتا ہے یا اناج کے ذخیرہ کو جلاتا ہے وہ مستوجب ملامت ہے اور یوم قیامت تک اسے یہ عیب لاحق رہے گا۔

مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ ظالم زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتا ہے اور وہ کھیتی اور نسل (انسانی) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: الحرث (کھیتی) سے مراد عورتیں ہیں اور النسل سے مراد اولاد ہے۔ اور یہ اس طرح ہے کیونکہ نفاق متفرق اور متضاد گفتگو اور قتال کے وقوع تک پہنچتا ہے اور اسی میں مخلوق کی ہلاکت ہے۔

زجاج نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ السعی فی الارض کا معنی ہے سرعت اور تیزی کے ساتھ چلنا۔ اور یہ لوگوں کے درمیان (فسادی) اختلاف اور فتنہ برپا کرنے سے عبارت ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: "بے شک لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے اللہ تعالیٰ تمام کو اپنی جانب سے دی جانے والی سزا میں شامل کر لے"۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ لغۃً الحرث کا معنی شق کرنا اور پھاڑنا ہے۔ اور اسی سے المحراث ہے یعنی وہ آلہ (ہل) جس کے ساتھ زمین کو پھاڑا جاتا ہے۔ اور الحرث سے مراد مال کمانا اور اسے جمع کرنا ہے۔ اور حدیث طیبہ میں ہے۔ احرث لدنیاك كأنك تعيش ابدا تو اپنی دنیوی زندگی کے لئے مال کما اور جمع کر گویا تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (یعنی ایسا نہ ہو کہ آدمی ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور پھر بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے، بلکہ حالات کی تلخیوں کے پیش نظر زندگی کی بازی زور سے۔ واللہ اعلم۔

اور الحرث کا معنی کھیتی ہے اور الحراث کھیتی کاشت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ تحقیق حرث و احترث یہ ہمّ اور ازدرع کی مثل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: احْرُثِ القرآن، ای ادرسہ یعنی قرآن پڑھ۔ اور حَرَثْتُ النَّاقَةَ و احْرَثْتُها یعنی میں اس پر سفر کرتا رہا یہاں تک کہ وہ کمزور ہو گئی۔ اور حرثت النار ای حرکتہا میں نے آگ کو حرکت دی اور المحراث اس

یہ کافر اور منافق کی صفت ہے جو اپنے بارے میں خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مومن کے لئے یہ ناپسندیدہ اور مکروہ ہے کہ گناہ اسے ان میں سے کسی میں واقع کر دے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا ہے: کسی آدمی کے لئے بطور گناہ اتنا کافی ہے کہ اسے کوئی دوسرا بھائی کہے: "اتق اللہ" (اللہ سے ڈرو) تو وہ آگے سے یہ کہہ دے: تجھ پر اپنے نفس کے بارے میں وہی لازم ہے جس کی نصیحت تو مجھے کر رہا ہے (1)۔

اور الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور غلبہ ہے۔ یہ عزہ یعزہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے: وہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اسی سے وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ (ص) ہے۔ یعنی وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی حمیت ہے۔ اسی کے مطابق شاعر کا قول بھی ہے:

اخذته عزة من جهله فتولى مغضبا فعل الضجر

اسے اس کی دور جاہلیت کی حمیت نے آ لیا، پس اس نے حالت غضب میں تنگی اور نقصان کے فعل کا ارتکاب کیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الْعِزَّةُ کا معنی قوت اور شدت نفس ہے۔ یعنی اس نے اپنی ذات میں قوت و طاقت حاصل کی اور ادھر ہی جھک گیا، پس اسی قوت نے اسے گناہ میں واقع کر دیا جب اس نے اسے آ لیا اور گناہ کو اس پر لازم کر دیا۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب اسے کہا جائے رک جا، ٹھہر جا تو وہ گناہ کا ارتکاب زیادہ کرتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ قوت و طاقت نے اسے گناہ پر ابھارا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے: قوت و طاقت نے اسے ایسی شے سے پکڑ لیا جو اسے گناہ میں مبتلا کرے گی۔ یعنی اس نے قوت و طاقت اور زمانہ جاہلیت کی حمیت کے سبب کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ بھی ہے۔ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ (ص) (لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہو گئے) ہیں۔)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِالْاِثْمِ میں با بمعنی لام ہے۔ یعنی عزت و حمیت نے اسے وعظ و نصیحت قبول کرنے سے پکڑ لیا، اس گناہ کے سبب جو اس کے دل میں تھا۔ اور وہ نفاق ہے۔ اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے جس میں وہ ناقہ کے پسینے کی صفت بیان کرتا ہے:

وكَأَنَّ رُبًّا أَوْ كُحَيْلًا مُعْقَدًا حَشَّ الْوَقُوْدُ بِهٖ جَوَانِبَ قُمْقُمِ

تو یہ بمعنی حش الوقود لہ ہے۔ یعنی با بمعنی لام ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ با بمعنی مع ہے۔ یعنی حمیت نے اسے گناہ کے ساتھ پکڑ لیا۔ پس با کا معنی تاویلات کے مطابق مختلف ہو جاتا ہے۔

یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کسی یہودی کا ہارون الرشید کے پاس کچھ کام تھا، وہ اس کے دروازے پر سال بھر آتا رہا لیکن وہ نہ پا سکا، پس ایک دن وہ دروازے پر کھڑا تھا، جب ہارون الرشید نکلا تو وہ دوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

1۔ [illegible]

اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ تو ہارون الرشید اپنی سواری سے نیچے اترا اور سجدے میں گر گیا۔ پس جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو اس کے کام کے بارے حکم دیا سو وہ کر دیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر آیا تو اسے کہا گیا: اے امیر المومنین! تو ایک یہودی کے کہنے پر اپنی سواری سے اترا ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا: وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۝

حَسْبُہٗ کا معنی ہے کہ اسے بطور سزا اور عذاب جہنم کافی ہے۔ جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے کفاک ما حل بک تجھے وہی کافی ہے جو تجھے پیش آیا ہے۔ اور انت تستعظم و تعظم علیہ ما حل تو عظمت طلب کرتا ہے اور تجھے اس پر عظمت دی جائے گی جو تجھے پیش آیا۔ اور المھاد، المھد کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جو سونے کے لئے تیار کی جائے۔ اور اسی سے مھد الصبی (بچے کا جھولا) بھی ہے۔ اور جہنم کو مہاد کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کفار کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس لئے کہ ان کے لیے مہاد کے بدلے جہنم ہے۔

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۝ (آل عمران) اور اسی کی مثل عرب کلام میں ان کا یہ قول ہے: تحیۃ بینھم ضرب وجیع (ان کے درمیان تحیہ دردناک ضرب لگانا ہے۔)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۝

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

اس آیت میں ابْتِغَاءَ مفعول لاجلہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ جب منافقین کی کارکردگی کا ذکر کیا تو پھر بعد میں مومنین کی کارکردگی کا ذکر فرمایا۔

کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے آئے تو قریش کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا اور تعاقب کیا۔ تو وہ اپنی سواری سے نیچے اترے اور ترکش میں موجود تمام تیر نکال لئے، اور اپنی قوس (تیر کمان) پکڑ لی اور فرمایا: تم جانتے ہو میں تم سے زیادہ تیر چلانے میں ماہر ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم! تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے سارے تیر پھینک دوں۔ بعد ازاں میں اپنی تلوار سے لڑوں گا جب تک اس کی کوئی شے میرے ہاتھ میں باقی رہی۔ پھر اس کے بعد تم جو چاہو کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تجھے نہیں چھوڑ سکتے کہ تم غنا اور خوشحالی کی حالت میں ہم سے چلے جاؤ حالانکہ تم ہمارے پاس تنگدستی اور افلاس کی حالت میں آئے تھے۔ لیکن اگر تم مکہ مکرمہ میں موجود اپنے مال پر ہماری راہنمائی کرو تو ہم تمہارا راستہ چھوڑ دیں گے۔ انہوں نے اسی (مذکورہ) شرط پر آپ سے معاہدہ کیا تو آپ نے اسے پورا کر دیا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ الآیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اے ابو یحییٰ! تیری بیع نفع بخش سودا کیا ہے اور ان پر یہ (مذکورہ) آیت تلاوت فرمائی۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب

رضا، مرضاۃ۔

ایک قوم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہا جائے: شری بمعنی اشتری ہے اور اس صورت میں آیت کو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف پھیرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی جان کو اپنے مال کے عوض خریدا تھا، نہ کہ اسے بیچا تھا مگر یہ کہا جا سکتا ہے: حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہو جانا گویا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ سے بیچنا ہے۔ پس لفظ یشری (بیچنے) کے معنی پر مبنی صحیح اور درست ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝

"اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے مومن، کافر اور منافق ہونے کے بارے میں بیان کر دیا تو فرمایا: تم ایک دین پر ہو جاؤ اور اسلام پر جمع ہو جاؤ اور اسی پر ثابت قدم ہو جاؤ۔ پس اس آیت میں السِّلْم بمعنی اسلام ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے، اور اسے ابو مالک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اسی کے مطابق کندی شاعر کا قول بھی ہے:

دعوت عشیرتی للسلم لما رأیتهم تولوا مدبرینا

میں نے اپنے خاندان کو اسلام کی دعوت دی جب میں نے انہیں دیکھا تو وہ پیٹھیں پھیر کر واپس چلے گئے۔

یعنی میں نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی جبکہ بنی کندہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اشعث بن قیس کندی کے ساتھ مرتد ہو گئے، کیونکہ مومنین کو کبھی بھی مسالمہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا گیا، اور مسالمہ سے مراد صلح ہے۔ اور بلاشبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا کہ آپ صلح کے لئے مائل ہوں جبکہ وہ اس کی طرف مائل ہوں۔ اور رہا یہ کہ آپ صلح کی ابتدا کریں تو اس طرح نہیں۔ یہ قول علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں حکم دیا گیا ہے جو اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے کہ وہ اپنے دلوں کے ساتھ اس میں داخل ہو جائیں۔ طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ تم امر دین میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تم نیکی کی تمام اقسام میں داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لفظ سین کے کسرہ کے ساتھ السِّلم پڑھا گیا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ السِّلم اور السَّلم دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور اسی طرح یہ اکثر بصریوں کے نزدیک بھی ہے۔ اور یہ دونوں لفظ اکٹھے اسلام اور صلح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ابو عمرو بن العلاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ اور یہاں اسے ادخلوا فی السِّلم پڑھا ہے اور کہا ہے: اس سے مراد اسلام ہے۔ اور وہ لفظ جو سورۃ انفال اور سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ہے۔ اسے السَّلم سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فرمایا: فتحہ کے ساتھ اس کا معنی مسالمہ (صلح) ہے۔

گیا ہے۔ اور جب عضو کو عضو کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ متفرق اور تقسیم ہونے سے محفوظ ہوتے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا یہ فعل نہی ہے اور خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ یہ مفعول ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور حضرت مقاتل نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے نماز میں تورات پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ نیز یہ کہ وہ ان بعض احکام پر عمل کریں گے جو تورات میں ہیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ کیونکہ بلاشبہ سنت کی اتباع کرنا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی بجائے بہتر اور اولیٰ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس کا معنی ہے) تم اس راستے پر نہ چلو جس کی طرف تمہیں شیطان دعوت دیتا ہے کیونکہ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ بلاشبہ تمہارے لئے اس کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۝

"اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آچکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے"

ارشاد باری تعالیٰ فَاِنْ زَلَلْتُمْ کا معنی ہے اگر تم صراط مستقیم سے دور ہٹنے لگو۔ دراصل زلل یعنی پھسلاہٹ قدم میں ہوتی ہے بعد ازاں یہ لفظ اعتقادات، آراء اور دیگر چیزوں میں (سیدھی راہ سے ہٹ جانے کے لئے) استعمال کیا جانے لگا ہے۔ کہا جاتا ہے: زَلَّ یَزِلُّ زَلًّا وَزَلَلًا وَزُلُوْلًا یعنی اس کا پاؤں پھسل گیا۔

ابو السمال العدوی نے زَلِلْتُمْ لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حرف کی اصل الزلق سے ہے اور معنی ہے: "تم حق سے ہٹ گئے اور بھٹک گئے۔"

ارشاد خداوندی مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَیِّنٰتُ میں الْبَیِّنٰتُ سے مراد معجزات اور آیات قرآن ہیں۔ اگر آیت میں خطاب مومنین کو ہے اور اگر خطاب اہل کتاب کو ہے تو پھر بینات سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور آپ کے بارے وہ علامات ہیں جو ان کی شریعت میں وارد ہوئی ہیں۔

آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ گناہ کے بارے جاننے والے کی سزا اس کی سزا کی نسبت بہت زیادہ اور شدید ہوگی جو اس سے ناواقف اور جاہل ہو اور جس تک دعوت اسلام نہ پہنچی وہ احکام شرعیہ کو ترک کرنے کے سبب کافر نہ ہوگا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو وہ قرآن کریم پڑھ رہے تھے تو انہیں جو قرآن پڑھا رہا تھا اس نے پڑھا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تو حضرت کعب نے کہا: بلاشبہ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ یہ اس طرح ہو۔ پھر ان دونوں کے پاس سے ایک آدمی گزرا تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: تم یہ آیت کس طرح پڑھتے ہو؟ تو اس آدمی نے کہا: فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۝ (بقرہ) تو حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: اسی طرح ہونا چاہیے (1)۔ اور عَزِیْزٌ

1۔ البحر المحیط، جلد 1، صفحہ 282

کا معنی ہے (وہ زبردست ہے) یعنی جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے اس سے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور حَكِيْمٌ کا مفہوم ہے کہ وہ جو فعل بھی کرتا ہے اس میں حکمت کارفرما ہوتی ہے (اس کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

"کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں اور فرشتے اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے۔ اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات۔"

ارشاد باری تعالیٰ هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی اسلام میں داخل نہ ہونے والے، اور هَلْ یہاں اس سے مراد انکار ہے۔ یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ نظرتہ اور انتظرتہ ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور النظر اور الانتظار بھی ہم معنی ہیں۔

حضرت قتادہ، ابو جعفر یزید بن قعقاع اور ضحاک نے فِي ظِلَالٍ مِّنَ الْغَمَامِ پڑھا ہے۔ اور ابو جعفر نے والملائكۃ کو الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور اس کی تقدیر عبارت ہے مع الملائکۃ یعنی ملائکہ کے ساتھ۔ عرب کہتے ہیں: اقبل الامیر فی العسکر۔ امیر آیا لشکر کے ساتھ۔ یعنی اس میں فی بمعنی مع ہے۔ ظُلَلٍ یہ ظُلَّةٌ کی جمع تکسیر ہے، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع ظلم ہے اور اس کی جمع سالم ظُلُلَات ہے۔

سیبویہ نے یہ شعر کہا ہے:

اذا الوحش ضم الوحش فی ظُلُلَاتِهَا　　　　سواقط من حر و قد کان اظهرا

اس میں ظُلُلَات ظُلَّةٌ کی جمع سالم ذکر کی گئی ہے۔

اور ظُلَّات اور ظلال یہ ظل کی جمع کثرت ہے اور اس کی جمع قلت اظلال ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ظلال ظُلَّةٌ کی جمع ہے جیسا کہ قُلَّةٌ کی جمع قِلال ہے۔ جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

ممزوجۃ بماء القلال　　　　(گھڑوں کے پانی میں ملائی گئی ہے)

اخفش سعید نے کہا ہے کہ والملائکۃ مجرور ہے یہ دفی الملائکۃ کے معنی میں ہے۔ فرمایا: اس میں رفع عمدہ ہے، جیسا کہ ان آیات میں ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّآ أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانعام: 158) اور وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (الفجر)

فراء نے کہا ہے: حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ملائکہ ان کے پاس ان کی ارواح قبض کرنے کے لئے آئیں گے۔ اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن (وہ آئیں گے) اور یہی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

ابو العالیہ اور ربیع نے کہا ہے کہ ملائکہ ان کے پاس چھائے ہوئے بادلوں کی صورت میں آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ (یوسف: 82) اور وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء: 32) علی بن عیسیٰ نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عمرو نے حضرت ابن عباس سے مروی ایک روایت میں اسے اپنی اصل کے مطابق پڑھا ہے۔ اور ایک قوم نے تاسئل ہمزہ کی حرکت کو سین کی طرف نقل کر کے اور ہمزہ وصل کو باقی رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ ان کی لغت کے مطابق جنہوں نے کہا ہے الاحمر اور کم یہ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ آتَيْنٰهُمْ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے کم آتینا آتیناهم اور فعل کو اس سے مقدم لانا جائز نہیں کیونکہ اس کے لئے صدر کلام ضروری ہے۔ اور قول اول تقدیر اول کے مطابق تمیز ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور تقدیر ثانی کی بنا پر یہ آتَيْنٰهُمْ کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کم مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہو اور اس کی خبر آتَيْنٰهُمْ ہو۔ اس میں کم کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہوگی اور تقدیر کلام یہ ہوگی کم آتیناهموه۔ اور یہ (یعنی کم) معرب نہیں۔ بلکہ یہ اسم ہے کیونکہ یہ حروف کے قائم مقام ہے جب کہ اس میں استفہام کے معنی پائے جائیں۔

اور جب تو فرق کرے کم اور اسم کے درمیان تو اختیار ہے کہ تو اسے من کے ساتھ لائے جیسا کہ اس آیت میں ہے اور اگر تو اسے (من کو) حذف کرے تو پھر تو اسے نصب دے دیا ہے کہ استفہام ہو یا کم خبریہ۔ اور خبریہ کی صورت میں جر بھی جائز ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کم بجود مقرف نال العلا ، و کریم بخله قد وضعه

اس میں کم خبریہ کی تمیز حرف جر کے سبب مجرور ہے۔

اور آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں ان کے پاس کتنی آیات و علامات آئیں جو آپ ﷺ کی پہچان کراتی ہیں اور آپ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت مجاہد اور حسن وغیرہما نے کہا ہے: یعنی وہ آیات و معجزات جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے جیسا سمندر کا پھٹ جانا (اور اس میں راستوں کا بن جانا) بادلوں کا سایہ، عصا مبارک اور ید موسیٰ وغیرہ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کو ان کے حوالے کے بارے حکم ارشاد فرمایا یہ زجر و توبیخ کی بنا پر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ یہ لفظ عام ہے جو تمام لوگوں کو شامل ہے۔ اگرچہ اس کا مخاطب بنی اسرائیل ہیں، کیونکہ انہوں نے اسے تبدیل کیا جو ان کی کتابوں میں تھا اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جو تھا اس کا انکار کیا۔ لیکن لفظ کا اطلاق تو اس پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو بدلتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا: یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے اور یہ پہلے (معنی) کے زیادہ قریب ہے اور لفظ میں کفار قریش بھی داخل ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت ﷺ ان پر بطور احسان و نعمت ان میں مبعوث فرمائے گئے۔ لیکن انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی اور اس پر شکر کرنے کو کفر کے ساتھ بدل دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ: فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ یہ جملہ خبریہ ہے جو کہ وعید کو متضمن ہے۔ اور العقاب عقب سے ماخوذ ہے۔ گویا کہ عقاب کرنے والا بدلہ اور جزا دینے کے لئے اس کے نشانات قدم پر چلتا ہے۔ اسی سے عقبة الراکب (وہ جگہ جہاں

سے سوار ہوا جاتا ہے) اور عقبۃ القدر (شوربے کا باقی حصہ جو ہانڈی والے کے لئے چھوڑا جائے) عقاب اور عقوبۃ وہ سزا جو گناہ کے بعد ہوتی ہیں۔ وقد عاقبہ بذنبہ "تحقیق اس نے اسے اس کے گناہ کی سزا دی"۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

"آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہو گی ان سے قیامت کے دن اور اللہ تعالیٰ روزی دیتا ہے جسے چاہے بے حساب اسے ایک بے"۔

ارشاد باری تعالیٰ: زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا میں الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مفعول ما لم یسم فاعلہ ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور اس سے مراد سرداران قریش ہیں (زُيِّنَ فعل مجہول ذکر کیا گیا ہے)۔ مجاہد اور حمید بن قیس نے فعل کو معروف یعنی مبنی للفاعل پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ فاعل کا پہلے ذکر موجود نہیں۔ ابن ابی عبلہ نے زُيِّنَتْ یعنی علامت تانیث کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جائز ہے کیونکہ تانیث غیر حقیقی ہے۔

اور مزین کرنے والا ہی اس کا خالق اور اس کا موجد ہے اور وہی خالق الکفر بھی ہے اور اسے شیطان بھی اپنے وسوسہ اور اپنے دھوکے کے ساتھ آراستہ کرتا ہے۔ اور یہاں خاص طور پر کافروں کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ انہوں نے تزیین (زیب و آرائش) کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے اور وہ دنیا کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور اسی سبب سے انہوں نے آخرت سے اعراض کر لیا ہے۔ جو کچھ زمین پر ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے لئے زینت بنا دیا ہے تاکہ وہ مخلوق کو آزمائے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ حسین کون ہے؟

اور مومن وہ ہیں جو شریعت کے طریقوں پر گامزن ہیں، زینت ان کے لئے باعث فتنہ نہیں۔ اور بے کفر تو زینت ان کی مالک بن جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے سوا کسی کا اعتقاد ہی نہیں رکھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق بنی‌تعالی‌عنہ کے پاس جب مال لایا گیا تو انہوں نے فرمایا: اے اللہ! بلاشبہ ہم استطاعت نہیں رکھتے مگر یہ کہ ہم اس سے خوش ہوں جسے تو نے ہمارے لئے زینت بنایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ کفار قریش کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ دنیوی اعتبار سے اپنی حالت کو عظیم قرار دیتے ہیں اور وہ اس پر رشک اور اظہار مسرت کرتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کے غلاموں کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

ابن جریج نے کہا ہے: وہ اہل ایمان کے آخرت کو طلب کرنے کے سبب ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبب مذاق ان کا فقر اور مال کی تنگدستی تھی (یعنی ان کے فقر و فاقہ کی وجہ سے کفار ان کا مذاق اڑاتے تھے)۔ جیسا کہ حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور انہیں کی مثل دیگر جانثاران مصطفیٰ ﷺ۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان کے فعل کے قبیح اور برا ہونے کے سبب ان کے رتبہ اور درجہ کی پستی پر آگاہ کیا اور فرمایا: وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (یعنی وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کی شان اور رتبہ قیامت کے دن ان سے بلند ہو گا۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس کسی نے کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو ذلیل سمجھا یا اسے اس کے فقر و افلاس اور قلت مال کی وجہ سے حقیر جانا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے مشہور کرے گا پھر اسے رسوا کر دے گا اور جس نے کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان لگایا یا اس کے بارے وہ کچھ کہا جو اس میں نہیں تھا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کے ٹیلے پر کھڑا کرے گا، یہاں تک کہ وہ اس سے نکل جائے جو اس نے اس کے بارے میں کہا (یعنی بندۂ مومن سے اپنے قول کی معذرت کرے اور معافی مانگ لے۔) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندۂ مومن کی عظمت اور عزت و اکرام مقرب فرشتے سے بھی زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنے والے مومن مرد اور توبہ کرنے والی مومنہ عورت سے زیادہ محبوب اور کوئی شے نہیں اور بلاشبہ مومن آدمی کی پہچان آسمان میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ایک آدمی کی پہچان اس کے گھر والوں اور اس کی اولاد میں ہوتی ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ کا معنی یہ ہے کہ وہ درجہ میں ان سے بلند ہوں گے۔ کیونکہ وہ جنت میں ہوں گے اور کفار جہنم میں ہوں گے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد بلند مکان ہو، اس اعتبار سے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے (یعنی پرہیزگار لوگ بلند مکان یعنی جنت میں ہوں گے۔)

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تفضیل اس پر ہو جو کچھ کافر ان کے بارے میں گمان کرتے ہیں (یعنی قطعاً ایسا نہ ہوگا جیسا کافر گمان کرتے ہیں بلکہ ان کی شان اس سے کہیں بلند ہوگی۔)

کیونکہ کفار تو کہتے ہیں: اگر آخرت ہوئی تو اس میں ہمارے لئے حصہ (خیر و فضل) تمہاری نسبت کہیں زیادہ ہوگا۔ اسی معنی میں حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ جو واقعہ انہیں عاص بن وائل کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا عاص بن وائل پر کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا تاکہ اس سے قرض کا مطالبہ کروں تو اس نے مجھے کہا: میں تجھے ہرگز قرض ادا نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو محمد ﷺ کے ساتھ کفر اختیار کرے۔ میں نے اسے جواب دیا: بلاشبہ میں ہرگز ان سے کفر اختیار نہ کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تجھے اٹھایا جائے۔ تو اس نے کہا: کیا مجھے موت کے بعد (دوبارہ) اٹھایا جائے گا؟ تو پھر میں تجھے قرض ادا کروں گا جب میں مال و اولاد کی طرف لوٹ کر گیا۔ الحدیث۔ عنقریب یہ مکمل حدیث بھی آئے گی۔ (1)

اور کہا جاتا ہے: سخرت منه و سخرت به، ضحكت منه و ضحكت به، و هزئت منه و به۔ یہ سب الفاظ ایک معنی میں کہے جاتے ہیں۔ اسے اخفش نے بیان کیا ہے اور اسم السخرية، والسُخْرِي اور السِخْرِي ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: 32) اور فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا (المومنون: 110) اور رجل سُخْرَة کا معنی ہے (وہ آدمی جس سے تمسخر کیا جاتا ہے۔ اور اگر یہی لفظ خاء کے فتحہ کے ساتھ ہو یعنی رجل سُخَرَة تو مراد وہ آدمی ہے جو لوگوں سے تمسخر کرتا ہو۔ اور فلان سُخْرَة الناس کا معنی تمسخر کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: خادم سُخْرَة

1۔ ترمذی شریف، باب ومن سورۃ مریم، حدیث نمبر 1949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وسخرۃ وتسخیرا یعنی فلاں نے اسے بغیر اجرت کے کام کا مکلف اور پابند بنایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ضحاک نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں بغیر کسی تاوان کے عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کمزور لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بلند رتبہ عطا فرمائے گا۔ پس یہ آیت متنبہ کر رہی ہے کہ ان پر عظیم انعام ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کو بغیر حساب قرار دیا ہے اس حیثیت سے کہ وہ دائمی ہے اور لامتناہی ہے، پس وہ شمار نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی صفت ہے۔ وہ جیسے تصرف کرتا ہے، بلاشبہ اس کی قدرت اتنی عظیم ہے تو وہ کسی حد و شمار کے ساتھ خرچ نہیں کرتا۔ پس اس کا سارے کا سارا فضل ہی بغیر حساب ہے۔ اور وہ جو حساب کے ساتھ ہے وہ آدمی کے اس عمل کے مطابق ہے جو آدمی نے آگے بھیجا ہوتا (یعنی ہر عمل کی جزا تو اس کے مطابق ہوگی مگر اس پر فضل اور عطا بلا حساب ہوگی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۝ (النبا) (یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ جنہیں عطا کیا جاتا ہے (یعنی مرزوقین) وہ ان کے وہم و گمان کے بغیر ہو جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: 3) (اور اسے (وہاں سے) رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

"(ابتدا میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور اتاری ان کے ساتھ کتاب برحق تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا۔ پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف"۔

ارشاد باری تعالیٰ: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً کا معنی ہے سب لوگ ایک دین پر تھے۔

حضرت ابی بن کعب اور ابن زید نے کہا ہے کہ النَّاس سے مراد بنی آدم (اولاد آدم) ہیں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں روحوں کی صورت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کر لیا۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: الناس سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ (پھر اس پر یہ سوال ہوتا ہے) کہ واحد کو لفظ جمع کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ (تو جواب یہ ہے کہ اس لئے) کیونکہ آپ ہی ساری نسل کی اصل اور بنیاد تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الناس سے مراد حضرت آدم اور حضرت مائی حوا علیہما السلام ہیں۔

حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ الناس سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تھا اور یہ دس صدیاں ہیں (جن میں) وہ لوگ حق پر تھے یہاں تک کہ ان میں اختلاف ہو گیا تب اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد والوں کو مبعوث فرمایا (1)۔

اور ابن ابی خیثمہ نے کہا ہے: جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اس وقت سے لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک پانچ ہزار آٹھ سو سال کا عرصہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے زیادہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین بارہ سو برس کی مدت ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس تک زندہ رہے اور آپ کے زمانے میں لوگ ایک ہی دین پر تھے، وہ دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور ملائکہ ان کے ساتھ مصافحہ کرتے تھے اور وہ اسی حال پر رہے یہاں تک کہ حضرت ادریس علیہ السلام (آسمانوں پر) اٹھا لئے گئے۔ پھر ان میں اختلاف پڑ گیا۔ یہ بات محل نظر ہے۔ کیونکہ صحیح روایت کے مطابق حضرت ادریس علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہوئے ہیں۔ کلبی اور واقدی وغیرہ ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی میں سوار ہونے والے لوگ ہیں، وہ مسلمان تھے پھر حضرت نوح علیہ السلام کے وصال کے بعد ان میں اختلاف ہو گیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ کفر پر ایک امت تھے اور اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کا وہ زمانہ ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا۔

اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں تمام لوگ ایک امت تھے اور وہ تمام کے تمام کافر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت دور جاہلیت میں ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے۔

پس ان اقوال کی بنا پر کان اپنے باب پر ہے یعنی زمانہ ماضی کے لئے جو گزر چکا ہے اور وہ تمام جنہوں نے آیت میں الناس سے مراد مومنین لئے ہیں انہوں نے کلام میں ف فاختلفوا فبعث مقدر مانا ہے۔ اور اس حذف پر دلیل یہ بیان کی ہے: وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ یعنی تمام لوگ دین حق پر تھے، پھر ان میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات مبعوث فرمائے، جو انہیں بشارت دینے والے ہیں جنہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی اور انہیں ڈرانے والے ہیں جنہوں نے نافرمانی کی۔ اور جنہوں نے الناس سے مراد کفار لئے ہیں، تو پھر انہیں کی طرف انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی۔

1۔ بحر الوجیز، جلد 1، صفحہ 285

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ کَانَ ثبوت کے لئے ہو (یعنی ہمیشہ ہو) اور مراد ان لوگوں کے بارے خبر دینا ہو جو تمام کے تمام ایک جنس ہیں کہ وہ شرائع سے خالی ہونے میں اور حقائق سے جاہل اور ناواقف ہونے میں ایک امت ہوتے اگر اللہ تعالیٰ ان پر احسان نہ فرماتا اور ان کی طرف اپنے رسول بھیج کر ان پر مہربانی نہ فرماتا۔ پس اس تاویل پر کَانَ مضی کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اس کا معنی وہی ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء) اور اُمَّةً کا لفظ ام (مقصود) کے اسی قول سے ماخوذ ہے: اممت کذا یعنی میں نے اس کا قصد کیا۔ پس امة واحدة کا معنی ہے ان کا مقصد ایک تھا۔ اور واحد کے لئے امة بولا جاتا ہے یعنی مقصد غیر مقصد الناس اس کا مقصد لوگوں کے مقصد کے سوا ہے۔ اسی کے مطابق حضور نبی کریم ﷺ کا حضرت قس بن ساعدہ کے بارے میں ارشاد گرامی بھی ہے یحشر یوم القیامة امة واحدة (قیامت کے دن اسے ایک امت (مقصد) پر اٹھایا جائے گا) اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل کے بارے فرمایا اور الامة القامة (سیدھا اور صحیح مقصد) گویا کہ تمام بدن کا مقصد یہی ہے۔

اور الإمة الف کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی نعمت ہے کیونکہ لوگ اس (نعمت) کا ہی قصد کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی امام ہے کیونکہ لوگ اس کی پیروی کرنے کا قصد کرتے ہیں۔ یہ زجاج نے ذکر کیا ہے۔ نحاس سے روایت ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کان البشر امة واحدة پڑھا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کان الناس امة واحدة فاختلفوا فبعث قراءت کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ، حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں اور قرآن کریم میں جن کے اسمائے گرامی مذکور ہیں وہ اٹھارہ ہیں۔ اور سب سے پہلے رسول حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اسے آجری اور ابو حاتم بستی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث شفاعت کے مطابق اول الرسل حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ لوگ انہیں کہیں گے انت اول الرسل آپ پہلے رسول ہیں (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے رسول حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ اس کا بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد باری تعالیٰ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ میں کتاب سے مراد اسم جنس یعنی کتب ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: الکتاب پر الف لام عہد کے لئے ہے اور اس سے مراد تورات ہے۔ اور لِيَحْكُمَ جمہور کے قول کے مطابق الکتاب کی طرف مسند ہے، اور یہ ان مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یعنی لان یحکم۔ اور یہ نسبت مجازی ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ:29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں ٹھیک ٹھیک)

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ عزوجل ولقد ارسلنا نوحا الی قومه، حدیث نمبر 3092، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
بخاری شریف، باب قول اللہ ذریة من حملنا مع نوح، حدیث نمبر 4118، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ ہر نبی اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔ اور جب اس نے کتاب کے مطابق فیصلہ کیا تو گویا کتاب نے ہی فیصلہ کیا۔

عاصم جحدری کی قراءت میں لِیُحْکَمَ بَیْنَ النَّاسِ ہے یعنی فعل مجہول پڑھا گیا ہے۔ اور یہ قراءت شاذ ہے، کیونکہ کتاب کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے۔ اور پہلے فیہ کی ضمیر فِیمَا میں ما کی طرف لوٹ رہی ہے اور دوسرے فیہ کی ضمیر الکتاب کی طرف لوٹنے کا احتمال رکھتی ہے۔ یعنی کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر انہی لوگوں نے جنہیں وہ عطا کی گئی تھی۔ الذین فعل کے سبب محل رفع میں ہے اور اُوْتُوْهُ بمعنی اعطوہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضمیر منزل علیہ کی طرف لوٹتی ہے اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے، یعنی نبی علیہ السلام کے بارے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز ان لوگوں کے جنہیں اس کے بارے علم عطا فرمایا گیا۔

بَغْیًا بَیْنَهُمْ یہ مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی هم یختلفوا الا لبغی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر باہمی حسد کے سبب۔ اس کا معنی و مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس میں ان کے فعل کی سفاہت اور اس قباحت پر تنبیہ ہے جس میں وہ واقع ہوئے۔

اور ھدی کا معنی ارشد راہنمائی کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی حق کی طرف راہنمائی فرمادی، اس طرح کہ ان کے لئے وہ کچھ بیان کردیا جس میں ان سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تھا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں سے بعض نے بعض کی کتابوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ان تمام کی تصدیق کے لئے راہنمائی فرمادی۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی ان امور میں جن میں اہل کتابین (یہود و نصاریٰ) نے اختلاف کیا۔ ان کے قول میں سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا یہودی تھے یا عیسائی۔ (یعنی یہودیوں نے کہا: وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا: وہ عیسائی تھے۔)

ابن زید اور زید بن اسلم نے کہا ہے: ان کا قبلہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے بیت المقدس کی طرف اور نصاریٰ نے مشرق کی طرف (منہ کیا) اور یوم جمعہ کے بارے میں ان کا اختلاف ہوا۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ وہ دن ہے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں ہماری راہنمائی فرمادی، وہ یہودیوں کے لئے ہفتہ کا دن ہے اور عیسائیوں کے لئے اتوار کا"(1)۔ اور ان کے روزوں کے بارے جو اختلاف ہے، مختصر وہ تمام امور جن میں انہوں نے اختلاف کیا (ان میں اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی فرمادی۔)

ابن زید نے کہا ہے: انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس یہودیوں نے انہیں فریب

1۔ بخاری شریف، باب فرض الجمعۃ، حدیث نمبر 827، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(حیرت انگیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے انہیں رب بنا لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کی راہنمائی فرمائی تو انہوں نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ قرار دیا۔

فراء نے کہا ہے: اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ علامہ طبری نے اسے پسند کیا ہے۔ انہوں نے کہا: تقدیر عبارت یہ ہے فھدی اللہ الذین آمنوا للحق لما اختلفوا فیہ (پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تقدیر عبارت کی طرف انہیں اس خوف نے دعوت دی ہے کہ لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے حق کے بارے میں اختلاف کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اس بعض کے بارے میں راہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور اسی (خوف) نے فراء کو اس مفہوم کو حق (کے مفہوم) کے قریب کر دیا۔ علامہ طبری نے بھی فراء سے بیان کرنے میں اسی کا قصد کیا ہے۔ اور رہا کتاب اللہ کے الفاظ پر بغیر ضرورت کے قلب کا دعویٰ کرنا تو اس کی طرف دیکھنے والے کا قصور نظری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام اپنی ذات اور وصف پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فھدی تقاضا کرتا ہے کہ بلاشبہ وہ حق تک پہنچ گئے اور فیہ کے کلمہ میں معنی مکمل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے قول من الحق سے اس جنس کی وضاحت کی ہے جس میں اختلاف واقع ہوا۔

مہدوی نے کہا ہے: لفظ اختلاف کو اہتماماً لفظ حق پر مقدم ذکر کیا گیا ہے جبکہ مقصود صرف اختلاف کا ذکر کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ قوی نہیں ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں ہے لما اختلفوا عنہ من الحق یعنی عن الاسلام۔ یعنی اسلام سے اختلاف کیا۔ اور باذنہ کے بارے زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے بعلمہ۔ یعنی اس کے علم کے ساتھ۔

نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے۔ اور اس کا معنی ہے بامرہ۔ یعنی اس کے حکم کے ساتھ۔ اور جب تو نے کسی شے کے بارے اجازت دی (تو اس کا مفہوم ہے) تحقیق تو نے اس کے بارے حکم دے دیا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہنمائی فرمائی کہ انہیں ایسی چیزوں کے بارے حکم فرمایا جن کے مطابق ان کے لئے عمل کرنا واجب ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ میں معتزلہ کے اس قول کا رد ہے کہ بندہ اپنی ذات کی ہدایت و راہنمائی کا اہتمام خود کرتا ہے (یعنی یہ بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔)

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۝

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں پہنچی انہیں تنگی اور مصیبت اور وہ ہلا ڈالے گئے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا)

رسول اور جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو! یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ میں حَسِبْتُمْ بمعنی ظننتم (تم نے گمان کیا) ہے۔ حضرت قتادہ، سدی اور اکثر مفسرین نے کہا: یہ آیت غزوہ خندق کے دوران نازل ہوئی جب کہ مسلمانوں کو مشقت، شدت، گرمی، سردی، تنگی اور تکلیف وہ زندگی اور طرح طرح کی تکالیف اور مصائب آ پہنچے اور ان کی کیفیت یہ ہوگئی جیسا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا: وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (الاحزاب: ۱۰) (اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔)

اور بعض نے کہا ہے: یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی۔ اس کی مثل آل عمران میں بھی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (آل عمران: ۱۴۲) (کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے۔)

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت مہاجرین کو تسلی اور حوصلہ دینے کے لئے نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے گھر اور اپنے اموال مشرکین کے ہاتھوں چھوڑ دیئے اور اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے ترجیح دی اور یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت کا اظہار کیا اور اغنیاء اور مالدار لوگوں میں سے کچھ نے اپنے باطن میں نفاق پیدا کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پاک کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

اس آیت میں اَمْ منقطعہ بمعنی بَلْ ہے۔ اور بعض اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کبھی اَمْ الف استفہام کے بدلے بھی آتا ہے تاکہ اس سے کلام کی ابتدا کی جائے اور حَسِبْتُمْ دو مفعولوں کو چاہتا ہے، اسی لئے نحویوں نے کہا ہے: اَنْ تَدْخُلُوا قائم مقام دو مفعولوں کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفعول ثانی محذوف ہے: یعنی أحسبتم دخولکم الجنّة واقعاً اور لَمَّا بمعنی لَمْ ہے اور مَثَلُ بمعنی شبہ ہے۔ یعنی اس طرح کے امتحان میں تمہیں نہیں ڈالا گیا جس طرح انہیں آزمایا گیا جو تم سے پہلے تھے۔ پس تم صبر کرو جیسا کہ انہوں نے صبر کیا۔

نضر بن شمیل نے بیان کیا ہے کہ مَثَلُ بمعنی صفة ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو: اور ابھی تک تمہیں اس طرح کی مصیبت اور شدت نہیں پہنچی جس طرح کی آزمائش ان لوگوں پر آئی جو تم سے پہلے تھے۔

وہب نے کہا ہے: مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ستر انبیاء علیہم السلام مردہ حالت میں پائے گئے اور ان کی موت کا سبب بھوک اور جوئیں تھیں۔ اس آیت کی مثل یہ بھی ہے: الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (العنکبوت) (الف۔ لام۔ میم۔ کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کی دعوت دی اور اس پر ان سے نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ۝

اور الزلزلة سے مراد سخت حرکت دینا ہے۔ یہ اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور احوال میں بھی۔ کہا جاتا ہے: زلزل الله

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمائیے: جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں اور جو بھی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ اس آیت کریمہ میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس میں اگر ہمزہ کو تخفیف کر دیا جائے تو اس کی حرکت سین کو دے کر اسے مفتوح پڑھا جائے اور ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو تو اسے پڑھے گا: يَسَلُوْنَكَ۔

یہ آیت حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ شیخ کبیر (بہت زیادہ بوڑھے) تھے۔ تو عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! بلاشبہ میرا مال کثیر اور بہت زیادہ ہے تو میں اسے کیونکر صدقہ کروں اور کس پر خرچ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ ارشاد باری تعالیٰ: مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں ما مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور ذا خبر ہے اور یہ بمعنی الذی ہے۔ اور اسم کی طوالت کے سبب اس سے ھاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے: ما الذی ینفقونہ اور اگر تو چاہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما ینفقون کے سبب محل نصب میں ہو۔ اور ذا ما کے ساتھ مل کر ایک شے کے قائم مقام ہے تو (اس صورت میں) ضمیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جب یہ اسم مرکب ہے تو پھر یہ محل نصب میں ہوگا۔ بخلاف شاعر کے اس قول کے:

وما ذا عسی الواشون ان یتحدثوا
سوی ان یقولوا اننی لک عاشق

(چغلی کھانے والوں کے پاس بات کرنے کے لئے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ کہیں: میں تیرا عاشق ہوں۔)

کیونکہ عسیٰ اس میں عمل نہیں کر رہا، پس ماذا مرکب کلمہ ہے اور محل رفع میں ہے کیونکہ ذا کا کوئی صلہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کہا گیا ہے کہ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ اور معنی یہ ہے: "وہ آپ سے پوچھتے ہیں کونسی وجوہ (اور اسباب) ہیں جن میں وہ مال خرچ کر سکتے ہیں اور جو مال خرچ کرنا لازم ہو وہ اسے کہاں رکھیں؟"

سدی نے کہا ہے: یہ آیت زکوٰۃ فرض ہونے سے پہلے نازل ہوئی، پھر فرض زکوٰۃ نے اسے منسوخ کر دیا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: مہدوی کو سدی کے بارے میں اس مسئلہ میں وہم ہوا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف یہ قول منسوب کر دیا کہ انہوں نے کہا: یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہے اس سے والدین کا حکم منسوخ ہو گیا۔

ابن جریج وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت مستحب صدقہ کے بارے میں ہے اور زکوٰۃ اس انفاق کے سوا ہے۔

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 60

پس اس قول کی بنا پر اب اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور یہ نفلی صدقہ کے مصارف کو بیان کر رہی ہے۔ پس خوشحال اور غنی آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے محتاج اور فقیر والدین پر اتنا مال خرچ کرے جو ان دونوں کی ان کی حالت کے مطابق اصلاح کر سکے (اور ان کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔) مثلاً کھانا، لباس اور دیگر ضروریات حیات۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے: بیٹے پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ کی شادی کرائے۔ البتہ یہ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے باپ کی بیوی کو خرچہ مہیا کرے چاہے وہ اس کی اپنی ماں ہو یا اجنبی عورت ہو۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اپنے باپ کی شادی کرانا لازم نہیں کیونکہ آپ کے پیش نظر یہ ہے کہ وہ (باپ) اکثر شادی سے مستغنی ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسے اس کی شدید حاجت ہو تو پھر اس کی شادی کرانا بھی اس پر واجب ہے۔ اگر اس طرح نہ ہو تو پھر اس پر یہ واجب کیا جاتا کہ وہ دونوں (یعنی باپ اور اس کی بیوی) پر خرچ کرے۔ اور عبادات میں سے وہ جو اموال سے تعلق رکھتی ہیں تو (بیٹے پر) لازم نہیں ہے کہ وہ اسے اتنا مال دے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا اور یا جہاد پر جا سکتا ہو۔ البتہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ باپ کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرے، کیونکہ صدقہ فطر نفقہ اور اسلام کی شرط کے ساتھ ضروری ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ۔ اس میں اَنْفَقْتُمْ کی وجہ سے مَآ محل نصب میں ہے۔ اور اسی طرح وَمَا تُنْفِقُوْا میں بھی ہے۔ اور یہ شرط ہے اور جواب شرط فَلِلْوَالِدَيْنِ ہے۔ اسی طرح وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ شرط ہے اور اس کا جواب فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ہے۔ یتیم، مسکین اور ابن سبیل کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (الروم: 39)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یَفْعَلُوْا یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ آیت کا ظاہر تو خبر ہے، حالانکہ یہ جزا کے معنی کو متضمن ہے (1)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

”فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ارشاد تعالیٰ: کُتِبَ اس کا معنی ہے: ”فرض کیا گیا ہے“۔ اس کی مثل پہلے گزر چکا ہے۔ ایک قوم نے اس کی قرأت کَتَبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ کی ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

كتب القتل والقتال علينا … وعلى الغانيات جر الذيول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 279

ہمارے اوپر جنگ وقتال فرض کیا گیا ہے اور حسن وجمال والیوں پر (فقط کپڑوں کے) دامنوں کو کھینچنا۔

یہ جہاد کی فرضیت کا ذکر ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے: یہ وہی ہے جس کے ساتھ انہیں آزمایا گیا ہے اور اسے جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس میں قتال سے مراد کفار دشمنوں کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا علم انہیں قرائن احوال سے ہوا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ جتنی مدت مکہ مکرمہ میں قیام پذیر رہے۔ آپ ﷺ کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی اور جب آپ ہجرت فرما ہوئے تو پھر آپ کو اجازت فرما دی گئی کہ مشرکین میں سے جو کوئی آپ کے خلاف جنگ کرے آپ اس کے ساتھ مقابلہ کریں اور جنگ لڑیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (الحج: 39) (اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم کیا گیا) پھر آپ کو تمام مشرکین کے ساتھ جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرما دی گئی (1)۔ اور علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مراد کون ہیں۔

تو ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں مراد صرف حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ پس ان پر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں جنگ کرنا فرض عین تھا۔ پھر جب شریعت مضبوط ہوگئی اور قرار پکڑ گئی تو جہاد فرض کفایہ ہو گیا۔ حضرت عطا اور امام اوزاعی نے یہی کہا ہے۔

ابن جریج نے بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت عطا کو کہا: کیا اس آیت کے مطابق لوگوں پر جہاد کرنا واجب (فرض عین) ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلاشبہ یہ ان (صحابہ کرام) پر فرض کیا گیا تھا۔ اور امت میں سے جمہور نے کہا ہے کہ جہاد کی پہلی فرضیت ہی فرض کفایہ تھی نہ کہ فرض عین مگر یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ جب انہیں جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دیتے تھے تو ان پر اس کے لئے نکلنا لازم ہو جاتا کیونکہ آپ ﷺ کی اطاعت وپیروی واجب (فرض عین) ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جس پر مسلسل اجماع رہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے ہر فرد پر جہاد فرض کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں میں سے کچھ افراد یہ فریضہ ادا کر دیں تو باقیوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر دشمن (حملہ آور ہو کر) دارالاسلام میں داخل ہو جائے تو اس وقت جہاد فرض عین ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ البراءۃ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور مہدوی وغیرہ نے حضرت ثوری سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: جہاد تطوع ہے (یعنی نفلی عبادت ہے اس میں رضا کارانہ طور پر شامل ہوا جاتا ہے۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ عبارت کسی سائل کے سوال کے جواب میں کہی گئی ہے۔ تحقیق اس نے جہاد کی تعیین کے بارے سوال کیا تو اسے کہا گیا: ذٰلک تطوع (کہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بلاتکلف اطاعت کی جاتی ہے۔)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ یہ مبتدا اور خبر ہے (اور محل ہے) اور وہ محل جر میں نا پسند ہے۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: الکُرْہ کا معنی مشقت ہے۔ اور الکَرْہ فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی وہ عمل ہے جس پر تجھے مجبور کیا

1۔ تفسیر ماوردی، زیر آیت ہذا

جائے۔ یہی پسندیدہ مفہوم ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بالضم (الکرہ) کا معنی بالفتح (الکرہ) کی مثل ہو۔ پس یہ دونوں لغتیں ہو سکتی ہیں۔ کہا جاتا ہے: کرھت الشیء کرھا و کرھا و کراھۃ و کراھیۃ (میں نے شے کو ناپسند کیا) اور اکرھتہ علیہ اکراھا (میں نے اسے اس پر مجبور کیا۔)

بلاشبہ جہاد ایک مشقت ہے۔ کیونکہ اس میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، وطن اور اہل و عیال کو چھوڑنا ہوتا ہے اور اپنے جسم کو زخم کھانے، اعضائے بدن کو کٹوانے اور اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے۔ سو ان کی ناپسندیدگی کا سبب یہی ہے نہ کہ یہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرض کو ناپسند کیا۔

حضرت عکرمہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک (پہلے) انہوں نے اسے ناپسند کیا اور پھر اسے پسند کرنے لگے اور کہا: سمعنا و اطعنا، ہم نے حکم سنا اور اطاعت و پیروی کے لئے سر تسلیم خم کر لیا (1)۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ حکم کی پیروی مشقت کو متضمن ہوتی ہے۔ لیکن جب ثواب معلوم ہو جائے تو اس کے ضمن میں مشقتوں کو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: دنیا میں اس کی مثال اس شے کو زائل کرنا ہے جو انسان کو تکلیف دیتی ہے، درد پہنچاتی ہے، اور وہ اس سے ڈرتا ہے جیسا کہ کسی عضو کو کاٹنا، داڑھ کو نکالنا اور فصد کروانا اور پچھنے لگوانا تاکہ درد اور تکلیف سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور صحت قائم رہ سکے۔ اور دار الخلد (جنت) میں دائمی حیات سے اور مقعد صدق میں عزت و کرامت سے افضل و اعلیٰ کوئی نعمت نہیں۔

مسئلہ نمبر3۔ قول باری تعالیٰ ہے: **وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا**۔ کہا گیا ہے کہ عسٰی بمعنی قد ہے۔ الاصم نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے واجبۃ (یعنی ضروری اور لازم ہونا) اور پورے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے لفظ عسٰی واجبۃ کے معنی میں ہے (یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو پھر اس میں شک کا معنی نہیں ہوتا بلکہ بالیقین ثابت ہونے کا معنی ہوتا ہے۔) سوائے اس ارشاد گرامی کے: **عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ** (التحریم: 5) (کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔)

ابو عبیدہ نے کہا ہے: عسٰی کا لفظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایجاب کے لئے ہے اور معنی یہ ہے: ہو سکتا ہے کہ تم جہاد میں پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اس اعتبار سے کہ اس میں تمہیں غلبہ دے دیا جائے، تم کامیابی سے ہمکنار ہو، تم مال غنیمت حاصل کرو اور تمہیں اجر و ثواب بھی دیا جائے گا۔ اور اس دوران جو فوت ہو اسے شہادت کی موت نصیب ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم جہاد چھوڑنے اور ترک کر دینے کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں برا ہو اس اعتبار سے کہ تم پر غلبہ پا لیا جائے، تمہیں ذلت و رسوائی پر مجبور کر دیا جائے اور تمہارے اختیارات اور حکومت ختم کر دی جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح اور درست ہے، اس پر کوئی غبار اور شک و شبہ نہیں۔ جیسا کہ بلاد اندلس میں اتفاق ہوا ہے،

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یَسْـَٔلُوْنَكَ اس لفظ کے بارے گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ جریر بن عبدالحمید اور محمد بن فضیل نے عطاء بن سائب سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے زیادہ بہتر قوم کوئی نہیں دیکھی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تیرہ مسائل کے بارے سوال کیا اور وہ تمام کے تمام قرآن کریم میں موجود ہیں۔

مثلاً یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ اور یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى اور وہ سوال نہ کرتے تھے مگر ایسی شے کے متعلق جو ان کے لئے نفع بخش ہوتی تھی۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: تیرہ مسئلوں میں سے سوائے تین کے حدیث طیبہ میں کوئی نہیں ہے۔

ابوالیسار نے جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جتھہ بھیجا اور ان پر ابوعبیدہ بن حارث یا عبیدہ بن حارث کو امیر مقرر کیا۔ پس جب وہ روانہ ہونے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرط محبت سے فریفتہ ہو کر رونے لگے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو (امیر بنا کر) بھیج دیا اور انہیں ایک خط لکھ کر عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اس خط کو کھول کر نہ پڑھیں یہاں تک کہ وہ فلاں فلاں جگہ تک پہنچ جائیں اور ارشاد فرمایا: اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو سفر پر مجبور نہ کرنا۔ پس جب وہ اس مقررہ جگہ پر پہنچے تو خط پڑھا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور کہا: سمعا و طاعۃ للہ و لرسولہ (کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور خوشنودی کے لئے حکم کی تعمیل میں دل و جان حاضر ہے۔)

راوی کا بیان ہے: دو آدمی واپس لوٹ آئے اور باقی افراد ان کے ساتھ آگے چلے گئے۔ چنانچہ ان کی ملاقات ابن حضرمی سے ہوئی تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور انہیں اس کا علم نہ تھا کہ آج رجب کا پہلا دن ہے تو اس پر مشرکین نے کہا: تم نے شہر حرام میں قتل کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیہ(1)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ روایت بھی ہے کہ بنی کلاب کے دو آدمی عمرو بن امیہ ضمری سے ملے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے اور وہ دن رجب کا پہلا دن تھا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ تب قریش نے کہا: اس نے ان دونوں کو شہر حرام (حرام مہینے) میں قتل کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

لیکن اس آیت کے سبب نزول میں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا واقعہ کثیر اور زیادہ مشہور ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نو افراد کے گروہ کے ساتھ بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آٹھ افراد کے ساتھ غزوۂ بدر سے دو ماہ پہلے جمادی الآخر میں بھیجا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رجب میں بھیجا تھا۔

ابو عمر نے کتاب الدرر میں اس کے بارے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرز بن جابر کی تلاش سے واپس لوٹ کر آئے۔ اس غزوہ کو بدر اولیٰ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمادی الثانی کے بقیہ ایام اور رجب کا مہینہ مدینہ طیبہ میں ہی قیام فرما

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 656-655

رہے اور رجب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش بن رئاب الاسدی کو بھیجا اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد اور بھی تھے۔ اور وہ یہ تھے ابو حذیفہ بن عتبہ، عکاشہ بن محصن، عتبہ بن غزوان، سہیل بن بیضا فہری، سعد بن ابی وقاص، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ تمیمی اور خالد بن بکیر لیثی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اسے کھول کر نہ دیکھیں یہاں تک کہ وہ دو دن سفر کر لیں، پھر اسے کھول کر پڑھیں۔ پس آپ نے وہی کچھ کیا جس طرح کرنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا۔ اور آپ اپنے صحابہ میں سے کسی کو مجبور نہ کریں اور آپ ان کے امیر تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا جیسے آپ نے حکم ارشاد فرمایا تھا۔ پس جب آپ نے خط کھولا اور اسے پڑھا تو اس میں پایا کہ جب تو میرے اس خط میں دیکھے تو پھر اس پر عمل کرنا یہاں تک کہ تو مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پر اترے اور وہاں قریش کی تاک میں رہنا اور ہمیں ان کی خبروں کے بارے آگاہ کرنا۔ اذا نظرت فی کتابی هذا فامض حتى تنزل نخلة بين مكة والطائف فترصد بها قريشا، وتعلم لنا من أخبارهم۔

پس جب آپ نے تحریر پڑھی تو کہا: سمعاً و طاعة (دل و جان سے تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہیں) پھر اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بارے آگاہ کیا اور اس کے بارے بھی کہ وہ ان میں سے کسی کو مجبور نہ کریں گے اور یہ کہ وہ آپ کی خوشنودی کے لئے انہیں ساتھ لے کر جائیں گے جنہوں نے آپ کی اطاعت کی اور یہ کہا اگر کسی نے بھی آپ کی اطاعت نہ کی تو پھر وہ اکیلے ہی آگے بڑھیں گے۔ پس جو کوئی شہادت کو پسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ (آگے بڑھنے کے لئے) اٹھے اور جو فانی موت کو ناپسند کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ تو ساتھیوں نے جواب دیا: ہم تمام کے تمام اس (کام) میں رغبت رکھتے ہیں جس میں آپ رغبت رکھتے ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل کے لئے دل و جان سے حاضر ہے۔ اور وہ سارے آپ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور حجاز کی طرف چل پڑے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ بھاگ گیا وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے اور اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں سمیت آگے چلے گئے یہاں تک کہ مقام نخلہ پر جا کر اترے تو وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرا جو کشمش اور دیگر سامان تجارت اٹھائے ہوئے تھا اور اس میں عمرو بن حضرمی تھا۔ حضرمی کا نام عبداللہ بن عباد ہے جو صدف سے تعلق رکھتا تھا اور صدف حضرموت کا ایک قبیلہ ہے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی اور حکم بن کیسان مولیٰ بنی مغیرہ بھی شامل تھے۔ پس مسلمانوں نے باہمی مشاورت کی اور کہا: ہم شہر حرام رجب کے آخری دن میں ہیں، پس اگر ہم ان سے قتال کرتے ہیں تو ہم شہر حرام کی حرمت کو پامال کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور اگر ہم انہیں آج رات چھوڑ دیتے ہیں تو پھر وہ حرم پاک میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ان کے ساتھ لڑنے پر اتفاق کر لیا اور واقد بن عبداللہ تمیمی نے تیر مارا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا اور نوفل بن عبداللہ بھاگ گیا۔ پھر سامان سے لدے ہوئے اونٹ اور دو قیدیوں کو ساتھ لے آئے اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: جو مال غنیمت ہم نے حاصل کیا ہے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خمس علیحدہ کر دو۔ پس انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسلام میں پہلا خمس

بھی تھا۔ پھر قرآن کریم نازل ہوا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیہ (اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ) (الانفال: ۴۱)

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے فعل کو برقرار رکھا اور اسے پسند کیا اور یوم قیامت تک اسے امت کے لئے سنت قرار دیا۔ یہی پہلی غنیمت ہے جو اسلام میں حاصل ہوئی اور (حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ) پہلے امیر ہیں اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر حرام میں ابن حضرمی کے قتل کو ناپسند کیا اور اس معاملہ کو توقف پر چھوڑ دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ تا قولہ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں قیدیوں کا فدیہ قبول کر لیا۔

پھر عثمان بن عبداللہ حالت کفر میں ہی مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اور حکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہی رہے یہاں تک کہ انہوں نے بئر معونہ میں جام شہادت نوش کیا اور حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما صحیح سالم مدینہ طیبہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہ کا اپنے اونٹ کی تلاش میں جانا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی اجازت سے تھا۔ اور عمرو بن حضرمی اور اس کے ساتھیوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا تو وہ ان سے خوفزدہ ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک یہ قوم تم سے خوفزدہ ہو کر گھبرا گئی ہے، پس تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور پھر اسے چاہئے کہ وہ ان کے پاس چلا جائے۔ پس جب انہوں نے اسے دیکھا جس کا سر مونڈا ہوا تھا تو وہ امن میں ہو گئے اور کہنے لگے: یہ قوم عمار ہے تم پر کوئی حرج اور خطرہ نہیں ہے اور پھر انہوں نے ان کے قتال کے بارے میں باہمی مشاورت کی۔ الحدیث۔

یہودیوں نے فال نکالی اور کہا: واقد سے مراد وقدت الحرب ہے یعنی جنگ بھڑک اٹھی اور عمرو سے مراد عمرت الحرب ہے یعنی جنگ قائم ہو گئی اور حضرمی سے مراد حضرت الحرب ہے جنگ شروع ہو گئی۔

اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم ان دونوں کا فدیہ قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ حضرت سعد اور حضرت عتبہ رضی اللہ عنہما آ جائیں اور اگر وہ دونوں نہ آئے تو ہم ان دونوں کو ان کے بدلے قتل کر دیں گے۔ پس جب وہ دونوں آ گئے تو ان دونوں نے فدیہ ادا کر دیا۔ پھر حکم نے تو اسلام قبول کر لیا اور مدینہ طیبہ میں ہی مقیم ہو گیا یہاں تک کہ غزوہ بئر معونہ میں شہید کر دیا گیا۔ رہا عثمان! تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ گیا اور وہیں حالت کفر میں مر گیا اور رہا نوفل! تو وہ غزوہ احزاب کے دن اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ خندق کو عبور کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے تو وہ اپنے گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور وہ دونوں کے اعضائے بدن ٹوٹ گئے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا۔ مشرکین نے اس کا مردہ جسم ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم اسے اٹھا لو کیونکہ اس کا مردہ بدن بھی ناپاک ہے اور اس کی دیت بھی ناپاک ہے" فهو خبيث الجيفة خبيث الدية یہی اس ارشاد باری تعالیٰ کے

نزول کا سبب ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ الآیۃ۔

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حضرمی کا قتل رجب کے آخری دن میں ہوا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور طبری نے سدی وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جمادی الثانی کے آخری دن قتل ہوا۔ لیکن پہلا قول زیادہ مشہور ہے۔ اسی بنا پر کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ رجب کی پہلی رات میں ہوا اور مسلمان اسے جمادی الثانی میں سے گمان کرتے تھے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ صاحب بن عباد نے اپنے رسالہ المعروف بالاسدیہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس وقت امیر المومنین کا نام دیا گیا اس لئے کہ انہیں مومنین کی ایک جماعت پر امیر مقرر کیا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 2۔ علما کا اس آیت کے نسخ کے بارے اختلاف ہے، پس جمہور اس کے نسخ کے قائل ہیں اور یہ کہ اشہر حرم میں مشرکین کے ساتھ قتال کرنا مباح ہے۔ البتہ اس کے ناسخ کے بارے میں ان کا اختلاف ہے۔ زہری نے کہا ہے: اسے ارشاد باری تعالیٰ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً (التوبہ: ۳۶) (اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے) نے منسوخ کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر حرام میں بنی ثقیف کے ساتھ جنگ کرنے نے منسوخ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر کو شہر حرام میں اوطاس کی طرف جنگ کے لئے بھیجا تھا (لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس حکم کے لئے ناسخ ہے۔)

اور ایک قول یہ کیا گیا ہے: ذوالقعدہ کے مہینہ میں جنگ پر بیعت رضوان لینے نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب مکہ مکرمہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیئے جانے کی خبر پہنچی اور یہ کہ وہ (اہل مکہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے ان کے دفاع پر بیعت لی (کہ وہ ان کا مقابلہ پوری جرأت کے ساتھ کریں گے۔) نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت ان سے جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے لی۔

اور امام بیہقی نے عروہ بن زبیر سے محمد بن اسحاق کی حدیث کے علاوہ حضرمی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ الآیۃ۔ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ شہر حرام میں قتال اسی طرح حرام ہے جیسے پہلے تھا اور جس سبب سے مومنین اسے حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس (قتال) سے بڑا جرم ہے۔ وہ یہ کہ (کفار) انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے جائیں۔ وہ انہیں بیڑیاں پہنا دیتے ہیں، انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے اور ستاتے ہیں اور انہیں محبوس کر لیتے ہیں۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور مسلمانوں کو حج و عمرہ اور نماز کے لئے مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ مسجد حرام کے باسیوں کو باہر نکالتے ہیں حالانکہ اس کے مکین مسلمان ہیں اور دین کے بارے میں انہیں طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا رکھتے ہیں اور ہم تک یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حضرمی کے قتل کی دیت ادا فرمائی اور شہر حرام کو اسی طرح حرام قرار دیا جس طرح وہ انہیں حرام قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖۤ (التوبہ: 1) (یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) (1)

1۔ دلائل النبوۃ للبیہقی، جلد 3، صفحہ 17-18

حضرت عطا کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے اور اشہر حرام میں قتال جائز نہ ہوگا اور اسی پر حلف اٹھایا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد وارد ہونے والی آیات زمانے کے اعتبار سے عام ہیں اور یہ خاص ہے اور بالاتفاق عام خاص کے لئے ناسخ نہیں ہو سکتا۔

اور ابو الزبیر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ شہر حرام میں جنگ نہ کرتے تھے مگر یہ کہ آپ کے ساتھ جنگ کی جاتی۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قِتَالٍ فِيهِ۔ اس میں قتال سیبویہ کے نزدیک بدل اشتمال ہے، کیونکہ سوال مہینے اور قتال دونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کفار مہینے کی حرمت کو توڑنے پر تعجب کرتے ہوئے آپ سے سوال کر رہے ہیں۔ پس ان کا سوال شہر (مہینے) کے متعلق ہوا صرف اس لئے کہ اس میں قتال پایا گیا۔

زجاج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کے بارے سوال کرتے ہیں۔

اور قتبی نے کہا: وہ آپ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے پوچھتے ہیں: کیا یہ جائز ہے؟ پس اسی وجہ سے انہوں نے قتال کو شہر سے بدل قرار دیا ہے اور سیبویہ نے ایک شعر بھی بیان کیا ہے:

فما كان قيسٌ هلكُه هلكَ واحدٍ   و لكنه بنيانُ قومٍ تهدّما

قیس کا ہلاک ہو جانا ایک آدمی کا ہلاک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا ہلاک ہونا تو پوری قوم کے محل کے گر جانے کے مترادف ہے۔ (تو اس میں هلكه قیس سے بدل ہے۔)

عکرمہ نے اس طرح قراءت کی ہے: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قَتْلٍ فِيْهِ قُلْ قَتْلٌ یعنی دونوں مقامات پر (قتال کو) بغیر الف کے پڑھا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے میں اور اس میں جنگ کرنے کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یعنی يسألونك عن الشهر الحرام وعن قتال فيه) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح قراءت کی ہے۔ پس اس صورت میں قتال، عن مکرر کی وجہ سے مجرور ہوگا۔ کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ قتال مجرور ہے کیونکہ اس سے پہلے عن۔ نیۃً موجود ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ قتال جوار کی بنا پر مجرور ہے۔ (یعنی چونکہ یہ مجرور کے پڑوس میں ہے جو کہ الشهر الحرام ہے، اس لئے اس کا اعراب اسے بھی دے دیا گیا ہے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں کسی لفظ کو حق جوار کی بنا پر کوئی اعراب دے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کلام میں ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ محض جوار کا اعتبار غلط ہے اور جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہ شاذ ہے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے: هذا جحر ضب خرب اور اس کے غلط ہونے پر دلیل تثنیہ میں عربوں کا یہ قول ہے: هذان جحرا ضب خربان بلاشبہ یہ اقواء (شعر کے قافیہ کو مختلف کرنا یعنی کسی کو رفع دینا اور کسی کو جر دینا) کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا یہ جائز نہیں ہوگا کہ کتاب اللہ میں سے کسی شے کو اس پر محمول کیا جائے اور افصح اور اصح لغات کے سوا اس طرح نہیں ہو سکتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ حق جوار کی بنا پر مجرور ہے، ان کا یہ قول خطا ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ عن کا مضمر کرنا جائز نہیں ہے اور اس بارے میں یہ قول کہ یہ بدل ہے (بھی جائز نہیں)

اعرج نے قتال کو مرفوع پڑھا ہے یعنی یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ

نحاس نے کہا ہے: یہ عربی میں ابہام اور پیچیدگی ہے اور اس میں معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے شہر حرام کے بارے سوال کرتے ہیں کیا اس میں قتال جائز ہے؟ اور ارشاد باری تعالیٰ یَسْئَلُوْنَكَ استفہام پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أصاحِ ترى برقًا أريك وميضه ... كلمع اليدين في حبيٍّ مكلّلِ

اے میرے ساتھی! کیا تو اس بجلی کو دیکھ رہا ہے جس کی چمک تجھے دکھائی گئی اونچے بادلوں کی چمک میں دونوں ہاتھوں کی جنبش (حرکت) کی طرح۔

تو اس میں تری سے پہلے الف استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اصاح کا الف اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ حرف ندا ہے۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے:

تروح من الحي أم تبتكر

کیا تو قبیلے سے شام کے وقت جائے گا یا صبح کے وقت۔

تو اس میں بھی اصل عبارت اتروح ہے، ہمزہ استفہام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ ام اس پر دلالت کر رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ۔ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی اس میں قتال کرنا انتہائی ناپسندیدہ اور بڑا عمل ہے۔ کیونکہ شہر حرام میں قتال کو حرام قرار دینا اس وقت ثابت ہے جبکہ ابتدا مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ آیت میں الشھر اسم جنس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عربوں کے لئے شہر حرام کو قوام بنا دیا تھا، وہ اس دوران اعتدال پر رہتے تھے، وہ خون نہیں بہاتے تھے اور نہ ہی اشہر حرام میں غارتگری کرتے تھے۔ اشہر حرام سے مراد رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہیں۔ ان میں تین مسلسل اور لگاتار ہیں اور ایک منفرد ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قول باری تعالیٰ: وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مبتدا ہے اور وَكُفْرٌۢ بِهٖ، صَدٌّ پر معطوف ہے۔ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا سبیل اللہ پر عطف کیا گیا ہے۔ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ بھی صَدٌّ پر معطوف ہے۔ اور مبتدا کی خبر اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ہے۔ یعنی مذکورہ افعال کرنا شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑے گناہ ہیں۔ یہ قول مبرد وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ اس میں لوگوں کو طویل عرصہ تک کعبہ معظمہ کا طواف کرنے سے روکنا ہے۔ اور وَكُفْرٌۢ بِهٖ میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو سکتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد ہے بالحج والمسجد الحرام۔ یعنی حج اور مسجد حرام میں کفر کا ارتکاب کرنا۔ اور وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ یعنی وہاں سے باسیوں کو نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی بڑا جرم اور گناہ ہے (اور اس کی سزا زیادہ ہے)۔

فراء نے کہا ہے: صَدٌّ کا عطف كَبِيْرٌ پر کیا گیا ہے اور وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِهٖ کی ضمیر پر کیا گیا ہے۔ تو یہ کلام عطف نسق اور متصل ہے منقطع نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ غلطی ہے کیونکہ معنی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وکفر بہ کے بعد ای باللہ کا عطف بھی کھینچ پر کر دیا جائے۔ اور اس سے یہ معنی ظاہر ہوگا کہ اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور بین ہے۔

جمہور کے قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے: اے کفار قریش! باقی تم ہمارے بارے میں شہر حرام میں جنگ کرنے کو بہت بڑا جرم سمجھتے ہو حالانکہ جو کچھ تم کر رہے ہو یعنی جو کوئی اسلام قبول کرنے کا ارادہ کرے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، تمہارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور تمہارا اہل مسجد کو مسجد سے نکالنا، جیسا کہ تم نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے ساتھ کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے زیادہ اور بڑا جرم ہے (1)۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

تعدون قتلا في الحرام عظيمة   واعظم منه لو يرى الرشد راشد

تم ماہ حرام میں قتل کو بڑا گناہ شمار کرتے ہو حالانکہ اگر کوئی ہدایت یافتہ راہ ہدایت کو دیکھے تو اس سے بھی بڑے گناہ یہ ہیں:

صدودكم عما يقول محمد   وكفر به والله راء و شاهد

محمد (ﷺ) کے ارشادات سے تمہاری مخالفت اور آپ سے کفر، اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور اس کا گواہ ہے۔

واخراجكم من مسجد الله اهله   لئلا يرى لله في البيت ساجد

اور تمہارا اللہ کی مسجد سے اس میں بسنے والوں کو نکال دینا تاکہ بیت اللہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی سجدہ کرنے والا نظر نہ آئے۔

فانا وان عيرتمونا بقتله   وارجف بالاسلام باغ و حاسد

اگرچہ تم نے ہمیں قتل کی عار دلائی اور سرکش اور حسد کرنے والوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا۔

سقينا من ابن الحضرمي رماحنا   بنخلة لما اوقد الحرب واقد

لیکن ہم نے وادی نخلہ میں ابن حضرمی کے خون سے اپنے نیزوں کو سیراب کیا جب واقد نے جنگ کی آگ بھڑکائی

دما وابن عبدالله عثمان بيننا   ينازعه غل من القيد عاند

عثمان بن عبداللہ ہمارے پاس ہے، تسمے کے خون آلود طوق نے اسے جکڑ رکھا ہے۔

زہری اور مجاہد وغیرہما نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ ارشاد ہے: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً اور فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ (توبہ: 5)۔

حضرت عطا نے کہا ہے: یہ منسوخ نہیں ہے اور اشہر حرام میں قتال نہیں کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ مجاہد وغیرہ نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے۔ یعنی تمہارا کفر کرنا ہمارے انہیں قتل کرنے سے بڑا جرم ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290

جمہور نے کہا ہے: یہاں فتنہ سے مراد ان (کفار) کا مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کرنا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو گئے یعنی تمہارا یہ رویہ اختیار کرنا شہر حرام میں تمہیں قتل کرنے سے زیادہ شدید اور سخت جرم ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُوْنَ۔ یہ ابتداءً اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر ہے اور اس کے ذریعہ مومنین کو کافروں کے شر سے ڈرانا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں اور يَرُدُّوْكُمْ حَتّٰى کے سبب منصوب ہے، کیونکہ یہ غایت ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّرْتَدِدْ اور جو کوئی اسلام سے کفر کی جانب لوٹ جائے۔ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ تو ان کے عمل باطل ہو گئے اور فاسد ہو گئے۔ اسی سے الحبط بھی ہے۔ مراد وہ بیماری ہے جو جانوروں کے پیٹوں میں بہت زیادہ گھاس اور چارہ وغیرہ کھا جانے سے لگ جاتی ہے۔ اس کے سبب ان کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور بسا اوقات اسی سبب سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے بطور تہدید ہے تاکہ وہ دین اسلام پر ثابت قدم رہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ علماء کے مابین مرتد کے بارے یہ اختلاف ہے کہ کیا اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی یا نہیں؟ کیا محض ردت کے ساتھ ہی اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں یا نہیں؟ مگر یہ کہ اس کی موت کفر پر واقع ہو؟ کیا اسے وارث بنایا جائے گا یا نہیں؟ یہ تین مسائل ہیں۔

(1) ایک گروہ نے کہا ہے: اسے توبہ کی ترغیب دی جائے گی، پس اگر وہ توبہ کر لے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا ہے: ایک ساعت ترغیب دی جائے گی اور دوسروں نے کہا ہے: ایک مہینہ تک اسے توبہ کی رغبت دلائی جائے گی اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اسے تین (بار) توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہی قول حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جسے آپ سے ابن قاسم نے روایت کیا ہے۔

حسن نے کہا ہے: اسے سو بار توبہ کی ترغیب دلائی جائے گی اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ اسے توبہ کی رغبت دلائے بغیر ہی قتل کر دیا جائے گا۔ امام شافعی نے بھی اپنے ایک قول میں یہی کہا ہے اور یہی طاؤس اور عبید بن عمیر کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

سحنون نے ذکر کیا ہے کہ عبد العزیز بن ابی سلمہ ماجشون کہا کرتے تھے: مرتد کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی اور انہوں نے حضرت معاذ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان کے پیچھے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا: تشریف رکھیے اور ان کے لئے تکیہ وغیرہ رکھا۔ تو اس وقت ان کے پاس ایک آدمی تھا جسے زنجیر پہنائی گئی تھی تو آپ نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ یہودی تھا اس نے اسلام قبول کیا اس نے پھر اپنے دین کو برے دین کی طرف لوٹا دیا ہے اور یہ یہودی ہو گیا ہے۔ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 290۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 659

بیٹھ جائیے۔ انہوں نے کہا: (ہاں) میں نہیں بیٹھوں گا یہاں تک کہ اسے قتل کر دیا جائے، یہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا فیصلہ ہے۔ تین بار آپ نے یہی کہا۔ چنانچہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے حکم دیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ یہ روایت امام مسلم وغیرہ نے بیان کی ہے۔(1)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مرتد پر اسلام پیش کیا جائے گا، اگر وہ اسلام قبول کر لے تو فبہا، ورنہ اسی جگہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ مہلت کا مطالبہ کرے۔ پس اگر اس نے مہلت کا مطالبہ کیا تو اسے تین دن کی مہلت دی جائے گی، لیکن آپ سے اور آپ کے اصحاب سے مشہور قول یہ ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے، ان کے نزدیک زندیق اور مرتد برابر ہیں۔ اور امام مالک نے کہا ہے کہ زندیق کو قتل کیا جائے گا اور اسے توبہ کی ترغیب نہیں دی جائے گی۔ یہ پہلے سورۃ البقرہ (ج ۱ ص: ۱۹۸) میں گزر چکا ہے۔

جو کوئی کفر کی ایک نوع سے نکل کر کفر کی ہی دوسری نوع میں داخل ہوا تو اس کے بارے علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور فقہاء نے کہا ہے: اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، کیونکہ اس طرح وہ اسی کفر کی طرف ہی منتقل ہوا ہے جس پر وہ ابتداء میں تھا، لہٰذا اسے اسی پر برقرار رکھا جائے گا۔ ابن عبد الحکم نے حضرت امام شافعی سے بیان کیا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من بدل دینه فاقتلوه جو کوئی اپنا دین بدل دے تم اسے قتل کر دو(2)۔ اور آپ نے کسی مسلمان کو کافر سے خاص نہیں کیا۔

امام مالک نے فرمایا ہے: حدیث کا معنی یہ ہے جو کوئی اسلام سے نکل کر کفر کی طرف جائے اور رہا وہ جو کفر سے کفر کی طرف نکلا تو وہ اس حدیث سے مراد نہیں۔ یہی فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے۔

امام شافعی سے مشہور قول وہ ہے جو مزنی اور ربیع نے ذکر کیا ہے کہ اہل ذمہ میں سے اپنا دین بدلنے والے کو امام وقت دار الحرب بھیج دے گا اور اسے اپنے شہر (ملک) سے نکال دے گا اور حربیوں کے اموال کے ساتھ اس کا مال بھی حلال ہو جائے گا اور دار الحرب پر غلبہ پا لیا گیا۔ کیونکہ امام وقت نے اسے اس دین کی بنا پر ذمی بنایا تھا جس پر وہ عقد ذمہ کے وقت تھا۔

مرتد عورت کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے:

امام مالک، امام اوزاعی، امام شافعی اور لیث بن سعد رحمہم اللہ نے کہا ہے: مرتد ہونے والی عورت کو قتل کر دیا جائے گا جیسا کہ مرتد آدمی کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں برابر ہیں۔ اور ان کی دلیل ظاہر حدیث ہے من بدل دینه فاقتلوه اور اس میں لفظ من مذکر و مؤنث دونوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔

امام ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہی ابن شبرمہ کا قول ہے، اسی کو ابن علیہ نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت عطا اور حسن کا قول ہے اور انہوں نے استدلال اس سے کیا ہے کہ

1۔ بخاری شریف، باب حکم المرتد و المرتدۃ، حدیث نمبر 6412، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب لا یعذب بعذاب اللہ، حدیث نمبر 2794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: من بدل دینہ فاقتلوہ۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا اور جو حدیث روایت کرتا ہے وہ اس کی تاویل اور مفہوم بہتر جانتا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے نیز آپ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اور پہلے فریق نے آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی استدلال کیا ہے: "کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے ایک کے ساتھ (یعنی) ایمان کے بعد کفر اختیار کرے ... الحدیث"۔ پس یہ حکم ہر اس آدمی کو شامل ہوگا جس نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا (چاہے وہ مرد ہو یا عورت) اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ امام شافعی نے کہا ہے: بے شک وہ آدمی جو مرتد ہوا (نعوذ باللہ) پھر اسلام کی طرف واپس آگیا تو نہ اس کے اعمال ضائع ہوں گے اور نہ ہی اس کا وہ حج ضائع ہوگا جس سے وہ فارغ ہو چکا۔ بلکہ اگر وہ حالت ردت پر ہی فوت ہو گیا تب اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

امام مالک نے فرمایا ہے: مرتد ہوتے ہی اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اختلاف کا ظہور مسلمان میں ہوگا کہ جب وہ حج کرے، پھر مرتد ہو جائے اور پھر اسلام قبول کر لے۔ پس امام مالک نے فرمایا کہ اس پر حج کرنا لازم ہوگا کیونکہ اس کا پہلا حج ردت کے سبب ضائع ہو چکا ہے۔ اور امام شافعی نے فرمایا: اس پر حج کا اعادہ لازم نہ ہوگا کیونکہ ابھی اس کے عمل باقی ہیں۔

ہمارے علماء نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: **لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ** (الزمر: 65) (اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے)

انہوں نے کہا: یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ ﷺ سے شرک اور ردت کا پایا جانا محال ہے۔

اور امام شافعی کے اصحاب نے کہا ہے: بلکہ امت پر بطریق تغلیظ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے شرف مرتبہ کے باوجود اگر شرک کا ارتکاب کریں تو ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے تو پھر تمہارا کیا حال ہوگا؟ لیکن آپ اپنے مرتبہ کے فضل و شرف کے سبب شرک نہیں کریں گے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: **يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ** (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیویو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔) وہ یہ ان کے شرف مرتبہ کے سبب ہے ورنہ ان سے اس قسم کے فعل کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ان کے زوج مکرم و معظم کی حفاظت و صیانت کی خاطر، یہ ابن عربی نے کہا ہے۔(1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی دونوں شرطوں کو پورا کرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر خلود فی النار کی جزا کو معلق کیا ہے۔ پس جو کوئی کفر پر قائم رہا اللہ تعالیٰ اس آیت کے مطابق اسے ہمیشہ کے لئے جہنم میں ڈال دے گا اور

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 147

جس کسی نے شرک کا ارتکاب کیا دوسری آیت کے مطابق اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ پس یہ دونوں آیتیں دو معنوں اور دو مختلف شخصوں کے لئے مفید ہیں اور جو خطاب آپ ﷺ کو کیا گیا ہے تو وہی آپ کی امت کے لئے ہے تاکہ آپ کا اختصاص ثابت ہو جائے اور جو آپ ﷺ کی ازواج مطہرات کے بارے وارد ہے تو بلاشبہ ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے تاکہ وہ یہ واضح کر دے کہ اگر ایسا تصور بھی کیا جائے تو یقیناً اس میں دو بے عزتیاں ہیں۔ ان میں ایک حرمت دین کی ہتک ہے اور دوسری حرمت نبی ﷺ کی ہتک ہے اور ہر حرمت کی ہتک پر عقاب (سزا) ہے۔ اور یہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا جس نے شہر حرام میں یا بلد حرام میں یا مسجد حرام میں گناہ و نافرمانی کا ارتکاب کیا اور جتنی حرمتوں کو اس نے پامال کیا ان کی تعداد کے مطابق اس پر عذاب دو چند کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 11۔ مرتد کی میراث میں علماء کا اختلاف ہے:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حسن، شعبی، حکم، لیث، ابو حنیفہ اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے: مرتد کی میراث اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہے۔

امام مالک، ربیعہ، ابن ابی لیلیٰ، شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس کی میراث بیت المال میں جائے گی۔ ابن شبرمہ، ابو یوسف، محمد اور اوزاعی رحمہم اللہ نے دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ مرتد نے ردت کے بعد جو کچھ کمایا وہ اس کے مسلمان ورثاء کے لئے ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مرتد نے حالت ردت میں جو کچھ کمایا وہ مال فئے ہے اور حالت اسلام میں جو کچھ اس نے کمایا پھر مرتد ہو گیا تو اس کے وارث اس کے مسلمان ورثاء ہوں گے۔

لیکن ابن شبرمہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دونوں امور کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور حضور نبی کریم ﷺ کا مطلق ارشاد گرامی لا یتوارث اهل ملتین (دو دین رکھنے والوں کے درمیان کوئی وراثت نہیں) ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ سوائے حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ اس کے کافر ورثاء اس کے وارث نہیں بنیں گے۔ لیکن آپ نے کہا ہے کہ وہ اس کے وارث بن سکتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 12۔ ارشاد باری تعالیٰ: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا الآیہ۔ جندب بن عبد اللہ اور عروہ بن زبیر وغیرہما نے کہا ہے کہ جب واقد بن عبد اللہ تمیمی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن حضرمی کو شہر حرام میں قتل کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس مال کا خمس لینے سے توقف فرمایا جو آپ کے لئے مال اور دو قیدیوں کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو عطا کیا گیا تھا تو مسلمانوں نے حضرت عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ ان پر شاق گزرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے شہر حرام میں اس آیت کے ساتھ ان کی تلافی فرمائی اور ان سے غم اور پریشانی کو دور فرما دیا۔ اور یہ خبر دی کہ ان کے لئے ہجرت کرنے والے اور جہاد کرنے والے کا ثواب ہے۔ انہی کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا پھر یہ آیت عام ہے ان کے حق میں باقی رہی جس نے وہ عمل کیا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگرچہ انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن ان کے لئے کوئی اجر بھی نہیں ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل

فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا الی آخر الآیہ۔

اور ہجرت کا معنی ہے الانتقال من موضع الی موضع ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا اور دوسری جگہ کے لئے اختیار کرتے ہوئے پہلی کو ترک کرنے کا قصد کرنا۔ ہجر وصل کی ضد ہے۔ (کہا جاتا ہے) هجرہ هجرا و هجرانا (فلاں نے اسے چھوڑ دیا) اور اس کا اسم الهجرۃ ہے۔ اور المهاجرۃ من ارض الی ارض کا معنی ہے دوسری جگہ کے لئے پہلی کو چھوڑ دینا، ترک کر دینا۔ اور التهاجر کا معنی التقاطع (باہمی مقاطعہ کرنا، تعلق توڑ دینا) ہے۔

اور جس نے المهاجرۃ کی تعریف یہ کی ہے الانتقال من البادیۃ الی الحاضرۃ یعنی دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونا تو اس نے اس سبب سے یہ نام دیا ہے کیونکہ عرب میں غالباً ایسا ہی ہوا ہے اور اس قول کے مطابق اہل مکہ مہاجرین نہیں ہیں۔

اور جاهد تو یہ جهد سے باب مفاعلہ ہے، جب کوئی پوری کوشش اور محنت صرف کر دے (اس کا مصدر) مجاهدۃ و جهادا ہے۔ اور اجتہاد اور تجاہد کا معنی ہے بذل الوسع والمجهود پوری طاقت، صلاحیت اور محنت کو صرف کر دینا۔ اور الجهاد بالفتح کا معنی ہے: محنت اور مشقت۔ اور يَرْجُوْنَ کا معنی ہے وہ طمع اور حرص رکھتے ہیں اور حصول قرب کے متمنی ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یَرْجُوْنَ کا قول ان کی مدح اور تعریف میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ جنت کی طرف جائے گا اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں آخری حد کو پہنچا ہوا ہو، اس کے دو سبب ہیں: ایک یہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ کون سے عمل پر ہوگا اور دوسرا یہ ہے تاکہ وہ اپنے عمل پر توکل اور بھروسہ نہ کر لے۔

اور رجا (امید) عام ہوتی ہے اور رجا کے ساتھ ہمیشہ خوف بھی ہوتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ خوف کے ساتھ رجا (امید) ہوتی ہے۔ گویا رجا ایک طویل اور وافر امید کا نام ہے۔ کہا جاتا ہے: رجوت فلانا رجوا و رجاء و رجاوۃ (میں فلاں سے امید باندھے ہوئے ہوں) کہا جاتا ہے: ما اتیتك الا رجاوۃ الخیر (میں تیرے پاس فقط خیر اور بھلائی کی امید لے کر آیا) اور ترجیته و ارتجیته اور رجیته یہ سب رجوته کے معنی میں ہیں۔ بشر نے اپنی بیٹی کو مخاطب ہو کر کہا ہے:

فرجّی الخیر وانتظری ایابی　　اذا ما القارظ العنزی آبا

اس میں ترجی امید کے معنی میں ہی مذکور ہے یعنی تو خیر اور بھلائی کی امید رکھ اور میرے لوٹنے کا انتظار کر۔

و ما لی فی فلان رجیة۔ ای ما ارجو یعنی میں فلاں کے بارے میں کوئی امید نہیں رکھتا۔ اور کبھی الرجو اور الرجاء خوف کے معنی میں ہوتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ (سورۃ نوح) یعنی کیا ہے تمہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے بارے میں ڈرتے نہیں۔

ابوذؤیب نے کہا ہے:

اذا لسعته النحل لم یرج لسعها　　و حالفها فی بیت نوب عوامل

اس میں لم یرج خوف اور ڈر کے معنی میں مذکور ہے۔
یعنی جب شہد کی مکھی نے اسے ڈسا تو اسے اس کے ڈسنے کا کوئی خوف اور پرواہ نہ ہوئی۔

اور الرجا الف مقصورہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے کنوئیں کی طرف اور اس کے دونوں کنارے اور ہر طرف اور کنارہ رجا کہلاتا ہے (1)۔ لوگوں میں سے عوام اس قول میں خطا کر جاتے ہیں: یا عظیم الرجا۔ کیونکہ وہ اسے الف مقصورہ کے ساتھ پڑھتے ہیں نہ کہ الف ممدودہ کے ساتھ۔ (یعنی اسے مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھنا چاہئے۔)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۟

"وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔ آپ فرمائیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے۔ اور پوچھتے ہیں آپ سے: کیا خرچ کریں؟ فرمائیے: جو ضرورت سے زیادہ ہو۔ اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو تاکہ تم غور و فکر کرو۔"

ارشاد باری تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۘ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: يَسْـَٔلُوْنَكَ اس میں سوال کرنے والے مومنین ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور الخمر خمر سے ماخوذ ہے جبکہ وہ ڈھانپ لے، چھپا لے۔ اور اسی سے خمار المرأۃ عورت کی اوڑھنی اور دوپٹہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو کسی شے کو ڈھانپ لے تو کہا جاتا ہے: خمرہ۔ اور اسی سے خمروا آنیتکم ہے (2) (تم اپنے برتن ڈھانپ دو) اور خمر (شراب) عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے گھنے درخت کو الخمر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے نیچے والی شے کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسے چھپا دیتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اخمرت الارض کثر خمرها (زمین نے ڈھانپ لیا اس کے درخت زیادہ ہو گئے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أَلَا يَا زَيْدُ وَالضَّحَّاكُ سِيرَا ... فَقَدْ جَاوَزْتُمَا خَمَرَ الطَّرِيقِ

خبردار! اے زید اور ضحاک! دونوں چلو (خوب تیز چلو) تحقیق تم راستے کے درختوں سے گزر چکے ہو۔

یعنی تم جرأت اور ہمت کے ساتھ چلو۔ تحقیق تم نے وہ نشیبی زمین کو عبور کر لیا ہے جہاں بھیڑیے وغیرہ چھپے رہتے ہیں۔ عجاج ایک لشکر کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے جو جھنڈوں اور لشکروں کے ساتھ بغیر کسی کمزوری کے چل رہا ہے:

فِي لَامِعِ الْعِقْبَانِ لَا يَمْشِي الْخَمَرْ ... يُوَجِّهُ الْأَرْضَ وَيَسْتَاقُ الشَّجَرْ

اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: دخل فی غمار الناس و خمارهم وہ لوگوں کی جماعت اور ان کی بھیڑ میں داخل ہوا۔ یعنی وہ لوگوں کے مجمع میں داخل ہو گیا۔ چونکہ شراب (خمر) عقل کو چھپا لیتی ہے اور اسے ڈھانپ لیتی ہے اس وجہ سے اسے خمر کا نام دیا جاتا

1۔ [illegible]

2۔ بخاری شریف، باب خمس من الدواب …، حدیث نمبر 3080، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں جائز نہیں ہے۔ چاہے وہ ایک جنس سے ہوں یا دو مختلف جنسوں سے۔ کیونکہ حدیث طیبہ عام ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اونٹ ذبح کیے گئے اور انہیں دس اجزاء میں تقسیم کر دیا گیا تو ایک آدمی نے کہا: مجھے ان میں سے ایک جزء ایک بکری کے عوض مجھے دے دو تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ اس کی صلاحیت نہیں رکھتا (یعنی یہ درست نہیں ہے)۔ امام شافعی نے فرمایا: میں نہیں جانتا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں صحابہ کرام میں سے کسی نے ان کی مخالفت کی ہو۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے گوشت کے عوض بکری کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ روایت قوی نہیں ہے۔

عبدالرزاق نے ثوری عن یحییٰ بن سعید کی سند سے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ آپ اسے مکروہ کہتے تھے کہ کسی زندہ کی بیع مردہ کے عوض کی جائے یعنی ذبح کی ہوئی بکری کی بیع زندہ کھڑی بکری کے عوض کی جائے۔

حضرت سفیان نے کہا ہے: ہم اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتے۔ مزنی نے کہا ہے: اگر گوشت کے عوض حیوان کی بیع کے بارے میں حدیث طیبہ صحیح نہیں ہے تو پھر قیاس یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور اگر حدیث صحیح ہے تو پھر قیاس باطل ہے اور حدیث کی اتباع کی جائے گی۔

ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ کوفیوں کے پاس اس بارے میں قیاس اور اعتبار کی جہت سے کثیر دلائل موجود ہیں کہ حیوان کے عوض گوشت کی بیع کرنا جائز ہے مگر یہ کہ جب حدیث صحیح ہوئی تو قیاس و نظر باطل ہو گئی۔

اور مالک نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت کے عوض حیوان کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کے بارے میں میں نہیں جانتا کہ اس کا اتصال حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو اور اس کی اسانید میں سے احسن حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کی مرسل ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی موطا میں ذکر کیا ہے۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے اور اصل یہ ہے کہ آپ مرسل روایات کو قبول ہی نہیں کرتے مگر گمان یہ ہے کہ آپ نے حضرت سعید بن مسیب کی مراسیل کو تلاش کیا اور انہیں پا لیا یا ان میں سے اکثر کو صحیح قرار دیا۔ پس ظاہر حدیث اور عموم حدیث کی بنا پر انواع حیوان کو گوشت کی انواع کے ساتھ بیچنا مکروہ ہے کیونکہ کوئی ایسی حدیث نہیں جو اسے خاص کر رہی ہو اور نہ ہی اجماع ہے۔ اور آپ کے نزدیک نص کی تخصیص قیاس کے ساتھ کرنا جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حیوان ہر اس جانور کا نام ہے جو خشکی یا پانی میں زندگی گزار رہا ہو اگرچہ اس کی اجناس مختلف ہوں جیسا کہ طعام ہر اس شے کا نام ہے جو کھائی جاتی ہو یا پی جاتی ہو۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فِيهِمَا یعنی خمر اور جوئے میں اِثْمٌ كَبِيرٌ بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب کا گناہ وہ ہے جو پینے والے سے صادر ہوتا ہے مثلاً ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا، گالی گلوچ دینا، فحش گوئی اور جھوٹا قول اور اس کی عقل کا زائل ہو جانا جس کے ساتھ وہ ان امور کو پہچانتا ہے جن کی ادائیگی اپنے خالق کے لیے واجب ہوتی ہے، نمازوں کو چھوڑ دینا اور

تعالیٰ کے ذکر سے رک جانا وغیرہ۔

امام نسائی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: شراب سے اجتناب کرو کیونکہ یہ ام الخبائث ہے تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار تھا۔ پس ایک گمراہ عورت اس سے عاملہ ہوئی۔ اس نے اس آدمی کی طرف اپنی لونڈی کو بھیجا اور اس نے اسے کہا: بے شک ہم تجھے شہادت کے لئے بلا رہے ہیں تو وہ اس لونڈی کے ساتھ چل پڑا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ جونہی وہ دروازے کے اندر داخل ہوا تو اس نے دروازہ بند کر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک خوبرو عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے پاس ایک بچہ تھا اور ساتھ ہی شیشے کے برتن میں شراب پڑی تھی۔ تو اس عورت نے کہا: قسم بخدا! میں نے تجھے شہادت کے لئے نہیں بلایا بلکہ میں نے تجھے اس لئے دعوت دی ہے تاکہ تو میرے ساتھ بدکاری کرے، یا شراب کا یہ جام پیے یا پھر اس بچے کو قتل کر دے۔ اس آدمی نے کہا: تو مجھے شراب کا یہ جام پلا دے۔ چنانچہ اس نے وہ جام اسے پلا دیا۔ اس نے کہا: مجھے اور پلاؤ۔ پس وہ پیتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب بھی کر لیا اور اس بچے کو بھی قتل کر دیا۔ پس تم شراب سے بچو۔ کیونکہ قسم بخدا! ایمان اور شراب پر دوام یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قریب ہی ان میں سے ایک دوسرے کو نکال دیتا ہے۔ ابو عمر نے اسے الاستیعاب میں ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی روایت ہے کہ اعشیٰ جب اسلام قبول کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کی طرف جانے لگا تو کچھ مشرک لوگ اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اسے کہا: تو کہاں جا رہا ہے؟ تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو انہوں نے کہا: تو ان سے نہ مل، کیونکہ وہ تجھے نماز کے بارے حکم ارشاد فرمائیں گے۔ اس نے جواب دیا: بلاشبہ رب تعالیٰ کی عبادت کرنا واجب ہے۔ تو انہوں نے پھر کہا: بلاشبہ وہ تجھے فقراء کو مال دینے کا حکم دیں گے۔ تو اس نے جواب دیا: نیکی کا عمل کرنا واجب ہے۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو زنا سے منع کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا: یہ عمل عقلاً انتہائی فحش اور قبیح ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر اسے کہا گیا: بے شک وہ تو شراب پینے سے منع کرتے ہیں۔ تب اس نے کہا: کیا ایسا بھی ہے؟ میں تو اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ پس وہ واپس لوٹ گیا اور کہا: میں ایک سال تک شراب پیوں گا پھر آپ کی طرف لوٹ جاؤں گا، لیکن وہ اپنے گھر تک نہ پہنچ سکا یہاں تک کہ وہ اونٹ سے گرا، اس کی گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا (1)۔

قیس بن عاصم منقری دور جاہلیت میں بہت زیادہ شراب پیتا تھا پھر اس نے اپنے اوپر اسے حرام کر دیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے نشے کی حالت میں اپنی بیٹی کے پیٹ کی سلوٹوں کو ٹٹولا اور اپنے والدین کو گالیاں دیں، اس نے چاند دیکھا تو اس کے بارے میں بھی کچھ (نازیبا) کلمات کہے اور شراب بنانے والے کو بہت سا مال دے دیا۔ جب اس کا نشہ اترا اور اسے اس کے بارے خبر ہوئی تو اس نے اپنے اوپر شراب کو حرام قرار دیا اور اس کے بارے وہ کہتا ہے:

رأیت الخمر صالحۃ و فیہا | خصال تفضح الرجل الحلیما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 203

میں نے شراب کو چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس میں ایسی خصال بھی ہیں جو حلیم آدمی کو خراب کر دیتی ہیں۔

فلا واللہ أشربها صحيحا ... ولا أشفى بها أبدا سقيما

قسم بخدا! میں اسے حالت صحت میں نہیں پیوں گا اور نہ ہی کبھی بیماری کی حالت میں اس سے علاج کروں گا۔

ولا أعطي بها ثمنا حياتي ... ولا أدعو لها أبدا نديما

میں اس کے عوض اپنی حیات بطور ثمن ادا نہیں کروں گا اور نہ میں اس کے لئے کبھی شراب پینے والے ساتھی کو بلاؤں گا۔

فإن الخمر تفضح شاربيها ... وتجنيهم بها الأمر العظيما

کیونکہ شراب اپنے پینے والے کو ذلیل و رسوا کر دیتی ہے اور انہیں بہت بڑے گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اور ابن اعرابی نے المفضل الضبی سے روایت کیا ہے کہ یہ شعر ابو محجن ثقفی کے ہیں اس نے شراب چھوڑنے کے وقت یہ کہے تھے اور آپ ہی کا یہ کہنا ہے کہ:

إذا مت فادفني إلى جنب كرمة ... تروي عظامي بعد موتي عروقها

جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے انگوری بیل کے پہلو میں دفن کرنا اس کی جڑیں میری موت کے بعد میری ہڈیوں کو تراوت دیں گی۔

ولا تدفنني بالفلاة فإنني ... أخاف إذا ما مت أن لا أذوقها

اور تم مجھے صحرا میں دفن نہ کرنا کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ جب میں مر جاؤں تو اسے نہ چکھ سکوں گا۔

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں کئی بار حد شرب کے کوڑے لگائے اور انہیں سمندر میں ایک جزیرہ کی طرف جلا وطن کر دیا، پس وہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا ملے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف انہیں قید کرنے کا حکم نامہ لکھا۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں قید کر لیا اور یہ انتہائی بہادر شہسواروں میں سے ایک تھے، جب یہ جنگ قادسیہ میں آپ کے حکم سے شریک ہوئے تو معروف یہی ہے کہ آپ نے ان کی بیڑیاں کھول دیں اور فرمایا: ہم کبھی بھی تمہیں شراب پینے پر کوڑے نہیں لگائیں گے۔ تو ابو محجن نے کہا: قسم بخدا! میں کبھی بھی شراب نہیں پیوں گا، پھر اس کے بعد کبھی بھی شراب نہیں پی۔ اور ایک روایت میں ہے: میں شراب پیتا تھا جب مجھ پر حد قائم کی جاتی تو میں اس سے پاک ہو جاتا تھا اور جب تم نے مجھ سے حد ساقط کر کے مجھے بری چھوڑ دیا ہے تو قسم بخدا! میں کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ ہیثم بن عدی نے بیان کیا ہے کہ اسے اس نے خبر دی ہے جس نے آذربیجان میں ابو محجن کی قبر دیکھی ہے یا کہا: جرجان کے نواح میں اس حال میں کہ اس پر بیل کی تین جڑیں لگی ہوئی ہیں۔ وہ خوب بڑھی ہوئی ہیں اور وہ پھل بھی دیتی ہیں اور وہ تمام کی قبر پر پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی قبر پر یہ لکھا ہوا ہے ہذا قبر ابی محجن (یہ ابو محجن کی قبر ہے)۔ اس نے کہا کہ میں نے اس پر خوب تعجب کیا اور مجھے ان کا یہ قول یاد آ گیا: إذا مت فادفني إلى جنب كرمة۔

بلاشبہ شراب پینے والا اہل عقل کے لئے تمسخر بن جاتا ہے اور وہ اپنے پیشاب اور نجاست کے ساتھ کھیلنے لگتا ہے اور بسا

الرقیب ہے۔ اس میں تین علامات ہوتیں اسی ترتیب پر جو ہم نے پیچھے بیان کر دی ہیں۔ چوتھا الحلس ہے۔ اس کے لئے چار علامات ہوتیں۔ پانچواں النافز ہے۔ اس کا نام النافس بھی ہے۔ اس کے لئے پانچ علامات ہوتیں۔ چھٹا المسبل ہے۔ اس کے لئے چھ علامات ہوتیں اور ساتواں المعلیٰ ہے۔ اس کے لئے سات علامات ہوتیں۔ اس طرح یہ اٹھائیس حصص ہوتے اور اصمعی کے قول کے مطابق اونٹوں کے حصص بھی اسی طرح ہوتے اور تیروں میں سے ابھی چار باقی ہیں۔ ان پر کوئی علامت نہ ہوتی اور نہ ہی ان کا کوئی حصہ ہوتا اور انصباء میں سے کوئی ان کے لئے ہوتا اور وہ یہ ہیں: المصدر، المضعف، المنیح اور السفیح۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: باقی تین تیر بغیر علامت کے ہیں اور وہ یہ ہیں: السفیح، المنیح اور الوغد۔ اس پر تیروں کی کثرت کی وجہ سے ان تینوں کا اضافہ کیا جاتا تھا جو انہیں حرکت دیتا اور کسی کی طرف میلان کا وہ کوئی راستہ نہ پاتا۔ اور تیروں کو حرکت دینے والے کو المفیض، الضارب اور الضریب کا نام دیا جاتا۔ اور جمع الضرباء آتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرکت دینے والے کے پیچھے ایک امین آدمی بٹھایا جاتا تا کہ وہ کسی کی طرفداری نہ کرے۔ پھر ضریب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا اور کپڑے کے ساتھ مکمل طور پر لپیٹ جاتا اور اپنا سر باہر نکالتا اور اپنا ہاتھ ربابہ (ترکش کی مانند تیر جمع کرنے کا برتن) میں داخل کرتا اور تیر نکالتا۔ اور عربوں کی عادت تھی کہ وہ موسم سرما کے وقت کے ختم ہونے اور فقراء پر سردی اور حالات کے سخت ہونے کی حالت میں اپنے تیروں کے ساتھ اونٹوں کو تقسیم کرتے تھے۔ اونٹ خریدے جاتے تھے اور خوشحال اور امیر لوگ ان کی قیمت کے ضامن ہوتے تھے اور ان کا مالک اپنے حق سے دستبردار ہو جاتا اور وہ اس کے ساتھ فخر کرتے تھے اور جو ان میں سے اس طرح نہ کرتا وہ اس کی مذمت کرتے تھے اور وہ اسے البرم کا نام دیتے تھے۔ متمم بن نویرہ نے کہا ہے:

ولا برما تهدي النساء لعرسه ۔۔۔ اذا القشع من برد الشتاء تقعقعا

پھر اونٹ ذبح کیے جاتے اور انہیں دس اقسام پر تقسیم کر دیا جاتا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اونٹوں کی تقسیم میں اصمعی نے خطا کی ہے۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ تیروں کے حصص کی تعداد کے مطابق ان کے بھی اٹھائیس حصے کیے جاتے، حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے دس پر تقسیم کرتے۔ پس جو کوئی بھی پہلے اپنا تیر نکالنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اپنے حصص لے لیتا اور فقراء کو عطا کر دیتا۔ اور ربابہ سے مراد ترکش کے مشابہ (برتن) ہے جس میں جوئے کے تیر جمع کیے جاتے ہیں۔ اور بسا اوقات انہوں نے تمام تیروں کو ربابہ کا نام دیا ہے۔ ابو ذؤیب نے گدھے اور گدھیوں کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

فكأنهن ربابة وكأنه ۔۔۔ يسر يفيض على القداح ويصدع

اور ربابہ کا معنی عہد اور میثاق بھی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

وكنت امرأ أفضت إليك ربابتي ۔۔۔ وقبلك ربتني فضعت ربوب

اور بعض قبائل میں وہ بسا اوقات اپنی ذاتوں کے لئے جوا کھیلتے پھر جس کی جیت اس پر ہوتی وہ اپنے تیر میں کامیاب ہوتا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور اسی طریقے پر قبیلے کے فقراء زندگی گزارتے تھے۔ اسی کے مطابق اعشیٰ کا قول ہے:

دونوں اعراب جید اور حسن ہیں مگر آیت میں تقدیر نصب کی بنا پر ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے کہا ہے: جب سابقہ آیت ارشاد باری تعالیٰ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ میں سوال نفقہ کے بارے ہے کہ وہ کس پر خرچ کیا جائے؟ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور جواب بھی اسی پر دال ہے اور جواب بھی سوال کے موافق ہی ظاہر ہوا ہے۔ اس آیت میں دوسرا سوال خرچ کرنے کی مقدار کے بارے ہے اور یہ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کی شان میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ (البقرہ: 215) انہوں نے کہا: میں کتنا خرچ کروں؟ تب یہ حکم نازل ہوا قُلِ الْعَفْوَ اور عفو کا معنی یہ ہے: ما سھل وتیسر وفضل ولم یشق على القلب اخراجه یعنی وہ شی جو آسان ہو، میسر ہو اور فالتو ہو اور اس کا نکالنا دل پر شاق نہ ہو۔

اسی معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

خُذِي العفو منّي تستديمي مودّتي ... ولا تنطقي في سَوْرتي حين أغضبُ

تو عفو لے لے میری محبت کو ہمیشہ برقرار رکھ اور جب میں غصے میں ہوں تو میرے غصے کی حالت میں تو بات نہ کر۔

پس معنی یہ ہے کہ تم اپنی حاجات سے فالتو مال خرچ کرو اور تم اس میں اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا نہ کرو کہ تم محتاج اور فقیر ہو جاؤ۔ آیت کی تاویل میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں یہی معنی زیادہ مناسب اور اولیٰ ہے۔ اور حضرات حسن، قتادہ، عطا، سدی، محمد بن کعب قرظی اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم کے قول کا معنی بھی یہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے: العفو ما فضل عن العیال کہ عفو سے مراد وہ مال ہے جو اہل و عیال سے فالتو ہو۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: صدقہ وہ ہے جو اس مال سے ہو جس کی حاجت نہ ہو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "بہترین صدقہ وہ ہے جو تو نے ضرورت سے زائد مال سے خرچ کیا" اور دوسری حدیث میں ہے: "بہترین صدقہ اس مال کا ہے جو ضرورت سے زائد ہو" (1)

قیس بن سعد نے کہا ہے (2): اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے: نہیں بلکہ یہ نفلی صدقات ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب کسی آدمی کے پاس سونا، چاندی یا اناج یا دودھ دینے والے جانور وغیرہ ہوتے تو وہ غور و فکر کرتا کہ ان میں سے کتنا مال اس کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال کے خرچے کے لئے سال بھر کے لئے کافی ہوگا۔ وہ اسے اپنے پاس روک لیتا اور باقی تمام مال و سامان صدقہ کر دیتا اور اگر وہ ان لوگوں میں سے ہوتا جو اپنے ہاتھ کے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ اپنی اور گھر والوں کی ایک دن کی ضرورت پوری کرنے کے لئے مال اپنے پاس روک لیتا اور باقی ماندہ صدقہ کر دیتا حتیٰ کہ پھر آیت زکوٰۃ نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی اور ہر وہ صدقہ منسوخ ہو گیا جس کے بارے انہیں حکم دیا گیا تھا۔

1۔ بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی الخ، حدیث نمبر 1337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، بخاری شریف، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی، حدیث نمبر 1338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 694

ایک قوم نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے اور مال میں زکوۃ کے سوا بھی حق ہے اور ظاہر حال قول اول پر ہی دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: مراد نفقہ کے احکام ہیں (یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ نفقہ کے بارے میں اپنے احکام تمہارے لئے کھول کر بیان کرتا ہے) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور و فکر کرو۔ پس تم اپنے مالوں میں سے اتنے روک لو جو تمہارے لئے دنیوی معاملات میں نفع بخش اور ضروری ہوں اور باقی ماندہ ان امور میں خرچ کرو جو آخرت میں تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کے امور کے بارے میں اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اس کے زوال اور اس کی فنا کے بارے میں غور و فکر کرو اور تم اس میں زہد اختیار کرو اور آخرت کے آنے اور اس کے باقی رہنے کے بارے غور و فکر کرو اور اس میں تم رغبت رکھو۔

فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۲۲۰

"دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں فرمایئے: (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے۔"

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (الانعام: 152) (اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا الآیہ (النساء: 10) (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔) تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا۔ پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچا تا تھا وہ اسے اس کے لئے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ الآیہ۔ پس انہوں نے ان کے کھانے پینے کی اشیاء کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ ہیں (1)۔ اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں کے مالوں کی حفاظت کا امر مقترن ہے۔ اور کہا گیا

1۔ سنن ابی داؤد، باب مخالطۃ الیتیم فی الطعام، حدیث نمبر 2487، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ بیٹھے ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مال کو ملانے سے بہ مشغول نہیں تھے۔ تو پس یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لئے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرمادی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کر لیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہنے لگا تو اس کے بارے اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے پاس ہونے پر ہی انحصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ضروریات خود ادا کرتے تھے)

مسئلہ نمبر 3۔ یتیم کا مال مضاربت اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شراء کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربت وغیرہ کے لئے بھی دینا جائز ہے۔ ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض سے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دینا جائز ہوگا جیسا کہ وہ یتیم کے لئے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خریدے اور یہ یتیم کے لئے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔

محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لئے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لئے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لئے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لئے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال کے ساتھ جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کر سکتا ہے اور اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباۃ (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لئے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے ہبہ کی جائے تو وصی کے لئے اس پر

کے لئے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرا دے اور باپ کے لئے بھی اپنے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو حتیٰ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قاضی کے لئے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کافل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے)۔

اور اگر کہا جائے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہاں بھی ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے نص بیان کر دی گئی ہو، لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرما دی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اور ہر وہ امر جس کے بارے خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے لہٰذا اس سے منع کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے)

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور و فکر کریں جو اس کے لئے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لئے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)۔

محمد بن عبد الحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لئے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ یہ اختلاط اور ملنا جلنا ہو، ہم شکل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لئے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل و عیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ

أَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾

"اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں اور بے شک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں، وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنكِحُوا اس میں جمہور کی قراءت تاء کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ البتہ شاذ قراءت میں ضمہ (پیش) کے ساتھ بھی اسے پڑھا گیا ہے۔ گویا معنی یہ ہے کہ ان کی شادی کرنے والے نے اپنے سے ان کا نکاح کر دیا۔ اور نکاح کا اصل معنی جماع ہے اور شادی کرنے کے معنی میں مجازاً اور وسعتاً استعمال ہوتا ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے اور (اہل کتاب کے ساتھ) نکاح کا میل جول رکھنے کی اجازت عطا فرما دی تو یہ واضح کر دیا کہ مشرکین کے ساتھ باہم نکاح کرنا صحیح نہیں ہے۔

مقاتل نے کہا ہے: یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مرثد بن ابی مرثد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کا نام کناز بن حصین غنوی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خفیہ طور پر مکہ مکرمہ بھیجا، تاکہ وہ آپ کے اصحاب میں سے جو لوگ وہاں ہیں انہیں نکال لائے۔ تو مکہ مکرمہ میں ایک عورت تھی جو زمانہ جاہلیت میں ان کے ساتھ محبت کرتی تھی۔ اسے عناق کہا جاتا تھا۔ وہ آپ کے پاس آئی تو آپ نے اسے فرمایا: بے شک اسلام نے اسے حرام کر دیا ہے جو کچھ عہد جاہلیت میں تھا تو اس نے کہا: پھر تم مجھ سے شادی کر لو تو آپ نے فرمایا: یہاں تک کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے لوں، چنانچہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے شادی کرنے سے منع فرما دیا کیونکہ آپ مسلمان تھے اور وہ مشرکہ تھی (1)۔ اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، پس ایک جماعت نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، پھر ان تمام سے اہل کتاب عورتوں کو نکال دیا ہے اور انہیں سورۃ

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 67-66

مائدہ میں حلال قرار دیا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور مالک بن انس، سفیان بن سعید ثوری اور عبدالرحمن بن عمرو اوزاعی رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔

اور حضرت قتادہ اور حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: آیت کا لفظ تمام کافر عورتوں کو شامل ہے اور اس سے مراد خاص طور پر اہل کتاب ہیں اور اس خصوص کو سورۃ المائدہ کی آیت نے بیان کیا ہے۔ اور یہ عموم کبھی بھی اہل کتاب عورتوں کو شامل نہیں ہوا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اور پہلے قول کے مطابق عموم ان کو بھی شامل ہے پھر سورۃ المائدہ کی آیت نے بعض عموم کو ختم کر دیا ہے۔ اور یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے، اسے ابن حبیب نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہودیہ اور نصرانیہ کا نکاح مذموم اور ثقیل ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسے حلال قرار دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم حربی نے کہا ہے: ایک قوم نے کہا ہے کہ سورۃ البقرہ کی آیت ناسخ ہے اور سورۃ المائدہ کی آیت منسوخ ہے لہٰذا انہوں نے ہر مشرک عورت کے نکاح کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ کتابیہ ہو یا غیر کتابیہ ہو۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کرنے والے کی دلیل وہ حدیث ہے جس کی سند صحیح ہے اور ہمیں محمد بن ریان نے وہ بیان کی ہے، انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن رمح نے بیان کیا کہ لیث نے حضرت نافع سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کسی آدمی کے یہودی یا نصرانی عورت سے شادی کرنے کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر مشرک عورتیں حرام قرار دی ہیں اور میں اس سے بڑا شرک کوئی نہیں جانتا کہ ایک عورت کہتی ہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول اس جماعت کے قول سے خارج ہے جو اپنے ساتھ حجت قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت نے اہل کتاب کی عورتوں کے حلال ہونے کے بارے یہ قول کیا ہے۔ ان میں سے حضرات عثمان، طلحہ، ابن عباس، جابر اور حذیفہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور تابعین میں سے حضرات سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، حسن، مجاہد، طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک ہیں اور فقہائے امصار بھی اسی قول پر ہیں۔ اور یہ بھی کہ سورۃ البقرہ کی اس آیت کا سورۃ المائدہ کی اس آیت کے لئے ناسخ ہونا ممتنع ہے۔ کیونکہ سورۃ البقرہ ان سورتوں میں سے ہے جو پہلے پہلے مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ المائدہ آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اور بلاشبہ آخر میں نازل ہونے والی پہلے والی کو منسوخ کرتی ہے۔ رہی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما! تو اس میں بھی کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما توقف کرنے والے آدمی تھے، جب آپ نے دونوں آیتیں سنیں کہ ایک میں حلت کا ذکر ہے اور دوسری میں حرمت کا اور نسخ کی دلیل بھی آپ پر واضح نہ ہوئی، تو آپ نے توقف فرما لیا، مگر آپ سے نسخ کا ذکر مروی نہیں، بلکہ صرف نسخ کی تاویل کی گئی ہے اور ناسخ و منسوخ تاویل کے ساتھ حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان بعض روایات میں کہا ہے جو ان سے مروی ہیں کہ یہ آیت بت

1۔ بخاری شریف، باب قول اللہ تعالیٰ ولا تنکحوا المشرکات، حدیث نمبر 4877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پرست، آتش پرست اور کتابی عورتوں کے بارے میں عام ہے اور ہر وہ عورت جو دین اسلام پر نہیں وہ حرام ہے۔ اس بنا پر یہ سورۃ المائدہ کی آیت کے لئے ناسخ ہے اور معنوی طور پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول اس کی تائید کرتا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر شرک کرنے والا کسی کو نہیں جانتا کہ ایک عورت کہے: اس کا رب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم اور دو کتابی عورتوں کے درمیان تفریق کی اور ان دونوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ طلاق دلوا دیں اور آپ غصے میں نہ ہوں تو آپ نے فرمایا: اگر تم دونوں کی طلاق جائز ہے تو یقیناً تمہارا نکاح بھی جائز ہے۔ لیکن میں تم دونوں کے درمیان انتہائی ذلت وحقارت کی تفریق کر رہا ہوں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ سند کے اعتبار سے جید اور عمدہ نہیں ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کا ارادہ کیا تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا: کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ یہ حرام ہے تو میں اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہوں یا امیر المومنین؟ (یعنی میں اسے فارغ کر دیتا ہوں) تو آپ نے فرمایا: میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ حرام ہے البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم ان میں سے بدکار عورتوں میں مشغول ہو جاؤ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن منذر نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور ان صحابہ کرام اور تابعین سے بھی جن کا ذکر نحاس کے قول میں ہوا ہے (نکاح کا جواز ذکر کیا ہے) اور اپنے کلام کے آخر میں کہا ہے: اوائل میں سے کسی سے بھی یہ قول صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے اسے حرام قرار دیا ہو۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جہاں تک دونوں آیتوں کا تعلق ہے ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ بظاہر لفظ شرک اہل کتاب کو شامل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ: 105) (نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک کہ اتاری جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔) اور فرمایا: لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ (البینہ: 1) (جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین)

پس لفظ میں ان کے درمیان فرق کیا ہے اور بظاہر عطف معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغایرت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ بھی کہ اسم شرک عام ہے اور یہ نص نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کے بعد یہ ارشاد گرامی: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ: 5) (اور (حلال ہیں) پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب) یہ نص ہے، پس جس میں احتمال ہے اور جس میں کوئی احتمال نہیں ان کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔ اور اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے یہ ارادہ کیا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 296-297

کرو جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور وہ اسلام لے آئے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ (آل عمران: 199) (اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر۔) اور یہ ارشاد ہے: مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ (آل عمران: 113) (اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے۔)

تو اسے کہا جائے گا: یہ اس ارشاد میں آیت کی نص کے خلاف ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور اس نظریہ کے خلاف ہے جو جمہور نے بیان کیا ہے کیونکہ ان میں سے جو اسلام لے آیا اس کی شادی کے جائز ہونے پر تو کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ہو گیا ہے۔

اور اگر وہ کہیں: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: أُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ اور ان کے نکاح کے حرام ہونے میں آگ کی طرف بلانے کو علت قرار دیا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی علت ہے: وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ کیونکہ مشرک آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور یہ علت تمام کفار میں جاری ساری ہے۔ یقیناً مسلمان مطلقاً کافر سے بہتر اور اچھا ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا اہل کتاب کا نکاح جب وہ حالت جنگ میں ہوں تو نکاح حلال نہیں ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ حلال نہیں، اور رب العالمین کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝ (التوبہ) (جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ دیں وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں)

محدث نے کہا: میں نے اس کا ذکر حضرت ابراہیم نخعی سے کیا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا۔ اور امام مالک نے اہل حرب کی شادی کو مکروہ قرار دیا ہے اور اس کی علت دار الحرب میں بچے کو چھوڑنا ہے اور اس وجہ سے کہ عورت وہاں شراب اور خنزیر میں تصرف کرے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ گویا یہ اس کی خبر دی جا رہی ہے کہ مومنہ لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ صاحب حسب اور صاحب مال ہو۔ وَّلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ وہ تمہیں حسن و جمال وغیرہ میں بہت پسند آئے۔ یہی علامہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔

یہ آیت حضرت خنساء ولیدہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: اے خنساء! تحقیق اس کے باوجود کہ تو سیاہ ہے اور تو بدصورت ہے تیرا ذکر ملاء اعلیٰ میں کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تیرا ذکر اپنی کتاب میں نازل کیا ہے۔ پس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی۔

اور حضرت سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک سیاہ رنگ کی

تیز تھی۔ انہوں نے غصے میں اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر نادم ہوئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبداللہ! وہ کیسی ہے؟ آپ نے عرض کی: وہ نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، اچھے طریقے سے وضو کرتی ہے اور شہادتین کی شہادت دیتی ہے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تو مومنہ ہے'' تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بالضرور اسے آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا۔ پھر انہوں نے ایسے ہی کیا تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے ان پر طعن کیا اور کہا: انہوں نے لونڈی سے نکاح کیا ہے؟ اور وہ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ مشرکین سے نکاح کریں اور وہ ان کے حسب و نسب میں رغبت رکھتے ہوئے ان سے نکاح کرتے رہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ اہل کتاب کی لونڈیوں کے نکاح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کتابیہ لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے اور اشہب نے کتاب محمد میں کہا ہے: وہ آدمی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کے تحت کتابیہ لونڈی ہو تو ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ اہل کتاب کی لونڈیوں کا نکاح جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ہمیں شیخ ابو بکر الشاشی نے مدینۃ السلام کے بارے درس دیا اور کہا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کتابیہ لونڈی کے نکاح کے جائز ہونے پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ اور آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مومنہ لونڈی اور مشرکہ کے نکاح کے درمیان اختیار دیا ہے۔ پس اگر مشرکہ لونڈی کا نکاح جائز نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان اختیار نہ دیتا۔ کیونکہ بلاشبہ اختیار دو جائز چیزوں کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ جائز اور ممتنع کے درمیان، اور نہ ہی دو ضدوں کے درمیان۔

جواب یہ ہے کہ دو ضدوں کے درمیان اختیار لغۃً بھی اور قرآن کی رو سے بھی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ (الفرقان) (اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانا ہو گا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہو گی۔) اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے خط میں کہا: حق کی طرف رجوع کرنا باطل میں سرکشی اختیار کرنے سے بہتر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَاَمَةٌ سے مراد وہ لونڈی نہیں جو کسی کی ملکیت ہو بلکہ اس سے مراد آدمیت ہے اور عورتیں اور مرد سب کے سب اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی باندیاں ہیں، قاضی بصرہ ابو العباس جرجانی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مجوسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ پس امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ، اوزاعی اور اسحاق رحمہم اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ اور ابن حنبل نے کہا ہے: مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک مجوسیہ عورت سے شادی کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اس کو طلاق دے دو۔

ابن القصار نے کہا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: دو قولوں میں سے ایک کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ہے۔ لہٰذا ان کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔

ابن وہب نے حضرت مالک سے روایت کیا ہے کہ مجوسیہ لونڈی ہو تو ملک یمین کی حیثیت سے اس کے ساتھ وطی کرنا جائز

نہیں اور اسی طرح بت پرست عورتوں اور دیگر کافر عورتوں کا حکم ہے۔ یہی موقف علماء کی ایک جماعت کا ہے، مگر ایک روایت ہے جسے یحییٰ بن ایوب نے ابن جریج سے اور انہوں نے حضرت عطا اور عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ ان دونوں سے مجوسی لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بارے پوچھا گیا تو ان دونوں نے کہا: اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ کی تاویل کی ہے۔ وہ یہ کہ ان دونوں کے نزدیک اس کا اطلاق عقد نکاح پر ہے نہ کہ خریدی ہوئی لونڈی پر۔ اور ان دونوں نے اوطاس کے قیدیوں سے استدلال کیا ہے۔ وہ یہ کہ صحابہ کرام نے ان میں سے لونڈیوں کے ساتھ ملک یمین کی حیثیت سے وطی کی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے۔ رہے اوطاس کے قیدی! تو ان میں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی لونڈیوں نے اسلام قبول کر لیا ہو تو پھر ان کے ساتھ نکاح جائز ہے اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ سے استدلال کا تعلق ہے تو وہ غلط ہے، کیونکہ انہوں نے لفظ نکاح کو عقد کے معنی پر محمول کیا ہے، حالانکہ لغت میں نکاح کا اطلاق عقد اور وطی دونوں پر ہوتا ہے۔ پس جب فرمایا: وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ تو ہر اس نکاح کو حرام کر دیا جو مشرکات پر واقع ہوتا ہے چاہے وہ عقد نکاح ہو یا وطی ہو۔

ابو عمر بن عبد البر نے کہا ہے کہ امام اوزاعی نے بیان کیا: میں نے زہری سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو مجوسیہ لونڈی خریدتا ہے، کیا وہ اس سے وطی کر سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: جب وہ یہ شہادت دے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو وہ اس سے وطی کر سکتا ہے۔

یونس نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے۔

ابو عمر نے کہا ہے کہ ابن شہاب کا قول ہے کہ اس کے لئے اس سے وطی کرنا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لے اور ابن شہاب مغازی اور سیر کے بارے لوگوں سے بڑھ کر عالم ہیں۔ آپ کا یہ قول اس کے قول کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جس نے یہ گمان کیا ہے کہ اوطاس کے قیدیوں سے وطی کی گئی اور ان عورتوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ یہ قول ایک جماعت سے مروی ہے۔ ان میں سے حضرت عطا اور عمرو بن دینار بھی ہیں۔ ان دونوں نے کہا ہے: مجوسیہ کے ساتھ وطی کرنے میں کوئی حرج نہیں اور فقہاء امصار میں سے کوئی ایک بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا (یعنی کسی نے اسے اہمیت نہیں دی) حالانکہ امام حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔

اور وہ ان میں سے ہیں جن کی فارس اور پھر خراسان کے سوا اپنی جنگ ہوئی اور ان کے اطراف والوں کی جنگ ہوئی اور ان میں سے کوئی بھی اہل کتاب نہیں جو تیرے لئے یہ بیان کرے کہ ان کی عورتوں کی سیرت اور کردار کیا ہوتا جب وہ قیدی بنائی جاتیں۔ فرمایا: ہمیں عبد اللہ بن محمد بن اسد نے خبر دی ہے، اس نے کہا: ہمیں ابراہیم بن احمد بن فراس نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں علی بن عبد العزیز نے بیان کیا ہے، اس نے کہا: ہمیں ابو عبید نے بتایا ہے، اس نے کہا: ہمیں ہشام نے یونس سے اور انہوں نے حسن سے ہمیں بیان کیا ہے، اس نے کہا: ایک آدمی نے اسے کہا: اے ابو سعید! تم کیا طریقہ کرتے ہو جب تم

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی قول حضرت امام مالک، حضرت امام ابو ثور اور حضرت طبری رحمۃ اللہ علیہم کا بھی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ "ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا" ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا نکاح الا بولی۔

اس حدیث کو حضرت شعبہ اور ثوری نے ابو اسحاق سے، انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایت کیا ہے۔ پس جو مرسل روایات قبول کرتے ہیں اس کو قبول کرنا ان پر لازم ہوگا اور رہے وہ جو مرسل روایات قبول نہیں کرتے تو ان پر بھی اسے قبول کرنا لازم ہوگا، کیونکہ وہ جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے وہ ان حفاظ اور ثقہ راویوں میں سے ہیں اور جنہوں نے اسے متصل ذکر کیا ہے ان میں سے اسرائیل اور ابو عوانہ دونوں ہیں جو ابو اسحاق سے، وہ ابو بردہ سے، وہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں (1)۔ اور اسرائیل اور جنہوں نے ان کی اتباع کی ہے وہ سب حفاظ ہیں اور حافظ کی زیادتی قبول کی جاتی ہے اور اس زیادتی کو اصول تقویت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: 232) (تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے) یہ آیت حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے اپنی بہن کو اپنے خاوند کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ اسے امام بخاری نے بیان کیا ہے اور اگر ان کے لئے نکاح کرنے میں کوئی حق نہ ہوتا تو انہیں رجوع سے روکنے سے منع نہ کیا جاتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کتاب اللہ میں سے بھی جو آیات اس پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہیں: فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ (النساء: 25) (تو نکاح کرو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے) اور یہ ارشاد: وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰى مِنْكُمْ (النور: 32) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے) پس اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بارے خطاب مردوں کے سوا کسی کو نہیں کیا۔ اگر یہ خطاب عورتوں کو ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر فرماتا۔ عنقریب اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے بطور حکایت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے کہا ہے: "بے شک میں ارادہ رکھتا ہوں کہ میں تجھے نکاح کر دوں" اس کی وضاحت سورۃ القصص میں آئے گی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: 34) (مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر) پس کتاب و سنت نے اس پر قوت اور تائید فراہم کی ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔

علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے جس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا عقد نکاح کیا (2) اور انہوں نے خود نکاح نہ کیا۔ یہ اس کے قول کا بطلان ہے جس نے کہا ہے کہ بالغ عورت اپنے نفس کی مالک ہوتی ہے اپنے ولی کے بغیر وہ اپنی شادی کر سکتی ہے۔ وہ عقد نکاح کر سکتی ہے اور اگر یہ اختیار اسے ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 1670، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ بخاری شریف، باب شہود الملائکۃ بدرا، حدیث نمبر 3704، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان کی اپنی ذات کے بارے میں پیغام نکاح بھیجنا ترک نہ کرتے جبکہ وہ اپنی ذات کے بارے میں اپنے باپ کی نسبت زیادہ قریب تھیں اور آپ نے پیغام نکاح اس کی طرف بھیجا جو ان کے معاملے کا مالک نہیں اور نہ ان کا عقد کرنے کا مالک ہے اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وضاحت بھی ہے الایم احق بنفسہا من ولیہا (1) (بیوہ عورت اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے۔) اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کے بارے اس میں زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اس کی رضامندی کے بغیر اس پر عقد نہیں کر سکتا، یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے بارے میں یہ زیادہ حق رکھتی ہے کہ وہ اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کر لے۔ اور دار قطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی عورت کسی عورت کی شادی نہیں کرے گی اور نہ کوئی عورت اپنی شادی کرے گی کیونکہ زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کر لیتی ہے۔" فرمایا: یہ حدیث صحیح ہے۔ (2)

اور ابو داؤد نے سفیان عن الزہری عن عروہ کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کسی عورت کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر کر دیا گیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔ آپ نے یہ جملہ تین بار فرمایا۔ پس اگر اس کے ساتھ دخول کر لیا گیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اس عمل کے عوض جو اس نے اس کے ساتھ کیا اور اگر وہ آپس میں جھگڑ پڑیں تو سلطان اس کا ولی ہوگا جس کا کوئی ولی نہ ہو (3)۔" یہ حدیث صحیح ہے۔

اور ابن علیہ نے جو قول ابن جریج سے نقل کیا ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ انہوں نے کہا: میں نے اس کے بارے حضرت زہری سے پوچھا تو انہیں اس کی پہچان نہ تھی۔ اور ابن علیہ کے سوا کسی ایک نے بھی ابن جریج سے یہ قول نقل نہیں کیا، حالانکہ ایک جماعت نے حضرت زہری سے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر زہری سے یہ ثابت ہو جائے تو بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ آپ سے اسے ثقہ راویوں نے نقل کیا ہے، ان میں سے سلیمان بن موسیٰ ہیں اور وہ ثقہ امام ہیں اور جعفر بن ربیعہ ہیں (4) اور اگر زہری اسے بھول گئے تب بھی یہ آپ کے لئے نقصان دہ نہیں۔ کیونکہ نسیان سے کوئی آدمی محفوظ نہیں، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدم علیہ السلام بھول گئے تو آپ کی ساری اولاد بھول گئی (5)۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نسیان لاحق ہو جاتا تھا تو پھر آپ کے سوا کون ہے جو نسیان سے زیادہ محفوظ ہو اور جس نے یاد رکھا تو وہ اس پر حجت ہے جو بھول گیا، پس جب ثقہ راوی خبر کو روایت کرے تو جو بھول گیا اس کا نسیان اس کے لئے نقصان دہ نہیں ہوگا۔ یہ تب ہے جبکہ وہ صحیح ہو جو ابن علیہ نے ابن جریج سے بیان کیا ہے تو کیا حال ہوگا جبکہ اہل علم نے اس حکایت کا انکار کیا ہے اور انہوں نے اس پر اعتماد نہیں کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو ابو حاتم محمد بن حبان تمیمی البستی نے المسند الصحیح میں [illegible] اس کی سند ہے

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888

2۔ سنن ابن ماجہ، [illegible] حدیث نمبر 1871، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابو داؤد، باب فی الولی، حدیث نمبر 1784، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ الاعراف، حدیث نمبر 3002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسجد کے پڑوس میں رہنے والے کی نماز مسجد کے بغیر نہیں ہوتی۔) اور لاحظ فی الاسلام لمن ترک الصلوٰۃ(1) (کہ جس نے نماز چھوڑ دی اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں) (ان ارشادات میں کمال کی نفی ہے اسی طرح اس حدیث میں بھی کمال کی نفی ہے یعنی نکاح کامل نہیں ہوگا۔) اور انہوں نے اس پر ان ارشادات سے استدلال کیا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اور فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔) اور اس روایت سے جو دار قطنی نے سماک بن حرب سے روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضرت علی بڑھنے کے پاس آیا اور کہا: ایک عورت ہے میں اس کا ولی ہوں اس نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟ تو حضرت علی بڑھنے نے فرمایا: جو کچھ اس نے کیا ہے اس میں غور و فکر کی جائے گی اور دیکھا جائے گا اگر اس نے کفو میں شادی کی ہے تو ہم اسے اس کی اجازت دے دیں گے اور اگر اس نے ایسے آدمی سے شادی کی جو اس کا ہم کفو نہیں تو ہم اسے تیرے حوالے کر دیں گے(2)۔

اور موطا میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بڑھنے نے اپنے بھائی عبد الرحمٰن کی بیٹی کی شادی کی اور وہ غائب تھے۔

الحدیث۔

اور ابن جریج نے اسے عبد الرحمٰن بن قاسم بن محمد بن ابی بکر سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بڑھنے سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک آدمی منذر بن زبیر بڑھنے کا نکاح اپنے بھائی کی اولاد میں سے ایک عورت کے ساتھ کیا۔ آپ نے ان کے درمیان پردہ لٹکا دیا، پھر گفتگو فرمائی۔ یہاں تک کہ جب عقد کے سوا کچھ باقی نہ بچا تو آپ نے ایک آدمی کو حکم دیا اور اس نے نکاح کر دیا، پھر آپ نے فرمایا: عورتوں کے پاس نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے (یعنی عورتوں کو ولایت نکاح حاصل نہیں) اور امام مالک کی حدیث میں وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ بڑھنے نے مہر اور احوال نکاح کو پختہ کیا اور اس (عورت) کے عصبہ میں سے ایک عقد کا ولی بنا اور عقد کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ بڑھنے کی طرف کی گئی کیونکہ اسے پختہ کرنے کی نسبت آپ کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے: اولیاء کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف روایت کی گئی ہیں کہ وہ کون ہیں؟ پس آپ نے ایک بار فرمایا: ہر وہ آدمی جس نے عورت کو اچھے اور حسین منصب میں رکھا وہی اس کا ولی ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا ذوی الارحام میں سے ہو یا اجنبی ہو یا امام ہو یا وصی ہو۔ اور ایک بار فرمایا: اولیاء عصبات میں سے ہوتے ہیں، پس ان میں سے جس نے عورت کو اچھے منصب میں رکھا وہ اس کا ولی ہوگا۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک نے اس بیان میں کہا ہے جو ان سے ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ جب کسی عورت کی شادی ولی کے علاوہ کوئی اور اس عورت کی اجازت سے کر دے تو پھر اگر وہ عورت شریف ہو اور لوگوں میں اس کا کوئی مقام ہو تو اس کے نکاح کو فسخ کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس کے ولی کو اختیار ہوگا اور اگر وہ عورت رذیل اور گھٹیا ہو جیسا کہ آزاد شدہ

1۔ التمہید جلد 19، صفحہ 91-90

2۔ سنن دار قطنی جلد 3، صفحہ 237

جو نبطی، سوداء یعنی قبطی قوم سے تعلق رکھنے والی ، زنا کار اور مسلمہ ہے اور وہ عورت جس کا کوئی مقام و مرتبہ نہ ہو تو اس کا نکاح جائز ہوگا اور اس کے ولی کو اختیار نہ ہوگا کیونکہ ہر کوئی اس کا کفو ہے۔

اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عورت شریف ہو یا رذیل ولی یا سلطان کے علاوہ کوئی اس کی شادی نہیں کر سکتا۔ اس قول کو ابن منذر نے پسند کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مسکین عورت اور وہ جو ذی مرتبہ اور ذی قدر ہو کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے بارے میں ان کے احکام کے درمیان مساوات اختیار کی ہے۔ اور فرمایا ہے: "تمام مسلمانوں کا خون مساوی اور برابر ہوتا ہے" (1)۔ اور جب وہ خون میں برابر ہوئے تو وہ اس کے علاوہ دیگر احکام میں بھی ایک شے ہوں گے۔

اور اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے نکاح کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو اس نے بعض مومنین کو بعض کا ولی بنا دیا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) اور فی الجملہ مومنین اسی طرح بعض بعض کے وارث بنتے ہیں، پس اگر ایک آدمی مر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی میراث تمام مسلمانوں کے لئے ہوگی اور اگر وہ کسی جنایت (جرم) کا ارتکاب کرے تو اس کی جانب سے مسلمان ہی دیت ادا کریں گے، پھر ایک ولایت دوسری ولایت سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور ایک قرابت دوسری قرابت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

اور جب عورت ایسی جگہ میں ہو جہاں نہ سلطان ہو اور نہ اس کا ولی ہو تو وہ اپنا معاملہ پڑوسیوں میں سے اس کے حوالے کر دے گی جو قابل اعتماد ہوگا اور وہ اس کی شادی کر سکے گا اور اس حال میں وہی اس کا ولی ہوگا، کیونکہ لوگوں کے لئے شادی کرنے سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اس بارے میں جتنا ممکن ہو سکے وہ اچھا عمل کرتے ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک نے کمزور حالت والی عورت کے بارے میں کہا ہے کہ بلاشبہ اس کی شادی وہ کر سکتا ہے جس کی طرف وہ اپنے معاملے کو منسوب کرے گی، کیونکہ وہ عورت ان میں سے ہے جو سلطان کے پاس پہنچنے سے قاصر ہوتی ہے۔ پس اسے اس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے جس کی موجودگی میں سلطان نہ ہو، پس فی الجملہ وہ اس طرف راجع ہوئی کہ مسلمان اس کے اولیاء ہیں۔ پس جب اس نے اپنا معاملہ ایک آدمی کے حوالے کر دیا اور اپنے اولیاء کو چھوڑ دیا تو بلاشبہ اس نے بلاوجہ ایک امر کو اختیار کیا ہے اور اس نے وہ کام کیا ہے جس کے بارے حاکم اور مسلمان اس کا انکار کرتے ہیں تو وہ نکاح فسخ کر دیا جائے گا یہ معلوم کیے بغیر کہ اس کی حقیقت حرام ہے۔

جب ہم نے یہ بیان کر دیا ہے کہ مومنین بعض بعض کے اولیاء ہیں اور یہ بھی کہ اس میں اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود نکاح فسخ کر دیا جائے گا کیونکہ یہ کام بلاوجہ ہوا ہے اور اس لئے بھی کہ فروج کے بارے زیادہ احتیاط ہے اور اس لئے بھی کہ ان کی حفاظت (ضروری ہے) اور جب دخول ہو جائے اور معاملہ طویل ہو جائے اور وہ اولاد کو جنم دے لے تو پھر یہ جائز نہیں ہے کہ فسخ

1۔ سنن ابی داؤد، باب السریۃ ترد علی اہل العسکر، حدیث نمبر 2371، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سنن نسائی، باب ... تتکافأ دماؤھم، حدیث نمبر 2672-2674، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں، کیونکہ امور جب متفاوت ہو جائیں تو پھر ان سے اس حرام کے سوا کسی کا ارادہ نہیں کیا جاتا جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اور یہ اس کے مشابہ ہو جاتا ہے جو حاکم کے حکم سے فوت ہو جائے جب کہ وہ عملاً یہ فیصلہ دے کہ اسے فسخ نہ کیا جائے مگر یہ کہ وہ ایسی خطا اور غلطی ہو جس میں کوئی شک نہ ہو (تو اس صورت میں حاکم کا فیصلہ نافذ العمل نہ ہوگا۔)

اور رہے امام شافعی اور آپ کے اصحاب! تو ان کے نزدیک بغیر ولی کے کیا ہوا نکاح ہمیشہ فسخ کیا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں بنیں گے اگر ان میں سے کوئی ایک مر جائے۔ اور ان کے نزدیک ولی نکاح کے فرائض میں سے ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک اس پر کتاب و سنت سے دلیل قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وانکحوا الایامٰی منکم اسی طرح فرمایا: فانکحوھن باذن اھلھن اور اولیاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فلا تعضلوھن اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لا نکاح الا بولی اور انہوں نے رذیل اور شریف عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا، کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ان دونوں کے درمیان خون کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون تتکافؤ دماؤھم اور تمام احکام اسی طرح ہیں۔ اور ان میں سے کسی میں کتاب و سنت میں بلند مرتبہ اور گھٹیا کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس نکاح کے بارے میں ان کا اختلاف ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے واقع ہو اور پھر ولی قبل از دخول اس کی اجازت دے دے تو حضرت امام مالک اور عبدالملک کے سوا ان کے اصحاب نے کہا ہے: وہ نکاح جائز ہے کیونکہ اس کے لئے اس کی اجازت قرب کے سبب ہے چاہے دخول ہوا ہو یا دخول نہ ہوا ہو۔ یہ تب ہے جب عقد نکاح غیر ولی نے کیا ہو اور عورت نے بذات خود عقد نکاح نہ کیا ہو اور اگر عورت نے اپنی شادی خود کی اور اس نے مسلمانوں میں سے کسی قریبی یا بعیدی ولی کے بغیر عقد نکاح خود کیا ہو تو یہ نکاح کسی حال میں ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں رکھا جائے گا اگرچہ وقت زیادہ گزر جائے اور وہ اولاد کو جنم دے دے۔ البتہ دخول کی صورت میں بچے کو اسی کے ساتھ ملحق کیا جائے گا اور حد ساقط ہو جائے گی اور ہر حال میں اس نکاح کو فسخ کرنا ضروری ہے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ اس صورت میں فسخ بغیر طلاق کے ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اولیاء کے مراتب اور ان کی ترتیب میں علماء نے اختلاف کیا ہے:

حضرت امام مالک فرماتے ہیں: اولیاء میں سے سب سے اول بیٹے ہیں اگرچہ وہ کتنے ہی نیچے کی طرف ہوں، پھر باپ، پھر وہ بھائی جو باپ اور ماں دونوں جانب سے سگے ہوں، پھر وہ جو صرف باپ کی طرف سے ہوں (علاتی بھائی) پھر حقیقی بھائیوں کے بیٹے پھر علاتی بھائیوں کے بیٹے، پھر باپ کی جانب سے اجداد (دادے) اگرچہ وہ کتنے ہی اوپر ہوں، پھر چچے بھائیوں کی ترتیب پر، پھر ان کے بیٹے بھائیوں کے بیٹوں کی ترتیب پر اگرچہ وہ کتنے نیچے ہوں، پھر آقا پھر سلطان یا قاضی۔

اور وصی یتیموں کا نکاح کرنے میں اولیاء پر مقدم ہوتا ہے اور وہی باپ کا خلیفہ اور اس کا وکیل ہوتا ہے اور یہ اس حال کے مشابہ ہوتا ہے اگر باپ زندہ ہوتا۔

اور حضرت امام شافعی نے کہا ہے: باپ کے ساتھ کسی کی کوئی ولایت نہیں ہے اور اگر باپ فوت ہو جائے تو پھر دادا، پھر دادے کے باپ کا باپ، کیونکہ یہ سب کے سب آباء ہیں۔ اور دادا کے بعد ولایت بھائیوں کی ہوتی ہے، پھر اس کے لئے جو

ان کے بعد زیادہ قریبی ہو۔

مزنی نے قول جدید میں کہا ہے: وہ جو ماں کی طرف سے منفرد ہو وہ نکاح میں زیادہ اولی ہوتا ہے جیسا کہ میراث میں۔ اور قدیم قول میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ دونوں برابر ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ اہل مدینہ نے امام مالک سے امام شافعی کے قول کی مثل روایت کیا ہے اور یہ کہ باپ بیٹے سے زیادہ اولی اور قریب ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ اسے الباجی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: دادا بھائیوں سے زیادہ اولی ہے اور مشہور مذہب وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

امام احمد نے کہا ہے: عورت کی شادی کرنے کے لئے ان میں سے زیادہ حقدار اس کا باپ ہے، پھر بیٹا، پھر بھائی، پھر اس کا بیٹا، پھر چچا۔ اور اسحاق نے کہا ہے: بیٹا باپ سے زیادہ اولی ہے: جیسا کہ حضرت امام مالک نے کہا ہے اور ابن منذر نے اسے ہی اختیار کیا ہے کیونکہ عمرو بن ام سلمہ نے ان کی اجازت کے ساتھ ان کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے نسائی نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے اور عنوان یہ ہے انکاح الابن امہ۔

میں کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کثرت کے ساتھ اس سے استدلال کیا ہے اور یہ کوئی شے نہیں ہے اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جو صحیح میں ثابت ہے کہ عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں بچہ تھا اور میرا ہاتھ پیالے میں ادھر ادھر گھومتا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے بچے! تو اللہ تعالیٰ کا نام لے اور دائیں ہاتھ سے کھا اور اس سے کھا جو تیرے سامنے ہے(1)۔“

اور ابو عمر نے کتاب الاستیعاب میں کہا ہے: عمر بن ابی سلمہ کی کنیت ابو حفص ہے، وہ سرزمین حبشہ میں ۲ھ میں پیدا ہوئے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس وقت ان کی عمر نو برس تھی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس کی عمر اتنی ہو وہ ولی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، لیکن ابو عمر نے ذکر کیا ہے کہ ابو سلمہ کا ام سلمہ سے ایک دوسرا بیٹا تھا، اس کا نام سلمہ تھا اور یہی وہ ہے جس نے اپنی ماں ام سلمہ کا نکاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور سلمہ کی عمر بڑے بھائی عمر بن ابی سلمہ سے زیادہ تھی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کے اعتبار سے زیادہ حافظ تھے اور ان کے بھائی عمر نے ان سے روایت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آدمی کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جو دور کے اولیاء میں سے ہو اور وہ کسی عورت کی شادی کرے۔ اسی طرح واقع ہوا ہے اور اقرب عبارت یہ ہے کہ کہا جائے: ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہے جس کی شادی اس کے اولیاء میں سے بعیدی ولی کرتا ہے درآنحالیکہ قریبی ولی حاضر ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اگر قریبی ولی نے اس میں سے کسی شے کا انکار نہ کیا اور نہ ہی اس نے اسے رد کیا تو وہ نکاح نافذ ہو

1۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 4957، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گا اور اگر آپ نے اس کا انکار کیا اور وہ شیبہ ہو یا باکرہ بالغہ ہو یتیم ہو اور اس کا کوئی وصی نہ ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور اہل مدینہ کی جماعت کا قول اس بارے میں مختلف ہے۔ سو ان میں سے کچھ والوں نے کہا ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا اور وہ نافذ ہو جائے گا، کیونکہ وہ ایسا نکاح ہے جو اصول اور خاندان میں سے ولی کی اجازت کے ساتھ منعقد ہوا ہے اور ان میں سے بعض نے کہا ہے کہ نافذ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ اولیاء میں افضل اور اعلیٰ رتبہ کا ولی موجود ہے اور وہ مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اکثر اصحاب کے نزدیک ان کے مذہب کا ماحصل یہی ہے اور اسے ہی اسمٰعیل بن اسحاق اور ان کے متبعین نے اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سلطان اس میں غور و فکر کرے گا اور وہ ولی اقرب سے اس شے کے بارے پوچھے گا جسے وہ ناپسند کر رہا ہے پھر اگر وہ اسے نافذ کرنا مناسب سمجھے تو اسے نافذ کر دے اور اگر اسے رد کرنا مناسب سمجھے تو اسے رد کر دے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ قریبی ولی ہر حال میں اسے رد کر دے گا، کیونکہ وہ اس کا حق ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے رد کرنے اور اس کی اجازت دینے کا اختیار ہے جب تک کہ عرصہ طویل نہ ہو اور وہ بچوں کو جنم نہ دے۔ یہ تمام اقوال اہل مدینہ کے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر ولی اقرب محبوس یا سفیہ ہو تو پھر اس کے بعد اولیاء میں سے جس کا مرتبہ ہو وہ اس کی شادی کر دے اور اسے ان میں میت کی طرح شمار کیا جائے۔ اسی طرح جب ولی اقرب غیبت بعیدہ پر غائب ہو یا اس طرح غائب ہو کہ جلدی اس کے واپس لوٹنے کی امید نہ ہو تو پھر بھی اس کے بعد والا ولی اس کی شادی کر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اقرب ولی غائب ہو اور اس کے پیچھے اس کی شادی کرنے والا کوئی نہ ہو تو حاکم اس کی شادی کر سکتا ہے۔ پہلا قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ جب دو ولی قرب میں واقع ہوں اور ان میں سے ایک غائب ہو اور عورت اپنے عقد نکاح کی ذمہ داری حاضر ولی کے سپرد کر دے تو جب غائب ولی واپس آئے تو اس کے لئے انکار کی اجازت نہیں۔ اور اگر دونوں حاضر ہوں اور عورت اپنا معاملہ ان میں سے ایک کے حوالے کرے تو وہ دوسرے ولی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کر سکتا اور اگر دونوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر حاکم اس میں غور و فکر کرے اور ان دونوں میں سے جس کو عورت کے حق میں اچھا سمجھے اس کی رائے کے مطابق فیصلہ کر دے۔ اسے ابن وہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ رہی نکاح میں شہادت! تو یہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک رکن نہیں ہے۔ اور اس بارے میں اس کی شہرت اور اعلان ہی کافی ہوگا اور یہ کہ وہ نکاح خفیہ اور سری ہونے سے نکل جائے۔

ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اگر کسی نے چند کے ساتھ نکاح کیا اور گواہوں کو حکم دیا کہ وہ اسے چھپا کر رکھیں تو نکاح جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ نکاح سر ہے اور اگر اس نے بغیر گواہوں کے غیر سری انداز میں نکاح کیا تو وہ جائز ہے اور وہ دونوں اس میں گواہ بنالیں جس سے وہ دو چار ہوں گے۔

ابن وہب نے امام مالک سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ وہ ایک عورت سے دو آدمیوں کی شہادت کے ساتھ شادی کرتا ہے اور ان دونوں کو چھپانے کے لئے کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ان دونوں کے درمیان طلاق کے ساتھ تفریق کر دی جائے گی اور نکاح جائز نہ ہوگا اور اگر آدمی نے اس کے ساتھ دخول کیا تو اس کے لئے مہر ہوگا اور دونوں گواہوں کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہا اور ان دونوں کے اصحاب نے کہا ہے: جب کسی نے دو شاہدوں کی موجودگی میں کسی عورت سے شادی کی اور اس نے ان دونوں کو کہا: تم اسے خفیہ رکھنا تو نکاح جائز ہوگا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ ہمارے ساتھی یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا قول ہے۔ انہوں نے کہا: ہر وہ نکاح جس پر دو آدمی گواہ ہوں تحقیق وہ سر (خفیہ) کی حد سے نکل گیا اور میرا گمان ہے کہ اسے لیث سے ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ امام شافعی، اہل کوفہ اور ان کے متبعین کے نزدیک سر سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ نکاح جس پر دو یا دو سے زیادہ آدمی گواہ نہ ہوں اور اسے ہر حال میں فسخ کر دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام شافعی کا قول اس حدیث کے مطابق زیادہ صحیح ہے جسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: دو عادل شاہدوں اور ولی مرشد کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہے اور اس بارے میں جو کچھ میں نے جانا ہے، صحابہ کرام میں سے کسی نے آپ کی مخالفت نہیں کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے لئے اس سے استدلال کیا ہے کہ بیوع جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ان میں عقد کے وقت گواہ بنانا ہے اور اس پر دلیل قائم ہے کہ گواہ بنانا بیوع کے فرائض میں سے نہیں ہے اور وہ نکاح جس میں اللہ تعالیٰ نے گواہ بنانے کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کے لئے زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ گواہ بنانا اس کی شروط اور فرائض میں سے نہ ہو، بلاشبہ مقصود انساب کی حفاظت کے لئے اعلان اور ظہور ہے۔ اور اشہاد کی ضرورت عقد کے بعد تب ہوتی ہے جب دو نکاح کرنے والوں کے درمیان کوئی اختلاف یا ایک دوسرے کے خلاف کوئی دعویٰ منعقد ہو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: اعلنوا النکاح (1) تم نکاح کا اعلان کرو۔ امام مالک کا یہ قول ابن شہاب اور اکثر اہل مدینہ کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10 ۔ قولہ تعالیٰ: وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ اور مومن غلام خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ مشرک حسب والے سے بہتر ہے۔ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ اگرچہ اس کا حسب اور اس کا مال تمہیں اچھا لگے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: مومن آدمی اور اسی طرح وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ سے مراد مومنہ عورت ہے جیسا کہ ہم نے اسے بیان کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمہارے تمام مرد اللہ تعالیٰ کے غلام اور تمہاری تمام عورتیں اللہ تعالیٰ کی باندیاں ہیں۔“ مزید فرمایا: ”تم اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے نہ روکو (2)۔“ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: نِعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ (ص) (بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ) یہی وہ اچھا اور مستحسن قول ہے جس پر اس آیت کو محمول کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ نزاع ختم ہو جاتا ہے اور اختلاف زائل ہو جاتا ہے۔ واللہ الموفق

1۔ ابن ماجہ، باب اعلان النکاح، حدیث نمبر 1884، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 4655

پس وہ دونوں نکل گئے اور پھر ان دونوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دودھ کا ہدیہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے پیچھے بھیج دیا اور ان دونوں نے خوب سیر ہو کر پیا اور انہیں پہچان ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر ناراض نہیں۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: یہودی اور مجوسی حیض والی عورتوں سے دور رہتے تھے اور عیسائی حیض والی عورتوں سے مجامعت کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان کا قصد کرتے ہوئے یہ حکم ارشاد فرمایا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: عَنِ الْمَحِيضِ۔ الْمَحِيضِ سے مراد حیض ہے اور یہ مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ حیضا و محاضا و محیضا فھی حائض اور یہ حائضۃ بھی ہے۔ فراء نے ایک شعر میں کہا ہے:

کحائضۃ یُزنیٰ بھا غیرَ طاہر (جیسا کہ حیض والی عورت اس سے ناپاک حالت میں زنا کیا جاتا ہے)

اور (کہا جاتا ہے) نساء حیض و حوائض اور الحیضۃ کا معنی ہے: ایک بار۔ اور الحیضۃ کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور جمع حیض ہے۔ اور المحیضۃ کا معنی وہ کپڑے کا ٹکڑا بھی ہے جس کے ساتھ عورت اپنی فرج کو (حیض آنے کے وقت) باندھتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: لیتنی کنتُ حِیضۃً مُلقاۃً (1) (اے کاش! میں وہ کپڑے کا ٹکڑا ہوتی جسے پھینک دیا جاتا ہے۔) اسی طرح المحیضۃ ہے اور اس کی جمع المحائض ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ المحیض زمان و مکان سے عبارت ہے اور نفس حیض کو بھی محیض کہا جاتا ہے یہ زمان و مکان میں اصل ہے اور حیض کے معنی میں مجاز ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے: المحیض حیض کا اسم (نام) ہے اور اسی کی مثل رؤبہ کا معیشت کے بارے قول ہے۔

الیک أشکو شدۃ المعیش ... و مر أعوام نتفن ریشی

میں زندگی کی تنگی اور شدت کی تیرے پاس شکایت کر رہا ہوں اور سال ہا سال گزر گئے انہوں نے میرے بال و پر اکھیڑ دیے ہیں۔

اور لغت کی اصل سیلان (بہہ پڑنا) اور انفجار (پھوٹ پڑنا) سے ہے۔ کہا جاتا ہے: حاض السیل و فاض سیلاب پھوٹ پڑا اور بہہ گیا اور حاضت الشجرۃ یعنی درخت کی رطوبت ظاہر ہو گئی بہہ گئی۔

اور اسی طرح الحیض بمعنی الحوض ہے کیونکہ پانی اس کی طرف بہتا ہے اور عرب یاء کی جگہ واؤ اور واؤ کی جگہ یاء داخل کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی جنس سے ہیں۔

ابن عرفہ نے کہا ہے: المحیض اور الحیض کا معنی اس کے محل کی طرف خون کا جمع ہونا ہے اور اسی سبب سے حوض کو بھی یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: حاضت المرأۃ و تحیضت، و درست و عرکت، و طمثت، تحیض حیضا و محاضا و محیضا جبکہ معلوم اوقات میں عورت کا خون بہہ پڑے۔ اور جب وہ غیر معلوم ایام میں جاری ہو اور حیض کی رگ کے سوا کہیں اور سے آئے تو پھر تو کہے گا: استحیضت فھی مستحاضۃ کہ عورت مستحاضہ ہو گئی۔ (یہ) ابن عربی نے کہا ہے۔ اور اس کے آٹھ اسماء ہیں (۱) حائض (۲) عارک (۳) فارک (۴) طامس (۵) دارس (۶) کابر (۷) ضاحک (۸) طامث۔

1۔ مصنف عبدالرزاق، 1/ 5، 206

حضرت مجاہد نے ارشاد باری تعالیٰ: فَضَحِكَتْ کا معنی بیان کیا ہے: حاضت۔ یعنی وہ حائضہ ہو گئی۔ اور قول باری تعالیٰ: فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ یعنی حضن (یعنی جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو وہ حائضہ ہو گئیں۔) اس کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی فرج سے ظاہر بہنے والا خون دیکھنے کی حالت میں تین احکام ہیں۔ پس ان میں سے حیض معروف ہے اور خون حیض سیاہ گاڑھا ہوتا ہے جس پر سرخی غالب ہو اور یہ کہ عورت اس کی وجہ سے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا ترک کر دے گی۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور کبھی یہ خون متصل (مسلسل) آتا ہے اور کبھی منقطع ہو جاتا ہے (یعنی ایک دو دن کے وقفے سے آتا ہے) پس اگر یہ متصل جاری رہے تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور اگر منقطع ہو اور عورت ایک دن خون دیکھے اور ایک دن طہر یا دو دو دن خون دیکھے اور دو دن یا ایک دن طہر تو بلاشبہ وہ خون کے دنوں میں نماز چھوڑ دے گی اور اس کے انقطاع کے وقت غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی، پھر وہ خون کے ایام کو اکٹھا کرے گی اور درمیان میں آنے والے ایام طہر کو لغو چھوڑ دے گی اور وہ انہیں عدت اور استبراء کی صورت میں طہر شمار نہیں کرے گی۔ حیض عورتوں کی فطرت میں ہے اور ان کی معروف جبلی عادت ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1) نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف تشریف لائے اور آپ عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ کرو کیونکہ اہل نار میں سے اکثر تم مجھے دکھائی گئی ہو۔ تو انہوں نے عرض کی: کیوں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور خاوندوں کی نافرمانی کرتی ہو۔ میں نے تم سے بڑھ کر ناقصات عقل و دین کسی کو نہیں دیکھا جو ایک محتاط آدمی کی عقل وفہم کو ختم کر دے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دین کے اعتبار سے ہم میں کون سی کمی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا عورت کی شہادت آدمی کی شہادت کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، کیوں نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ ان کی عقل کی کمی کی وجہ سے ہے اور کیا جب وہ حائضہ ہو جائے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے کیا اسی طرح نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کی: ہاں، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کے دین کی کمی کی وجہ سے ہے۔"

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ عورت روزے کی قضا کرے گی اور نماز کی قضا نہیں کرے گی۔

حضرت معاذہ کی حدیث ہے انہوں نے کہا: میں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا اور کہا: حیض والی عورت کو کیا ہے کہ وہ روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا نہیں کرتی؟ تو انہوں نے فرمایا: کیا تو حروریہ (*) ہے؟ میں نے

1۔ بخاری شریف، باب ترک الحائض الصوم، حدیث نمبر 293، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

*: حروریہ خوارج کا ایک گروہ ہے جو کوفہ کے قریب ایک گاؤں حروراء کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا تھا۔ ان کے نزدیک ایسی ہی اجمالی شدت اور سختی ہے جیسا کہ معروف ہے۔

کہا: میں حروریہ تو نہیں۔ البتہ میں پوچھ رہی ہوں۔ تو پھر انہوں نے فرمایا: چونکہ وہ ہمیں لاحق ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا گیا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1) اور جب عورت کا خون ختم ہو جائے تو اس کے لئے اس سے پاکیزگی اور طہارت غسل ہے اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے حیض کی مقدار میں اختلاف کیا ہے:

فقہائے مدینہ نے کہا ہے: بلاشبہ حیض پندرہ دنوں سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ جائز ہے کہ وہ پندرہ دن اور اس سے کچھ کم ہو اور جو پندرہ دنوں سے زیادہ ہوگا وہ حیض نہ ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے۔ یہ مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا ہے۔

اور امام مالک سے یہ بھی مروی ہے کہ حیض کے قلیل ہونے اور کثیر ہونے کا کوئی وقت نہیں مگر وہی جو عورتوں میں پایا جاتا ہے (یعنی ان کی عادت ہوتی ہے)۔ گویا آپ نے اپنا پہلا قول چھوڑ دیا ہے اور عورتوں کی عادت کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کم سے کم طہر پندرہ دن ہے۔ بغداد کے رہنے والے اکثر اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی، امام اعظم ابو حنیفہ، ان دونوں کے اصحاب اور امام ثوری رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور اس باب میں صحیح قول یہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت تین حیض مقرر کی ہے اور جنہیں بڑھاپے یا صغر سنی کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو ان کی عدت تین ماہ مقرر کی ہے۔ گویا کہ ہر حیض ایک مہینے کا عوض ہے اور مہینہ طہر اور حیض دونوں کو جامع ہوتا ہے۔ پس جب حیض کم ہوگا تو طہر زیادہ ہوگا اور جب حیض کے دن زیادہ ہوں گے تو طہر کے دن کم ہوں گے۔ پس جب حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہو تو واجب ہے کہ اس کے مقابلے میں کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہو۔ تاکہ ایک مہینے میں حیض اور طہر دونوں مکمل ہو جائیں اور قرآن و سنت کے دلائل کے ساتھ عورتوں کی خلقت اور ان کی فطرت میں اغلباً یہی متعارف ہے۔

اور امام شافعی نے فرمایا ہے: کم سے کم حیض کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی اکثر مدت پندرہ دن ہے اور ان سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی مروی ہے کہ اسے عورتوں کے عرف اور عادت کی طرف لوٹا دیا گیا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک جو خون تین دنوں سے کم ہوگا وہ استحاضہ ہوگا۔ یہ نماز کے مانع نہیں ہوتا مگر جب کہ یہ پہلی بار ظاہر ہو۔ کیونکہ اس کی انتہائی مدت معلوم نہیں ہوتی۔ پھر عورت پر ان اوقات کی نماز قضا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح وہ خون جو دس دنوں سے زیادہ ہو (وہ بھی) اہل کوفہ کے نزدیک استحاضہ ہے۔ اور اہل حجاز کے نزدیک جو پندرہ دنوں سے زائد ہوگا وہ استحاضہ ہوگا اور جو ایک دن اور ایک رات سے کم ہوگا امام شافعی کے نزدیک وہ استحاضہ ہوگا اور یہی قول امام اوزاعی اور طبری کا ہے اور جنہوں نے کہا ہے کہ حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے ان میں سے حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت ابو ثور اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ہیں۔

1۔ بخاری شریف، باب لا تقضی الحائض الصلوۃ، حدیث نمبر 310، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

امام اوزاعی نے کہا ہے: ہمارے پاس ایک عورت ہے صبح کے وقت حائضہ ہوتی ہے اور شام کے وقت پاک ہو جاتی ہے۔

حیض کی اکثر اور اقل مدت، طہر کی اقل مدت، احتیاط اور اس کی حجت کے بارے میں ہم نے اس باب میں وہی ذکر کیا ہے جسے علماء نے اپنایا ہے۔

کتاب المقتبس فی شرح موطا مالک بن انس میں ہے کہا: اگر کسی عورت کو پہلی بار حیض آئے تو امام شافعی کے قول کے مطابق جو خون وہ پہلی بار دیکھے گی وہ پندرہ دن تک بیٹھی رہے گی پھر وہ غسل کرے گی اور چودہ دن کی نماز لوٹائے گی۔

اور امام مالک نے کہا ہے: وہ نماز قضا نہیں کرے گی اور اس کے خاوند کو اس سے روکا جائے گا۔ علی بن زیاد نے ان سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کی مقدار بیٹھی رہے گی اور یہی قول حضرت عطا اور ثوری وغیرہ کا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ ایک دن اور ایک رات بیٹھے گی، پھر وہ غسل کرے گی اور نماز پڑھے گی اور اس کا خاوند اس کے پاس نہ آئے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ دس دن نماز چھوڑے رکھے گی۔ پھر غسل کرے گی اور بیس دن تک نماز پڑھتی رہے گی۔ پھر بیس دنوں کے بعد دس دن تک نماز چھوڑ دے گی، پس اس کی یہی حالت جاری رہے گی یہاں تک کہ اس سے خون ختم ہو جائے۔ رہی وہ عورت جس کے دن معلوم ہوں تو وہ ایام معلومہ کے مطابق تین دنوں تک احتیاط کرے گی۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے: جب تک وہ پندرہ دنوں سے تجاوز نہ کرے۔ امام شافعی نے کہا ہے: جب اس کے دن گزر جائیں تو بغیر کسی احتیاط کے وہ غسل کرے گی۔

خون میں سے دوسرا دم نفاس ہے جو ولادت کے وقت ظاہر ہوتا ہے: علماء کے نزدیک اس کے لئے بھی معلوم حد ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ وہ دو مہینے ہیں۔ یہی امام مالک کا قول ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ چالیس دن ہیں۔ یہی امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے علاوہ بھی قول کیے گئے ہیں۔

اور اس سے طہارت اس کے ختم ہونے کے وقت حاصل ہوتی ہے اور اس کا غسل، غسل جنابت کی طرح ہے۔ قاضی ابو محمد عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: حیض اور نفاس کا خون گیارہ چیزوں سے روکتا ہے اور وہ نماز کا واجب ہونا، اسے پڑھنا صحیح ہونا اور روزہ رکھنا، کہ اس کا وجوب ہونا (یعنی روزے کا وجوب برقرار رہتا ہے لیکن اسے رکھنا مؤخر ہو جاتا ہے) اور فرق کا فائدہ یہ ہے کہ روزے کی قضا لازم ہے اور نماز کی قضا لازم نہیں۔ فرج اور اس کے سوا میں جماع کرنا، عدت، طلاق، طواف، قرآن کریم کو مس کرنا، مسجد میں داخل ہونا، اس میں اعتکاف کرنا اور قرآن کی قراءت میں دو روایتیں ہیں۔

اور تیسری قسم کا خون وہ ہے جو نہ عورتوں کی عادت ہے اور نہ ان کی طبع اور خلقت میں داخل ہے۔ بلکہ یہ ایک رگ ہے جو کٹ جاتی ہے اور اس سے سرخ رنگ کا خون بہتا ہے اور یہ خون منقطع نہیں ہوتا مگر جب جلد درست اور معتدل ہو جائے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ عورت اس کی موجودگی میں بھی پاک ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے نماز، روزے سے مانع نہیں ہوتا۔ اس پر

علماء کا اجماع ہے اور آثار مرفوعہ کا اتفاق ہے بشرطیکہ یہ معلوم ہو کہ یہ رگ کا خون ہے خون حیض نہیں ہے۔

امام مالک (1) نے ہشام بن عروہ عن ابیہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: فاطمہ بنت ابی حبیش نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں پاک نہیں ہوتی! کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ وہ رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے۔ جب تجھے حیض آئے تو نماز چھوڑ دے اور جب اس کی مقدار (دن) گزر جائیں تو تو اپنے آپ سے خون دھو ڈال اور نماز پڑھ لے۔" یہ حدیث اپنے صحیح ہونے اور اپنے الفاظ قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ حائضہ اور مستحاضہ کے احکام تفصیل سے بیان کرتی ہے۔ اس باب میں جو روایات ہیں یہ حدیث ان سے زیادہ صحیح ہے اور یہ حدیث اس کا رد کرتی ہے جو عقبہ بن عامر اور مکحول سے مروی ہے کہ حیض والی عورت ہر نماز کے وقت غسل کرے گی اور وضو کرے گی اور بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوگی۔ اور اس میں ہے کہ حائضہ عورت نماز نہیں پڑھے گی اور اس پر تمام علماء کا اجماع ہے سوائے خوارج کے ایک گروہ کے کہ وہ کہتے ہیں: حیض والی عورت پر نماز ہے۔ اور اس حدیث میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ مستحاضہ عورت پر سوائے اس غسل کے جو وہ انقطاع حیض کے وقت کرتی ہے اور کوئی غسل لازم نہیں، اگر اس کے علاوہ بھی غسل اس پر لازم ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے اسے حکم ارشاد فرما دیتے اور اس میں ان کے قول کا بھی رد ہے جن کا خیال ہے کہ اس پر ہر نماز کے لئے غسل لازم ہے اور ان کے قول کا بھی جن کا خیال یہ ہے کہ وہ دن کی دو نمازوں کو ایک غسل کے ساتھ جمع کرے اور رات کی دو نمازوں کے لئے ایک غسل کرے اور صبح کی نماز کے لئے علیحدہ غسل کرے اور ان کے قول کا جنہوں نے کہا: وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی اور حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے گی۔ اور حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا بھی کہ وہ ایک طہر سے دوسرے طہر تک غسل کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کسی شے کا حکم اسے ارشاد نہیں فرمایا۔ اور اس میں اس کے قول کا بھی رد ہے جس نے انتظار و احتیاط کی بات کی ہے۔ کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے (فاطمہ کو) یہ حکم دیا کہ جب تجھے یقین ہو جائے کہ حیض ختم ہو چکا ہے تو تو غسل کرلے اور نماز پڑھ لے، آپ نے اسے یہ حکم نہیں دیا کہ وہ حیض آنے یا نہ آنے کے انتظار میں تین دن تک نماز چھوڑے رکھے اور احتیاط نماز پڑھنے میں ہوتی ہے نہ کہ اسے چھوڑنے میں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ هُوَ اَذًى یعنی یہ وہ شے ہے جس کے سبب عورت اور اس کے سوا مرد کو اذیت اور تکلیف ہوتی ہے یعنی خون حیض کی بدبو کے سبب۔ اور الاذی قذر اور نجاست سے کنایہ ہے۔ اور اس کا اطلاق قول مکروہ پر بھی ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى (البقرہ: 264) (مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر) یعنی اس مکروہ اور ناپسندیدہ قول کے ساتھ جو تم اسے سناتے ہو اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ دَعْ اَذٰىهُمْ (الاحزاب: 48) (اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی۔) یعنی آپ منافقین کی اذیت رسانی کی پرواہ

1۔ بخاری شریف، باب لا ستحاضۃ، حدیث نمبر 295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ذبح کریں تو آپ انہیں جزا دیں مگر یہ کہ ان میں امیر بنا دیں۔ اور حدیث طیبہ میں ہے: وَأَمِيطُوا عَنْهُ الأَذَى (1) اور اس سے اذیت کو دور کرو۔ اس میں الاذیٰ سے مراد وہ بال ہیں جو پیدائش کے وقت بچے کے سر پر ہوتے ہیں اور ساتویں دن اس سے مونڈ دیے جاتے ہیں اور یہی عقیقہ ہے اور حدیث ایمان میں ہے: وأدناها إماطة الأذى عن الطريق راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا۔ یعنی کانٹے، پتھر اور ان کی طرح کی دیگر چیزیں جن سے گزرنے والا کسی تکلیف میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور رب کریم کا ارشاد: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِنْ مَطَرٍ (النساء: 102) اس کا ذکر آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ دم استحاضہ بہنے کے سبب جنہوں نے مستحاضہ عورت سے وطی کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے استدلال کیا اور کہا: ہر خون تکلیف دہ (نجس) ہے اسے کپڑے اور بدن سے دھونا واجب ہوتا ہے، پس دم حیض اور استحاضہ کے درمیان مباشرت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ مکمل طور پر ناپاکی اور نجاست ہے۔ اور رہی نماز تو اس کی رخصت کے بارے حدیث طیبہ موجود ہے جیسا کہ سلس البول کی بیماری کی حالت میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، یہ قول ابراہیم نخعی، سلیمان بن یسار، حکم بن عیینہ، عامر شعبی، ابن سیرین اور زہری کا ہے اور حسن کی جانب سے اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

اور یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ مستحاضہ کا خاوند اس کے ساتھ صحبت نہیں کرے گا اور اسی طرح ابن علیہ اور مغیرہ بن عبدالرحمن نے کہا ہے اور یہ اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سے اعلیٰ ترین افراد میں سے ہیں اور ابو مصعب نے بھی یہی کہا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا جاتا ہے۔

اور جمہور علماء نے کہا ہے: مستحاضہ عورت روزہ رکھ سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے، طواف کعبہ کر سکتی ہے اور قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے اور اس کا خاوند بھی اس کے ساتھ مباشرت کر سکتا ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: اہل فقہ و علم نے اسی کا حکم دیا ہے، اگرچہ اس کا خون بہت زیادہ بھی ہو اور آپ سے ابن وہب نے روایت کیا ہے۔

اور امام احمد فرماتے ہیں: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ خاوند اس سے وطی نہ کرے، البتہ اگر عرصہ طویل ہو جائے تو پھر وطی کر سکتا ہے۔

اور مستحاضہ کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ جماع کرے اگرچہ اس کا خون اس کی ایڑیوں پر بہہ رہا ہو۔

اور امام مالک نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ وہ رگ کا خون ہے وہ حیض نہیں ہے۔" پس جب وہ حیض نہیں ہے تو پھر کون سی شے ہے جو خاوند کو اس کے پاس جانے سے روک سکتی ہے حالانکہ وہ نماز بھی پڑھ رہی ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مستحاضہ کے خون کے بارے میں یہ حکم فرما دیا ہے کہ وہ نماز کے مانع نہیں ہے اور وہ عورت اس حالت میں ذکر کی عبادات کے سوا بھی عبادت کر سکتی ہے تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس کے لیے حیض کے

1۔ بخاری شریف، باب إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة، حدیث نمبر 5049، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ساتھ پڑھا ہے اور حضرت ابی اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں یتطھرن ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ولا تقربوا النساء فی محیضہن واعتزلوہن حتی یتطھرن ہے۔ اور علامہ طبری نے طا کی تشدید والی قراءت کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: یہ معنی یغتسلن ہے، کیونکہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ آدمی پر حرام ہے کہ وہ اپنی زوجہ کا خون ختم ہونے کے بعد اس کے پاک ہونے سے پہلے اس کے قریب جائے۔ انہوں نے کہا: بلاشبہ علماء میں اختلاف ہے کہ وہ کیا ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے کہ طہر سے مراد پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: کہ اس سے مراد نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا ہے اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس سے مراد شرمگاہ کو دھونا ہے۔ اور یہ اسے اپنے خاوند کے لئے حلال کر دے گا اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا۔

اور ابو علی فارسی نے طا کی تخفیف والی قراءت کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ثلاثی ہے اور یحیض کی ضد ہے اور یہ بھی ثلاثی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ طہارت حاصل کر لیں۔ یہی موقف امام مالک اور جمہور علماء کا ہے اور یہ کہ وہ طہارت جس کے سبب حائضہ عورت سے جماع حلال ہو جاتا ہے جب اس کا خون ختم ہو جائے وہ یہی پانی کے ساتھ طہارت حاصل کرنا ہے جیسا کہ جنبی کی طہارت (پانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے) اور تیمم یا کوئی اور اس کی جانب سے جائز نہ ہوگا، یہی امام مالک، امام شافعی، طبری، محمد بن مسلمہ، اہل مدینہ اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی کہا ہے۔ اور یحییٰ بن بکیر اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: جب حیض والی عورت پاک ہو جائے (یعنی اس کا خون ختم ہو جائے) اور اس نے اسی جگہ تیمم کر لیا جہاں پانی نہ ہو تو وہ اپنے خاوند کے لئے حلال ہو گئی اگرچہ اس نے غسل نہ بھی کیا ہو۔

حضرت مجاہد، عکرمہ اور طاؤس رحمہم اللہ نے کہا ہے: خون کا منقطع ہونا ہی اسے زوج کے لئے حلال کر دیتا ہے لیکن اسے وضو کر لینا چاہئے۔

امام اعظم ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے: اگر اس کا خون دس دن گزرنے کے بعد ختم ہوا تو آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ غسل سے پہلے اس سے وطی کرے اور اگر خون کا انقطاع دس دنوں سے پہلے پہلے ہو گیا تو پھر جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے یا اس پر نماز کا وقت داخل ہو جائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی کوئی وجہ اور علت نہیں، تحقیق انہوں نے حائضہ عورت کے لئے اس کا خون منقطع ہونے کے بعد اس طرح فیصلہ کیا ہے جو عدت میں محبوس ہو اور انہوں نے اس کے خاوند کو کہا: عورت کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جب تک وہ تیسرے حیض سے غسل نہ کر لے، پس ان کے اس قول کے قیاس کی بنا پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے وطی کی جائے یہاں تک کہ وہ غسل کر لے۔ یہ اہل مدینہ کے ساتھ موافقت ہے۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس میں حکم کو دو شرطوں پر معلق کیا ہے: ان میں سے ایک خون کا منقطع ہونا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰی یَطْهُرْنَ اور دوسرا پانی کے ساتھ غسل کرنا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ یعنی جب وہ پانی کے ساتھ غسل کر لیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء: 6) (اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) کو) اس میں بھی حکم دو شرطوں پر معلق ہے اور حکم

اعتکاف کی حالت میں نہ ہو۔ اصم نے یہی کہا ہے۔ اور ابن عباس اور ابورزین نے کہا ہے: (معنی ہے) طہر کی جانب سے نہ کہ حیض کی جانب سے اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور محمد بن حنفیہ نے کہا ہے: معنی ہے من قبل الحلال دون قبل الزنی یعنی حلال طریقے سے نہ کہ زنا کے طریقے سے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۝ اس میں اختلاف ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ مراد ہے گناہوں اور شرک سے توبہ کرنے والے اور المتطهرون یعنی جنابت اور حدث کے لاحق ہونے کے وقت پانی سے طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے والے۔ حضرت عطا وغیرہ نے یہی کہا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا: التوابین سے مراد گناہوں سے توبہ کرنے والے ہیں اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کرنے سے توبہ کرنے والے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: گویا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف دیکھا ہے جو لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں بطور حکایت ہے: اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ۝ (الاعراف) (باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنتے ہیں۔)

اور یہ بھی قول ہے: المتطهرون وہ ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیے اور اگر کہا جائے کہ جس نے گناہ کیے ہیں اس کا ذکر اس پر مقدم کیسے ہو سکتا ہے جس نے گناہ نہیں کیے؟ تو جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر پہلے کیا ہے تاکہ توبہ کرنے والا رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہو جائے اور متطہر اپنی ذات کے بارے میں عجب اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں ذکر کیا ہے: فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (فاطر: 32) اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو اور پہلے پہلے کرو اپنی بھلائی کے کام اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو۔"

اس میں چھ مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ائمہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1) اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ فرمایا: یہودی کہتے تھے جب کوئی آدمی اپنی عورت کے ساتھ اس کی دبر کی جانب سے اس کی قبل (فرج) میں وطی کرتا ہے تو بچہ بھینگا ہوتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ اور زہری سے ایک روایت میں یہ زائد ہے: اگر چاہے تو اسے اوندھا لٹائے اور اگر چاہے تو سیدھا لٹائے مگر وطی ایک سوراخ میں ہو اور

(1) صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4164، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صمام کا لفظ صاد کے ساتھ بھی مروی ہے۔ ترمذی نے یہی کہا ہے۔(1)

اور امام بخاری نے حضرت نافع سے روایت کیا ہے (2) کہ انہوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب قرآن کریم پڑھتے تھے تو کسی سے گفتگو نہ کرتے تھے یہاں تک کہ قراءت سے فارغ ہو جاتے۔ پس ایک دن میں قرآن کریم اٹھائے ہوئے تھا اور انہوں نے سورۃ البقرہ پڑھی یہاں تک کہ اس مقام (اس آیت) پر پہنچ کر رک گئے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کیونکر یہ آیت نازل کی گئی ہے؟ میں نے عرض کی: نہیں۔ فرمایا: یہ اس اس میں نازل ہوئی ہے، پھر آپ آگے پڑھنے لگے۔

اور عبد الصمد نے بیان کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے بتایا کہ مجھے ایوب نے نافع کے واسطے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بیان کی ہے: فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ کے بارے انہوں نے کہا: یاتیہا فی۔ یعنی اس میں مجرور محذوف ہے۔ حمیدی نے کہا ہے: وہ الفرج ہے (3) یعنی وہ اس کے ساتھ فرج میں جماع کرے۔

اور ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: بلاشبہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو وہم ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بلاشبہ یہ انصار کا ایک قبیلہ تھا وہ بت پرست تھے اور اس قبیلے کے ساتھ یہودی بھی تھے اور وہ اہل کتاب تھے اور وہ ان کو اپنے اوپر علم میں فضیلت دیتے تھے اور وہ بہت سے افعال میں ان کی اقتدا کرتے تھے اور اہل کتاب کے امور میں سے ایک یہ تھا کہ وہ عورتوں کے ساتھ ایک طرف پر جماع کرتے تھے اور یہ عورت کے لئے زیادہ پردہ پوشی والا ہوتا۔ پس انصار کے اس قبیلے نے ان کے افعال میں سے اس فعل کو بھی اختیار کر لیا اور یہ قبیلہ قریش میں سے تھا جو عورتوں کو گدی کے بل لٹا کر ان سے وطی کرتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے، کبھی سامنے کی جانب سے، کبھی پیچھے کی جانب سے اور کبھی چت لٹا کر، پس جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے انصار کی ایک عورت سے شادی کی اور وہ اس کے ساتھ وہی کچھ کرنے لگا تو اس نے اسے ناپسند کیا اور ایسا کرنے سے روکا اور کہا: ہمارے ہاں عورت کے ساتھ ایک طرف سے جماع کیا جاتا ہے پس تو بھی اسی طرح کر ورنہ مجھ سے دور ہو جا یہاں تک کہ ان دونوں کا معاملہ بڑھ گیا اور حضور نبی مکرم ﷺ تک جا پہنچا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ یعنی سامنے کی جانب سے، پیچھے کی جانب سے اور چت لیٹنے کی حالت میں (کھیتی کی جگہ میں جماع کرو) اور یہی محل ولد ہے۔(4)

امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں ہلاک ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: کس شے نے تمہیں ہلاک کیا ہے؟ عرض کی: آج رات میں نے اپنے پالان (مراد بیوی ہے) کو الٹا کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ راوی نے بیان کیا: پھر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ آیت وحی فرمائی:

1۔ سنن ترمذی، باب سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2904، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی جامع النکاح، حدیث نمبر 1849، ایضاً

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، اقبل وادبر واتق الدبر والحیضة (تو سامنے کی جانب سے اور پیچھے کی جانب سے وطی کر اور دبر اور حالت حیض میں وطی کرنے سے بچ۔) فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔(1)

اور نسائی نے ابوالنضر سے بیان کیا ہے کہ اس نے نافع مولی ابن عمر رضی اللہ عنہما کو کہا: تیرے بارے میں اکثر قول ہے کہ تم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کرتے ہو کہ انہوں نے یہ فتوی دیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں جماع کیا جا سکتا ہے تو حضرت نافع نے فرمایا: تحقیق انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا، البتہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ معاملہ کیسے تھا۔ ایک دن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے قرآن کریم کھولا اور میں ان کے پاس تھا یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچے۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔ فرمایا: اے نافع! کیا تو جانتا ہے اس آیت کا معاملہ کیا ہے؟ بے شک ہم گروہ قریش عورتوں کو منہ کے بل اوندھا لٹاتے تھے، جب ہم مدینہ طیبہ میں آئے اور ہم نے انصار کی عورتوں سے نکاح کیے تو ہم نے ان سے وہی کرنا چاہا جو ہم اپنی عورتوں سے کرتے تھے تو ان عورتوں نے اسے ناپسند کیا اور اسے بڑا معاملہ قرار دیا، کیونکہ انصار کی عورتوں کے ساتھ ان کے پہلوؤں کے بل جماع کیا جاتا تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى

مسئلہ نمبر 2۔ یہ احادیث تمام کیفیات اور حالت کی اباحت میں نص ہیں بشرطیکہ وطی محل حرث میں ہو، یعنی جس کیفیت میں تم چاہو پیچھے کی جانب سے اور آگے کی جانب سے، وہ پیٹھ کے بل لیٹی ہوئی ہو یا چت یا پہلو کے بل۔ اور رہا محل حرث کے سوا کسی جگہ میں وطی کرنا تو یہ مباح نہیں ہے اور نہ اسے مباح کیا جائے گا۔ اور حرث کا ذکر یہ دلالت کرتا ہے کہ محل حرث کے سوا میں وطی کرنا حرام ہے۔ اور حرث یہ تشبیہ ہے، کیونکہ ان میں بچہ بویا جاتا ہے، پس لفظ حرث واضح کرتا ہے کہ اباحت صرف اور صرف فرج میں واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ وہی بیج اولاد کا محل ہے اور شاعر نے کہا ہے:

انما الارحام ارضـ　　ـون لنا محترثات

بے شک ارحام زمینیں ہیں ہمارے لئے کھیتیاں بنائی گئی ہیں۔

فعلینا الزرع فیها　　وعلی الله النبات

پس ہمارے اوپر ان میں بیج ڈالنا ہے اور اگانا (یعنی اولاد عطا کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے۔

پس عورت کی فرج زمین کی طرح ہے اور نطفہ بیج کی مانند ہے اور بچہ نباتات کی طرح ہے۔ پس الحرث بمعنی المحترث ہے اور الحرث کو واحد لایا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل صوم وقوم صوم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَنّٰى شِئْتُمْ جمہور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ فتوی کے نزدیک اس کا معنی ہے: جس طرح تم چاہو سامنے کی جانب سے اور پشت کی جانب سے جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور انّٰی سوال کے لئے اور کسی کام کی خبر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں اور یہ لغوی اعتبار سے کیف، این اور متی سے عام ہے۔ یہی اس کا عربی استعمال ہے اور لوگوں نے اس آیت میں انہی الفاظ کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2906، ضیاء

اور سیبویہ نے کیف اور این دونوں کے ساتھ اکٹھی اس کی تفسیر بیان کی ہے۔

اور ایک فرقہ نے این کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی ہے اور یہ موقف اپنایا ہے کہ دبر میں وطی مباح ہے اور جن کی طرف یہ قول منسوب ہے وہ حضرت سعید بن مسیب، حضرت نافع، حضرت ابن عمر، حضرت محمد بن کعب قرظی اور عبد الملک بن ماجشون رحمہم اللہ ہیں اور اسے امام مالک سے ان کی اس کتاب سے بیان کیا گیا ہے اس کا نام کتاب السر ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ماہر اصحاب اور ان کے مشائخ اس کتاب کا انکار کرتے ہیں اور امام مالک کا مقام و مرتبہ اس سے کہیں بلند اور اعلیٰ ہے کہ ان کے لئے کتاب السر ہو اور یہ قول العتبیہ میں ہے۔

اور علامہ ابن عربی نے ذکر کیا ہے کہ ابن شعبان نے اس قول کے جواز کو صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت بڑی جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی روایات کتاب جماع النسوان و احکام القرآن میں منسوب کی ہیں اور الکیا الطبری نے کہا ہے: محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ وہ اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے اور وہ اس میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کرتے تھے: اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ (الشعراء) (کیا تم بدفعلی کرنے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں۔) اور فرمایا: تقدیر کلام یہ ہے: وتترکون مثل ذلک من ازواجکم یعنی تم اس کی مثل اپنی بیویاں چھوڑ دیتے ہو، اگر اس کی مثل بیویوں سے مباح نہ ہوتا تو یہ صحیح نہ ہوتا اور اس کی مثل کسی دوسرے محل میں مباح نہیں ہے یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: تم وہ کرتے ہو اور اس کی مثل مباح کو چھوڑ دیتے ہو۔

الکیا نے کہا: یہ بات محل نظر ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے: اور تم چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لئے تمہارے رب نے تمہاری بیویاں جن میں تمہاری شہوت کی تسکین ہے اور جماع کی لذت ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ حاصل ہو جاتی ہیں، پس اس معنی پر زجر و توبیخ جائز ہے۔ قول باری تعالیٰ: فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اس ارشاد گرامی کے ساتھ: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ محل جس میں واقع ہوتا ہے وہ خاص ہے اور وہ اسی میں مقصود ہے جو محل ولد ہے (یعنی جس محل میں وطی کرنے سے اولاد کا ہونا ممکن ہے وہی محل حرث ہے اور اسی میں جماع جائز ہے تو چونکہ دبر میں یہ عمل کرنے سے اولاد کا امکان نہیں اس لئے نہ وہ محل حرث ہے اور نہ ہی اس میں وطی مباح ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس مسئلہ میں یہی حق اور صحیح ہے۔

اور ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے رتقاء میں اختلاف نہیں کیا۔ یہ ایسی عورت ہے جس سے وطی نہیں کی جا سکتی، یہ عیب ہے اس کے سبب اسے رد کیا جا سکتا ہے، مگر وہ روایت جو حضرت عمر بن عبد العزیز کی طرف سے مروی ہے وہ قوی نہیں ہے وہ یہ کہ رتقاء کو نہیں لوٹایا جائے گا اور نہ کسی اور کو۔ تمام کے تمام فقہاء اس کے خلاف ہیں کیونکہ مسیس (وطی) ہی نکاح کا مقصود ہے اور اس پر ان کے اجماع میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ دبر محل وطی نہیں ہے اور اگر یہ وطی کا محل ہوتی تو پھر اسے رد نہ کیا جاتا جس کی فرج میں وطی نہ کی جا سکتی ہو۔

اور ان کے اجماع میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ ایسی بانجھ عورت جو بچے نہیں جنتی اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ اور اس مسئلہ میں صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے اور وہ جو امام مالک اور ان کے اصحاب کی طرف منسوب ہے وہ باطل ہے اور وہ اس سے بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ وطی کی اباحت محل حرث کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اور اس لئے بھی کہ بیویوں کو پیدا کرنے میں حکمت نسل کو پھیلانا ہے اور جو اس کا محل نہیں ملک نکاح اسے شامل ہی نہیں ہوتی۔ یہی بات حق ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے: ہمارے نزدیک وہ (یعنی دبر میں وطی کرنا) اور ذکر کو ساتھ مس کرنا حکم میں برابر ہیں۔ کیونکہ محل نجاست میں قذر (گندگی) اور اذیت دم حیض کی نسبت زیادہ ہے اور وہ زیادہ فحش (قبیح) ہے اور رہی بول کی تکلیف تو یہ رحم کی تکلیف کے سوا ہے۔

علامہ ابن عربی نے قبس میں کہا ہے کہ ہمیں الشیخ الامام فخر الاسلام ابو بکر محمد بن احمد بن حسین فقیہ وقت اور امام وقت نے کہا: فرج چودہ چیزوں کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور انہوں نے اپنے ہاتھ پر گن کر بتایا اور کہا: بول کا راستہ تیس کے ماتحت ہے اور ذکر اور فرج کا راستہ وہ ہے جس پر پانچ مشتمل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرج کو حالت حیض میں عارضی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا ہے تو پھر دبر کو لازمی نجاست کی وجہ سے حرام قرار دیا جانا بدرجہ اولیٰ ہے۔

اور امام مالک نے ابن وہب اور علی بن زیاد کو اس وقت کہا جب ان دونوں نے انہیں یہ خبر دی کہ مصر میں لوگ آپ کے بارے میں یہ باتیں کرتے ہیں کہ وہ اسے (دبر میں وطی کو) جائز قرار دیتے ہیں تو آپ نے اس سے نفرت کی (اسے انتہائی ناپسند کیا) اور ناقل کی تکذیب بالفور کی اور فرمایا: انہوں نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے انہوں نے میری تکذیب کی ہے انہوں نے میری طرف جھوٹی نسبت کی ہے۔ (کذبوا علی تین بار کہا) پھر فرمایا: کیا تم عرب قوم نہیں ہو؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تو کیا اگانے والے محل کے سوا کوئی کھیت ہو سکتا ہے (اور وہ محل فرج ہی ہے۔)

اور جس سے مخالف نے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنّٰى شِئْتُمْ یہ اپنی عمومیت کے اعتبار سے تمام راستوں کو شامل ہے (یعنی قبل اور دبر دونوں کو) تو اس میں ان کے لئے کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے کیونکہ جو ہم نے اس کے بارے ذکر کیا ہے اس کے سبب یہ خاص ہو چکا ہے اور ان احادیث کے سبب جو صحیح، حسن اور مشہور ہیں اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہ صحابہ کرام نے مختلف متون کے ساتھ روایت کیا ہے وہ تمام کی تمام عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کے حرام ہونے پر دال ہیں۔

انہیں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، ابو داؤد، نسائی، ترمذی رحمہم اللہ وغیرہم نے روایت کیا ہے اور انہیں ابو الفرج ابن جوزی نے ان کی سندوں سمیت ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے تحریم المحل المکروہ اور ہمارے شیخ ابو العباس نے بھی ایک جز میں جمع کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے اظہار ادبار من اجاز الوطء فی الادبار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہی وہ حق ہے جس کی اتباع کی گئی ہے اور اس مسئلہ میں صحیح (نظریہ) ہے اور اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھنے والے کو نہیں چاہئے کہ وہ اس مصیبت میں پڑے کیونکہ یہ عالم کی خطا اور لغزش ہے اس کے بعد کہ اس کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں اور ہمیں عالم کی غلطی سے ڈرایا اور محفوظ رکھا گیا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کے خلاف مروی ہے اور جس نے ایسا کیا اس کی تکفیر مروی ہے اور یہی آپ رضی اللہ عنہ کے لائق اور شایان شان ہے۔ اسی طرح حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے اسے جھوٹا قرار دیا ہے جس نے آپ کی طرف سے اس بارے میں بیان کیا، جیسا کہ امام نسائی نے ذکر کیا ہے اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور امام مالک نے اس کا انکار کیا اور اسے بہت بڑا قدم قرار دیا اور جس نے اسے آپ کی طرف منسوب کیا اسے جھوٹا قرار دیا۔

اور الدارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں سعید ابن یسار ابی الحباب سے روایت کیا ہے فرمایا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: آپ ان عورتوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے ساتھ تحمیض کی جائے؟ آپ نے فرمایا: تحمیض کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا: "دبر" تو آپ نے فرمایا: کیا مسلمانوں میں سے بھی کوئی ایسا کرتا ہے۔

اور حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مسند روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: "اے لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں کرتا تم عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو" اور اسی کی مثل حضرت علی بن طلق سے بھی مروی ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر (کرم) نہیں فرمائے گا"

اور ابو داؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت قتادہ سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ لواطت صغریٰ ہے"(1)۔ یعنی عورت کی دبر میں وطی کرنا۔

اور حضرت طاؤس سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورتوں کے ساتھ ان کی دبروں میں وطی کرنے سے ہی قوم لوط کا عمل شروع ہوا تھا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب کوئی شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو پھر جو بھی اس کے سوا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ یعنی پہلے پہلے وہ عمل کرلو جو کل (یعنی آخرت میں) تمہارے لئے باعث نفع ہوں۔ اس میں مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی تصریح اس ارشاد باری تعالیٰ میں کی گئی ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (البقرہ: 110) (اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا اجر اللہ کے ہاں) تو معنی یہ ہوا تم اپنے لئے طاعت اور عمل صالح آگے بھیجو (یعنی پہلے پہلے کرلو)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اولاد اور نسل کی چاہت ہے کیونکہ اولاد دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔ تحقیق یہ شفیع بھی ہوتا ہے اور ڈھال بھی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد پاک دامن عورتوں سے شادی کرنا ہے تاکہ اولاد صالح اور طاہر ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد افراط کو آگے بھیجنا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جس نے تین بچے آگے بھیجے جو ان

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6706

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: مراد ایسا آدمی ہے جو قسم کھالیتا ہے کہ وہ نیکی نہ کرے گا اور صلہ رحمی نہ کرے گا اور نہ لوگوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ پس اسے کہا جاتا ہے: تو نیکی کر تو وہ کہتا ہے: میں نے تو (نیکی نہ کرنے کی) قسم کھا رکھی ہے۔

اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ جھوٹ بولتے ہوئے قسمیں نہ کھاؤ جب تم نیکی، پرہیزگاری اور اصلاح (صلح کرانے) کا ارادہ کرو، پس اس کے بعد لا کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دلوں کو خوفزدہ کر دیتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو) اور کثرت سے قسمیں کھانے والے کی مذمت بیان فرمائی۔ سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ (القلم) (اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی۔) اور عرب کم قسمیں کھانے کے سبب تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا:

قلیل الالایا حافظ لیمینہ   وان صدرت منہ الالیۃ برت

کم قسمیں کھانے والا اپنی قسم کی حفاظت کرتا ہے اور اگر اس سے قسم صادر ہو جائے تو وہ سچی ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر اَنْ تَبَرُّوْا کا معنی ہے تم قسمیں کم کھاؤ کیونکہ اس میں نیکی اور پرہیزگاری ہے، کیونکہ کثیر قسموں کے ساتھ حنث (قسم توڑنا) بھی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی رعایت اور پاسداری میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ تاویل حسن اور اچھی ہے۔

حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ قسم ہر شے میں رائج ہے اور کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ تم ہر حق اور باطل میں تصرف کے لئے قسم نہ کھاؤ۔

اور زجاج وغیرہ نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے کہ ایک آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس سے فعل خیر کا مطالبہ کیا جائے تو اللہ کے ساتھ عذر پیش کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے: مجھ پر قسم ہے، حالانکہ اس نے قسم نہیں کھائی ہوتی۔ قتبی نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم یہ قسم کھاؤ کہ تم صلہ رحمی نہ کرو گے، صدقہ نہ کرو گے اور صلح نہیں کراؤ گے اور انہی کے مشابہ نیکی اور خیر کے کاموں سے متعلقہ قسمیں تو تم قسم کا کفارہ ادا کر دو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ (تاویل) حسن ہے اس کے لئے جو ہم نے بیان کیا ہے اور اسی پر سبب نزول بھی دلالت کرتا ہے، ہم اس کے بعد والے مسئلہ میں اسے بیان کریں گے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح پر (مال) خرچ نہ کریں گے جس وقت اس نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے باتیں کیں (اور آپ پر تہمت لگائی) جیسا کہ حدیث الافک میں ہے، اس کا بیان سورۃ النور میں آئے گا۔ یہ ابن جریج سے مروی ہے۔(1)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ النور، حدیث نمبر 4381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یعنی تمہیں اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم نیکی، تقویٰ اور صلح کرانے سے باز نہ رکھے، یہ بھی زجاج سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول من اجلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی لا ان تبروا ہے اور لا کو حذف کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ای لئلا تضلوا (اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ) طبری اور نحاس نے اسی طرح کہا ہے اور وجوہ نصب میں سے چوتھی وجہ یہ ہے: کراھة ان تبروا (کہ نیکی کو ناپسند کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں نہ کھاؤ) جار سے حذف کر دیا گیا ہے، اسے نحاس اور مہدوی نے ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ محل جر میں ہے۔ یہ قول خلیل اور کسائی کا ہے اور تقدیر کلام ہے: فی ان تبروا اور فی مضمر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ اسے جر دی گئی۔

اور سَمِیْعٌ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ عَلِیْمٌ اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

"نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ تمہاری لایعنی قسموں پر لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: بِاللَّغْوِ۔ اللغو یہ مصدر ہے لغا یلغو و یلغی، و لغی یلغی لغا جب کلام میں کوئی ایسی شے ذکر کی جائے جس کی حاجت اور ضرورت نہ ہو یا ایسی شے کو لانا جس میں خیر اور بھلائی نہ ہو یا ایسی شے جس کا گناہ لغو ہو جائے اور حدیث شریف ہے: "جب تو اپنے ساتھی کو کہے" خاموش ہو جا" اس حال میں کہ امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو تو نے لغو عمل کیا" (1) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی لغت میں لغوت کی بجائے فلغیت ہے۔ اور شاعر نے کہا ہے:

وربّ أسراب حجيج كُظّمِ ... عن اللغا ورفثِ التكلّمِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

ولستَ بمأخوذٍ بلغوٍ تقولُه ... اذا لم تَعَمَّدْ عاقداتِ العزائمِ

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا یمین لغو کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کسی آدمی کا وہ قول جو اس کے کلام کے درمیان میں ہو اور محاورہ میں اس کی عجلت پسندی کے سبب ہو: لا واللہ اور بلیٰ واللہ یہ (الفاظ) قسم کے ارادے سے نہ ہوں۔

مروزی نے کہا ہے: وہ یمین لغو جس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ لغو ہے وہ آدمی کا یہ قول ہے: لا واللہ اور بلیٰ واللہ جبکہ یہ اس کی گفتگو اور کلام میں واقع ہوں نہ ان سے قسم کا اعتقاد ہو اور نہ ہی قسم کا ارادہ ہو۔

اور ابن وہب نے یونس سے اور انہوں نے ابن شہاب سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ ام

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعة، حدیث نمبر 882، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اگر میں نے اس طرح کیا اور حلال مجھ پر حرام ہے۔ مکحول دمشقی نے اسی طرح کہا ہے۔ اور امام مالک نے بھی یہی کہا ہے سوائے بیوی کے کیونکہ اس نے اس میں تحریم لازم کر دی ہے مگر یہ کہ قسم کھانے والا اپنے دل کے ساتھ اسے خارج کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغو سے مراد معصیت کی قسم ہے۔ حضرت سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبد الرحمٰن اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں بیٹوں حضرت عروہ اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے جیسا کہ کوئی یہ قسم کھاتا ہے: ”وہ شراب ضرور پیے گا یا وہ قطع رحمی ضرور کرے گا۔“

پس اس کی نیکی اس فعل کو ترک کرنا ہے اور اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے اور ان کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا دیکھا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ دے کیونکہ بے شک اس کا ترک کرنا ہی اس کا کفارہ ہے(1)۔“ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر بھی ”المائدۃ“ میں آئے گا۔

اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں بددعا کرے: (مثلاً) اللہ تعالیٰ اس کی بصارت کو اندھا کر دے، اللہ تعالیٰ اس کا مال ضائع کر دے، وہ یہودی ہے، وہ مشرک ہے، وہ ولد الزنا ہے اگر اس نے اس طرح کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: دو آدمی خرید و فروخت کرتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے: قسم بخدا! میں تجھے اتنے کے عوض نہیں بیچوں گا اور دوسرا کہتا ہے: قسم بخدا! میں اتنے کے عوض اسے نہیں خریدوں گا۔

حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: وہ آدمی جو قسم کھاتا ہے کہ وہ یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ بھول جاتا ہے اور اسے کر گزرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بے شک یمین لغو وہ ہے جس کا کفارہ ادا کیا جائے، یعنی جب قسم کا کفارہ ادا کر دیا جائے تو وہ ساقط ہو جاتی ہے اور لغو ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا کفارہ ادا کرنے کے سبب اور اس سے بہتر کی طرف لوٹنے کے سبب مواخذہ نہیں فرمائے گا۔ ابن عبد البر نے ایک قول بیان کیا ہے کہ لغو سے مراد مکرہ کی قسم ہے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ قسم جو نسیان اور بھول کے ساتھ ہو اس کے لغو ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ وہ اس کے قصد اور ارادہ کے خلاف واقع ہوتی ہے، پس وہ محض لغو ہے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: مکرہ کی قسم اپنے انجام سمیت جس نے بالاکراہ قسم کھائی اس کا ذکر ”النحل“ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عربی نے کہا ہے: رہا وہ جس نے کہا کہ لغو سے مراد یمین المعصیۃ ہے تو یہ باطل ہے، کیونکہ ترک معصیت پر قسم کھانے والے کی قسم عبادت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہو جاتی ہے اور معصیت کا ارتکاب کرنے پر قسم کھانے والے کی قسم معصیت ہونے کے اعتبار سے منعقد ہو جائے گی اور اسے کہا جائے گا: تو معصیت کا ارتکاب نہ کر اور کفارہ ادا کر دے اور

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6738　　2۔ احکام القرآن، جلد 2، صفحہ 635

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضور نبی کریم ﷺ نے ایلاء کیا اور طلاق دی اور آپ ﷺ کے ایلاء کا سبب آپ سے ازواج مطہرات کا ایسے نفقہ کا سوال تھا جو آپ ﷺ کے پاس نہ تھا اسی طرح صحیح مسلم میں ہے اور کہا گیا ہے کیونکہ حضرت زینب بنت جحش نے آپ ﷺ کا ہدیہ آپ پر واپس لوٹا دیا تھا پس اس سے آپ ﷺ غصے ہوئے اور ان سے ایلاء کرلیا (1) اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایلاء ہر اس کے لئے ثابت ہوتا ہے جس کے لئے طلاق ثابت ہے۔ پس آزاد، غلام اور سکران (نشے والا) ہر ایک کو ایلاء لازم ہوتا ہے اور اسی طرح سفیہ (احمق) اور جس پر ولایت کی جائے بشرطیکہ وہ بالغ اور غیر مجنون ہو اور اسی طرح خصی ہے جیسے وہ مقطوع الذکر ہو اور بوڑھا آدمی جبکہ اس میں رمق ونشاط باقی ہوں۔

مقطوع الذکر آدمی جب ایلاء کرے تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول مختلف ہے۔

ایک قول میں ہے کہ اس کے لئے کوئی ایلاء نہیں ہے اور ایک قول میں ہے اس کا ایلاء صحیح ہوتا ہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح اور کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ رجوع وہ ہے جو قسم توڑ دیتا ہے اور [illegible] اسے ساقط نہیں کرتا تو جب حنث سے مانع قسم باقی ہے تو پھر ایلاء کا حکم بھی باقی ہوگا اور گونگے آدمی کا ایلاء ایسی تحریر یا اشارہ کے ساتھ ہوتا ہے جو سمجھا جاسکتا ہو اور وہ اس کو لازم ہوگا۔ اسی طرح عجمیوں کا حکم ہے جب وہ عربی عورتوں سے ایلاء کرلیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس بارے اختلاف ہے جس کے ساتھ قسم میں سے ایلاء واقع ہوتا ہے۔

پس ایک قوم نے کہا ہے: ایلاء واقع نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی قسم کھانے کے ساتھ (2)، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: من کان حالفا فلیحلف باللہ او لیصمت (3) (یعنی جو کوئی قسم اٹھانے والا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائے یا پھر وہ خاموش رہے۔)

امام شافعی نے بھی اپنے جدید قول میں یہی کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ”ہر وہ قسم جو جماع سے روکے تو وہی ایلاء ہے“ (4) اور اسی کے مطابق شعبی، نخعی، مالک، اہل حجاز، سفیان ثوری، اہل عراق، امام شافعی نے اپنے دوسرے قول میں، ابو ثور، ابو عبید، ابن منذر اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: ہر وہ قسم جس کے سبب حالف اپنی بیوی کے ساتھ جماع کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ حانث ہو جائے گا تو وہ اس کے سبب ایلاء کرنے والا ہوگا بشرطیکہ اس کی قسم چار مہینے سے زیادہ کی ہو۔ پس ہر وہ جس نے اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات اور اس کی کلام، اس کے عہد اور اس کے ذمہ کی قسم کھائی تو اس پر ایلاء لازم ہو جائے گا اور اگر کسی نے کہا: اقسم یا اعزم

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 177، دار احیاء التراث العربیہ

3۔ بخاری شریف، کتاب الایمان، باب لا تحلفوا بآبائکم، جلد 2، صفحہ 983، وزارت تعلیم

ایضاً، کتاب الشہادات، حدیث نمبر 2482، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 360، [illegible]

اور ساتھ ہی ان شاء اللہ کا ذکر کیا تو کہا گیا ہے: اس پر ایلاء واقع نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ طلاق کا ارادہ کرے اور اس کی نیت کرے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ قسم ہے تو اس پر ایلاء واقع ہو جائے گا۔ اس کا تفصیلی بیان "سورۃ المائدۃ" میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اگر کسی نے روزوں کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے وطی نہ کرے گا اور کہا: اگر میں تجھ سے وطی کروں تو مجھ پر ایک ماہ یا ایک سال کے روزے ہیں تو وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا۔ اور اسی طرح ہر وہ جو حج، طلاق، عتق، نماز یا صدقہ میں سے اپنے ذمہ لازم کرتا ہے (تو وہ مولی ہو جائے گا) اور ان تمام میں بنیاد اور اصل قول باری تعالیٰ کی عمومیت ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ اور کوئی فرق نہیں ہے جب اس نے صدقہ یا معین غلام کی آزادی یا غیر معین غلام کی آزادی کے ساتھ ایلاء کیا تو ایلاء ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اگر کسی نے قسم کھائی، قسم بخدا! وہ وطی نہ کرے گا اور استثناء کر دی اور کہا: ان شاء اللہ تعالیٰ تو بلاشبہ وہ ایلاء کرنے والا ہو جائے گا اور اگر اس نے اس سے وطی کی تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔ یہ امام مالک سے ابن قاسم کی روایت میں ہے اور ابن ماجشون نے المبسوط میں کہا ہے: وہ مولی نہیں ہوگا۔ یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ استثناء (ان شاء اللہ کہنا) قسم کو کھول دیتا ہے۔ اور حالف کو اس طرح کر دیتا ہے گویا کہ اس نے قسم کھائی ہی نہیں اور یہی فقہائے امصار کا مذہب ہے کیونکہ ان شاء اللہ کہہ کر اس نے وضاحت کر دی ہے کہ وہ فعل کا قصد کرنے والا نہیں(1) اور اس کی وجہ جسے ابن القاسم نے روایت کیا ہے اس کی بنا اس پر ہے کہ استثناء قسم کو نہیں کھولتا البتہ وہ کفارہ کو ساقط کرنے میں مؤثر ہوتا ہے۔ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا۔ پس جب اس کی قسم باقی ہے، منعقد ہو چکی ہے تو پھر ایلاء کا حکم اسے لازم ہوگا اگرچہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 5۔ اگر کسی نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، ملائکہ یا کعبہ معظمہ کے ساتھ قسم کھائی کہ وہ اس سے وطی نہ کرے گا یا اس نے کہا: وہ یہودی یا نصرانی یا زانی (ہو) اگر وہ اس سے وطی کرے تو اس صورت میں وہ ایلاء کرنے والا نہ ہوگا(2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔ باجی نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ان سے قسم کے طریقہ کے علاوہ لایا ہے اور اگر وہ ان کو اس طرح لایا کہ ان میں سے یہ کوئی اور جو الفاظ اس نے اسے کہے ہیں وہ ان کے ساتھ ایلاء کرنے والا ہے۔ اور المبسوط میں ہے کہ ابن القاسم سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: لا مرحبا اور اس سے وہ ایلاء کا ارادہ کرتا ہے، وہ مولی ہو جائے گا تو انہوں نے ذکر کیا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر وہ کلام جس سے اس نے طلاق کی نیت کی تو وہ طلاق ہو جاتی ہے اور یہ (ایلاء) اور طلاق دونوں برابر ہیں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قرآن کریم میں مذکور ایلاء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: کوئی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ یہ قسم کھائے کہ وہ ہمیشہ عورت کو مس نہیں کرے گا۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب کسی نے قسم کھائی کہ وہ ایک دن یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اپنی بیوی کے قریب نہیں آئے گا پھر اس نے چار مہینے تک وطی نہ کی تو وہ عورت ایلاء کے سبب اس سے جدا ہو جائے گی۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 176، دار احیاء التراث العربیہ

2۔ [illegible] جلد 6، صفحہ 65 [illegible]

کے لئے اعتماد علی پر قائم رہے تو بغیر مدت مقرر کیے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کر دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے لئے مدت ایلاء مقرر کی جائے گی اور یہ قول بھی ہے کہ آدمی کا اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی صورت میں اس پر ایلاء داخل نہ ہوگا اگرچہ وہ کئی سال تک اس سے مقاربت نہ کرنے پر قائم رہے لیکن اسے نصیحت کی جائے گی اور اسے اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم دیا جائے گا کہ وہ اسے ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے نہ روکے رکھے۔

مسئلہ نمبر 11۔ اور اس کے بارے میں بھی اختلاف ہے جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیوی سے مجامعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اپنے بچے کو دودھ چھڑا لے تاکہ حاملہ اپنے بچے کو دودھ پلائے اور وہ اسے ضرر پہنچانے کا ارادہ نہ کرے یہاں تک کہ مدت رضاع گزر گئی تو امام مالک کے نزدیک بچے کی اصلاح کا ارادہ ہونے کی بنا پر اس کی بیوی کو مطالبے کا حق حاصل نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اسے ایلاء نہ قرار دیا (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں یہی کہا ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مولی ہو جائے گا اور بچے کو دودھ پلانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور یہی حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب، امام اوزاعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ آدمی ایلاء کرنے والا نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی زوجہ سے اس کمرے میں یا اس گھر میں دخول نہ کرے گا کیونکہ وہ مقاربت کے لئے اس کے سوا اور جگہ بھی پا سکتا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ اور اسحاق نے کہا ہے: اگر اس نے اسے چار ماہ تک چھوڑے رکھا تو وہ ایلاء کے ساتھ جدا ہو جائے گی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ اس سے چار ماہ تک رکا رہا ہے اور اگر اس نے یہ قسم کھائی کہ وہ اس سے اس مصر یا اس شہر میں وطی نہ کرے گا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مولی ہو جائے گا۔ اور ایسا ایلاء سفر میں ہوتا ہے کہ وہ مشقت اور کلفت برداشت کرتا ہے نہ کہ اپنے باغ یا اپنے قریبی کھیتوں میں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ نِّسَآئِهِمْ اس میں آزاد عورتیں، ذمیہ عورتیں اور لونڈیاں سبھی داخل ہیں جب وہ شادی کر لیں اور غلام کا ایلاء بھی اپنی بیوی سے ثابت ہو جاتا ہے۔

امام شافعی، احمد اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء بھی آزاد آدمی کے ایلاء کی مثل ہے (2)۔ ان کی دلیل اس قول باری تعالیٰ کا ظاہر ہے: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ کیونکہ یہ تمام ازواج کے لئے ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔

امام مالک، زہری، عطا بن ابی رباح اور اسحاق نے کہا ہے: اس (غلام) کی مدت دو مہینے ہے۔ اور حسن اور نخعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: اگر غلام کی بیوی کسی کی لونڈی ہو تو اس کے ایلاء کی مدت دو مہینے ہے اور اگر وہ آزاد ہو تو اس کے ایلاء کی مدت چار مہینے ہے اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لونڈی کے ایلاء کی مدت آزاد

1۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب الایلاء، جلد 1، صفحہ 515، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

عورت کے ایلاء کا نصف ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ امام مالک، مدنی ان کے اصحاب، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اوزاعی اور نخعی وغیرہم نے کہا ہے کہ ایلاء کے لازم ہونے میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں برابر ہیں۔ امام زہری، عطا اور ثوری نے کہا ہے کہ ایلاء نہیں ہوتا مگر دخول کے بعد۔

اور امام مالک نے کہا ہے: صغیرہ عورت میں ایلاء نہیں ہوتا جب تک وہ بالغ نہ ہو اور اگر اس نے اس سے ایلاء کیا اور وہ بالغ ہو گئی تو اس کے بالغ ہونے کے دن سے ایلاء لازم ہو جائے گا (1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ اور رہا ذمی تو اس کا ایلاء صحیح نہیں ہوتا جس طرح کہ اس کی جانب سے ظہار اور طلاق درست نہیں ہوتے اور وہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک اہل شرک کا نکاح صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ان کے لئے [illegible] اور احسان کے مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ وہ شریعت کے مکلف نہیں کہ ان پر قسموں کے کفارات لازم ہوں اور اگر وہ ہمارے پاس ایلاء کا مقدمہ پیش بھی کریں تو ہمارے حاکم کو نہیں چاہیے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، وہ اپنے حکام کی طرف جائیں گے اور اگر ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم ہو رہا ہو تو پھر وہ حکم اسلام کے مطابق فیصلہ کرے جیسا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی چھوڑ دے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ۔ التربص کا معنی ہے: مہلت دینا اور تاخیر کرنا۔ یہ تصبر (صبر کرنا) کا الٹ (مقلوب) ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

تَرَبَّصْ بِهَا رَيْبَ الْمَنُوْنِ لَعَلَّهَا　　تُطَلَّقُ يَوْمًا اَوْ يَمُوْتُ حَلِيْلُهَا

تو اس کے ساتھ حوادثِ زمانہ کا انتظار کر شاید کسی دن اسے طلاق دے دی جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے گا

اور چار مہینے وقت مقرر کرنے کا فائدہ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس بارے میں اہل جاہلیت سے جو ذکر کیا ہے وہ پہلے گزر چکا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس (ایلاء) سے منع فرما دیا اور مرد کی علیحدگی کے ساتھ عورت کو ادب سکھانے کے لئے خاوند کے لئے چار مہینے مدت مقرر کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** (النساء: 34) (اور تم انہیں خوابگاہوں میں چھوڑ دو) اور حضور نبی مکرم ﷺ نے بھی اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ انہیں ادب سکھانے کے لئے ایک ماہ تک ایلاء کیا اور کہا گیا ہے کہ چار مہینے وہ ہیں جن سے زیادہ عورت اپنے خاوند سے صبر کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کسی رات مدینہ طیبہ میں گشت کر رہے تھے تو آپ نے ایک عورت کی آواز سنی وہ یہ شعر کہہ رہی تھی:

اَلَا طَالَ هٰذَا اللَّيْلُ وَاسْوَدَّ جَانِبُهٗ　　وَاَرَّقَنِيْ اَنْ لَا حَبِيْبَ اُلَاعِبُهٗ

فَوَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ لَا شَيْءَ غَيْرُهٗ　　لَزُعْزِعَ مِنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهٗ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 303

مخافۃ ربی والحیاء یکفنی وإکرام بعلی أن تنال مراکبہ

جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا: تیرا خاوند کہاں ہے؟ تو اس نے جواب دیا: آپ نے اسے عراق بھیجا ہوا ہے پھر آپ نے عورتوں کو بلایا اور ان سے پوچھا: ایک عورت کتنی دیر تک اپنے خاوند کے بغیر صبر کر سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا: دو مہینے اور تیسرے ماہ اس کا صبر کم ہو جاتا ہے اور چوتھے ماہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے، پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کے جہاد کی مدت چار مہینے مقرر کر دی، جب چار ماہ گزر جاتے تو آپ جہاد کرنے والے لشکر کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسرا لشکر بھیج دیتے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے یہ بات بھی مدت ایلاء کے چار مہینوں کے ساتھ اختصاص کو قوی کرتی ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ فَآءُوْ اس کا معنی ہے: پھر اگر انہوں نے رجوع کر لیا اور اسی سے یہ بھی ہے (1) فاءت الظل فیئًا اور اس معنی میں زوال کے بعد والے سایہ کوئی فئ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے مغرب کی جانب لوٹ آتا ہے، کہا جاتا ہے: فلان سریع الفئ من غضبہ، اور فاء فیئۃ و فیوءًا۔ وانہ سریع الفیئۃ یعنی وہ رجوع میں تیز رفتار ہے۔ شاعر نے کہا:

ففاءت و لم تقض الذی اقبلت لہ و من حاجۃ الانسان ما لیس قاضیا

پس وہ لوٹ آئی اور اس نے اسے پورا نہ کیا جس کے لئے آئی اور انسان کی حاجت پوری ہونے والی نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ سب کے سب جن سے کچھ محفوظ اور یاد کیا جاتا ہے وہ اس پر متفق ہیں کہ فئی سے مراد اس آدمی کا جماع کرنا ہے جس کا کوئی عذر نہ ہو اور اگر اس کا کوئی عذر ہو (مثلاً) وہ بیمار ہو جائے، قید ہو جائے یا اس کے مشابہ کوئی اور عذر ہو تو بلاشبہ اس کا رجوع صحیح ہو گا اور یہ اس کی بیوی ہو گی اور جب سفر سے آنے کے سبب یا مرض سے افاقہ پانے کے سبب عذر زائل ہو جائے یا قید سے رہائی پانے کے سبب (عذر ختم ہو جائے) اور وہ وطی سے انکار کر دے تو ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی بشرطیکہ مدت ایلاء گزر چکی ہو۔ امام مالک نے المدونۃ میں اور المبسوط میں یہی کہا ہے۔

اور عبد الملک نے کہا ہے: وہ عورت مولی سے اس دن سے جدا ہو گی جس دن مدت ختم ہوئی، پس اگر رجوع کے ساتھ اس کا عذر سچا ہوا جبکہ عورت نے اسے قدرت دی تو گزرے ہوئے ایام میں بھی اس کے سچا ہونے کا حکم لگایا جائے گا اور اگر عورت پر قدرت حاصل ہونے کے وقت (وطی سے) انکار کے ساتھ جس رجوع کا دعویٰ کیا تھا اس کی تکذیب کر دی تو اس کے معاملہ کو جھوٹ اور جھگڑے پر محمول کیا جائے گا اور اس وقت میں جو بھی احکام واجب ہوتے ہیں وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب عذر کی حالت میں گواہوں نے اس کے رجوع کے بارے شہادت دی ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہو گی۔ حسن، عکرمہ اور نخعی نے یہی کہا ہے اور امام اوزاعی نے بھی یہی کہا ہے۔

اور نخعی نے بھی کہا ہے: صرف قول اور شہادت کے ساتھ رجوع صحیح ہوتا ہے اور ایلاء کا حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے اگر اسے وطی کے مواقع میسر نہ ہوں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ

ابن عطیہ نے کہا ہے: اگر اس نے مباشرت نہ کی تو اس قول کو باب ضرر کی طرف لوٹایا جائے گا (1)۔

اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر وہ جماع پر قادر نہ ہو تو وہ یہ کہے: میں نے اس (بیوی) کی طرف رجوع کر لیا۔ الکیا الطبری نے کہا ہے: امام ابوحنیفہ ایسے آدمی کے بارے فرماتے ہیں جس نے ایلاء کیا درآنحالیکہ وہ مریض تھا اور اس کے اور اس کی بیوی کے مابین چار ماہ کی مسافت تھی یا وہ رتقاء تھی یا صغیرہ تھی یا آدمی مقطوع الذکر تھا تو جب اس نے اس کی طرف زبان سے رجوع کیا اور مدت گزر گئی اور عذر ابھی تک موجود تھا تو وہ رجوع صحیح ہے۔ امام شافعی اپنے دو قولوں میں سے ایک میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جماع کے بغیر رجوع نہیں ہو سکتا، چاہے حالت عذر ہو یا غیر عذر اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے، فرمایا: اسی طرح حکم ہے اگر وہ سفر میں ہو یا قید میں۔

مسئلہ نمبر 19۔ امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور جمہور علماء رحمہم اللہ نے مولی پر کفارہ واجب کیا ہے جب وہ اپنی بیوی کی طرف جماع کے ساتھ رجوع کر لے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر کفارہ نہیں ہے (2)۔ اسی طرح نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ حضرت نخعی نے بیان کیا ہے وہ کہا کرتے تھے: جب مولی رجوع کر لے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا اور اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد فَاِنْ فَآءُوْ میں بعض اہل تاویل نے کہا ہے: یعنی اس قسم کے لئے جس میں وہ حانث ہو گئے (اگر انہوں نے رجوع کر لیا)، قسم میں بعض تابعین کا ان کے بارے میں یہی مذہب ہے جنہوں نے نیکی، تقویٰ یا کسی بھی بھلائی اور خیر کے خلاف یہ قسم کھائی کہ وہ اسے نہیں کرے گا، پھر وہ اسے کرے اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس میں کفارہ کا ذکر نہیں کیا اور یہ بھی کہ یہ اس معنی پر مترتب ہوتا ہے کہ یمین لغو ہے جو کسی معصیت پر قسم کھائی جائے اور زوجہ کے ساتھ وطی ترک کرنا معصیت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کبھی اس قول کے لئے سنت سے استدلال کیا جاتا ہے، حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ترک کر دے کیونکہ اسے ترک کرنا ہی اس (قسم) کا کفارہ ہے (3)۔

اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان آیۃ الایمان میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور جمہور کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: من حلف علی یمین فرای غیرها خیرا منها فلیأت الذی هو خیر ولیکفر عن یمینه (4) کہ جس نے کسی کام پر قسم کھائی پھر اس کے غیر کو اس سے بہتر اور اچھا پایا تو اسے چاہیے کہ وہ کرے جو بہتر اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 303، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 511، دار احیاء التراث العربیہ
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من قال کفارتها ترکها، جلد 1، صفحہ 154، وزارت تعلیم
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب من حلف علی یمین، جلد 1، صفحہ 153، وزارت تعلیم

دیتا ہو اور اپنی قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دے)

مسئلہ نمبر 20۔ جب اس نے قسم کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تو اس سے ایلاء ساقط ہو گیا، ہمارے علماء نے یہی کہا ہے۔ اس میں ایک مذہب کے مطابق حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے پر دلیل ہے ایلاء کے مسئلہ میں بھی۔ یہ بات ہے اور ایلاء کے مسئلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ آپ حنث پر کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز کے قائل نہیں[1]۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے حانث ہونے سے پہلے کفارہ جائز نہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے مولی کے لئے دو فیصلوں میں سے ایک کے بارے حکم دیا ہے یعنی رجوع یا طلاق کا ارادہ، پس اگر حانث ہونے پر کفارہ کی تقدیم جائز ہو تو یقیناً رجوع یا طلاق کے ارادہ کے بغیر ہی ایلاء باطل ہو گیا کیونکہ اگر وہ حانث ہوا تو حنث کے سبب کوئی شے اس پر لازم نہ ہوگی اور جب حانث پر قسم توڑنے کے سبب کوئی شے لازم نہیں تو وہ مولی نہ ہوا۔ اور کفارہ کو مقدم کرنے کے جواز میں ایلاء کے حکم کو اس کے بغیر ساقط کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اور یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۲۷﴾ اس میں العزیمۃ کا معنی ہے: کسی شے پر عقد کو مکمل کرنا، کہا جاتا ہے: عزم علیہ یعزم عزماً و عزیمۃ و عزیماً و عزماناً، و اعتزم اعتزاماً۔ و عزمت علیک لتفعلن یعنی میں نے تجھ پر قسم کھائی ہے تو ضرور ایسا کرے گا۔

شمر نے کہا ہے: العزیمۃ والعزم اس سے مراد تیرا کسی کام پر اپنے آپ کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے کہ تو اسے کرے گا۔ اور الطلاق من طلقت المرأۃ تطلق (یہ نصر ینصر کے وزن پر ہے) طلاقاً (میں نے عورت کو طلاق دی وہ طلاق والی ہو گئی) فھی طالق و طالقۃ۔ (یعنی صفت کا صیغہ مذکر اور مونث دونوں طرح آتا ہے۔) اعشیٰ نے کہا ہے:

أیا جارتا بینی فانک طالقۃ

اے میری زوجہ! تو مجھ سے علیحدہ ہو جا کیونکہ تو طلاق والی ہے۔

اور طلقت میں (لام کو ضمہ پڑھنا بھی) جائز ہے جیسا کہ عظم یعظم اور اخفش نے اس کا انکار کیا ہے اور طلاق سے مراد ہے نکاح کی گرہ کو کھولنا اور اس کی اصل الانطلاق (جانا) ہے اور المطلقات سے مراد المخلیات ہے (یعنی وہ عورتیں جنہیں آزاد چھوڑ دیا گیا) اور الطلاق کا معنی ہے: تخلیۃ (فارغ چھوڑ دینا) کہا جاتا ہے: نعجۃ طالق و ناقۃ طالق: یعنی وہ بکری یا اونٹنی جسے چراگاہ میں مکمل چھوڑ دیا جائے، اس پر کوئی رکاوٹ (قید) نہ ہو اور نہ کوئی چرواہا ہو۔ اور بعیر طلق (طاء اور لام کے ضمہ کے ساتھ) یعنی وہ اونٹ جو بندھے ہوئے نہ ہوں۔ اور اس کی جمع اطلاق ہے۔ اور حبس فلان فی السجن طلقاً بغیر قید یعنی فلاں کو قید خانہ میں بغیر بیڑی اور قید کے بند کیا گیا ہے اور الطالق من الابل: یعنی وہ اونٹنی جسے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 182، دار الفکر

اور مدت گزر گئی تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اس پر دلیل ہے کہ وہ کوئی طلب ہے جس کا تعلق سننے کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ محض اس پر طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْۤ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۠

"اور طلاق دی ہوئی عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک اور نہ جائز ہے ان کے لیے کہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر۔ اور ان کے خاوند زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں اگر وہ ارادہ رکھتے ہوں اصلاح کا۔ اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ الْمُطَلَّقٰتُ جب اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا ذکر فرمایا اور یہ کہ اس میں طلاق واقع ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کے حکم کو بیان فرمایا۔

ابو داؤد اور نسائی کی کتاب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد باری تعالیٰ: وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ الآیہ کے بارے میں فرمایا: آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دیتا تھا تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے اور اگر وہ اسے تین طلاقیں دے دے تو یہ منسوخ ہے (1) اور فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیہ۔

اور الْمُطَلَّقٰتُ لفظ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور وہ ہے مدخول بہا عورتیں اور دخول سے پہلے جس عورت کو طلاق دے دی گئی وہ سورۃ الاحزاب کی آیت کے تحت اس سے خارج ہو گی۔ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا (الاحزاب: 49) (تو نہیں تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری جسے تم شمار کرو) اسی کا بیان آگے آئے گا اور اسی طرح حاملہ عورت اس ارشاد کے ساتھ اس سے خارج ہو گی: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 4) (اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے۔)

اور اقراء سے مقصود استبراء ہے بخلاف عدت وفات کے کیونکہ وہ عبادت ہے (2) اور وہ صغیرہ وغیرہا کی طرف متعدی ہوتی ہے اور

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ، جلد 1، صفحہ 297، وزارت تعلیم
ایضاً، حدیث نمبر 1876، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

وہ بیرہ جو نا امیدی کی عمر کو پہنچ جائے اللہ تعالیٰ نے ان کی عدت مہینے مقرر کی ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: والمطلقت المطلقات میں عموم ان تمام کو شامل ہے پھر انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے، یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ یہ آیت صرف ان عورتوں کے بارے ہے جو حائضہ ہیں اور یہی عورتوں کا عرف ہے اور اسی پر ان کا بڑا حصہ ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: یَتَرَبَّصْنَ۔ التربص کا معنی انتظار کرنا ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ یہ (بظاہر) خبر ہے لیکن اس سے مراد امر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ: 233) وحسبك درهم (یعنی تو ایک درہم پر اکتفا کر۔ یہ اہل زبان کا قول ہے۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اس میں جو ابن الشجری نے ذکر کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: یہ باطل ہے اور بلاشبہ یہ حکم شریعت کے بارے خبر ہے، پس تو کسی مطلقہ کو پائے کہ وہ انتظار نہیں کرتی تو یہ حکم شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی خبر کا مخبر کے خلاف واقع ہونا لازم نہیں آئے گا (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے لیتربصن (یعنی چاہیے کہ وہ انتظار کریں) اور پھر لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جمہور لوگوں نے قُرُوْءٍ۔ فُعُول کے وزن پر قراءت کی ہے، اس میں لام کلمہ ہمزہ ہے اور حضرت نافع سے قرو روایت کیا گیا ہے یعنی واؤ کے کسرہ اور شد کے ساتھ بغیر ہمزہ کے۔ اور حسن نے زبر یا قاف کے فتحہ را کے سکون اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔

اور قروء، اقرؤ اور اقراء کی جمع ہے (4) اور واحد قرء قاف کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اصمعی نے یہی کہا ہے۔ اور ابو زید نے کہا ہے: قرء قاف کے فتحہ کے ساتھ ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: اقرأت المرأۃ جب عورت حائضہ ہو جائے۔ فہی مقرئ اور اقرأت کا معنی طہرت بھی ہے جب وہ پاک ہو جائے۔

اور اخفش نے کہا ہے: اقرأت المرأۃ (یہ کہا جاتا ہے) جب عورت حیض والی ہو جائے اور جب اسے حیض آئے تو تو کہے گا: قرأت بغیر الف کے۔ کہا جاتا ہے: اقرأت المرأۃ حیضۃ او حیضتین (عورت کو ایک حیض آیا یا دو) اور القرء کا معنی حیض کا ختم ہونا بھی ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مراد وہ ایام ہیں جو دو حیضوں کے درمیان ہوتے ہیں (یعنی طہر) اور اقرأت حاجتک: تیری حاجت قریب آ گئی۔ یہ جوہری سے منقول ہے۔ اور ابو عمرو بن العلاء نے بیان کیا ہے کہ عربوں میں سے بعض حیض کو قرء کا نام دیتے ہیں اور بعض طہر کو قرء کہتے ہیں اور ان میں سے بعض دونوں کو ایک ساتھ قرء کہتے ہیں۔ پس طہر کو حیض کے ساتھ قرء کہا جاتا ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرء کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے: اہل کوفہ نے کہا ہے: اقراء سے مراد حیض ہیں۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت سدی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دارالکتب العلمیہ
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 189، دارالفکر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دارالکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 302، دارالفکر

ابو عبیدہ نے بھی کہا ہے(1)۔

اور اہل حجاز نے کہا ہے: اقراء سے مراد اطہار ہیں، حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت زہری، حضرت ابان بن عثمان اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ پس جنہوں نے حیض کو قرء کا نام دیا ہے تو انہوں نے رحم میں خون جمع ہونے کی وجہ سے یہ نام رکھا ہے اور جنہوں نے اسے طہر کا نام قرار دیا ہے تو وہ بدن میں خون جمع ہونے کی وجہ سے ہے اور وہ جو القرء میں اس اصل کو تیرے لئے ثابت کر رہا ہے وہ وقت ہے۔ کہا جاتا ہے: ھبت الریح لقرئھا و قارئھا ای لوقتھا (یعنی ہوا چلی اپنے وقت کے سبب)۔ شاعر نے کہا ہے:

کرھت العقر عقر بنی شلیل … اذا ھبت لقارئھا الریاح (2)

میں نے بنی شلیل کی بستی العقر کو ناپسند کیا جب کہ ہوائیں چلیں اپنے وقت پر۔

اور کہا گیا ہے کہ حیض کے لئے ایک وقت ہے اور طہر کے لئے بھی ایک وقت ہے، کیونکہ یہ دونوں ایک معین وقت کی طرف راجع ہوتے ہیں اور اعشی نے اطہار کے بارے میں کہا ہے:

أفی کل عام أنت جاشم غزوۃ … تشد لأقصاھا عزیم عزائکا

مورثۃ عزا و فی الحی رفعۃ … لما ضاع فیھا من قروء نسائکا (3)

اور ایک دوسرے نے حیض کے بارے میں کہا ہے:

یا رب ذی ضغن علی فارض … لہ قروء کقروء الحائض (4)

یعنی کسی نے اسے نیزہ مارا تو اس کا خون حیض والی عورت کے خون کی طرح تھا۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: یہ قریت الماء فی الحوض سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد حوض میں پانی کا جمع ہونا ہے (5) اور اسی سے القرآن ہے کیونکہ یہ معانی کو جمع کرتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجتماع حروف کی وجہ سے قرآن کہا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ما قرأت الناقۃ سلی قط، یعنی کبھی اس کے پیٹ میں بچہ جمع نہیں ہوا اور عمرو بن کلثوم نے کہا ہے:

ذراعی عیطل أدماء بکر … ھجان اللون لم تقرأ جنینا (6)

تو گویا رحم حیض کے وقت خون کو جمع کرتا ہے اور جسم طہر کے وقت اسے جمع کرتا ہے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے: اس کا قول جس نے یہ کہا کہ القرء ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: قریت الماء فی الحوض (میں نے حوض میں پانی جمع کیا) یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ القرء مہموز ہے اور یہ غیر مہموز ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

2۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 292، مؤسسۃ الکتب الثقافیہ بیروت

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 303، دار الفکر

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

5۔ ایضاً

6۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 365، دار الکتب العربیہ بیروت

میں (مفسر) کہتا ہوں: اہل لغت کی نقل کے مطابق یہ صحیح ہے یعنی جوہری وغیرہ نے یہ کہا ہے اور اس پانی کا نام قرئ ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القرء کا معنی ہے الخروج (نکلنا) یا طہر سے حیض کی طرف یا حیض سے طہر کی طرف، اسی بنا پر امام شافعی نے ایک قول میں کہا ہے: القرء الانتقال من الطهر الى الحيض، یعنی القرء کا معنی طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا ہے اور وہ حیض سے طہر کی طرف نکلنے کو قرء نہیں کہتے۔ اور اشتقاق کے حکم کے مطابق تو لازم آتا ہے کہ وہ بھی قرء ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کا معنی ہوگا تین ادوار یا تین انتقالات اور مطلقہ عورت صرف دو حالتوں سے متصف ہوتی ہے، پس کبھی وہ طہر سے حیض کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی حیض سے طہر کی طرف اس کلام کا معنی صحیح ہو جائے گا اور اس کی دلالت طہر اور حیض دونوں پر ہوگی اور یہ اسم مشترک ہوگا۔
اور کہا جاتا ہے: جب یہ ثابت ہو گیا کہ القرء سے مراد انتقال (تبدیلی ہونا) ہے تو عورت کا طہر سے حیض کی طرف نکلنا آیت میں بالکل مراد نہیں اور اسی لئے حالت حیض میں طلاق کا ہونا طلاق سنی (سنت والی) نہیں ہے جس کا حکم دیا گیا ہے اور نہ عدت کے لئے وہ طلاق ہے، کیونکہ عدت کے لئے طلاق وہ ہے جو حالت طہر میں ہو اور یہ القرء کے انتقال سے ماخوذ ہونے پر دلالت کرتا ہے اور جب حالت طہر میں طلاق سنی ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی: فعدتهن ثلاثة انتقالات، (پس ان کی عدت تین انتقالات ہیں۔) ان میں سے پہلا اس طہر سے انتقال ہے جس میں طلاق واقع ہوئی اور وہ انتقال جو حیض سے طہر کی طرف ہے اسے قرء نہیں بنایا گیا، کیونکہ لغت اس پر دلالت نہیں کرتی، لیکن ہمیں دوسری دلیل سے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ نہیں کیا ہے اور جب ان دو میں سے ایک معنی مراد ہونے سے خارج ہو گیا تو دوسرا مراد ہو باقی رہ گیا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا، پس اس بنا پر اس کی عدت تین انتقالات ہے، ان میں سے پہلا طہر ہے اور اس معنی کی بنا پر کامل تین اقراء کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے بشرطیکہ طلاق حالت طہر میں ہو اور کسی اعتبار سے اسے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔
الکیا طبری نے کہا ہے: امام شافعی کے مذہب کی انتہائی توجیہ کے لئے یہ گہری نظر ہے اور ممکن ہے کہ ہم اس میں وہ دلائل ذکر کریں جسے شریعت کی حکمتوں کی باریکیوں میں سے سمجھنا بعید نہ ہوگا اور وہ ہے طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونا اسے قرء کہا گیا ہے کیونکہ یہ براءت رحم پر دلالت کرتا ہے تو چونکہ حاملہ عورت کو غالباً حیض نہیں آتا پس اسے حیض آنا اس کے لئے براءت رحم کی علامت ہے اور حیض سے طہر کی طرف منتقل ہونا اس کے خلاف ہے اور حیض والی عورت کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے حیض کے بعد حاملہ ہو جائے اور جب حمل برقرار رہے اور بچہ قوی ہو جائے تو اس کا خون منقطع ہو جاتا ہے اسی وجہ سے عرب حالت طہر میں اپنی عورتوں کے حمل کے سبب تعریف کرتے ہیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح بیان کی۔ شاعر کہتا ہے:

و مبرأ من كل غبر حيضة   و فساد مرضعة و داء مغيل

یعنی یہ کہ اس کی ماں اپنے حیض کے باقی ہونے کی صورت میں اس کے ساتھ حاملہ نہیں ہوئی۔
یہی وہ ہے جو علماء اور اہل زبان نے اقراء کی تاویل میں کہا ہے۔ اور انہوں نے کہا: قرأت المرأة قرءا جب وہ

(عورت) حائضہ ہو یا پاک ہو۔ اور یہ بات تب بھی بولا جاتا ہے جب وہ حاملہ ہو اور اس پر انہوں نے اتفاق کیا ہے کہ القرء سے مراد الوقت ہے اور جب تو کہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ اوقات، تو آیت عدد میں مفسر ہو جائے گی درآنحالیکہ محدود میں احتمال ہوگا۔ اور پھر محدود کے لئے بیان کی تلاش کسی دوسری آیت میں ضروری ہوگی، پس ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسے طہر کے وقت طلاق دینے کے بارے حکم دیا جائے گا پس ضروری ہے کہ وہی (طہر) عدت میں بھی معتبر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَطَلِّقُوْهُنَّ یعنی تم انہیں ایسے وقت میں طلاق دو جس کے ساتھ عدت گزاری جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ (اور تم عدت کو شمار کرو) اس سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ مطلقہ عدت گزارتی ہے اور وہ وہ طہر ہے جس میں طلاق دی جاتی ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "اسے (یعنی اپنے بیٹے کو) حکم دو کہ وہ اس کی طرف رجوع کرے پھر اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ (حیض سے) پاک ہو جائے۔ پھر وہ حائضہ ہو پھر وہ پاک ہو پس یہی وہ عدت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو اس وقت طلاق دی جائے (1)۔" اسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اس بیان میں نص ہے کہ طہر کا زمانہ ہی وہ ہے جسے عدت کا نام دیا جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عورتوں کو طلاق دی جائے گی۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے حالت حیض میں طلاق دی تو وہ اس حیض کو شمار نہ کرے گی اور جس نے حالت طہر میں طلاق دی تو جمہور کے نزدیک وہ اس طہر کو عدت میں شمار کرے گی۔ پس یہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابو بکر بن عبدالرحمن نے کہا ہے: ہم اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتے مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق وہ یہ کہتا ہے کہ اقراء سے مراد اطہار ہیں۔ پس جب آدمی ایسے طہر میں طلاق دے جس میں اس نے وطی نہ کی تو عورت باقی طہر کو شمار کرے گی اگرچہ وہ ایک ساعت اور ایک لحظہ ہو، پھر وہ حیض کے بعد دوسرے طہر کی طرف متوجہ ہوگی، پھر دوسرے حیض کے بعد تیسرے کی طرف متوجہ ہوگی۔ پس جب اس نے تیسرے حیض کا خون دیکھ لیا تو وہ ازواج کے لئے حلال ہو گئی (یعنی وہ اب شادی کر سکتی ہے) اور عدت سے نکل گئی۔

اور اگر طلاق دینے والے نے ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے مباشرت کی تھی تو طلاق ثابت ہو جائے گی اور وہ گنہگار ہوگا اور وہ اس طہر میں سے باقی کے ساتھ عدت گزارے (3)۔ اور زہری نے ایک عورت کے بارے میں کہا ہے جسے طہر کے دوران طلاق دی گئی کہ وہ اس طہر کے باقی دنوں کے سوا تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی (☆)۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب تحریم طلاق الحائض، جلد 1، صفحہ 476، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دارالکتب العلمیہ بیروت

☆ عورت کی عدت حیض کے اعتبار سے یا طہر کے اعتبار، ائمہ فقہا اس میں اختلاف ہے، احناف کے نزدیک حیض کے اعتبار سے ہے، احناف کے دلائل کی تفصیل "ہدایہ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے یہ کہا ہو کہ الاقراء سے مراد اطہار ہیں۔ یہ ابن شہاب زہری کے علاوہ کوئی کہتا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے وہ طہر جس میں طلاق دی گئی وہ لغو ہو جائے گا پھر وہ عورت تین اطہار کے ساتھ عدت گزارے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کی بنا پر مطلقہ عورت حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ چوتھے حیض میں داخل ہو جائے اور ابن القاسم اور امام مالک اور آپ کے جمہور اصحاب، امام شافعی اور علمائے مدینہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض کا پہلا قطرہ دیکھے گی تو وہ عصمت (پابندی) سے نکل جائے گی (1)۔ یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے اور اسی کی طرف داؤد بن علی اور ان کے اصحاب گئے ہیں۔

اور زہری کے خلاف دلیل یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاہر کی طلاق میں بغیر جماع کے اجازت عطا فرمائی اور اول طہر اور آخر طہر کا ذکر نہ فرمایا۔

اور اشہب نے کہا ہے: عصمت اور میراث منقطع نہیں ہوتیں یہاں تک کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دم حیض ہے تاکہ ایک دفعہ خون کا آنا دم حیض کے سوا کوئی اور نہ ہو (2)۔

علمائے کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش کو اس وقت فرمایا جب اس نے آپ کے پاس خون کی شکایت کی: "بے شک وہ ایک رگ ہے پس تو دیکھ اور جب تجھے دم حیض آئے تو تو نماز نہ پڑھ اور جب حیض کے ایام گزر جائیں تو تو طہارت حاصل کر (غسل کر لے) پھر ایک حیض سے دوسرے حیض تک نمازیں پڑھتی رہ (3)۔"

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ (الطلاق: 4) "اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر تمہیں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔" پس جس سے ناامید اور مایوس قرار دیا گیا ہے وہ حیض ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی عدت ہے اور جو اس کا عوض بنایا گیا ہے وہ مہینے ہیں جبکہ وہ معدوم ہو (یعنی حیض نہ آنے کی صورت میں عدت مہینوں کے ساتھ ہوگی۔) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں کہا کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے (یعنی) آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے۔ اور اگر میں اس پر قدرت رکھتا کہ میں اس کی عدت ایک کامل اور ایک نصف حیض مقرر کر سکوں تو میں کر دیتا اور کسی صحابی نے بھی آپ کی بات کا انکار نہ کیا۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ ان کی طرف سے اجماع ہے اور یہی دس صحابہ کرام کا قول ہے انہیں میں سے خلفائے اربعہ بھی ہیں اور تیرے لیے وہی کافی ہے جو انہوں نے کہا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ تو اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، کتاب الطہارۃ، [illegible] جلد 1، صفحہ 45، وزارت تعلیم

دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے بعض ثلاثۃ اقراء ہے اور اس سے مراد کامل تین حیض ہیں اور یہ محققین کی نحو کے مطابق ہے اور ہمارے قول کے مطابق کہ اقراء سے مراد حیض ہیں کیونکہ جو کہتے ہیں کہ مراد طہر ہیں وہ جائز قرار دیتے ہیں کہ وہ دو طہر اور تیسرے کے بعض ایام عدت گزارے، کیونکہ جب اس نے حالت طہر میں طلاق دی تو وہ ان کے نزدیک اس طہر کا بقیہ حصہ عدت گزارے، یہی ایک قرء ہے اور ہمارے نزدیک وہ شروع حیض سے آغاز کرے گی تاکہ اسم (قرء) صادق آ جائے اور جب آدمی نے عورت کو ایسے طہر میں طلاق دی جس میں اس نے وطی نہ کی تو وہ متوجہ ہو گی حیض کی طرف پھر حیض کی طرف پھر حیض کی طرف (یعنی وہ تین حیض عدت گزارے گی) اور جب وہ تیسرے حیض سے غسل کرے گی تو وہ عدت سے نکل جائے گی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بے شک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے: سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (الحاقہ: 7) (اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک) اور ثمانیۃ ایام میں ہاء کو ثابت رکھا ہے، کیونکہ الیوم مذکر ہے اور اسی طرح القرء ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یہی مراد ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے ساتھ اس میں موافقت کی ہے کہ عورت کو جب حالت حیض میں طلاق دی جائے کہ وہ اس حیض کو عدت میں شمار نہ کرے گی جس میں اسے طلاق دی گئی اور نہ ہی اس طہر کو جو اس حیض کے بعد ہوگا، بلکہ وہ عدت کا آغاز اس حیض سے کرے گی جو طہر کے بعد ہوگا اور ہمارے نزدیک وہ طہر سے عدت شروع کرے گی، جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اور اہل لغت نے جائز قرار دیا ہے کہ وہ بعض کو کل کے نام سے تعبیر کریں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اور اس سے مراد شہران (دو مہینے) اور تیسرے کے بعض ایام ہیں (1) اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ہے۔ واللہ اعلم

اور جو یہ کہتے ہیں کہ قرء سے مراد حیض ہیں ان میں سے بعض نے کہا ہے جب وہ تیسرے حیض سے پاک ہو جائے تو غسل کے بغیر اس کی عدت گزر گئی اور رجعت کا حق باطل ہو گیا (2)۔ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابن شبرمہ اور امام اوزاعی رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔

اور شریک نے کہا ہے: جب عورت غسل میں بیس برس تک کوتاہی کرے گی تو اس کے خاوند کو اس پر رجعت کا حق حاصل رہے گا جب تک وہ غسل نہ کرے۔

اور اسحاق بن راہویہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب تیسرے حیض میں عورت میں خون پڑ گیا تو وہ جدا ہو جائے گی اور خاوند کے لئے رجوع کا حق منقطع ہو جائے گا مگر یہ کہ عورت کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اپنے حیض سے غسل کر لے اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور یہ قول ضعیف ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ: 234) (اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس)

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 185، دار الفکر
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 304، دار الکتب العلمیہ

عدت کو پوری کرلیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقے سے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور رہا وہ جو امام شافعی نے ذکر کیا ہے کہ طہر سے حیض کی طرف نفس انتقال کو قرء کا نام دیا جاتا ہے اور اس کا فائدہ عورت پر عدت کو کم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ جب وہ عورت کو اس کے طہر کی آخری ساعت میں طلاق دے پھر وہ حیض میں داخل ہو جائے تو وہ اسے ایک قرء شمار کرے گی اور تیسرے طہر سے منتقل ہوتے ہی عصمت منقطع ہوگئی اور وہ حلال ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ جمہور علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ لونڈی جسے حیض آتا ہے جب اس کا خاوند اسے طلاق دے تو اس کی عدت دو حیض ہوگی۔ اور ابن سیرین سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں لونڈی کی عدت کو آزاد عورت کی عدت کی طرح ہی دیکھتا ہوں مگر یہ کہ اس میں کوئی سنت جاری ہو چکی ہو، کیونکہ سنت زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی اتباع کی جائے۔

اور اصم عبد الرحمن بن کیسان، داؤد بن علی اور اہل ظاہر کی ایک جماعت نے کہا ہے: بے شک طلاق اور وفات کی عدت مہینوں اور حیضوں کے ساتھ ہے وہ اس سے متعلقہ آیات لونڈی اور آزاد عورت کے حق میں عام ہیں، پس آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔

اور جمہور نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: طلاق الأمة تطليقتان و عدتها حيضتان (1) (لونڈی کی طلاق دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہیں) اسے ابن جریج نے عطا عن مظاهر بن اسلم عن ابيه عن القاسم بن محمد عن عائشة رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کیا ہے۔ فرماتی ہیں: قال رسول الله ﷺ: طلاق الأمة تطليقتان و قرؤها حيضتان (2) آپ نے طلاق اور عدت دونوں کی اکٹھی نسبت اس کی طرف کی ہے مگر مظاہر بن اسلم اس حدیث کے ساتھ منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ان دونوں میں سے جو بھی غلام ہوا اس کی طلاق کم ہوگی۔ اور علماء کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ یعنی حیض میں سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اسے چھپانا ان کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عکرمہ، زہری اور نخعی رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد حمل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے (3)۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس سے مراد حیض اور حمل دونوں ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ حاملہ عورت حائضہ ہوتی ہے اور

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی سنة طلاق العبد، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم

جامع ترمذی، کتاب الطلاق، باب ما جاء ان طلاق الأمة تطليقتان، حدیث نمبر 1102، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2068، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتاب العلمیہ

آیت سے معنی مقصود یہ ہے کہ جب عدت کا دارومدار حیض اور طہر پر ہے اور دونوں پر اطلاع فقط عورتوں کی جانب سے ہو سکتی ہے تو پھر اس میں قول عورت کا ہی تسلیم کیا جائے گا جب وہ عدت کے گزرنے یا نہ گزرنے کا دعویٰ کرے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر امین بنا دیا ہے اور یہی اس ارشاد کا مقتضی ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ أَرْحَامِهِنَّ (1)۔

اور سلیمان بن یسار نے کہا ہے: ہمیں یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ ہم عورتوں کو کھولیں اور ان کی شرمگاہوں کی طرف دیکھیں، بلکہ اسے ان کے سپرد کیا گیا ہے کیونکہ انہیں اپنے آپ پر امین بنایا گیا ہے۔

اور چھپانے سے منع کرنے کے معنی مرد کو نقصان پہنچانے اور اس کا حق ضائع کرنے سے منع کرنا ہے، پس جب مطلقہ نے کہا: میں حیض سے ہوں، حالانکہ وہ حیض سے نہ ہو تو اس نے مرد کے رجوع کا حق ضائع کر دیا۔ اور جب اس نے کہا: میں حیض سے نہیں ہوں، حالانکہ وہ حالت حیض میں ہو تو اس نے مرد پر وہ نفقہ لازم کر دیا جو اس پر لازم نہیں تو اس طرح اس نے مرد کو ضرر اور نقصان پہنچایا، یا وہ حیض کی نفی کے بارے اپنے جھوٹ سے یہ قصد کرتی ہے کہ اسے واپس نہ لوٹایا جائے یہاں تک کہ عدت گزر جائے اور شریعت اس کے حق کو ختم کر دے اور اسی طرح حاملہ عورت حمل کو چھپاتی ہے تاکہ وہ مرد رجوع کے حق کو ختم کر دے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: دور جاہلیت میں ان کی عادت تھی کہ وہ حمل کو چھپاتی تھیں تاکہ وہ بچے کو نئے خاوند کے ساتھ ملا دیں، پس اس بارے میں آیت نازل ہوئی (2)۔

اور بیان کیا گیا ہے کہ اشجع کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور وہ حاملہ ہے اور مجھے اس کے شادی کرنے سے امن نہیں ہے اور میرا بیٹا دوسرے کے پاس چلا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اشجعی کی عورت اس کے پاس لوٹا دی گئی۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن منذر نے بیان کیا ہے: اہل علم میں سے ہر اس نے کہا جس سے میں نے حفظ کیا: جب عورت نے دس دنوں میں کہا: میں نے تین حیض گزار لئے ہیں اور میری عدت گزر چکی ہے۔ بلاشبہ اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی اور نہ اس سے وہ قول قبول کیا جائے گا مگر وہ یہ کہے: میں نے بچہ (سقط) گرا دیا ہے تحقیق اس کی خلقت ظاہر ہو چکی تھی (تب اس کا قول قبول کر لیا جائے گا)۔

اور اس مدت میں علماء کا اختلاف ہے جس میں عورت کے قول کی تصدیق کی جائے گی تو حضرت امام مالک نے کہا ہے: جب وہ کہے "میری عدت گزر چکی ہے" یا اتنی مدت میں کہے جس کی مثل میں عدت گزر سکتی ہے تو اس کا قول قبول کیا جائے گا (3) اور اگر اس نے اتنی مدت میں عدت گزرنے کی خبر دی جس میں شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے تو اس کے بارے دو قول ہیں۔ آپ نے المدونہ میں فرمایا: جب عورت نے کہا میں نے ایک مہینے میں تین حیض گزار لئے ہیں تو اس کی تصدیق کر لی جائے بشرطیکہ عورتیں اس کی تصدیق کر دیں (4)۔ اسی طرح شریح نے کہا ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا قالون!

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

3۔ السنن الکبریٰ، کتاب العدد، باب تصدیق المرأۃ المطلقۃ فی انقضاء عدتہا، جلد 5، صفحہ 10، [illegible]

4۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 12

یعنی تو نے درست کہا اور اچھا کیا۔

اور کتاب محمد میں فرمایا: اس کی تصدیق نہ کی جائے گی مگر 2 پندرہ دنوں میں۔ اور اسی طرح ابو ثور کا قول ہے۔ ابو ثور نے کہا ہے: تم سے کم اس کے قول کی تصدیق سینتالیس دنوں میں ہو سکتی ہے اور وہ اس طرح کہ کم سے کم طہر کی مدت پندرہ دن ہے اور کم سے کم حیض کی مدت ایک دن ہے۔ اور حضرت نعمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ساٹھ دنوں سے کم مدت میں عورت کے قول کی تصدیق نہیں کی جائے گی، اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ، رحم میں موجود شے کو چھپانے کی حرمت کی تاکید کے لئے یہ انتہائی شدید اور عظیم وعید ہے اور فی الحقیقت رحم میں جو کچھ ہے اس کے بارے خبر دینے کی امانت کی ادائیگی کے لئے واجب ہونے کا اظہار ہے۔ یعنی مومن عورتوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو ایمان نہیں رکھتا اس کے لئے چھپانا مباح ہے، کیونکہ ایسا کرنا اس کے لئے بھی حلال نہیں جو ایمان نہیں رکھتا، بلاشبہ یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: ان کنت اخی فلا تظلمنی (اگر تو میرا بھائی ہے تو تو مجھ پر ظلم نہ کر)، (بلکہ مقصود یہ ہے) کہ چاہئے ایمان تجھے ایسا کرنے سے روکے، کیونکہ ایسا کرنا اہل ایمان کے فعل میں سے نہیں ہے (یعنی ان کے شایان شان نہیں ہے۔)

قولہ تعالیٰ: وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَبُعُوْلَتُهُنَّ۔ البعولۃ: البعل کی جمع ہے اور اس کا معنی زوج (خاوند) ہے[1] اور اسے بعل اس لئے نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ زوجہ پر ان چیزوں کے بارے میں غالب اور بلند ہوتا ہے جن کا وہ اس کی زوجیت کے اعتبار سے مالک ہوتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا (الصافات: 125) ای ربا۔ کیا تم رب کو پکارتے ہو۔ تو اسے ربوبیت میں بلند ہونے کی وجہ سے بعل کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے: بَعْل وبُعُولۃ۔ جیسا کہ ذکر کی جمع میں کہا جاتا ہے ذَکَر و ذُکُورۃ اور فحل کی جمع میں کہا جاتا ہے: فَحْل و فُحُولۃ، اس کے آخر میں یہ ہا زائدہ ہے اور جمع مؤنث کی تاکید کے لئے ہے[2] اور یہ شاذ ہے، اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا اور اس میں سماع معتبر ہوتا ہے، پس لعب میں لعوبۃ نہیں کہا جا سکتا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ ہا تانیث ہے جو فعول پر داخل کی گئی ہے[3]۔

اور البعولۃ البعل کا مصدر بھی ہے اور بعل الرجل یبعل (مثل منع یمنع) بعولۃ، یعنی آدمی بعل ہو گیا اور المباعلۃ اور البعال کا معنی جماع ہے۔ اسی معنی میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایام تشریق کے بارے ارشاد گرامی ہے: انھا ایام اکل و شرب وبعال[4] (کہ وہ کھانے، پینے اور جماع کرنے کے دن ہیں۔) یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ پس آدمی عورت کے لئے بعل ہے اور عورت مرد کے لئے بعلۃ ہوتی ہے اور تباعل مباعلۃ کہا جاتا ہے جب وہ اس سے مباشرت کرے اور فلان بعل ھذا یعنی فلاں اس کا مالک اور مربی ہے، اس کے کثیر حامل ہیں وہ آگے آئیں گے۔ ان شاء اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ سنن دار قطنی، کتاب الصوم، باب طلوع الشمس بعد الافطار، جلد 3، صفحہ 212، حدیث نمبر 32، دار المحاسن للطباعہ

ہے اور وہ اس سے وطی نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ اسے فاسد پانی سے استبراء کرائے (1) (یعنی یقین کرلے کہ پہلی وطی سے استقرار حمل نہیں ہوا)۔

ابن قاسم نے کہا ہے: اگر اس کی عدت گزر جائے تو وہ اور کوئی غیر بقیہ مدت استبراء میں اس کے ساتھ نکاح نہ کرے، اگر اس نے کیا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا اور عورت مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہوگی کیونکہ وہ پانی بھی تو اسی کا پانی ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: جب مرد نے عورت کے ساتھ مجامعت کرلی تو اس نے اس کی طرف رجوع کرلیا؛ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، حسن بصری، ابن سیرین، زہری، عطا، طاؤس اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ مزید کہا: اور وہ شاہد بنائے گا، اسی طرح اصحاب الرائے، امام اوزاعی اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ نے کہا ہے، اسے ابن منذر نے بیان کیا ہے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: تحقیق کہا گیا ہے: اس کی وطی ہر حال میں رجوع ہوگی، چاہے وہ رجعت کی نیت کرے یا نہ کرے، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ایک فریق سے اسی طرح روایت کیا جاتا ہے اور یہی موقف لیث نے اپنایا ہے۔

اور انہوں (علماء) نے اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی لونڈی خیار کے ساتھ فروخت کی کہ اس کے لئے مدت خیار میں اس کے ساتھ وطی کرنا مباح ہے اور یہ کہ وہ اس کے ساتھ اسے اپنی ملکیت کی طرف واپس لوٹانے والا اور اسے اپنے اس فعل کے ساتھ بیع توڑنے کا اختیار ہے اور یہ حکم مطلقہ رجعیہ کے لئے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس نے بوسہ لیا یا مباشرت کی اور اس سے وہ رجعت کی نیت کرتا ہے تو رجعت ثابت ہو جائے گی اور اگر اس نے بوسہ اور مباشرت سے رجعت کی نیت نہ کی تو وہ گنہگار ہوگا اور رجوع کرنے والا نہ ہوگا اور سنت یہ ہے کہ وہ وطی کرنے سے پہلے یا بوسہ لینے یا مباشرت سے پہلے گواہ بنالے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے وطی کی یا شہوت کے ساتھ اسے مس کیا یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھا تو اس کی رجعت ثابت ہو جائے گی، یہی امام ثوری کا قول ہے اور اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنالے اور امام مالک، امام شافعی، اسحاق، ابو عبید اور ابو ثور رحمہم اللہ کے قول کے مطابق رجعت ثابت نہ ہوگی۔ ابن منذر نے یہی کہا ہے اور استذکار میں کہا ہے: بالقول رجوع کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور رہا بالفعل جیسے کہ جماع اور بوسہ وغیرہ تو قاضی ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان کے ساتھ اور ان تمام افعال کے ساتھ جو حصول لذت کے لئے کیے جاتے ہیں رجوع صحیح ہوتا ہے۔

ابن المواز نے کہا ہے: لذت کے لئے جسم کو چھونا یا اس کی فرج کی طرف دیکھنا یا اس کے محاسن میں سے جو اس کے قریب ہیں انہیں دیکھنا جبکہ وہ اس سے رجعت کا ارادہ کرے بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے کہ رجعت صحیح نہیں ہوتی مگر بالقول، یہ ابن منذر نے ابو ثور، جابر بن زید اور ابو قلابہ رحمہم اللہ سے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس نے عورت سے جماع کیا وہ رجعت کی نیت کرے یا اس کی نیت

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، باب ما جاء فی عدۃ المطلقۃ، جلد 6، صفحہ 122، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، مصر

ذکر ہے تو اس طرح رجعت ثابت نہ ہوگی اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی کیونکہ اگر وہ اسے لوٹا لیتا تو اس پر کوئی مہر نہ تھا اور بغیر رجعت کے وطی مہر کے عوض رجعت سے اولیٰ نہیں ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا سوائے امام شافعی کے کہ جس نے اس پر مہر مثل واجب کیا ہو اور ان کا قول قوی نہیں ہے، کیونکہ یہ عورت زوجات کے حکم میں ہے اور یہ اس مرد کی وارث تھی۔ یہ اور وہ اس کا وارث بنتا۔ یہ تو کس طرح اس عورت کے ساتھ وطی کرنے میں مہر مثل واجب ہوگا جس کا حکم اپنے اکثر احکام میں زوجہ کے حکم کا مثل ہے مگر یہ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں شبہ قوی ہے، کیونکہ بغیر رجعت کے اس عورت کو اس مرد پر حرام قرار دیا گیا ہے اور اس پر علما کا اجماع ہے کہ وہ عورت جس کے ساتھ شبہ کے سبب وطی کی جائے اس کے لئے مہر واجب ہوتا ہے اور یہی بھی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا آدمی عورت کی طرف رجوع کرنے سے پہلے اس کے ساتھ سفر کر سکتا ہے؟ تو امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ رجوع کر لے (1)۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام زفر کے سوا آپ کے دیگر اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ کیونکہ امام زفر سے حسن بن زیاد نے روایت کیا ہے کہ آدمی کے لئے رجعت سے پہلے اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اور ان سے عمرو بن خالد نے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ سفر نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس بارے میں علما کے مابین اختلاف ہے کہ کیا آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کے پاس داخل ہو اور اس کے محاسن میں سے کوئی شے دیکھے اور کیا وہ عورت اس کے لئے بناؤ سنگھار کرے گی اور پھر اس پر ظاہر ہوگی؟ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وہ اس کے ساتھ خلوت اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی بغیر اجازت کے وہ اس پر داخل ہو سکتا۔ ہے اور نہ ہی اس کی طرف وہ دیکھ سکتا ہے مگر یہ کہ اس پر کپڑے ہوں اور نہ ہی وہ اس کے بالوں کی طرف دیکھ سکتا ہے اور کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھائے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ان کے سوا کوئی اور بھی ہو اور نہ وہ ایک کمرے میں اس کے ساتھ رات بسر کر سکتا ہے بلکہ وہ اس سے (دوسرے کمرے میں) منتقل ہو جائے گا۔

ابن قاسم نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور کہا ہے: نہ وہ اس پر داخل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بال دیکھ سکتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ اس کے لئے بناؤ سنگھار کر سکتی ہے، خوشبو لگا سکتی ہے، زیور پہن سکتی ہے اور اس کے سامنے بھی آ سکتی ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب آدمی اپنی عورت کو ایک طلاق دے دے تو وہ اس کے پاس اجازت سے گزر سکتا ہے اور وہ لباس اور زیور میں سے جو چاہے پہن سکتی ہے اور اگر ان دونوں کے لئے ایک کمرے کے سوا اور کوئی نہ ہو تو

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب العدۃ و طلاق السنۃ، جلد 5، صفحہ 146، المطبعۃ الخیریۃ بمصر

وہ اپنے درمیان پردہ ڈال لیں اور آدمی اس کے پاس داخل ہوتے وقت سلام کہے۔ اسی طرح حضرت قتادہ سے بھی مروی ہے اور وہ داخل ہونے سے پہلے کھنکارنے یا کھانسنے وغیرہ کے ساتھ اپنے آنے کا احساس دلائے جب وہ داخل ہو۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: وہ عورت جسے ایک طلاق دی گئی ہو آدمی اس کی طرف رجوع کا مالک ہوتا ہے اور وہ طلاق دینے والے پر طلاق بائنہ والی کی طرح حرام کی گئی ہے یہاں تک کہ وہ رجوع کر لے اور وہ رجوع نہیں کرے گا مگر قول کے ساتھ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ طلاق دینے والے نے جب عدت گزرنے کے بعد کہا: بلاشبہ میں نے عدت میں تیری طرف رجوع کر لیا تھا اور اس نے انکار کر دیا تو اس میں عورت کا قول اس کی قسم کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا اور آدمی کو اس پر کوئی اختیار نہ رہے گا، مگر حضرت نعمان (امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) نکاح اور رجعت میں قسم کا نظریہ نہیں رکھتے اور صاحبین نے اس میں ان کے ساتھ اختلاف کیا ہے اور ان دونوں نے دیگر تمام اہل علم کے قول کی مثل ہی کہا ہے۔ اور اسی طرح جب بیوی لونڈی ہو اور آقا اور لونڈی کا اختلاف ہو جائے اور خاوند عدت گزرنے کے بعد عدت میں رجوع کا دعویٰ کرتا ہو اور اس (لونڈی) نے انکار کیا ہو تو اس میں قول زوجہ لونڈی کا معتبر ہوگا اگرچہ اس کو آقا اسے جھوٹا قرار دے، یہی امام شافعی، ابو ثور اور نعمان رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور یعقوب اور محمد نے کہا ہے: قول آقا کا معتبر ہوگا کیونکہ وہی اس کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ لفظ رد عصمت کے زوال کا تقاضا کرتا ہے مگر ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک طلاق رجعی وطی کو حرام کر دیتی ہے اور رجوع اسے حلت کی طرف لوٹا دیتا ہے۔

اور لیث بن سعد، ابو حنیفہ اور جنہوں نے ان دونوں کے قول کے مطابق کہا ہے، ان کا بیان ہے کہ رجعت وطی کو حلال کر دیتی ہے، طلاق کا فائدہ اس عدد کو کم کرتا ہے جو صرف اس کے لئے رکھا گیا ہے اور احکام زوجیت باقی ہیں ان میں سے کوئی شے نہیں گھٹی۔ انہوں نے کہا: احکام زوجیت اگرچہ باقی ہیں لیکن جب تک عدت میں ہے وہ عدت گزرنے کے ساتھ زوال کے راستے پر چل رہی ہے۔ پس رجعت اس راستے سے واپس لوٹانے کا نام ہے جسے عورت نے اپنے چلنے کے لئے اختیار کر رکھا ہے۔ اور یہ رد مجازی ہے اور وہ رد جس کے ساتھ ہم نے حکم لگایا ہے وہ حقیقی ہے کیونکہ وہاں زوال موجود ہے جو ہو چکا ہے اور وہ وطی کو حرام قرار دینا ہے، پس اس سے حقیقۃً رد (رجوع) واقع ہوا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 10۔ لفظ اَحَقُّ کا اطلاق دو حقوں کے درمیان تعارض کے وقت ہوتا ہے اور ان میں سے ایک حق ترجیح پا جاتا ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ انتظار کی مدت (عدت) میں خاوند کا حق عورت کے بارے میں اس کے اپنے حق سے زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ عورت عدت گزرنے کے بعد اپنے نفس کی مالک بنتی ہے اور اسی طرح حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد بھی ہے: الایم احق بنفسها من ولیها (1) (بیوہ عورت اپنے بارے میں اپنے ولی کی نسبت زیادہ حق رکھتی ہے۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ آدمی کے لئے رجوع مستحب ہے لیکن جب عورت کے لئے اپنے احوال کی اصلاح کے سبب

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1888

اصلاح کا قصد کرے اور آپس میں وحشت کو زائل کرنے کا قصد کرے اور اگر عورت کو ضرر دینا، اس سے عدت کو طویل کرنے اور اس کے ساتھ نکاح کے بچے سے خلاصی پانے کو قطع کرنے کا قصد اور ارادہ کرے تو پھر اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے: وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (البقرہ: 231) (اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو) پھر جس نے ایسا کیا تو رجعت صحیح ہوگی اگرچہ اس نے نہی کا ارتکاب کیا اور اپنے نفس پر ظلم کیا اور اگر ہم نے اس مقصود کو جان لیا تو ہم اس پر چھوڑ دیں گے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ، اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَهُنَّ یعنی حقوق زوجیت میں سے ان کے حقوق مردوں پر ہیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: بلاشبہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و زینت کا اہتمام کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ یہی ہے کہ میں اپنے وہ تمام حقوق اچھی طرح حاصل کروں جو میرے اس پر ہیں اور وہ اپنے وہ حقوق حاصل کرے جو اس کے مجھ پر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق) یعنی ایسی زینت جس میں گناہ نہ ہو۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے: یعنی ان کے لئے حسن صحبت اور حسن سلوک ان کے خاوندوں پر اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے ان پر ہر اس کام میں اطاعت واجب ہے جو وہ ان پر لازم قرار دیں۔

اور کہا گیا ہے: بے شک ان کے لئے ان کے خاوندوں پر انہیں اذیت نہ دینا اسی طرح لازم ہے جس طرح اپنے خاوندوں کے لئے معصیت کو ترک کرنا ان پر لازم ہے۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: تم ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح کہ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈریں (1)۔ تمام معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ آیت حقوق زوجیت سے متعلق تمام حقوق کو شامل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: "بلاشبہ میں اپنی زوجہ کے لئے زیب و زینت کرتا ہوں" (2)۔

علماء نے کہا ہے: رہی مردوں کی زینت تو اس کا انحصار ان کے مختلف احوال پر ہوتا ہے۔ بے شک وہ اس کے اعمال نرم مزاجی، خوش اخلاقی اور اتفاق کی بنا پر کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک طرح کی زینت ایک وقت میں مناسب ہوتی ہے اور ایک وقت میں وہی مناسب نہیں ہوتی، کبھی ایک طرح کی زینت جوانوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور ایک زینت بوڑھوں کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے اور وہ جوانی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ کیا تو دیکھتا نہیں کہ شیخ اور بوڑھا آدمی جب اپنی مونچھیں مونڈ دے تو یہ اس کے لئے موزوں ہے اور اس کے لئے باعث زینت ہے اور جوان جب ایسا عمل کرے تو وہ بدصورت ہو جاتا ہے اور اسے ناپسند کیا جاتا ہے کیونکہ داڑھی ابھی بڑی نہیں اور جب وہ اپنی مونچھیں مونڈ دے جو کہ وہ پہلی بار ظاہر ہوئی ہوں تو

1۔ جامع البیان طبری، جلد 2، صفحہ 543، دار احیاء التراث العربیہ

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 544

اس کا چہرہ قبیح ہو جاتا ہے اور جب اس کی داڑھی بڑھ جائے اور وہ اپنی لبوں کو مونڈ دے تو یہی اس کے لئے زینت بن جاتی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے رب نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں داڑھی مبارک کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دوں اور اپنی لبوں کو کاٹوں (1)"۔ اسی طرح لباس کی کیفیت اور حالت بھی ہے۔ اور ان تمام میں حقوق کی طلب اور چاہت ہے۔ بلاشبہ وہ نرم مزاجی اور خوش اسلوبی سے کام کرتا ہے تاکہ وہ اپنی بیوی کے نزدیک اتنا حسین اور خوبصورت ہو جائے کہ اسے خوش کر دے۔ اور وہ اسے کسی بھی غیر مرد سے پاکدامن کر دے۔ اسی طرح سرمہ ہے مردوں میں سے بعض کے ساتھ وہ مناسبت رکھتا ہے اور بعض کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ اور جہاں تک خوشبو لگانا، مسواک کرنا، دانتوں کا خلال کرنا، میل کچیل اور فالتو بالوں کو دور کرنے، پاکیزگی و طہارت حاصل کرنے اور ناخن تراشنے کا تعلق ہے تو یہ اول بالکل ظاہر اور قوم کے موافق ہیں اور خضاب بوڑھوں کے لئے اور انگوٹھی جوانوں اور بوڑھوں تمام کے لئے زینت ہے اور یہ مردوں کا زیور ہے۔ اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔ پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کی حاجت کے اوقات مقرر کرے اور اسے پاکدامن بنائے اور اسے کسی غیر کی طرف دیکھنے سے بے نیاز کر دے اور اگر آدمی اپنے آپ میں بستر پر عورت کے حقوق ادا کرنے سے عجز اور کمزوری دیکھے تو وہ ایسی ادویہ استعمال کرے جو اس کی قوت باہ میں اضافہ کریں اور اس کی شہوت کو تقویت پہنچائیں یہاں تک کہ وہ اسے پاکدامن بنا دے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی مردوں کے لئے عورتوں پر درجہ اور رتبہ ہے۔ اور مدرجۃ الطریق: اس کا معنی ہے راستے کا بلند اور بڑا حصہ۔ اس میں اصل معنی الطی لپیٹنا ہے۔ کہا جاتا ہے: درجوہ یعنی طووہ، مدرجہ انہوں نے اپنی اصلی تحریر لپیٹ لی اور اسی سے وہ درجہ ہے جس پر وہ ترقی کرتا ہے اور کہا جاتا ہے: رجل بین الرجلۃ، یعنی ایسا آدمی جس کی قوت ظاہر ہو۔ وھو ارجل الرجلین یعنی وہ ان دونوں میں سے زیادہ قوی ہے اور فرس رجیل یعنی طاقتور گھوڑا اور اسی سے الرجل ہے کیونکہ اس میں چلنے کی قوت ہوتی ہے۔ پس آدمی کے مرتبہ کی زیادتی اس کی عقل اور اس کے خرچ کرنے کی قوت کے سبب اور دیت، میراث اور جہاد کے سبب ہے۔

حمید نے کہا ہے: الدرجہ کا معنی داڑھی ہے۔ یہ اگر ان کی طرف سے صحیح بھی ہے تو بھی ضعیف ہے۔ اس کا تقاضا نہ آیت کا لفظ کرتا ہے اور نہ اس کا معنی۔ (2)

ابن عربی نے کہا ہے: بندے کے لئے اچھا اور خوبصورت یہ ہے کہ اس سے باز رہے جو وہ نہیں جانتا اور خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اور مردوں کی عورتوں پر فضیلت کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہے اور اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی عورت مرد سے تخلیق کی گئی ہے۔ پس مرد اس کی اصل ہے (3) اور مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے بغیر اجازت کے تصرف کرنے سے روکے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی مگر مرد کی اجازت کے ساتھ اور وہ حج نہیں کر سکتی مگر محرم کے ساتھ۔ اور کہا گیا ہے کہ الدرجۃ کا معنی الصداق

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 656، حدیث ... موسسۃ الرسالۃ بیروت۔ بخاری شریف، باب تقلیم الاظفار، حدیث نمبر 5442، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ
3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 188-189، دار الفکر

(درجہ) بھی ہے۔ شعبی نے یہی کہا ہے اور کہا گیا ہے اس کا معنی جواز الادب (ادب کا لحاظ رکھنا) ہے۔ جہاں معانی کے اعتبار سے اس درجہ کا لفظ تفضیل کا تقاضا کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ خاوند کا حق زوجہ پر اس سے زیادہ ہے جو بیوی کا حق خاوند پر ہے۔ اسی لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: ولو امرت احدا بالسجود لغیر اللہ لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا (1) (اگر میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ الدرجۃ لفظ مردوں کو حسن معاشرت پر ابھارنے اور عورتوں کے لئے مال اور اخلاق میں وسعت ظرفی اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بلاشبہ افضل کو چاہئے کہ وہ اپنے اوپر بوجھ برداشت کرے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول حسن اور عمدہ ہے۔ (2)

ماوردی نے کہا ہے: احتمال ہے کہ یہ حقوق نکاح میں ہو۔ اس کے لئے ان کے سوا عقد نے افزوں کیا ہے اور عورت پر لازم ہوتا ہے کہ مرد کے بلانے پر اس کے بستر پر آئے اور مرد پر اس کی دعوت کو قبول کرنا لازم نہیں ہوتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اسی کے بارے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: "جس عورت کو اس کے خاوند نے اپنے بستر کی جانب بلایا اور اس نے اس سے انکار کر دیا تو ملائکہ صبح ہونے تک اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں" (3)۔ واللہ عزیز یعنی وہ غالب اور سلطان ہے، اس پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں۔ حکیم یعنی وہ جاننے والا ہے اور جو وہ کرتا ہے وہی درست اور صحیح کرتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"طلاق دو بار ہے پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ واپس لو اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔ یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اس میں سات مسائل ہیں:

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حق الزوج علی المرأۃ، جلد 1، صفحہ 134، وزارت تعلیم
جامع ترمذی، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأۃ، حدیث نمبر 1079، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دارالکتب العلمیہ
3۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، حدیث نمبر 4794، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گئی تو وہ بھی خطاب میں سے ایک خاطب (پیغام نکاح بھیجنے والا) ہے۔ کتاب اللہ، سنت اور اجماع امت اس پر دال ہے کہ طلاق مباح ہے ممنوع نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اس سے منع کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے جو ثابت ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ دار قطنی نے روایت کیا ہے "مجھے ابو العباس محمد بن موسیٰ بن العدولی اور یعقوب بن ابراہیم دونوں نے حدیث بیان کی ہے اور ان دونوں نے کہا ہے: ہمیں حسن بن عرفہ، اسماعیل بن عیاش بن حمید ابن مالک اللخمی نے مکحول سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ذکر کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک عتاق (آزاد کرنے) سے زیادہ پسندیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی شے تخلیق نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہو۔ پس جب کوئی آدمی اپنے غلام کو کہے انت حر ان شاء اللہ تعالیٰ تو آزاد ہے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ آزاد ہے اور اس کے لئے استثنا نہیں ہے اور اگر کوئی اپنی بیوی کو کہے انت طالق ان شاء اللہ تعالیٰ تو اس کے لئے استثنا ہے اور اسے طلاق واقع نہ ہوگی۔"

محمد بن موسیٰ بن علی، حمید بن ربیع، یزید بن ہارون نے ہمیں بیان کیا کہ اسماعیل بن عیاش نے اپنی اسناد کے ساتھ اسی طرح ہمیں خبر دی ہے۔

حمید نے کہا ہے کہ مجھے یزید بن ہارون نے کہا ہے: کون سی حدیث ہے اگر حمید ابن مالک اللخمی معروف ہوتا! میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں! تو یزید نے کہا: تو نے مجھے خوش کر دیا ہے اب یہ حدیث ہوئی ہے!"(1)

ابن منذر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے طلاق میں استثنا یعنی ان شاء اللہ کو موثر قرار دیا ہے ان میں سے طاؤس، حماد، امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ ہیں۔

امام مالک اور امام اوزاعی کے قول کے مطابق طلاق میں استثنا جائز نہیں ہے اور حسن اور قتادہ کا صرف طلاق کے بارے میں یہی قول ہے۔ فرمایا: وبالقول الاول اقول۔ میں تو پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ یہ مبتدا ہے اور خبر امثل یا احسن ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو یعنی فعلیکم امساک بمعروف، یا فالواجب علیکم امساک بما یعرف انہ الحق (2) (یعنی تم پر واجب ہے روک لینا ایسے طریقے سے جس کے بارے یہ معلوم ہو کہ یہ حق اور درست ہے) اور قرآن کے علاوہ اسے مصدر ہونے کی بنا پر فَاِمْسَاكًا پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور باحسان کا معنی یہ ہے کہ وہ بیوی کے حقوق میں سے کسی بھی شے میں اس پر ظلم نہ کرے اور نہ قول میں زیادتی اور حد سے تجاوز کرے۔ اور الامساک، الاطلاق کے خلاف ہے (یعنی امساک کا معنی روکنا اور اطلاق کا معنی چھوڑنا ہے۔) اور التسریح کا معنی ہے کسی شے کو چھوڑ دینا اور اسی سے تسریح الشعر (یعنی بالوں کو چھوڑ دینا ہے تاکہ وہ بعض کو بعض سے علیحدہ

1۔ سنن دار قطنی، جلد 4، صفحہ 35، دار المحاسن قاہرہ
2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 200، دار الکتب العلمیہ

کرے اور متعہ واجب ادا کرے۔ اس نے موسیٰ کو چھوڑ دیا اور تسریح کا لفظ دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے یہاں تک کہ دوسری طلاق کی عدت مکمل ہو جائے اور وہ اپنے نفس کی زیادہ مالک ہو جائے۔ یہ سدی اور ضحاک کا قول ہے اور دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ اسے تیسری طلاق دے اور اسے چھوڑ دے۔ یہ حضرت عطا اور حضرت مجاہد وغیرہما کا قول ہے (1) اور تین وجوہ کی بنا پر یہ زیادہ صحیح ہے۔

(۱) وہ حدیث جسے دارقطنی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ (طلاق دو بار ہے) تو یہ تین کیونکر ہوئیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ ایک روایت میں ہے: یہ تیسری طلاق ہے (2)۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۲) تسریح الفاظ طلاق میں سے ہے کیا تو جانتا نہیں کہ ان سرحوا السراح الجمیل پڑھا گیا ہے۔

(۳) بے شک فعل تفعیل یعنی باب تفعیل اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نے دوسری طلاق پر فعل کو مکرر کیا ہے اور ترک میں فعل کا نئے سرے سے کرنا نہیں ہے جسے تفعیل سے تعبیر کیا جاتا ہو (3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس پر علماء نے اجماع کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ یہ دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی یہی مراد لی گئی ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ (البقرہ: 230) (دو بار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ) اور اس پر بھی علماء کا اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں تو اس کے لئے اس کی طرف رجوع کا حق ہے اور اگر اس نے اسے تیسری طلاق دے دی تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی کرے (4)۔ اور یہ قرآن کریم کا وہ محکم حکم ہے جس کی تاویل (اور معنی) میں کوئی اختلاف نہیں۔ اسی کی مثل عادل راویوں کی احادیث بھی مروی ہیں۔ حمید بن نصر نے بیان کیا کہ ہمیں قاسم بن اصبغ نے بیان کیا کہ ہمیں محمد بن وضاح نے بتایا، انہوں نے کہا: ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کیا اور انہوں نے کہا: ہمیں ابو معاویہ نے اسماعیل بن سمیع کے واسطہ سے ابو رزین سے حدیث بیان کی۔ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے آپ کا کیا خیال ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ تو اس میں تیسری طلاق کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (وہ یہ ہے) فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور اسے ثوری وغیرہ نے اسماعیل بن سمیع سے اور انہوں نے ابو رزین سے اسی طرح روایت کیا ہے (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الکیا الطبری نے یہ خبر ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ نقل کے اعتبار سے ثابت نہیں ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کو ترجیح دی ہے اور یہ کہ تیسری طلاق تو اس ارشاد گرامی میں سیاق خطاب میں مذکور ہے: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 305، دار الکتب العلمیہ 2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ 4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر 5۔ سنن دارقطنی، جلد 4، صفحہ 4، دار المحاسن

واقع ہوتی ہے تو انہوں نے تین احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت طاؤس، ابو صہباء اور عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اور دوسری حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ اس کی روایت کے مطابق جس نے یہ بیان کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجوع کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور وہ آپ کے لئے ایک طلاق شمار ہوئی (1) اور تیسری حدیث یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجعت کا حکم فرمایا (2) اور رجعت ایک طلاق واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

ان احادیث کا جواب وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عطا، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک بن حویرث، حضرت محمد بن ایاس بن بکیر اور حضرت نعمان بن ابی عیاش رضی اللہ عنہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے (کہ) جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس سے جدا ہو گئی اور اب وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا مگر دوسرے زوج کے بعد (3) اور اس بارے میں ان ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت کی ہے وہ جماعت (جمہور کی رائے) سے موافقت رکھتی ہے اور طاؤس وغیرہ کی روایت اس کی (کمزوری) پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے نہیں ہیں کہ وہ اپنی رائے کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخالفت کریں۔

ابن عبد البر نے کہا ہے کہ طاؤس کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، عراق، مشرق اور مغرب کے شہروں کے فقہاء میں سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے موالی میں سے ابو صہباء معروف نہیں ہیں۔

قاضی ابو الولید الباجی نے کہا ہے: میرے نزدیک ابن طاؤس سے اس بارے میں روایت صحیح ہے اور ان سے ائمہ نے روایت کی ہے: (یعنی) معمر اور ابن جریج وغیرہ اور ابن طاؤس امام ہیں اور وہ حدیث جس کی طرف وہ اشارہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے جسے ابن طاؤس نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق کے عہد اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے پہلے دو سال تک تین طلاقیں ایک طلاق تھی۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک لوگ اس امر میں جلدی کرنے لگے ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔ پس اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں! پھر آپ نے اسے ان پر نافذ کر دیا۔ (4)

اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ ایک طلاق واقع کرتے تھے اس کے بدلے جہاں اب لوگ تین طلاقیں واقع کرتے ہیں اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ بے شک لوگ اس معاملے میں جلدی کرنے لگے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1877، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ شرح معانی الآثار، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 34، مکتبہ امدادیہ ملتان

4۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 477-478، وزارت تعلیم

ہیں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی تو آپ نے انہیں ناپسند کیا کہ وہ طلاق دینے کے معاملہ میں جلدی کریں جس میں ان کے لئے تاخیر تھی پس اگر ابتدائے اسلام میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ان کا یہی حال ہوتا جو آپ نے کہا ہے تو ان پر یہ عیب نہ ہوتا کہ انہوں نے اس معاملہ میں جلدی کی ہے جس میں ان کے لئے تاخیر تھی۔

اور اس تاویل کے صحیح ہونے پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کئی سندوں سے مروی ہے کہ آپ نے اس کے لئے تین طلاقوں کے لازم ہونے کا فتویٰ دیا جس نے اکٹھی تین واقع کیں۔ پس اگر ابن طاؤس کی حدیث کے یہ معنی ہیں تو یہ تو ہم نے بیان کر دیے ہیں اور اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے جس میں وہ تاویل کرتے ہیں جن کے قول کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی تو بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے اور قیاس کے اعتبار سے ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ طلاق ہے اور اسے وہ واقع کرتا ہے جو اس کا مالک ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اسے لازم قرار دیا جائے اور اس کی اصل یہ ہے کہ جب کوئی مفرد طلاق واقع کرے (تو وہ واقع ہو جاتی ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو تاویل الباجی نے بیان کی ہے وہ وہی ہے جس کا معنی الکیا الطبری نے علمائے حدیث سے ذکر کیا ہے؟ یعنی وہ ایک طلاق دیتے تھے۔ وہی اب تین طلاقیں دیتے ہیں، یعنی وہ ہر طہر میں ایک طلاق نہیں دیتے تھے؟ ... پوری عدت میں ایک طلاق دیتے تھے یہاں تک کہ وہ جدا ہو جاتی اور عدت گزر جاتی۔

قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے بیان کیا ہے: اس کا معنی ہے کہ لوگ ایک طلاق پر اقتصار کرتے تھے، پھر وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کثرت سے تین طلاقیں دینے لگے۔ قاضی نے کہا: یہی معنی راوی کے اس قول کے زیادہ مشابہ ہے کہ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقوں میں جلدی کی تو آپ نے ان پر جلدی نافذ کر دی۔ اس کا معنی ہے کہ آپ نے ان کا حکم ان پر لازم کر دیا۔

اور رہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث تو دار قطنی نے احمد بن صبیح عن طریف بن ناصح عن معاویہ بن عمار الدھنی عن ابی الزبیر کی سند سے روایت کیا ہے کہ ابو الزبیر نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے پوچھا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں درآنحالیکہ وہ حائضہ ہو تو انہوں نے مجھے فرمایا: کیا تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کو پہچانتا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں (اور وہ حائضہ تھی) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سنت کی طرف لوٹا دیا۔ اور دار قطنی نے کہا: تمام کے تمام (راوی) شیعہ ہیں۔ اور محفوظ روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں ایک طلاق دی۔(1)

عبید اللہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اسے حالت حیض میں ایک طلاق دی تھی مگر انہوں نے سنت کے خلاف عمل کیا تھا۔

اسی طرح صالح بن کیسان، موسیٰ بن عقبہ، اسماعیل بن امیہ، لیث بن سعد، ابن ابی ذئب، ابن جریج، جابر، اسماعیل بن

1۔ سنن دار قطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 7، دار المحاسن

ابراہیم بن عقبہ نے حضرت نافع سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک طلاق دی تھی (1) اور اسی طرح زہری نے سالم عن ابیہ اور یونس ابن جبیر اور شعبی و حسن سے بیان کیا ہے۔

اور رہی حدیث رکانہ تو اس کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ حدیث مضطرب، منقطع ہے، کسی ایسی سند سے یہ بیان نہیں کی گئی جس سے استدلال ہو سکتا ہو۔ اسے ابو داؤد نے ابن جریج کی حدیث سے بیان کیا جو انہوں نے بنی رافع کے بعض افراد سے نقل کی ہے اور ان میں کوئی بھی قابل حجت نہیں ہے۔ (یعنی) عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے۔ اور اس میں ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: "تو اسے واپس لوٹا لے۔" (2)

تحقیق اسے کئی طرق سے عن نافع بن عجیر بھی روایت کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی اور رسول اللہ ﷺ نے اسے قسم دی کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے قسم کھائی کہ انہوں نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے اسے ان کی طرف واپس لوٹا دیا (3)۔ پس یہ سند اور متن دونوں میں اضطراب ہے اور اس طرح کی شے سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس حدیث کو کئی طرق سے دارقطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے۔ بعض میں کہا ہے: حدثنا محمد بن يحيى بن مرداس حدثنا ابو داؤد السجستاني حدثنا احمد بن عمرو بن السرح و ابو ثور ابراهيم بن خالد الكلبي اور دوسروں نے کہا: حدثنا محمد بن ادريس الشافعي حدثني عمي محمد بن علي بن شافع عن عبد الله بن علي بن السائب عن نافع بن عجير بن عبد يزيد کہ رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی سہیمہ المزنیہ کو بتہ طلاق دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم ﷺ کو آگاہ کیا اور کہا: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے (بیوی کو) اس کی طرف واپس لوٹا دیا اور انہوں نے دوسری طلاق حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دی اور تیسری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں (4)۔ ابو داؤد نے کہا ہے: "یہ حدیث صحیح ہے"۔ پس حدیث رکانہ میں سے جو صحیح ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی نہ کہ تین طلاقیں دیں۔ اور طلاق البتہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔ پس اس سے استدلال ساقط ہو گیا۔ والحمد للہ، واللہ اعلم۔

اور ابو عمر نے کہا کہ حدیث رکانہ کے بارے میں امام شافعی کی روایت اپنے چچا سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے اور انہوں نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 476، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886 _ 1887، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت۔ ترمذی حدیث، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 300، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 1888، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسکی زیادتی بیان کی ہے جسے اصول رد نہیں کرتے۔ پس اس کے ناقل کے ثقہ ہونے کی وجہ سے اسے قبول کرنا واجب ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان کے چچا اور ان کے دادا رکانہ کے اہل بیت ہیں اور تمام کے تمام بنی عبد المطلب بن عبد مناف میں سے ہیں اور وہ اس قصہ کو زیادہ بہتر جانتے ہیں جو انہیں پیش آیا۔

فصل: احمد بن محمد بن مغیث الطلیطلی نے اپنی وثائق میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور کہا ہے: طلاق دو قسموں پر منقسم ہے: طلاق سنت اور طلاق بدعت۔ پس طلاق سنت وہ ہے جو اس طریقہ پر واقع ہو جو شریعت نے مباح قرار دیا ہے اور طلاق بدعت وہ ہے جو اس کی نقیض اور ضد ہو اور وہ یہ ہے کہ آدمی عورت کو طلاق دے حالت حیض میں یا حالت نفاس میں یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں دے، پس اگر اس نے ایسا کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی۔

اہل علم کے اس پر اجماع کر لینے کے بعد کہ وہ طلاق دینے والا ہے ان کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ کتنی طلاقیں اسے لازم ہوں گی، تو حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اسے ایک طلاق لازم ہوگی، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے اور فرمایا: اس کا قول ثلاثا اس کا کوئی معنی نہیں ہے کیونکہ اس نے تین بار طلاق نہیں دی۔ البتہ اس کا قول انی طلقت ثلاثا جائز ہوگا جبکہ وہ اس سے اس کے بارے خبر دے رہا ہو جو گزر چکا ہے۔ پس وہ کہتا ہے: میں نے تین طلاقیں دیں تو یہ ان تین افعال کی خبر دینے والا ہو جائے گا جو اس سے تین اوقات میں صادر ہوئے۔ جیسا کہ کوئی آدمی کہے: "میں نے کل فلاں سورۃ تین بار پڑھی" تو وہ صحیح ہوگا اور اگر اس نے ایک بار سورۃ پڑھی اور کہا: میں نے اسے تین بار پڑھا" تو وہ جھوٹا ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین بار قسم کھائے کہ وہ قسم کو بار بار دہراتا ہے تو یہ تین قسمیں ہوں گی اور اگر اس نے ایک بار قسم کھائی اور کہا: احلف باللہ ثلاثا میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تین قسمیں کھاتا ہوں تو یہ صرف ایک قسم ہوگی اور طلاق بھی اسی کی مثل ہے۔

حضرت زبیر بن عوام اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے اور ہم نے یہ سب ابن وضاح سے روایت کیا ہے اور شیوخ قرطبہ میں سے ابن زنباع شیخ ہدی محمد بن تقی بن مخلد، محمد بن عبد السلام الخشنی جو اپنے وقت میں منفرد عالم دین اور فقیہ عصر تھے، اصبغ بن الحباب اور ان کے سوا ایک پوری جماعت نے اسی طرح کہا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حجت میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لفظ طلاق تفریق کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس سے مراد دو الگ طلاقیں ہیں (یعنی دو بار طلاق) جس کے بعد امساک بمعروف ہو سکتا ہے اور اس سے مراد عدت میں رجوع کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا معنی ہے کہ وہ اسے بغیر رجوع کیے اسی حالت پر چھوڑے رکھے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے (1) اور اس میں اس پر احسان ہے اگر ان دونوں کے درمیان ندامت واقع ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ○ (الطلاق) (تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔) اس سے مراد فرقت پر ندامت اور رجعت میں

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 307، دار الفکر

رغبت رکھتا ہے اور تین کو واقع کرنا اچھا نہیں ہے کیونکہ اس میں اس وسعت کو ترک کرتا ہے جو ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اور اس پر مترتب کیا۔ پس اللہ تعالیٰ کا طلاق کو متفرق ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جب انہیں جمع کیا جائے تو وہ لفظ واحد ہے (لہذا ایک واقع ہوگی) اور اسی مدونہ میں موجود دیگر مسائل جو اس پر دلالت کرتے ہیں ان پر قیاس کے ذریعے اسے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے انسان کا یہ قول ہے: مالی صدقة فی المساکین کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو ثلث مال اس کی طرف سے جائز ہوتا ہے۔ اور ابن منذر کی الاشراف میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر، طاؤس، ابو الشعثاء، عطا اور عمرو بن دینار رحمہم اللہ کہتے ہیں: جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ ایک واقع ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ بسا اوقات انہوں نے ہمت کی اور کہا: غیر المدخول بها لا عدة علیها، کیونکہ جب اس نے غیر مدخول بہا عورت کو کہا انت طالق ثلاثا تو وہ انت طالق سے اس کے فارغ ہونے کے ساتھ ہی بائنہ ہوگئی تو ثلاثا کا لفظ اس پر اس حال میں پڑ رہا ہے کہ وہ بائنہ ہو چکی ہے۔ لہذا یہ لفظ اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوگا، کیونکہ اس کا قول: انت طالق (معنی طلاق کو ادا کرنے میں) بنفسہ مستقل ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ غیر مدخول بہا عورت میں بینونت (جدائی) اس پر موقوف نہ ہو جو اس کے بعد وارد ہو رہا ہے جبکہ اس میں اصل "انت طالق" ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام شافعی نے قول باری تعالیٰ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور سَرِّحُوْهُنَّ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ یہ لفظ طلاق کے لئے صریح ہے۔ (1) حالانکہ علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو محمد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ صریح وہ ہوتا ہے جو کسی بھی طریقہ پر لفظ طلاق کو متضمن ہو، مثلاً وہ کہے: انت طالق، انت مطلقة، قد طلقتك، یا الطلاق له لازم۔ اور اس کے سوا الفاظ طلاق میں سے جو بھی اس معنی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ الفاظ کنایہ ہیں اور اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو الحسن نے کہا ہے: طلاق کے لئے الفاظ صریح کثیر ہیں اور ان میں سے بعض بعض کی نسبت زیادہ بین اور واضح ہیں: (مثلاً) لفظ طلاق، سراح، فراق، حرام، خلیة اور بریة وغیرھا۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: صریح تین الفاظ ہیں اور وہ وہ ہیں جن کے بارے قرآن وارد ہو چکا ہے اور وہ ہیں لفظ طلاق، السراح اور الفراق۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (الطلاق: 2) (یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ) اور فرمایا: اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اور مزید فرمایا: فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (الطلاق: 1) (تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب یہ بات ثابت اور متحقق ہوگئی تو پھر طلاق کی دو قسمیں ہیں: صریح اور کنایہ۔

پس صریح تو وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور کنایہ وہ ہے جو اس کے سوا ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صریح میں آدمی نیت کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ صرف لفظ کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور کنایہ نیت کی محتاج ہوتی ہے اور ان کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 308، دار الکتب العلمیہ

دلیل جنہوں نے کہا: بے شک (یہ الفاظ) الحرام، الخلیۃ اور البریۃ صریح الطلاق ہیں، طلاق کے معنی میں کثیر الاستعمال ہیں یہاں تک کہ وہ اس معنی میں معروف ہیں اور یہ باب طلاق میں بین اور واضح ہو گئے، جیسا کہ جس طرح غائط کا لفظ پست زمین کے لیے وضع کیا گیا، پھر اسے بطریق مجاز قضائے حاجت کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور وہ اس معنی میں زیادہ بین، ظاہر اور مشہور ہو جائے اس کی نسبت جس کے لئے اسے وضع کیا گیا اور ہمارے مسئلہ میں اسی طرح کی مثال ہے۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا ہے: "اگر طلاقیں ہزار ہوں تو (طلاق) البتۃ ان میں سے کوئی شے باقی نہیں چھوڑتی۔ پس جس نے کہا ہے: البتۃ تو اس نے انتہائے اخیر کو پھینک دیا (1)۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔

دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: الخلیۃ والبریۃ والبتۃ والبائن اور الحرام تین طلاقیں ہیں، اور عورت آدمی کے لئے حلال نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسرے خاوند سے شادی کر لے (2)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی روایت ہے کہ البتۃ تین طلاقیں ہیں۔ ان البتۃ ثلاث سند کے اعتبار سے اس میں ضعف ہے، اسے دارقطنی نے بیان کیا ہے اور عنقریب ارشاد خداوندی: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ هُزُوًا کے تحت اس کا ذکر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس کے بارے کوئی اختلاف نہیں کیا جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد طلقتک میں نے تجھے طلاق دی، کہ یہ مدخول بہا اور غیر مدخول بہا دونوں کے حق میں صریح طلاق ہے اور جس نے اپنی عورت کو کہا: انت طالق تو طلاق والی ہے تو یہ ایک طلاق ہے مگر یہ کہ وہ اس سے زیادہ کی نیت کرے۔ اور اگر اس نے دو یا تین کی نیت کر لی تو وہی ہی لازم ہو جائیں گی جن کی اس نے نیت کی اور اگر اس نے کسی شے کی نیت نہ کی تو پھر ایک طلاق ہوگی اور آدمی رجعت کا مالک ہوگا (یعنی ایک طلاق رجعیہ ہوگی) اور اگر اس نے کہا: انت طالق اور کہا: میں نے قید (بیڑیوں) سے آزاد ہونے کا ارادہ کیا ہے تو اس کا قول قبول نہ کیا جائے گا اور طلاق اس پر لازم ہو جائے گی مگر یہ کہ وہاں کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس کے صدق پر دلالت کرتا ہو اور جس نے کہا: انت طالق واحدۃ، لا رجعۃ لی علیک تو اس کا قول: لا رجعۃ لی علیک (مجھے تجھ پر رجوع کا حق نہیں) باطل ہوگا اور اس کے قول واحدۃ کی وجہ سے اس کے لئے رجعت ثابت ہوگی، کیونکہ واحدۃ سے مراد تین نہیں ہو سکتیں اور اگر اس نے اپنے قول: لا رجعۃ لی علیک سے تین کی نیت کی تو امام مالک کے نزدیک یہ تین ہی ہوں گی۔

اور اس کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: قد فارقتک (میں نے تجھے جدا کر دیا)، سرحتک (میں نے تجھے چھوڑ دیا)، انت خلیۃ (تو فارغ ہے)، انت بریۃ (تو بری ہے) انت بائن (تو جدا ہے)، حبلک علی غاربک (تیری رسی تیرے کندھے پر)، انت علی حرام (تو مجھ پر حرام ہے)، الحقی باھلک (تو اپنے اہل سے جا مل)، قد وھبتک لاھلک (میں نے تجھے تیرے اہل کے حوالے کر دیا)، قد خلیت سبیلک (میں نے تیرا راستہ چھوڑ دیا)، لا سبیل لی علیک (مجھے تجھ پر کوئی اختیار نہیں) تو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: اس سے طلاق

1۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، باب ما جاء فی البتۃ، جلد 1، صفحہ 511، وزارت تعلیم

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 2، جز رابع، صفحہ 32، دار المحاسن

بائن واقع ہوگی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب آدمی نے اپنی بیوی کو کہا استقلی بامرک (تو اپنے معاملے میں مستقل ہے) یا امرک لک (تیرا معاملہ تیرے سپرد ہے) یا الحقی باھلک۔ (تو اپنے گھر والوں سے جا مل) اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس سے ایک طلاق بائن ہو گی۔

اور امام مالک سے اس کے بارے میں یہ مروی ہے جس نے اپنی عورت کو کہا: قد فارقتک یا سرحتک کہ یہ صریح طلاق میں سے ہے۔ جیسا کہ اس کا قول: انت طالق صریح ہے اور آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ طلاق کنایہ ہے، لہٰذا اس میں کہنے والے کی نیت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا جتنے عدد کا اس نے ارادہ کیا ہے مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا۔

ابن المواز نے کہا ہے: وہ عورت جس کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا اس کے بارے میں دو میں سے اصح قول یہ ہے کہ ایک طلاق ہو گی مگر یہ کہ وہ اکثر کی نیت کرے۔ ابن القاسم اور ابن عبد الحکم نے یہی کہا ہے۔

اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ تین طلاقیں ہیں اور اس کی مثل یہ الفاظ بھی ہیں: خلعتک (میں نے تجھے چھوڑ دیا) یا لا ملک لی علیک (میری تجھ پر کوئی ملکیت نہیں)

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام الفاظ کنایات سے مدخول بہا عورت کے حق میں تین طلاقیں ہوتی ہیں جن میں کہنے والا کوئی نیت نہ کرے اور غیر مدخول بہا کے بارے میں وہ نیت کرے اور اگر وہ صرف الفاظ دے اور کہے: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ خطاب میں سے ایک خاطب ہے کیونکہ مدخول بہا عورت کو اس کا خاوند نہ چھوڑ سکتا ہے نہ جدا کر سکتا ہے اور نہ ہی بری قرار دے سکتا ہے مگر تین طلاقوں کے ساتھ اور جس سے دخول نہ کیا گیا ہو تو اسے وہ ایک طلاق کے ساتھ چھوڑ سکتا ہے، بری کر سکتا ہے اور جدا کر سکتا ہے۔

امام مالک اور آپ کے اصحاب کے ایک طائفہ سے مروی ہے اور یہی اہل مدینہ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ وہ ان تمام الفاظ میں نیت کرے گا اور طلاق میں سے جس کی اس نے نیت کی وہ اسے لازم ہو جائے گی۔

اور آپ سے تمام کنایات میں سے بالخصوص البتۃ کے بارے یہ مروی ہے کہ وہ اس سے نیت نہ کرے نہ مدخول بہا کے بارے میں اور نہ غیر مدخول بہا کے بارے میں۔

اور امام ثوری، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے: ان تمام میں اس کی نیت کا اعتبار ہے، پس اگر اس نے تین کی نیت کی تو یہ تین ہوں گی اور اگر ایک کی نیت کی تو وہ ایک بائنہ ہو گی اور وہ اپنے نفس کے بارے زیادہ حقدار ہو جائے گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ ایک ہو گی۔ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اگر اس نے دو کی نیت کی تو یہ دو ہوں گی۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: ان تمام الفاظ میں وہ طلاق دینے والا نہیں ہو گا یہاں تک کہ وہ یہ کہے: میں نے اپنے کلام سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو پھر اتنی ہوں گی جتنی کی اس نے نیت کی۔ پس اگر اس نے تین سے کم کی نیت کی تو وہ رجعی ہو گی۔ اور اگر اس نے اسے ایک بائن طلاق دی تو وہ ایک طلاق رجعی ہو گی۔

اور اسحاق نے کہا ہے: ہر وہ کلام جو طلاق سے مشابہت رکھتا ہو تو اس سے وہ طلاق واقع ہو جائے گی جس کی اس نے نیت کی اور ابو ثور نے کہا: یہ طلاق رجعیہ ہوگی اور اس کی نیت کے بارے نہیں پوچھا جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ طلاق بائن کا تصور نہیں کرتے مگر خلع یا ایلاء میں اور ان میں یہی روایت محفوظ ہے۔ ابو عبید نے بھی یہی کہا ہے۔

اور امام بخاری نے یہ عنوان باندھا ہے باب اذا قال فارقتک او سرحتک او البریة او الخلیة او ما عنی به الطلاق فهو علی نیته (1) (یعنی ان الفاظ سے طلاق کا انحصار اس کی نیت پر ہے۔) اور آپ نے اس سے علمائے کوفہ اور امام شافعی کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے قول ما عنی به من الطلاق سے اسحاق کے قول کی طرف اشارہ کیا ہے اور جس میں یہ دلیل ہے کہ ہر وہ کلمہ جو طلاق یا غیر طلاق ہونے کا احتمال رکھتا ہو تو یہ جائز نہیں کہ اس سے طلاق لازمی ہو مگر تب جبکہ متکلم یہ کہے: بلاشبہ اس نے اس سے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو اس کے اقرار کے ساتھ اس سے طلاق لازم ہو جائے گی اور نکاح کو باطل کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یقین کے ساتھ اس کے صحیح ہونے پر انہوں نے اجماع کیا ہوا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: امام مالک کا قول ایسے آدمی کے قول کے بارے میں مختلف ہے جس نے اپنی بیوی کو کہا: اعتدی (تو عدت کے دن شمار کر)، قد خلیتک، یا حبلک علی غاربک۔

آپ نے ایک بار کہا: وہ ان میں نیت نہیں کرے گا اور یہ تین طلاقیں ہیں۔ اور ایک بار کہا: وہ ان تمام میں نیت کرے گا۔ مدخول بہا کے بارے میں بھی اور غیر مدخول بہا کے بارے میں بھی اور اسی طرح میں بھی کہتا ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف جمہور نے اختیار کیا ہے اور جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ ان الفاظ میں نیت کرے گا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کیا جائے گا وہ صحیح ہے، ہم نے اسے دلیل سے بیان کر دیا ہے اور اس صحیح حدیث سے جسے ابو داؤد، ابن ماجہ اور دار قطنی وغیرہم نے یزید بن رکانہ سے بیان کیا ہے کہ رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو طلاق البتہ دی اور اس کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم بخدا! تو نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے؟ تو رکانہ نے عرض کی: قسم بخدا! میں نے اس سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ عورت ان کی طرف لوٹا دی۔ ابن ماجہ نے کہا ہے: میں نے ابو الحسن الطنافسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: یہ حدیث کتنی اشرف و اعلیٰ ہے۔ (2)

اور امام مالک نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جو اپنی بیوی کو کہتا ہے: انت علی کالمیتة والدم ولحم الخنزیر (تو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 792، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب طلاق البتة، جلد 1، صفحہ 149، وزارت تعلیم

ایضاً، ابو داؤد، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 1886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2040، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ترمذی، کتاب الطلاق واللعان، حدیث نمبر 1097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھ پر مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کی طرح ہے کہ میں اسے البتہ (بالکل جدا) دیکھتا ہوں اگرچہ آدمی کی نیت نہ بھی ہو اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی مگر دوسرے زوج کے بعد۔

اور امام شافعی کے قول میں ہے کہ اگر اس نے طلاق کا ارادہ کیا تو وہ طلاق ہوگی جتنی بھی طلاقوں کا اس نے ارادہ کرلیا اور اگر اس نے طلاق کا ارادہ نہ کیا تو پھر اس کے حلف دینے کے بعد کوئی شے واقع نہ ہوگی۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: ہر وہ لفظ جو کنایۃ عن الطلاق ہے کے بارے میں اس باب کی اصل وہ روایت ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس عورت کے لئے جس سے کسی نے شادی کی تو اس وقت اس عورت نے کہا: اعوذ باللہ منك۔ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ تو اس نے کہا: قد عذت بمعاذ الحقی باھلك (1) (تجھے پناہ حاصل ہے تو اپنے گھر والوں کے ساتھ جا مل) پس وہ طلاق ہو گئی۔ اور حضرت کعب ابن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو کہا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے علیحدہ رہنے کا حکم ارشاد فرمایا تھا الحقی باھلك اور وہ طلاق نہ ہوئی تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ لفظ نیت کا محتاج ہے اور اس میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر اسی کے ساتھ جس کی بولنے والا نیت کرے گا۔ اور اسی طرح تمام الفاظ کنایات کا حکم ہے جو فراق اور غیر فراق کے معنی کا احتمال رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

اور رہے وہ الفاظ جو الفاظ طلاق میں سے نہیں ہیں اور نہ انہیں فراق (جدائی) سے کنایہ قرار دیا جا سکتا ہے تو اکثر علماء ان میں سے کسی سے طلاق واقع نہیں کرتے اگرچہ کہنے والا اس کا ارادہ بھی کرے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جس نے کسی بھی لفظ سے طلاق کا ارادہ کیا تو طلاق اسے لازم ہو جائے گی حتیٰ کہ اس قول کے ساتھ بھی کلی واشربی وقومی واقعدی۔ (تو کھا اور پی، تو کھڑی ہو اور تو بیٹھ جا) اس میں امام مالک کے اپنے اصحاب کے سوا کسی نے ان کی اتباع نہیں کی۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

اس میں چودہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا اس میں "ان" یحل کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور آیت میں خطاب ازواج کو ہے، انہیں منع کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ازواج سے کوئی شے ضرر اور اذیت پہنچانے کی غرض سے لیں اور یہ وہ خلع ہے جو صحیح نہیں ہوتا مگر اس طرح کہ آدمی ضرر اور اذیت دینے میں منفرد نہ ہو۔ اور ذکر خاص کر اسی چیز کا کیا گیا ہے جو خاوندوں نے اپنی عورتوں کو دے رکھی ہوں، کیونکہ لوگوں میں عرف اور رواج یہی ہے کہ فساد اور ناچاکی کے وقت آدمی اس شے کا مطالبہ کرتا ہے جو مرد کے ہاتھ سے عورت کے لئے مہر اور اس کی دیگر حاجات کو پورا کرنے کے لئے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، باب ما یقع بہ الطلاق، جلد 1، صفحہ 149۔
بخاری شریف، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 4852-4853، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، کتاب حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر 4068

سامان نکلا ہو۔ اسی وجہ سے اسے ذکر کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَلَا یَحِلُّ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اور فَاِنْ طَلَّقَهَا کے درمیان بطور جملہ معترضہ کے فصل ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طلاق پر فدیہ لینا جائز ہے اور عورت کا مال نہ لینے کی تشدید پر اجماع ہے مگر یہ کہ نافرمانی اور معاملات میں فساد عورت کی جانب سے ہو۔

ابن منذر نے حضرت عثمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جب ظلم اور خصومت مرد کی جانب سے ہو اور عورت اس سے خلع لے تو اس کا مال لینا جائز ہے اور وہ گنہگار رہے گا اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ حلال نہ ہوگا اور جو مال اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: ان کے قول میں سے یہ ظاہر کتاب اللہ، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت (1) ہونے والی خبر اور اس نظریہ کے خلاف ہے جس پر عام اہل علم کا اجماع ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ اگر کسی کو کہا جائے کہ تو خطا کی تلاش میں خوب محنت اور کوشش کر تو وہ اس سے بڑھ کر کوئی امر نہیں پائے گا کہ کتاب اللہ کسی شے کی تحریم کے بارے حکم لگائے پھر کوئی مقابلہ کرنے والا اس کے مقابل ایسی شے لائے جو نص کے خلاف ہو اور وہ کہنے لگے: بلکہ وہ جائز ہے اور جو کچھ اس نے لیا ہے وہ واپس لوٹانے پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

ابو الحسن بن بطال نے کہا ہے اور ابن قاسم نے امام مالک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ قول ظاہر کتاب اللہ کے خلاف ہے اور حضرت ثابت بن قیس کی بیوی والی حدیث کے خلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کہ وہ (کوئی شے) لے مگر اس اندیشہ اور خوف کے بعد کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے اور تحریم کو اس کے لئے وعید کے ساتھ مؤکد کیا جس نے حد سے تجاوز کیا۔

اور معنی یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو اپنے بارے میں یہ گمان ہو کہ وہ اپنے ساتھی کے نکاح سے متعلق حقوق اس طرح پورے نہ کر سکے گا جس طرح اس پر واجب ہیں۔ اس میں وہ کراہت اور ناپسندیدگی بھی ہے جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے تو پھر عورت پر فدیہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ہی خاوند پر کچھ لینے میں حرج ہے اور خطاب زوجین (میاں بیوی دونوں) کو ہے اور اَنْ یَّخَافَآ میں ضمیر دونوں کے لئے ہے اور اَلَّا یُقِیْمَا مفعول بہ ہے اور خفت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ یہ خوف بمعنی علم ہے یعنی وہ دونوں جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہیں کر سکیں گے اور یہی خوف حقیقی ہے اور یہ مکروہ عمل کے واقع ہونے کا ڈر اور خوف ہے اور یہ ظن کے معنی کے قریب ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ یہ استثناء منقطع ہے۔ (یعنی) لیکن اگر نافرمانی عورتوں کی جانب سے ہو تو پھر تم پر فدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

1۔ الحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دار الکتب العلمیہ

حمزہ نے اسے الا ان یخافا یا کے ضمہ کے ساتھ (یعنی) صیغہ مجہول میں پڑھا ہے اور فاعل محذوف ہوگا اور وہ والی اور حکام ہیں۔ ابو عبید نے اسے پسند کیا ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے ہے فَاِنْ خِفْتُمْ فرمایا: خوف زوجین کے علاوہ کسی اور کے لئے ذکر کیا ہے (یعنی والی یا حاکم کو خوف ہو) اگر زوجین کا ارادہ کرتا تو کہتا: فان خافا اس میں ان کے لئے حجت اور دلیل ہے جنہوں نے خلع سلطان کے حوالے کیا ہے (یعنی حاکم وقت کے فیصلے کے بغیر خلع نہیں ہو سکتا)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حضرت سعید بن جبیر، حسن اور ابن سیرین رحمہم اللہ کا قول ہے اور شعبہ نے کہا ہے: میں نے حضرت قتادہ کو کہا: کس سے حسن نے یہ اخذ کیا ہے کہ خلع سلطان کے سپرد ہے؟ تو انہوں نے کہا: زیاد سے اور یہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی جانب سے والی تھے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ قول زیاد سے معروف ہے اور اس قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں ہے کیونکہ آدمی جب اپنی بیوی سے خلع کرتا ہے تو بلاشبہ وہ اس شے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ دونوں راضی ہوتے ہیں اور سلطان اس پر اسے مجبور نہیں کر سکتا اور اس کے قول کی کوئی اصل نہیں ہے جس نے کہا ہے: یہ سلطان کے سپرد ہے اور انہوں نے ابو عبید کے اختیار کا انکار کیا ہے اور اسے رد کیا ہے اور میں ان کے اختیار اور پسند میں اس حرف سے زیادہ بعید اور کوئی شے نہیں جانتا کیونکہ اعراب، الفاظ اور معنی میں سے کوئی بھی اسے ثابت نہیں کرتا۔ جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے الا ان تخافا کو پڑھا ہے تخافوا اور یہ عربی ہے۔ جب اسے ما لم یسم فاعلہ کی طرف لوٹایا گیا تو کہا گیا: الا ان یخاف اور رہا یہ تو اگر اس کا اعتبار الا ان یخافا پر ہو تو پھر ضروری ہے کہ کہا جائے: فان خیف۔ اور اگر فان خفتم پر ہو تو پھر واجب ہے کہ یہ کہا جائے: الا ان تخافوا۔

اور رہا معنی تو یہ بعید ہے کہ کہا جائے کہ تمہارے لئے حلال نہیں کہ تم اس میں سے کوئی شے لو جو تم نے انہیں دے رکھی ہے مگر یہ کہ تمہارے سوا کسی کو خوف ہو اور رب العالمین نے یہ کہا ہے: فلا جناح علیکم ان تاخذوا منہا فدیۃ (کہ تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ تم مرد کے لئے عورت سے فدیہ لو) کہ خلع سلطان کے حوالے ہو جائے۔

امام طحاوی نے کہا ہے: حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ سلطان کے بغیر خلع کا جائز ہونا صحیح ہے اور جس طرح طلاق اور نکاح بغیر سلطان کے جائز ہیں اسی طرح خلع بھی جائز ہے۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا اگر تمہیں خوف ہو اس بات کا کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے حُدُوْدَ اللّٰهِ کی حدیں۔ یعنی ان حقوق میں جو ان دونوں پر واجب ہیں مثلاً حسن صحبت اور خوبصورت طرز زندگی اور اس میں خطاب حکام کو اور حاکم نہ ہونے کی صورت میں اس طرح کے معاملات میں واسطہ بننے والوں کو کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ کرنے کا معنی ہے عورت کا اپنے خاوند کے حق کو حقیر جاننا اور اس کا اس کی اطاعت نہ کرنا۔ یہی حضرت ابن عباس، مالک بن انس اور جمہور فقہاء نے یہی کہا ہے۔(2)

1۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 1، صفحہ 308، دار الفکر

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ

اور حسن بن ابی الحسن اور ان کے ساتھ ایک جماعت نے کہا ہے: جب عورت نے یہ کہہ دیا کہ میں تیرے حکم کی اطاعت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے غسل جنابت نہیں کروں گی اور میں تیرے لئے قسم پوری نہیں کروں گی تو خلع حلال ہو گیا اور شعبی نے کہا ہے: اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے کہ وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کریں گے۔ وہ یہ کہ ایک دوسرے کو طعنہ دیتا ہو اور ناراض کرنا ترک طاعت کی طرف دعوت دیتا ہے (1)۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: خلع اور مال لینا حلال ہو جاتا ہے جب کہ عورت اپنے خاوند کو کہے: میں تجھے ناپسند کرتی ہوں اور میں تجھ سے محبت نہیں کرتی اور اسی طرح کے جملے (2)۔ تو ان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے۔

امام بخاری نے ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ثابت بن قیس کے بارے میں اخلاق و کردار اور دین کے اعتبار سے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے (ان اعتبارات سے ان میں کوئی عیب اور نقص موجود نہیں) لیکن میں اس کی طاقت نہیں رکھتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کیا تو اس کا باغ لوٹا دے گی؟" اس نے عرض کی: جی ہاں (3)۔

اسے ابن ماجہ نے حضرت قتادہ عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: قسم بخدا! میں دین اور اخلاق کے بارے میں ثابت بن قیس میں کوئی عیب نہیں پاتی، لیکن میں اسلام میں کفر (ناشکری و انکار) کو ناپسند کرتی ہوں، میں بغض کی وجہ سے اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اسے لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ اس سے اپنا باغ لے لے اور مزید کچھ نہ لے (4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ان سے انتہائی شدید بغض رکھتی تھیں اور وہ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بطریق خلع تفریق کر دی۔ اسلام میں یہی پہلا خلع تھا۔

حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اسلام میں سب سے پہلے جس نے خلع کیا وہ عبد اللہ بن ابی کی بہن ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرا سر اور اس کا سر کبھی جمع نہیں رہ سکتے۔ میں نے خیمے کی ایک طرف اٹھائی تو میں نے اسے ایک جماعت میں آتے دیکھا تو وہ ان تمام میں سب سے زیادہ سیاہ تھا قد و قامت کے اعتبار سے ان سب سے چھوٹا تھا اور چہرے کے لحاظ سے سب سے زیادہ قبیح تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس کا باغ اس پر واپس لوٹا دے گی؟ اس نے عرض کی: جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں زائد بھی دوں گی تو آپ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 307، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، الخلع وکیف الطلاق فیہ، جلد 2، صفحہ 794، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 4867-4868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطلاق، المختلعۃ تاخذ ما اعطاہا، جلد 1، صفحہ 148، وزارت تعلیم۔ ایضاً، حدیث نمبر 2045، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سلّم نے ان دونوں کے مابین تفریق کر دی۔ یہ حدیث خلع میں اصل ہے اور جمہور فقہاء اسی پر عمل پیرا ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا: میں اہل علم سے اس کے بارے مسلسل سنتا رہا ہوں اور یہی امر ہے جس پر ہمارے نزدیک اجماع ہے اور وہ یہ کہ آدمی جب عورت کو کوئی ضرر اور تکلیف نہ دے اور اس کی طرف برائی کی نسبت بھی نہ کرے اور مرد کی جانب سے اسے ستایا بھی نہ جائے اور عورت اس سے جدائی اور علیحدگی پسند کرے تو آدمی کے لئے حلال ہے کہ وہ اس سے ہر وہ شے لے لے جو بطور فدیہ وہ اسے دے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کی بیوی کے بارے میں کہا اور اگر ناچاکی اور اختلاف مرد کی جانب سے ہو کہ وہ اسے تنگ کرتا ہو اور اسے اذیت اور ضرر پہنچاتا ہو تو وہ اسے وہ شے واپس لوٹا دے جو اس سے لی ہے۔

عقبہ بن ابی الصہباء نے کہا ہے: میں نے بکر بن عبداللہ مزنی سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جس کی عورت یہ چاہتی ہے کہ وہ اس سے خلع لے لے تو انہوں نے کہا: اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے کوئی شے لے۔

میں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جو اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا ہے وہ کہاں گیا فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ؟ انہوں نے کہا: یہ منسوخ ہو چکا ہے، میں نے کہا: ناسخ آیت کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا: سورۃ النساء میں یہ آیت ہے: وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا ۝ (النساء:(۰)) (اور اگر تم ارادہ کر لو کہ بدل لو اپنی بیوی کو دوسری بیوی کی جگہ اور دے چکے ہو تم اسے ڈھیروں مال تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول شاذ ہے اور اپنے شاذ ہونے کی وجہ سے اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں سے ایک آیت دوسری کو ختم کرنے والی نہیں ہے کہ نسخ واقع ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاِنْ خِفْتُمْ الآیہ اس آیت کے ساتھ زائل اور ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دونوں کو جب یہ خوف اور اندیشہ ہو تو پھر قاعدہ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ (النساء: 20) میں داخل نہیں۔ کیونکہ یہ صرف مردوں کے لئے ہے اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ آیت محکم ہے(2) اور بکر کے قول کی کوئی حقیقت نہیں اگر عورت دینے کا ارادہ کرے۔ تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے جائز قرار دیا کہ وہ اپنی زوجہ سے وہ کچھ لے لے جو اس نے دے رکھا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت سے انہوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے خلع کو شقاق اور ضرر کی حالت کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ کہ خلع میں یہ شرط ہے اور یہ نظریہ اس روایت سے مزید پختہ اور مضبوط ہو جاتا ہے جو ابو داؤد نے حضرت عائشہ سے بیان کی ہے کہ حبیبہ بنت سہل حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں تو انہوں نے اسے مارا اور کندھے کے کنارے کی ہڈی توڑ دی، چنانچہ صبح کے وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور شکایت پیش کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: "تو اس سے کچھ مال لے لے اور اسے فارغ کر دے۔"

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 568، دار احیاء التراث العربیہ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 173

اور ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس سے اس مال سے زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت طاؤس، حضرت عطا اور حضرت اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: قضاۃ اس کے مال لینے کی اجازت نہیں دیتے مگر اتنا جو اس نے اسے دیا ہوا ہو۔ یہی قول امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ نے بھی کہا ہے۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابن جریج نے روایت کیا ہے کہ ابو الزبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں زینب بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھی۔ اور انہوں نے بطور مہر ایک باغ اسے دیا تھا۔ پھر اس نے انہیں ناپسند کیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زیادہ تو نہیں البتہ اس کا باغ واپس کر دے۔" تو اس نے عرض کی: جی ہاں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے وہ باغ لے لیا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا (یعنی اسے فارغ کر دیا) اور جب یہ خبر حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو انہوں نے کہا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قبول ہے (1)۔ اسے ابو الزبیر نے کئی ایک سے سنا ہے اور دار قطنی نے اسے بیان کیا ہے اور حضرت عطا سے مرسل روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی خلع لینے والی عورت سے اس سے زیادہ مال نہیں لے گا جتنا اس نے اسے دیا ہوا ہے۔" (2)

مسئلہ نمبر 7۔ امام مالک کے نزدیک خلع جائز ہے اپنے پھل کے عوض جس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر نہ ہوئی ہو، بھاگنے والے اونٹ کے عوض، بھاگ جانے والے غلام کے عوض، جنین کے عوض جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہو یا اسی طرح کی اور چیزیں جن کی ہلاکت کا امکان ہو، بخلاف بیع اور نکاح کے اور اس کے لئے ان تمام کا مطالبہ جائز ہے پس اگر وہ اس کے حوالے ہو گئی تو وہ اس کی ہو جائے گی اور اگر اس کے حوالے نہ ہوئی تو پھر اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی اور طلاق اس کے حکم پر نافذ ہو جائے گی۔

امام شافعی نے کہا ہے: خلع جائز ہوگا اور اس کے لئے مہر مثل ہوگا۔ اسے ابن خویز منداد نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: کیونکہ وہ عقود جن میں معاوضہ ہوتا ہے جب دو بدل فاسد ہو متحقق ہوں اور وہ ضائع ہو جائے تو ان میں بدل کی مثل واجب کی طرف رجوع کیا جاتا ہے (لہٰذا مہر مثل لوٹایا جائے گا)۔

اور ابو ثور نے کہا ہے: خلع باطل ہے۔ اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: خلع جائز ہے اور اس کے لئے وہ ہوگا جو لونڈی کے پیٹ میں ہے اور اگر اس میں بچہ نہ ہو تو اس کے لئے کوئی شے نہ ہوگی۔

اور "المبسوط" میں ابن قاسم سے منقول ہے: خلع جائز ہوتا ہے اس پھل کے عوض جو اس کے درخت اس سال دیں گے اور ان کے عوض جو بچے اس کا ریوڑ اس سال دے گا۔ اس سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابن القاسم کے موقف کی دلیل اس ارشاد کا عموم ہے: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔

اور قیاس کی جہت سے یہ کہ یہ ان میں سے ہیں جن کا وہ ہبہ اور وصیت کے ساتھ مالک بن جاتا ہے تو پھر جائز ہے کہ یہ معلوم کی طرح خلع میں بھی عوض ہوں اور یہ بھی کہ خلع طلاق ہے اور طلاق اصلاً بغیر عوض کے بھی ہوتی ہے تو جب بغیر کسی شے

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، باب المہر، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ
2۔ ایضاً

کے عوض کے بیچ دیتا ہے تو پھر تو بعوض کے ساتھ اس کا صحیح ہونا بدرجہ اولیٰ ہوگا، کیونکہ مبدولی کی سب سے بری حالت یہی ہے کہ وہ مسکوت عنہ کی طرح ہو اور جب وہ نکاح جو عقد تحلیل ہے فاسد عوض اسے فاسد نہیں کرتا تو یہ اس طلاق کو کیونکر فاسد کر سکتا ہے جو عقد کو زائل کرنے والی اور اسے کھولنے والی ہے (یعنی بدرجہ اولیٰ عوض فاسد اسے فاسد نہیں کرے گا۔)

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی عورت نے اس کے عوض آدمی سے خلع کیا کہ وہ اس سے اپنے بیٹے کو دو سال تک دودھ پلائے گی تو یہ جائز ہے۔ خلع کی صورت میں دو سال کے بعد مدت معلومہ تک اس کا نفقہ بیٹے پر ہوگا اس کے بارے دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جائز ہے اور یہ مخزومی کا قول ہے اور اسے سحنون نے اختیار کیا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ وہ جائز نہیں۔ اسے ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور اگر خاوند نے اس کی شرط لگائی تو وہ باطل ہے اور وہ اس سے ساقط کر دیا جائے گا (1) (یعنی اس پر اسے لازم نہیں کیا جائے گا)۔

ابو عمر نے کہا ہے: جنہوں نے بدکنے والے اونٹ، بھاگ جانے والے غلام اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جن کے ثابت ہونے کا امکان ہے کہ عوض خلع کو جائز قرار دیا ہے ان کے ذمہ پر لازم ہے کہ وہ اسے بھی جائز قرار دیں۔ ان کے علاوہ دیگر نے کہا: امام مالک نے اس نفقہ کے عوض خلع سے منع نہیں کیا جو دو سال سے زائد ہو غرر کی وجہ سے۔ بلکہ اس سے منع کیا ہے کیونکہ یہ وہ حق ہے جو ہر حال میں باپ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، پس اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے اور اس میں اور دو سال کے نفقہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ دودھ، نفقہ اور یہ دودھ پلانا زوجیت کی حالت میں ماں پر واجب ہوتا ہے اور طلاق کے بعد بھی جب باپ تنگ دست اور مفلس ہو تو جائز ہے کہ وہ نفقہ ماں کی طرف منتقل ہو جائے۔ کیونکہ یہی اس کا محل ہے۔ اور امام مالک نے اس پر البسوط میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (البقرہ: ۲۳۳) (اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو دودھ کی مدت پوری کرنی چاہتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 9۔ اگر بیٹے کے نفقہ کے عوض وجہ مباح پر خلع واقع ہوا اور مدت مکمل ہونے سے پہلے بچہ فوت ہو جائے تو کیا بقیہ نفقہ کے لئے خاوند اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے؟ تو ابن المواز نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کسی شے کے لئے عورت کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اور ابو الفرج نے آپ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع کر سکتا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو خلع کے عوض اس کے لئے عورت کے ذمہ ثابت ہے اور وہ بچے کی موت سے ساقط نہیں ہوگا، جیسا کہ اگر وہ اس سے خلع کرے ایسے مال کے عوض جو عورت کے ذمہ کے ساتھ متعلق ہو۔ اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے لئے ایسے مال کی شرط نہیں لگائی جو اسے خوشحال بنا دے گا، بلکہ اس نے اپنے بچے کی مشقت کی کفایت کرنے کی شرط لگائی ہے اور جب بچہ فوت ہو گیا تو اب اس کے لئے عورت کی طرف کسی شے کے لئے رجوع نہیں ہوگا جیسا کہ اگر کوئی آدمی ایک سال تک کسی بچے پر احسان اور تطوعاً خرچ کرنے کی ذمہ داری لے اور بچہ فوت ہو جائے تو اس پر کسی شے کے لئے رجوع نہیں کیا

1۔ الفواکہ الدوانی، کتاب ما جاء فی الطعام، جلد 5، صفحہ 27، مطبوعہ ... مصر

جائے گا کیونکہ اس نے اپنے تطوع سے بچے کی مشقت برداشت کرنے کا قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم

امام مالک نے کہا ہے: میں نے کسی کو نہیں دیکھا ہے جو اس طرح کی صورت میں رجوع کرتا ہو اور اگر وہ اس کا پیچھا کرے تو بھی اس بارے اس کے لئے آپ کا ایک قول ہے۔ اور علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اگر عورت فوت ہو گئی تو بچے کا نفقہ اس کے مال میں ہوگا کیونکہ یہ وہ حق ہے جو اس کی موت سے پہلے اس میں ثابت ہو چکا ہے لہٰذا وہ اس کی موت کے ساتھ ساقط نہیں ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جس کسی نے خلع کی صورت میں اپنی عورت پر اس کے حمل کے نفقہ کی شرط لگائی اور عورت کے پاس کوئی شے نہ ہو تو نفقہ اس آدمی پر ہوگا کیونکہ عورت کے پاس کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ خرچ کر سکے اور اگر وہ اس کے بعد خوشحال ہو جائے تو آدمی اس مال کے لئے اس کی طرف رجوع کرے جو اس نے خرچ کیا اور وہ اس سے لے لے۔

امام مالک نے کہا: حق یہ ہے کہ آدمی کو اس کے اپنے بچے کے نفقہ کا مکلف اور پابند بنایا جائے اگرچہ اس نے بچے کی ماں پر اس کے نفقہ کی شرط لگائی ہو بشرطیکہ ماں کے پاس ایسا مال نہ ہو جو وہ اس پر خرچ کر سکے۔

مسئلہ نمبر 11۔ خلع کے بارے میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ کیا وہ طلاق ہے یا فسخ نکاح ہے؟ پس حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ خلع طلاق ہے (1) اور یہی امام مالک، ثوری، اوزاعی، ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے۔ پس جس نے خلع سے دو یا تین طلاقوں کی نیت کی، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ اسے لازم ہو جائیں گی اور اصحاب الرائے نے کہا ہے: اگر خاوند نے تین طلاقوں کی نیت کی تو وہ تین ہی ہوں گی اور اگر اس نے دو کی نیت کی تو وہ ایک طلاق بائنہ ہوگی (کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے)۔

اور امام شافعی نے اپنے دو قولوں میں سے ایک میں کہا ہے: اگر اس نے خلع سے طلاق کی نیت کی اور اس کا نام بھی لیا تو وہ طلاق ہوگی اور اگر اس نے طلاق کی نیت نہ کی اور نہ اس کا نام لیا تو فرقت واقع نہ ہوگی، آپ نے قدیم قول میں یہی کہا ہے اور آپ کا پہلا قول میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ مزنی نے کہا ہے: وہی ان کے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔

اور ابو ثور نے کہا ہے: جب وہ طلاق کا نام نہ لے تو خلع فقط فرقت ہوگی اور طلاق نہیں ہوگی اور اس نے طلاق کا نام لیا تو وہ طلاق ہوگی اور خاوند رجعت کا زیادہ مالک ہوگا جب تک وہ عدت میں رہی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ خلع فسخ ہے، طلاق نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اس کی نیت کرے ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت طاؤس، حضرت عکرمہ، حضرت اسحاق اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔ انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابن عیینہ نے عمرو سے، انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر بیوی نے اس سے خلع لے لیا کیا وہ اس

1۔ [illegible] کی کتاب [illegible]، جلد 5، صفحہ 18، [illegible]

سے شادی کر سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں چاہیے کہ وہ اس سے نکاح کر لے، خلع طلاق نہیں ہے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے آیت کی ابتدا میں اور اس کے آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور خلع کا ذکر ان کے درمیان میں ہے، پس خلع کوئی شے نہیں ہے۔ پھر کہا: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ، پھر پڑھا: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اگر خلع طلاق ہو تو پھر دو طلاقوں کے ذکر کے بعد یہ تیسری ہوگی اور اس کے بعد فَاِنْ طَلَّقَهَا چوتھی طلاق پر دال ہوگا، پس تحریم چار طلاقوں کے ساتھ متعلق ہو جائے گی۔

انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے امام ترمذی، ابو داؤد اور دار قطنی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک حیض عدت گزارنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے (2)۔ اور حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء سے روایت ہے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں خلع لیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا یا اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض کے ساتھ عدت گزارے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ربیع کی حدیث صحیح ہے کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہ ایک حیض عدت گزارے (3)۔ انہوں نے کہا: پس یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع فسخ ہے نہ کہ طلاق اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اور اگر یہ (خلع لینے والی) عورت مطلقہ ہوتی تو اس کے لئے ایک حیض پر اقتصار نہ کیا جاتا (کیونکہ مدت تو تین حیض ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر اس نے اس سے خلع کر لیا، پھر وہ اس سے شادی کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اس کے لئے صحیح ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ اگرچہ وہ اس کے علاوہ کسی زوج سے شادی نہ کرے۔ کیونکہ اس کے لئے دو طلاقوں کے سوا کچھ نہیں ہے اور خلع لغو ہے۔

اور جنہوں نے خلع کو طلاق بنایا ہے انہوں نے کہا ہے: اس کے لئے اس عورت کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں یہاں تک کہ وہ دوسرے زوج سے شادی کر لے، کیونکہ خلع کے ساتھ تین طلاقیں مکمل ہو گئی ہیں اور یہی صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قاضی اسماعیل بن اسحاق نے کہا ہے: اس آدمی کے بارے میں قول کیسے جائز ہو سکتا ہے جسے اس کی بیوی نے کہا: تو مجھے مال کے عوض طلاق دے دے، پس اس نے اسے طلاق دے دی، کہ یہ طلاق نہیں ہوگی اور اگر اس نے بغیر کسی شے کے عورت کا معاملہ اس کے ہاتھ دے دیا اور اس نے اپنے آپ کو طلاق دے دی تو وہ طلاق ہوگی۔ (فرمایا) رہا قول باری تعالیٰ: فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ تو یہ اس قول پر معطوف ہے: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کیونکہ اس کا ارشاد: اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ بلاشبہ یہ مراد ہے یا تطلیق ہے اور اگر خلع کا عطف دو طلاقوں پر کیا جائے تو پھر خلع اصلاً جائز ہی نہ ہوگا

1۔ السنن الکبری للبیہقی، باب الخلع ہل ہو فسخ او طلاق، جلد 7، صفحہ 316، دار الفکر بیروت
2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم اسلام آباد۔ ابو داؤد، باب الخلع، حدیث نمبر 1902، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ ایضاً۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مگر دو طلاقوں کے بعد اور یہ کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور کسی اور نے کہا ہے: آیت میں جو دلیل انہوں نے کی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نے دو طلاقوں کے حکم کا فائدہ دیا ہے جب وہ ان دونوں کو خلع کی وجہ کے سوا پر واقع کرے۔ اور ان دونوں کے ساتھ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ کے سبب رجعت بھی ثابت ہوگی۔ پھر ان دونوں کا حکم ذکر کیا جب یہ کسی وجہ سے منقطع ہوں۔ یہی خلع ان دونوں کی طرف لوٹ آئے گا جن کا ذکر پہلے ہو چکا، کیونکہ اس سے مقصود طلاق مطلق اور طلاق بالعوض کا بیان ہے اور تیسری طلاق چاہے بالعوض ہو یا بغیر عوض کے ہو بلاشبہ وہ حلت کو ختم کر دیتی ہے مگر زوج ثانی کے بعد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جواب تو آیت کا ہے اور رہی حدیث: تو ابو داؤد نے کہا ہے۔ جب انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث حیض کے بیان میں ذکر کی۔ اس حدیث کو عبد الرزاق نے معمر عن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مرسل ذکر کیا ہے اور قعنبی نے مالک عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی مثل ہے (1)۔ ابو داؤد نے کہا ہے: ہمارے نزدیک عمل اسی پر ہے۔

میں کہتا ہوں: یہی امام مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ثوری اور اہل کوفہ کا مذہب ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے اکثر اہل علم اور دوسروں کا بھی یہی مذہب ہے۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک حیض کے بارے میں حدیث اپنی غرابت کے باوجود جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور مرسل ہونے کے باوجود جیسا کہ ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی (2)۔ اسے دار قطنی نے معمر عن عمرو بن مسلم عن عکرمۃ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنے زوج سے خلع لیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عدت ڈیڑھ حیض مقرر فرمائی۔ یہاں معمر سے ڈیڑھ حیض روایت کرنے والا وہی راوی ہے جو ان سے ایک حیض روایت کرتا ہے اور وہ ہشام بن یوسف ابو عبد الرحمن الصنعانی الیمانی ہے۔ اکیلے امام بخاری نے اس کی روایت نقل کی ہے۔ پس سند اور متن کے اعتبار سے حدیث مضطرب ہے، پس اس سے اس بارے میں استدلال کرنا ساقط ہو گیا کہ خلع فسخ نکاح ہے اور اس بارے میں بھی کہ مطلقہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَالۡمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوۡٓءٍ تو ہر مطلقہ مدخول بہا کے بارے میں نص باقی رہا، سوائے ان کے جنہیں اس سے خاص کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: "اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اصحاب نے کہا ہے: خلع والی عورت کی عدت ایک حیض ہے (3)۔ اسحاق نے کہا ہے: اگر کوئی جانے والا اس طرف جائے تو وہ مذہب قوی ہے۔"

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا: اس کی عدت ایک حیض ہے اور یہی ابان

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم
2۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 255، دار المحاسن قاہرہ
3۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق و اللعان، جلد 1، صفحہ 142، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب ما جاء فی الخلع، حدیث نمبر 1105، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بن عثمان اور اسحاق نے بھی کہا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح ہے اور حضرت عثمان اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کے بارے میں میں کہتا ہوں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ثابت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں: تحقیق ہم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: خلع والی عورت کی عدت طلاق والی عورت کی عدت کی طرح ہے(1) اور یہی قول صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ امام مالک کا قول اس کے بارے میں مختلف ہے جس نے بلا عوض خلع واقع کرنے کا قصد کیا۔ ابن عبدالوہاب نے کہا ہے: امام مالک کے نزدیک وہ خلع ہے اور طلاق بائن ہے اور آپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق بائن نہ ہو گی مگر عوض پائے جانے کے ساتھ، یہ اشہب اور امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ یہ طلاق عوض اور استیفاء عدد سے خالی ہے پس یہ رجعی ہوگی جیسا کہ اگر یہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: میرے نزدیک اور دیگر اہل علم کے نزدیک نظر و فکر کے اعتبار سے آپ کے دو قولوں میں سے یہ زیادہ صحیح ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ خلع میں عوض کا حاصل نہ ہونا اسے اپنے مقتضا سے نہیں نکالتا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ شرعی یا تحریمی عوض پر خلع کرے۔

مسئلہ نمبر 13۔ خلع کرنے والی عورت وہ ہوتی ہے جو اپنی کل شے کے عوض خلع کرتی ہے۔ اور مفتدیہ فدیہ دینے والی وہ ہوتی ہے جو بعض مال بطور فدیہ دیتی ہے اور بعض لے لیتی ہے اور مبارئۃ مبارات کرنے والی وہ ہوتی ہے جو دخول سے پہلے ہی اپنے خاوند سے جدائی اختیار کر لے۔ پس وہ کہتی ہے: قد ابرئتک فبارئنی (میں نے تجھے جدا کیا پس تو مجھے جدا کر دے)۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور عیسیٰ بن دینار نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: مبارئۃ وہ عورت ہے جو کوئی شے لیتی ہے اور نہ کچھ دیتی ہے(2) اور مختلعہ (خلع کرنے والی) وہ ہے جو وہ مال بھی دے دیتی ہے جو خاوند نے اسے دیا ہو اور اپنے مال سے اس پر اضافہ بھی کرتی ہے۔ اور مفتدیہ وہ ہے جو اس مال کے بعض سے فدیہ دیتی ہے جو مرد نے اسے دیا ہو اور بعض اپنے پاس روک لیتی ہے اور یہ سب دخول سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد بھی۔ پس جو دخول سے پہلے ہو اس میں عدت نہیں ہے۔ اور مصالحہ (صلح کرنے والی) مبارئۃ کی مثل ہے۔

قاضی ابو محمد وغیرہ نے کہا ہے: یہ چاروں الفاظ ایک ہی معنی کی طرف راجع ہوتے ہیں(3) اگرچہ القاب کے اعتبار سے ان کی صفات مختلف ہیں۔ اور یہ طلاق بائن ہے چاہے وہ اس کا نام لے یا نہ لے، مرد کے لیے عدت کے دوران رجعت کا حق نہیں ہوگا اور اسے عدت میں اور اس کے بعد ولی کی رضامندی اور مہر کے ساتھ دوبارہ زوجیت سے پہلے اور بعد نکاح کا حق حاصل ہوگا، بخلاف ابو ثور کے، کیونکہ عورت نے جب عوض ادا کر دیا تو وہ اپنے نفس کی مالک ہو جائے گی اور اگر طلاق خلع رجعی ہو تو

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم
2۔ المدونۃ الکبری، کتاب ما جاء فی الخلع، جلد 5، صفحہ 14، مطبعۃ السعادۃ مصر
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ بیروت

پس ایسا کلام ہے جو فَاِنْ طَلَّقَهَا کی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ پر بنا کرنے کے مانع ہے۔ بلکہ اقرب یہی ہے کہ اس کا رجوع اس پر ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے جیسا کہ استثنا (ان شاء اللہ تعالیٰ) میں ہوتا ہے۔ اور یہ اس کی طرف راجع نہیں ہوگا جو اس سے متقدم ہے مگر دلالت کے ساتھ (یعنی جب کوئی قرینہ دال ہو تو پھر متقدم کی طرف راجع ہو سکتا ہے) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ (النساء: ۲۳) (اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پارہی) ہیں ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو۔)

پس یہ اسی پر مقصور ہوگی جو اس کے متصل بعد ہے اور اس کی طرف عائد نہیں جو اس پر متقدم ہے یہاں تک کہ عورتوں کی ماؤں کے بارے میں دخول کی شرط نہیں ہوگی۔

علماء کا خلع کے بعد عدت میں طلاق ہونے کے بارے اختلاف ہے، پس ایک گروہ نے کہا ہے: جب آدمی نے اپنی بیوی سے خلع کرلیا پھر اسے طلاق دے دی اور وہ عورت ابھی عدت میں تھی تو جب تک وہ عدت میں ہے اسے طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، شریح، طاؤس، نخعی، زہری، حکم، حماد، ثوری، اصحاب الرائے رحمہم اللہ نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اسے طلاق لازم نہ ہوگی اور یہ قول حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر، حضرت عکرمہ، حضرت حسن، حضرت جابر بن زید، امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم اللہ کا ہے۔ اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے: اگر عورت نے اس شرط پر اسے طلاق کا فدیہ دیا کہ وہ اسے مسلسل تین طلاقیں ترتیب کے ساتھ دے گا پھر جس وقت اس نے اسے طلاق دی تو وہ اس پر ثابت ہو گئی اور اگر اس کے درمیان خاموشی ہو تو جو طلاق خاموشی اور ٹھہرنے کے بعد ہوگی وہ کوئی شے نہ ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسق الکلام کا معنی ہے کہ وہ بعض بعض کے ساتھ متصل ہو اور یہ اس کے لیے ایک حکم ثابت کرتا ہے اسی طرح جب استثنا قسم کے متصل بعد ہو تو اس کے لیے استثنا کا حکم ثابت ہو جاتا ہے اور جب اس سے منفصل ہو تو پھر اس کا متقدم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاِنْ طَلَّقَهَا سے مراد تیسری طلاق ہے فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔ اس پر اجماع ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے (کیا) نکاح کافی ہوتا ہے۔ اور اس بارے میں کہ کیا شے تحلیل کو مباح کرتی ہے۔ پس حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ اور آپ کے ساتھ موافقت رکھنے والوں نے کہا ہے: صرف عقد نکاح ہی کافی ہے۔ اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: صرف وطی کافی نہیں ہے یہاں تک کہ انزال ہو جائے۔

جمہور علماء اور تمام فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ اس میں وطی کافی ہے اور اس سے مراد شرمگاہوں کا اس طرح ملنا ہے جو حد اور غسل کو واجب کردے، روزے اور حج کو فاسد کردے اور زوجین کو محصن بنا دے اور کامل مہر لازم کردے۔

ابن عربی نے کہا ہے: فقہ میں میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ نہیں آیا جو اس سے زیادہ مشکل ہو اور وہ یہ کہ اصول فقہ میں سے ہے کہ کیا حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے یا اواخر اسماء سے؟ سو اگر ہم کہیں کہ حکم اوائل اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم

ہے کہ ہم حضرت سعید بن مسیب کے قول کے مطابق کہیں۔ اور اگر ہم کہیں کہ حکم اولاً اسماء سے متعلق ہوتا ہے تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم حشفہ کو فرج میں غائب کرنے کے ساتھ انزال کی شرط بھی لگائیں، کیونکہ یہی ذوق عسیلہ کا آخر ہے (1) جیسے کہ حسن نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: ذوق عسیلہ کا معنی وطی کرنا ہے۔ حضرت سعید بن مسیب کے سوا علماء کی جماعت کا یہی موقف ہے۔ آپ فرماتے ہیں: رہی لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوسرا اس سے مجامعت کرے اور میں یہ کہتا ہوں جب دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ نکاح صحیح کر لیا کہ وہ اس سے اس کے حلال کا ارادہ نہ کرے تو پھر کوئی حرج نہیں کہ زوج اول اس سے نکاح کرے۔ اور یہ قول ہے جس کے بارے ہم کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے آپ کے ساتھ موافقت کی ہو سوائے خوارج کی ایک جماعت کے اور اس کے ماسوا کے بارے میں سنت پر اکتفا کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت سعید بن مسیب کے قول کے بارے میں حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے اسے نحاس نے کتاب "معانی القرآن" میں ذکر کیا ہے۔ فرمایا: اہل علم کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے، کیونکہ فرمایا: زَوْجًا غَیْرَهٗ حالانکہ زوجیت مقدم ہے پس نکاح جماع کے معنی میں ہوگا۔ مگر سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ یہاں لفظ نکاح نکاح صحیح کے معنی میں ہے جب اس نے اسے حلال کرنے کا ارادہ نہ کیا ہو۔

میں (مفسر) نے کہا ہے: میں ان دونوں کے بارے یہ گمان کرتا ہوں کہ حدیث عسیلہ ان تک نہیں پہنچی یا وہ ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پس انہوں نے ظاہر قرآن کو لے لیا اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ۔ واللہ اعلم۔

ائمہ کرام نے روایت کیا اور الفاظ دارقطنی کے ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور خاوند سے شادی کرلے اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا شہد چکھ لے۔" (2)

بعض علمائے احناف نے کہا ہے: جو کوئی حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق عقد نکاح کرلے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اسے فسخ کرے اور اس میں آپ کے اختلاف کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ علماء کے اجماع سے خارج ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اور وہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے سمجھا جاتا ہے: حتی یذوق کل واحد منهما عسيلة صاحبه (3) کہ وہ دونوں جماع کی لذت پانے میں برابر ہیں۔ اور یہی ہمارے نزدیک اس بارے میں دو قولوں میں سے ایک کے لئے حجت ہے کہ اگر اس نے اس سے وطی کی درآنحالیکہ وہ سوئی پڑی ہو یا اس پر غشی طاری ہو تو وہ طلاق دینے والے (زوج اول) کے لئے حلال نہ ہوگی کیونکہ اس نے شہد نہیں چکھا جب کہ اس کا ادراک نہ ہوا۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام نسائی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال گوندنے والی اور گودوانے والی، دوسرے کے بال اپنے بالوں میں لگانے والی اور بال اکھڑوانے والی، سود کھانے والے اور

1۔ احکام القرآن لابن عربی، جلد 1، صفحہ 190، دار الفکر بیروت

2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 32، دار المحاسن قاہرہ

3۔ ایضاً

حلالہ کرنے والے، حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جاتا ان تمام پر لعنت کی ہے۔ (1)

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے پر لعنت کی ہے (2)۔ اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور یہ حدیث حضور نبی کریم ﷺ سے کئی اسناد سے مروی ہے اور اہل علم کے نزدیک حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے بعض کا اسی پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں۔

اور تابعین میں سے فقہاء کا بھی یہی قول ہے اور اسی طرح سفیان ثوری، ابن مبارک، امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ بھی کہتے ہیں اور میں نے جارود سے سنا ہے وہ وکیع سے ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسی طرح کہا ہے اور فرمایا: چاہئے کہ اس باب کے بارے میں اصحاب رائے کا قول بیان کیا جائے اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی کسی عورت سے شادی کرے تا کہ وہ اسے (پہلے خاوند کے لئے) حلال کر دے پھر اسے خیال آیا کہ وہ اسے روک لے تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ نیا نکاح کرے۔

ابو عمر بن عبدالبر نے کہا ہے کہ حلالہ نکالنے والے کے نکاح میں علماء نے اختلاف کیا ہے اور امام مالک نے کہا ہے: حلالہ نکالنے والا اپنے نکاح پر قائم نہیں رہے گا یہاں تک کہ وہ نکاح جدید کرے لیکن اگر اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی تو اس کے لئے مہر مثل ہوگا اور اس کی مجامعت اسے زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی، برابر ہے دونوں کو علم ہو یا علم نہ ہو جب اس نے حلالہ کی غرض سے اس کے ساتھ شادی کی۔ اور نہ وہ اپنے نکاح پر برقرار رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح امام ثوری اور اوزاعی نے بھی کہا ہے۔ اور اس میں ایک دوسرا قول بھی ہے جو نکاح خیار اور محلل کے بارے میں امام ثوری سے مروی ہے کہ نکاح جائز ہے اور شرط باطل ہے اور اسی میں اور نکاح متعہ کے بارے میں ابن ابی لیلیٰ کا بھی یہی قول ہے اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے نکاح محلل کے بارے میں مروی ہے: کتنا برا ہے جو اس نے کیا ہے اور نکاح جائز ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے: نکاح جائز ہے اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا اور اس کے لئے اسے اپنے پاس روک لینا جائز ہے اگر وہ چاہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ عورت زوج اول کے لئے حلال نہیں ہوگی اگر اس نے اس کے ساتھ حلالہ کی غرض سے شادی کی اور ایک بار انہوں نے کہا: اس نکاح کے ساتھ وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی جب زوج ثانی اس کے ساتھ مجامعت کرے اور اسے طلاق دے دے اور اس بارے میں انہوں نے کوئی اختلاف نہیں کیا کہ اس زوج (مراد زوج ثانی) کا نکاح صحیح ہے اور یہ کہ اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر قائم رہے۔

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 101، وزارت تعلیم۔ ایضاً مسند امام احمد، حدیث نمبر 4283

2۔ جامع ترمذی، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

ایضاً، باب ما جاء فی المحل والمحلل لہ، حدیث نمبر 1038، 1039۔ سنن ابو داؤد، باب فی التحلیل، حدیث نمبر 1778، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن ماجہ، باب المحلل والمحلل لہ، حدیث نمبر 1923-1924، 1925، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آدمی نے یہ کہا کہ میں تیرے ساتھ شادی کرنے لگا ہوں تاکہ میں تجھے (زوج اول کے لئے) حلال کر دوں پھر اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں تو یہ نکاح متعہ کی قسم ہے اور یہ فاسد ہے وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اسے فسخ کر دیا جائے گا اور اگر اس نے اس نکاح پر وطی کی تو وہ (زوج اول کے لئے) حلال نہ ہوگی اور اگر زوج ثانی نے اس کے ساتھ مطلقاً نکاح کیا نہ اس نے کوئی شرط لگائی اور نہ ہی اس پر حلالہ کی شرط لگائی گئی تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کی قدیم کتاب میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور دوسرا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے اور ان کی جدید مصری کتاب میں ان کا قول مختلف نہیں کہ نکاح صحیح ہوگا جب اس نے کوئی شرط نہ لگائی اور یہی داؤد کا قول ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: الماوردی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ اگر حلالہ کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی تو نکاح صحیح ہوگا اور وہ اسے زوج اول کے لئے حلال کر دے گا۔ اور اگر دونوں نے عقد کے دوران حلالہ کی شرط لگائی تو نکاح باطل ہوگا اور وہ اسے پہلے کے لئے حلال نہیں کرے گا۔ فرمایا: یہی امام شافعی کا قول ہے اور حسن اور ابراہیم نے کہا ہے: جب تین میں سے کسی ایک نے حلالے کا قصد کیا تو نکاح فاسد ہوگا اور یہ بہت شدت اور سختی ہے اور سالم اور قاسم نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ حلالہ کی غرض سے شادی کرے بشرطیکہ زوجین کو اس کا علم نہ ہو (1) اور وہ ماجور ہوگا۔ اسی طرح ربیعہ اور یحییٰ بن سعید نے کہا ہے اور داؤد بن علی نے بھی یہی کہا ہے بشرطیکہ عقد کرتے وقت اس کی شرط کا اظہار نہ ہو۔

مسئلہ نمبر 9۔ ہمارے علماء کے نزدیک حلالہ کے لئے نکاح کے جائز ہونے کا دارومدار نکاح کرنے والے زوج پر ہے خواہ اس کی شرط لگائی جائے یا وہ اس کی نیت کرے اور جب اس میں سے کوئی شے ہوگی تو اس کا نکاح فاسد ہوگا اور وہ اس پر برقرار نہیں رہے گا اور اس کی وطی اس عورت کو زوج اول کے لئے حلال نہیں کرے گی۔ اور طلاق دینے والے خاوند کا اس بارے میں جاننا اور نہ جاننا برابر ہے اور کہا گیا ہے: بے شک اسے چاہیے کہ جب اسے علم ہو کہ اس کے ساتھ نکاح کرنے والے نے اس لئے اس کے ساتھ شادی کی ہے تو وہ اس کے رجوع سے احتیاط برتے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے حلال نہیں کرے گا مگر وہ نکاح جو رغبت کے ساتھ ہو اور اسے عورت کی حاجت اور ضرورت ہو اور اس سے حلالہ کا قصد نہ کیا جائے اور اس کا عورت کے ساتھ وطی کرنا مباح ہو (یعنی) نہ وہ روزے دار ہو، نہ حالت احرام میں ہو اور نہ ہی حیض کی حالت میں ہو اور زوج بالغ مسلمان ہو۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: جب زوج ثانی نکاح صحیح کے ساتھ اس سے وطی کرے اور اس کی فرج میں حشفہ غائب کر دے تو تحقیق دونوں نے شہد چکھ لیا اور اس میں نکاح کرنے والے کا قوی اور ضعیف ہونا برابر ہے اور برابر ہے کہ وہ اسے داخل کرے اپنے ہاتھ کے ساتھ یا عورت کے ہاتھ کے ساتھ اور وہ بچہ ہو یا مراہق (قریب البلوغ) ہو یا مجبوب (مقطوع الذکر) ہو اس کا اتنا حصہ باقی ہو جتنا وہ غائب کر سکتا ہو جیسا کہ غیر خصی آدمی غائب کرتا ہے اور برابر ہے کہ خاوند اس سے وطی کرے اس حال

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

میں کہ وہ عورت احرام باندھے ہوئے ہو یا روزہ دار ہو یہ سب کچھ اس بنا پر ہے جو امام شافعی نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، امام ثوری، اوزاعی، حسن بن صالح کا قول بھی ہے اور بعض اصحاب مالک کا قول بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ابن حبیب نے کہا ہے: اگر وہ اس سے شادی کرے پھر اگر وہ اسے پسند آجائے تو وہ اسے روک لے گا ورنہ اسے حلال کرنے میں اس کے لئے اجر ہوگا تو یہ جائز نہیں۔ جب اس نے اپنے نکاح کو حلالہ کی نیت سے ملا دیا تو اب اس کے ساتھ وہ زوج اول کے لئے حلال نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 6۔ آقا کا اپنی اس لونڈی کے ساتھ وطی کرنا جس کا خاوند اسے قطعی طلاق دے دے اسے حلال نہیں کرتا، کیونکہ وہ زوج نہیں ہے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عبیدہ، مسروق، شعبی، ابراہیم، جابر بن زید، سلیمان بن یسار، حماد بن ابی سلیمان اور ابو الزناد رحمہم اللہ کا بھی قول ہے اور اسی موقف پر فقہائے امصار کی جماعت بھی ہے۔

اور عثمان، زید بن ثابت اور زبیر سے اس کے خلاف بھی روایت ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر دے گا جب اس کے آقا نے اس کے ساتھ وطی کی اور وہ اس سے دھوکہ دہی کا ارادہ نہ کرے اور نہ ہی حلالہ کا اور وہ اپنے زوج کی طرف نکاح اور مہر کے ساتھ لوٹ جائے گی۔ اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور آقا اس پر ملک یمین کی حیثیت سے مسلط ہوا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ موطا امام مالک میں ہے کہ انہیں خبر پہنچی ہے کہ حضرت سعید بن مسیب اور سلیمان بن یسار رحمہما اللہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے اپنے غلام کی شادی اپنی ایک لونڈی سے کی، پھر غلام نے اسے طلاق البتہ (قطع کرنے والی طلاق) دی، پھر آقا نے وہ لونڈی اسی غلام کو ہبہ کر دی تو کیا وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال ہوگی؟ تو دونوں نے کہا: وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ کسی اور خاوند سے شادی کرے(1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ حضرت امام مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جس کے نکاح میں ایک مملوکہ لونڈی تھی پھر اس نے اسے خرید لیا اور تحقیق اس نے اسے ایک طلاق دے رکھی تھی۔ تو انہوں نے فرمایا: وہ اس کے لئے ملک یمین کی حیثیت سے حلال ہوگی جب تک وہ اس کی طلاق کو مغلظہ نہ بنائے اور اگر اس نے اسے طلاق مغلظہ دی تو پھر وہ ملک یمین کے طور پر اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے(2)۔ ابو عمر نے کہا ہے: علماء کی جماعت اور ائمہ فتویٰ کا یہی موقف ہے: امام مالک، ثوری، اوزاعی، شافعی، ابو حنیفہ، احمد، اسحاق، ابو ثور رحمہم اللہ انہی میں سے ہیں۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا، طاؤس اور حسن رحمہم اللہ کہتے ہیں: جب اس نے اسے خرید لیا جس نے اسے طلاق البتہ دی تو وہ اس کے لئے ملک یمین کے طور پر حلال ہوگی، اس لئے کہ یہ ارشاد عام ہے: اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس قول میں خطا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ کا معنی ہے مائیں اور بہنیں مباح

1۔ موطا امام مالک، کتاب النکاح، جلد 1، صفحہ 504، وزارت تعلیم

2۔ ایضاً

نہیں ہیں اور اسی طرح تمام محرمات بھی مباح نہیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 9۔ جب مسلمان نے اپنی ذمی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر ایک ذمی نے اس کے ساتھ نکاح کیا اور اس کے ساتھ دخول بھی کیا اور پھر اسے طلاق دے دی تو ایک گروہ نے کہا کہ وہ ذمی اس کے لئے زوج ہے پس اب اس کے لئے زوج اول کی طرف لوٹنا جائز ہے۔ اسی طرح حسن، زہری، سفیان ثوری، شافعی، ابوعبید اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اسی طرح ہم بھی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: **حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ** اور نصرانی بھی زوج ہے اور امام مالک اور ربیعہ نے کہا ہے: وہ اسے حلال نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جمہور علماء کا موقف ہے کہ نکاح فاسد تین طلاقوں والی عورت کو حلال نہیں کر سکتا۔ امام مالک، ثوری، امام شافعی، اوزاعی، اصحاب الرائے، امام احمد، اسحاق اور ابوعبید تمام یہ کہتے ہیں کہ وہ نکاح صحیح کے بغیر زوج اول کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔ اور حکم کہتے ہیں کہ وہ زوج ہے اور ابن منذر نے کہا ہے: وہ زوج نہیں ہے کیونکہ ظہار، ایلاء اور لعان میں ازواج کے احکام ان دونوں کے درمیان ثابت نہیں ہیں اور اہل علم میں سے جن سے کچھ یاد رکھا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ عورت نے جب زوج اول کو کہا: میں نے شادی کی ہے اور میرے خاوند نے مجھ سے دخول کیا ہے اور زوج اول نے اس کی تصدیق کر دی تو وہ اس کے لئے حلال ہو جائے گی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس کی تصدیق نہ کرے جب اس کے دل میں اس کے جھوٹا ہونے کا خیال واقع ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس باب میں انتہائی شدت اور تغلیظ مروی ہے اور آپ کا ارشاد ہے: میرے پاس جو حلالہ نکالنے والا اور جس کے لئے حلالہ نکالا گیا لایا گیا تو میں یقیناً ان دونوں کو رجم کر دوں گا (1)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حلالہ نکالنا تو زنا ہے وہ مسلسل زنا ہی کرتے رہیں گے اگرچہ وہ بیس برس تک بھی اس پر قائم رہیں۔

ابو عمر نے کہا ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول فقط تغلیظ کا احتمال رکھتا ہے، کیونکہ آپ سے یہ صحیح روایت ہے کہ آپ نے حرام فرج میں وطی کرنے والے سے حد کو اٹھا لیا اور آپ نے کہا: وہ اس کی تحریم سے جاہل تھا اور آپ نے جہالت کے سبب اسے معذور قرار دیا۔ پس اس بارے میں تاویل اولیٰ اور بہتر ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس پر رجم نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝**

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **فَاِنْ طَلَّقَهَا** اس میں مراد زوج ثانی ہے (یعنی اگر زوج ثانی اسے طلاق دے دے) **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ** اس میں ما مشتبہ ضمیر سے مراد عورت اور زوج اول ہے (تو ان دونوں پر کوئی حرج نہیں)۔ یہ حضرت ابن

1۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 211، دار الکتب العلمیہ

عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے (1)۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ آزاد آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے پھر اس کی عدت گزر جائے اور وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور وہ اس سے مجامعت کرے پھر اسے فارغ کر دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے پھر وہ پہلے خاوند سے نکاح کرے تو وہ اس کے پاس تین طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (یعنی زوج اول کو از سر نو تین طلاقوں کا اختیار حاصل ہوگا)۔

اور ایسے آدمی کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیتا ہے پھر وہ کسی دوسرے سے شادی کرتی ہے، پھر اس سے پہلے خاوند کی طرف لوٹ کر آتی ہے تو اس کے بارے ایک گروہ نے کہا ہے: وہ اس کے پاس اپنی باقی طلاقوں کے حق کے ساتھ رہے گی (چاہے باقی ایک ہو یا دو)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر اصحاب نے کہا ہے: ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابی بن کعب، حضرت عمران ابن حصین اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں اور اسی طرح حضرت زید بن ثابت، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبد اللہ بن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا جاتا ہے اور یہی قول حضرت عبیدہ السلمانی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت حسن بصری، حضرت مالک، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابن ابی لیلی، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت ابو عبید، حضرت ابو ثور، حضرت محمد بن حسن اور حضرت ابن نصر رحمہم اللہ نے کہا ہے۔

اور اس میں دوسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ یہ نکاح بھی جدید ہے اور طلاق بھی جدید ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح حضرات عطا، نخعی، شریح، نعمان اور یعقوب رحمہم اللہ نے کہا ہے اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اور وکیع نے اعمش سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبد اللہ کے اصحاب کہتے ہیں: کیا زوج ثانی تین طلاقوں کو تو گرا دیتا ہے اور وہ ایک اور دو طلاقوں کو نہیں گراتا فرمایا: ہمیں حفص نے حجاج سے، انہوں نے طلحہ سے اور انہوں نے ابراہیم سے ہمیں بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب کہا کرتے تھے: زوج ثانی ایک اور دو طلاقوں کو اسی طرح گرا دیتا ہے جیسے وہ تین طلاقوں کو گرا دیتا ہے سوائے عبیدہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: یہ عورت اس کے پاس اپنی باقی طلاقوں کے ساتھ رہے گی (2)۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: میں قول اول کے مطابق کہتا ہوں۔

اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر دوسرے خاوند نے اس کے ساتھ دخول کیا ہے تو طلاق بھی جدید ہے اور نکاح بھی جدید ہے اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر وہ اپنی باقی طلاقوں پر رہے گی۔ یہ ابراہیم نخعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ یہ شرط ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر دونوں کو گمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ کتاب المصنف لابن ابی شیبہ، باب من قال منہ، جلد 4، صفحہ 113، مکتبۃ الزمان للنشر والتوزیع، المدینۃ المنورہ

جو کہ ان میں ہے: ایک اپنے ساتھی کے ساتھ حسن معاشرت اختیار رکھے گا۔

اور کہا جاتا ہے کہ حفظہ و تفقہ سے مراد ان کے فرائض ہیں یعنی جب دونوں کو علم ہو کہ ان کے درمیان وہ امر ہے جو نکاح کے صحیح اور جاری ہونے سے مانع ہے اور جب خود کو علم ہو کہ وہ اپنی بیوی کے نفقہ یا اس کے مہر یا اس کے دیگر حقوق ادا کرنے سے عاجز ہے تو اس پر واجب ہے کہ ان میں سے کسی شے سے وہ عاجز ہے تو اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس سے شادی کرے یہاں تک کہ وہ اسے وضاحت کے ساتھ بتا دے یا وہ اپنے بارے میں عورت کے حقوق کی ادائیگی پر قدرت کے بارے جان لے۔ اور اسی طرح اگر اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو اسے استمتاع سے روکتی ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے بیان کرے تاکہ وہ اپنی جانب سے عورت کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور اسی طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسے نسب کے بارے دھوکے میں مبتلا کرے جس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور اس کے پاس نہ ہی مال ہو اور نہ ہی کوئی ذریعہ کاروبار اور اس میں جھوٹ بولنے والا ہو۔ اسی طرح عورت پر بھی لازم ہے کہ جب وہ اپنی ذات میں خاوند کے حقوق کی ادائیگی سے عجز کے بارے جانتی ہو یا اسے کوئی ایسی بیماری ہو جو استمتاع سے مانع ہو مثلاً جنون، جذام، برص یا شرمگاہ میں کوئی بیماری ہو تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرد کو دھوکے میں ڈالے اور اس پر لازم ہے کہ اسے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی وضاحت کرے جس طرح کہ بائع پر سامان کے بارے واجب ہوتا ہے کہ اس کے سامان میں جو عیوب اور نقائص ہیں وہ انہیں بیان کرے۔

اور جب زوجین میں سے کوئی اپنے شریک میں کوئی عیب پائے تو اس کے لئے اسے رد کرنا جائز ہے۔ پس اگر عیب مرد کی جانب ہو تو عورت کے لئے کامل مہر ہوگا اگر اس کے ساتھ دخول کیا گیا ہو اور اگر اس کے ساتھ دخول نہیں ہوا تو پھر اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ اور اگر عیب عورت کی جانب ہو تو خاوند اسے واپس لوٹا دے اور جو مہر اسے دیا ہے وہ اس سے لے لے۔ اور تحقیق یہ روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی بیاضہ کی ایک عورت سے شادی کی تو آپ نے اس کے پہلو میں برص کا نشان پایا تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا اور فرمایا: "تم نے مجھ پر اسے پوشیدہ رکھا ہے۔"

اور عنین کی بیوی کے بارے میں امام مالک سے روایت مختلف ہے جب اس نے اپنا آپ مرد کے حوالے کر دیا پھر مرد کے عنین ہونے کے سبب ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی گئی تو آپ نے ایک بار کہا: اس کے لئے کامل مہر ہوگا اور ایک بار کہا: اس کے لئے نصف مہر ہوگا اور اس کا انحصار اس قول کے اختلاف پر ہے کہ وہ کس کے ساتھ مہر کی مستحق ہوگی کیا اپنے آپ کو حوالے کرنے کے ساتھ یا دخول کے ساتھ؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہمارے اصحاب نے اختلاف کیا ہے کہ کیا عورت کے ذمہ خدمت کرنا بھی ہے یا نہیں؟ تو ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے: عورت پر خدمت کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ یہ عقد استمتاع (لطف اندوز ہونے) کو شامل ہے نہ کہ خدمت کو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ یہ عقد اجارہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ملک رقبہ حاصل ہوتی ہے بلکہ یہ تو فقط استمتاع پر عقد ہے اور عقد کے ذریعہ صرف استمتاع کا مستحق بنایا جاتا ہے جو کہ اس کے سوا کسی اور کا مطالبہ اس سے زیادہ کا عورت سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف دیکھتے نہیں: فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ

کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ اس میں بلغن کا معنی قاربن ہے (یعنی جب وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں) اس پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ معنی اس کا محتاج ہے کیونکہ عدت مکمل ہونے کے بعد اسے روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے (1) اور اس کے بعد والی آیت میں یہ لفظ انتہا کو پہنچنے کے معنی میں ہے، کیونکہ وہاں معنی اس کا تقاضا کرتا ہے۔ پس یہ لفظ دوسری آیت میں حقیقت ہے اور پہلی میں مجاز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ، امساک بالمعروف کا معنی ان حقوق کے ساتھ قیام ہے جو عورت کی جانب سے مرد پر واجب ہوتے ہیں۔ اسی لئے علماء کی جماعت نے کہا ہے: بے شک امساک بالمعروف میں سے ہے کہ خاوند جب وہ مال نہ پائے جسے وہ بیوی پر خرچ کرے گا تو وہ اسے طلاق دے دے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ معروف کی حد سے خارج ہو گیا۔ پھر اس کی جگہ حاکم طلاق دے دے گا اس ضرر اور اذیت کی وجہ سے جو عورت کو ایسی حالت میں اس کے پاس رہنے سے لاحق ہو رہی ہے جس میں وہ اس کے نفقہ پر قادر نہیں۔ اور بھوک ایسی شے ہے جس پر صبر نہیں۔ اسی طرح امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو ثور، ابو عبید، یحییٰ القطان اور عبد الرحمن ابن مہدی رحمہم اللہ نے کہا ہے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اور تابعین میں سے حضرت سعید بن مسیب نے یہی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہی سنت ہے اور اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور ایک گروہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی اور اس پر صبر کرنا عورت کے ذمہ لازم ہوگا اور حاکم کے حکم کے مطابق نفقہ مرد کے ذمہ پڑے گا۔ یہ قول حضرت عطا اور زہری رحمہما اللہ کا ہے اور علماء کوفہ اور ثوری رحمہم اللہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ (البقرہ: 280) اور فرمایا: وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ" الآیہ (النور: 32)۔

پس اللہ تعالیٰ نے فقیر کے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہے تو معلوم ہوا کہ فقر و افلاس کا سبب فرقت ہونا جائز نہیں اور اس کا اس کے باوجود نکاح کرنا مستحب ہے۔

اور یہ بھی کہ زوجین کے درمیان نکاح اجماع کے ساتھ منعقد ہوا ہے لہٰذا ان کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی مگر اسی کی مثل اجماع کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت کے ساتھ جس کے معارض کوئی روایت نہ ہو۔

اور پہلے قول کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ ارشاد ہے جو صحیح بخاری میں ہے: "عورت کہے گی یا مجھے کھانا مہیا کر اور یا مجھے طلاق دے دے۔ (2)" اور یہ محل خلاف میں نص ہے اور ہمارے نزدیک تنگدستی کے سبب ہونے والی فرقت طلاق

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 309، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 808، وزارت تعلیم

رہتی ہے بخلاف امام شافعی کے۔ ان کا کہنا ہے: وہ طلاق بائنہ ہے کیونکہ یہ بنا کے بعد فرقت ہوئی ہے اس کے ساتھ طلاق کا عدد مکمل نہیں ہوا اور نہ یہ کسی عوض کے لئے اور نہ ہی اس کا سبب خاوند کی جانب سے ضرر ہے، پس یہ رجعیہ ہوگی۔ اس کی اصل مولی (ایلاء کرنے والا) کی طلاق ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ یعنی یا تم انہیں طلاق دے دو، یہ پیچھے گزر چکا ہے۔ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا۔ امام مالک نے ثور بن زید الدیلی سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اسے اس کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اسے اپنے پاس روکنے کا ارادہ رکھتا ہے اور (صرف اس لئے) تاکہ وہ اس طرح اس پر عدت کو طویل کر دے اور اسے ضرر اور اذیت پہنچائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ انہیں نصیحت کر رہا ہے (1)۔ اور زجاج نے کہا ہے: فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ یعنی اس نے اپنے آپ کو عذاب کے لئے پیش کیا، کیونکہ جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اسے کرنا اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے لئے پیش کرنا ہی ہے۔ اور یہ خبر اس خبر کے موافق ہے جو طلاق اور رجوع کو ترک کرنے کے بارے میں نازل ہوئی جس طریقہ پر اہل جاہلیت تھے جیسا کہ اس کا بیان اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے تحت گزر چکا ہے۔ پس ان دونوں خبروں نے ہمیں یہ فائدہ دیا ہے کہ مذکورہ دونوں آیتوں کا نزول قریب قریب ایک ہی معنی میں ہے اور وہ مرد کا عورت کو ضرر اور اذیت پہنچانے کے ارادہ سے اسے اپنے پاس روکنا اور اس کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق کے طریقہ پر نہ لو کیونکہ یہ تمام کے تمام سنجیدہ ہیں۔ پس جس نے ان میں مذاق کیا تو یہ اس پر لازم ہو جائیں گے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: دور جاہلیت میں ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور کہتا ہے: بلاشبہ میں نے طلاق دی ہے اور مذاق کر رہا ہوں اور وہ غلام کو آزاد کرتا اور کسی سے اپنا نکاح کرتا اور یہ کہتا: میں نے مذاق کیا ہے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے طلاق دی یا جس نے کسی کو آزاد کیا یا اپنا نکاح کیا یا کسی کا نکاح کیا اور پھر یہ گمان کیا کہ وہ مذاق کر رہا ہے تو وہ سنجیدہ شمار ہوگا (3)" (یعنی یہ تمام احکام نافذ ہو جائیں گے) اسے معمر نے روایت کیا ہے کہا ہے: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے عمرو سے انہوں نے حسن سے اور انہوں نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے اور اسی کے مثل اسے ذکر کیا ہے اور موطا امام مالک میں ہے کہ ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو بار طلاق دی ہے آپ میرے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اسے تیری جانب سے تین طلاقیں واقع ہو گئیں اور ستانوے طلاقوں کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیت کے ساتھ استہزا کیا ہے (4)۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 576، دار احیاء التراث العربیہ
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العربیہ
3۔ مجمع الزوائد، باب [illegible]، جلد 4، صفحہ 529، دار الفکر
4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 510، [illegible]

اور دار قطنی نے اسماعیل بن امیہ القرشی کی حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آدمی کو سنا کہ اس نے طلاق البتہ دی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوئے اور فرمایا: "تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو یا اللہ تعالیٰ کے دین کو تمسخر اور مذاق کے طور پر لیتے ہو۔ جس نے طلاق البتہ دی ہم نے اس کے لئے تین طلاقیں لازم کر دیں اور وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کر لے۔" اس میں راوی اسماعیل بن امیہ کوفی ہے اور ضعیف الحدیث ہے۔(1)

اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ آدمی جو اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے پھر کہتا ہے: قسم بخدا! نہ میں تجھے وارث بناؤں گا اور نہ میں تجھے چھوڑوں گا۔" عورت نے کہا: وہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا: جب تیری عدت گزرنے کے قریب ہو گی تو میں تیری طرف رجوع کر لوں گا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی(2): وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا الآیۃ۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: تمام اقوال آیت کے معنی میں داخل ہیں کیونکہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کرے اسے یہی کہا جائے گا: اتخذھا ھزوا اس نے اسے مذاق کے ساتھ لیا ہے اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اس (آیت) کے ساتھ کفر کیا اور اسے بھی کہا جائے گا جس نے اسے پرے پھینک دیا اور اسے نہ لیا اور عمل اس کے خلاف کیا سو اس بنا پر یہ تمام اقوال آیت میں داخل ہیں اور آیات اللہ سے مراد اس کے دلائل، اس کا امر اور اس کی نہی ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے مذاق کے طور پر طلاق دی تو وہ طلاق اسے واقع ہو جائے گی اور اس کے سوا میں اختلاف ہے۔ اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین کام ہیں کہ ان میں سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہے (اور وہ ہیں) نکاح، طلاق اور رجعت۔"(3)

اور حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ ان تمام نے کہا: تین فعل ہیں جن میں کوئی مذاق اور لاتعبیر نہیں اور ان میں مذاق کرنے والا بھی سنجیدہ شمار ہوتا ہے اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں۔(4)

اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ترک نہ کرو کہ تم کوتاہی کرنے والے اور مذاق کرنے والے ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں گناہ سے توبہ استغفار کرنا بھی داخل ہے جبکہ فعلاً اس پر اصرار ہو اور اسی طرح ہر وہ عمل جو اس معنی میں ہو پس اس کے بارے آگاہ رہو۔

1۔ دار قطنی، کتاب الطلاق والخلع والایلاء، جلد 4، صفحہ 20، دار المحاسن قاہرہ

2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 306، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ما جاء فی طلاق المعتوہ، حدیث نمبر 1113، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 298، وزارت تعلیم۔ ایضاً باب فی الطلاق علی الہزل، حدیث نمبر 1875، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب من طلق او نکح، حدیث نمبر 2020، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ المحلی لابن حزم، جلد 7، صفحہ 341، دار الفکر

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ یعنی اسلام اور احکام کے بیان (کے ساتھ) جو تم پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے اسے یاد کرو۔ اور الْحِكْمَةِ اس سے مراد سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مقدس سے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود کو بیان کرتی ہے جس کے بارے میں کتاب اللہ میں بیان اور وضاحت نہ ہو (1)۔ يَعِظُكُمْ بِهٖ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ یُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰی لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو انہیں کہ نکاح کریں اپنے خاوندوں سے جب کہ رضامند ہو جائیں آپس میں مناسب طریقہ سے یہ فرمان (الٰہی) ہے نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن ابو البداح کے نکاح میں تھی تو اس نے اسے طلاق دی اور اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر وہ نادم ہوا تو اسے پیغام نکاح بھیجا سو وہ راضی ہو گئی اور اس کے بھائی نے انکار کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے اور کہا: میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے اگر تو اس سے شادی کرے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت مقاتل نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معقل کو بلایا اور فرمایا: "اگر تو مومن ہے تو اپنی بہن کو ابو البداح سے نہ روک۔" تو معقل نے عرض کی: میں ایمان لایا اور اپنی بہن کی شادی اس سے کر دی (2)۔

اور امام بخاری نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن کو اس کے خاوند نے طلاق دی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی پھر اس نے اسے پیغام نکاح بھیجا تو حضرت معقل نے انکار کر دیا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی (3): فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔

اور اسے دارقطنی نے بھی حسن سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے حضرت معقل بن یسار نے بتایا ہے میری ایک بہن تھی میرے پاس اس کے لئے پیغام نکاح آتے تھے اور میں اس سے لوگوں کو روکتا رہتا تھا، پھر میرے چچا کا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے اس کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا، پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ دونوں اکٹھے رہے پھر اس نے اسے طلاق رجعی دے دی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس کی عدت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

2۔ ایضاً

گزر گئی، پھر اس نے دیگر لوگوں کے ساتھ اسے پیغام نکاح دیا تو میں نے کہا: میں نے اس کے بارے لوگوں سے انکار کیا اور میں نے تیرے ساتھ اس کی شادی کر دی پھر تو نے اسے طلاق دی جس میں رجعت کا حق تھا پھر تو نے اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی اور جب میرے پاس پیغام نکاح آئے تو تو بھی دیگر خواہش رکھنے والے لوگوں کے ساتھ میرے پاس نکاح کی خواہش لے کر آیا میں تیرے ساتھ کبھی شادی نہ کروں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یا فرمایا: یہ آیت نازل کی گئی: وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔ پس میں نے اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور میں نے اس کا نکاح اس سے کر دیا (1)۔

بخاری کی روایت میں ہے: پس حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اس سے ابھی تک نفرت کی اور کہا: اس نے اسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ اس پر قدرت رکھتا تھا پھر وہ اس کے ساتھ نکاح کی خواہش کر رہا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی پھر حضرت معقل نے حمیت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی (2)۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ معقل بن سنان (یعنی نون کے ساتھ) ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتابوں میں معقل بن یسار یا سنان سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی نے فرمایا ہے کہ وہ معقل بن سنان ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں ہوتا کیونکہ حضرت معقل رضی اللہ عنہ کی بہن ثیبہ تھی۔ اگر ولی کے بغیر اختیار اس کے پاس ہوتا تو وہ اپنی شادی کر لیتی اور وہ اپنے ولی معقل کی محتاج نہ ہوتی۔ پس معلوم ہوا کہ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ میں خطاب اولیاء کو ہے اور شادی کے بارے میں اختیار انہیں کے پاس ہے کہ وہ ان کی رضامندی کے ساتھ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں خطاب ازواج کو ہے اور وہ اس طرح کہ غیر کے نکاح سے روکتے ہوئے اس کا رجوع کر لینا عورت پر عدت کے طویل ہونے کے سبب اذیت ناک اور ضرر رساں ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عورت اپنی شادی خود کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا: کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت عورت کی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ اور ولی کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس مسئلہ میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے جو کہ اس کے سبب نزول کے بارے ہم نے ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اس مقام پر بلوغ الاجل سے مراد انتہا کو پہنچنا ہے کیونکہ نکاح کی ابتدا کا تصور عدت گزرنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے اور تَعْضُلُوْهُنَّ کا معنی ہے تحبسوھن (یعنی جب وہ اپنی عدت کی انتہا کو پہنچ جائیں تو تم انہیں نہ روکو۔)

اور خلیل نے بیان کیا ہے: دجاجۃ معضل جب مرغی پر انڈا اٹک جائے (تب یہ کہا جاتا ہے)۔

1۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن
2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 803، وزارت تعلیم

اور کہا گیا ہے کہ العضل کا معنی التضییق والمنع ہے یعنی تنگ کرنا اور روکنا اور یہ بھی اسی معنی کی طرف ہی راجع ہے۔ کہا جاتا ہے: اردت امرا فعضلتنی عنه یعنی میں نے کام کا ارادہ کیا اور تو نے مجھے اس سے روک دیا اور مجھ پر اسے تنگ اور مشکل کر دیا۔ اور اعضل الامر بھی کہا جاتا ہے جب تجھ پر کام کے ذرائع تنگ ہو جائیں۔ اسی سے ان کا یہ قول بھی ہے: انه لعضلة من العضل جب وہ کام میں کسی قسم کے حیلہ اور ذریعہ پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

اور ازہری نے کہا ہے: عضل کی اصل ان کے اس قول سے ہے: عضلت الناقة (1) (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اونٹنی کا بچہ پھنس جائے اور اس کا نکلنا آسان نہ ہو اور عضلت الدجاجة جب اس کا انڈا پھنس جائے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے معضلة ولا ابا حسن یعنی مسئلہ مشکل ہے اور اس کے فیصلہ کرنے والے بہت تنگ ہیں اور حضرت طاؤس نے کہا ہے: تحقیق مشکل ترین فیصلے لائے گئے اور ہوا یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سوا کوئی ان پر قائم نہ رہا۔ لقد وردت عضل اقضیة ما قام بها الا ابن عباس اور عربوں کے نزدیک ہر مشکل معضل ہے اور اسی سے امام شافعی کا قول ہے:

اذا المعضلات تصدینی کشفت حقائقها بالنظر

جب مشکلات مجھے چیلنج کرتی ہیں تو میں ان کے حقائق کو غور و فکر سے کھول دیتا ہوں

اور کہا جاتا ہے: اعضل الامر جب معاملہ بہت سخت ہو جائے اور داء عضال یعنی شدید بیماری جس کا درست ہونا مشکل ہے اور وہ طبیبوں کو تھکا دے۔ اور عضل فلان ایمه یعنی فلاں نے اپنی مطلقہ کو منع کیا۔ یعضلها و یعضلها یعنی ضاد کے کسرہ اور ضمہ دونوں لغتیں ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ اس میں ذلکم نہیں کہا کیونکہ یہ جمع کے معنی پر محمول ہے اور اگر ذلکم ہوتا تو بھی جائز ہوتا۔ جیسا: ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہارے لئے اس میں مصالح اور خیر کیا ہے۔ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اور تم اسے نہیں جانتے ہو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَي الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 310، دار الکتب العلمیہ

مدت ، اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے۔ تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق۔ نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے۔ پس اگر دونوں ارادہ کریں دودھ چھڑانے کا اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں دونوں پر اور اگر تم چاہو تو دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو، تب بھی کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا طے کیا تھا تم نے مناسب طریقہ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔"

اس میں اٹھارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالْوَالِدٰتُ یہ مبتدا ہے۔ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ یہ اس کی خبر ہے۔ حَوْلَيْنِ کَامِلَيْنِ یہ ظرف زمان ہے۔ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نکاح اور طلاق کا ذکر کر چکا تو پھر اس نے اولاد کا ذکر کیا کیونکہ کبھی زوجین آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان کے ہاں بچہ ہوتا ہے۔ پس کہا گیا ہے: یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو۔ یہ سدی اور ضحاک وغیرہ نے بیان کیا ہے [1]۔ یعنی وہ خود اجنبی عورتوں کی نسبت اپنی اولاد کو دودھ پلانے کا زیادہ حق رکھتی ہیں کیونکہ وہ زیادہ شفیق اور زیادہ نرم ہیں اور صغیر بچے کو چھین لینا بچے اور اس کی ماں دونوں کے لئے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بچہ اگرچہ دودھ چھڑا بھی جائے تو ماں ہی زیادہ شفیق اور مہربان ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے اور وہی پرورش کی زیادہ حقدار ہوتی ہے جب تک وہ شادی نہ کرے جیسا کہ آگے آرہا ہے اور اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کیونکہ مطلقہ عورت تو لباس کی مستحق نہیں ہوتی جب طلاق بائن ہو، بلکہ وہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے مگر یہ کہ اسے مکارم اخلاق پر محمول کیا جائے اور کہا جائے: اولیٰ یہ ہے کہ اجرت اس سے کم نہ ہو جو اس کی خوراک اور لباس کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ یہ آیت عام ہے ان مطلقات کے بارے میں بھی جن کی اولاد ہو اور بیویوں کے بارے میں بھی (یعنی تمام کو شامل ہے) اور اظہر یہی ہے کہ یہ آیت ان بیویوں کے بارے میں ہے جن کا نکاح ابھی باقی ہو، کیونکہ وہ نفقہ اور لباس دونوں کی مستحق ہوتی ہیں اور زوجہ نفقہ اور لباس کی مستحق ہوتی ہے چاہے وہ دودھ پلائے یا نہ پلائے۔ نفقہ اور لباس دونوں حبس (قدرت) کے مقابلے میں ہیں۔ اور جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو جائے گی تو قدرت کامل نہ رہے گی اور کبھی یہ وہم کیا جاتا ہے کہ نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، پس اس وہم کو اس ارشاد کے ساتھ زائل کر دیا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ مراد زوج (بچے کا باپ) ہے رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ یعنی دودھ پلانے کی حالت میں (ان کا نفقہ اور لباس زوج پر ہے۔) کیونکہ یہ زوج کے مصالح اور منافع میں مشغول ہوتی ہے تو یہ اسی طرح ہو گیا جیسا کہ اگر وہ خاوند کے کام کی غرض سے اس کی اجازت کے ساتھ سفر پر چلی جائے تو نفقہ ساقط نہیں ہوتا۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 1، صفحہ 301، دارالکتب العلمیہ

اول وقت سے دوسرے کی طرف پلٹنے والا ہے اور کہا گیا ہے کہ سال کو حول اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اغلب امور بدل جاتے ہیں۔ کاملین یہ کامل ہونے کے لئے قید ہے کیونکہ کبھی کوئی کہنے والا کہتا ہے: اقمت عند فلان حولین اور اس سے وہ ایک سال اور دوسرے سال کا کچھ حصہ مراد لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ یعنی جو کوئی ایک دن اور دوسرے دن کے کچھ حصے میں جلدی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ اس پر دلیل ہے کہ دو سال دودھ پلانا حتمی نہیں ہے کیونکہ دو سال سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ لیکن یہ حد اس لئے بیان کی گئی ہے تاکہ زوجین کے درمیان مدت رضاع کے بارے میں تنازع ختم ہو جائے۔ لہذا خاوند پر دو سال سے زیادہ عرصہ اجرت دینا واجب نہیں ہے اور اگر باپ اس مدت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہے اور ماں اس پر راضی نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اور دو سال میں زیادتی یا کمی تب ہو سکتی ہے جب بچے کے لئے اس میں کوئی نقصان نہ ہو اور والدین رضامند ہوں۔

حضرت مجاہد اور ابن محیصن نے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّتِمَّ الرَّضَاعَةُ پڑھا ہے یعنی تا کو فتحہ کے ساتھ اور الرضاعۃ کو رفع کے ساتھ۔ یعنی فعل کی نسبت اس کی طرف کی ہے۔

اور ابو حیوہ، ابن ابی عبلہ، جارود بن ابی سبرہ نے الرِّضَاعَةَ کو را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ الحضارۃ اور الحضارۃ ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے القصعۃ کے وزن پر الرضعۃ پڑھا ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اَنْ یُّکْمِلَ الرَّضَاعَةَ (1) قراءت کی ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ بصری الرَّضَاعَةَ کو صرف را کے فتحہ کے ساتھ اور الرضاع کو صرف را کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً القتال اور کوفی الرضاعۃ کو را کے کسرہ کے ساتھ اور الرضاع کو را کے فتحہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آپ کے متبعین اور علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ وہ رضاعت جو حرمت میں نسب کے قائم مقام ہے وہ وہی ہے جو دو سال میں ہو، کیونکہ دو سال گزرنے کے ساتھ رضاعت کی مدت مکمل ہو گئی اور دو سال کے بعد کی رضاعت معتبر نہیں ہے (2)۔ آپ کا یہ قول موطا میں ہے اور یہ آپ سے محمد بن عبد الحکم کی روایت ہے اور یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی حضرت زہری، قتادہ، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، شافعی، احمد، اسحاق، ابو یوسف، محمد اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے۔

اور ابن عبد الحکم نے آپ سے دو سال اور کچھ تھوڑے دن زیادہ کا قول روایت کیا ہے۔ عبد الملک نے کہا ہے کہ دو مہینے اور اس طرح کی مدت ہے۔

اور ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: رضاعت کی مدت دو سال اور دو مہینے ہے (3) اور ولید بن مسلم نے آپ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: دو سالوں کے بعد دودھ پلانے کی جو مدت ہو گی ایک مہینہ یا دو مہینے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 311، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ سنن دارقطنی، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 90، [illegible]

فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ (الطلاق:6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو تم ان پر خرچ کرو) کیونکہ انہی کے سبب غذا اسے ملتی ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ آدمی پر اپنی اولاد میں سے ان بچوں کا نفقہ واجب ہے جن کا کوئی مال نہ ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند بنت عتبہ کو فرمایا اس حال میں کہ اس نے آپ سے عرض کی تھی کہ ابو سفیان انتہائی بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا نفقہ نہیں دیتا جو میرے لئے اور میرے بیٹوں کے لئے کافی ہو تو پھر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے لے لیتی ہوں، کیا مجھ پر اس میں گناہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خذی مایکفیک وولدک بالمعروف (1) (تو اتنا مال لے لے مناسب طریقے سے جو تیرے لئے اور تیری اولاد کے لئے کافی ہو)

اور الکسوۃ کا معنی لباس ہے۔ اور قولہ بِالْمَعْرُوْفِ کا معنی ہے جو عرف شرع میں بغیر افراط و تفریط کے متعارف ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نفقہ خاوند کی دولت اور اس کے منصب کے مطابق ہوگا مد یا کسی اور پیمانے کے ساتھ اندازے کی ضرورت نہیں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس کا بیان سورۃ الطلاق میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: عورت کو اجرت میں کمی پر صبر کرنے کا پابند اور مکلف نہیں کیا جائے گا اور خاوند کو اسراف (فضول خرچی) کا پابند نہیں کیا جائے گا بلکہ میانہ روی کا لحاظ رکھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 9۔ اس آیت میں امام مالک کی اس پر دلیل موجود ہے کہ پرورش کا حق ماں کو ہے اور وہ بچے میں اس کے بالغ ہونے تک ہے اور بچی میں نکاح تک ہے اور یہ ماں کا حق ہے اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب بچہ آٹھ برس کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ وہ عمر ہے جس میں وہ تمیز کر سکتا ہے لہٰذا اسے والدین کے درمیان اختیار دیا جائے گا کیونکہ اس کی یہ حالت قرآن کریم کی تعلیم، ادب اور دیگر وظائف عبادات کے لئے اس کی ہمت اور استعداد کو متحرک کرنے کی ہے اور اس میں بچہ اور بچی دونوں برابر ہو گئے ہیں۔

اور امام نسائی وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا مجھ سے لے لے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس بچے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان میں سے جسے چاہے پکڑ لے" تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا (2)۔

اور ابو داؤد کی کتاب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک عورت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرا خاوند چاہتا ہے کہ وہ میرا بیٹا لے جائے، حالانکہ یہ ابو عنبہ کے کنوئیں سے مجھے پانی لا کر دیتا ہے اور میرے لئے بہت نفع بخش ہے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ اندازی کر لو۔" تو اس کے خاوند نے کہا: میرے بیٹے کے بارے میں کون میرے ساتھ جھگڑ سکتا ہے؟ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بچے کو فرمایا: "یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو جس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، جلد 1، صفحہ 167، وزارت تعلیم

2۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 112، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب تخییر الصبی بین ابویہ، حدیث نمبر 2341، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے ان دونوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ لے۔ تو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لے کر چلی گئی (1)۔

اور ہماری دلیل وہ ہے جسے ابو داؤد نے امام اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ایک عورت حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! بے شک یہ میرا بیٹا ہے میرا پیٹ اس کے لئے برتن اور جائے حفاظت رہا، میرے پستان اسے سیراب کرتے رہے اور میری گود اس کے لئے گھر بنی رہی اور اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب اس نے اسے مجھ سے چھیننے کا ارادہ کیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: انت احق بہ ما لم تنکحی (2) تو اس کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک تو نکاح نہ کرے۔

ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ زوجین جب آپس میں علیحدہ علیحدہ ہو جائیں اور ان دونوں کا بچہ ہو تو ماں اس بچے کا زیادہ حق رکھتی ہے جب تک وہ نکاح نہ کرے۔ اسی طرح ابو عمر نے کہا ہے: میں علماء سلف میں سے کسی کو بھی مطلقہ عورت کے بارے میں اختلاف کرتے نہیں جانتا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے تو وہ باپ کی نسبت اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے جس وقت تک وہ چھوٹا بچہ ہے اور کسی شے کی تمیز نہیں کر سکتا بشرطیکہ اس کے پاس وہ حفاظت میں ہو اور (اخراجات کی) کفایت بھی ہو اور اس عورت میں فسق اور اجنبیوں کے سامنے زینت کا اظہار ثابت نہ ہو۔ پھر اس کے بعد اسے اختیار دینے میں اختلاف ہے جبکہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے درمیان تمیز کر سکتا ہو اور وہ عقل رکھتا ہو کہ ان میں سے کون اس کے حق میں اولیٰ اور بہتر ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں بغیر تخییر کے خالہ کے حق میں فیصلہ فرمایا۔

ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اسے لوں گا اور میں اس کا زیادہ حقدار ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر ہے اور خالہ ماں ہوتی ہے اور حضرت علی نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ یہ میرے چچا کی بیٹی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی میرے گھر ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، میں اس کے لئے (گھر سے) نکلا اور میں نے سفر کیا اور میں اسے لے کر آیا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور یہ حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا: واما الجاریۃ فاقضی بہا لجعفر، تکون مع خالتہا وانما الخالۃ ام (3) اور رہی بچی تو میں اس کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں کرتا ہوں، یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1938، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 311، وزارت تعلیم۔ ایضاً، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

وارث پر خالہ میں ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ ابن منذر نے کہا ہے: تمام محفوظ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ بچے میں ماں کا حق نہیں ہے جب وہ شادی کر لے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح انہوں نے اپنی "کتاب الاشراف" میں کہا ہے اور قاضی عبدالوہاب نے "شرح الرسالہ" میں حسن سے ذکر کیا ہے کہ شادی کے سبب پرورش میں اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ اور امام مالک، امام شافعی، نعمان اور ابو ثور رحمۃ اللہ علیہم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ نانی بچے کی پرورش کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ جب بچے کی ماں نہ ہو اور اس کی دادی ہو تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب بچے کی خالہ نہ ہو تو پھر دادی زیادہ حقدار ہے(1) اور ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا: خالہ دادی سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے(2)۔

اور امام شافعی اور نعمان کے قول میں ہے کہ دادی خالہ سے زیادہ حق رکھتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک باپ دادی کی نسبت اپنے بیٹے کے لئے زیادہ اولیٰ ہے(3)۔

ابو عمر نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ہے بشرطیکہ اس کی کوئی زوجہ یا بیوی نہ ہو۔ پھر باپ کے بعد بہن اور پھر پھوپھی کا حق ہے اور یہ تب ہے جب ان میں سے ہر ایک کے پاس بچہ محفوظ و مامون ہو اور وہ اس کے پاس حفاظت و کفایت میں ہو اور جب اس طرح نہ ہو تو پھر کسی کو حق حضانت حاصل نہیں، بلکہ اس کے بارے غور و فکر کیا جائے گا جس کے پاس بچہ زیادہ محفوظ ہوگا اور وہ اس کی حفاظت اور خیر اور بھلائی کی تعلیم کے سلسلہ میں انتہائی اچھا اور حسین سلوک کرے گا اور یہ ان کے قول کے مطابق ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ پرورش بچے کا حق ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور آپ کے اصحاب میں سے بھی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور اسی طرح فاجرہ عورت، ضعیف اور بیماری یا اپاہج ہونے کی وجہ سے جو بچے کا حق ادا کرنے سے عاجز ہو وہ اسے حق حضانت نہیں دیتے۔

ابن حبیب نے مطرف سے اور ابن ماجشون نے امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ پرورش کا حق پہلے ماں کا ہے پھر نانی کا پھر خالہ کا پھر دادی کا پھر بچے کی بہن کا پھر بچے کی پھوپھی کا پھر بچے کی بھتیجی کا اور پھر باپ کا ہے۔ دادی بہن سے اولیٰ ہے اور بہن پھوپھی سے اولیٰ ہے اور پھوپھی اپنے مابعد افراد سے اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور تمام مردوں میں سے اولیاء اور وارثوں اور وصی سے اولیٰ ہے اور خالہ کی بیٹی کے لئے، پھوپھی کی بیٹی کے لئے اور چچا کی بھتیجیوں کے لئے بچے کی پرورش میں سے کوئی حق نہیں ہے۔ اور جب پرورش کرنے والے کی جانب سے بچے پر ضائع ہونے یا فساد پا ہونے کا کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہو تو وہ اس کی مسلسل پرورش کرتا رہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہاں تک کہ وہ بچہ ہونے کے اطلاق سے نکل جائے۔ اور یہاں تک کہ بچی شادی کر لے مگر یہ کہ باپ سفر پر نکلے اور وطن سے منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہو تو اس وقت وہ اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، کتاب الرضاع، جلد 5، صفحہ 40

2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 38

3۔ ایضاً

اور کسی غیر کی نسبت اپنے بچے کا زیادہ حقدار ہے اگر وہ (بچے کی ماں) منتقل نہ ہو؛ چاہے اور اگر باپ نے تجارت کے لئے نکلنے کا ارادہ کیا تو پھر اس کے لئے حق حضانت نہیں اور اسی طرح بچے کے وہ اولیاء ہیں جن کے ساتھ وہ رہتا ہے جب وہ وطن بنانے کے لئے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اور ماں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کو باپ کے رہنے کی جگہ سے منتقل کرے مگر اس صورت میں کہ وہ اتنی مسافت سے بھی قریب ہو جس میں نماز قصر ہو جاتی ہے اور اگر آدمی نے عورت کے شہر سے منتقل ہوتے وقت اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اس کے پاس اپنا بچہ نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کا نفقہ اور اس کی مشقت معین سالوں تک اس پر لازم ہوگی تو اگر عورت نے اسے اپنے ذمہ لازم کر لیا تو وہ اس پر لازم ہو جائے گا۔ اور اگر وہ فوت ہو گئی تو پھر اس کے ترکہ میں سے اس کے لئے اس کے ورثاء کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ قرض ہے جو اس کے ترکہ میں سے لیا جائے گا۔ اور پہلا قول اصح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ اگر بچہ فوت ہو جائے یا جیسا کہ اگر وہ خلع میں رضاعت کے خرچ کی بھی اس سے صلح کر لے اور وہ اسے ساقط کر دے تو پھر اس میں سے کسی شے کے لئے اس کا پیچھا نہ کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 11۔ جب ماں شادی کر لے تو اس سے اس کا بچہ نہ چھینا جائے یہاں تک کہ اس کا خاوند اس سے دخول کر لے (1)۔ یہ امام مالک کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: جب اس نے نکاح کر لیا تو اس کا حق حضانت ختم ہو گیا۔ اور اگر اس نے اسے طلاق دے دی تو امام مالک کے نزدیک اس میں اس کے لئے رجوع کا حق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کا مشہور مذہب یہی ہے اور قاضی اسماعیل نے ذکر کیا ہے اور اسے ابن خویز منداد نے بھی امام مالک سے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں آپ کا قول مختلف ہے۔ سو ایک بار کہا: وہ بچہ اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ایک بار کہا: وہ نہیں لوٹایا جائے گا۔

ابن منذر نے کہا ہے: جب ماں اس شہر سے نکل گئی جس میں اس کا بیٹا تھا پھر اس کی طرف واپس آ گئی تو پھر بھی وہ اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہوگی۔ یہ امام شافعی، ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔ اور اسی طرح اگر اس نے شادی کی پھر اسے طلاق ہو گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو بچہ بھی اس کے حق میں لوٹا دیا جائے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے کہا ہے: پس اگر خاوند نے اسے طلاق دی یا وہ فوت ہو گیا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ بچے کو لے لے کیونکہ وہ عذر زائل ہو چکا ہے جس کے سبب بچے کو چھوڑنا جائز ہوا تھا۔

مسئلہ نمبر 12۔ اگر عورت نے اپنے بچے کی پرورش چھوڑ دی اور اس نے اسے لینے کا ارادہ ہی نہ کیا حالانکہ وہ فارغ تھی اور تزویج کے سبب مشغول نہ تھی۔ پھر اس کے بعد اس نے بچے کو لینے کا ارادہ کیا تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی۔ پس اگر اس کا بچے کو چھوڑنا کسی عذر کے باعث تھا تو اس کے لئے اسے لینا جائز ہے اور اگر اس کا ترک اسے چھوڑنے اور نفرت کے سبب تھا تو اب اس کے بعد اس کے لئے بچے کو لینا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ اور علماء نے ایسے زوجین کے بارے اختلاف کیا ہے جو طلاق کے سبب جدا ہو جاتے ہیں اور زوجہ ذمیہ ہے تو ایک گروہ نے کہا ہے: ذمیہ اور مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہی اپنے بچے کی زیادہ حقدار ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 5، صفحہ 40، [illegible]

یہ قول جمہور، اصحاب الرائے اور ابن القاسم صاحب مالک رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: تحقیق ہم نے حدیث مرفوع روایت کی ہے جو اس قول کے موافق ہے اور اس کی اسناد میں کلام ہے۔

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ بچہ ان میں سے مسلمان کے ساتھ ہوگا۔ یہ قول امام مالک، سوار اور عبداللہ بن حسن کا ہے اور یہی حضرت امام شافعی سے بھی بیان کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح ان کا ان زوجین میں بھی اختلاف ہے جو آپس میں جدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک آزاد ہے اور دوسرا مملوک۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: آزاد اولیٰ ہے۔ یہ قول حضرت عطا، ثوری، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور امام مالک نے کہا ہے: باپ جب آزاد ہو اور اس کا آزاد بیٹا ہو اور ماں مملوکہ (کنیز) ہو تو بلاشبہ ماں اس کی زیادہ حقدار ہو مگر یہ کہ اسے بیچ دیا جائے اور وہ کہیں اور منتقل ہو جائے تو پھر باپ کا حق زیادہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ماں بچے کے باپ کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے اسے دودھ پلانے سے انکار نہ کرے یا وہ اجرت مثل سے زیادہ کا مطالبہ کرے اور باپ کے لئے بھی حلال نہیں ہے کہ ماں کو دودھ پلانے میں اس کی رغبت کے باوجود اس سے منع کرے۔ یہ قول جمہور مفسرین کا ہے۔

نافع، عاصم، حمزہ اور کسائی نے تضار را مشددہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ نہی کی بنا پر محل جزم میں ہے (1) اور اس کی اصل لا تضارر ہے اور پہلی راء کو دوسری میں ادغام کیا گیا اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے دوسری کو فتحہ دے دیا گیا۔ اسی طرح مضاعف میں کیا جاتا ہے جبکہ اس سے پہلے فتحہ یا الف ہو تو کہتا ہے: عضّ یا رجل (تو کاٹ اے آدمی!) اور ضارّ فلانا یا رجل (تو فلاں کو ضرر پہنچا اے آدمی) یعنی بچہ ماں سے نہیں چھینا جائے گا جب وہ دودھ پلانے پر راضی ہو اور بچہ اس سے مانوس ہو۔

ابو عمرو، ابن کثیر اور ابان نے حضرت عاصم اور ایک جماعت سے تضارُّ راء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کا عطف لا تکلف نفس پر کیا ہے اور یہ خبر ہے اور اس سے مراد امر ہے (2)۔

اور یونس نے حسن سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: لا تضار زوجھا (یعنی وہ اپنے خاوند کو ضرر نہ پہنچائے) کہ وہ یہ کہے: میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی اور نہ وہ خاوند اسے ضرر پہنچائے کہ وہ اس کا بیٹا چھین لے حالانکہ وہ کہہ رہی ہو: میں اسے دودھ پلاؤں گی۔ اور یہ احتمال ہے کہ یہ اصل میں تضارِر ہو اور ولد مفعول مالم یسم فاعلہ ہو۔ اور حضرت عمر بن خطاب سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے لا تضارر پڑھا ہے یعنی دو راء جن میں سے پہلی مفتوح ہے۔

اور ابو جعفر بن قعقاع نے تضارْ یعنی را کو ساکن اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح لا یضار کاتب ہے۔ اور یہ بعید ہے کیونکہ دو ہم مثل لفظ جب جمع ہو جائیں اور وہ دونوں اصلی ہوں تو ان میں سے ایک کو تخفیف کے لئے حذف کرنا جائز نہیں۔ پس یا ادغام ہوگا یا اظہار ہوگا۔ اور آپ سے اسکان اور تشدید بھی مروی ہے اور حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم سے لا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

تُضَآرَّ پہلی راء کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ قول باری تعالیٰ: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ پر معطوف ہے۔ اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس حضرت قتادہ، سدی، حسن اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بچے کا وارث ہے کہ اگر وہ فوت ہو جائے۔

بعض نے کہا ہے: مراد بچے کا ایسا وارث ہے جو صرف مردوں میں سے ہو کہ دودھ پلانے کا اہتمام کرنا اس کے ذمہ لازم ہوگا جیسا کہ یہ بچے کے باپ پر لازم تھا اگر وہ زندہ ہوتا اور حضرت مجاہد اور حضرت عطا نے یہی کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے: مراد بچے کا وارث ہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی ہو۔ اسے دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے اتنی مقدار جتنا اس کی میراث میں ان کا حصہ ہے(2) اور یہی امام احمد اور اسحاق نے کہا ہے۔

اور قاضی ابو اسحاق اسماعیل بن اسحاق نے اپنی کتاب "معانی القرآن" میں کہا ہے: "پس رہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو انہوں نے کہا ہے: صغیر کا نفقہ اور اسے دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی بہن کا صغیر اور محتاج بیٹا ہو اور چچا کا بیٹا صغیر اور محتاج ہو اور وہی اس کا وارث ہو تو نفقہ ماموں پر واجب ہوگا اپنے اس بھانجے کے لئے جس کا وہ وارث نہیں ہے اور چچا کے بیٹے سے اپنے چچا کے اس بیٹے کے لئے جس کا وہ وارث ہے نفقہ ساقط ہو جائے گا"۔ ابو اسحاق نے کہا ہے: انہوں نے ایسا قول کیا ہے جو نہ کتاب اللہ میں ہے اور نہ ہم کسی کو جانتے ہیں جس نے یہ کہا ہو۔

علامہ طبری نے امام ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین رحمہم اللہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ وارث جس پر بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنا لازم ہوتا ہے وہی اس کا وارث ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اس کا ذی رحم محرم ہو اور اگر چچا کا بیٹا وغیرہ ذی رحم محرم کے ساتھ نہیں ہے تو اس پر کوئی شے لازم نہ ہوگی(3)۔

اور کہا ہے: (الوارث) سے مراد باپ کا عصبہ ہے ان پر نفقہ اور لباس دونوں واجب ہوں گے۔

ضحاک نے کہا ہے: اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے اور بچے کا مال ہو تو اسے دودھ پلانے والا اس مال سے لے لے گا۔ اور اگر اس کا کوئی مال نہ ہو تو پھر وہ عصبہ سے لے گا۔ اور اگر عصبہ کے پاس بھی مال نہ ہو تو پھر ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے۔

اور قبیصہ بن ذؤیب، ضحاک اور بشیر بن نصر قاضی عمر بن عبد العزیز رحمہم اللہ نے کہا ہے: الوارث سے مراد بچہ بذات خود ہے اور انہوں نے معنی الوارث کی تاویل المولود سے کی ہے جیسا کہ ما عنی المولود له ہے۔ یعنی اس پر اپنے مال میں سے اپنے آپ کو دودھ پلانا واجب ہے جب وہ اپنے باپ کا وارث بن جائے۔

اور سفیان نے کہا ہے: یہاں وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد جو باقی رہ جائے(4) وہ ہے۔ پس اگر باپ فوت ہو جائے تو ماں پر بچے کی کفالت اور دیکھ بھال کرنا لازم ہے جبکہ بچے کا مال نہ ہو اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 1، صفحہ 600، دار احیاء التراث العربیہ
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ

اسے بچے کو دودھ پلانے کا اہتمام کرنے میں اس کے ساتھ اتنی مقدار شراکت کرے گا جتنا میراث میں سے اس کا حصہ ہے۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر یتیم فوت ہو، اس کا کوئی مال نہ ہو تو امام وقت پر بیت المال سے اس کا انتظام کرنا واجب ہے اور اگر امام ایسا نہ کرے تو پھر مسلمانوں پر ایسا کرنا واجب ہے اخص فالاخص کے طریقہ پر۔ اور ماں بچے کے ساتھ سب سے زیادہ مختص ہے لہٰذا اس پر اسے دودھ پلانا اور اس کا اہتمام کرنا واجب ہوگا۔ وہ بچے کی طرف رجوع کرے گی اور نہ کسی اور کی طرف (یعنی بچے پر اٹھنے والے اخراجات کے لئے نہ بچے پر نہ کسی اور طرف متوجہ نہ ہوگی) اور دودھ پلانا واجب ہے اور نفقہ مستحب ہے اور وجہ استحباب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اور ازواج پر ان کے ساتھ حقوق کا قیام واجب ہے اور جب خاوند کے فوت ہو جانے یا اس کے تنگدست ہو جانے کے سبب ان کے حق کا پورا ہونا متعذر اور مشکل ہو جائے تو حق ان سے ساقط نہیں ہوتا۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ عدت ان (عورتوں) پر واجب ہے اور نفقہ اور سکنیٰ ان کے خاوندوں پر لازم ہے اور جب ان کے لئے نفقہ متعذر ہو جائے تو ان سے عدت ساقط نہیں ہوتی۔

عبدالرحمٰن بن قاسم نے الاسدیہ میں امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی کے ذمے بھائی اور قریبی رشتہ دار اور ذوی رحم محرم کا نفقہ لازم نہیں ہوتا (1)۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ منسوخ ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ امام مالک کے الفاظ ہیں اور آپ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا ناسخ کون ہے اور نہ ہی عبدالرحمٰن بن قاسم (نے بیان کیا ہے) اور نہ مجھے معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے اصحاب میں سے کسی نے اسے بیان کیا ہو اور وہ جو یہ شبہ القا ہے کہ وہ ان کے نزدیک اس کا ناسخ ہے۔ واللہ اعلم، وہ یہ کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے ایک سال کا نفقہ اور سکنیٰ متوفی کے مال سے رکھا جب کہ پھر اسے منسوخ کر دیا اور اسے اٹھا لیا۔ اسی طرح وارث سے بھی اسے منسوخ کر دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس اسی بنا پر نفقہ بچے کی اپنی ذات پر اس کے مال سے ہوتا ہے اور وارث پر ان میں سے کوئی شے نہیں ہوتی اس بنا پر جو گزر چکا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ، ابن قاسم نے امام مالک سے بیان کیا ہے کہ یہ منسوخ ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس میں غافلوں کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور تھوڑے لوگوں کی عقلیں اس میں حیرت زدہ ہو جاتی ہیں، حالانکہ اس میں امر قریب ہے اور وہ یہ کہ فقہاء و مفسرین میں سے علماء متقدمین تخصیص کو نسخ کا نام دیتے تھے، کیونکہ اس میں ان بعض افراد سے حکم کو اٹھانا ہوتا ہے جنہیں عموم شامل ہوتا ہے۔ یہ ان کا تسامح تھا اور وہ ان کی زبانوں پر جاری رہا یہاں تک کہ اس نے ان کے بعد والے لوگوں کو اشکال میں ڈال دیا۔ اور اس میں قول کی تحقیق یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَ عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ یہ ماتقدم کی طرف اشارہ ہے۔ پس لوگوں میں سے وہ جنہوں نے ایجاب نفقہ اور تحریم اضرار میں سے تمام کی طرف لوٹایا ان میں فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور سلف میں سے حضرت قتادہ اور حسن رحمہما اللہ ہیں اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

1۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب ارخاء الستور، جلد 5، صفحہ 48، [illegible]

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا معنی تمام ماتقدم کی طرف نہیں لوٹتا، بلکہ یہ صرف تحریم اضرار کی طرف لوٹتا ہے اور معنی یہ ہے کہ وارث پر بھی ماں کو ضرر پہنچانا اسی طرح حرام ہے جس طرح باپ پر ہے اور یہی اصل ہے۔ پس جو یہ دعویٰ کرے کہ اس میں عطف جمیع ماتقدم کی طرف راجع ہے تو دلیل لانا اسی پر لازم ہے[1]۔ میں (مفسر) کہتا ہوں کہ ان کا قول هذا هو الاصل اس سے مراد قریب ترین مذکور کی طرف ضمیر کو لوٹانا ہے۔ اور یہی صحیح ہے کیونکہ اگر وہ ان تمام کا ارادہ کرتا یعنی دودھ پلانا، نفقہ مہیا کرنا اور ضرر نہ پہنچانا تو یقیناً فرماتا: وعلى الوارث مثل هؤلاء پس یہ اس پر دلیل ہے کہ اس کا عطف ضرر نہ دینے پر ہے۔

اور اسی بنا پر تمام مفسرین نے اس کی تاویل اس معنی میں کی ہے جسے قاضی عبدالوہاب نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو اس طرح ضرر نہ پہنچائے کہ باپ جب اسے اجرت مثلی دے (تو وہ کہے) کہ وہ اسے دودھ نہیں پلائے گی اور نہ باپ اپنے بچے کے باعث ضرر پہنچائے اس طرح کہ ماں جب تیار ہو کہ وہ اسے اجرت مثلی کے عوض دودھ پلائے گی تو پھر اسی کا وہ حق ہے۔ (باپ انکار نہ کرے) کیونکہ ماں بچے کے لئے زیادہ نرم اور زیادہ محبت و شفقت سے پیش آنے والی ہے اور اس کا دودھ کسی بھی اجنبیہ عورت کے دودھ کی نسبت زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: امام مالک، آپ کے تمام اصحاب، شعبی، زہری، ضحاک اور علماء کی ایک جماعت رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمِثْلُ ذٰلِكَ سے مراد ہے کہ ضرر نہ پہنچایا جائے۔ رہا رزق (نفقہ) اور لباس تو ان میں سے کوئی شے واجب نہ ہوگی۔

اور ابن قاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ نفقہ اور رضاع وارث پر ہے پھر اسے اجماع امت کے ساتھ اس معنی میں منسوخ کر دیا گیا ہے کہ وارث کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور اختلاف اس میں ہے کہ کیا اس پر نفقہ اور لباس ہے یا نہیں؟

اور یحییٰ بن یعمر نے وعلى الورثة جمع کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ عموم کا تقاضا کرتا ہے۔ پس اگر وہ حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کریں لا يقبل الله صدقة وذو رحم محتاج کہ اللہ تعالیٰ کوئی صدقہ اس حال میں قبول نہیں فرماتا کہ ذو رحم محتاج ہو۔ تو انہیں کہا جائے گا کہ الرحم ہر ذی رحم کے لئے عام ہے، چاہے وہ محرم ہو یا غیر محرم اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ذو رحم پر صدقہ خرچ کرنا اولیٰ اور راجح ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اجعلها في الاقربين[2] (تم صدقہ کو اقربین میں خرچ کرو) پس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے اور اس میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے جس کا انہوں نے قصد کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور نحاس نے کہا ہے: رہا اس کا قول جس نے کہا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کہ اسے ضرر نہ پہنچایا جائے تو یہ قول حسن اور اچھا ہے کیونکہ لوگوں کے اموال ممنوع ہیں اور اس میں کوئی شے بغیر دلیل قطعی کے نہیں نکل سکتی اور جنہوں نے علی ورثة الاب

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 205، دار الفکر
2۔ صحیح بخاری، کتاب الوصایا، جلد 1، صفحہ 385، وزارت تعلیم

مراد لیا ہے تو ان کی دلیل یہ ہے کہ نفقہ باپ پر لازم ہے۔ لہٰذا اس کے وارث بیٹے کے وارثوں سے اولیٰ ہوں گے اور ان کی دلیل جنہوں نے کہا: مراد بچے کے وارث ہیں تو وہ کہتے ہیں: جس طرح وہ اس کے وارث ہوتے ہیں (اسی طرح) وہ اس کے حقوق کو بھی ادا کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: محمد بن جریر ان کے قول کو پسند کرتے تھے جنہوں نے کہا ہے کہ یہاں مراد بچے کے وارث ہیں، یہ اگرچہ قول غریب ہے لیکن اس سے استدلال صحیح ہے اور اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ اس کا مال اسی کے زیادہ قریب اور اولیٰ ہے۔ اور فقہاء نے اجماع کیا ہے سوائے ان کے جو ان سے الگ ہو گیا کہ ایک آدمی کا اگر چھوٹا بچہ ہو اور بچے کا مال بھی ہو اور باپ خوشحال ہو تو باپ پر نفقہ اور رضاعت واجب نہ ہوگا بلکہ وہ بچے کے مال سے ادا ہوگا۔

اور اگر کہا جائے: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ کہا جائے گا کہ یہ ضمیر مؤنث کے لئے ہے اور اس کے ساتھ اجماع آیت کی حد ہے اس کی وضاحت کرنے والا ہے، کوئی مسلمان اس سے نکلنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

اور رہا وہ جس نے کہا کہ اس سے مراد وہ ہے جو والدین میں سے ایک کے مرنے کے بعد باقی رہے تو اس کی دلیل یہ ہے کہ ماں کے لئے اپنے بچے کو ضائع کرنا جائز نہیں، حالانکہ وہ فوت ہو جائے جو بچے پر اور اس کی ماں پر خرچ کرتا تھا۔

اور امام بخاری نے اس قول کے رد میں ایک باب بیان کیا ہے اس کا عنوان ہے "باب - وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ وهل على المرأة منه شيء" اور آگے ام سلمہ اور ہند کی حدیث بیان کی ہے۔

اس میں معنی یہ ہے کہ ام سلمہ کے حضرت ابو سلمہ کی طرف سے بیٹے تھے اور ان کا کوئی مال نہ تھا تو انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے بیٹوں کا نفقہ اس پر واجب نہیں اور اگر واجب ہوتا تو وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ نہ کہتی: اور میں نے اسے چھوڑا نہیں (1)۔

اور رہی ہند کی حدیث تو اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باپ کے مال سے اپنا نفقہ اور اپنے بچے کا نفقہ لینے کے لئے چھوڑ دیا اور آپ نے نفقہ اس پر واجب نہیں کیا جیسا کہ اسے باپ پر واجب کیا۔ پس امام بخاری نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب والدین کی زندگی میں بیٹوں کا خرچ ماں پر لازم نہیں ہے تو اسی طرح باپوں کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ان پر لازم نہ ہوگا۔

اور رہا ان کا قول جنہوں نے کہا کہ بلاشبہ نفقہ اور دودھ پلانا ہر ذی رحم محرم پر لازم ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ ہر ذی رحم محرم پر خرچ کرے جب وہ فقیر ہو۔

نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معارض یہ ہے کہ نہ اسے کتاب اللہ سے لیا گیا ہے نہ اجماع سے اور نہ ہی سنت صحیحہ سے۔ بلکہ یہ قول ہم نے ذکر کیا ہے اس کے سوا کہیں معروف ہی نہیں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب النفقات، جلد 2، صفحہ 809، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب النفقات، حدیث نمبر 4950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بھی رہا قرآن کریم تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ پس اگر وارث پر نفقہ اور لباس ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے: جب وہ یتیم ماموں ہو اور اپنے چچا کا بیٹا چھوڑے تو نفقہ اس کے ماموں پر ہے اور اس کے چچا کے بیٹے پر کوئی شے نہیں ہے تو یہ قرآن کریم کی نص کے خلاف ہے کیونکہ ماموں چچا کے بیٹے کے ساتھ کسی کے قول کے مطابق بھی وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی وہ اکیلا اکثر علماء کے قول کے مطابق وارث بن سکتا ہے اور وہ جنہوں نے اس سے ہر ذی رحم محرم پر نفقہ کا استدلال کیا ہے، اکثر اہل علم اس کے خلاف ہیں۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا اس میں اَرَادَا کی ضمیر والدین کے لئے ہے اور فِصَالًا کا معنی ہے دودھ چھڑانا (1)۔ یعنی ماں کے دودھ کے سوا کسی اور خوراک کو غذا بنانا اور الفصال اور الفصل کا معنی الفطام ہے اور اس کا اصل معنی التفریق ہے اور یہ بچے اور پستان کے درمیان تفریق اور جدائی کرنا ہے اور اسی سے الفصیل ہے (یعنی اونٹنی یا گائے کا بچہ) کیونکہ اسے اپنی ماں سے جدا کیا جاتا ہے۔ عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا یعنی وہ راضی ہو جائیں دو سالوں سے پہلے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا یعنی اس کا دودھ چھڑانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب مدت رضاع دو سال مقرر کی تو اس نے بیان کر دیا کہ ان دونوں کا دودھ چھڑانا وہی فطام ہے اور ان دونوں کو جدا کرنا وہی فصال ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، مگر یہ کہ والدین اس مدت سے کم پر بچے کو نقصان پہنچائے بغیر متفق ہو جائیں اور وہ اس بیان کے ساتھ جائز ہے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دو سال دودھ پلانا واجب تھا اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں تخفیف کی گئی اور دو سال سے کم مدت دودھ پلانا مباح کر دیا گیا اس قول کے ساتھ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا الآیہ۔ اور اس میں احکام میں اجتہاد کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کے لئے مشاورت مباح قرار دی ہے ایسے امور میں جو صغیر کی اصلاح کرنے والے ہوں اور یہ ان دونوں کے ظن غالب پر موقوف ہے نہ کہ حقیقت و یقین پر۔ اور التشاور کا معنی ہے: رائے کا اظہار کرنا۔ اسی طرح المشاورۃ اور المشورۃ ہے جیسا کہ المعونۃ اور شرت العسل کا معنی ہے میں نے اسے (شہد کو) نکالا ہے اور شرت الدابۃ و شورتہا یعنی میں نے اسے چلایا اس کی چال کو تیز کرنے کے لئے اور الشوار کا معنی ہے گھر کا سامان، کیونکہ وہ دیکھنے والے کے لئے ظاہر ہوتا ہے اور الشارۃ کا معنی ہے آدمی کی ہیئت اور الاشارۃ کا معنی ہے جو تیرے دل میں ہے اسے نکالنا اور اس کا اظہار کرنا۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ یعنی لاولادکم غیر الوالدۃ؛ اگر تم چاہو تو اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ والدہ کے علاوہ (دایہ سے) زجاج نے یہی کہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: عربی میں تقدیر عبارت یہ ہے ان تسترضعوا اجنبیۃ لاولادکم (کہ تم اجنبی عورت سے اپنی اولاد کو دودھ پلواؤ) اس کی مثل یہ ارشاد ہے: كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ (المطففین: 3) یعنی کالوا لھم او وزنوا لھم اور لام کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتے ہیں ان میں سے ایک حرف کے ساتھ ہوتا ہے اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دارالکتب العلمیہ

أمرتك الخير فافعل ما أمرت به ... فقد تركتك ذا مال و ذا نشب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہ کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے، تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب جائیداد چھوڑا ہے۔

اور یہ جائز نہیں ہے: دعوت زیدا، ای دعوت لزید، کیونکہ یہ تلبیس (حقیقت کو چھپانا) تک پہنچا دیتا ہے اور اس نوع میں سماع معتبر ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر اس آیت میں دایہ بنانے کے جواز پر دلیل موجود ہے جبکہ آباء اور مائیں اس پر متفق ہو جائیں اور عکرمہ نے قول باری تعالیٰ وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ میں کہا ہے: اس کا معنی ہے دایہ۔ اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

دراصل یہ ہے کہ ہر ماں پر اپنے بچے کو دودھ پلانا لازم ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تحریر کی ہے۔ لیکن اس نے زوجیت کو اپنی ولد کو دودھ پلانے کا حکم دیا ہے اور ان کے لئے ازواج پر نفقہ اور لباس واجب کیا ہے اور زوجیت قائم رہے گی اور اگر دودھ پلانے کا انتظام کرنا باپ پر لازم ہوتا تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کے نفقہ اور لباس کے لازم ہونے کا ذکر کیا ہے تو وہ اس کا بھی ذکر کر دیتا۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر فقہاء امصار کے سوا حسیبہ (خاندانی شرف والی عورت) کی استثنا کی ہے اور کہا ہے: اس پر دودھ پلانا لازم نہ ہوگا (2) اور اسے آیت سے نکال دیا ہے اور اصول فقہ کے ایک اصول کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی ہے۔ اور وہ ہے العمل بالعادۃ۔ عمل عادت اور رواج کے مطابق ہوتا ہے اور یہ وہ اصول ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی نہیں سمجھا۔ اور اس میں عمدہ اصول یہ ہے کہ یہ امر دور جاہلیت میں صاحب حسب و شرف لوگوں میں رائج تھا، پھر اسلام آیا اور اس نے اسے تبدیل نہیں کیا اور آپ کے زمانے تک صاحب ثروت و حسب لوگ بچوں کو دودھ پلانے والیوں کے حوالے کرنے کے ساتھ ماؤں کو استمتاع کے لئے فارغ کرنے پر مصر رہے۔ تو آپ نے یہ عہد پایا اور ہمارے زمانے کا حکم تو ہم نے اسے شرعاً ثابت کر دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اِذَا سَلَّمْتُمْ جب تم جتنی اجرت دودھ پلانے والی دایہ کو ادا کرو۔ سفیان نے یہی کہا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: جب تم ماؤں کو ان کی اجرت اس حساب سے ادا کر دو جس کے مطابق انہوں نے دودھ پلانے کے وقت تک دودھ پلایا (3)۔

سات قراء میں سے چھ نے ما آتیتم یعنی ما اعطیتم پڑھا ہے اور ابن کثیر نے اَتَیْتُمْ یعنی ما جئتم و فعلتم (جو تم لائے اور تم نے کیا) پڑھا ہے۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

وما كان من خير أتوه فإنما ... توارثه آباء آبائهم قبل (4)

جو نیکی انہوں نے کی ہے وہ خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ بلاشبہ ان کے آباء کے آباء اس سے پہلے اس کے وارث بنتے تھے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 312، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 311
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 313، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً

ان کی بیویاں انتظار کریں گی۔) اس عبارت میں انتہائی ایجاز اور اختصار ہے۔ اور مہدوی نے سیبویہ سے بیان کیا ہے کہ معنی ہے: وفیما یتلی علیکم الذین یتوفون۔

اور کوفہ کے بعض علماء نحو نے کہا ہے: الذین کی خبر چھوڑ دی گئی ہے اور مقصود ان کی ازواج کے بارے خبر دینا ہے کہ وہ انتظار کریں گی۔ اور اس لفظ کا معنی ہے شروع ہونے کی خبر دینا اور وجوہ میں سے ایک میں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس عورت کی عدت کے بارے میں ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اس میں ظاہراً عموم ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ مہدوی نے بعض علماء سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت حاملہ عورتوں کو بھی شامل تھی پھر اسے اس قول کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (طلاق: 4)(1) (اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے حمل وضع کر لیں۔)

اور اکثر علماء نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ کے لئے ناسخ ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ کیونکہ لوگ اسلام کے کچھ عرصہ اس پر قائم رہے جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی چھوڑ جاتا تو وہ اپنی بیوی کے لئے ایک سال کے نفقہ کی وصیت کرتا اور سکنی (رہائش گاہ) کی وصیت کرتا جب تک وہ نہ نکلے اور شادی نہ کر لے۔ پھر اسے چار مہینے اور دس دن اور میراث کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: اس میں نسخ نہیں ہے بلکہ یہ سال کی مدت میں کمی کرنا ہے جیسا کہ صلوٰۃ مسافر کہ جب یہ چار سے کم ہو کر دو رکعتیں ہوئی تو یہ نسخ نہیں ہے۔ اور یہ واضح طور پر غلط ہے جب اس کا حکم یہ تھا کہ وہ ایک سال تک عدت گزارے گی جب وہ نہ نکلے اور اگر وہ نکل گئی تو اسے روکا نہ جائے پھر اس حکم کو زائل کر دیا گیا ہے اور اس پر چار مہینے دس دن عدت لازم ہوئی ہے اور یہی وہ نسخ ہے اور صلوٰۃ مسافر میں اس میں سے کوئی شے نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی پھر حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور صلوٰۃ مسافر کو اپنے حال پر برقرار رکھا گیا (2)۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ایسی حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت وضع حمل ہے۔ یہ جمہور علماء کے نزدیک ہے اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ اس کی عدت دو مدتوں میں سے آخری مدت (طویل مدت) کو مکمل کرنا ہے۔ اور ہمارے علماء میں سے سحنون نے اسے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اس کی دلیل جو حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے وہ ان دونوں قولوں کو جمع کرنے کا ارادہ ہے: یعنی وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (3) اور اس قول کے درمیان: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور وہ اس طرح کہ جب وہ

1۔ محرر وجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 51، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، حدیث نمبر 337، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 613، دار احیاء التراث العربی

دو مدتوں کی انتہا تک پہنچی رہی تو اس نے دونوں آیتوں کے مقتضا کے مطابق عمل کیا۔ اور اگر وہ وضع حمل کے ساتھ عدت گزارے تو اس نے عدت وفات والی آیت کے ساتھ عمل ترک کر دیا۔ اور دونوں کو جمع کرنا تو ترجیح سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اس پر تمام اہل اصول کا اتفاق ہے۔ یہ انتہائی اچھی نظر و فکر ہے اگر اس پر حدیث سبیعہ اسلمیہ (1) سے اعتراض نہ کیا جائے کہ اسے اپنے خاوند کی وفات کے بعد چند راتیں گزرنے کے ساتھ نفاس آ گیا اور اس نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اور حدیث نے واضح کر دیا ہے کہ رب کریم کا ارشاد: وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ مطلقات اور ان عورتوں کے بارے میں جن کے خاوند فوت ہو جائیں اپنے عموم پر محمول ہے اور عدت وفات دونوں میں سے غیر حاملہ کے ساتھ مختص ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ یہ ہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصریٰ کی آیت عدت وفات کی آیت کے بعد نازل ہوئی۔

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اس کا ظاہر کلام بے شک اس کا نسخ ہے لیکن وہ اس سے مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بلاشبہ یہ آیت اس کے لئے مخصص ہے اور اس نے اس سے اس کی بعض مشمولات کو نکال دیا ہے اور اسی طرح حدیث سبیعہ عدت وفات سے متاخر ہے۔ کیونکہ سبیعہ کا قصہ حجۃ الوداع کے بعد کا ہے۔ اور اس کا خاوند سعد بن خولہ تھا اور وہ بنی عامر بن لؤی میں سے تھا اور وہ غزوہ بدر میں شامل ہونے والے اصحاب میں سے تھا۔ جس وقت وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوا اس وقت یہ حاملہ تھی۔ اور یہی وہ تھا جس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثیہ کہا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کے وصال سے نصف مہینہ گزرنے کے بعد اس نے بچے کو جنم دیا۔ اور بخاری نے کہا ہے: چالیس راتیں گزرنے کے بعد (2)۔

اور مسلم نے حضرت عمر بن عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ سبیعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا اس نے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فتویٰ دیا کہ میں اس وقت سے حلال ہو چکی ہوں جب سے میں نے حمل کو وضع کر لیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے شادی کی اجازت مرحمت فرما دی اگر میرے لئے ضرورت ہو (3)۔

ابن شہاب نے بیان کیا ہے: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا کہ وہ اس وقت شادی کر لے جب بچے کی ولادت ہو جائے اگرچہ اس کا خون جاری ہو مگر یہ کہ اس کا خاوند اس کے قریب نہ جائے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے۔ اسی نظریہ پر جمہور علماء اور ائمہ فقہاء ہیں۔

اور حسن، شعبی، نخعی اور حماد نے کہا ہے: نفاس والی عورت جب تک حالت نفاس میں ہے نکاح نہیں کرے گی۔ اور انہوں نے دو شرطیں لگائی تھیں: ایک وضع حمل اور دوسری نفاس سے پاک ہونا۔ اور حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔ اور ان کے لئے اس

1۔ صحیح بخاری، باب واولات الاحمال اجلہن، حدیث نمبر 4907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، باب ... حدیث نمبر 4165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، جلد 2، صفحہ 729، وزارت تعلیم

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 486، قدیمی

قول میں کوئی حجت نہیں ہے۔ نعت تعلت من نفاسها تجملت للخطاب(1) (جب وہ اپنے نفاس سے پاک ہو جائے تو وہ خود کو نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگھار کرے) جیسا کہ صحیح مسلم اور ابی داؤد میں ہے۔ کیونکہ تعلت کا اگرچہ اصلی معنی دم نفاس سے پاک ہونا ہے جیسا کہ خلیل نے بیان کیا ہے۔ پھر بھی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہاں اس سے مراد اس کے نفاس کے دردوں اور تکلیف کا ختم ہونا ہو اور اگر وہ معنی تسلیم کر لیا جائے جو خلیل نے بیان کیا ہے تو پھر اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے بلکہ دلیل سبیعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد میں ہے "تو حلال ہو گئی جب سے تو نے وضع حمل کر لیا"(2) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع کے وقت صحت کو واقع کیا اور اسی پر اسے معلق کیا اور یہ نہیں فرمایا جب تیرا خون منقطع ہوا اور نہ یہ فرمایا کہ جب تو پاک ہوئی۔ لہٰذا وہی صحیح ہے جو جمہور نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء کے درمیان اس پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہر مطلقہ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے چاہے خاوند رجعت کا مالک ہو یا نہ ہو (یعنی طلاق رجعی ہو یا بائن) اور عورت آزاد ہو یا لونڈی، مدبرہ ہو یا مکاتبہ۔ البتہ حاملہ متوفی عنہا زوجہا کی مدت عدت میں اختلاف ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور تمام نے آپس میں اختلاف کیے بغیر اس پر اجماع کیا ہے کہ اگر آدمی فوت ہو جائے اور وہ حاملہ عورت پیچھے چھوڑ جائے اور چار مہینے اور دس دن گزر جائیں تو وہ حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ بچے کو جنم دے دے پس اس سے معلوم ہوا کہ مقصود ولادت ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يَتَرَبَّصْنَ۔ التربص کا معنی نکاح میں تاخیر کرنا اور صبر کرنا ہے اور مسکن نکاح سے نکلنا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنی کتاب میں سکنیٰ کا ذکر نہیں کیا ہے جیسا کہ مطلقہ کے لئے۔ بے شک اس قول کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے اَسْكِنُوْهُنَّ اور کتاب اللہ میں لفظ عدت میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو احداد (سوگ کا اظہار کرنا) پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ فقط فرمایا: يَتَرَبَّصْنَ حدیث طیبہ نے ان تمام چیزوں کو بیان فرمایا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ عدت وفات میں انتظار بلاشبہ احداد کے ساتھ ہے اور احداد سے مراد زیب و زینت سے، خوبصورت رنگے ہوئے کپڑے پہننے سے اور خوشبو وغیرہ لگانے سے رکنا اور باز رہنا ہے(3) اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے: احداد کوئی شے نہیں ہے صرف زوج سے انتظار کرنا ہے اور عورت کے لئے مباح ہے کہ بناؤ سنگھار کر سکتی ہے اور خوشبو لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریعہ بنت مالک بن سنان کو فرمایا اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (4) (تو اپنے گھر میں ہی رکی رہ یہاں تک کہ کتاب اللہ کے مطابق عدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔) اس نے بیان کیا ہے سو میں نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 115، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب عدۃ الحامل، حدیث نمبر 1982، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 569، وزارت تعلیم
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 815، دار احیاء التراث العربیۃ
4۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

چار مہینے اور دس دن عدت گزارنی ہے۔ یہ حدیث ثابت ہے۔ اسے امام مالک نے سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سے بیان کیا ہے اور اسے ان سے امام مالک، ثوری، وہیب بن خالد، حماد بن زید، عیسیٰ بن یونس اور ایک کثیر تعداد نے۔ ابن عیینہ، القطان اور شعبہ رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

اور تحقیق امام مالک نے اسے ابن شہاب سے روایت کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

الباجی نے کہا ہے: ان سے ان کے سوا کسی اور نے روایت نہیں کیا اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے بھی اسے اخذ کیا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: انہوں نے اسی کے ساتھ متوفی عنہا زوجہا کے لئے اپنے گھر میں عدت گزارنے کا فیصلہ کیا ہے اور علمائے حجاز و عراق کے نزدیک یہ حدیث مشہور و معروف ہے کہ متوفی عنہا زوجہا پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر میں عدت گزارے، وہاں سے نہ نکلے۔ اور یہی قول حجاز، شام، عراق اور مصر وغیرہ امصار کے فقہاء کی جماعت کا ہے۔

اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس پر لازم نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہی عدت گزارے بلکہ وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں سکنیٰ کا ذکر مطلقات کے بارے ہے اور ان کی دلیل میں سے یہ بھی ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اختلاف ہے۔

انہوں نے کہا ہے: بلاشبہ یہ حدیث ایک ایسی عورت روایت کر رہی ہے جس کا علمی مرتبہ معروف نہیں۔ اور سکنیٰ کو واجب کرنا ایک حکم کو واجب کرتا ہے اور احکام ثابت نہیں ہوتے مگر کتاب اللہ کی نص کے ساتھ یا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ساتھ یا اجماع کے ساتھ۔

ابو عمر نے کہا ہے: جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو وہ بحمد اللہ ثابت ہے اور رہا اجماع تو سنت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت نہیں کیونکہ جب کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو حجت اس کا قول ہوتا ہے جس کے قول کی تائید اور موافقت سنت کرے۔ وباللہ التوفیق۔

اور حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے بھی داؤد کے قول کی مثل مروی ہے اور اسی طرح حضرت جابر بن زید، عطا اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا اور یہ نہیں فرمایا: یعتددن فی بیوتھن (وہ اپنے گھروں میں عدت گزاریں)، لہٰذا عورت جہاں چاہے عدت گزارے (1)۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔

اور عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ معمر نے زہری سے اور انہوں نے حضرت عروہ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنی بہن ام کلثوم کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ کی طرف نکلیں اس وقت ان کا خاوند طلحہ بن عبید اللہ شہید ہو چکا تھا اور آپ فتویٰ دیتی تھیں کہ متوفی عنہا زوجہا اپنی عدت کے دوران نکل سکتی ہے (2)۔

1۔ جامع البیان طبری، جلد 2، صفحہ 615، دار احیاء التراث العربی

2۔ مصنف عبدالرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیہ

فرمایا: ہمیں ثوری نے عبید اللہ بن عمر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قاسم بن محمد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ لوگوں نے اس بارے میں ان کا انکار کیا ہے(1)۔ مزید فرمایا: معمر نے زہری سے ہمیں بیان کیا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت کے بارے میں رخصت دینے والوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کو لیا ہے اور اہل ورع اور عزم لوگوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو لیا ہے۔(2)

اور موطا میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایسی عورتوں کو مقام بیداء سے لوٹا دیتے تھے جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوتے اور آپ انہیں حج سے منع کرتے تھے(3) اور یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اجتہاد ہے۔ کیونکہ آپ گھر میں عورت کے لئے عدت گزارنے کے قائل تھے جس میں اس کا خاوند فوت ہوا، آپ عورت کے لئے اسے لازم قرار دیتے تھے اور یہی قرآن و سنت کا تقاضا ہے۔ پس عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ حج اور عمرہ کے لئے نکلے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

امام مالک نے کہا ہے: اسے واپس لوٹا دیا جائے گا جب تک کہ اس نے احرام نہ باندھا ہو۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب خاوند رہائش گاہ کا ذاتی طور پر مالک ہو تو عورت کے لئے اس میں عدت گزارنا لازم ہے۔ یہی اکثر فقہاء کا موقف ہے۔ (مثلاً) امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ وغیرہ۔ اور یہ حدیث فریعہ کی وجہ سے ہے۔ کیا گھر کو فروخت کرنا جائز ہے جب کہ وہ مرنے والے کی ملکیت ہو اور ورثاء نے اس کا ارادہ کیا ہو؟ تو ہمارے جمہور اصحاب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے اور اس میں عورت کے عدت گزارنے کی شرط لگائی جائے گی۔

ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ عورت غرماء کی نسبت سکنیٰ کی زیادہ حقدار ہے اور محمد بن حکم نے کہا ہے: یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس کی عدت طویل ہو جائے۔

اور ابن قاسم کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس میں غالب سلامتی ہے اور شک نادر ہے اور یہ عقود کو فاسد کرنے میں موثر نہیں ہوتا، اور اگر اس میں اسی شرط کے ساتھ بیع واقع ہو جائے پھر عورت کو شک پڑ جائے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب محمد میں کہا ہے کہ وہ اس مقام کا زیادہ حق رکھتی ہے یہاں تک کہ شک ختم ہو جائے اور ہمارے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ مشتری کے لئے بیع فسخ کرنے یا اسے مکمل کرنے کا اختیار ہو اور کسی شے کے ساتھ اس کی طرف رجوع نہیں کیا جائے گا کیونکہ وہ عدت معتادہ داخل ہوا ہے۔ اور اگر بیع زوال شک کی شرط کے ساتھ واقع ہوئی تو وہ فاسد ہے۔

سحنون نے کہا ہے: مشتری کے لئے کوئی حجت نہیں ہے اگرچہ شک پانچ سال تک لمبا ہو جائے کیونکہ وہ عدت پر داخل ہے اور عدت کبھی پانچ سال ہوتی ہے اور اسی طرح اسے ابو زید نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر خاوند کا گھر ہو لیکن ذاتی ملکیت نہ ہو تو عورت کے لئے عدت کی مدت تک سکنیٰ ہوگا۔ بخلاف امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے۔ اور اس کی دلیل فریعہ کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے حالانکہ آپ

1۔ مصنف عبد الرزاق، کتاب الطلاق، جلد 7، صفحہ 20، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 7، صفحہ 28
3۔ موطا امام مالک، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 531، وزارت تعلیم

جانتے تھے کہ اس کا خاوند رہائش گاہ کی ذاتی ملکیت نہیں رکھتا: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (1) (تو اپنے گھر میں ہی ٹھہر یہاں تک کہ لکھی ہوئی مدت اپنے اختتام کو پہنچ جائے)۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ گھر اس عورت کا تھا، پس اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: امکثی فی بیتک (2) کیونکہ معمر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی کہ اس کا خاوند قتل کردیا گیا ہے اور اس نے اسے ایسے گھر میں چھوڑا ہے جو اس کا نہیں اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور آگے حدیث ذکر کی۔

اور ہمارے لئے سکنیٰ کی نوعیت یہ ہے کہ اس نے ایسا گھر چھوڑا جس کے باسی اس کے اس طرح مالک ہوتے ہیں کہ اس میں ان پر کوئی تاوان اور بدلہ نہیں ہوتی۔ تو لازم ہے کہ اس کی بیوی اس میں عدت گزارے۔ اس کی اصل یہی ہے جبکہ وہ ذاتی طور پر اس کا مالک ہو۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب اس نے کرایہ ادا کر رکھا ہو۔ اور رہی وہ صورت جب اس نے کرایہ ادا نہ کیا ہو تو المدونہ میں ہے کہ میت کے مال میں عورت کے لئے کوئی سکنیٰ نہیں اگرچہ وہ خوشحال ہو۔ کیونکہ عورت کا حق اس کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جس رہائش گاہ کا وہ مکمل طور پر مالک ہوتا ہے اور جس کا کرایہ اور عوض اس نے ادا نہ کیا ہو وہ اس کا کامل طور پر مالک نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عوض کا مالک ہے جو اس کے قبضے میں ہے اور اس میں بیوی کا کوئی حق نہیں مگر میراث کے سبب نہ کہ سکنیٰ کی حیثیت سے، کیونکہ وہ مال ہے سکنیٰ نہیں ہے اور امام محمد نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ میت کے لئے اس کے مال میں کرایہ لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فریعہ کے لئے ارشاد گرامی: امکثی فی بیتک حتی یبلغ الکتاب اجلہ (3) یہ احتمال رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس لئے حکم دیا تھا کہ اس کے خاوند نے گھر کا کرایہ ادا کیا ہوا تھا یا یہ کہ اس میں اس کی وفات تک سکونت اختیار کی گئی تھی یا یہ کہ گھر والوں نے اس کے لئے اس میں عدت کو مباح قرار دیا تھا کرایہ کے عوض یا بغیر کرایہ کے یا ان میں سے جو اللہ تعالیٰ نے چاہا جس سے آپ نے یہ جان لیا کہ اس گھر میں رہنا اس کے لئے لازم ہے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔

مسئلہ نمبر 10۔ اس عورت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جس کے پاس اس کے خاوند کی موت کی خبر آتی ہے اس حال میں کہ وہ اپنے خاوند کے گھر کے سوا کسی اور گھر میں ہو۔ تو امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس کے گھر اور قرار گاہ کی طرف لوٹنے کا حکم دیا ہے اور یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب اور نخعی نے کہا ہے کہ وہ وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کے پاس خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نہیں جائے گی یہاں تک کہ عدت گزر جائے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول صحیح ہے مگر یہ کہ خاوند نے اسے اس مکان کی طرف منتقل کیا ہو تو پھر عدت اسی مکان میں لازم ہوگی۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 144، وزارت تعلیم
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 11۔ اس عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی حاجات اور ضروریات کے لئے صبح کے وقت لوگوں کے عام پھیل جانے کے وقت سے لے کر شام کے بعد ان کے اپنے گھروں میں پرسکون ہونے کے وقت تک گھر سے نکل سکتی ہے اور وہ اپنے اس گھر کے سوا رات کہیں نہیں گزار سکتی۔

اور بخاری اور مسلم میں ام عطیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرے گی سوائے اپنے خاوند کے کہ وہ چار مہینے اور دس دن ہے۔ وہ نہ تو رنگا ہوا کپڑا پہنے گی سوائے یمنی کپڑے کے (یعنی عصب کا کپڑا) اور نہ وہ سرمہ لگا سکتی ہے اور نہ خوشبو لگا سکتی ہے مگر جب وہ پاک ہو تو قسط یا اظفار (1) (خوشبو کی دو قسمیں ہیں) میں سے تھوڑی سی لگا سکتی ہے۔

اور ام حبیبہ کی حدیث میں ہے: "وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ کسی میت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ کا اظہار کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن (2) (سوگ کرے گی)" الحدیث۔ الاحداد کا معنی ہے: عورت جب تک عدت میں ہے زیب و زینت کی ہر قسم کو ترک کر دے مثلاً عمدہ لباس، خوشبو، زیورات، سرمہ اور مہندی لگانا وغیرہ۔ کیونکہ زینت ازواج کی طرف دعوت دیتی ہے تو اس سد ذرائع کے طور پر اس سے منع کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کی حرمات کو تار تار ہونے سے بچانے کے لئے اور عورت زیتون اور تلوں کا تیل کسی خوشبو میں ملا کر اپنے سر کو نہ لگائے۔ کہا جاتا ہے: امرأۃ حاد و محد سوگ منانے والی عورت۔ اصمعی نے کہا ہے: ہم حدت نہیں پہچانتے۔ اور لایحل کا فاعل وہ مصدر ہے جسے تحد اور ان سے بنانا ممکن ہے یہی مراد ہے تو گویا کہ اس نے کہا: الاحداد۔

مسئلہ نمبر 12۔ حضور نبی کریم ﷺ کا عورت کو ایمان سے متصف کرنا دو قولوں میں سے ایک کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک اہل کتاب عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد نہیں ہے۔ یہ قول ابن کنانہ اور ابن نافع کا ہے۔ اور اسے اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے اور اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن منذر نے کہا ہے اور ابن القاسم نے روایت کیا ہے کہ اس پر بھی مسلمان عورت کی طرح احداد (سوگ کا اظہار کرنا) ہے۔ یہی لیث، شافعی، ابو ثور اور ہمارے عام اصحاب نے کہا ہے، کیونکہ یہ عدت کے احکام میں سے ایک حکم ہے اور یہ مسلمان کے تحت کتابیہ عورت پر اسی طرح لازم ہے جس طرح رہائش کی جگہ اور عدت لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد میں: فوق ثلاث الا علی زوج (3) اس پر دلیل ہے کہ مسلمان عورتوں پر تین دنوں سے زیادہ اپنے ازواج کے سوا کسی پر احداد کرنا حرام ہے اور ان پر تین دن سوگ کا اظہار کرنا مباح ہے۔ مرنے کے بعد آنے والی رات سے لے کر تیسری رات کے اختتام تک اسے شمار کیا جائے گا۔ اگر کسی عورت کا دیور فوت ہوا اس

1۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تلبس الحادۃ ثیاب العصب، حدیث نمبر 4924، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب الکحل للحادۃ، حدیث نمبر 4921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 488، وزارت تعلیم

حالانکہ ابھی دن یا رات کا کچھ حصہ باقی تھا تو اسے وہ شمار کرے گی اور آنے والی رات سے حساب لگائے گی۔

مسئلہ نمبر 14۔ یہ حدیث اپنے حکم کے عام ہونے کے سبب ان تمام زوجات کو شامل ہے جن سے ان کے ازواج فوت ہو جائیں اور ان میں لونڈیاں، آزاد عورتیں، بڑی اور چھوٹی سب داخل ہیں۔ اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ لونڈی اور صغیرہ پر احداد نہیں ہے جیسا کہ اسے قاضی ابوالولید الباجی نے بیان کیا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: لونڈی جو کسی کی بیوی ہو وہ جملہ ازواج میں اور عموم اخبار میں داخل ہے اور یہ قول امام مالک، شافعی، ابوثور اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور مجھے اس بارے میں کسی کا اختلاف یاد نہیں ہے۔ اور میں انہیں نہیں جانتا ہوں کہ وہ ام ولد پر احداد ہونے کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔ کیونکہ وہ زوجہ نہیں ہوتی اور احادیث ازواج کے بارے میں وارد ہیں۔

الباجی نے کہا ہے: صغیرہ جب ان عورتوں میں سے ہو جو امر و نہی کی عقل رکھتی ہیں اور اس کے لئے جو حد بیان کی جائے اس کا وہ التزام کرتی ہو تو اسے احداد کا حکم دیا جائے گا اور اگر وہ اپنی صغر سنی کے سبب کسی شے کو نہ جانتی ہو تو ابن مزین نے عیسیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس کے گھر والے اسے ان تمام چیزوں سے روکیں گے جن سے کبیرہ اجتناب کرتی ہے اور یہ (احداد) اس کے لئے لازم ہے اور صغیرہ پر احداد کے واجب ہونے کی دلیل وہ روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت نے اپنی اس بچی کے بارے پوچھا جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں دکھنے لگیں کہ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے؟ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں“ آپ نے یہ دو بار یا تین بار پوچھا تو آپ ہر بار یہی کہتے رہے: ”نہیں“ (1) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عمر کے بارے نہ پوچھا۔ اگر صغر اور کبر کے سبب حکم مختلف ہو جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عمر کے بارے ضرور سوال کرتے تاکہ آپ اس کا حکم بیان فرمائیں اور اس قسم کے مسئلہ میں بیان میں تاخیر جائز نہیں ہوتی اور یہ دلیل بھی ہے کہ وہ جس پر عدت وفات لازم ہے اس پر کبیرہ کی طرح احداد کرنا بھی لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ ابن منذر نے کہا ہے: میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ خضاب بھی اس زینت میں داخل ہے جس سے منع کیا گیا ہے اور انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ سوگ والی عورت کے لئے رنگے ہوئے کپڑے اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے مگر ایسا کپڑا جسے سیاہ رنگ سے رنگا جائے کیونکہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما نے اس کی رخصت دی ہے۔ اور زہری نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اسے چاہئے کہ وہ عصب کا کپڑا نہ پہنے، اور یہ حدیث کے خلاف ہے۔

اور المدونہ میں امام مالک نے کہا ہے: وہ یمن کے عصب کا باریک کپڑا نہیں پہن سکتی اور آپ نے موٹے کپڑے کی گنجائش رکھی ہے۔ ابن قاسم نے کہا ہے: کیونکہ باریک کپڑا رنگے ہوئے کپڑے کے قائم مقام ہے (2) اور وہ ریشم، کتان اور

1۔ سنن ابو داؤد، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 314، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب تحد المتوفی عنہا [illegible] حدیث نمبر 4920، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب [illegible]، جلد 5، صفحہ 113، [illegible]

ریشمی کا باریک اور موٹا کپڑا پہن سکتی ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: ہر اس نے رخصت دی ہے جس نے آپ سے سفید لباس کے بارے کچھ گفتگو کی ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: امام شافعی کا موقف یہ ہے کہ ہر وہ رنگ جو باعث زینت ہو سوگ منانے والی عورت اسے نہیں پہنے گی، چاہے وہ باریک ہو یا موٹا ہو۔ اسی طرح قاضی عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رنگوں میں سے ہر وہ جس کے ساتھ عورتیں اپنے خاوندوں کے لئے زیب و زینت اور حسن کا اظہار کرتی ہیں سوگ منانے والی عورت کو چاہئے کہ وہ اس سے باز رہے۔

اور ہمارے بعض متاخرین شیوخ نے ایسا عمدہ سفید لباس پہننے سے بھی منع کیا ہے جس سے زیب و زینت کی جا سکتی ہے اور اسی طرح نفیس قسم کا سیاہ لباس (پہننے سے بھی منع کیا ہے)۔

ابن المواز نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ زیور نہیں پہن سکتی اگرچہ وہ لوہے کا بنا ہوا ہو، فی الجملہ ہر وہ شے جسے ایک عورت اس طور پر پہنتی ہے کہ اسے حسن و خوبصورتی کے اظہار کے لئے بطور زیور استعمال کیا جاتا ہو سوگ منانے والی عورت اسے نہیں پہن سکتی۔

اور ہمارے اصحاب نے جواہرات، یواقیت اور زمرد پر کوئی نص بیان نہیں کی حالانکہ وہ بھی زیور کے معنی میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 16۔ ہر عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس پر احداد کے واجب ہونے پر سوائے حسن کے تمام علماء نے اجماع کیا ہے۔ حسن نے کہا ہے: احداد واجب نہیں۔ اور انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے عبداللہ بن شداد بن الہاد نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ”تین دن تک سوگ کا لباس پہن لے پھر جو چاہے وہ کر[1]۔“

ابن منذر نے کہا ہے: تمام اہل علم میں سے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ احداد کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور وہ جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دونوں سرمہ لگا سکتی ہیں، خضاب لگا سکتی ہیں اور جو چاہیں وہ کر سکتی ہیں۔ حالانکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے احداد ثابت ہے اور حسن کے پاس بھی یہ احادیث پہنچی ہیں ان سے اسے تسلیم کیا ہے۔ شاید حسن بصری تک یہ احادیث نہیں پہنچیں یا پہنچی تو ہیں لیکن آپ نے اسماء بنت عمیس کی حدیث کے سبب ان کی تاویل کر لی ہے کہ اس نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر سوگ کا اظہار کرنے کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی اور یہ ان کی بیوی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تین دن کی اجازت عطا فرمائی اور پھر تین دن گزرنے کے بعد اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ طہارت کا اہتمام کرے اور سرمہ لگا لے۔ ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم نے کئی وجوہ سے اس کا رد کیا ہے، اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: یہ حدیث شاذ ہے اس کے مطابق عمل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اسحاق نے بھی کہا ہے۔

1۔ سنن ابن سعد، جلد 8، صفحہ 356، مطبوعہ دار صادر بیروت

مسئلہ نمبر 17۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ طلاق والی عورت پر احداد نہیں ہے، چاہے طلاق رجعی ہو یا بائن، ایک ہو یا اس سے زیادہ۔ یہی قول ربیعہ اور عطا کا ہے۔

اور علمائے کوفہ امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ثوری، حسن بن حی، ابو ثور اور ابو عبید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اس پر احداد ہے اور یہی حضرت سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، ابن سیرین اور حکم بن عیینہ کا قول ہے۔

حکم نے کہا ہے کہ احداد متوفیٰ عنہا زوجہا کی نسبت اس پر زیادہ مؤکد اور شدید ہے اور معنی کے اعتبار سے دونوں عدت ہیں جس کے ساتھ نسب کی حفاظت کی جاتی ہے۔

امام شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے کہا ہے: احتیاط اسی میں ہے کہ مطلقہ عورت کو زینت سے بچنا چاہئے۔ ابن منذر نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ تین دنوں سے زیادہ کسی میت پر سوگ کا اظہار کرے مگر خاوند پر چار مہینے اور دس دن (1) (سوگ منائے)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہو جائیں اور طلاق دینے والا زندہ ہو اس پر احداد نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ایسی طلاق دی جس میں وہ رجوع کا مالک ہو پھر وہ عدت گزرنے سے پہلے فوت ہو جائے تو عورت پر عدت وفات ہوگی اور وہ اس کی وارث بھی ہوگی۔ اور وہ عورت جسے حالت مرض میں تین طلاقیں دی جائیں اس کی عدت میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ عدت طلاق گزارے گی (2)۔ یہ قول امام مالک، امام شافعی، یعقوب، ابو عبید اور ابو ثور رحمہم اللہ کا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہی ہم کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیض والی عورتوں کی عدت حیض قرار دی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں دی ہوں پھر اگر وہ فوت ہو جائے تو طلاق دینے والا اس کا وارث نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس کی بیوی نہیں رہی اور جب وہ اس کی بیوی نہیں تو پھر وہ اس کا خاوند بھی نہیں ہوگا۔

اور ثوری نے کہا ہے: دو عدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی اس کے مطابق عدت گزارے گی اور نعمان و محمد نے کہا ہے: اس پر چار مہینے اور دس دن عدت ہوگی اور اس میں تین حیض مکمل کرے گی۔

مسئلہ نمبر 19۔ علماء کا ایسی عورت کے بارے اختلاف ہے جسے اپنے خاوند کے فوت ہونے یا اس کی طرف سے طلاق کی خبر پہنچی۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: طلاق اور وفات کی صورت میں عدت اس دن سے ہوگی جس دن وہ مرا ہے یا طلاق دی ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے اور یہی حضرت مسروق، عطا اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے اور یہی امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ثوری، ابو ثور، اصحاب الرائے اور ابن منذر کا موقف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، جلد 2، صفحہ 804، وزارت تعلیم
2۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب الطلاق، جلد 6، صفحہ 35، مطبعۃ السعادۃ مصر

اور اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچی۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت حسن بصری، قتادہ، عطا خراسانی اور جلاس بن عمرو رضی اللہ عنہم نے کہا ہے۔

اور حضرت سعید بن مسیب اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہما اللہ نے کہا ہے: اگر بینہ قائم ہو جائے تو اس کی عدت یوم وفات یا یوم طلاق سے ہوگی اور اگر بینہ قائم نہ ہو تو اس دن سے جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عدت کو وفات یا طلاق کے ساتھ معلق کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اگر وہ اس کی موت کے بارے جان لے اور احداد چھوڑ دے تو عدت گزر جاتی ہے اور جب اس نے علم نہ ہونے کے سبب احداد چھوڑ دیا تو یہ اور زیادہ آسان ہے کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ صغیرہ کی عدت گزر جاتی ہے اور اس پر احداد نہیں ہوتا اور یہ بھی کہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو اور وہ خاوند کی طلاق یا اس کی وفات کا علم نہ رکھتی ہو پھر وہ اپنا حمل وضع کر لے تو بلاشبہ اس کی عدت گزر گئی اور اس مسئلہ اور مختلف فیہا مسئلہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور ان کی دلیل جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی عدت اس دن سے ہوگی جس دن اس کے پاس خبر پہنچے گی یہ ہے کہ زیب و زینت ترک کرنے کے سبب عدت عبادت ہے اور وہ قصد اور نیت کے بغیر صحیح نہیں ہوتی اور قصد نہیں ہو سکتا مگر علم کے بعد۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 20۔ آزاد، لونڈی، صغیرہ، کبیرہ، وہ عورت جو حیض کی عمر کو نہ پہنچے، وہ جو حائضہ ہو اور حیض سے نا امید ہو جائے اور کتابیہ عورت اس کے ساتھ دخول ہوا یا نہیں جبکہ وہ غیر حاملہ ہو ان تمام پر عدت وفات لازم ہوتی ہے اور سوائے لونڈی کے ان تمام کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ کیونکہ اس ارشاد میں آیت عام ہے: **يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا** اور وہ لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت دو مہینے اور پانچ راتیں ہیں۔

ابن عربی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس کی عدت بالاجماع آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے مگر وہ جو اصم سے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے آزاد اور لونڈی کو اس میں برابر قرار دیا ہے، حالانکہ اجماع اس سے پہلے ہے لیکن اپنے بہرے پن کے سبب (1) اس نے سنا نہیں۔

الباجی نے کہا ہے: اس بارے میں ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے سوائے اس کے جو ابن سیرین سے مروی ہے اور وہ ان سے ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہے: لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کی مثل ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اصم کا قول من حیث النظر صحیح ہے کیونکہ وہ آیات جو مہینوں اور حیضوں کے ساتھ وفات اور طلاق کی عدت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں وہ لونڈی اور آزاد کے حق میں عام ہیں۔ پس اس نقطہ نظر سے آزاد اور لونڈی کی عدت برابر ہے۔ کیونکہ عمومات میں آزاد اور لونڈی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جس طرح نکاح میں لونڈی اور آزاد برابر ہیں اسی طرح وہ عدت میں بھی اس کے ساتھ برابر ہوگی۔ واللہ اعلم

ابن عربی نے کہا ہے: امام مالک سے روایت ہے کہ کتابیہ عورت تین حیضوں کے ساتھ عدت گزارے گی جب اس سے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 210، دارالفکر

براءت رحم ہوگی اور یہ آپ سے انتہائی فاسد قول منقول ہے، کیونکہ اس قول نے اسے (کتابیہ کو) آیت وفات کے عموم سے خارج کر دیا ہے حالانکہ وہ اس میں شامل ہے اور اس نے اسے آیت طلاق کے عموم میں داخل کر دیا ہے حالانکہ یہ اس میں سے نہیں ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس کی بنا ہے جو مدونہ میں ہے اس پر عدت نہیں اگر وہ غیر مدخول بہا ہو کیونکہ اس کی براءت رحم معلوم ہے اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد کسی مسلمان یا غیر مسلم سے شادی کر سکتی ہے کیونکہ جب اس پر عدت وفات نہیں ہے اور نہ ہی دخول کے سبب استبراء رحم لازم ہے تو پھر وہ ازواج کے لئے حلال ہے۔

مسئلہ نمبر 21۔ اور علماء نے ام ولد کی عدت کے بارے اختلاف کیا ہے جب اس کا آقا فوت ہو جائے۔

پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ یہی تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ ان میں سے حضرت سعید بن مسیب، حضرت زہری، حضرت حسن بصری رحمہم اللہ اور کئی اور بھی ہیں اور یہی امام اوزاعی اور اسحاق رحمہما اللہ نے کہا ہے۔

اور ابوداؤد اور دار قطنی نے قبیصہ بن ذویب سے اور انہوں نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم پر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مشتبہ نہ بناؤ کہ متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار مہینے دس دن ہے یعنی ام ولد کے حق میں۔ یہ لفظ ابوداؤد کے ہیں اور دار قطنی نے کہا ہے: یہ موقوف ہے۔ اور یہی درست ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ قبیصہ نے عمرو سے سماع نہیں کیا (2)۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور ابو عبید نے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کی عدت تین حیض ہے اور یہی قول حضرت عطاء، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اصحاب الرائے رحمہم اللہ کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ عدت آزادی کی حالت میں واجب ہوئی ہے لہٰذا یہ واجب ہے کہ عدت کامل ہو اور اس کی اصل آزاد عورت کی عدت ہے۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ابو ثور نے کہا ہے: اس کی عدت ایک حیض ہے (3) اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

اور طاؤس سے روایت ہے کہ اس کی عدت اس آزاد عورت کی عدت کا نصف ہے جس کا خاوند فوت ہو جائے اور اسی طرح حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے میں میں یہی کہتا ہوں کہ وہ سب سے قلیل مدت ہے جو کہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دار الفکر

2۔ سنن دار قطنی، باب المہر، جلد 2، صفحہ 310، دار المحاسن للطباعۃ؛ ایضاً سنن ابی داؤد، باب فی عدۃ ام الولد، حدیث نمبر 1964، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المدونۃ الکبریٰ، کتاب عدۃ الطلاق، جلد 5، صفحہ 120، السعادۃ بجوار محافظۃ مصر

اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس میں کوئی سنت نہیں ہے جس کی اتباع کی جائے اور نہ ہی کوئی اجماع ہے جس پر اعتماد کیا جائے۔ آزادی کی حالت میں اس کی عدت میں ان کے اختلاف کا ذکر حالت وفات میں اختلاف کی طرح برابر برابر ہے۔ مگر امام اوزاعی نے کہا ہے کہ آزادی کی حالت میں اس کی عدت تین حیض ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان اقوال میں سے اصح قول امام مالک کا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ پس حیضوں کے انتظار میں یہ شرط ہے کہ وہ طلاق کے سبب ہو۔ پس اس کے ساتھ کسی غیر سبب سے ہونے کی نفی ہوگئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ پس اس کے وجوب کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے کہ انتظار کرنے والی بیوی ہو۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ لونڈی اس کے خلاف ہے اور یہ بھی دلیل ہے کہ بے شک یہ ملک یمین کے سبب موطوءہ لونڈی ہے پس اس کا استبراء رحم ایک حیض سے ہے۔ لونڈی میں اصل یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 22۔ جب یہ ثابت ہوگیا تو کیا ام ولد کی عدت محض استبراء ہے یا عدت ہے؟ پس اس کے بارے ابو محمد نے اپنی معونت میں ذکر کیا ہے کہ ایک حیض استبراء ہے اور عدت نہیں ہے۔ اور المدونہ میں ہے کہ ام ولد پر عدت ہے اور اس کی عدت ایک حیض ہے جس طرح کہ آزاد عورت کی عدت تین حیض ہیں۔ اور اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ جب ہم نے کہا: یہ عدت ہے تو امام مالک نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ وہ کسی سے وعدہ کرے جو اس سے نکاح کرے گا حتیٰ کہ ایک حیض گزر جائے (1)۔

ابن القاسم نے کہا ہے: مجھ تک آپ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ نے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ہی رات گزارے گی اور آپ نے اس کی مدت استبراء کے لئے عدت کا حکم ثابت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ وہ عورت جسے تین طلاقیں ہوں یا ایسی مطلقہ جس پر خاوند کو رجوع کا حق ہو، آزاد ہو یا لونڈی وہ حاملہ ہو اس کا خرچہ خاوند پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: 6) (اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں۔)

اور حاملہ متوفی عنہا زوجہا کے نفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ اسی طرح حضرات جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب، حضرت عطا، حضرت حسن، حضرت عکرمہ، عبدالملک بن یعلیٰ، یحییٰ انصاری، ربیعہ، مالک، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے اور ابو عبید نے اصحاب الرائے سے اسے بیان کیا ہے۔ اس میں دوسرا قول یہ ہے کہ اس کے لئے کل مال سے نفقہ ہوگا اور یہ قول حضرت علی اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، شریح، ابن سیرین، شعبی، ابو العالیہ، نخعی، جلاس بن عمرو، حماد بن ابی سلیمان، ایوب سختیانی، سفیان ثوری اور ابو عبید رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 211، دار الفکر مصر

ابن منذر نے کہا ہے: میں پہلے قول کے مطابق کہتا ہوں، کیونکہ انہوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ہر اس آدمی کا نفقہ جس کے نفقہ پر اسے زندگی میں مجبور کیا جا سکتا ہے مثلاً اس کے بچے، بیوی اور اس کے والدین وہ نفقہ اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو اسی طرح اس کی ازواج میں سے حاملہ کا نفقہ بھی اس سے ساقط ہو جائے گا۔

اور قاضی ابو محمد نے کہا ہے: کیونکہ حمل کا نفقہ دین ثابت نہیں ہے کہ وہ اس کی موت کے بعد اس کے مال سے متعلق ہو جائے، اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تنگدستی کے سبب اس سے ساقط ہو جاتا ہے تو موت کے سبب اس کا ساقط ہونا زیادہ اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا۔ علماء نے ان چار ماہ اور دس دن میں اختلاف کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے لیے وقت مقرر فرمایا ہے کہ کیا ان میں سے وہ ایک بار حیض آنے کی محتاج ہوتی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا ہے: جب وہ عورت موطوءہ ہو تو اس کی براءت رحم نہ ہوگی مگر اس حیض کے ساتھ جو اسے چار مہینے اور دس دن کے دوران آئے گا ورنہ وہ مشکوک ہو جائے گی۔ اور بعض دوسروں نے کہا ہے: اس پر چار ماہ اور دس دن سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنے آپ کو واضح شک میں دیکھے۔ کیونکہ اس مدت میں حیض نہیں آتا یا ان میں سے جو کسی نے اپنے آپ کو پہچان لیا یا اسے پہچان لیا جائے کہ اس کا حیض اسے نہیں آئے گا مگر اس مدت سے زیادہ اور اکثر مدت میں۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَّ عَشْرًا۔ وکیع نے ابو جعفر الرازی سے، انہوں نے ربیع بن انس سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ چار مہینوں کے ساتھ دس دن کو کیوں ملایا گیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیونکہ اتنی مدت میں روح پھونکی جاتی ہے۔ عنقریب سورۃ حج میں اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اصمعی نے کہا ہے: بے شک ہر حاملہ کا بچہ اس کے حمل کی نصف مدت میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس یہ بھی حرکت کرنے لگے گا (یعنی فهی مرکضین ذکر کیا ہے) اور کسی اور نے کہا ہے: ارکضت فهي مرکضة (اس نے حرکت دی پس یہ حرکت کرنے والی ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

و مرکضة صريحي ابوها تهان لها الغلامة والغلام

اس میں مرکضة اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور خطابی نے کہا ہے: قولہ: وَّ عَشْرًا اس سے مراد راتوں سمیت دن ہیں۔ واللہ اعلم

اور مبرد نے کہا ہے: العشر مؤنث لایا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد مدت ہے۔ اس کا معنی ہے وعشر مدد، ہر مدت ایک دن اور ایک رات کی ہے۔ پس رات اپنے دن کے ساتھ مل کر زمانے کی ایک مدت معلوم ہے اور نہ کہا گیا ہے: عشرة نہیں فرمایا راتوں کے حکم کو غلبہ دیتے ہوئے کیونکہ رات دن سے پہلے ہوتی ہے اور ایام ان کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ وَّ عَشْرًا لفظ کے اعتبار سے زیادہ خفیف ہے (1)۔ پس راتوں کو دنوں پر غلبہ دیا جاتا ہے جب یہ تاریخ میں جمع ہو جائیں، کیونکہ مہینوں کی ابتدا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ

رات سے چاند طلوع ہونے کے وقت ہوتی ہے تو جب مہینے کی ابتدا اور پہلا حصہ رات ہے تو پھر رات کو ہی غلبہ دیا جائے گا۔ آپ کہتے ہیں: صمنا خمسا من الشھر ہم نے مہینے سے پانچ روزے رکھے۔ پس راتیں غالب ہوتی ہیں اگرچہ روزہ دن کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور علمائے کوفہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد دن اور راتیں ہیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: پس اگر کسی عقد کرنے والے نے اس سے اس قول کی بنا پر نکاح کیا درآنحالیکہ چار مہینے اور دس راتیں گزر چکی تھیں تو وہ نکاح باطل ہوگا یہاں تک کہ دسواں دن بھی گزر جائے۔

اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جب اس کی مدت چار مہینے اور دس راتیں گزر گئی تو وہ ازدواج کے لئے حلال ہوگئی اور وہ اس لئے کہ انہوں نے عدت کو مبہم دیکھا تو تانیث کو غلبہ دے دیا اور اسے راتوں پر محمول کر دیا۔ اور یہ موقف فقہاء میں سے امام اوزاعی اور متکلمین میں سے ابو بکر الاصم نے اختیار کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے 'وعشرۃ' پڑھا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اجل (مدت) کی نسبت ان (عورتوں) کی طرف کی ہے کیونکہ وہ انہیں کے معاملے کی حد بیان کی گئی ہے اور اس سے مراد ہے عدت کا گزرنا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے اور یہ اس حکم کے ساتھ متعلق ہے جو حکام اور اولیاء کے لئے ہے[1]۔ فِيْمَا فَعَلْنَ اس سے مراد خواستگاری کرنا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہوتا ہے (یعنی) بناؤ سنگھار کرنا اور احداد کو ترک کرنا وغیرہ[2]۔ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی: ایسے طریقے سے جس کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے یعنی ازواج کو دیکھنے کا اختیار اور عقد ہونے سے پہلے مہر مقرر کرنا وغیرہ کیونکہ یہ اولیاء کا حق ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ اولیاء کو اختیار ہے کہ وہ انہیں عدت کے دوران شادی کے لئے بناؤ سنگھار کرنے اور آراستہ ہونے اور حسن و خوبصورتی کا اظہار کرنے سے منع کریں۔ اس میں اسحاق کے اس قول کا رد بھی ہے کہ مطلقہ عورت جب تیسرے حیض میں داخل ہو جائے تو وہ بائنہ ہو جاتی ہے اور پہلے خاوند کے لئے رجعت کا حق منقطع ہو جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے لئے شادی کرنا حلال نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ غسل کر لے اور شریک سے روایت ہے کہ اس کے خاوند کے لئے رجعت کا حق رہتا ہے جب تک وہ غسل نہ کرے اگرچہ بیس سال بعد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ اور یہاں بلوغ الاجل سے مراد تیسرے حیض کے خون میں اس کے داخل ہونے کے ساتھ عدت کا گزرنا ہے اور اس میں غسل کو ذکر نہیں۔ تو جب اس کی عدت گزر گئی وہ ازدواج کے لئے حلال ہو گئی اور بناؤ سنگھار میں سے جو بھی وہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو حدیث مروی ہے اگر وہ ثابت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 314، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً

ہے تو وہ استحباب پر محمول ہوگی۔ واللہ اعلم۔

(اشارہ اس حدیث کی طرف ہے: عن ابن عباس من أن المرأة اذا طعنت في الحيضة الثالثة بانت و انقطعت رجعة الزوج، وهذا القول اسحاق المستقدم وهو ضعيف) حاشیہ قرطبی

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝

"اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں۔ جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے، البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بجز اس کے کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات اور نہ پختہ ارادہ کرو نکاح کی گرہ باندھنے کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہا کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا جُنَاحَ یعنی کوئی گناہ نہیں، جُنَاحَ کا معنی گناہ ہے، یہی معنی شریعت میں اصح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شاق گزرنے والا امر ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ معنی اصح ہے۔ شماخ نے کہا ہے:

إذا تعلو براكبها خليجا تذكر ما لديه من الجناح

اس میں الجناح سے مراد مشقت آمیز امر ہے۔

اور قولہ تعالیٰ: عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ اس میں خطاب تمام لوگوں کو کیا گیا ہے: اور علماء اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے دل میں معتدہ کے ساتھ نکاح کی خواہش رکھتا ہو[1]۔ یعنی عدت وفات میں اشارۃً پیغام نکاح دینے میں تم پر کوئی بوجھ اور گناہ نہیں۔ تعریض تصریح کی ضد ہے۔ اس سے مراد افہام المعنی بالشئ المحتمل له ولغیرہ ہے یعنی کسی معنی کو ایسی شے کے ساتھ سمجھا دینا جو اس معنی اور دوسرے کا احتمال رکھتی ہو اور یہ عرض الشئ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کسی شے کی جانب اور طرف ہے۔ گویا وہ اس طرح مطلوب شے کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ میرے اس قول سے ہے عرفت الرجل یعنی میں نے آدمی کو بطور تحفہ ہدیہ پیش کیا اور حدیث طیبہ میں ہے: ان رکبا من المسلمین عرضوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وابابکر ثیابا بیضا۔ ای اھدوا لھما۔ کہ مسلمان شہسواروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے بطور تحفہ پیش کیے۔ اور کلام کے ساتھ تعریض کرنے والا وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی تک بات اس طرح پہنچاتا ہے کہ وہ اس کا معنی ومفہوم سمجھ جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع امت ہے کہ عدت گزارنے والی عورت کے ساتھ ایسی گفتگو کرنا جو اس کے نکاح کے بارے میں صریح نص ہو اور اس پر متنبہ کرنے والی ہو وہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح اس پر بھی امت کا اجماع ہے کہ اس کے ساتھ ایسی کلام کرنا جو فحش ہو اور جماع کا ذکر کرنا یا ایسی گفتگو جو جماع پر ابھارتی ہو یہ بھی جائز نہیں ہے اور اسی طرح جو کلام بھی اس معنی ومفہوم کے مشابہ ہو گا وہ جائز نہیں اور اس کے سوا جو گفتگو ہے اسے جائز قرار دیا گیا ہے اور تعریض کے جو قریب تر کلام ہے وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول ہے جو آپ نے فاطمہ بنت قیس کے ساتھ کیا: کونی عند ام شریک ولا تسبقینی بنفسک (1) (تو ام شریک کے پاس رہ اور اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ لے جا) اور وہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہو تو بالاجماع اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ زوجہ کی طرح ہے اور رہی وہ عورت جو طلاق بائن کی عدت میں ہو تو صحیح قول یہی ہے کہ اسے تعریضاً پیغام نکاح دینا جائز ہے۔ واللہ اعلم۔

تعریض کی تفسیر میں بہت سے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔ ان کا مجموعہ دو قسموں کی طرف لوٹتا ہے:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اس کا ذکر اس کے ولی سے کرے اور اسے اس طرح کہے لا تسبقنی بھا (تو اس کے بارے مجھ سے (کسی اور کی طرف) آگے نہ بڑھنا۔) اور دوسری قسم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی واسطے کے اس کی طرف اس سے اشارہ کرے۔ اور اسے اس طرح کہے: بلاشبہ میں شادی کا ارادہ رکھتا ہوں یا تو بڑی خوبصورت ہے یا بلاشبہ تو صالحہ اور نیک ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ تجھے خیر و برکت عطا فرمانے والا ہے۔ میں تجھ سے رغبت رکھتا ہوں، کون ہے جو تجھ سے اعراض کر سکتا ہے، بے شک تجھ میں رغبت بہت زیادہ ہے، بلاشبہ مجھے کسی عورت کی حاجت وضرورت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کوئی امر مقدر فرمائے گا تو وہ ہو جائے گا۔

یہ تمام امام مالک اور ابن شہاب کی بیان کردہ تمثیلات ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ یہ کہے: "تو اپنے بارے میں مجھ سے تجاوز نہ کرنا (2)"۔ اور کوئی حرج نہیں کہ وہ اسے کوئی ہدیہ اور تحفہ دے اور یہ کہ عدت کے دوران اس کا کام کاج کر دے جبکہ وہ اس کی شان کے مطابق ہو۔ ابراہیم نے بھی کہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اپنی مدح اور تعریف کرے اور وہ اپنے پسندیدہ افعال اور خاندانی شرافت کا ذکر کرے جس میں اشارۃً شادی کا تذکرہ بھی ہو۔

سکینہ بنت حنظلہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن علی رضی اللہ عنہ میرے پاس اجازت لے کر آئے اور میرے خاوند کے فوت ہونے کے وقت سے ابھی میری عدت نہیں گزری تھی اور انہوں نے کہا: تم ابوجعفر محمد بن علی بن حسین رضی اللہ عنہم نے اس طرح کہا ہے۔

1۔ ... جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ 2۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 618، دار احیاء التراث العربیہ

جانتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری قرابت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے میری قرابت ہے اور عرب میں میرے مقام و مرتبہ کو بھی تو جانتی ہے۔ میں نے کہا: اے ابو جعفر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے، بلاشبہ تم ایسے آدمی ہو جس سے مؤاخذہ کیا جائے گا، تم مجھے میری عدت کے دوران پیغام نکاح دے رہے ہو۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ میں نے تو تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی قرابت کے بارے بتایا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمہ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیوہ ہو چکی تھیں اور ارشاد فرمایا: ”یقیناً تو جانتی ہے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کا پسندیدہ ہوں اور میری قوم میں میرے مقام سے بھی تو آگاہ ہے۔“ یہی پیغام نکاح تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(1) اور معتدہ کے پاس ہدیہ بھیجنا بھی جائز ہے اور یہ بھی تعریض میں سے ہے۔ سحنون اور بہت سے علماء نے یہی کہا ہے اور ابراہیم نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضرت مجاہد نے یہ ناپسند کیا ہے کہ کوئی اسے یہ کہے: ”تو اپنے بارے میں مجھ سے سبقت نہ کر“ اور وہ اسے ہی خفیہ معاہدہ ہونے لے(2)۔

قاضی ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تاویل کی بنا پر جائز ہے جو آپ نے فاطمہ کو فرمایا تھا کہ یہ اس کے لئے اس آدمی کے بارے میں رائے کے طور پر ہے جو اس سے شادی کرے گا نہ کہ اس طور پر کہ اس سے اس نے اپنی ذات کا ارادہ کیا ہو، کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے خلاف ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ: الخطبۃ خاء کے کسرہ کے ساتھ، اس کا معنی ہے کلام اور قصد سے پیغام نکاح دینا اور فعل یا قول سے لطف اندوز ہونا۔ کہا جاتا ہے: خطبہا یخطبہا خطبا و خطبۃ (پیغام نکاح دینا) اور رجل خطاب کثرت سے پیغام نکاح دینے والا آدمی۔ اور اس معنی میں شاعر کا قول بھی ہے:

برح بالعینین خطاب الکثب　　یقول انی خاطب وقد کذب

وانما یخطب عسا من حلب(4)

اور الخطیب اس کا معنی ہے الخاطب پیغام نکاح دینے والا۔ اور الخطیبی کا معنی الخطبۃ (منگنی) ہے۔

عدی بن زید نے کہا ہے وہ جذیمہ الابرش کی طرف سے الزباء کی منگنی کے ارادہ کا ذکر کرتا ہے:

لخطیبی التی غدرت و خانت　　و ہن ذوات غائلۃ لحینا

اور الخطب سے مراد وہ آدمی ہے جو عورت کو پیغام نکاح دیتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے: ہی خطبہ و خطبتہ التی یخطبہا۔ یہ فلاں کی طرف منسوب ہے اور اس کی منگیتر ہے جسے وہ پیغام بھیجتا ہے۔ اور الخطبۃ فعلۃ کے وزن پر ہے جیسے جلسۃ اور قعدۃ۔ اور الخطبۃ خاء کے ضمہ کے ساتھ اس سے مراد وہ کلام ہے جو نکاح وغیرہ میں کہا جاتا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: خطبہ وہ ہے جس کے اول اور آخر میں ہو۔ اور اسی طرح وہ جو فعلۃ کے وزن پر ہو جیسے الاکلۃ

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 224، دار المحاسن قاہرہ
2۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً

(خارش) اور الضغطۃ (تنگی) ایک دفعہ کا بھینچنا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اس کا معنی ہے اس کی عدت گزرنے کے بعد اس سے شادی کرنے کے بارے جو تم پوشیدہ رکھے ہوئے ہو اور چھپائے ہوئے ہو۔ الاکنان کا معنی ہے ڈھانپنا، چھپانا اور مخفی رکھنا۔

کہا جاتا ہے: کننتہ واکننتہ دونوں کا معنی ایک ہے یعنی میں نے اسے چھپائے رکھا۔

اور کہا گیا ہے: کننتہ یعنی میں نے اسے محفوظ رکھا، یہاں تک کہ اسے کوئی آفت نہ آپہنچی، اگرچہ وہ مستور اور چھپا ہوا نہ بھی ہو۔ اور اسی سے بیض مکنون اور دُرّ مکنون ہے (یعنی چھپایا ہوا انڈا اور موتی) اور اکننتہ کا معنی ہے میں نے اسے مخفی رکھا اور میں نے اسے ڈھانپ لیا۔

اور کہا جاتا ہے: کننت الشیء (من الاجرام) جب تو اسے چھپائے کپڑے سے، یا گھر سے یا زمین وغیرہ سے، اور اکننت الامر فی نفسی: میں نے کام کو اپنے دل میں چھپائے رکھا۔ اور عربوں سے یہ جملہ نہیں سنا گیا۔

کننتہ فی نفسی اور کہا جاتا ہے: اکن البیت الانسان گھر نے انسان کو چھپالیا وغیرہا۔

پس اللہ تعالیٰ نے اس سے گناہ کو اٹھا دیا ہے جس نے اخفا اور تعریض کے ساتھ معتدہ سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اینہ وعدہ لینے سے منع فرمایا ہے جو شادی کے بارے صریح ہو اور اس پر اس کی بنا ہو اور وعدے پر اتفاق ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے علم اور جاننے کی رخصت دی ہے، نفوس کے غلبہ اور ان کے مغرور ہونے کے سبب اور انسان کے اس کی ملکیت سے کمزور اور ضعیف ہونے کے سبب۔

مسئلہ نمبر 5۔ شوافع نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ تعریض میں حد واجب نہیں ہوگی۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے تعریضاً پیغام نکاح دینے میں گناہ کو اٹھا لیا ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ قذف کے بارے تعریض کرنا حد کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نکاح میں تعریض کو تصریح کے مقام پر نہیں رکھا۔ ہم نے کہا ہے: یہ (قول) ساقط (الاعتبار) ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پیغام نکاح میں نکاح کے بارے تصریح کی اجازت نہیں دی۔ اور اس نے ایسی تعریض کی اجازت عطا فرمائی ہے جس سے نکاح کو سمجھا جا سکتا ہو۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ تعریض سے قذف سمجھی جائے گی اور عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہوتا ہے اور یہ تعریض کرنے والے پر حد کو ثابت کر دے گا تاکہ فاسق لوگوں کو ایسی تعریض کے ذریعے عزتوں کو ہاتھ میں لینے کا راستہ نہ مل جائے جس سے وہی سمجھا جاتا ہو جو تصریح سے سمجھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے چاہے وہ چھپا ہوا ہو تمہارے دلوں میں یا اعلانیہ ہو تمہاری زبانوں کے ساتھ۔ سو اللہ تعالیٰ نے تعریض کی رخصت دی ہے تصریح نہیں کی۔ حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم انہیں پیغام نکاح دو گے (1)۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اس میں یعنی تم ان سے خفیہ طور پر معاہدہ نہ کرو۔ اس میں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 315، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَعْزِمُوْا عزم کے معنی میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ کہا جاتا ہے: عزم الشیء و عزم علیہ (اس نے شے کا ارادہ کیا اور اس پر پختہ ہو گیا) اور یہاں معنی ہے: ولا تعزموا علی عقدۃ النکاح (اور تم نکاح کی گرہ پختہ نہ کرو) اور یہ ایک واضح امر ہے کہ قرآن کریم سب سے فصیح کلام ہے، پس جو اس میں وارد ہوا ہے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کی صحت و فصاحت میں کوئی شک کیا جا سکتا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (البقرہ: 227) (اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں) اور یہاں فرمایا: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تو اس کا معنی ہے: لا تعزموا علی عقدۃ النکاح فی زمان العدۃ (تم عدت کے دوران نکاح کی گرہ پختہ نہ کرو)۔ پھر اس سے علیٰ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

سیبویہ نے کہا ہے: ضُرب فلان الظھر والبطن یعنی علی الظھر والبطن (فلاں کو پیٹھ اور پیٹ پر مارا گیا)۔ سیبویہ نے کہا ہے: ان اشیاء میں حذف پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

نحاس نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ ولا تعقدوا عقدۃ النکاح ہو کیونکہ تعزموا اور تعقدوا کا معنی ایک ہے (اور تم نکاح کی گرہ کو پختہ نہ کرو) اور کہا جاتا ہے: تعزُموا یعنی زا کے ضمہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ اس سے مراد عدت کا مکمل ہونا ہے اور الکتاب سے یہاں مراد وہ حد ہے جو مقرر کی گئی اور عدت میں سے وہ مقدار ہے جسے بیان کر دیا گیا، لکھ دیا گیا اور اس کا نام کتاب رکھا ہے کیونکہ کتاب اللہ نے اس حد کو بیان کیا ہے اور اسے مقرر کیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: کتاب اللہ علیکم۔

اور اسی طرح فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (النساء) (بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقررہ وقت پر) پس الکتاب کا معنی الفرض (مقرر کردہ) ہے۔ یعنی یہاں تک کہ مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ (حتی یبلغ الفرض أجلہ)

کتب علیکم الصیام یعنی تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے: حتی یبلغ فرض الکتاب أجلہ یعنی کتاب کی مقرر کی ہوئی مدت اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ اس تاویل کی بنا پر الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور پہلی تاویل پر اس میں کوئی حذف نہیں ہے، وہی اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ اللہ تعالیٰ نے عدت کے دوران عقد نکاح کو حرام قرار دیا ہے اپنے اس ارشاد کے ساتھ: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ یہ محکم ہے، اس کی تاویل پر اجماع ہے کہ بلوغ اجلہ سے مراد انقضاء العدۃ (عدت کا گزرنا) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ عدت میں تعریض کو مباح قرار دیا ہے: وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ الآیہ۔

اور علماء نے اس کی اباحت میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے، البتہ انہوں نے تعریض کے الفاظ میں اختلاف کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر

چکا ہے۔ اور انہوں نے اس آدمی کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے جو کسی عورت کو اس کی عدت میں پیغام نکاح دیتا ہے درآنحالیکہ وہ حاملہ ہو یا وہ اس سے وعدہ دیتا ہے اور عدت کے بعد عقد نکاح کرتا ہے اور اس سے پہلی آیت میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

اور انہوں نے اختلاف کیا ہے کہ اگر کسی نے عدت میں نکاح کی گرہ پختہ کر لی اور اس پر اطلاع پائی گئی اور حاکم نے اس کا نکاح فسخ کر دیا اور وہ دخول سے پہلے ہوا تو وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ بھی نکاح میں دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں کے ساتھ نکاح کا ایک خواہشمند ہو سکتا ہے (اور پیغام نکاح بھیج سکتا ہے) امام مالک نے یہی کہا ہے اور ابن القاسم نے المدونہ میں اس باب کے آخر میں بیان کیا ہے جس کے پیچھے ضرب اجل المفقود ہے۔

اور ابن جلاب نے امام مالک سے ایک روایت بیان کی ہے کہ عقد میں تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اگرچہ نکاح کا فسخ دخول سے پہلے ہو (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے نکاح عدت میں کیا ہے۔ پس یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تحریم دائمی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ جب وہ اس کے پاس جائے۔ اور اگر عقد عدت میں ہوا اور وہ اس کے پاس داخل ہوا اس کی عدت گزرنے کے بعد تو پھر مسئلہ یہ ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 5۔ پس اہل علم میں سے ایک قوم نے کہا ہے: یہ عدت میں دخول کی طرح ہے۔ لہٰذا دونوں کے درمیان تحریم ہمیشہ کے لئے ہوگی اور اہل علم میں سے ایک گروہ نے کہا ہے اس سے تحریم ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی۔ اور امام مالک نے کہا ہے: تحریم دائمی ہوگی اور ایک بار کہا: اس سے تحریم ثابت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل واضح ہے۔ آپ کے دونوں قول المدونہ میں طلاق سنت کے بیان میں ہیں اور اگر اس نے عدت میں دخول کیا تو پھر مسئلہ یہ ہے (3)۔

مسئلہ نمبر 6۔ امام مالک، لیث اور اوزاعی رحمہم اللہ نے کہا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور وہ عورت اس کے لئے کبھی حلال نہ ہوگی۔ امام مالک اور لیث نے کہا ہے: ملک یمین کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے مروی کی اس کے ساتھ شادی کو جائز قرار دیا۔ اور انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ دونوں کبھی جمع نہ ہو سکیں گے۔ حضرت سعید نے کہا ہے: اس کے لئے اس کا وہ مہر ہوگا جس کے عوض اس کی فرج حلال کی گئی (4)۔ اسے امام مالک نے موطا میں بیان کیا ہے۔

اور ثوری، علمائے کوفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے: ان کے درمیان تفریق کر دی جائے گی اور تحریم دائمی نہ ہوگی بلکہ ان کے درمیان فسخ نکاح کیا جائے گا پھر وہ اس کی عدت گزارے گی پھر وہ عورت نکاح دینے والوں میں سے ایک عورت نکاح دینے والا ہو جائے گا اور انہوں نے اس پر علماء کے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 2، صفحہ 317، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ موطا امام مالک، صفحہ 504، وزارت تعلیم

اس سے شادی کرنا حرام نہیں ہوتا۔ تو اسی طرح دوران عدت اس کا اس سے وطی کرنا بھی ہے۔ انہوں نے کہا: یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اسے عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔ اور عبدالرزاق نے ثوری عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: وہ دونوں اکٹھے رہ سکتے ہیں جمع ہو سکتے ہیں۔

قاضی ابوالولید الباجی نے المنتقی میں بیان کیا ہے: عدت میں نکاح کرنے والا اس سے خالی نہ ہوگا کہ جب وہ اس کے پاس گیا تو یا وہ اس کے پاس عدت میں جائے گا یا عدت کے بعد۔ پس اگر وہ عدت میں اس کے پاس گیا ہے تو پھر مشہور مذہب یہ ہے کہ تحریم دائمی ہوگی۔ یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور شیخ ابوالقاسم نے التفریع میں بیان کیا ہے کہ جب آدمی عدت میں عورت سے شادی کرتا ہے، چاہے وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو یہ جانتے ہوئے کہ ایسا کرنا حرام ہے تو اس کے بارے دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تحریم دائمی ہوگی (یعنی وہ عورت اس پر حلال نہ ہو سکے گی) جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اور دوسری یہ ہے کہ وہ زنا کرنے والا ہے اور اس پر حد لازم ہے اور بچہ اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا اور اس کے لئے جائز ہے کہ جب اس کی عدت گزر جائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہی امام شافعی[1] اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔
پہلی روایت کی وجہ یہ ہے اور وہی مشہور ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرح فیصلہ کرنے اور لوگوں میں اس کے نافذ ہونے سے ثابت ہے اور آپ کے فیصلے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے تھے اور پھیل جاتے تھے اور آپ سے اختلاف کرنے والا کوئی معلوم نہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ یہ اجماع ہے۔
قاضی ابومحمد نے بیان کیا ہے کہ اسی کی مثل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور اس کے مشہور ہونے اور عام منتشر ہونے کے باوجود دونوں کے ساتھ اختلاف کرنے والا کوئی نہیں۔ یہی اجماع کا حکم ہے۔
اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممنوع وطی ہے اور اس کی تحریم دائمی نہیں۔ جیسا کہ اگر وہ اپنی شادی خود کرے یا نکاح متعہ کرے یا زنا کرے (تو ان سے دائمی تحریم ثابت نہیں ہوتی۔)
اور قاضی ابوالحسن نے کہا ہے: اس بارے میں امام مالک کا مشہور مذہب نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔
اور ابوعمر نے سند بیان کی ہے: حدثنا عبدالوارث بن سفیان حدثنا قاسم بن اصبغ عن محمد بن اسماعیل عن نعیم بن حماد عن ابن المبارک عن اشعث عن الشعبی عن مسروق کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس خبر پہنچی کہ قریش کی ایک عورت سے ثقیف کے ایک آدمی نے اس کی عدت میں شادی کی تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان کے درمیان تفریق کر دی اور ان دونوں کو سزا دی اور فرمایا: تو کبھی اس سے نکاح نہیں کر سکتا اور آپ نے اس کا مہر بیت المال میں دے دیا۔ یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچی تو انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امیر المومنین پر

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 317-318، دار الکتب العلمیہ

کے بعد مصر میں اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور بروع بنت واشق کی حدیث کے مطابق بیان کیا۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: بروع کی حدیث ثابت کرنے میں اختلاف ہے، پس قاضی ابو محمد عبدالوہاب نے ابن ابی زید کے رسالہ کی شرح میں کہا ہے کہ بروع بنت واشق کی حدیث کو حفاظ حدیث اور ائمہ اہل علم نے رد کر دیا ہے اور واقدی نے کہا ہے: یہ حدیث مدینہ طیبہ میں پیش ہوئی تو علماء میں سے کسی نے اسے قبول نہیں کیا اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے جیسا کہ ہم نے آپ سے اور ابن منذر سے ذکر کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کی مثل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور اسی کے مطابق ہم کہتے ہیں اور بیان کیا کہ یہی ابو ثور اور اصحاب الرائے کا قول ہے۔

اور زہری، اوزاعی، مالک، شافعی رحمہم اللہ سے حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے قول کی مثل ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس مسئلہ میں ایک تیسرا قول بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کے لئے میراث نہیں ہوگی یہاں تک کہ مہر ہو (یعنی مہر کے بغیر میراث نہیں ہو سکتی) مسروق نے یہی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف امام مالک نے اختیار کیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مہر مقرر ہونے سے پہلے نکاح کی تفریق ہے پس اس میں مہر واجب نہیں اور اس کی اصل طلاق ہے لیکن جب حدیث صحیح ہے تو اس کے مقابلے میں قیاس فاسد ہے اور ابو محمد عبدالحق نے اپنا مذہب بیان کیا ہے جو حدیث سے موافقت رکھتا ہے۔ الحمدللہ۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: حدیث بروع کو عبدالرزاق نے ثوری عن منصور عن ابراھیم عن علقمہ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کیا ہے اور اس میں ہے: پس معقل بن سنان کھڑے ہوئے اور اس میں ابن مہدی نے ثوری عن فراس عن الشعبی عن مسروق عن عبداللہ کی سند سے بیان کیا اور کہا: معقل بن یسار۔ اور میرے نزدیک صحیح اس کا قول ہے جس نے معقل بن سنان کہا ہے نہ کہ معقل بن یسار (2)۔ کیونکہ معقل بن یسار قبیلہ مزینہ کا آدمی ہے اور یہ حدیث اشجع کی عورت کے بارے ہے جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے ہے نہ کہ مزینہ سے۔ اور اسی طرح اسے داؤد نے شعبی عن علقمہ سے روایت کیا ہے اور اس میں ہے: بنی اشجع کے لوگوں نے کہا، اور معقل بن سنان یوم حرہ میں شہید ہوئے، اور یوم حرہ کے بارے میں شاعر کہتا ہے

الا تلکم الانصار تبکی سراتها ... و اشجع تبکی معقل بن سنان

خبردار! وہ انصار اپنے سرداروں کو رو رہے ہیں اور بنی اشجع معقل بن سنان کو رو رہے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اس میں ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی اگر تم نے ان عورتوں کو طلاق دی جنہیں تم نے مس نہیں کیا اور تَمَسُّوْهُنَّ کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور یہ نافع، ابن کثیر، ابو عمرو، عاصم اور ابن عامر کی قرات ہے اور حمزہ اور کسائی نے تماسوهن باب مفاعلہ سے پڑھا ہے کیونکہ وطی دونوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے اور

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 135، دارالکتب العلمیہ

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب الرجل یتزوج ولا یفرض لہا فیموت، حدیث نمبر 1880، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بھی باب مفاعلہ میں فاعل بمعنی فعل بھی آتا ہے۔ جیسے طارقت النعل (میں نے نعل کو گانٹھا) اور عاقبت اللص (میں نے چور کو سزا دی) اور پہلی قرات اس باب میں مفاعلہ کے معنی کا تقاضا کرتی ہے اس معنی کے اعتبار سے جو کسی سے کیا گیا ہے اور ابو علی نے اسے ترجیح دی ہے کیونکہ دونوں معنی کے افعال اس وزن پر ثلاثی آتے ہیں۔ جیسا کہ نکح، سفد، قرع، دقط اور ضرب الفحل (ان تمام میں جفتی کرنے اور وطی کرنے کا معنی مشترک ہے) اور دونوں قراتیں حسن ہیں۔

اور **أَوْ تَفْرِضُوا** میں أَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ بمعنی واو ہے۔ یعنی ما لم تمسوهن ولم تفرضوا لهن جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **وَكَمْ مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَأْسُنَا بَيَاتًا أَوْ هُمْ قَائِلُونَ** ﴿ (الاعراف) (اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو برباد کر دیا ہم نے انہیں۔ پس آیا ان پر عذاب رات کے وقت یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: **وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ** ﴿ یہ ویزیدون کے معنی میں ہے۔ (الصافات) (اور ہم نے بھیجا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف) اور ارشاد گرامی ہے: **وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا** ﴿ یعنی وکفورا (الدہر) (اور نہ کہنا مانئے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اور یہ قول: **وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ** (النساء: 43) یعنی وجاء احد منکم من الغائط وانتم مرضی او مسافرون ہے۔ (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے)

اور یہ ارشاد: **إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ** (الانعام: 146) اور اسی کی مثل دیگر ارشادات۔ (مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ)

اور اسی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کے مفروضہ کا عطف کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً

پس اگر پہلا ارشاد اس سے قبل مفروضہ کی طلاق کے بیان کے لئے ہوتا تو اس کا دوبارہ ذکر نہ فرماتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: **وَمَتِّعُوهُنَّ** اس کا معنی ہے تم انہیں کوئی ایسی شے دو جو ان کے لئے متعہ بن سکتی ہو۔ حضرت ابن عمر، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بن ابی حسن، حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابو قلابہ، حضرت زہری، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک بن مزاحم رحمہم اللہ نے اسے وجوب پر محمول کیا ہے۔

اور ابو عبید، امام مالک بن انس اور ان کے اصحاب اور قاضی شریح وغیرہ رحمہم اللہ نے اسے ندب پر محمول کیا ہے۔(1)

پہلے قول والوں نے مقتضائے امر سے استدلال کیا ہے (یعنی الامر للوجوب) اور دوسرا قول کرنے والوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: حقا علی المحسنین اور علی المتقین اور اگر یہ واجب ہوتا تو پھر اس کا اطلاق تمام مخلوق پر ہوتا اور پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے۔ کیونکہ امر کے عموم میں ہے متعوهن کے قول میں امتاع ہے اور امتاع کی اضافت ان کی طرف لام تملیک کے ساتھ ہے۔ اس ارشاد میں وللمطلقات متاع اس میں وجوب ندب سے زیادہ ظاہر ہے اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 319، دار الکتب العلمیہ

کے بارے جاننے والا ہے۔

دارقطنی نے حدیث ذکر کی ہے۔ بیان کیا ہے کہ یہ آیت لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الآیہ انصار کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے مہر مقرر نہ کیا پھر اسے چھونے سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اسے متعہ دے اگرچہ وہ تیری ٹوپی ہی ہو" متعها ولو بقلنسوتك۔(1)

اور دارقطنی نے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ عائشہ خثعمیہ حضرت امام حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کر لی گئی تو اس نے کہا: اے امیر المومنین! تجھے خلافت مبارک ہو۔ تو آپ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور تو خوشی کا اظہار کر رہی ہے! اذهبی فانت طالق ثلاثا تو جا تجھے تین طلاقیں ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ اس نے اپنا کمبل لپیٹ لیا اور بیٹھ گئی یہاں تک کہ اس کی عدت گزر گئی۔ پس آپ نے اس کی طرف بطور متعہ دس ہزار اور اس کے مہر میں سے جو کچھ باقی تھا وہ سب بھیج دیا۔ تو اس نے کہا:

متاع قلیل من حبیب مفارق

جدا ہونے والے محبوب کی نسبت متعہ انتہائی قلیل ہے۔

پس جب آپ کے پاس اس کا یہ قول پہنچا تو آپ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اپنے جد امجد سے نہ سنا ہوتا یا میرے باپ نے مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے میرے جد امجد سے سنا۔ آپ فرماتے ہیں: وہ آدمی جس نے اپنی بیوی کو تین مبہم یا اقراء کے وقت تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور زوج سے شادی کر لے تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔(2)

ایک روایت میں ہے کہ قاصد نے انہیں اس کی خبر دی اور وہ رونے لگے اور فرمایا: اگر میں نے اسے طلاق کے ساتھ مکمل جدا نہ کر دیا ہوتا تو میں اس کی طرف رجوع کر لیتا۔ لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں یا ہر طہر کے وقت ایک طلاق یا ہر مہینے کے شروع میں ایک طلاق یا اسے اکٹھی تین طلاقیں دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ کسی اور خاوند سے شادی کرے (ايما رجل طلق امراته ثلاثا عند كل طهر تطليقة او عند راس كل شهر تطليقة او طلقها ثلاثا جميعا لم تحل له حتى تنكح زوجا غيره)(3)

مسئلہ نمبر 9۔ وہ آدمی جو متعہ سے جاہل اور ناواقف ہو یہاں تک کہ کئی سال گزر گئے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے دے اگرچہ وہ شادی بھی کر لے۔ اور اگر وہ عورت فوت ہو جائے تو اس کے ورثاء کو دے۔ اسے ابن مواز نے ابن قاسم سے روایت کیا ہے۔ اور اصبغ نے کہا ہے: اگر عورت فوت ہو جائے تو پھر اس پر کوئی شے لازم نہیں ہے کیونکہ متعہ طلاق کی وجہ سے پہنچنے والے غم کے سبب عورت کو تسلی دینے کے لئے ہے اور وہ مقصود فوت ہو چکا ہے اور پہلے قول کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حق ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 324، دار الفکر
2۔ سنن دارقطنی، کتاب الطلاق، جلد 4، صفحہ 30، دار المحاسن قاہرہ
3۔ ایضاً

نَصِیف۔ یہ تینوں نصف کے بارے میں لغات ہیں اور حدیث میں ہے: فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم ولا نصیفہ۔ ای نصفہ۔ (1) (یعنی اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرے تو وہ ان میں سے کسی کے مد کو نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس کے نصف کو) اور نصیف کا معنی القناع (اوڑھنی دوپٹہ) بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جب آدمی نے عورت کو مہر دے دیا پھر اسے قبل از دخول طلاق دے دی اور مہر عورت کے قبضے میں بڑھ گیا یا کم ہو گیا تو امام مالک نے فرمایا ہے: کل سامان جو مرد نے اسے بطور مہر دیا یا غلام تو دونوں کی بڑھوتری دونوں (مرد و عورت) کے لئے ہو گی اور اس کا نقصان بھی دونوں کے درمیان تقسیم ہو گا۔

اور اس کی ہلاکت بھی ان دونوں پر ہی پڑے گی، اس صورت میں اس میں سے عورت پر کوئی شے نہ ہو گی۔ اور اگر اس نے سونے یا چاندی کی معینہ مقدار بطور مہر دی اور اس نے اس کے ساتھ غلام یا گھر خرید لیا یا اس کے عوض ان کا کچھ حصہ خرید لیا یا اس کے سوا خوشبو یا گھر کا ساز و سامان یا اس کے علاوہ کوئی ایسی شے خریدی جس میں عورت کا تصرف ہو یعنی جو حاجت و ضرورت کے لئے اور مرد کے ساتھ اس گھر میں رہنے کی خاطر اپنے معاملات کی اصلاح کے لئے ہو تو وہ تمام کا تمام اسی کے قائم مقام ہے گویا مرد نے وہی بطور مہر دیا اور اس کی نمو اور کمی دونوں کے درمیان منقسم ہو گی۔

اور اگر اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی تو پھر اس کے لئے نصف کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ عورت پر یہ لازم ہے کہ وہ مرد کو اس مہر کا نصف بطور قرض ادا کرے جس پر اس نے قبضہ کیا ہے۔ اور اگر عورت نے کل مہر یا اس کے کچھ حصہ کے ساتھ کوئی شے خریدی تو وہ اس کے ساتھ مختص ہو جائے گی اور عورت پر مرد کے لئے اس مہر کا نصف بطور قرض ہو گا جس پر عورت نے قبضہ کیا ہے اور اسی طرح اگر عورت نے کسی غیر سے غلام یا گھر خریدا اس ہزار کے عوض جو مرد نے اسے بطور مہر دیا تھا پھر اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی تو وہ اس پر ہزار کے نصف کے لئے رجوع کر سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے اپنی بیوی کے ساتھ مجامعت کی پھر فوت ہو گیا اور آدمی نے اس کے لئے مہر مقرر کیا تھا تو اس عورت کے لئے وہ کامل مہر بھی ہو گا اور میراث بھی ہو گی اور اس پر عدت بھی ہو گی۔

اور علماء نے ایسے آدمی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو عورت کے ساتھ خلوت تو اختیار کرتا ہے اور اس سے مجامعت نہیں کرتا یہاں تک کہ اسے جدا کر دیا۔ تو علمائے کوفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر تو مہر واجب ہو گا اور عورت پر عدت بھی ہو گی، کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، انہوں نے کہا: خلفائے راشدین نے اس آدمی کے بارے میں فیصلہ فرمایا جس نے دروازہ بند کر لیا یا پردہ لٹکا دیا تو اس عورت کے لئے میراث ہو گی اور اس پر عدت بھی ہو گی (2)۔ یہ مرفوع روایت بھی ہے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور امام شافعی کامل مہر واجب نہیں کرتے اور نہ ہی عورت پر عدت ہو گی جبکہ دخول نہ ہو۔ ظاہر قرآن کریم اس کی تائید کرتا

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، جلد 1، صفحہ 518، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، ... حدیث نمبر 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ السنن الکبریٰ، جلد 7، صفحہ 255، دار الفکر

ہے۔ شریح نے کہا ہے: میں نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں باب یا ستر کا ذکر کیا ہو جبکہ آپ کا خیال یہ ہے کہ چونکہ مرد نے عورت کو مس نہیں کیا لہٰذا اس کے لئے نصف مہر ہوگا۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مذہب ہے۔ اور اس بارے میں ہمارے علماء کا موقف عنقریب سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کریم کے اس ارشاد کے تحت: وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ الآیۃ۔

اس میں إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ استثنا منقطع ہے۔ کیونکہ ان کا نصف معاف کرنا ان کے لینے کی جنس میں سے نہیں ہے۔ اور يَعْفُونَ کا معنی یترکن (وہ چھوڑ دیتی ہیں) اور تسقطن (وہ درگزر کرتی ہیں) ہے اور اس کا وزن يَفْعَلْنَ ہے۔ معنی یہ ہے مگر یہ کہ وہ اس نصف کو چھوڑ دیتی ہیں جو ان کے لئے زوج پر واجب ہوتا ہے اور ان داخل ہونے کے باوجود نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ مضارع میں جمع مؤنث کا صیغہ رفع، نصب اور جزم کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے اور یہ ضمیر ہے علامت اعراب نہیں ہے۔ پس اسی وجہ سے نون ساقط نہیں ہوا، کیونکہ اگر نون ساقط ہو جائے تو پھر مذکر کے ساتھ اس کا اشتباہ لازم آئے گا۔

اس آیت میں معاف کرنے والیوں میں ہر وہ عورت ہے جو اپنی ذات کے معاملہ کی خود مالک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں مہر ثابت ہو جانے کے بعد اسے ساقط کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اسے خالص ان کا حق بنایا ہے۔ پس وہ اس میں قائم رہ سکتی اور ساقط کرنے کا تصرف کر سکتی ہیں جیسے چاہیں جبکہ وہ اپنے نفسوں کے معاملہ کی مالک ہیں اور وہ بالغ، عاقل اور ہدایت یافتہ بھی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور فقہاء و تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے: اس باکرہ عورت کا معاف کرنا بھی جائز ہوتا ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو اور اسے سحنون نے المدونہ میں ابن قاسم کے سوا کسی اور سے بیان کیا ہے اس کے بعد کہ ابن قاسم نے ذکر کیا ہے کہ اس کا نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں ہے۔ رہی وہ جو باپ یا وصی کے زیر پرورش رہی تو اس کا اپنے نصف مہر کو ساقط کرنا جائز نہیں۔

یہ ایک ہی قول ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں جسے میں جانتا ہوں۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ اس کا عطف پہلے پر ہے، وہ مبنی ہے اور یہ معرب ہے اور حسن نے أَوْ يَعْفُوْ واؤ کو ساکن پڑھا ہے (1)۔ گویا کہ انہوں نے واؤ پر فتحہ کو ثقیل سمجھا ہے۔ لوگوں نے اس ارشاد کے معنی مراد میں اختلاف کیا ہے: أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔ پس دار قطنی نے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بنی نصر کی ایک عورت سے شادی کی اور پھر دخول سے پہلے ہی اسے طلاق دے دی اور اس کی طرف کامل مہر بھیج دیا اور فرمایا: میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (بقرہ: 237) اور میں اس سے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں (2)۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ

2۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ

کی تاویل کی: اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ مراد ایسی ذات ہے جو ہر حال میں طلاق سے پہلے بھی اور طلاق کے بعد بھی۔ یعنی یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں اپنے نکاح کی گرہ ہے (یعنی عبارت ہے: عقدۃ نکاحہ)۔ پھر جب الف لام داخل کیا گیا تو ہا کو حذف کر دیا گیا جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ یعنی ماواہ اور نابغہ نے کہا ہے:

لهم شيمة لم يعطها الله غيرهم   من الجود والاحلام غير عوازب

اس میں الاحلام اصل میں احلامهم ہے۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ: عُقْدَةُ النِّكَاحِ اصل میں عقدة نکاحه ہے۔

دارقطنی نے حضرت قتیبہ بن سعید کی حدیث سے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ ابن لہیعہ نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ولی عقدة النكاح الزوج (1) کہ نکاح کی گرہ کا ولی زوج ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن مسیب اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم سے بھی مسند بیان کی گئی ہے۔ فرمایا: اسی طرح نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاؤس، مجاہد، شعبی اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہم نے بھی کہا ہے اور اس کے سوا نے حضرت مجاہد اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ کیا ہے۔ اسے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے اور امام شافعی کے قول سے بھی یہی صحیح ہے۔ یہ تمام کے تمام عورت کے مہر میں سے کسی شے پر ولی کے لئے کوئی حق نہیں رکھتے۔ اس پر اجماع ہونے کی وجہ سے کہ ولی اگر زوج کو طلاق سے پہلے مہر سے بری کر دے تو یہ جائز نہیں ہے اور اسی طرح طلاق کے بعد بھی ہے۔

اور اس پر بھی اجماع ہے کہ ولی اس کے مال میں سے کوئی شے ہبہ کرنے کا مالک نہیں ہوتا اور مہر بھی اس کا مال ہے۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اولیاء میں سے وہ بھی ہیں جن کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا اور وہ چچا کے بیٹے اور بھائیوں کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح باپ بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

اور ان میں سے وہ بھی ہے جس نے کہا وہ ولی ہے، اسے دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بیان کیا ہے (2)۔ انہوں نے کہا ہے: یہی ابراہیم، علقمہ اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے اور اس کے سوا حضرت عکرمہ، طاؤس، عطاء، ابو الزناد، زید بن اسلم، ربیعہ، محمد بن کعب، ابن شہاب، اسود بن یزید، شعبی، قتادہ، مالک اور شافعی کے قدیم قول نے اس میں اضافہ کیا ہے۔

اور باپ کے لئے اپنی باکرہ بیٹی کا نصف مہر معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب اسے طلاق ہو جائے، چاہے وہ حیض کی عمر کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

عیسیٰ بن دینار نے کہا ہے: وہ اس میں سے کسی شے کے لئے اپنے باپ کی طرف رجوع نہیں کرے گی اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں ارشاد فرمایا ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (البقرہ: 237) پس ازواج کا ذکر کیا اور اس خطاب کے ساتھ انہیں خطاب فرمایا، پھر فرمایا: اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ پس عورتوں کا ذکر کیا۔ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ تو یہ تیسرا حصہ ہے اسے اس زوج کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا جس کا ذکر پہلے ہوا مگر یہ کہ اس کے سوا کوئی موجود نہ ہو، حالانکہ وہ پایا گیا

1۔ سنن دارقطنی، کتاب النکاح، جلد 3، صفحہ 279، دار المحاسن قاہرہ 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 280

ہے اور وہ ولی ہے اور وہی مراد ہے۔ اس کا یہ معنی مکی نے بیان کیا ہے اور اسے ابن عربی نے ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اور یہ معلوم شدہ ہے کہ ہر عورت معاف نہیں کر سکتی، کیونکہ صغیرہ اور وہ عورت جس پر پابندی ہو ان کے لئے معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دونوں قسموں کو بیان فرمایا اور فرمایا: اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ یعنی اگر وہ اس کے اہل ہوں اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ اور اس سے مراد ولی ہے کیونکہ اس میں اختیار اسی کے پاس ہے۔

اور اسی طرح ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم اور ابن قاسم نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ ہے اور یہی لونڈی کے حق میں آقا ہے۔ اور بلاشبہ ولی کا معاف کرنا جائز ہوتا ہے جب کہ وہ صائب الرائے لوگوں میں سے ہو اور اس کا معاف کرنا جائز نہیں ہوتا جبکہ وہ بیوقوف اور احمق ہو۔

اور اگر کہا جائے: ہم تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مراد ولی ہے بلکہ اس سے مراد زوج ہے اور یہ اسم اس کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ یہ ولی کی نسبت عقد کرنے کا زیادہ مالک ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

تو جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ باکرہ بیٹی کے حق میں باپ کی نسبت زوج عقد کا زیادہ مالک ہوتا ہے، بلکہ وہاں تو صرف باکرہ کا باپ ہی مالک ہوتا ہے نہ کہ زوج، کیونکہ جس پر عقد کیا گیا ہے وہ باکرہ کی بضع ہے اور زوج اس کا عقد کرنے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ باپ اس کا مالک ہوتا ہے۔

اور شریح نے بھائی کے نصف مہر معاف کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اسی طرح عکرمہ نے کہا ہے: اس کا معاف کرنا بھی جائز ہے جس نے دونوں کے درمیان عقد نکاح کیا ہے چاہے وہ چچا ہو یا باپ ہو یا بھائی ہو۔ اگرچہ وہ ناپسند بھی کرے۔

ابو نہیک اور شعبی نے اَوْ یَعْفُوْ واؤ کو الف کے مشابہ قرار دے کر اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کی مثل شاعر کا قول بھی ہے:

فما سوّدتني عامر عن وراثة ۔۔۔ أبى الله أن أسمو بأم ولا أب

اس میں اسمو کی واؤ کو سکون کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور تعفوا دراصل تعفووا ہے پہلی واؤ کو ساکن کر دیا گیا اس پر حرکت ثقیل ہونے کی وجہ سے، پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ خطاب مردوں اور عورتوں کو ہے اور مردوں کو اس میں غلبہ دیا گیا ہے۔ اور لام بمعنی الی ہے یعنی اقرب الی التقوی۔

اور جمہور نے اسے تعفوا تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو نہیک اور شعبی نے وان یعفوا یاء کے ساتھ قراءت کی ہے۔ یہ ضمیر اسی کی طرف راجع ہے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے(1)۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 321، دار الکتب العلمیہ

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسے وان تعفون تاء کے ساتھ نہیں پڑھا گیا کہ یہ عورتوں کے لئے ہو۔

اور جمہور نے وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ کو واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یحییٰ بن یعمر نے اسے کسرہ دیا ہے۔ اور حضرت علی، مجاہد، ابو حیوہ اور ابن ابی عبلہ رضی اللہ عنہم نے ولا تناسوا الفضل پڑھا ہے۔ اور یہ قراءت معنی کو پختہ کرنے والی ہے، کیونکہ یہ تناسی (بھولنے کا بہانہ کرنا) کا محل ہے نہ کہ نسیان کا، مگر تشبیہ کی بنا پر۔

مجاہد نے کہا ہے: الفضل سے مراد مرد کا کامل مہر مکمل کرنا ہے یا عورت کا اپنے نصف مہر کو چھوڑ دینا ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ یہ خبر اپنے ضمن میں محسن کے لئے وعدہ اور غیر محسن کے لئے محرومی لئے ہوئے ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر تمہارا معاف کرنا اور تمہارا پورا مطالبہ کرنا مخفی نہیں ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ۝

"پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حٰفِظُوْا یہ خطاب تمام امت کو ہے اور یہ آیت نمازوں کو ان کے اوقات میں ان کی تمام شرائط کے ساتھ قائم کرنے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرنے کا حکم ہے۔

اور محافظۃ کا معنی کسی شے پر مداومت اور مواظبت اختیار کرنا ہے اور الوسطیٰ، الاوسط کا مؤنث ہے اور کسی شے کا وسط اس کا بہترین، عمدہ اور مناسب ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا اس کی تفصیلی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور ایک اعرابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے کہا:

یا اوسط الناس طرا فی مفاخرہم ۔۔۔ واکرم الناس اما برۃ و ابا

اور وسط فلان القوم یسطہم یعنی فلاں ان کے وسط میں ہو گیا۔ اور الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کا علیحدہ اور منفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ الصلوات کے عموم میں بھی وہ داخل ہے تو اس کی عظمت اور مرتبہ کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7) (اور اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے) (اس میں منک اور من نوح کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے حالانکہ نبیین کے عموم میں یہ داخل تھے۔ تو یہ اظہار شرف و مرتبہ کے لئے ہے) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ (الرحمن) (ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے۔)

(فاکھۃ کے عموم میں داخل ہونے کے باوجود نخل اور رمان کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے۔)

ابو جعفر الرواسی نے وَالصَّلٰوةَ الْوُسْطٰى کو اغراء کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے یعنی تقدیر عبارت ہے: والزموا الصلوٰۃ الوسطیٰ (تم صلوٰۃ وسطیٰ کو لازم پکڑو) اور اسی طرح حلوانی نے بھی پڑھا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

اور قالون نے نافع سے الوسطیٰ صاد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ طاء اس کی مجاورت میں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہی محل میں سے ہیں۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ صراط وغیرہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ لوگوں نے وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی تعیین میں اختلاف کیا ہے اس پر دس اقوال ہیں۔

(1) اس سے مراد ظہر ہے، کیونکہ یہ نماز دو قولوں میں سے صحیح قول کی بنا پر دن کے وسط میں ہے کہ دن کا آغاز طلوع فجر سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور ہم نے ظہر سے ابتدا کی ہے کیونکہ یہی وہ پہلی نماز ہے جو اسلام میں ادا کی گئی۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ہے ان میں سے حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبد اللہ بن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور ان روایات میں سے جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ایک وہ ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، جس وقت ان دونوں نے املا کرائی حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ اسے واؤ کے ساتھ بیان کیا (1)۔

اور روایت ہے کہ یہ مسلمانوں پر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے کیونکہ یہ تیز گرمی کے وقت میں آتی ہے اور تحقیق انہیں اپنے اموال میں کاموں نے خوب تھکا رکھا ہوتا ہے۔

اور ابوداؤد نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز سخت گرمی میں ادا فرماتے تھے اور کوئی ایسی نماز نہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر اس سے زیادہ شاق اور مشقت آمیز ہوتی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى اور یہ بھی فرمایا: اس سے پہلے بھی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد بھی دو نمازیں ہیں (2)۔ اور امام مالک نے مؤطا میں اور ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: صلوٰۃ وسطیٰ صلوٰۃ ظہر ہے (3)۔

طیالسی نے یہ زیادہ کہا ہے: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے سخت گرمی کے وقت میں ادا فرماتے تھے۔

(2) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز عصر ہے، کیونکہ اس سے پہلے دن کی دو نمازیں ہیں اور اس کے بعد رات کی دو نمازیں ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اس استدلال میں سے عمدہ اور اچھی یہ ہے کہ یہ نماز ہے جس کے لئے وسطیٰ کہا گیا ہے کیونکہ یہ دو نمازوں کے درمیان ہے ان میں سے ایک وہ ہے جو سب سے اول فرض کی گئی اور دوسری وہ نماز ہے جو دوسرے نمبر پر فرض کی گئی۔

اور جنہوں نے کہا ہے کہ یہی نماز صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم ہیں (4)۔ یہی امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ کا مختار ہے۔ امام شافعی

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 69، وزارت تعلیم

3۔ مؤطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم

4۔ صحیح بخاری، باب الدعاء علی المشرکین، حدیث 5917، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بعض علماء اور اکثر اہل الاثر نے یہی کہا ہے اور عبدالملک بن حبیب نے بھی یہی موقف اپنایا ہے اور ابن عربی نے بھی القبس میں اور ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں اسے ہی اختیار کیا ہے اور کہا ہے: اسی قول پر جمہور لوگ ہیں اور یہی میں بھی کہتا ہوں۔

اور انہوں نے اس باب میں وارد ہونے والی احادیث سے استدلال کیا ہے انہیں مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے اور میں ان میں سے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیان کروں گا۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "الصلاۃ الوسطی صلاۃ العصر" صلاۃ وسطی نماز عصر ہے۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1) اور ہم اس سے زیادہ احادیث "القبس فی شرح موطا مالک بن انس" میں لائے ہیں۔

(۳) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد نماز مغرب ہے۔ قبیصہ بن ابی ذؤیب نے ایک جماعت میں یہی کہا ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ یہ رکعتوں کی تعداد میں متوسط ہے نہ رکعتوں کی تعداد بہت کم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ ہے اور نہ ہی سفر میں اس کی قصر کی جاتی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسے نہ اپنے وقت سے مؤخر کیا ہے اور نہ ہی اسے جلدی ادا فرمایا ہے اور اس کے بعد دو نمازیں جہری ہیں اور اس سے پہلے دو نمازیں سری ہیں اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل ترین نماز مغرب ہے۔ اس نے اسے نہ کسی مسافر سے ساقط کیا اور نہ کسی مقیم سے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ رات کی نماز کا آغاز کیا اور اس کے ساتھ دن کی نمازوں کو ختم کر دیا۔ پس جس نے مغرب کی نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک محل بنائے گا اور جس نے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے بیس سال کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ یا فرمایا چالیس سال کے"۔

(۴) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء کی نماز ہے کیونکہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان ہے جن کی قصر نہیں کی جاتی اور یہ نیند کے وقت میں آتی ہے اور اس میں تاخیر کرنا مستحب ہوتا ہے اور یہ شاق اور گراں ہوتی ہے لہٰذا اس کی محافظت کی تاکید فرمائی۔

(۵) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح کی نماز ہے، کیونکہ اس سے پہلے رات کی دو نمازیں ہیں جن میں قراءت بالجہر کی جاتی ہے اور اس کے بعد دن کی دو نمازیں ہیں جن میں سراً قراءت کی جاتی ہے اور اس لئے بھی کہ اس کا وقت داخل ہوتا ہے اور لوگ سوئے ہوتے ہیں اور اس کے لئے سردی کے موسم میں سردی کی شدت کی وجہ سے اٹھنا اور گرمی کے موسم میں رات کے چھوٹا ہونے کے باعث اٹھنا شاق اور مشکل ہوتا ہے۔

اور جنہوں نے کہا کہ یہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے ان میں سے حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ اسے موطا نے بلاغاً ذکر کیا ہے۔ (یعنی امام مالک نے اسے حکایت فرمایا کہ ان دونوں سے یہ خبر ان کے پاس پہنچی ہے) اور ترمذی نے اسے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ (معلق ایسی روایت ہے جو غیر مسند ہو) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی امام مالک اور آپ کے اصحاب کا قول ہے اور اسی کی طرف امام شافعی کا میلان ہے اس میں جو آپ سے قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ نماز عصر ہے اور آپ

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی صلوٰۃ الوسطیٰ، حدیث نمبر 165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سے یہ صحیح اور معروف سند سے مروی ہے۔(1)

اور جنہوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ صبح کی نماز ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ یعنی فیھا (اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے اس میں عاجزی کرتے ہوئے) (لیکن استدلال کرنے والوں نے ترجمہ کیا قنوت پڑھتے ہوئے۔) اور صبح کی نماز کے سوا کوئی فرض نماز نہیں ہے جس میں قنوت ہو۔ ابورجاء نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہمیں بصرہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور اس میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھائی اور اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس میں قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے رہیں۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی(2)۔ قنوت کا حکم آگے آئے گا اور اس بارے میں علماء کی جو آراء ہیں سورۃ آل عمران میں اس ارشاد کے تحت: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آل عمران:128)

(1) اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد جمعہ کی نماز ہے کیونکہ اس کے لئے جمع ہونے اور اس میں خطبہ ہونے کے سبب اسے خاص کیا گیا ہے اور اسے عید بنایا گیا ہے۔ ابن حبیب اور مکی نے یہ ذکر کیا ہے۔ اور مسلم نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس قوم کے لئے جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں لقد ھممت ان آمر رجلا یصلی بالناس ثم احرق علی رجال یتخلفون عن الجمعۃ بیوتھم(3) میں نے یہ ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو لوگوں کو نماز پڑھانے کے لئے حکم دوں پھر ان لوگوں کو ان کے گھروں میں جلادوں جو جمعہ کی نماز سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

(ے) اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد صبح اور عصر کی دونوں نمازیں ہیں۔ شیخ ابوبکر الابہری نے یہی کہا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل و ملائکۃ بالنھار الحدیث(4) (تم میں رات اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں۔) اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

اور حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا: اما انکم ستعرضون علی ربکم فترونہ کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رؤیتہ فان استطعتم الا تغلبوا علی صلاۃ قبل طلوع الشمس و صلاۃ قبل غروبھا یعنی العصر والفجر۔ (بے شک عنقریب تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ تمہیں اس کی رؤیت میں کوئی مشقت نہ ہوگی۔ پس اگر تم

1۔ صحیح بخاری، باب السعی بین الصفا و المروۃ، حدیث نمبر 5017، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 237، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب القنوت قبل الرکوع، حدیث نمبر 946، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 232، وزارت تعلیم
4۔ صحیح بخاری، کتاب المواقیت، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 522، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استطاعت رکھو تو مغلوب نہ ہو) اس نماز کے بارے میں تم مغلوب نہ ہو جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہے اور وہ نماز جو غروب آفتاب سے پہلے ہے) ان سے مراد عصر اور فجر کی نمازیں ہیں۔ پھر حضرت جریر نے یہ آیت پڑھی: وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ: 130)(1) (اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے۔)

اور حضرت عمارہ بن رویبہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ہرگز کوئی آگ میں داخل نہ ہوگا جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھی(2)۔'' ان سے مراد بھی فجر اور عصر کی نمازیں ہیں۔

اور انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من صلی البردین دخل الجنة(3) جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پڑھیں وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہ تمام صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہیں۔ ان دونوں نمازوں کو بردین کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں نمازیں ٹھنڈک کے وقت میں پڑھی جاتی ہیں۔

(۸) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد عشاء اور صبح کی نمازیں ہیں۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے اپنے اس مرض کے دوران فرمایا جس میں ان کا وصال ہوا: تم سنو اور تم اپنے پیچھے آنے والوں کو بھی پہنچاؤ ان دو نمازوں پر محافظت اختیار کرو۔ یعنی جماعت کے ساتھ ادا کرو۔ عشاء اور صبح کی نمازیں اور اگر تم جان لو جو ان دونوں میں (اجر) ہے تو تم ان دونوں کو ادا کرنے کے لئے آؤ اگرچہ تمہیں اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ کر آنا پڑے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے۔

ائمہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر وہ جان لیں جو (اجر) عشاء اور صبح کی نمازوں میں ہے تو وہ ان دونوں کے لئے آئیں اگرچہ گھسٹ کر آنا پڑے اور فرمایا: بے شک یہ دونوں نمازیں منافقین پر بہت سخت اور بھاری ہیں(4)۔'' اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے والے کے لئے پوری رات قیام کرنے اور عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے والے کے لئے نصف رات قیام کرنے کا (اجر) رکھا گیا ہے۔ اسے امام مالک نے موقوف علی عثمان ذکر کیا ہے اور مسلم نے اسے مرفوع ذکر کیا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے آپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من شهد العشاء في جماعة كان له قيام نصف ليلة ومن صلى العشاء والفجر في جماعة كان له كقيام ليلة(5) جو آدمی عشاء کی جماعت میں حاضر ہوا اس کے لئے نصف رات کا قیام کرنے کا اجر ہے اور جس نے عشاء اور فجر کی نمازیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم
2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح ترمذی، باب فضل صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 521، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 288، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب فضل صلوٰۃ الفجر، حدیث نمبر 540، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 322، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب فضل العشاء فی الجماعۃ، حدیث نمبر 617، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ جامع ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 30، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب فضل صلوٰۃ الجماعۃ، حدیث نمبر 460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل العشاء والفجر فی الجماعۃ، حدیث نمبر 205، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جماعت کے ساتھ ادا کیں تو اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کی طرح اجر ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جسے امام مالک اور مسلم رحمہم اللہ علیہم نے روایت کیا ہے۔

(۹) یہ پانچوں کی پانچوں نمازیں ہیں، یہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ سے فرض اور نفل کو شامل ہے پھر فرض کا خصوصاً ذکر کیا۔

(۱۰) الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى سے مراد غیر معین نماز ہے۔ حضرت نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا ہے اور ربیع بن خیثم نے بھی یہی کہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نمازوں میں صلوٰۃ وسطیٰ کو اسی طرح مخفی اور پوشیدہ رکھا ہے جیسے کہ رمضان المبارک میں لیلۃ القدر کو مخفی رکھا ہے اور جس طرح کہ جمعہ کے دن (مقبول) ساعت کو اور رات کی ان ساعتوں کو مخفی رکھا جن میں دعا مقبول ہوتی ہے، تاکہ وہ رات کے وقت اندھیروں میں عالم الخفیات کی مناجات کے لئے قیام کریں۔

اور جس سے اس کی صحت پر استدلال ہوتا ہے کہ یہ مبہم ہے غیر معین ہے وہ روایت ہے جسے مسلم نے اپنی صحیح میں باب کے آخر میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی: حافظوا علی الصلوات وصلوٰۃ العصر تم نمازوں پر اور نماز عصر پر مواظبت اختیار کرو۔ پس ہم نے اسے پڑھا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور یہ نازل ہوئی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى تو کسی آدمی نے کہا: کیا یہ صلوٰۃ عصر ہی ہے؟ براء نے کہا ہے: میں نے تجھے خبر دی ہے کیسے یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے منسوخ فرمایا؟(1) واللہ اعلم۔ پس اس سے لازم ہوا کہ اسے معین کرنے کے بعد اس کی تعیین کو منسوخ کر دیا گیا اور اسے مبہم رکھا گیا پس تعیین اٹھ گئی۔ واللہ اعلم۔

اور یہ مسلم کی پسند ہے، کیونکہ اسے باب کے آخر میں لایا گیا ہے اور علماء متاخرین میں سے کئی ایک نے اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ دلائل کے مابین تعارض ہونے اور ترجیح نہ ہونے کی وجہ سے (علماء متاخرین نے یہی کہا ہے۔) پس تمام نمازوں پر محافظت اور ان کے اوقات میں ان کی ادائیگی کے سوا کوئی شے باقی نہیں رہی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں یہ اختلاف ان کے بطلان پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وصلوٰۃ العصر ثابت کیا ہے جو کہ ابو یونس مولیٰ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مذکور ہے جبکہ آپ نے اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے مصحف قرآنی لکھے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: بلاشبہ یہ الفاظ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی مانند ہیں۔ اور اس پر عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حکم ارشاد فرمایا کہ میں ان کے لئے مصحف لکھوں۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس آپ نے مجھے اسی طرح املاء کرایا حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ---- وہی العصر ---- وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (2) اور فرمایا: اسی طرح میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا۔ پس آپ کا قول وہی العصر اس پر دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ میں سے الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کی اپنے قول وہی العصر

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 227، وزارت تعلیم

2۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 121-122، وزارت تعلیم

کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔ اور نافع نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے صلاۃ العصر کے الفاظ روایت کیے ہیں (1) جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے صلاۃ العصر کے الفاظ بھی یعنی بغیر واؤ کے روایت کیے گئے ہیں (2)۔

اور ابو بکر الانباری نے کہا ہے: اس زائد لفظ میں یہ اختلاف اس کے بطلان پر اور جو کچھ تمام مسلمانوں کے مصحف الامام میں ہے اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس پر ایک دوسری دلیل بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جنہوں نے کہا: والصلاۃ الوسطی وصلاۃ العصر انہوں نے صلاۃ وسطی غیر عصر کو قرار دیا ہے۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا رد ہے جسے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: غزوۂ احزاب کے دن مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عصر کی نماز سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج کا رنگ زرد ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شغلونا عن الصلاۃ الوسطی ملأ اللہ اجوافهم وقبورهم نارا (3) الحدیث۔ انہوں نے ہمیں صلاۃ وسطی سے مشغول رکھا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں اس پر دلیل موجود ہے کہ وتر واجب (فرض) نہیں ہیں، کیونکہ مسلمانوں کا فرض نمازوں کی تعداد پر اتفاق ہے کہ وہ سات سے کم ہیں اور تین سے زیادہ ہیں اور تین سے سات کے درمیان سوائے پانچ کے اور کوئی طاق عدد نہیں ہے۔ اور جفت اعداد کا کوئی وسط نہیں تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور حدیث معراج میں بھی پانچ ہی اور پچاس ہیں کیونکہ میرے نزدیک قول تبدیل نہیں ہوتا۔ هی خمس وهن خمسون لا یبدل القول لدی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اس کا معنی ہے تم اپنی نمازوں میں عجز و انکساری کرتے ہوئے کھڑے رہو۔ اور لوگوں کا قٰنِتِیْنَ کے معنی میں اختلاف ہے۔ حضرت شعبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے طائعین اطاعت کرنے والے اور حضرت جابر بن زید، عطا اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: قرآن کریم میں ہر مقام پر قنوت کا لفظ طاعت کے معنی میں ہے۔ اور ابو سعید نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بیان کیا ہے اور بے شک ہر دین والے آج دعا فرمائی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس امت کو کہا گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے اطاعت و پیروی کرتے ہوئے کھڑے رہو (4)۔

اور مجاہد نے کہا ہے: قٰنِتِیْنَ کا معنی ہے خاشعین خشوع کرنے والے۔ قنوت کا معنی ہے رکوع کو طویل کرنا، خشوع کرنا، آنکھوں کو جھکانا اور عجز و انکساری کرنا۔

اور ربیع نے کہا ہے: القنوت کا معنی ہے قیام کو طویل کرنا (5)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور آیت اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ

1۔ موطا امام مالک، کتاب صلاۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم
2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 442، دارالکتاب العربیہ بیروت
3۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 227، بیروت
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 323، دارالکتب العلمیہ
5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 324

کہ وہ نماز میں ہے اور وہ کلام اس کی نماز کی اصلاح کے بارے میں نہ ہو تو وہ نماز کو فاسد کر دیتی ہے سوائے اس روایت کے جو اوزاعی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے کسی شخص کے احیاء کے لئے کلام کی یا اس جیسے بڑے امور کے بارے میں تو اس کے ساتھ اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ یہ قول نظر و فکر کے اعتبار سے ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔

اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نماز میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔(1) الحدیث اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ نیا حکم بیان کیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کرو"(2) اور ایسا کوئی بڑا واقعہ نہیں ہے جس کے لئے نماز کو توڑنا واجب ہو اور اس وجہ سے وہ کلام سے منع کرتا ہو۔ پس جس کسی نے اپنے کلام کے لئے اپنی نماز کو توڑ دیا جیسے وہ احیاء نفس یا مال یا ایسا کام ہو [illegible] کے طریقہ پر ہو کے لئے فضیلت دیکھتا ہو تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے اور بنا نہ کرے۔ اس مسئلہ میں یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ نماز کے دوران بھول کر کلام کرنے کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اور ان کے اصحاب ان تمام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز میں سہواً گفتگو کرنا اسے فاسد نہیں کرتا۔ لیکن امام مالک نے یہ بھی کہا ہے: نماز میں عمداً گفتگو کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کی کیفیت اور اس کی اصلاح کے بارے میں ہو۔ یہی ربیعہ اور ابن القاسم کا قول ہے۔

اور سحنون نے ابن القاسم سے اور انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر کسی قوم کو امام نے دو رکعتیں نماز پڑھائی اور بھول کر سلام پھیر دیا اور انہوں نے اس کے لئے تسبیح (سبحان اللہ کہا) کہی اور وہ نہ سمجھے تو ان لوگوں میں سے جو اس کے پیچھے نماز میں تھے ایک آدمی نے کہا: بلاشبہ تم نے نماز مکمل نہیں کی سو اپنی نماز مکمل کرو۔ پس وہ قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا یہ حق ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ تو فرمایا: امام انہیں وہ نماز پڑھا دے گا جو ان کی نماز میں سے باقی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنی بقیہ نماز پڑھیں گے ان میں سے وہ بھی جس نے کلام کیا اور وہ بھی جس نے کلام نہیں کیا اور ان پر کوئی شے نہ ہوگی اور وہ اسی طرح کچھ کرنے والے ہوں گے جو کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کے دن کیا۔ یہ المدونہ میں ابن القاسم کا قول ہے اور ان کی روایت امام مالک سے ہے اور یہ امام مالک کے تمام اصحاب ذوالیدین کے مسئلہ میں امام مالک کے قول کے خلاف ہیں سوائے ابن قاسم کے۔ کیونکہ اس بارے میں وہی امام مالک کا قول بیان کرتے ہیں اور ان کے سوا دوسرے اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ ابتدائے اسلام میں ہوا اور آپ لوگ اپنی نماز کے بارے میں پہچانتے ہیں۔ پس جس کسی نے اس دوران گفتگو کی تو وہ اس کا اعادہ کرے۔ اور یہی قول

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 204، وزارت تعلیم

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 133، وزارت تعلیم

صحیح بخاری، باب [illegible] حدیث 6988، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عراقیین کا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب اور ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نماز میں گفتگو کرنا کسی بھی حال میں اسے فاسد کر دیتا ہے چاہے وہ سہواً ہو یا عمداً ہو، نماز کے بارے میں ہو یا کسی غیر کے بارے میں۔ اور یہی ابراہیم نخعی، عطاء، حسن، حماد بن ابی سلیمان اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ کے اصحاب کا خیال ہے کہ ذوالیدین کے قصے کے بارے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ابن مسعود اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی حدیث سے منسوخ ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگرچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام ہیں لیکن انہوں نے ذوالیدین کی حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے جیسا کہ انہوں نے اس حدیث کو مرسل ذکر کیا ہے: من ادرکہ الفجر جنبا فلا صوم لہ (1) جسے جنبی حالت میں فجر نے پا لیا تو اس کے لئے روزہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے مرسل حدیثیں روایت کرتے ہیں۔

اور علی بن زیاد نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں ابو قرہ نے بتایا کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: جب آدمی نماز میں کلام کرے تو مستحب یہ ہے کہ وہ اس کا اعادہ کرے اور بنا نہ کرے۔ مزید کہا: اور ہمیں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بلاشبہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو فرمائی اور اس دن آپ کے اصحاب نے بھی آپ کے ساتھ گفتگو کی، کیونکہ ان کا گمان تھا کہ نماز ختم ہو گئی ہے اور آج کسی کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

اور کئی نے ابن القاسم سے ایک آدمی کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس نے اکیلے نماز پڑھی اور اپنی طرف سے وہ چار رکعتوں سے فارغ ہو گیا تو اس کے پہلو میں موجود ایک آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ تو نے تو صرف تین رکعتیں پڑھی ہیں تو وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ درست ہے جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ فرمایا: اس کی نماز فاسد ہو گئی اور اسے نہیں چاہئے تھا کہ وہ اس سے کلام کرتا اور نہ یہ چاہئے تھا کہ اس (دوسرے) کی طرف متوجہ ہوتا۔

ابو عمر نے کہا ہے: اور اس مسئلہ میں جماعت کے ساتھ امام اور منفرد کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ پس وہ امام اور اس کے مقتدیوں کے لئے نماز کی حالت کے بارے کلام کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور منفرد کو اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے اس مسئلہ میں ابن القاسم کے جواب کو منفرد اور امام اور اس کے ساتھیوں پر محمول کرتے ہیں اور آپ کے اس قول میں نقصان کی بنا پر حضرت ذوالیدین کی حدیث کے مخالف ہی ہے جیسا کہ اس میں امام مالک کا قول مختلف ہے۔

اور امام شافعی اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: جس نے عمداً کلام کیا اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس نے نماز مکمل نہیں کی اور یہ کہ وہ نماز میں ہے تو اس نے اپنی نماز فاسد کر دی۔ اور اگر اس نے سہواً گفتگو کی یا اس نے گفتگو کی اور وہ یہ گمان کرتا ہو کہ وہ نماز میں نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل کر لیا ہے تو وہ بنا کر سکتا ہے۔

اور اس مسئلہ میں امام احمد نے اختلاف کیا ہے اور ان سے الاثرم نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آدمی نے اپنی نماز کے دوران اس کی اصلاح کے لئے جو گفتگو کی تو اس سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔ اور اگر اس نے سہواً کلام کی اور گفتگو کی تو اس کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصوم، جلد 1، صفحہ 350، وزارت تعلیم

مسئلہ نمبر 8۔ القنوت: اس کا معنی قیام ہے اور یہ اس کی ان اقسام میں سے ایک ہے جو ابو بکر بن انباری نے ذکر کی ہیں۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ فرض نماز میں قیام کرنا ہر تندرست اور اس پر قدرت رکھنے والے آدمی پر واجب ہے چاہے وہ منفرد ہو یا امام ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ امام بنایا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے۔ پس جب کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو''(1) الحدیث۔ اسے ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا بیان ہے: وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اور انہوں نے صحت مند مقتدی کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو ایسے مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے جو کھڑے ہونے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اہل علم کے ایک گروہ نے اس کی اجازت دی ہے بلکہ جمہور اہل علم نے، کیونکہ امام کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اور جب وہ (امام) بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سب بھی بیٹھ کر نماز پڑھو''(2)۔ یہی اس مسئلہ میں صحیح ہے۔ ابھی ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور علماء کے ایک گروہ نے مریض امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی طاقت کے مطابق اپنا فرض ادا کر رہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جس میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں کھڑے ہو کر آپ کی نماز کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ آپ کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ نہیں کیا اور اپنی نماز انہیں کے ساتھ بیٹھ کر مکمل کی اور وہ کھڑے تھے۔ اور یہ معلوم ہے کہ یہ واقعہ آپ کے اپنے گھوڑے سے گرنے کے بعد کا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دوسرا فعل پہلے فعل کے لئے ناسخ ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے ان میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد بن علی ہیں اور یہی ولید بن مسلم کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا: میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ امام کے پہلو میں ان میں سے کوئی کھڑا ہو جائے جو لوگوں کو امام کی نماز کے بارے بتاتا رہے (یعنی امام کی حرکات و سکنات سے آگاہ رکھے۔) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت غریب ہے۔

اور اس کے بارے اہل مدینہ کی ایک جماعت اور دوسروں نے کہا ہے اور یہی صحیح ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ کوئی بیٹھنے والا کھڑے ہونے والوں کی امامت نہیں کرائے گا۔ پس اگر بیٹھ کر اس نے ان کی امامت کرائی تو امام اور مقتدی تمام کی نماز باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''میرے بعد بیٹھ کر کوئی بھی امامت نہ کرائے گا(3)''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 89، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 647-648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب انما جعل الامام لیؤتم بہ، حدیث نمبر 648-649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن دارقطنی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 398، حدیث نمبر 9

فرمایا: اگر امام بیمار ہو تو امام کی نماز مکمل ہوگی اور اس کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز فاسد ہوگی۔ مزید کہا: جس نے بغیر علت کے بیٹھ کر نماز پڑھی تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ امام مالک سے ابو مصعب نے اپنی مختصر میں روایت بیان کی ہے۔ پس جس نے بیٹھ کر نماز پڑھی اس پر وقت میں اور وقت کے بعد اعادہ واجب ہوگا۔ اور امام مالک سے اس بارے میں روایت بیان کی گئی ہے کہ وہ صرف وقت میں اعادہ کریں گے۔ اور اس بارے میں امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول امام مالک کے مشہور قول کی مثل ہی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کے لئے اور اپنے مذہب کے لئے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے ابو مصعب نے بیان کیا ہے۔ اسے دار قطنی نے جابر سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا دار قطنی نے کہا ہے: اسے جابر جعفی کے سوا کسی نے حضرت شعبی سے روایت نہیں کیا ہے اور وہ متروک الحدیث ہے۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ ابو عمر نے کہا ہے: جابر جعفی کسی بھی شے سے حجت نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ اسے مسند روایت کرتا ہو تو پھر اس سے کیسے استدلال ہو سکتا ہے جسے وہ مرسل روایت کرتا ہے؟

امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب مریض امام بیٹھ کر ایسی قوم کو نماز پڑھائے جن میں کچھ صحت مند اور کچھ مریض ہوں تو امام کی نماز اور اس کے پیچھے پڑھنے والوں میں سے ان کی نماز جو کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے صحیح اور جائز ہے اور ان کی نماز جن کے لئے قیام کا حکم ہے باطل ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے کہا ہے: امام اور تمام مقتدیوں کی نماز جائز ہے اور انہوں نے کہا: اگر امام نے اشارے کے ساتھ ایسے لوگوں کو نماز پڑھائی جو رکوع اور سجود کر سکتے ہیں تو تمام کے قول کے مطابق مقتدیوں کی نماز جائز نہیں اور امام کی نماز جائز ہے اور امام زفر کہتے ہیں: ان کی نماز بھی جائز ہوگی کیونکہ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا ہے اور ان کے امام نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسی طرح امام شافعی نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ابو عمر اور ان کے علاوہ ان سے پہلے اور بعد کے علماء نے کہا ہے کہ یہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی، حالانکہ میں نے ان کے سوا کو اس کے خلاف بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس باب میں طرق احادیث کو جمع کیا ہے اور ان پر گفتگو کی ہے اور اس بارے میں فقہاء کا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے تاکہ تیرے لئے راہ صواب واضح ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ چاہے اور اس کے قول کی صحت واضح ہو جائے جس نے یہ کہا کہ تندرست مقتدی کا مریض امام کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

پس ابو حاتم محمد بن حبان البستی نے المسند الصحیح میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایک جماعت میں تھے تو آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے نہیں ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں؟ صحابہ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم جانتے نہیں ہو کہ جس نے میری اطاعت کی تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں میری طاعت ہے؟" انہوں نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ ہم تو شہادت دیتے ہیں کہ جس کسی نے آپ کی طاعت کی تحقیق اس نے

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آپ کی اطاعت ہے۔ پھر فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت یہ ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میری اطاعت یہ ہے کہ تم اپنے امراء کی اطاعت کرو۔ پس اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائیں تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو(1)۔“ اس کی سند میں عقبہ بن ابی الصہبا راوی ہے اور وہ ثقہ ہے، یحییٰ بن معین نے یہی کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ واضح بیان ہے کہ مقتدیوں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا جبکہ ان کا امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے اللہ تعالیٰ کی اس اطاعت میں سے ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے۔ یہ میرے نزدیک اس اجماع کی ایک قسم ہے جس کی اجازت پر انہوں نے اجماع کیا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چار ایسے ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ فتویٰ دیا ہے۔ (یعنی) حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسید بن حضیر اور حضرت قیس بن قہد رضی اللہ عنہم اور ان صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ان چار کے خلاف مروی نہیں جو وحی اور قرآن کریم کے نزول کے وقت حاضر تھے اور جنہیں تحریف و تبدیلی سے محفوظ رکھا گیا، نہ سند متصل کے ساتھ اور نہ منقطع کے ساتھ۔ تو گویا صحابہ کرام نے اس پر اجماع کیا کہ امام جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدیوں پر بھی لازم ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھیں۔ اسی طرح جابر بن زید، اوزاعی، مالک بن انس، احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم، ابو ایوب سلیمان بن داؤد الہاشمی، ابو خیثمہ، ابن ابی شیبہ، محمد بن اسماعیل اور اصحاب حدیث میں سے جو ان کے متبعین ہیں مثلاً محمد بن نصر اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ رحمہم اللہ نے کہا ہے اور اس حدیث کو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت انس بن مالک، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر بن خطاب اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔

اس امت میں سب سے اول جس نے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے مقتدی کی نماز کو باطل قرار دیا جبکہ امام بھی بیٹھ کر نماز پڑھائے وہ مغیرہ بن مقسم صاحب النخعی ہیں اور ان سے حماد بن ابی سلیمان نے اسے لیا ہے اور پھر حماد سے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے نقل کیا ہے اور پھر آپ کے بعد آنے والے آپ کے اصحاب نے آپ کی اتباع کی ہے اور اس بارے میں وہ اعلیٰ روایت جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے اسے جابر جعفی نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یؤمن احد بعدی جالسا اس روایت کی اسناد اگر صحیح بھی ہو تو بھی یہ مرسل ہے اور مرسل خبر اور وہ جسے کوئی روایت نہ کرے ہمارے نزدیک حکم میں دونوں برابر ہیں، پھر امام ابو حنیفہ کہتے ہیں: جن سے میں نے ملاقات کی ان میں حضرت عطاء سے افضل میں نے کوئی نہیں دیکھا اور جن سے میں ملا ان میں جابر جعفی سے زیادہ جھوٹا میں نے کوئی نہیں دیکھا اور میں کبھی اس کے پاس رائے سے کوئی شے نہیں لایا مگر وہ اس بارے میرے پاس حدیث لایا اور گمان ہوا کہ اس کے پاس اتنے اتنے ہزار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں ہیں جن کے بارے گفتگو نہیں۔ پس یہ امام اعظم ابو حنیفہ ہیں جو جابر جعفی پر جرح کر رہے ہیں اور اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور یہ اس قول کی ضد ہے جس کی بنا پر آپ کے اصحاب نے آپ کا مذہب اختیار کیا ہے(2)۔

1۔ سنن فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 470، موسسۃ الرسالہ بیروت

2۔ سنن فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 417 تا 474، موسسۃ الرسالہ بیروت

کے ساتھ بیان فرمایا کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ وہ اس نماز میں ذکر کر رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کی تاکہ لوگ آپ کی اقتدا کریں اور وہ نماز جو رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے سے گرنے کے وقت اپنے گھر میں پڑھائی تھی اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے آپ کو ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کریں تاکہ وہ لوگوں کو آپ کی تکبیر سنوا سکیں۔ تو بلاشبہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عظیم مسجد میں تکبیر کے ساتھ اپنی آواز بلند کی جس میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی حالت مرض میں نماز پڑھائی، پس جب صحیح ہے جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے تو پھر یہ جائز نہیں کہ ہم ان اخبار میں سے بعض کو بعض کے لئے ناسخ قرار دیں (1) اور اس نماز کی طرف حضور نبی کریم ﷺ دو آدمیوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے تھے اور آپ ﷺ اس میں امام تھے اور آپ نے انہیں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور انہیں بھی بیٹھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور وہی دو نماز جو آپ ﷺ نے اپنی عمر مبارک کی آخری نماز پڑھی تو اس کے لئے آپ ﷺ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ (یا نوبہ) رضی اللہ عنہما کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے اور اس میں آپ مقتدی تھے اور آپ ﷺ نے ایک ہی کپڑا لپیٹ کر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا فرمائی (2)۔ اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے فرمایا: وہ آخری نماز ہے جو رسول اللہ ﷺ نے قوم کے ساتھ ایک کپڑا لپیٹ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر ادا فرمائی (3)۔ پس آپ ﷺ نے مسجد میں دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا فرمائیں نہ کہ ایک نماز۔ اور عبیداللہ ابن عبداللہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی خبر میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ دو مردوں کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ ان دو میں سے ایک حضرت عباس اور دوسرے حضرت علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ اور مسروق نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو خبر بیان کی ہے اس میں ہے: پھر حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آپ میں کچھ آرام اور سکون پایا تو آپ حضرت بریرہ اور حضرت ثوبہ کے درمیان سہارا لے کر تشریف لے گئے۔ بے شک میں آپ ﷺ کے نعلین کی طرف دیکھتی رہی وہ سنگریزوں میں لکیر ڈال رہے تھے اور میں آپ کے قدموں کے تلووں کی طرف دیکھتی رہی۔ الحدیث۔

پس یہ تیری اس پر رہنمائی کرتی ہے کہ وہ دو نمازیں تھیں نہ کہ ایک نماز (4)۔

ابو حاتم نے کہا ہے: ہمیں محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے خبر دی ہے انہوں نے کہا: ہمیں محمد بن بشار نے بیان کیا ہے، انہوں نے کہا ہمیں بدل بن محبر نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبید اللہ بن عبداللہ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ صف میں آپ کے پیچھے تھے (5)۔

1۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلاۃ، جلد 5، صفحہ 491 تا 493، موسسۃ الرسالۃ بیروت
2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 488
3۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء اذا صلی الامام قاعدا، حدیث نمبر 331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
صحیح بخاری، باب من قام الی جنب الامام لعلۃ، حدیث 642۔ صحیح بخاری، باب الرجل یأتم بالامام، حدیث 677، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح بخاری، باب معنی الامام لیؤتم به، حدیث نمبر 648، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلاۃ، جلد 5، صفحہ 488، موسسۃ الرسالۃ بیروت
5۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 483

ابوحاتم نے کہا ہے: شعبہ بن حجاج نے زائدہ بن قدامہ سے اس خبر کے متن میں موسیٰ بن ابی عائشہ سے اختلاف کیا ہے۔ پس شعبہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقتدی بنایا ہے اس حیثیت سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھی اور دوسرے لوگوں نے کھڑے ہو کر۔ اور زائدہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام قرار دیا ہے اور اس حیثیت سے کہ آپ نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور قوم نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ اور یہ دونوں انتہائی ثقہ اور حافظ ہیں۔ تو یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایسی دو روایتیں جن کے ظاہر میں ایک فعل میں تضاد ہے ان میں سے ایک کو مطلق متقدم امر کے لئے ناسخ بنا دیا جائے پس جس نے دو حدیثوں میں سے ایک کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر متقدم کے لئے ناسخ بنایا اور دوسرے کو بغیر دلیل کے چھوڑ دیا تو اس کی صحت پر ثبوت لانا اس کے ذمہ ہے اس نے اپنے خصم کے لئے یہ جائز قرار دیا کہ وہ دو خبروں سے اسے لے لے جسے اس نے چھوڑا ہے۔ اور اسے چھوڑ دے جسے اس نے لیا ہے۔ اور یہ مثل ہے اس نوع کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خبر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کیا اور آپ حالت احرام میں تھے (1) اور حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا اور وہ دونوں حلال تھے (یعنی حالت احرام میں نہ تھے۔) (2) پس یہ دونوں حدیثیں ایک فعل میں بظاہر متضاد ہیں بغیر اس کے کہ ہمارے نزدیک ان دونوں کے درمیان تضاد ہو۔ اصحاب حدیث کی ایک جماعت نے ان دونوں حدیثوں کو متعارض قرار دیا ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے مروی ہیں اور انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خبر کو لے لیا ہے جو انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ لاینکح المحرم ولا ینکح (محرم نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی کا نکاح کر سکتا ہے) تو انہوں نے اسے لے لیا۔ جبکہ یہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے ساتھ موافقت رکھتی ہے جو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بارے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خبر کو چھوڑ دیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حالت احرام میں نکاح کیا۔ پس جس نے یہ کہا اس کے لئے یہ کہنا لازم ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت مرض میں نماز کے بارے دو حدیثیں متضاد ہیں اسی طریقہ پر جو اس سے پہلے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی خبر لائے جس میں مقتدیوں کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم موجود ہو جبکہ ان کا امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور وہ اسے پکڑ لیں جبکہ وہ ان دو روایتوں میں سے ایک کے موافق ہو جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت مرض میں نماز کے بارے روایت کی گئی ہیں اور وہ چھوڑ دے اس خبر کو جو ان میں سے منفرد ہو جیسا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے معاملہ میں کیا گیا (3)۔

ابوحاتم نے کہا ہے: بعض عراقیوں نے گمان کیا ہے جو کوفیوں کا مذہب اختیار کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول اذا صلی قاعدا فصلوا قعودا اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ بیٹھ کر تشہد پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر تشہد پڑھو۔ تو یہ خبر کو اس کے عموم سے

1۔ صحیح بخاری، باب التزویج المحرم، حدیث نمبر 1705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ تزویج المحرم، حدیث 770، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان، کتاب الصلوٰۃ، جلد 5، صفحہ 483 تا 485، مؤسسۃ الرسالہ بیروت

پھیر دیتا ہے جس کے بارے میں خبر وارد ہے بغیر کسی ایسی دلیل کے جو اس معنی کو ثابت کر سکے(1)۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

"پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیدل یا سوار (جیسے بن پڑے) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے"

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خِفْتُمْ یہ خوف سے ماخوذ ہے جس کا معنی گھبراہٹ اور ڈر ہے۔ فَرِجَالًا یعنی تم نماز پڑھو پیدل چلتے ہوئے اَوْ رُكْبَانًا یا سوار۔ یہ رجالا پر معطوف ہے۔ اور الرجال، راجل یا رجل کی جمع ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: رجل الانسان یرجل رجلا جب آدمی کے پاس سواری نہ ہو اور وہ اپنے قدموں پر چلے۔ (صفت کا صیغہ ہوگا) فہو رجل و راجل و رجل (جیم کے ضمہ کے ساتھ) یہ اہل حجاز کی لغت ہے، وہ کہتے ہیں: مشی فلان الی بیت اللہ حافیا رجلا (فلاں بیت اللہ شریف کی طرف ننگے پاؤں پیدل چلا) اسے طبری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ و رجلان و رجیل و رجل(2) اور اس کی جمع رجال، رجلی، رجالی، رجالۃ، رجالی، رجلان، رجلۃ و رجلۃ (جیم کے فتحہ کے ساتھ) اور ارجلۃ و اراجل و اراجیل کے اوزان پر بنائی جاتی ہے اور الرجل جو کہ امرأۃ کی ضد ہے اس کی جمع رجال بھی بنائی جاتی ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو نماز میں قنوت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کا حکم ارشاد فرمایا اور قنوت سے مراد وقار، سکینہ اور اعضاء کا پرسکون ہونا ہے اور یہ نفس یا امن اور طمانیت کی حالت میں ممکن ہو سکتا ہے تو پھر حالت خوف کا ذکر فرمایا جو کبھی کبھی طاری ہو سکتی ہے اور یہ بیان فرمایا کہ یہ عبادت بندے سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی اور اپنے بندوں کو نماز کے بارے میں رخصت عطا فرمائی کہ وہ اپنے قدموں پر پیدل چلتے ہوئے اور گھوڑے، اونٹ اور اسی طرح کی کسی شے پر سواری کرتے ہوئے اپنے سر کے اشارے کے ساتھ جس طرف منہ کرنا ممکن ہو متوجہ ہو کر نماز پڑھ لیں۔ یہ علماء کا قول ہے۔ اور یہی اس گھبراہٹ اور خوف کی نماز ہے جب خوف شدت اور سختی کے ساتھ آدمی کی ذات پر مسلط ہو جائے جنگ کی حالت میں یا ایسے درندہ جو اسے تلاش کر رہا ہو اس سے خوف کی حالت میں یا ایسے دشمن سے خوف ہو جو اس کا پیچھا کر رہا ہو یا ایسے سیلاب کا خوف ہو جو اسے اٹھا سکتا ہو۔ بالجملہ ہر وہ شے جس سے آدمی اپنی جان پر خوف ہو تو وہی وہ عذر مبیح ہے جسے یہ آیت متضمن ہے(4)۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ رخصت اپنے ضمن میں علماء کا اجماع بھی لیے ہوئے ہے کہ انسان جہاں کہیں بھی ہو اشاروں سے

1۔ صحیح ابن حبان، کتاب الصلاۃ، جلد 5، صفحہ 487، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دارالکتب العلمیہ

3۔ ایضاً

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 324، دارالکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وقت ایک رکعت نماز فرض کی ہے (1)۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: اس روایت کو بیان کرنے میں بکیر بن اخنس منفرد ہے اور وہ روایت حجت نہیں ہوتی جس میں وہ منفرد ہو۔ اور نماز میں اولیٰ یہ ہے کہ اس میں احتیاط برتی جائے وہ آدمی جس نے اپنے خوف اور سفر کی حالت میں دو رکعتیں نماز پڑھ لی تو وہ اختلاف سے یقین کی طرف نکل گیا۔

اور ضحاک، ابن مزاحم نے کہا ہے: وہ آدمی جسے حالت جنگ یا کسی اور حالت میں موت کا خوف ہو تو وہ ایک رکعت پڑھ سکتا ہے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ دو تکبیریں کہہ لے۔

اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے: اگر وہ صرف ایک تکبیر پر ہی قادر ہو تو وہی اس کی طرف سے جائز ہو گی۔ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے (2)۔

اور قول تعالیٰ: فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ یعنی (جب تمہیں امن حاصل ہو جائے) تو تم اس حکم کی طرف لوٹ جاؤ جو تمہیں ارکان کی تکمیل کے بارے دیا گیا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ کا معنی ہے جب تم دار السفر سے دار الاقامہ کی طرف نکل جاؤ۔ علامہ طبری نے اس کا رد کیا ہے (3) اور ایک جماعت نے کہا ہے: اَمِنْتُمْ جب تمہارا وہ خوف زائل ہو جائے جس نے تمہیں اس نماز پر مجبور کر دیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے خائف کی بنا کے بارے اس باب میں اختلاف کیا ہے جب وہ امن میں ہو جائے، حضرت امام مالک نے کہا ہے: اگر کسی نے ایک رکعت حالت امن میں پڑھ لی پھر اسے خوف لاحق ہو گیا تو وہ سوار ہو اور اسی پر بنا کر لے (یعنی دوسری رکعت سواری پر پڑھ لے تو نماز مکمل ہو جائے گی۔) اور اسی طرح اگر کسی نے حالت خوف میں سواری پر ایک رکعت پڑھی، پھر اسے امن ہو گیا تو وہ اترے اور اسی پر بنا کر لے۔ یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور مزنی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب کوئی امن کی حالت میں نماز شروع کرے، پھر اسے خوف لاحق ہو جائے وہ منہ قبلہ شریف کی طرف کرے اور بنا نہ کرے اور اگر اس نے حالت خوف میں نماز شروع کی پھر اسے امن حاصل ہو جائے تو وہ بنا کر لے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سواری سے اترنے والا تو بنا کر سکتا ہے (لیکن) سوار ہونے والا بنا نہیں کر سکتا۔ اور امام ابو یوسف نے کہا ہے: وہ ان تمام صورتوں میں سے کسی میں بھی بنا نہیں کر سکتا۔

مسئلہ نمبر 8۔ قول تعالیٰ: فَاذْكُرُوا اللّٰهَ کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی نماز کی تعلیم دی ہے جو اصل نماز کے قائم مقام ہے اور تمہاری کوئی نماز فوت نہیں ہوئی اور یہی وہ ہے جسے تم نہ جانتے تھے اور قول باری كَمَا میں کاف بمعنی شکر ہے تو کہتا ہے: تو میرے ساتھ اسی طرح (سلوک) کر جیسے میں نے تیرے ساتھ کیا اسی طرح بدل اور شکر ہو گا اور مَا اپنے مابعد کے ساتھ مصدر ہے اور عَلَّمَكُمْ کا مفعول ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 241، وزارت تعلیم
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً

حضرت ربیع بن انس نے بھی کہا ہے۔ اور سکنیٰ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا: یہ آیت جو سورۃ البقرہ میں ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ تحقیق اسے دوسری آیت نے منسوخ کر دیا ہے آپ نے اسے کیوں نہیں لکھا یا آپ نے اسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے بھتیجے! میں نے اس میں سے کسی شے کو اس کے مکان سے تبدیل نہیں کیا (1)۔

اور علامہ طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: بے شک یہ آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور عدت چار مہینے اور دس دن ثابت ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وصیت بنا دی اس میں سکنیٰ سات مہینے اور بیس راتیں ہے۔ پس اگر عورت چاہے تو اپنی وصیت میں رہے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (2)۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس تمام کا حکم نسخ متفق علیہ کے ذریعے زائل ہو چکا ہے مگر وہ جو طبری نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے روایت کیا ہے۔ اس بارے میں طبری کی نظر ہے۔

اور حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس پر اجماع منعقد ہے کہ سال کی مدت منسوخ ہو چکی ہے اور اس کی عدت چار مہینے اور دس دن ہے۔ دوسروں نے کہا: قولہ وصیۃ کا معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عورتوں پر زوج کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک گھروں میں رہنا واجب ہوتا ہے۔ پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ طبری نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے وہ صحیح ثابت ہے۔ بخاری نے روایت کیا ہے: ہمیں اسحاق، روح، شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا فرمایا: یہ عدت اپنے زوج کے گھر والوں کے پاس گزارنا واجب تھی پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تمام سال، سات مہینے اور بیس راتیں وصیت بنا دیا، اگر وہ چاہے تو اپنی وصیت میں سکونت رکھے اور اگر چاہے تو نکل جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (3)۔ مگر پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: "بلاشبہ یہ عدت چار مہینے اور دس دن ہے تم میں سے کوئی زمانہ جاہلیت میں سال مکمل ہونے پر مینگنی پھینکتی تھی۔" الحدیث (4)
یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شریعت کے احکام نافذ ہونے سے پہلے ان عورتوں کی حالت کا بیان ہے جن کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دار الکتب العلمیہ

3۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 650، وزارت تعلیم۔ ایضاً، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4172، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4167، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن نسائی، کتاب الطلاق، جلد 1، صفحہ 143، وزارت تعلیم

خارج تو نہیں ہوتے تھے۔ پس جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سال تک گھروں میں ہی رہنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس مدت کو چار مہینے دس دن کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا یہ وضاحت کے ساتھ سنت ثابتہ میں ہے جسے اخبار آحاد سے نقل کیا گیا ہے۔ اس پر علماء مسلمین کا اجماع ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابو عمر نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا اور اسی طرح یہ دوسری آیت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ جمہور علماء کے نزدیک یہ سب منسوخ ہے۔ پھر بیویوں کے لئے سال بھر رہائش کی وصیت کرنے کو منسوخ کر دیا گیا سوائے ایک شاذ روایت کے جسے چھوڑ دیا گیا ہے وہ ابن ابی نجیح نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے اور اس پر کوئی متابع نہیں لایا گیا اور نہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد آنے والے علماء مسلمین میں سے کسی نے اس کے سبب چار مہینے اور دس دن پر اضافہ کیا ہے جہاں تک میں جانتا ہوں۔

اور ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے جس پر لوگوں کا عمل ہے، پس اجماع منعقد ہو گیا اور اختلاف ختم ہو گیا۔ و باللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَصِيَّةٌ حضرت نافع، ابن کثیر، کسائی، عاصم نے ایک روایت میں اور ابوبکر رحمۃ اللہ علیہم نے مبتدا ہونے کی بناء پر وَصِيَّةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر لِّاَزْوَاجِهِمْ ہے۔ اور یہ معنی ہونے کا احتمال بھی ہے علیہم وصیۃ۔ ان پر وصیت لازم ہے اور قول باری تعالیٰ لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہو (1)۔ علامہ طبری نے کہا ہے کہ بعض علماء نحو نے کہا ہے کہ معنی ہے کُتِبَت علیہم وصیۃ ان پر وصیت فرض کی گئی ہے اور قول لِّاَزْوَاجِهِمْ صفت ہوگا (2)۔ فرمایا: اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ہے۔ اور ابو عمرو، حمزہ اور ابن عامر رحمۃ اللہ علیہم نے وصیۃً منصوب پڑھا ہے اور اسے فعل پر محمول کیا ہے۔ یعنی فلیوصوا وصیۃ یعنی چاہئے کہ وہ ضرور وصیت کریں پھر میت تو وصیت نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ وفات کے قریب ہوں اور لِّاَزْوَاجِهِمْ اس قراءت کی بناء پر بھی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے اوصی اللہ وصیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت کو لازم قرار دیا ہے۔ اور مَّتَاعًا، مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا ہے۔ یعنی تم انہیں ضرور نفقہ ادا کرو۔ یا جعل اللہ لهن ذلك متاعا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وہ خرچہ مقرر فرما دیا ہے۔ کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہو یا مصدر کے سبب جو کہ الوصیۃ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ يَّتِيْمًا (البلد) یہاں متاع سے مراد اس کے سال کا نفقہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: غَيْرَ اِخْرَاجٍ اس کا معنی ہے کہ میت کے اولیاء کے لئے اور گھر کے وارثوں کے لئے عورت کو باہر نکالنا جائز نہیں ہے اور غَيْرَ اخفش کے نزدیک مصدر کی بناء پر منصوب ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا لا اخراجا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ منصوب ہے کیونکہ یہ متاعا کی صفت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ الموصین (وصیت کرنے والے) سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی متعوهن غیر مخرجات (تم انہیں نفقہ دو اس حال میں انہیں نکالا نہ جائے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 325، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

حرف جر کے حذف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اصل عبارت ہے: من غیر اخراجہم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ خَرَجْنَ الآیہ اس کا معنی ہے اگر وہ اپنے اختیار اور مرضی سے سال سے پہلے نکل جائیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تو کسی ولی پر یا حاکم پر کسی اور پر کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس پر پورا سال اپنے خاوند کے گھر میں ٹھہرا واجب نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نفقہ منقطع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے یا ازواج کی خواہش کے لئے ان پر بناؤ سنگھار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اے ورثاء! ان کے بارے تمہاری نگہبانی کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے پھر ان پر لازم ہے کہ وہ ایک سال مدت گزرنے سے پہلے پہلے شادی نہ کریں یا عدت گزرنے کے بعد ان کی شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: مِنْ مَّعْرُوْفٍ۔ مراد وہ طریقہ ہے جو شریعت سے موافقت رکھتا ہو۔ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ یہ صفت ہے جو اس کے بارے میں وعید کا تقاضا کرتی ہے جس نے اس آیت میں بیان کردہ حد کی مخالفت کی اور عورت کو نکال دیا حالانکہ وہ نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ حَكِیْمٌ یعنی اپنے بندوں کے امور میں سے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے خوب پختہ کرنے والا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ۝ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

"اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔ اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام تاکہ تم سمجھ جاؤ۔"

اس آیت میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ ابو ثور رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ محکم آیت ہے اور متعہ ہر مطلقہ عورت کے لئے لازم ہے اسی طرح زہری نے کہا ہے (زہری نے کہا) یہاں تک کہ لونڈی کے لئے بھی جسے اس کا خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے (1) اور اس آیت کی وجہ سے یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔

اور امام مالک نے کہا ہے: ہر مطلقہ کے لئے متعہ ہے چاہے اسے دو طلاقیں ہوں یا ایک طلاق ہو وہ اس کے پاس جائے یا نہ جائے، اس کے لئے مہر مقرر کرے یا نہ کرے، سوائے اس عورت کے جس کے پاس جانے سے پہلے اسے طلاق ہو جائے اور اس کے لئے مہر مقرر ہو تو اس کے لئے نصف مہر کافی ہوگا اور اگر اس کے لئے مہر مقرر نہ ہو تو اس کے لیے متعہ ہوگا چاہے وہ مہر مثل سے کم ہو یا زیادہ اور اس متعہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اسے آپ سے ابن قاسم نے بیان کیا ہے اور ابن قاسم نے المدونہ سے چھوٹے نالے کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے مطابق ہر مطلقہ کے لئے متعہ مقرر کیا ہے، پھر دوسری آیت میں اس کی استثنا کر دی ہے جس کے لئے مہر مقرر کیا گیا اور اس کے ساتھ دخول نہ ہوا تو اسے متعہ سے خارج کر دیا اور ابن زید نے گمان کیا ہے کہ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے کہ ابن قاسم نے نقل نسخ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 326، دارالکتب العلمیہ

سے لفظ استثنا کی طرف فرار اختیار کیا ہے، اس محل میں استثنا کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ تو صرف نسخ ہے جیسا کہ زید بن اسلم نے کہا ہے۔ اور ابن قاسم نے لازم قرار دیا ہے کہ قولہ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ ہر مطلقہ کو شامل ہے۔ تو پھر نسخ کا قول لازم اور ضروری ہے۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح، مجاہد وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت ان ثیبہ عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا کیونکہ اس آیت کے سوا دوسری میں ان عورتوں کے لئے متعہ کا ذکر گزر چکا ہے جن کے ساتھ دخول نہیں کیا گیا۔ پس یہ قول اس عورت کے بارے میں ہے جس کے لئے مس سے پہلے مہر مقرر کر دیا گیا یہ بھی عموم میں داخل نہیں ہوئی۔ اور یہ اس بنا پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ یہ عورتوں میں سے اس صنف کو خاص کر رہا ہے اور جب کہا گیا ہے کہ یہ عموم اس قسم کو بھی شامل ہے تو پھر یہ نسخ ہوگا تخصیص نہیں۔ (1)

اور امام شافعی نے دوسرے قول میں کہا ہے: بلا شبہ متعہ نہیں ہے مگر اس عورت کے لئے جسے قبل از دخول طلاق دی جائے اور وہاں نہ مس ہوا اور نہ مہر مقرر ہو۔ کیونکہ جو مہر میں سے کسی شے کی مستحق ہو جائے تو وہ اپنے حق میں متعہ کی محتاج نہیں رہتی۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ (الاحزاب: 28) اس پر محمول ہے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے ایک احسان ہے نہ کہ آپ کے لئے واجب ہے اور قول باری تعالیٰ: فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ (الاحزاب: 48) بھی غیر مفروضہ پر محمول ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: وہ عورت جس کا مہر مقرر کیا جائے اس کے لئے مہر ہوگا جب اسے قبل مسیس طلاق دی جائے، اس کے لئے کوئی متعہ نہ ہوگا، کیونکہ اس نے مباشرت کے بغیر نصف مہر لے لیا ہے۔ اور مدخول بہا کو جب طلاق دی جائے تو اس کے لئے متعہ ہوگا، کیونکہ مہر وطی کے مقابلہ میں واقع ہوتا ہے اور متعہ عقد کے ساتھ انتہائی استعمال کے سبب (لازم ہے)۔ اور امام شافعی نے خلع اور مبارات کرنے والی کے لئے بھی متعہ واجب کیا ہے اور امام مالک کے اصحاب نے کہا ہے: فدیہ دینے والی کے لئے کیسے متعہ ہو سکتا ہے حالانکہ وہ خود دیتی ہے تو وہ متعہ کیسے لے گی اور جدائی اور فراق کو اختیار کرنے والی کے لئے کوئی متعہ نہیں ہے چاہے وہ خلع لینے والی ہو یا فدیہ دینے والی یا مبارات کرنے والی یا صلح کرنے والی یا لعان کرنے والی یا آزاد ہونے والی فراق اور جدائی کو اختیار کرے۔ اس کے ساتھ دخول ہو یا نہ ہو، اس کے لئے مہر مقرر ہو یا نہ ہو۔ تفصیلی بیان پہلے گزر چکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

"کیا نہیں دیکھا تو نے ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ پھر زندہ فرمایا انہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَمْ تَرَ رؤیت قلب مراد ہے۔ اس کا معنی ہے اَلَمْ تَعْلَمْ کیا آپ نہیں جانتے اور سیبویہ کے نزدیک اس کا معنی ہے: کیا آپ آگاہ نہیں ان لوگوں کے معاملہ کے بارے۔ (یعنی الم تنبہ) اور یہ رؤیت (یعنی اَلَمْ تَرَ) دو مفعولوں کا محتاج نہیں ہے۔

ابو عبد الرحمن السلمی نے الم تر را کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور التقائے حرکت کے بغیر ہی ہمزہ کو حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کی اصل ہے: الم ترءِ۔

ان لوگوں کا قصہ یہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی ایک قوم ہے۔ ان میں وبا پھیل گئی، یہ ایک گاؤں میں تھے جسے ذاوردان کہا جاتا ہے (یہ گاؤں واسط کے مشرقی نواح میں واقع ہے اور ان کے درمیان ایک فرسخ کا فاصلہ ہے "معجم یاقوت") پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکلے اور ایک وادی میں جا اترے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موت مسلط کر دی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چار ہزار تھے۔ طاعون سے بھاگتے ہوئے نکلے اور انہوں نے کہا: ہم ایسی زمین پر آئے ہیں جہاں موت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو مار دیا۔ پھر ان کے پاس سے ایک نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کر دیا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ آٹھ دن تک مرے رہے اور بعض نے کہا: سات دن تک۔ واللہ اعلم۔

حضرت حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور سزا مدت مقررہ سے پہلے مار دیا، پھر انہیں باقی ماندہ عمروں کے لئے اٹھا دیا۔ اور بعض نے کہا ہے: ان کے انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات میں سے ایک نبی علیہ السلام کے معجزہ کے اظہار کے لئے ان کے ساتھ ایسا کیا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا اسم گرامی حضرت شمعون علیہ السلام ہے۔ اور نقاش نے بیان کیا ہے کہ وہ بخار سے بھاگے تھے (2)۔

اور بعض کا خیال ہے کہ وہ جہاد سے فرار ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کی زبان سے جہاد کے بارے حکم ارشاد فرمایا تو وہ جہاد میں قتال ہونے کے سبب موت سے خوفزدہ ہو گئے، پس وہ اس سے بھاگتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی تاکہ وہ انہیں متنبہ کر دے کہ کوئی شے انہیں موت سے نجات نہیں دلا سکتی پھر انہیں زندہ کیا اور انہیں اپنے اس ارشاد سے جہاد کے بارے حکم دیا: **وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ** (اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرو) حضرت ضحاک نے یہی کہا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تمام کے تمام قصص ضعیف الاسانید ہیں، لہٰذا آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کو تنبیہ اور توقیف کی عبارت میں انسانوں کو ایک قوم کے بارے خبر دی ہے کہ وہ موت سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں موت دے دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا تاکہ وہ اور ان کے بعد آنے والے تمام یہ جان لیں کہ موت دینا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ لہٰذا کسی ڈرنے والے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 327، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 328

کے خوف کا اور کسی دھوکہ کھانے والے کے دھوکہ کا کوئی معنی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اپنے اس امر کا مقدمہ بنایا ہے جو اس نے حضور نبی رحمت ﷺ کی امت کے مومنوں کو جہاد کے بارے حکم فرمایا۔ یہ علامہ طبری کا قول ہے اور یہی آیت کے ظاہر الفاظ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ أُلُوفٌ جمہور نے کہا ہے: یہ الف کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے: وہ چھ ہزار تھے۔ بعض نے کہا ہے: وہ اسی ہزار تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: وہ چالیس ہزار تھے۔ ابو مالک نے کہا ہے: وہ تیس ہزار تھے (1)۔ سدی کا قول ہے: وہ سینتیس ہزار تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ستر ہزار تھے۔ حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی چالیس ہزار اور آٹھ ہزار کی روایت ہے۔ آپ سے اسے ابن جریج نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی آٹھ ہزار کی روایت بھی ہے اور آپ سے چار ہزار کی روایت بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تین ہزار تھے۔ اور صحیح یہ ہے کہ وہ دس ہزار سے زائد تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ أُلُوفٌ اور یہ جمع کثرت ہے اور دس اور اس سے کم کے بارے میں أُلُوفٌ نہیں بولا جاتا۔

ابن زید نے الوف کے لفظ کے بارے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وھم مؤتلفون یعنی انہیں ان کی قوم کے افتراق نے نہیں نکالا اور نہ ان کے درمیان کوئی فتنہ برپا ہوا بلکہ وہ تو ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھتے تھے اور الفت افتراق کے خلاف ہے۔ پس وہ موت سے فرار اختیار کرتے ہوئے اور اپنے خیال کے مطابق زندگی کی خواہش رکھتے ہوئے اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی جگہ موت دے دی جو ان کے گمان کے مطابق ان کے لئے جائے نجات تھی۔ پس اس معنی کی بنا پر الوف آلِف کی جمع ہے۔ جیسا کہ جالس کی جمع جلوس ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک خاص مدت تک موت دی اور پھر انہیں زندہ کر دیا اور سزا کے لئے موت دینے کے بعد زندگی ہے اور اپنی مدت مقررہ پر موت آنے کے بعد زندگی نہیں ہے (2)۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ زندہ کیے گئے اور اپنی قوم کی طرف لوٹے تو وہ پہچانے جا سکتے تھے (کہ وہ مردہ تھے) اور موت کی علامات ان کے چہروں پر تھیں اور ان میں سے کوئی جو کپڑا بھی پہنتا تھا تو وہ میلا سا کفن بن جاتا یہاں تک کہ وہ اپنی اس مدت مقررہ پر فوت ہوئے جو ان کے لئے لکھی گئی تھی۔

ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی اس نسل میں وہ بو باقی ہے۔ اور روایت ہے کہ وہ عراق کے (شہر) واسط کے پاس تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بدبودار ہو جانے کے بعد زندہ کیے گئے، پس وہ بو آج تک ان کی نسل میں موجود ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: حَذَرَ الْمَوْتِ ای لحذر الموت یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے۔ اور یہ بھی مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور مُوتُوا امر تکوین ہے اور کہا جانا بھی بعید نہیں ہے۔ انہیں ندا دی گئی اور انہیں کہا گیا: تم مر جاؤ اور یہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 228، …

بھی بیان کیا گیا ہے کہ دو فرشتوں نے ان کے پاس چیخ لگائی تم مر جاؤ پس وہ مر گئے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو فرشتوں کے واسطہ سے کہا: مُوْتُوْا کہ تم مر جاؤ (1)۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ ان اقوال میں سے زیادہ صحیح (اور زیادہ واضح) اور زیادہ مشہور قول یہ ہے کہ وہ وبا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے۔ اسے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: وہ طاعون سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے نکلے تو وہ مر گئے، پھر انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ انہیں زندہ فرما دے تاکہ وہ اس کی عبادت کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرما دیا (2)۔ اور عمرو بن دینار نے اس آیت کے بارے کہا ہے: ان کی بستی میں طاعون پھیل گیا تو کچھ لوگ وہاں سے نکل گئے اور کچھ لوگ باقی رہ گئے اور نکلنے والوں کی تعداد باقی رہنے والوں کی نسبت زیادہ تھی فرمایا: پس جو نکل گئے وہ محفوظ رہے اور جو وہیں مقیم رہے وہ مر گئے۔ اور جب دوسری بار ایسا ہوا تو سوائے قلیل لوگوں کے وہ تمام کے تمام نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو بھی موت دے دی، پھر انہیں زندہ کر دیا اور وہ اپنے شہروں کی طرف لوٹ گئے اور ان کی اولاد بھی پیدا ہوئی۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ طاعون سے ڈرتے ہوئے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے جانوروں کو ایک ہی ساعت میں مار دیا اور وہ چالیس ہزار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی پر اس آیت میں کئی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ بخاری کے ہیں کہ انہوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سنا وہ حضرت سعد کو حدیث بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا کا ذکر کیا اور فرمایا: ” (یہ) رجز یا عذاب ہے جس کے ساتھ بعض امتوں کو عذاب دیا گیا پھر اس سے کچھ بچ جانے والے باقی رہے اور وہ ایک بار ختم ہو جاتا ہے اور دوسری بار پھر آ جاتا ہے۔ پس جو کوئی اس کے بارے کسی زمین میں سنے تو اسے چاہیے کہ وہ وہاں بالکل نہ آئے اور جو اس علاقے میں ہو کہ وہاں وبا پھیل جائے تو وہ اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلے (3)“۔ اسے ابو عیسیٰ ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: ہمیں قتیبہ نے بیان کیا ہے کہ ہمیں حماد بن زید نے عمرو ابن دینار عن عامر بن سعد عن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے خبر دی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کیا اور فرمایا: ” یہ باقی رہنے والا رجز یا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کی ایک جماعت پر بھیجا گیا۔ پس جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور جب کسی زمین میں واقع ہو اور تم وہاں نہ ہو تو تم وہاں نہ جاؤ (4)“۔ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی حدیث کے مقتضا کے مطابق حضرت عمر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کیا جب وہ مقام سرغ سے اسی وقت واپس لوٹے جب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں حدیث کے بارے خبر دی۔ اسی بنا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 328، دار الکتب العلمیہ
2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 700، دار احیاء التراث العربیہ
3۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، جلد 2، صفحہ 1032، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5288، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 126، وزارت تعلیم۔
ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ الفرار من الطاعون، حدیث نمبر 986، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5286، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پر یہ موطا وغیرہ میں مشہور ہے۔

اور ایک قوم نے وبا اور بیماری والی زمین سے فرار کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: "وبا سے بھاگنا میدان جہاد سے بھاگنے کی طرح ہے"(1) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف نکلنے کا واقعہ معروف ہے اور اس میں ہے کہ آپ واپس لوٹ آئے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس پر دلیل موجود ہے کہ آدمی پر تکلیف اور اذیت ناک چیزوں کے آنے سے پہلے ان سے بچنا اور احتیاط کرنا لازم ہے اور خوف زدہ کرنے والی شے کے ہجوم اور حملے سے پہلے ان سے اجتناب کرنا ایک طرف ہو جانا لازم ہے اور ان کے آنے کے بعد ان پر صبر کرنا اور جزع فزع نہ کرنا لازم ہے اور یہ اس لئے ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے منع فرمایا ہے جو وبا والی زمین میں نہ ہو کہ وہ وبا پھیل جانے کے بعد اس میں داخل ہو اور جو وہاں ہو اسے وبا پھیل جانے کے بعد اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نکلنے سے منع فرمایا ہے۔ یہی ضروری ہے کہ اسی طرح امور کی تکالیف و مصائب سے ہر بچنے والے کے لئے حکم ہو۔ اس میں ان کے لئے طاعون سے بچنے کی راہ بھی ہے اور یہ حضور نبی مکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے اس ارشاد کی مثل ہے: "تم دشمن سے ملاقات کی (جنگ کرنے کی) تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر صبر کرو(2)۔"

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں یہی صحیح ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقتضی ہے اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیکوکار اور عظیم المرتبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس پر بطور حجت فرمایا جب انہوں نے آپ سے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے فرار ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! کاش! تیرے سوا کوئی اور یہ کہتا: ہاں ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی بھاگ رہے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے اور اس کے خلاف جو مقدر فرما دیا ہے اس سے بچنے کے لئے انسان کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ڈرانے والی اور ہلاک کرنے والی اشیاء سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور وسعت و طاقت کے مطابق مکروہات سے بچنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر آپ نے انہیں فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر تیرا اونٹ ہو اور تو وادی میں اترے جس کے دو کنارے ہوں ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو اور دوسرا قحط زدہ ہو۔ کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تو نے سرسبز و شاداب حصہ میں چرایا تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے اور اگر تو نے قحط زدہ حصہ میں چرایا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی جگہ سے مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ گئے۔

الکیا الطبری نے کہا ہے: ہم کوئی اختلاف نہیں جانتے کہ کفار یا ڈاکو جب ایک کمزور شہر کا قصد کریں اور اس کے باسیوں میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کے سامنے سے ہٹ جائیں، اگرچہ موت کی مقررہ مدت

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 139، قدیمی کتب خانہ

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424، وزارت تعلیم، ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2744، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں کوئی زیادتی اور کمی نہیں ہو سکتی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ وبا سے فرار اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وبا کی جگہ میں جو ہو اور اسے شاید اس سے کچھ حصہ لے لیا جائے تاکہ اس مرض عام کے سبب میں اس کا یہ واسطے شریک ہو جائیں اور وہاں سے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہ ہے، بلکہ وہ اسے سفر کی ان مشقتوں کی طرف منسوب کرے گا جو اسے وبا کی مبادیات میں سے پہنچیں۔ پس وہ دکھ تکلیف بڑھ جائے گا اور ضرر زیادہ ہو جائے گا اور وہ ہر راستے میں ہلاک ہو جائیں گے اور وہ ہر کشادہ اور تنگ جگہ میں گر جائیں گے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے جو کوئی وبا سے نہیں بھاگا وہ محفوظ رہا۔ اسے ابن المدائنی نے بیان کیا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی نصیحت کافی ہے کہ فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا۔ شاید اگر وہ فرار ہو اور بچ جائے تو وہ کہنے لگے: بلاشبہ میں نے اپنے نکلنے کے سبب وبا سے نجات پائی ہے تو اس طرح اس کا اعتقاد خراب اور فاسد ہو جائے گا۔ بالجملہ اس سے فرار ممنوع ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں شہروں کو خالی کرنا لازم آتا ہے اور کمزور لوگ اس سے کبھی بری نہیں ہوتے کیونکہ ان پر شہروں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اور ان کے لئے ایسا کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ ان سہولتوں سے شہروں کے خالی ہونے کے سبب اذیت اٹھاتے ہیں جو شہروں کا حصہ ہوتی ہیں اور کمزور لوگوں کے لئے معاون اور مددگار ہوتی ہیں۔

اور جب کسی زمین میں وبا ہو تو وہاں احتیاط، خوف اور ضرر کے مقامات سے پرہیز کرنے کے ارادے سے کوئی نہ آئے اور ایسے وہموں کو دور کرنے کے لئے جو انسان کے دل میں تشویش پیدا کر دیتے ہیں اور وہاں داخل ہونے میں ہلاکت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم میں جائز نہیں ہوتا، کیونکہ مکروہ سے اپنے آپ کو بچانا واجب ہے اور اس پر سوء اعتقاد کا خوف کیا جا سکتا ہے کہ وہ یہ کہنے لگے: اگر میں اس جگہ میں داخل نہ ہوتا تو مجھے یہ تکلیف نہ آتی۔ پس طاعون زدہ علاقے میں داخل ہونے سے منع کرنے یا وہاں سے نکلنے سے منع کرنے میں بڑا فائدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: طاعون مقیم پر اور بھاگنے والے پر ایک آزمائش ہے۔ کیونکہ بھاگنے والا کہتا ہے: میں نے اپنے فرار کے سبب نجات پائی ہے اور مقیم کہتا ہے: میں یہاں مقیم رہا سو میں مر گیا۔ اسی قسم کی طرف امام مالک نے اس وقت اشارہ کیا جس وقت ان سے کوڑھ زدوں کی طرف دیکھنے کی کراہت کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: میں نے اس میں کوئی کراہت نہیں سنی ہے اور جو روایات اس سے نہی کے بارے وارد ہوئی ہیں وہ صرف اس خوف سے ہیں کہ وہ اسے گھبراہٹ اور اضطراب میں مبتلا کر دے گا یا اسے وہ شے (وہم) خوفزدہ کرتی رہے گی جو اس کے دل میں واقع ہو جائے گی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے وبا کے بارے میں فرمایا ہے: "جب تم کسی زمین میں اس کے بارے سنو تو تم اس کی طرف نہ آؤ اور جب وبا پھیل جائے اور تم وہاں ہو تو پھر اس سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو" اور اس شہر کے بارے میں بھی پوچھا گیا جس میں موتیں اور بیماریاں واقع ہو رہی ہوں کیا اس سے نکلنا بھی مکروہ ہے؟ تو فرمایا: میں کوئی حرج نہیں دیکھتا وہ نکلے یا وہیں مقیم رہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد گرامی: "جب کسی زمین میں وبا واقع ہو جائے اور تم وہاں ہو تو اس

سے فرار اختیار کرتے ہوئے نہ نکلو(1)"۔ اس میں اس پر دلیل ہے کہ فرار کے ارادہ کے بغیر طاعون والے شہر سے نکلنا جائز ہے بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ جو کچھ اسے پہنچتا ہے وہ اس سے خطا نہیں ہو سکتا اور اسی طرح تکرر وہاں داخل ہونے کا بھی ہے جبکہ اسے یہ یقین ہو کہ اس کا داخل ہونا اس کی طرف ایسی تقدیر کو نہیں کھینچ سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر نہیں بنائی۔ پس آدمی کے لئے وہاں داخل ہونا اور وہاں سے نکلنا اس حد تک مباح ہے جو ہم نے ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 5۔ طاعون پر صبر کی فضیلت اور اس کے بیان کے بارے میں یہ ہے کہ الطاعون، بروزن فاعول الطعن سے ماخوذ ہے مگر یہ کہ جب اسے اصل معنی سے پھیر دیا گیا تو اسے وبا کے سبب عام موت پر دلالت کرنے کے لئے وضع کر دیا گیا۔ جوہری نے یہی کہا ہے اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہے۔(2)" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: طعن کو تو ہم نے پہچان لیا ہے پس طاعون کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پھوڑا (گلٹی) ہے اونٹ کے پھوڑے (طاعون) کی طرح جو کہ پیٹ سے نیچے والی جگہوں اور بغلوں کے نیچے نکلتا ہے(3)۔

علماء نے کہا ہے: اس وبا کو اللہ تعالیٰ بطور عذاب اور سزا کے اپنے بندوں میں سے گنہگاروں اور کافروں میں سے جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور کبھی اسے صالحین کے لئے شہادت اور رحمت بنا کر بھیج دیتا ہے۔ جیسے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے طاعون عمواس میں کہا: بے شک یہ تمہارے لئے شہادت اور رحمت ہے اور تمہارے نبی علیہ السلام کی دعا ہے: اے اللہ! معاذ اور اس کے گھر والوں کو اپنی رحمت سے ان کا حصہ عطا فرما۔ اور ان کی ہتھیلی میں پھوڑا ہو گیا۔

حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تحقیق میں نے شہادت اور رحمت کو تو پہچان لیا اور میں اسے نہ پہچان سکا کہ یہ تمہارے نبی کی دعا ہے؟ چنانچہ میں نے اس کے بارے پوچھا تو کہا گیا: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی کہ آپ کی امت کی فنا طعن اور طاعون سے ہو، جس وقت آپ نے یہ دعا مانگی کہ آپ کی امت کا آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو اس سے آپ کو روک دیا گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ دعا مانگی۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طاعون سے بھاگنے والا میدان جہاد کے لشکر سے بھاگنے والے کی طرح ہے اور اس میں صبر کرنے والا میدان جہاد میں صبر کرنے والے کی طرح ہے(4)۔" اور بخاری میں حضرت یحییٰ بن یعمر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسے خبر دی کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے پوچھا تو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ایک عذاب ہے جسے اللہ تعالیٰ جن پر چاہتا ہے بھیج دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مومنین کے لئے رحمت بنایا ہے۔ پس کوئی بندہ نہیں ہے جو طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور صبر کرتے ہوئے اسی شہر میں ٹھہرا رہتا ہے اور وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے ہرگز کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 494، وزارت تعلیم
2۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 255، دار صادر بیروت
3۔ ایضاً
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 133، قدیمی کتب خانہ

تھی نے اس کے لئے لکھ دی ہے مگر اس کے لئے شہید کے اجر کی مثل اجر ہے(1)۔“ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی بھی تفسیر ہے کہ ”طاعون شہادت ہے اور مطعون شہید ہے(2)۔“ یعنی اس پر صبر کرنے والا اس کے اجر کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اسے ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے مقدر کی ہے اسی لئے حضرت معاذ بن جبل نے تمنا کی کہ اس میں فوت ہو جائیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو مر گیا وہ شہید ہے اور جو کوئی طاعون سے خوف زدہ ہو گیا اور اسے گمان ہوا اور اس سے بھاگ گیا تو وہ اس حدیث کے معنی میں داخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6: ابو عمر نے کہا ہے: مجھ تک کوئی خبر نہیں پہنچی کہ اہل علم میں سے کوئی طاعون سے بھاگا ہو سوائے اس کے جو ابن مدائنی نے ذکر کی ہے کہ علی بن زید بن جدعان طاعون کی وجہ سے السیالہ (یہ مدینہ منورہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اہل مدینہ کا مکہ کی طرف آتے ہوئے یہ پہلا مرحلہ ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ملل اور روحاء کے درمیان واقع ہے)۔ (شرح الزرقانی) کی طرف چلے گئے اور وہ ہر جمعہ کی نماز میں شریک ہونے کے لئے لوٹ آتے تھے اور جب وہ جمعہ میں شریک ہوتے تو لوگ ان کے بارے پکارتے تھے: فرّ من الطاعون یہ طاعون سے بھاگے ہیں۔ اور وہ السیالہ میں فوت ہوئے۔ ابن مدائنی نے مزید کہا: عمرو بن عبید اور رباط بن محمد رباطیہ کی طرف بھاگ گئے تو ابراہیم بن علی الفقیمی نے اس بارے میں کہا ہے:

ولما استفز الموت كل مكذب   صبرت و لم يصبر رباط ولا عمرو

جب موت نے ہر جھٹلانے والے کو ہلاک و برباد کر دیا (تو) میں نے صبر کیا اور رباط اور عمرو نے صبر نہ کیا۔

اور ابو حاتم نے اصمعی سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: بصرہ کے بعض لوگ طاعون سے بھاگے اور ان میں سے کوئی اپنے گدھے پر سوار ہوا اور سفوان (یہ بصرہ میں باب المربد سے ایک مرحلہ کے فاصلہ پر پانی ہے) معجم یاقوت) کی طرف اپنے گھر والوں کے پاس چلا گیا اور اس نے حدی گانے والے کو سنا جو اس کے پیچھے حدی گا رہا ہے:

لن يسبق الله على حمار   ولا على ذي منعة طيار

او يأتي الحتف على مقدار   قد يصبح الله امام الساري

اور مدائنی نے ذکر کیا ہے: عبدالعزیز بن مروان کی حکومت کے دوران مصر میں طاعون پڑا تو وہ اس سے بھاگتے ہوئے نکل گیا اور الصعید کے دیہاتی علاقوں میں سے ایک دیہات میں جا اترا اسے سُکر (یہ الصعید کے مشرق کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے اور مصر کے درمیان دو دن کا فاصلہ ہے (یاقوت) کہا جاتا ہے۔ تو عبدالعزیز نے اس سے پوچھا: تیرا کیا نام ہے؟ تو اس نے کہا: طالب بن مدرک۔ تو اس نے کہا: اوہ میں اپنے آپ کو فسطاط کی طرف لوٹنے والا نہیں دیکھ رہا۔ پھر وہ اسی گاؤں میں مر گیا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت تعلیم

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، جلد 2، صفحہ 853، وزارت ... ایضاً صحیح بخاری، باب ما یذکر فی الطاعون، حدیث نمبر 5281-82، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"

یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑائی کرنے کا خطاب حضور نبی رحمت ﷺ کی امت کو ہے۔ یہی جمہور کا قول ہے اور اس سے مراد وہ نیت بیان کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند رہے (1)۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور یہ ہر راستے کو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ (آپ فرما دیجئے: یہ میری راہ ہے)

امام مالک نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کے راستے کثیر ہیں اور کوئی راستہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر اس میں یا اس کے لئے قتال نہ کیا جاتا ہو اور ان میں سب سے عظیم دین اسلام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب ان لوگوں کے لئے ہے جو بنی اسرائیل میں سے زندہ کیے گئے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ اور وَقَاتِلُوْا میں واؤ ماقبل امر پر عطف کرنے کے لئے ہے اور کلام میں اس کی تقدیر کو چھوڑ دیا گیا ہے: وقال لهم قاتلوا۔ اور پہلے قول کی بنا پر یہ سارا کلام ماقبل جملہ پر معطوف ہے، اور کلام میں مقدر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

نحاس نے کہا ہے: وَقَاتِلُوْا اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو حکم ہے کہ تم اس طرح نہ بھاگو جیسا کہ وہ بھاگ گئے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یعنی وہ تمہارے اس قول کو بھی سن لے گا اگر تم نے اس کی مثل کہا جیسا کہ انہوں نے کہا اور اس سے تمہاری مراد کو بھی جان لے گا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس قول کی کوئی اصل اور وجہ نہیں ہے جس نے یہ کہا کہ لڑائی کرنے کا حکم ان لوگوں کو ہے جنہیں زندہ کیا گیا۔ واللہ اعلم

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

"کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حق کی راہ پر جہاد اور قتال کرنے کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ شریعت میں سے کوئی شے (حکم) نہیں ہے مگر اس کی حفاظت اور اس کے دفاع میں قتال جائز ہوتا ہے اور ان میں عظیم تر دین اسلام ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں (اپنا مال) خرچ کرنے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 329، دارالکتب العلمیہ

نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا، نہ انہوں نے کسی قیدی کو چھڑایا اور نہ کسی کی معاونت کی۔ اطاعت و پیروی سے سستی اور
کوتاہی کرتے ہوئے اور اس دنیا کی طرف میلان رکھتے ہوئے۔

اور تیسرا گروہ وہ ہے جس نے یہ قول سنا تو اس کی پیروی اور تعمیل میں جلدی کی اور ان میں سے ایک قرض دینے والے نے
تو اپنے مال کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے ترجیح دی جیسا کہ حضرت ابوالدحداح وغیرہ۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 3۔ ارشاد تعالیٰ: قَرْضًا حَسَنًا: القرض کا معنی ہے: اسم لکل ما یلتمس علیہ الجزاء یعنی قرض ہر اس
شے کا نام ہے جس پر وہ جزا کا طالب ہوتا ہے۔ قرض فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو وہ عطا کیا جس کے بدلہ کا وہ اس سے
تقاضا کر سکتا ہے۔ لبید نے کہا:

واذا جوزیت قرضا فاجزہ　　　انما یجزی الفتی لیس الجمل

جب تجھے بطور قرض جزا دی جائے تو تو اس کی جزا دے کیونکہ جوان ہی جزا اور بدلہ دیتا ہے نہ کہ اونٹ۔

اور القرض (قاف کے کسرہ کے ساتھ) بھی ایک لغت ہے جسے کسائی نے بیان کیا ہے اور استقرضت من فلان کا معنی
ہے میں نے اس سے قرض طلب کیا تو اس نے مجھے قرض دے دیا۔ اور اقترضت منہ کا معنی ہے میں نے قرض لیا۔ اور زجاج
نے کہا ہے: لغت میں قرض کا معنی ہے البلاء الحسن والبلاء السیئ یعنی اچھی آزمائش اور بری آزمائش۔ امیہ نے کہا ہے:

کل امرئ سوف یجزی قرضہ حسنا　　　او سیئا و مدینا مثل ما دانا

ہر آدمی کو اس کے قرض کا بدلہ دیا جائے گا چاہے وہ حسن ہو یا سیئ ہو اور جس کو قرض دیا گیا ہے وہ قرض دینے والے کی مثل ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

تجازی القروض بامثالہا　　　فبالخیر خیر و بالشر شرا

قرضوں کا بدلہ ان کی مثلوں کے ساتھ ہی دیا جائے گا یعنی اچھائی کا بدلہ اچھائی کے ساتھ اور شر کا بدلہ شر کے ساتھ ہوگا۔

اور کسائی نے کہا ہے: القرض سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو گزر گئے اور قرض کا اصل معنی قطع کرنا اور کاٹنا ہے اور
اسی سے المقراض (قینچی) ہے۔ اور اقرضتہ سے مراد یہ ہے کہ میں نے اس کے لئے اپنے مال سے ایک حصہ الگ کر دیا ہے تاکہ اس
کا بدلہ دیا جائے گا۔ اور انقرض القوم اس کا معنی ہے ان کا اثر ختم ہو گیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔ اور یہاں پر قرض اسم ہے
اور اگر یہ مصدر ہوتا تو پھر یہاں اقراضا ہوتا۔

اس آیت میں قرض کی استدعا کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی تقریب الی الفہم اور انہیں ایسے انداز سے مانوس کرنے کے
لئے ہے جسے وہ سمجھ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو الغنی الحمید ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بندہ مومن کی وہ عطا جس کے عوض
وہ آخرت میں ثواب کی امید رکھتا ہے اسے قرض کے ساتھ تشبیہ دی ہے جیسا کہ اس نے جنت کے حصول میں جان اور مال
دینے کو بیع اور شراء سے تشبیہ دی ہے۔ اس کا بیان سورۃ برائت میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد صدقہ پر، اور فقراء اور محتاج لوگوں پر مال خرچ کرنے اور ان پر وسعت و خوشحالی

کیا اور ان پر شدت اور سختی کا اظہار کیا تو انہوں نے وہ پورا کر دیا۔ گویا حضرت مریض ہو گئے اور کئی مہینے ٹھہرے رہے (اور ان
سے نہ ملے) پھر ان کے پاس آئے اور کہا: مجھے ایک ہزار درہم میری عطا تک قرض دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں بڑی عزت و
کرامت سے! اے ام عتبہ وہ تھیلا لاؤ جس پر مہر لگی ہوئی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔ راوی کا بیان ہے: چنانچہ وہ لے کر آئی تو
انہوں نے کہا: قسم بخدا! یہ تمہارے وہی دراہم ہیں جو تم نے مجھے دیے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک درہم بھی نہیں ہلایا۔ تو
آپ نے کہا: تیرے باپ کی قسم! جو تو نے میرے ساتھ سلوک کیا کس نے تجھے اس پر ابھارا؟ تو انہوں نے کہا: میں نے تم سے
سنا ہے کہ تم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو
دو بار قرض دیتا ہے تو وہ اس کے ایک بار صدقہ دینے کی طرح ہے (1)۔“ فرمایا: مجھے ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح خبر دی ہے۔

(ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت اس طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو
مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے۔“ اسے ابن حبان نے صحیح قرار
دیا ہے اور بیہقی نے مرفوعاً اور موقوف روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ نمبر 6۔ آدمی کا قرض ایک کا بدل ایک ہوتا ہے یعنی وہ اسی پر اتنی ہی لوٹانے کا جتنا اس نے اسے قرض دیا ہے
اور اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے کہ دنانیر، دراہم، گندم، جو، کھجور، کشمش اور ہر وہ شے طعام میں سے جس کی مثل موجود ہے
اسے قرض کے طور پر لینا جائز ہے اور مسلمانوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہوئے اس پر اجماع کیا ہے کہ قرض
میں زیادتی کی شرط لگانا ربا ہے اگرچہ وہ چارے کی ایک مٹھی ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے یا ایک دانہ
ہو اور جو چیز قرض کے طور پر لی ہے اس سے افضل واپس لوٹانا جائز ہے بشرطیکہ اس کی شرط نہ لگائی جائے، کیونکہ یہ احسان کے
باب سے ہے۔ اور یہ بکر کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے: ”بے شک تم میں سے
بہترین وہ ہے جو قضا کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے (قضاء)۔“ اسے ائمہ نے روایت کیا ہے یعنی بخاری اور مسلم وغیرہما نے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعریف کی ہے جس نے ادائیگی اچھے طریقہ سے کی اور اسے مطلق قرار دیا اور اسے کسی
صفت سے مقید نہ کیا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے البکر کے بارے میں فیصلہ فرمایا اور اس سے مراد نوعمر اور پسندیدہ جوان
اونٹ ہے اور عمدہ اونٹ وہ ہوتا ہے جو رباعی ہو۔ اس میں خیار سے مراد مختار ہے اور رباعی سے مراد وہ ہے جو چوتھے سال میں
داخل ہو، کیونکہ وہ اس میں اپنے رباعیہ دانت گراتا ہے اور یہ وہ دانت ہیں جو ثنایا سے ملے ہوتے ہیں اور یہ چاروں
رباعیات کہلاتے ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور یہ جائز نہیں ہے کہ جس نے قرض لیا ہے وہ قرض دینے والے کو ہدیہ وغیرہ دے اور قرض
دینے والے کو اسے قبول کرنا حلال ہے مگر یہ کہ پہلے بھی دونوں کی عادت ہو (کہ وہ ہدیہ اور تحفہ وغیرہ دیتے رہتے ہوں) سنت
کی صراحت ہے۔ ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ ہشام بن عمار، اسماعیل بن عیاش، عتبہ بن حمید الضبی نے یحییٰ بن ابی اسحاق الہنائی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم

2۔ ایضاً، صفحہ 170

سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنے بھائی کو مال قرض کے طور پر دیتا ہے اور وہ اسے کچھ ہدیہ دیتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ اسے ہدیہ دے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو وہ اسے نہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو مگر یہ کہ ان دونوں کے درمیان اس سے پہلے بھی یہ عادت جاری ہو(1)۔"

مسئلہ نمبر 8۔ قرض مال میں سے ہوتا ہے۔ تحقیق ہم اس کا حکم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ عزت و آبرو سے بھی ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے: "کیا تم میں سے کوئی ابو ضمضم کی طرح ہونے سے عاجز ہوگا کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلا تو کہتا: اے اللہ! میں نے اپنی عزت تیرے بندوں پر صدقہ کر دی(2)۔"

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: "تو اپنی عزت اپنے فقر و افلاس کے دن کے لئے قرض دے دے۔" مراد یہ ہے کہ جو کوئی تجھے گالی گلوچ دے تو تو اس سے حق نہ لے اور نہ تو اس پر حد قائم کر یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے تو وافر اجر دینے والا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے: عزت کو صدقہ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور امام مالک سے مروی ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ فاسد ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حدیث صحیح میں کہا ہے: "بے شک تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں(3)۔" الحدیث۔ اور یہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ تینوں محرمات اس میں ایک کے قائم مقام ہیں کہ ان کا احترام کرنا آدمی کے لئے قرض اور لازم ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: حَسَنًا واقدی نے کہا ہے: جس کی ذات کو اچھا شمار کیا جائے اور عمرو بن عثمان صدفی نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ نہ احسان جتلایا جائے اور نہ ہی اسے اذیت اور پریشانی میں مبتلا کرے۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: وہ اپنے قرض میں کسی عوض کا اعتقاد نہ رکھتا ہو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ عاصم وغیرہ نے فَيُضَاعِفَهُ الف اور فا کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے عین کو مشدد بغیر الف کے اور فا کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابن کثیر، ابو جعفر اور شیبہ نے تشدید اور فا کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے الف کے ساتھ اور فا کو مرفوع پڑھا ہے۔ جنہوں نے اسے رفع دیا ہے انہوں نے یقرض کے ساتھ ملایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تقدیر عبارت ہو یضاعفہ ہے۔ اور جنہوں نے منصوب پڑھا ہے تو انہوں نے فاء کے ساتھ استفہام کا جواب بنایا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے پہلے ان مضمر ہے۔ تشدید اور تخفیف دونوں لغتیں ہیں۔ اور تشدید کی دلیل اضعافا کثیرۃ ہے کیونکہ تشدید کثرت بیان کرنے کے لئے ہوتی ہے اور حسن اور سدی نے کہا ہے: ہم اس تضعیف (کئی گنا) کو نہیں جانتے مگر صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 177، وزارت تعلیم۔ سنن ابن ماجہ، باب القرض، حدیث نمبر 2422، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 231، دار الفکر

3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 632، وزارت تعلیم

ارشاد گرامی ہے: وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جہاد کے نفقہ کے بارے میں ہے اور ہم حساب لگاتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تھے کہ ایک آدمی کا خرچ اپنی ذات پر اور اپنے رفقاء پر اور اپنی سواری پر سات سو گنا تھا۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ یہ ہر شے میں عام ہے، وہی روزی تنگ کرنے والا ہے اور روزی فراخ اور کشادہ کرنے والا ہے۔ ہم نے "شرح الاسماء الحسنیٰ فی الکتاب الاسنیٰ" میں ان دونوں پر بحث کی ہے۔ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یہ وعید ہے کہ وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ ۘ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ۝

"کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تاکہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں۔ نبی نے کہا: کہیں ایسا تو نہ ہو کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد تو تم جہاد نہ کرو۔ وہ کہنے لگے: (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔"

قتال اور جنگ پر برانگیختہ کرنے کے بارے میں دوسرا قصہ بیان فرمایا جو بنی اسرائیل میں پیش آیا۔ الملا کا معنی ہے اشراف قوم، گویا کہ وہ شرف و عزت سے بھرے ہوتے ہیں اور زجاج نے کہا ہے: انہیں یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ ان چیزوں سے بھرے ہوتے تھے جن کی انہیں ضرورت اور احتیاج ہوتی تھی۔

اور اس آیت میں الملا سے مراد قوم ہے، کیونکہ معنی اس کا تقاضا کرتا ہے اور الملا اسم جمع ہے جیسا کہ قوم اور رھط وغیرہ۔ اور الملا کا معنی حسن خلق بھی ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: احسنوا الملا فکلکم سیروی (1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے: تم اخلاق اچھے کرو تو تم تمام کے تمام سیراب (خوشحال) ہو جاؤ گے۔

قولہ تعالیٰ: مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد۔ إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا کہا گیا ہے کہ وہ نبی حضرت شمویل بن بال بن علقمہ تھے اور وہ ابن العجوز کے لقب سے معروف تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شمعون تھے۔ سدی نے یہی کہا ہے اور بلاشبہ کہا گیا ہے کہ ابن العجوز لقب اس لئے تھا کہ ان کی ماں بوڑھی تھی تو اس نے

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 240، وزارت تعلیم

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بیٹے کی التجا کی حالانکہ وہ بوڑھی اور بانجھ ہو چکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہ عطا فرما دیا اور انہیں سمعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس بڑھیا نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ وہ اسے بیٹا عطا فرمائے تو رب کریم نے اس کی دعا سن لی اور بڑھیا نے بچے کو جنم دیا۔ پس اس نے اس کا نام سمعون رکھا، وہ کہتی: اللہ تعالیٰ نے میری دعا سن لی ہے اور سین عبرانی زبان میں شین ہو جاتی ہے اور وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے اور حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ حضرت یوشع بن نون تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے اور درمیان میں لوگوں کی کئی امتیں ہیں۔ اور حضرت یوشع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غلام تھے[1] اور محاسبی نے ذکر کیا ہے کہ ان کا نام اسماعیل تھا۔ واللہ اعلم

یہ آیت بنی اسرائیل کی اس قوم کے بارے خبر ہے جنہیں ذلت نے آلیا اور دشمن نے ان پر غلبہ پالیا تو انہوں نے جہاد کے بارے اجازت طلب کی کہ انہیں اس کا حکم دیا جائے اور جب انہیں حکم دیا گیا تو ان میں سے اکثر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور قلیل لوگ ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ مذکورہ لوگ وہی ہیں جنہیں موت دی گئی اور پھر وہ زندہ کر دیے گئے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: نُّقَاتِلْ یہ نون اور جزم کے ساتھ ہے اور جمہور قراء کی قراءت جواب امر کی بنا پر ہے اور ضحاک اور ابن ابی عبلہ نے یاء کے ساتھ اور فعل کو مرفوع پڑھا ہے (یعنی یقاتل) اور یہ الملک کی صفت کے محل میں ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اور یہ عَسَيْتُمْ بھی ہے یعنی فتحہ اور کسرہ کے ساتھ دو لغتیں ہیں۔ دوسری کے مطابق حضرت نافع نے قراءت کی ہے اور باقیوں نے پہلی کے مطابق (یعنی فتحہ کے ساتھ) اور یہی مشہور ہے۔

ابو حاتم نے کہا ہے: کسرہ کی کوئی وجہ (اور علت) نہیں ہے اور اس کے ساتھ حسن اور طلحہ نے پڑھا ہے۔

مکی نے اسم فاعل میں کہا ہے: عَسٍ اور یہ ماضی میں سین کے کسرہ پر دلالت کرتا ہے اور سین پر فتحہ یا لغت مشہورہ ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: کسرہ کی وجہ عربوں کا یہ قول ہے: هو عس بذلك مثل حر اور شج۔ اور یہ فَعِل اور فَعِيل دونوں کے وزن پر آیا ہے جیسا کہ نَقِمَ اور نَقَمَ میں ہے اور اسی طرح عَسَيْتُ اور عَسِيْتُ ہے۔ پس اگر فعل کی نسبت اسم ظاہر کی طرف کی جائے تو عَسِيْتُمْ میں قیاس یہ ہے کہ کہا جائے: عَسِيَ زَيْدٌ مثلاً رَضِيَ زَيْدٌ اور اگر یہ کہا جائے تو یہ قیاس کے مطابق ہے اور اگر نہ کہا جائے تو پھر جائز ہے کہ دونوں لغتیں ملا دی جائیں۔ اور دونوں میں سے ایک دوسری کی جگہ استعمال ہوتی رہے۔ اور اس کلام کا معنی یہ ہے کیا تم پیٹھ پھیرنے اور فرار اختیار کرنے کے قریب ہو؟ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا۔[2]

زجاج نے کہا ہے: أَلَّا تُقَاتِلُوا یہ محل نصب میں ہے یعنی هل عسيتم مقاتلة (کیا تم لڑائی نہ کرنے کے قریب ہو) قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اخفش نے کہا ہے: اس میں أن زائدہ ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ اپنے معنی پر محمول

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 330، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 330-331

ہے۔ یعنی وما منعنا (یعنی کون سی شے ہمارے لئے رکاوٹ ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: مالک الا تفعل؟ ما منعک یعنی کون سی شے تیرے لئے نہ پڑھنے سے رکاوٹ ہے۔

اور کہا گیا ہے: یعنی یہ ہے ہمارے لئے اس میں کون سی شے ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ نہیں کریں گے۔ نحاس نے کہا: یعنی زید وحدہ اور سیجا ہے۔ اور "ان" محل نصب میں ہے۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا یہ علت بیان کر رہی ہے اور اسی طرح وَاَبْنَآئِنَا بھی ہے یعنی اپنی اولادوں کے سبب سے (ہم ضرور لڑیں گے)

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ یعنی جب ان پر فرض کر دیا گیا تو تَوَلَّوْا اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب اس نے ان پر قتال فرض کیا اور انہوں نے حقیقت کو دیکھا تو جنگ لڑنے کے بارے میں ان کے افکار تبدیل ہو گئے اور ان کی جانیں نکلنے لگیں۔ تَوَلَّوْا یعنی ان کی نیتیں مضطرب ہو گئیں اور ان کے عزائم ڈھیلے پڑ گئے۔ یہ حال ہے ان امتوں کا جو بڑی خوشحال اور متنعم تھیں اور انہوں نے خوشحالی کے اوقات میں جنگ کی تمنا کرتے ہوئے دعا کی درخواست کی اور جب جنگ چھڑ گئی تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور اپنی طبع کی پیروی کی۔

اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ نے بھی اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ منع فرمایا ہے: "تم دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کی التجا کرو اور جب تمہارا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو پھر تم ثابت قدم رہو (1)" اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے قلیل لوگوں کی خبر دی کہ وہ اپنی نیت پر ثابت اور مستحکم رہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرنے پر ان کے ارادے برقرار رہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

"اور کہا انہیں ان کے نبی نے: بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر۔ بولے: کیوں کر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں۔ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا یعنی تم نے جو اللہ تعالیٰ سے مانگا ہے اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 424

تمہاری دعا کو قبول کر لیا ہے اور طالوت پانی پلاتے تھے۔ بعض نے کہا: وہ چمڑا رنگنے کا کام کرتے تھے اور بعض نے کہا ہے: وہ اجرت پر کام کرتے تھے اور عالم بھی تھے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بادشاہ بنا دیا جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ وہ حضرت بنیامین کے قبیلے سے تھے اور وہ نہ نبوت کے قبیلے سے تھے اور نہ ہی بادشاہت کے قبیلے سے۔ اور نبوت بنی لاوی میں تھی اور بادشاہت یہودا کے قبیلے میں تھی اسی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب بنی اسرائیل نے کہا جو انہوں نے حضرت شمویل بن بالی علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کی کہ وہ ان کی طرف ایک امیر اور بادشاہ بھیجے اور اس پر راہنمائی بھی فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم اپنے اس سینگ کی طرف دیکھو جس میں تیل تمہارے گھر میں پڑا ہے۔ جب کوئی آدمی تمہارے پاس آئے اور وہ تیل جوش مار کر آواز نکالنے لگے جو سینگ میں ہے تو وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ ہو گا اور اس تیل میں سے اس کے سر پر دو اور اسے ان پر بادشاہ مقرر کر دو۔

فرمایا: طالوت چمڑے کی دباغت کا کام کرتے تھے۔ ان کا جانور گم ہو گیا اور وہ اس کی تلاش میں نکلے اور حضرت شمویل علیہ السلام کے گھر کا قصد کیا تاکہ وہ اپنے لئے جانور کے معاملے میں دعا کریں یا ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ پائیں کہ امید لگ جائے تو تیل میں جوش پیدا ہو گیا جیسا ان کا گمان تھا۔ بیان کیا: پس حضرت شمویل علیہ السلام ان کے پاس کھڑے ہوئے اور اسے اٹھایا اور اس میں سے کچھ تیل طالوت کے سر پر لگایا اور انہیں فرمایا: تو ان بنی اسرائیل کا بادشاہ اور امیر ہے جن کے بارے اس نے مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (1)۔ پھر بنی اسرائیل کو فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ اور امیر مقرر کیا ہے۔

طالوت اور جالوت یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دونوں معرب ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں منصرف نہیں (2)۔ اسی طرح داؤد بھی ہے۔ ان کی جمع طوالیت، جوالیت اور دوادیہ ہے۔ اور اگر کسی آدمی کا نام طاؤس اور راقود رکھا جائے تو یہ دونوں منصرف ہوں گے اگرچہ یہ دونوں عجمی ہیں۔

ان کے اور پہلے کے درمیان فرق یہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں: الطاؤس، پس الف لام داخل ہوتے ہیں اور یہ عربی میں بھی منصرف بنا دیئے گئے ہیں اور پہلے انہیں متمکن نہیں بنا سکتے (یعنی طالوت اور جالوت کو)۔

قولہ تعالیٰ: اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا یعنی وہ کیسے ہمارا امیر بن سکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کا حق رکھتے ہیں؟ وہ انبیاء علیہم السلام کو تکلیف پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے تکبر اور انکار کے بارے میں اپنے طریقے پر چلتے رہے اور انہوں نے کہا: "انّٰی" یعنی کیف ان کی جہت سے۔ پس "انّٰی" یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔

حالانکہ ہم بادشاہ کے قبیلے سے ہیں اور وہ اس طرح نہیں ہے اور وہ فقیر اور مفلس ہے۔ پس انہوں نے اس اقویٰ سبب کو چھوڑ دیا اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور پہلے سے اس کا فیصلہ ہے۔ یہاں تک کہ ان کے نبی علیہ السلام نے اس قول کے ساتھ

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 719-718

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

ان پر حجت اور دلیل بیان فرمائی: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے چن لیا ہے اور یہی حجت قاطعہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے لئے طالوت کو چننے کی علت بھی بیان فرمادی اور وہ اس کی علم میں کشادگی اور وسعت ہے جو انسان کی بقا ہے اور وہ جسم ہے جو جنگ میں اس کا معاون اور مقابلے کے وقت اس کا سامان جنگ ہے۔ پس یہ آیت امام کی صفت اور امامت کے احوال کے بیان کو متضمن ہے اور بلاشبہ اس کے لئے علم، دین اور قوت کا ہونا ضروری ہے نہ کہ نسب کا۔ پس اس میں علم اور فضائل نفس کے ساتھ نسب کا کوئی حصہ نہیں ہے اور بلاشبہ یہ نسب پر مقدم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اس نے طالوت کو ان پر علم اور اس کی قوت کی وجہ سے اختیار اور ترجیح دی ہے، اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ اعلیٰ اور اشرف ہیں۔ اور سورت کے پہلے حصہ میں امامت اور اس کی شرائط کا ذکر گزر چکا ہے جو کافی ہے اور دوبارہ اس کے بیان کی حاجت نہیں اور یہ آیت اس میں اصل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اس وقت طالوت بنی اسرائیل میں سب سے بڑا عالم تھا اور بڑا خوبصورت اور طاقتور انسان تھا اور وہ اتنا جسیم تھا کہ دشمن بھی اس سے خوف کھاتے تھے۔ کہا گیا ہے کہ اس کا نام طالوت اس کی قد و قامت طویل ہونے کی وجہ سے تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جسم کی زیادتی سے مراد خیر اور شجاعت کے اوصاف کی کثرت ہے اور اس سے جسم کا عظیم ہونا مراد نہیں ہے۔ کیا آپ شاعر کے قول کی طرف نہیں دیکھتے:

ترى الرجل النحيف فتزدريه ۔۔۔ وفي أثوابه أسد هصور

ويعجبك الطرير فتبتليه ۔۔۔ فيخلف ظنك الرجل الطرير

وقد عظم البعير بغير لب ۔۔۔ فلم يستغن بالعظم البعير

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی معنی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج مطہرات کے لئے ارشاد ہے: "تم میں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مجھے وہ ملے گی جس کا ہاتھ تم میں سے زیادہ طویل ہوگا"۔ پس وہ آپس میں طوالت کو دیکھنے لگیں۔ تو ان میں حضرت زینب پہلے فوت ہوئیں، کیونکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتی تھیں اور صدقہ کرتی تھیں (1)۔ اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے: علم سے مراد جنگ کا علم ہے اور یہ بغیر دلیل کے عام کی تخصیص ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: علم کی زیادتی اس اعتبار سے تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی اور یہ اس بنا پر ہے کہ طالوت نبی ہو۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۔ بعض تاویل کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ رب العالمین کا یہ ارشاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شمویل علیہ السلام کے قول میں سے ہے اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ آپ نے انہیں یہ تب کہا جب آپ نے دلائل میں ان کی سرکشی اور ان کے جھگڑے کو دیکھا تو ارادہ کیا کہ آپ اپنی کلام کو ایسی قطعی دلیل سے مکمل کریں جس پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 291، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1331، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(اور اللہ تعالیٰ اپنا ملک عطا فرما دیتا ہے جسے چاہتا ہے) اور دنیوی ملک کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف مملوک کی اضافت مالک کی طرف کرنے کی طرح ہے۔ پھر ان کے لئے رغبت اور تنبیہ کی بنا پر ان کی طرف سے سوال کے بغیر فرمایا: اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ یہ احتمال رکھتا ہے کہ انہوں نے آپ سے اس قول میں صدق پر دلیل طلب کی ہے: اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پہلا قول سیاق آیت کے مطابق زیادہ ظاہر ہے اور دوسرا بنی اسرائیل کے اخلاق ذمیمہ کے زیادہ مشابہ ہے، یہ موقف طبری نے اختیار کیا ہے (1)۔

وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۟

"اور کہا انہیں ان کے نبی نے کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق اس میں تسلی (کا سامان) ہوگا تمہارے رب کی طرف سے اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون اٹھالائیں گے اس صندوق کو فرشتے۔ بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو۔"

قولہ تعالیٰ: وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ یعنی اتیان التابوت ہے، یعنی تابوت کا آنا ان کی بادشاہی کی نشانی ہے اور تابوت (صندوق) کے بارے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدم علیہ السلام پر نازل فرمایا (اتارا) اور وہ آپ کے پاس رہا، یہاں تک کہ (وراثۃ) چلتے چلتے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل اس کی برکت سے ان پر غالب آتے تھے جو کوئی ان سے جنگ لڑتے حتیٰ کہ بنی اسرائیل نافرمان ہو گئے تو ان سے تابوت چھین لیا گیا اور عمالقہ نے اسے چھینا تھا۔ سدی کے قول کے مطابق وہ جالوت اور اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے ان سے تابوت چھین لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس پر سب سے بڑی دلیل ہے کہ نافرمانی (گناہوں کی کثرت) ذلت و رسوائی کا سبب ہے اور یہ بالکل بین اور واضح ہے۔

نحاس نے کہا ہے کہ تابوت میں تسلی اس طور پر تھی کہ یہ مروی ہے اس میں سے رونے کی آواز سنائی دیتی تھی، پس جب وہ اسے سنتے تو وہ جنگ کے لئے چل پڑتے تھے اور جب یہ آواز پرسکون ہو جاتی تو نہ وہ چلتے اور نہ ہی تابوت چلتا۔

اور یہ قول بھی ہے کہ وہ اسے میدان جنگ میں رکھتے تھے اور وہ مسلسل غالب آتے رہے یہاں تک کہ وہ نافرمان اور گستاخ ہو گئے تو وہ مغلوب ہو گئے اور ان سے تابوت لے لیا گیا اور وہ ذلیل و رسوا ہو گئے۔ پس جب انہوں نے ہلاکت اور اپنا قلع قمع ہونے کی علامت دیکھی تو ان میں سے بعض نے اسے ناپسند کیا اور وہ اپنے معاملات میں مشاورت کرنے لگے یہاں تک کہ ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 332، دار الکتب العلمیہ

ایسی شے ہے جس کی روح ہے، کیونکہ قرآن کا سننا صحیح نہیں ہوتا مگر اس کے لئے جو عقل رکھتا ہے۔ واللہ اعلم

قولہ تعالیٰ: وَبَقِيَّةٌ۔ بقیۃ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

سو کہا گیا ہے: (اس میں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور تختیوں کے ٹکڑے تھے کیونکہ وہ ٹوٹ گئی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں پھینکا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی بیان کیا ہے اور عکرمہ نے یہ زائد کہا ہے کہ اس میں تورات بھی تھی۔

اور ابو صالح نے کہا ہے: بقیۃ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، آپ کا لباس، حضرت ہارون علیہ السلام کے کپڑے اور تورات کی دو تختیاں ہیں۔

اور عطیہ بن سعد نے کہا ہے: اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کا عصا، دونوں کے کپڑے اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔

اور ثوری نے کہا ہے: لوگوں میں سے کچھ کہتے ہیں کہ البقیۃ سے مراد سونے کی طشتری میں دو قفیز من (وہ کھانا جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، حضرت ہارون علیہ السلام کا عمامہ شریف اور تختیوں کے ٹکڑے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: عصا اور نعلین مراد ہیں (1)۔

اور جو کچھ اس بارے روایت ہے اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اپنی قوم کے پاس تختیاں لے کر آئے اور آپ نے انہیں بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے پایا تو آپ نے غصے میں آ کر وہ تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ پس آپ نے ان میں سے جو صحیح تھیں انہیں نکال لیا اور جو ٹوٹ گئی تھیں ان کے ٹکڑے اٹھا لئے اور انہیں تابوت میں رکھ دیا۔

اور ضحاک نے کہا ہے: البقیۃ سے مراد جہاد کرنا اور دشمنوں سے قتال کرنا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: تابوت کے بارے میں ان میں سے کوئی امر ہو، یا تو اس میں لکھا ہوا ہے اور یا پھر اس کی ذات کا لوٹانا ہی اس کے بارے میں امر کی طرح ہے۔ اور تبرک کی نسبت آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام کی طرف اس حیثیت سے کی گئی کہ حکم ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف لکھا ہوا تھا اور وہ تمام کے تمام آل موسیٰ اور آل ہارون علیہما السلام ہی تھے اور کسی آدمی کی آل سے مراد اس کے قرابتدار ہوتے ہیں (2)۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۗ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّٰبِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

"پھر جب روانہ ہوا طالوت اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے سو جس نے پانی پی لیا اس سے تو وہ نہیں میرے ساتھیوں سے اور جس نے نہ چکھا اسے تو یقیناً وہ میرے ساتھیوں میں سے ہے مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے۔ پس سب نے پی لیا اس سے مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ کہنے لگے: کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی (تو) کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ، فَصَلَ کا معنی ہے جب وہ ان کے ساتھ نکلا۔ فصلت الشیء فانفصل یعنی میں نے شے کو کاٹا پس وہ کٹ گئی۔

حضرت وہب بن منبہ نے کہا ہے: جب طالوت روانہ ہوا تو لشکریوں نے اسے کہا: بے شک ہم سے نہیں اٹھایا جا سکے گا پس آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارے لئے نہر جاری کر دے۔ تو طالوت نے انہیں کہا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے۔

سدی کے قول کے مطابق فوجوں کی تعداد اسی ہزار تھی۔ اور حضرت وہب نے کہا ہے کوئی بھی اس سے پیچھے نہ رہا تھا سوائے اس کے جو صغر سنی یا کبر سنی یا مرض کی وجہ سے معذور تھا (1)۔ اور ابتلاء کا معنی الاختبار (آزمائش) اور امتحان ہے۔ اور نہر اور النہر یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی السعة سے ہے (یعنی وسعت و خوشحالی) اور اسی سے النہار بھی ہے۔ تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا: وہ نہر جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمایا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان ہے (2)۔ جمہور نے بنہر کو ہا کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مجاہد اور حمید الاعرج نے بنہرٍ ہا کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے اور اس ابتلاء کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا، پس جس کی اطاعت وجود پانی کو ترک کرنے میں ظاہر ہوئی تو اس کے بارے یہ معلوم ہو گا کہ وہ اس کے سوا دیگر امور میں بھی مطیع و فرمانبردار رہے گا۔ اور جس پر پانی کے بارے میں اس کی خواہش اور طلب غالب رہی اور اس نے حکم کی نافرمانی کی تو وہ دشوار اور ہولناک تکالیف و مصائب میں نافرمان ہو گا۔

پس روایت ہے کہ وہ نہر پر پہنچے اس حال میں کہ پیاس انہیں لگی ہوئی تھی اور نہر کا پانی انتہائی میٹھا اور خوبصورت تھا۔ اسی لئے اطاعت کرنے والوں کو چلو میں لینے کی رخصت دی گئی تاکہ اس سے شدت پیاس کی اذیت کچھ تو ختم ہو جائے اور ان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 334، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

حال میں وہ نفس کا جھگڑا ختم کر سکیں (1) اور یہ بیان فرمایا کہ زندگی کی تنگی پر صبر کرنے والوں کی احتیاط کے وقت پیاس کے ضرر اور تکلیف کو ختم کرنے کے لئے ایک چلو کافی ہوتا ہے کہ جس کا قصد وارادہ آسودگی اور خوشگواری نہ ہو۔ جیسا کہ عروہ نے کہا ہے:

وأحسوا قراح الماء والماء بارد

اور انہوں نے خالص پانی تھوڑا تھوڑا پیا اور پانی ٹھنڈا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس معنی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: حسب المرء لقيمات يقمن صلبه۔(2) آدمی کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی صلب (ریڑھ کی ہڈی مراد پشت) کو سیدھا رکھ سکیں۔

اور بعض وہ لوگ جو معانی کی گہرائی میں غور و فکر کرتے ہیں انہوں نے کہا ہے: یہ آیت ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے بیان فرمائی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دنیا کو نہر سے تشبیہ دی ہے اور اس سے پانی پینے والے کو اس سے جو دنیا کی طرف مائل ہے اور اس سے حظ وافر لینے کا طالب ہے اور پانی نہ پینے والے کو دنیا سے انحراف کرنے والے اور اس میں زہد و تقویٰ اختیار کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے ایک چلو لینے والے کو دنیا میں بقدر حاجت لینے والے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تینوں احوال مختلف ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کتنی حسین تعبیر ہے اگر اس تاویل میں تحریف اور ظاہر معنی سے خروج کا اندیشہ نہ ہو لیکن اس کا صحیح معنی دوسرا ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ طالوت نبی تھے انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس کی طرف وحی اور الہام فرمایا اور اس نے الہام کو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے آزمائش قرار دے دیا۔ اور جنہوں نے کہا وہ نبی نہ تھا انہوں نے کہا: اسے ان کے نبی حضرت شمویل علیہ السلام نے وحی کے سبب اس کی خبر دی جب طالوت نے اپنی قوم کو اس کے بارے آگاہ کیا اور بلاشبہ یہ آزمائش اس لئے آئی تاکہ صادق اور کاذب کے مابین تمیز ہو سکے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کی اطاعت و پیروی کو آزمانے کے لئے انہیں آگ روشن کرنے اور پھر اس میں کود جانے کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن اسے اس معنی پر محمول کیا گیا کہ یہ آپ کا اس امر سے ڈرانے کے لئے مزاح ہے جس کا آپ نے انہیں مکلف اور پابند بنایا تھا۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي یہاں شرب بمعنی کرع ہے (یعنی پانی پر منہ رکھ کر بلاواسطہ

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 324، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 60، وزارت تعلیم

ایضاً جامع ترمذی، باب ما جاء فی کراہیۃ کثرۃ الاکل، حدیث نمبر 2302، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الکرع کا معنی ہے کہ آدمی دریا سے اپنا منہ لگا کر بلا واسطہ پانی پیے۔ اور اگر اس نے اپنے ہاتھ سے پانی پیا یا برتن کے ساتھ اس سے پیا تو وہ آزاد نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دریا میں منہ لگا کر پانی پینے اور ہاتھ کے ساتھ پانی پینے کے درمیان فرق کیا ہے (1)۔ فرمایا: یہ فاسد ہے، کیونکہ شرب الماء کا اطلاق لغت عرب میں ہر ہیئت اور صفت پر کیا جاتا ہے۔ ہاتھ کے ساتھ چلو بھر کر یا منہ لگا کر پینا ایک ہی ہے اور جب لغۃً اور حقیقۃً وہ شرب پایا گیا جس کی قسم کھائی گئی ہے تو وہ حانث ہو گیا۔ پس اسے جان لو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اہل لغت نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے جیسا کہ کتاب و سنت نے فرق بیان کیا ہے۔

جوہری وغیرہ نے کہا ہے: کرع فی الماء کرعا (کہا جاتا ہے) جب کوئی اپنے منہ کے ساتھ پانی اس کے محل سے پیے نہ وہ ہتھیلی کے ساتھ پیے اور نہ کسی برتن کے ساتھ اور اس میں دوسری لغت ہے۔ کرع یعنی را کے کسرہ کے ساتھ یکرع، کرعا۔ اور الکرع سے مراد بارش کا پانی ہے جو منہ میں پڑتا ہے۔

اور رہی حدیث صحیحہ تو ابن ماجہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے کہ واصل بن عبد الاعلیٰ، ابن فضیل نے لیث عن سعید بن عامر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے اور ہم اس میں منہ لگا کر پانی پینے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھو اور پھر ان سے پانی پیو کیونکہ ہاتھ سے بڑھ کر اچھا اور پاکیزہ برتن کوئی نہیں ہے (2)۔ اور یہ نص ہے۔ لیث بن ابی سلیم مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ۔ الاغتراف کا معنی ہے: کسی شے سے ہاتھ اور کسی آلہ سے لینا۔ اور اسی سے المغرفۃ (چمچ) ہے۔ اور الغرف، الاغتراف کا ہم معنی ہے۔ اور غرفۃ غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ مصدر ہے اور اغترافۃ نہیں کہا، کیونکہ الغرف اور الاغتراف کا معنی ایک ہے۔ اور الغرفۃ کا معنی ہے ایک بار۔ اور اسے غرفۃ غین کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ شی ہے جس کا چلو بھرا جاتا ہے اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ الغرفۃ ایک ہاتھ کے ساتھ چلو بھرنا اور الغرفۃ دو ہاتھوں کے ساتھ چلو بھرنا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہتھیلیاں صاف ترین برتن ہیں۔ اسی معنی میں حسن کا قول ہے:

لا يدلفون الى ماء بآنية ... الا اغترافا من الغدران بالراح

الدلیف کا معنی ہے آہستہ چلنا۔

وہ برتن لے کر پانی کی طرف آہستہ چال نہیں چلتے مگر تالاب سے ہتھیلی کے ساتھ چلو بھرتے ہوئے (لیتے ہیں)۔

1۔ احکام القرآن ابن العربی، جلد 1، صفحہ 323، دار الفکر

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاشربہ، جلد 1، صفحہ 253، وزارت تعلیم۔ ایضاً، ابواب الاشربہ، باب الشرب بالاکف والکرع، حدیث نمبر 3423، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انجام دیتے رہے۔ اس کا بیان سورۂ آل عمران میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

"پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے۔ اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو اور عطا فرمائی داؤد کو اللہ نے حکومت اور دانائی اور سکھا دیا اس کو جو چاہا اور اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے تو برباد ہو جاتی زمین لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر"

قولہ تعالیٰ: فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر مدد و نصرت نازل فرمائی۔ فَهَزَمُوْهُمْ تو انہوں نے انہیں شکست دی (ان کو کچل کر توڑ دی) اور الہزم کا معنی ہے توڑنا۔ اور اسی سے ہے سقاء مُتَهَزِّم یعنی ایسی مشک جو خشکی کے سبب ٹوٹ جائے اور اسی سے وہ قول ہے جو زمزم کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا گڑھا ہے (هَزْمَةُ جبریل) یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے زمین کو اپنے پاؤں سے پیچھے دبایا، گڑھا بن گیا اور پانی نکل آیا۔ اور الہزم سے مراد وہ خشک لکڑی بھی ہے جو ٹوٹ جاتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ اس لئے کہ طالوت بادشاہ تھا اور جالوت کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے یا اپنی قوم میں سے چنا گیا تھا۔ یہ قد و قامت کے اعتبار سے چھوٹا، زیادہ تر بیمار رہنے والا، زرد رنگ کا تھا اس کی (آنکھیں چھوٹی اور نیلی تھیں۔) اور جالوت لوگوں میں سے انتہائی مضبوط اور بہت زیادہ قوی تھا۔ اور یہ اکیلا لشکروں کو شکست دے سکتا تھا اور جالوت کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ وہ عمالقہ کا امیر اور سردار تھا اور (قتل کرنے والے) داؤد ابن ایشی تھے۔ یہ ایشی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور کہا جاتا ہے: داؤد بن زکریا بن رشوی تھے، یہ یہوذا بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی اولاد میں سے تھے اور بیت المقدس کے رہنے والے تھے۔ ان کو نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں اکٹھی عطا فرما دی گئیں۔ اس سے پہلے یہ چرواہے تھے اور یہ اپنے بھائیوں میں سے چھوٹے تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے اور ان کے سات بھائی اصحاب طالوت میں سے تھے۔ پس جب جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دل میں کہا: میں ضرور بضرور اس جنگ کو دیکھنے کے لئے جاؤں گا، جب اس راستے پر چلے ایک پتھر کے پاس سے گزرے تو اس نے آپ کو آواز دی اے داؤد! مجھے اٹھا لے اور میرے ساتھ تو جالوت کو قتل کرے گا، پھر ایک دوسرے پتھر نے انہیں آواز دی، پھر ایک اور نے آواز دی، پس آپ نے انہیں اٹھا لیا اور انہیں اپنے توبرے میں رکھ لیا اور چل پڑے۔ پس جالوت (لشکر کی صفوں سے) باہر نکلا اور دعوت مبارزت دینے لگا تو لوگوں نے اس کے مقابلے کی جرأت نہ کی اور کمزوری دکھائی یہاں تک کہ طالوت نے کہا: جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا میں اس کا نکاح اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے مال میں حکم بناؤں گا، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام

آپ نے اور کہا: میں اس کے ساتھ مقابلہ کروں گا اور اسے قتل کردوں گا(1)۔ لیکن طالوت نے جب ان کی صغرسنی اور چھوٹے قد کو دیکھا تو انہیں کمزور قرار دے کر واپس لوٹا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام تینوں چھوٹے قد کے تھے۔ پھر طالوت نے دوبارہ اور سہ بارہ اعلان کیا اور پھر بھی حضرت داؤد علیہ السلام ہی باہر نکلے۔ تب طالوت نے ان سے کہا: کیا تو اپنی ذات میں کسی شے سے تجربہ رکھتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ اس نے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: ایک دفعہ ایک بھیڑیا میرے ریوڑ میں داخل ہو گیا تو میں نے اسے مارا، پھر اس کے سر کو پکڑ لیا اور میں نے اسے اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ طالوت نے کہا: بھیڑیا تو کمزور ہے، کیا اس کے علاوہ بھی تو کوئی تجربہ رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ایک دفعہ ایک شیر میرے ریوڑ میں آگیا تو میں نے اسے مارا، پھر میں نے اسے جبڑوں سے پکڑ لیا اور میں نے ان دونوں کو چیر ڈالا۔ کیا تو اسے شیر سے بھی زیادہ طاقتور جانتا ہے؟ جالوت نے کہا: نہیں۔ طالوت کے پاس ایک زرہ تھی اور وہ اسی پر پوری آسکتی تھی جو جالوت کو قتل کرے گا۔ پس اس نے اس کے بارے آپ کو آگاہ کیا اور وہ زرہ آپ پر ڈال دی تو وہ بالکل برابر ہو گئی۔ پھر طالوت نے کہا: تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جا، میرا ہتھیار پکڑ لے (اور اس کے مقابلے میں جا)۔ چنانچہ آپ نے ایسا کر لیا لیکن جب تھوڑا سا چلے تو واپس لوٹ آئے اور لوگوں نے کہا: یہ نوجوان تو بزدل ہو گیا ہے۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے میرے سبب قتل نہ کیا اور اس کے خلاف اس نے میری مدد نہ فرمائی تو پھر یہ گھوڑا اور یہ ہتھیار میرے لئے نفع بخش نہیں ہیں۔ البتہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اس سے اپنی عادت کے مطابق ہی لڑوں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام معقلاع (پتھر پھینکنے کا گوپھیا فلاخن) کے ساتھ پتھر پھینکنے کے لوگوں کی نسبت زیادہ ماہر تھے۔ پس آپ (گھوڑے سے) اترے اور اپنے توبرے کو اٹھایا اور اسے لٹکا لیا اور اپنا گوپھیا اٹھایا اور جالوت کی طرف چل نکلے۔ وہ مکمل اپنے ہتھیار پہنے ہوئے تھا اس کے سر پر خود تھا اس میں تین سو رطل تھے، جیسا کہ الماوردی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ تو جالوت نے انہیں کہا: اے نوجوان! تو میری طرف نکلا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: اس طرح جیسا کہ تو کتے کی طرف نکلا ہے۔ آپ نے فرمایا: ہاں، بلکہ تو اس سے بھی آسان ہے۔ فرمایا: میں یقیناً آج تیرا گوشت پرندوں اور درندوں کو کھلاؤں گا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیر جانتے ہوئے انہیں اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا ہاتھ پتھر کی طرف بڑھایا۔ اور روایت ہے کہ وہ پتھر جڑ چکے تھے اور وہ ایک پتھر بن گیا تھا۔ سو آپ نے اسے پکڑا اور اپنے گوپھیے میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور اسے گھمایا اور پھینک دیا، پس وہ جالوت کے سر میں جا لگا اور اسے قتل کر دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر اپنے توبرے میں رکھ لیا اور لوگوں میں مل گئے۔ اور جالوت کی فوج نے منہ موڑ لیا اور انہیں ہزیمت اور شکست ہوئی(2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پتھر خود سے ناک کی جگہ پر جا لگا۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے آنکھ پر جا کر لگا اور اس کی گدی کی جانب سے نکل گیا اور اس کے لشکر کی ایک جماعت کو جا کر لگا اور اس نے انہیں قتل کر دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ پتھر ٹوٹ کر بکھر گیا یہاں تک کہ لشکر کے ہر فرد کو اس کا کچھ حصہ جا کر لگا اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دارالکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

(مگر یہ اس کی) اس مشقت کی طرح تھا جو حضور نبی کریم ﷺ نے غزوہ حنین کے دن بنی ہوازن پر پھینکی۔ واللہ اعلم

ان آیات کے قصص میں لوگوں نے بہت زیادہ بیان کیا ہے اور میں نے تیرے لئے ان میں سے خاص مقصود کو ہی ذکر کیا ہے وللہ الحمد۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: طالوت کے اس قول کے بارے میں ہے "جو اس کا مقابلہ کرے گا اور اسے قتل کرے گا تو میں اس کی شادی اپنی بیٹی سے کروں گا اور اسے اپنے مال میں حکم بناؤں گا" یہ مفہوم ہماری شریعت میں بھی ثابت اور موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ امام وقت کہے: جو فلاں کا سر لائے گا تو اس کے لئے اتنا ہوگا، یا جو فلاں کو قیدی بنا کر لائے تو اس کے لئے اتنا انعام ہوگا۔ اس کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ مبارزت امام کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی، جیسا کہ امام احمد اور اسحاق وغیرہما اس کے بارے کہتے ہیں اور اس میں امام اوزاعی سے اختلاف منقول ہے، سو ان سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی بھی امام کی اجازت کے بغیر حملہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر امام مبارزت سے روک دے تو پھر اس کی اجازت کے بغیر کوئی مبارز طلب نہ کرے گا۔

اور ایک گروہ نے مقابلے کو مباح قرار دیا ہے اور انہوں نے امام کی اجازت ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ امام مالک کا قول ہے۔

امام مالک سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا جو دو صفوں کے درمیان کہتا ہے: کون مقابلہ کرے گا؟ تو انہوں نے فرمایا: اس کا انحصار اس کی نیت پر ہے، اگر اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ رکھتا ہے تو میں امید رکھتا ہوں کہ اس کے لئے کوئی حرج نہ ہوگا۔ زمانہ ماضی میں ایسا کیا جاتا رہا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: مبارزت طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن منذر نے کہا ہے: امام کی اجازت کے ساتھ مبارزت طلب کرنا اچھا ہے اور اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے جس نے امام کی اجازت کے بغیر مبارز طلب کیا یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں کوئی مانع خبر نہیں ہے۔

وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ سدی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو طالوت کا ملک (بادشاہی) اور شمعون کی نبوت عطا فرمائی۔ اور وہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں علم عطا فرمایا وہ زرہیں بنانے اور پرندوں کی گفتگو سمجھنے اور دیگر ان علوم کی انواع میں سے کئی عطا فرمائے جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو عطا فرمائے ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک زنجیر عطا فرمائی جو کہکشاں اور فلک سے ملا ہوا تھا اور اس کا ایک سرا حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ کے پاس تھا اور ہوا میں جو واقعہ بھی پیش آتا زنجیر بجنے لگتا اور اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہو جاتا اور جو چیز بھی پیدا ہوتی اور کوئی آفت زدہ اسے چھو لیتا تو وہ اس سے نجات پا جاتا اور وہ آپ کی قوم کے دین میں داخل ہونے کی علامت تھی کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں کے ساتھ مس کرتے پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے سینوں پر مل لیتے اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 337، دارالکتب العلمیہ

کے بعد ان کے پاس فیصلے کرتے تھے یہاں تک کہ اسے اٹھا لیا گیا۔

قولہ تعالیٰ: وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ یعنی مما شاء ہے اور کبھی ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ رکھ دیا جاتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ اسی طرح تمام کی قرأت ہے سوائے حضرت نافع کے کیونکہ انہوں نے دفاع پڑھا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کا مصدر ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے: حسبت الشئ حسابا، آب ایابا، لقیتہ لقاء، اور اسی کی مثل کتبہ کتابا ہے اور اسی سے کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (النساء:24) بھی ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا ہے۔ پس دفاع اور دفع دونوں دفع کے مصدر ہوں گے۔ یہی سیبویہ کا مذہب ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: دافع اور دفع دونوں کا معنی ایک ہے جیسا طارقت النعل اور طارقت ہے یعنی میں نے جوتے کو ایک دوسرے پر سیا۔ الخصف کا معنی الخرز (سینا) ہے۔

ابو عبیدہ نے جمہور کی قرأت کو اختیار کیا ہے (یعنی) وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ اور انہوں نے دفاع پڑھنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی غالب نہیں آسکتا۔ مکی نے کہا ہے: یہ وہم ہے باب مفاعلہ نے اس میں وہم پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے۔ اور لفظ اللہ فعل کے سبب محل رفع میں ہے یعنی لولا ان یدفع اللہ۔ اور دفاع سیبویہ کے نزدیک مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے۔ الناس مفعول ہے اور بعضھم الناس سے بدل ہے اور ببعض سیبویہ کے نزدیک مفعول ثانی کے محل میں ہے اور یہ ان کے نزدیک تیرے اس قول کی مثل ہے: ذھبت بزید تو اس میں زید مفعول کے محل میں ہے۔ اسے جان لو۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء کا ان لوگوں کے بارے میں اختلاف ہے جنہیں فساد سے بچایا گیا ہے وہ کون ہیں؟

تو کہا گیا ہے: وہ ابدال ہیں اور وہ چالیس آدمی ہیں ان میں سے جب بھی کوئی فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا بدل بنا دیتا ہے۔ اور جب قیامت قریب ہوگی تو وہ تمام فوت ہو جائیں گے ان میں سے بائیس شام میں ہیں اور اٹھارہ عراق میں ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ان الابدال یکونون بالشام وھم اربعون رجلا کلما مات منھم رجل ابدل اللہ مکانہ رجلا یسقی بھم الغیث و ینصر بھم علی الاعداء ویصرف بھم عن اھل الارض البلاء (1) (کہ بلاشبہ ابدال شام میں ہوں گے اور وہ چالیس آدمی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی آدمی فوت ہو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا آدمی مقرر فرما دے گا۔ ان کے سبب اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، ان کے سبب دشمنوں کے خلاف مدد فرماتا ہے اور ان کے سبب اہل زمین سے بلائیں اور مصیبتیں دور فرماتا ہے۔) اسے امام ترمذی نے نوادر الاصول میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے انہوں نے کہا: بلاشبہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات زمین کے اوتاد تھے اور جب نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی امت میں

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، ذکر الیمن والشام، جلد 1، صفحہ 582

امت سے ایک جماعت کو ان کا بدل بنا دیا۔ انہیں ابدال کہا جاتا ہے۔ اور کثرت صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے ان لوگوں کو فضیلت نہیں دی گئی، بلکہ حسن خلق، صدق و ورع، حسن نیت، تمام مسلمانوں کے لئے دلوں کا صاف اور سلامت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے انہیں صبر، حلم، دانشمندی اور بغیر کسی ذلت کے تواضع و انکساری اختیار کرنے کی نصیحت کرنے کے سبب انہیں فضیلت دی گئی ہے۔ اور وہ انبیاء علیہم السلام کے خلفاء ہیں وہ ایسی قوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے چن لیا ہے اور انہیں اپنی ذات کے بارے میں اپنے علم کے ساتھ خالص اور مختص کر لیا ہے اور وہ چالیس صدیق ہیں ان میں سے تیس آدمی حضرت ابراہیم خلیل الرحمن کے یقین کی مثل پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سبب اہل زمین سے مصائب اور لوگوں سے آفات اور آزمائشوں کو دور فرماتا ہے اور ان کے سبب ہی زمین پر بارش برسائی جاتی ہے اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ان میں سے کوئی آدمی فوت نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایسا آدمی پیدا فرما دے جو اس کا خلیفہ اور نائب ہوگا (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی فوجوں کے سبب دشمنوں کو دور نہ کرتا تو مشرکین غالب آجاتے اور وہ مومنین کو قتل کرتے اور شہروں اور مساجد کو برباد کر دیتے۔

اور حضرت سفیان ثوری نے کہا ہے: مراد وہ گواہی اور شہادت دینے والے لوگ ہیں جن کے سبب حقوق حاصل کیے جاتے ہیں اور مکی نے بیان کیا ہے کہ اکثر مفسرین نے یہی معنی بیان کیا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے سبب انہیں نہ بچاتے جو نماز نہیں پڑھتے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کے سبب ان کی حفاظت نہ کرے جو تقویٰ اختیار نہیں کرتے تو وہ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دے (2)۔

اسی طرح نحاس اور ثعلبی نے بھی ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے کہا ہے اور تمام مفسرین نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ نیکوکار مومن کو فاجر اور کفار سے نہ بچائے تو زمین برباد اور فاسد ہو جائے۔ اور ایک حدیث ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کے نماز پڑھنے والوں کے سبب نماز نہ پڑھنے والوں سے اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے سبب زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں سے اور روزے رکھنے والوں کے سبب روزے نہ رکھنے والوں سے اور حج کرنے والوں کے سبب حج نہ کرنے والوں سے اور جہاد کرنے والوں کے سبب جہاد نہ کرنے والوں سے عذاب دور فرماتا رہے گا اور اگر وہ ان اعمال کے ترک کرنے پر جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ انہیں آنکھ جھپکنے کی بھی مہلت نہ دے گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے ارشاد فرمایا: ان للہ ملائکۃ تنادی کل یوم لولا عباد رکع واطفال رضع وبہائم رتع لصب علیکم العذاب صبا (بے شک اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو ہر روز ندا دیتے ہیں: اگر عبادت گزار بندے نہ ہوتے، شیر خوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب موسلا دھار برسا دیا جاتا) (3)۔ اسے

1۔ نوادر الاصول فی معرفۃ احادیث الرسول، جلد 1، صفحہ 69، دار صادر بیروت

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 155، حدیث نمبر 9820، دار الکتب العلمیہ

ابو بکر الخطیب نے اسی معنی میں حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

منصور نے ابراہیم عن علقمہ عن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم میں خشوع کرنے والے آدمی، چرنے والے جانور اور شیر خوار بچے نہ ہوں تو مومنین پر موسلادھار عذاب برسا دیا جائے (1)۔

بعض نے یہ معنی لیا اور کہا:

لولا عباد للإله ركع　　و صبية من اليتامى رضع

اگر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے نہ ہوں اور شیر خوار یتیم بچے نہ ہوں۔

و مهملات في الفلاة رتع　　صب عليكم العذاب الأوجع

اور جنگل میں چھوڑے گئے چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر دردناک عذاب موسلادھار برسا دیا جائے۔

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ آدمی کے اپنے بیٹے اور پوتے کی اصلاح کرنے کے سبب اس کی اصلاح فرما دیتا ہے اس کے گھر والوں کی اور اس کے ارد گرد کے گھروں کی (اصلاح فرما دیتا ہے) اور وہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہتے ہیں جب تک وہ ان میں ہو۔" (2)

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کے سبب آزماتا ہے اور کافر کو مومن کے سبب عافیت عطا کرتا ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إن الله ليدفع بالمؤمن الصالح عن مائة من اهل بيته و جيرانه البلاء بے شک اللہ تعالیٰ نیک صالح مومن کے سبب اس کے گھر والوں اور پڑوسیوں میں سے سو افراد سے مصیبت اور آفت کو دور فرماتا ہے (3)۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

اور کہا گیا ہے: یہ دفاع اور بچاؤ اس شریعت کے سبب ہے جو انبیاء و رسل علیہم السلام کی زبانوں پر شریعتوں میں سے جاری ہوئیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاء چھینتے اور ایک دوسرے کا سامان لوٹتے اور ہلاک ہو جاتے۔ یہ حسین قول ہے کیونکہ روکنے اور دفاع وغیرہ میں عموم ہے۔ پس اس میں غور کر لو۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے کفار کے شر کو دور کرنا یہ اس کا فضل اور خاص انعام ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝

"یہ آیتیں ہیں اللہ کی ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر (اے حبیب!) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔"

تِلْكَ مبتدا ہے، اور اٰيٰتُ اللّٰهِ اس کی خبر ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور خبر نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ بنا لے۔ وَاِنَّكَ

1۔ السنن الکبری للبیہقی، صلاۃ الاستسقاء، جلد 3، صفحہ 345، دار الفکر

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 2، صفحہ 755

3۔ تفسیر معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 355، دار الفکر بیروت

لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ یہ اِنَّ کی خبر ہے یعنی وانک لمرسل۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو آگاہ فرمایا ہے کہ یہ آیات وہ ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہیں نبی مرسل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

"یہ سب رسول ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کیے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ الرُّسُلُ یہاں تلک فرمایا ہے۔ ذلک نہیں فرمایا تو یہ لفظ جمع کی تانیث کی رعایت کرتے ہوئے کہا ہے اور یہ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے اور الرُّسُلُ اس کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر مابعد جملہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرسل عطف بیان ہے اور فَضَّلْنَا خبر ہے۔ یہ مشکل آیت ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لا تخیروا بین الانبیاء(1) (تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دو) اور مزید فرمایا: لا تفضلوا بین انبیاء اللہ(2) (تم اللہ تعالیٰ کے انبیاء کے درمیان کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دو) انہیں ائمہ ثقات نے روایت کیا ہے۔ یعنی تم یہ نہ کہو فلاں فلاں سے بہتر ہے اور نہ یہ کہو فلاں فلاں سے افضل ہے۔ کہا جاتا ہے: خیر فلان بین فلان و فلان (فلاں نے فلاں فلاں کے درمیان ایک کو بہتر قرار دیا) اور فضیلت دی جب اس نے یہ کہا تو اس میں (فضل) مشدد ہوگا۔

اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ پس ایک قوم نے کہا ہے: یہ حکم آپ ﷺ کی طرف تفضیل کے بارے وحی نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور آپ کے یہ جاننے سے پہلے کا ہے کہ آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں۔ اور بلاشبہ قرآن کریم فضیلت دینے سے روکنے والے حکم کے لئے ناسخ ہے۔

اور ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ ﷺ کے ارشاد انا سید ولد آدم(3) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں) سے مراد قیامت کا دن ہے (یعنی قیامت کے دن آپ اولاد آدم کے سردار ہوں گے) کیونکہ اس دن آپ ﷺ شفاعت فرمائیں

1۔ مشکوۃ المصابیح، باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء، جلد 1، صفحہ 507۔　　2۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 485، وزارت تعلیم

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 328 ... صحیح بخاری، کتاب التفسیر سورہ بنی اسرائیل، حدیث 4343، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس نبوت کی جہت سے یہ ہے جو ایک خصلت ہے جس میں کسی کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں، بلکہ یہ فضیلت احوال، خصوصیات، کرامات و الطاف میں زیادتی اور متفرق معجزات کی بنا پر ہے اور رہی نبوت فی ذاتہا تو اس میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نہیں، بلکہ یہ تفاضل دوسرے امور کے سبب ثابت ہوتا ہے جو اس پر مستزاد ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں سے بعض رسل اولوالعزم ہیں اور ان میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی عطا فرمایا اور ان میں سے بعض کے درجات بلند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) (اور تحقیق ہم نے بعض انبیا کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی۔ اور مزید فرمایا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اچھا قول ہے، کیونکہ اس نے بغیر نسخ کے آیات اور احادیث کے درمیان تطبیق کر دی ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا قول ان فضائل کی بنا پر ہے جو انہیں عطا فرمائے گئے اور ان وسائل کی وجہ سے ہے جو انہیں دیے گئے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیا علیہم السلام پر اور اہل آسمان پر فضیلت دی ہے تو صحابہ نے پوچھا: اے ابن عباس رضی اللہ عنہما! کیونکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان والوں پر فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْۤ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی۔ یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو۔)

اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ (الفتح) (یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی ہے تا کہ دور فرما دے آپ کے لیے اللہ تعالیٰ جو الزام آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو ہجرت کے بعد لگائے گئے۔) پھر انہوں نے کہا: انبیا علیہم السلام پر آپ کی فضیلت کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم: 4) (اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس قوم کی زبان کے ساتھ تا کہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لیے (احکام الٰہی کو) اور اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ارشاد فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (السبا: 28) (اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف) یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن و انس کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اسے ابو محمد الدارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: خیر بنی آدم نوح و ابراهيم و موسى و محمد صلی اللہ علیہ وسلم (1) کہ بنی آدم میں سے افضل اور بہتر حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہی رسولوں میں سے اولوالعزم ہیں۔ اور یہ تعیین بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے نص ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنہیں رسالت عطا فرمائی گئی ہے وہ ان سے افضل ہیں جنہیں رسالت نہیں دی گئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دارالکتب العلمیہ

تو بلاشبہ جنہیں رسالت دی گئی ہے انہیں رسالت کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ نبوت میں برابر ہیں، یہاں تک کہ رسولوں کو بھی اپنی امتوں کی جانب سے تکذیب اور انہیں قتل کرنے جیسی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں اور یہ ایسی شے ہے جس میں کوئی خفا نہیں ہے مگر ابن عطیہ ابو محمد عبدالحق نے کہا ہے: بلاشبہ قرآن کریم تفضیل کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ فی الجملہ ہے اس میں کسی ایک مفضول کی تعیین نہیں ہے اور اسی طرح احادیث بھی ہیں اور اسی لئے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انا اکرم ولد آدم علی ربی (1) (میں اپنے رب کے نزدیک (تمام) اولاد آدم سے زیادہ معزز ہوں) اور فرمایا: "میں اولاد آدم کا سردار ہوں (2)" اور آپ نے تعیین نہیں فرمائی۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "کسی کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں (3)۔" اور فرمایا: "تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو (4)۔" اور ابن عطیہ نے کہا ہے: ان میں مفضول کی تعیین سے نہی کے ساتھ منع کیا گیا ہے، کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام نوجوان تھے اور آپ اعبائے نبوت کے نیچے دب گئے تو جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ حکم توقیفی ہے تو دوسروں کے لئے تو بدرجہ اولیٰ ہوگا (5)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے وہی اولیٰ ہے ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ خبر دی ہے کہ اس نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو وہ بعض فضیلت والے انبیاء کو بیان بھی کرتا ہے اور ان احوال کا ذکر بھی کرتا ہے جن کے سبب انہیں فضیلت دی گئی ہے۔ پس اس نے فرمایا ہے: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ (البقرہ: ۲۵۳) (ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کئے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں۔)

اور مزید فرمایا: وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی اور مزید فرمایا: وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ (اور ہم نے اسے انجیل عطا فرمائی) وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِيَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (الانبیاء) (اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیزگاروں کے لئے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا (النمل: 15) (اور تحقیق ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا فرمایا) اور مزید فرمایا: وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ (الاحزاب: 7) (اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے بھی اور نوح سے بھی) پس یہ عام بیان کیا پھر خاص بیان کیا اور آغاز حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اسی طرح گفتگو صحابہ کرام کے بارے میں بھی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ وہ شرف صحبت میں تمام

1۔ مشکوۃ المصابیح فضل سید المرسلین جلد 1 صفحہ 514۔ جامع ترمذی باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابن ماجہ کتاب الزہد جلد 1 صفحہ 329 وزارت تعلیم
3۔ صحیح بخاری کتاب الانبیاء جلد 1 صفحہ 485 وزارت تعلیم
4۔ ایضاً
5۔ المحرر الوجیز جلد 1 صفحہ 338 دارالکتب العلمیہ

مشترک ہیں، پھر ان فضائل میں وہ متفرق اور جدا جدا ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں مواہب و وسائل میں سے عطا فرمائے ہیں۔ پس وہ ان کے سبب ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اس کے باوجود ان تمام کو صحابیت، عدالت اور ان کی تعریف وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی کافی ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: 29) ((جو ان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادتمند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر طاقتور ہیں) اور مزید فرمایا: وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا (الفتح: 26) (اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اس کے اہل بھی تھے۔) پھر فرمایا: لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ (الحدید: 10) (تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی) اور مزید فرمایا: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (الفتح: 18) (یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ کی اس درخت کے نیچے۔) پس یہ بھی عام اور خاص بیان ہے۔ اور ان سے عیب اور نقص کی نفی کی ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین ونفعنا بحبهم آمین۔

قولہ تعالیٰ: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ جس سے کلام کی گئی ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے عرض کی گئی: کیا وہ نبی مرسل تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں وہ نبی مکلم تھے" (یعنی جن سے کلام کی گئی۔) ابن عطیہ نے کہا ہے: بعض لوگوں نے تاویل بیان کی ہے کہ آدم علیہ السلام کو شرف ہمکلامی جنت میں عطا ہوا، اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت باقی رہ گئی (1)۔ عبارت سے اسم کے طویل ہونے کے سبب ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل عبارت ہے: من كلمه الله۔

قولہ تعالیٰ: وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ نحاس نے کہا ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق یہاں بَعْضَهُمْ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں سرخ و سیاہ کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میرے لئے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنادی گئی اور ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی اور میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں (2) اور مجھے شفاعت عطا کی گئی۔" اور اسی سے قرآن کریم، چاند کا شق ہونا، درخت کا آپ سے کلام کرنا، چند کھجوروں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑی مخلوق کو کھانا اور ام معبد کی بکری کے خشک ہونے کے بعد اسے دوہنا وغیرہ تمام معجزات آپ کے متعلق ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور زائد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے عظیم تر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ انبیاء علیہم السلام کو ختم کیا گیا۔ علاوہ ازیں وہ خلق عظیم ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اور لفظ یہ احتمال رکھتا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سوا وہ تمام ہوں جن کی آیات و معجزات بڑے بڑے ہیں۔ اور کلام کا ذکر تاکید ہو سکتا ہے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مکان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 338، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، جلد 1، صفحہ 199، وزارت تعلیم

حسن نے کہا ہے: یہ فرض زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ اور ابن جریج اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ آیت فرض زکوٰۃ اور نفلی صدقات وغیرہ کو جامع ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صحیح ہے لیکن ماقبل آیات قتال کے ذکر میں ہیں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ اس کو روکتا ہے جو کافروں کے حق میں ہے اور اس سے یہ موقف ترجیح پاتا ہے کہ اس سے مراد ندباً اور مستحباً اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنا ہے۔ اور آیت کے آخر میں یہ قول اسے مزید تقویت دیتا ہے: وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی تم ان سے اپنی جانوں کے ساتھ لڑتے ہوئے اور اموال خرچ کرتے ہوئے مقابلہ کرو۔(1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس دلیل پر ایک بار مال خرچ کرنا واجب ہوگا اور ایک بار مستحب جہاد کے متعین ہونے اور اس کے عدم تعین کے اعتبار سے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس (مال) سے خرچ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا اور جس کے ساتھ ان پر انعام کیا۔ اور انہیں روک کر رکھنے سے ڈرایا یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی خرید و فروخت ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی کسی نفقہ کو پانا ممکن ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ (تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تاکہ میں صدقہ (و خیرات) کر لیتا۔)

اور الخلۃ سے مراد خالص دوستی ہے۔ یہ تخلل الاسرار بین الصدیقین سے ماخوذ ہے۔ (دو دوستوں کے درمیان راز نفوذ کر جاتے ہیں) اور الخلالۃ، الخلالۃ، الخلالۃ تمام کا معنی دوستی اور محبت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

وکیف تواصل من اصبحت　　خلالتہ　　کابی　　مرحب

تو اسے کیسے ملتا ہے جس کی دوستی ابو مرحب کی طرح ہوگئی ہے۔

اور ابو مرحب سائے کی کنیت ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: یہ اس عرقوب کی کنیت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: مواعید عرقوب (عرقوب کے وعدے)۔ اور الخلۃ سے مراد میٹھی اور شیریں گھاس بھی ہے جو عام بوٹی سے خالی ہو۔ کہا جاتا ہے: الخلۃ خبز الابل والحمض فاکھتھا (شیریں گھاس اونٹ کی روٹی ہے اور نمکین و ترش گھاس اس کا پھل ہے۔) اور الخلۃ (خاء کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی حاجت و فقر ہے اور الخلۃ کا معنی ابن مخاض بھی ہے۔ (یعنی ایک سال کا اونٹ) اور یہ اصمعی سے روایت ہے۔ کہا جاتا ہے: اتاھم بقرص کانہ فرسن خلۃ (وہ ان کے پاس ایک ٹکیہ لے کر آیا گویا کہ وہ اونٹ کا کھر ہے۔) اس کا مؤنث بھی خلۃ ہی ہے۔ اور میت کے لئے کہا جاتا ہے: اللھم اسدد خلتہ (اے اللہ! اس کے اس خلل کی اصلاح فرما دے جو اس نے چھوڑا ہے۔) اور الخلۃ کا معنی ترش و نمکین گھاس بھی ہے۔

اور الخلۃ یہ خلل السیف کا واحد مؤنث ہے۔ اور یہ وہ غلاف ہیں جن کے ساتھ تلواروں کی میانوں کو ڈھانپا جاتا ہے اور یہ سونے وغیرہ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے: خلۃ تلبس ظهر سية القوس یعنی وہ لکڑی جو قوس کی دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 339، دارالکتب العلمیہ

طرفوں کے ظاہر کو پہنا دیئے جاتے ہیں اور الخلۃ کا معنی دوستی بھی ہے جو دلوں میں باقی رہ جاتی ہے۔ اس کا بیان سورۃ النساء میں الخلیل کے مادہ اشتقاق اور اس کے معنی کی بحث میں آئے گا۔

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آخرت میں نہ کوئی دوستی ہوگی اور نہ شفاعت مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت ہے جس کے ساتھ وہ اسے شرف بخشے گا جسے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ نصب کے ساتھ بغیر تنوین کے قراءت کی ہے اور اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَا بَيْعَ فِيْهِ وَلَا خِلٰلَ۔

اور سورۃ الطور میں ہے لَا لَغْوَ فِيْهَا وَلَا تَأْثِيْمَ۔(1)

اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے:

الا طِعَانَ وَلَا فُرْسَانَ عَادِيَةٌ ۔۔۔ إِلَّا تَجَشُّؤُكُمْ عِنْدَ التَّنَانِيرِ

اس میں بھی لا طعان ولا فرسان منصوب ہیں۔

ہمزہ استفہام لا کے عمل کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے: الا رجل عندک۔ اور یہ بھی جائز ہے الا رجل ولا امرأۃ۔ جیسا کہ بغیر استفہام کے ایسا کہنا جائز ہے۔ پس تو اسے جان لے۔

باقی تمام نے اسے رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ الراعی نے کہا ہے:

وما صَرَمْتُكِ حتى قُلْتِ مُعْلِنَةً ۔۔۔ لا نَاقَةٌ لِيَ فِي هَذَا وَلَا جَمَلُ

اور میں نے تجھے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ تو نے اعلان کرتے ہوئے کہا اس میں نہ میری کوئی اونٹنی ہے اور نہ کوئی اونٹ ہے اور یہ روایت بھی کی گئی ہے: وما ھجرتک۔ پس فتحہ نفی عام پر دلالت کرتا ہے جو اس صنف کی تمام وجوہ کو مستغرق ہے۔ گویا کہ یہ جواب ہے اس کا جس نے کہا: کیا اس میں بیع ہوگی؟ پس سائل نے عام سوال کیا تو پھر جواب بھی نفی عام کے ساتھ دیا جائے گا۔ اور لا اسم منفی کے ساتھ مل کر ایک اسم کے قائم مقام ہے جو مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور فیہ خبر ہے۔ اور اگر چاہے تو اسے بیع کی صفت بنا لے اور جنہوں نے رفع دیا ہے انہوں نے لا کو بمنزلہ لیس قرار دیا ہے اور جواب کو غیر عام بنایا ہے اور گویا یہ اس کا جواب ہے جس نے کہا: "کیا اس میں بیع ہوگی؟" یعنی کلام میں بیع سے پہلے من کو ساقط کر دیا ہے۔ پس جواب ایسا لایا گیا جو رفع سے اسے تبدیل کرنے والا نہیں اور اسم مرفوع مبتدا ہے یا لیس کا اسم ہے اور فیہ خبر ہے۔

مکی نے کہا ہے: بہتر اور عمدہ رفع ہے، کیونکہ کثیر قراء نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ دیگر کلام میں لا بیع فیہ ولا خلۃ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور حمیہ نے بنی مذحج کے ایک آدمی کے لئے کہا ہے:

هذا لَعَمْرُكُمُ الصَّغَارُ بِعَيْنِهِ ۔۔۔ لا أُمَّ لِي إِنْ كَانَ ذَاكَ وَلَا أَبُ

اس میں بھی لا ام لی ولا اب پڑھا گیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 340، دار الکتب العلمیہ

اور جائز ہے کہ پہلے کو مبنی (برفتح) پڑھا جائے اور دوسرے کو نصب اور تنوین دی جائے۔ جیسا کہ تو کہہ سکتا ہے: لا رجل فیہ ولا امرأۃ، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے:

لا نسب الیوم ولا خلۃ اتسع الخرق علی الراقع

اور لا دونوں مقامات میں زائدہ ہے، پہلے کا عطف محل پر ہے اور دوسرے کا لفظ پر ہے۔ اور پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلے کو رفع دیا جائے گا اور دوسرے کو مبنی پڑھا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کا قول: لا رجل فیہا ولا امرأۃ، جیسا کہ امیہ نے کہا ہے:

فلا لغو ولا تأثیم فیہا وما فاھوا بہ ابدا مقیم

اعراب کی پانچوں وجہیں تیرے اس قول میں جائز ہیں: لا حول ولا قوۃ الا باللہ، یہ پہلے گزر چکا ہے۔ [illegible] والکفرون یہ مبتدا ہے۔ ھم یہ مبتدائے ثانی ہے: الظلمون یہ دوسرے مبتدا کی خبر ہے اور اگر تو چاہے تو ھم ضمیر کو زائدہ بنا دے بطور ضمیر فصل کے۔ اور الظلمون خبر ہے الکفرون کی۔ عطاء بن دینار نے کہا ہے(1): سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے یہ کہا ہے: والکفرون ھم الظلمون اور یہ نہیں کہا ہے: والظلمون ھم الکفرون (یعنی یہ کہا ہے کہ کفار ظالم ہیں یہ نہیں کہا ہے کہ ظالم کافر ہیں۔)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

"اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے۔ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم سے مگر جتنا وہ چاہے۔ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اور نہیں تھکاتی اسے زمین و آسمان کی حفاظت اور وہی ہے سب سے بلند عظمت والا۔"

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ یہ آیۃ الکرسی ہے، یہ قرآن کی آیات کی سردار ہے اور سب سے بڑی آیت ہے جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ یہ رات کے وقت نازل ہوئی اور حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زید کو بلایا اور یہ آیت لکھوا دی۔

حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جب آیۃ الکرسی نازل ہوئی دنیا میں تمام بت گر گئے اور اسی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 526

طرح دنیا میں تمام بادشاہ گر پڑے اور ان کے سروں سے تاج گر گئے اور شیاطین بھاگ پڑے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو مارنے لگے اور ابلیس کے پاس تمام جمع ہو گئے اور اسے اس کے بارے مطلع کیا تو اس نے انہیں کہا کہ وہ اس کے بارے تفتیش کریں۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف آئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ ائمہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس قرآن کریم میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟" انہوں نے کہا: میں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اے ابا المنذر! کیا تو جانتا ہے تیرے پاس کتاب اللہ میں سے کون سی آیت سب سے بڑی ہے؟" تو میں نے عرض کی: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: "اے ابا المنذر! تجھے علم مبارک ہو(1)"۔ حکیم ترمذی ابو عبداللہ نے یہ اضافہ ذکر کیا ہے: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں ساق عرش کے پاس شہنشاہ مطلق کی پاکی بیان کرتی ہے(2)"۔

ابو عبداللہ نے کہا ہے: یہ آیت اللہ تعالیٰ جل ذکرہ نے اسے نازل فرمایا اور اس کا ثواب اس کے پڑھنے والے کے لئے دنیا اور آخرت میں رکھا ہے۔ پس دنیا میں تو یہ ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کی آفات و مصائب سے حفاظت کرتی ہے۔ نوف البکالی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: آیت الکرسی تورات میں ولیۃ اللہ کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے پڑھنے والوں کو ملکوت السموات والارض میں عزیز پکارا جاتا ہے۔ فرمایا: حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو وہ اپنے گھر کے چاروں کونوں میں آیۃ الکرسی پڑھتے تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اس کے ذریعے چاروں اطراف سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتے تھے اور یہ کہ شیطان آپ کے گھر کے کونوں سے آپ سے دور ہو جائے(3)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ایک جن سے کشتی کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پچھاڑ دیا تو جن نے آپ کو کہا: مجھے چھوڑ دو یہاں تک کہ میں آپ کو وہ بتاتا ہوں جس کے ساتھ تم ہم سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ تو آپ نے اسے چھوڑ دیا اور اس سے پوچھا تو اس نے کہا: بلاشبہ تم ہم سے آیۃ الکرسی کے ساتھ محفوظ رہ سکتے ہو(4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ صحیح ہے اور حدیث میں ہے: جس نے ہر نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کی روح قبض کرنے کی ذمہ داری رب ذوالجلال لے لیتا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی معیت میں جنگ لڑی یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کہا: میں نے تمہارے نبی ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو اس کے لئے موت کے سوا کوئی شے جنت میں داخل ہونے سے مانع نہیں ہے اور اس پر صدیق اور عابد ہی مواظبت اختیار کرتا ہے اور جس نے اسے اس وقت پڑھا جب وہ اپنے بستر پر گیا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی آیۃ الکرسی، حدیث نمبر 1248، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 337-338 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 338

اسے، اس کے پڑوسیوں کو اور اس کے پڑوسیوں کے پڑوسیوں کو اور اس کے ارد گرد کے گھروں کو محفوظ فرما دیا (1)"۔

اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک کی زکوۃ (صدقہ فطر) کی حفاظت میرے سپرد کی، آگے پورا قصہ ذکر کیا۔ اور اس میں ہے: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ خیال یہ ہے کہ وہ مجھے ایسے کلمات سکھا دے گا جن کے سبب اللہ تعالیٰ مجھے نفع پہنچائے گا، سو میں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ کیا ہیں؟" میں نے عرض کی: اس نے مجھے کہا ہے: جب تو اپنے بستر میں جائے تو اول سے آخر تک آیۃ الکرسی پڑھا کر اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اور اس نے مجھے کہا ہے: تجھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلسل محافظ رہے گا اور صبح ہونے تک کوئی شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ اور وہ (صحابہ کرام) خیر کی چیز لینے کے بہت زیادہ حریص تھے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اس نے تجھ سے سچ کہا ہے حالانکہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اے ابو ہریرہ! کیا تو اسے جانتا ہے جس سے تو تین راتیں باتیں کرتا رہا ہے؟" عرض کی: نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ شیطان ہے (2)"۔

مسند دارمی ابو محمد میں ہے شعبی نے کہا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی کا ایک جن سے آمنا سامنا ہو گیا تو وہ آپس میں کشتی کرنے لگے تو اس صحابی نے اسے پچھاڑ دیا، تو اس آدمی نے اسے کہا: بلاشبہ میں تجھے کمزور بدنما غباری مانند دیکھ رہا ہوں گویا تیرے دونوں ہاتھ کتے کے ہاتھوں کی طرح ہیں، کیا تم اسی طرح ہوتے ہو اے جنوں کے گروہ! یا تو ان میں سے اس طرح ہے؟ اس نے کہا: نہیں قسم بخدا! بلاشبہ میں ان میں سے مضبوط پسلیوں والا ہوں، البتہ تو دوبارہ میرے ساتھ کشتی کر، اگر تو نے مجھے پچھاڑ لیا تو میں تجھے ایسی شے سکھا دوں گا جو تیرے لئے نفع بخش ہوگی۔ صحابی نے فرمایا: ہاں ٹھیک ہے۔ پھر انہوں نے اسے پچھاڑ دیا تو اس نے کہا: کیا تم آیت الکرسی پڑھتے ہو: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ تو اس نے کہا کیونکہ تم جب بھی اسے اپنے گھر میں پڑھو گے تو شیطان گدھے کی شکل میں ہوا خارج کرتے ہوئے اس سے نکل جائے گا اور پھر صبح ہونے تک اس میں داخل نہ ہوگا۔ اسے ابو نعیم نے ابو عاصم ثقفی سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غریب حدیث میں ذکر کیا ہے۔ ابو معاویہ نے اس کے بارے میں ابو عاصم ثقفی سے، انہوں نے شعبی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: کیا وہ عمر رضی اللہ عنہ تھے؟ تو انہوں نے فرمایا: امکان یہی ہے کہ وہ عمر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

ابو محمد دارمی نے کہا ہے۔ الضئیل کا معنی ہے: باریک (کمزور)، الشخیت کا معنی ہے: انتہائی لاغر کمزور، الخیخ کا معنی ہے: پیٹ سے خارج ہونے والی ہوا۔ اور یہ لفظ حاء کے ساتھ الحبج بھی ہے۔

اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے حم ۔ المؤمن الیہ المصیر تک اور آیۃ الکرسی صبح کے وقت پڑھیں تو شام ہونے تک وہ ان دونوں کے سبب محفوظ رہے گا اور

1۔ مشکوۃ المصابیح، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 69 2۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، جلد 1، صفحہ 310، وزارت تعلیم

جس نے ان دونوں کو شام کے وقت پڑھا تو وہ صبح ہونے تک ان کے سبب محفوظ رہے گا (1)۔" فرمایا: یہ حدیث غریب ہے۔

اور ابوعبداللہ الترمذی الحکیم نے کہا ہے: روایت کیا گیا ہے کہ مومنین کے لئے کافی ہے کہ حفاظت کی خاطر ہر نماز کے بعد انہیں پڑھنا مستحب ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی جس نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے پر دوام اختیار کیا میں اسے اس سے زیادہ عطا کروں گا جو میں شکر کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں اور انبیاء علیہم السلام کا اجر اور صدیقین کے اعمال کا اجر اور میں اس پر اپنا دست رحمت پھیلا دیتا ہوں اور اس کے لئے کوئی شے رکاوٹ نہیں ہے کہ میں اسے جنت میں داخل کروں مگر یہ کہ ملک الموت اسے لے آئے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: اے میرے پروردگار! جس نے اس کے بارے سنا وہ اس پر دوام اختیار نہیں کرے گا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں یہ اپنے بندوں میں سے کسی کو عطا نہیں کروں گا سوائے نبی کے یا صدیق کے یا ایسے آدمی کے جس سے میں محبت کرتا ہوں یا ایسے آدمی کے جس کے بارے میں ارادہ کروں کہ وہ میرے راستے میں قتل ہو جائے۔"

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اے موسیٰ! جس کسی نے ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی تو میں اسے انبیاء علیہم السلام (کے اعمال) کا ثواب عطا کروں گا۔ ابوعبداللہ نے کہا ہے: میرے نزدیک اس کا معنی ہے: میں اسے انبیاء علیہم السلام کے عمل کا ثواب عطا فرماؤں گا اور جہاں تک نبوت کے ثواب کا تعلق ہے تو وہ سوائے انبیاء علیہم السلام کے اور کسی کے لئے نہیں ہے (2)۔

یہ آیت توحید اور اعلیٰ صفات کو متضمن ہے۔ اس میں پچاس کلمے ہیں اور ہر کلمے میں پچاس برکتیں ہیں۔ اور یہ تہائی قرآن کریم کے برابر ہے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح وارد ہے۔ ابن عطیہ نے اسے ذکر کیا ہے۔

اور لفظ اَللّٰهُ مبتدا ہے اور لَآ اِلٰهَ مبتدا ثانی ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور وہ معبود یا موجود ہے۔ اور اِلَّا هُوَ، لا الہ کے محل سے بدل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا اور خبر ہے اور یہ مرفوع ہے اور اس معنی پر محمول ہے: ما الہ الا ھو (سوائے اس کے کوئی الٰہ نہیں ہے) اور غیر قرآن میں لا الٰہ الا ایاہ پڑھنا بھی جائز ہے اور استثنا کی بنا پر ضمیر منصوب ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنی طویل حدیث میں کہا ہے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سے کون سی سب سے بڑی آیت آپ پر نازل فرمائی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: قرآن کریم میں اشرف اور بلند رتبہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے: کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کا تکرار مضمر اور ظاہر اٹھارہ بار کیا جاتا ہے۔ (اس لئے یہ دوسری آیات

1۔ جامع ترمذی، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 111
2۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271

سے بلند رتبہ اور اعلیٰ ہے۔)

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اگر چاہے تو اسے ھُوَ سے بدل بنا لے اور اگر چاہے تو یہ خبر کے بعد خبر بھی ہو سکتی ہے اور اگر چاہے تو اس سے پہلے مبتدا مضمر بھی ہو سکتا ہے اور غیر قرآن میں اسے مدح کی بنا پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔

اور اَلْحَیُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم ہے جس کے ساتھ اسے پکارا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام جب مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو انہیں اسماء کے ساتھ دعا مانگتے تھے۔ یا حی یا قیوم۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آصف بن برخیا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس تخت بلقیس لانے کا ارادہ فرمایا تو اسی قول کے ساتھ دعا مانگی: یا حی یا قیوم۔ اور یہ قول بھی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے انہیں فرمایا: ایا ھیا شراھیا یعنی یا حی یا قیوم۔ اور کہا جاتا ہے: یہی سمندر میں سفر کرنے والوں کی دعا ہے کہ جب انہیں غرق ہونے کا خوف لگتا ہے تو وہ انہی اسماء کے ساتھ دعا مانگتے ہیں (پکارتے ہیں)۔

علامہ طبری نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ کہا جائے گا: حَیٌّ قَیُّوْمٌ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف خود بیان کیا ہے اور پھر اس میں کوئی غور و فکر کیے بغیر اسے اسی طرح ذکر کیا جائے گا۔

اور یہ قول بھی ہے: اللہ تعالیٰ نے امور کے محل میں تصرف کرنے اور اشیاء کی مقادیر مقرر کرنے کی وجہ سے اپنا نام حی رکھا ہے اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: حی وہ ہوتا ہے جسے موت نہیں آتی۔

اور سدی نے کہا ہے: الحی سے مراد باقی رہنے والا ہے۔ لبید کا قول ہے:

فاِمّا ترینی الیوم اصبحتُ سالما ... فلستُ باَحیا من کلاب و جعفر

پس اگر تو آج مجھے دیکھ رہا ہے کہ میں نے صبح سالم کی ہے تو میں کلاب اور جعفر سے باقی رہنے والا نہیں ہوں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: یا حی یہی اسم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ اَلْقَیُّوْمُ یہ قائم سے ہے: یعنی مخلوق کو تدبیر کے ساتھ قائم رکھنے والا۔ یہ قتادہ سے مروی ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ہر نفس کو اس کے ساتھ قائم رکھنے والا جو اس نے کمایا ہے تاکہ وہ اسے اس کے عمل کے مطابق جزا دے اس حیثیت سے کہ وہ اس کے بارے میں جاننے والا ہے اور ان میں سے کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا معنی ہے وہ ذات جو نہ بدلتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ (یعنی نہ اس کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ وہ زوال پذیر ہے) امیہ بن ابی الصلت نے کہا ہے:

لم تُخلق السماء والنجوم ... والشمس معها قمر یقوم

آسمان اور ستارے اور سورج اور اس کے ساتھ قائم ہونے والا چاند نہیں پیدا کیے گئے۔

قدّره مُھیمن قیّوم ... والحشر والجنة والنعیم

جسے نگہبان قیوم نے مقرر کیا ہے۔ اور حشر اور جنت میں تمام نعمتیں (جنھیں پیدا کی گئیں)

إِلَّا لِأَمْرٍ شَأْنُهُ عَظِيمٌ

مگر ایسے امر کے لئے جس کی شان انتہائی عظیم ہے۔

علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے: میں نے ا۔ا کمل الفریری کی "عیون التفسیر" میں الْقَيُّوْمُ کی تفسیر میں دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ہے اور کہا جاتا ہے: وہ وہ ہے جو سوتا نہیں ہے، گویا کہ انہوں نے یہ مفہوم آیۃ الکرسی میں اس کے بعد والے ارشاد گرامی سے لیا ہے: لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

اور کلبی نے کہا ہے: الْقَيُّوْمُ وہ ہے جس کی ابتدا نہ ہو۔ اسے ابوالانباری نے بیان کیا ہے۔

قیوم کی اصل قیووم ہے۔ واؤ اور یا ایک کلمے میں جمع ہیں اور ان میں سے پہلا حرف ساکن ہے پس واؤ کو یا سے بدلنے کے بعد پہلی یا کو دوسری میں ادغام کر دیا۔ قیوم فعول کے وزن پر نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ واؤ سے ہے تو یہ قووم ہو جائے گا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت علقمہ، حضرت اعمش اور حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے الحی القیام الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور اہل لغت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عربوں کے نزدیک القیوم زیادہ معروف ہے اور بنا کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور علت کے اعتبار سے زیادہ ثابت ہے۔ اور القیام القوام سے القیام کی طرف منقول ہے۔ الفعال کو الفیعال کی طرف پھیرا گیا ہے جیسا کہ الصواغ کو الصیاغ کہا گیا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

إِنَّ ذَا الْعَرْشِ لَلَّذِي يَرْزُقُ النَّا سَ وَحَيٌّ عَلَيْهِمُ قَيُّومُ

بلاشبہ صاحب عرش وہ ہے جو لوگوں کو رزق عطا فرماتا ہے اور وہ ان پر حی و قیوم ہے۔

پھر رب العالمین نے اس کی نفی کی ہے کہ اسے اونگھ آئے یا نیند (یعنی نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند)

السِّنَةُ کا معنی تمام کے قول کے مطابق اونگھ ہے اور اونگھ وہ ہوتی ہے جو آنکھ میں ہوتی ہے اور جب وہ دل میں ہو جائے تو پھر نوم (نیند) ہو جاتی ہے۔ عدی بن رقاع نے ایک عورت کا تو نظر کے ساتھ وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

وَسْنَانُ أَقْصَدَهُ النُّعَاسُ فَرَنَّقَتْ فِي عَيْنِهِ سِنَةٌ وَلَيْسَ بِنَائِمِ

وسنان کا اونگھ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ پس اس کی آنکھوں میں اونگھ داخل ہو چکی ہے اور وہاں نیند نہیں ہے۔

اور مفضل نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ السِّنَةُ سر کی جانب سے ہوتی ہے: اور نعاس آنکھ میں ہوتی ہے اور نوم (نیند) دل میں ہوتی ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: وسنان وہ ہے جو نیند سے بیدار ہوتا ہے حالانکہ وہ عقل و سمجھ نہیں رکھتا یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنے گھر والوں پر تلوار سونت لیتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ جو کچھ ابن زید نے کہا ہے یہ محل نظر ہے۔ کلام عرب سے اسے نہیں سمجھا جا سکتا[1]۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ

اور سدی نے کہا ہے: السِّنَةُ سے مراد اس غنودگی کی ہوا ہے جو چہرے پر لگتی ہے اور انسان اونگھنے لگتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بالجملہ اس سے مراد وہ فتور اور ڈھیلا پن ہے جو انسان کو لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عقل مفقود نہیں ہوتی۔ اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی خلل واقع نہیں ہوتا اور کسی حال میں بھی اسے کوئی اکتاہٹ اور سستی لاحق نہیں ہوتی۔

سنة میں اصل وسنة ہے اس میں واؤ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ یسن سے حذف کی گئی ہے اور النوم سے مراد وہ ثقل اور بوجھ ہے جس کے ساتھ انسان کے حق میں ذہن زائل ہو جاتا ہے (یعنی عقل کام نہیں کرتی) اس مثل واؤ عطف کے لئے ہے اور یہ تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں: اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور حکایت موسیٰ علیہ السلام سے منبر پر بیان کرتے ہوئے سنا ہے "کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کیا اللہ تعالیٰ جل شانہ بھی سوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک فرشتہ بھیجا اور اس نے آپ کو تین بار بیدار رکھا پھر اس نے آپ کو دو بوتلیں دے دیں، ہر ہاتھ میں ایک بوتل تھی اور آپ کو حکم دیا کہ ان دونوں کی حفاظت کریں۔ فرمایا: پھر آپ سونے لگے اور قریب تھا کہ آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں مل جاتے پھر آپ بیدار ہو جاتے اور آپ انہیں ایک دوسرے سے دور ہٹا لیتے بالآخر آپ گہری نیند سو گئے اور آپ کے دونوں ہاتھ آپس میں ٹکرا گئے اور دونوں بوتلیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر وہ سوتا رہتا تو پھر یہ آسمان اور زمین (اپنی اپنی جگہ) مضبوطی سے ٹھہرے نہ رہتے (1)۔" یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے کئی ایک نے ضعیف کہا ہے اور ان میں سے امام بیہقی بھی ہیں۔

قولہ تعالیٰ: لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (یعنی زمین و آسمان کی ہر شے) اسی کی ملکیت ہے۔ اور وہ تمام کا مالک اور رب ہے۔ عبارت میں مَا کو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو عقل رکھتے ہیں تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں مراد کلی طور پر موجود چیزیں ہیں۔ (چاہے وہ ذوی العقول یا غیر ذوی العقول ہوں) علامہ طبری نے کہا ہے: یہ آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: 3) (ہم بتوں کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت زیادہ نزدیک کر دیں۔)

قولہ تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ اس میں مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور ذَا اس کی خبر ہے۔ اور الَّذِي، ذَا کی صفت ہے اور اگر چاہے تو بدل بنا لے اور یہ جائز نہیں ہے کہ ذَا زائدہ ہو جیسا کہ مَا کے ساتھ زائد کیا گیا ہے کیونکہ مَا مبہم ہوتا ہے اور ذَا کی اس کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کے ساتھ اسے زائد کر دیا گیا ہے۔

اور اس آیت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کے بارے میں جسے چاہے گا اذن عطا فرمائے گا اور وہ انبیاء علیہم السلام، علماء، مجاہدین، ملائکہ اور ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جنہیں رب العالمین اعزاز و اکرام اور شرف عطا فرمائے گا۔

1۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 257، حدیث نمبر 273، دار الفکر

پھر وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر انہیں کے لئے جن کے لئے وہ راضی ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ علماء اور صالحین ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور وہ دونوں منزلوں کے درمیان ہوں گے یا وہاں پہنچ چکے ہوں گے لیکن ان کے اعمال صالح بھی ہوں گے۔

اور بخاری باب بقیۃ من ابواب الرؤیۃ میں ہے: بے شک مومنین کہیں گے: اے ہمارے رب! یہ تیرے بندے ہمارے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے اور یہ شفاعت ان کے بارے میں ہے جن کا معاملہ بالکل قریب کا ہوتا ہے (1) جیسا کہ جنت کے دروازے کے ساتھ چمٹنے والا بچہ شفاعت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ان کے قرابتداروں اور ان کے جاننے پہچاننے والوں کے بارے میں ہے اور انبیاء علیہم السلام ان کے بارے میں شفاعت کریں گے جو ان کی امت کے گنہگار اپنے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل ہو چکے ہوں گے بغیر کسی قرابت اور معرفت کے صرف نفس ایمان کے سبب (وہ شفاعت کریں گے)۔ پھر خطاؤں اور گناہوں میں مستغرق ان لوگوں کے بارے میں ارحم الراحمین کی شفاعت باقی رہ جائے گی جن کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کی شفاعت نے کوئی عمل نہ کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت حساب کی تعجیل کے بارے میں ہوگی اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی خاص ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں شفاعت کی کیفیت بڑے شافی بیان کے ساتھ بیان کر دی ہے۔ شاید آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نہیں پڑھا کہ شفاعت کرنے والے جہنم میں داخل ہوں گے اور وہاں سے ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنہوں نے عذاب واجب جان لیا ہوگا۔ پس اس بنا پر یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ مومنین کے لئے دو شفاعتیں ہوں گی: ایک شفاعت ان کے بارے میں جو ابھی جہنم تک نہیں پہنچے اور دوسری شفاعت ان کے بارے میں جو اس تک پہنچ چکے ہوں گے اور اس میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ عطا فرمائے۔ آمین۔

سو آپ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے: "پھر جہنم پر پل بچھایا جائے گا اور شفاعت حلال ہو جائے گی اور وہ کہتے رہیں گے: اللھم سلم سلم۔ اے اللہ! سلامتی کے ساتھ گزار دے، سلامتی کے ساتھ گزار دے۔ عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم پل کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس میں پاؤں رکھنے کی جگہ پر پھسلن ہوگی (پاؤں قرار نہ پکڑ سکیں گے) اس کے ساتھ لوہے کے تیز کنڈے ہوں گے اور اس میں سخت جگہ پر ایسے خاردار پودے ہوں گے جن کو سعدان کہا جاتا ہے۔ پس مومنین اس سے آنکھ جھپکنے کی طرح، بعض بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح اور بعض گھوڑوں اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی طرح گزر جائیں گے اور وہ نجات پا جائے گا جو سلامت رہ گیا اور بعض زخمی ہوں گے اور انہیں آتش جہنم میں گرنے سے بچا لیا گیا، یہاں تک کہ جب مومنین آگ سے خلاصی پا جائیں گے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی بھی ان مومنین سے زیادہ طاقتور نہیں جو قیامت کے دن اپنے ان بھائیوں کا حق لینے کے لئے جو جہنم میں ہوں گے اللہ کی بارگاہ میں قسم کے ساتھ عرض کریں گے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 341، دار الکتب العلمیہ۔ بخاری شریف، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صفت ہے جو منقسم نہیں ہوتی۔ اور آیت کا معنی ہے: کسی کے لئے کوئی معلوم نہیں مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے کہ وہ اسے جان لے۔

قولہ تعالیٰ: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کرسی ایک موتی ہے اور قلم بھی ایک موتی ہے اور قلم کی لمبائی سات سو برس کی ہے اور کرسی کی طوالت کتنی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

حماد بن سلمہ نے عاصم بن بہدلہ سے اور یہی عاصم بن ابی النجود ہیں۔ اور انہوں نے زر بن حبیش کے واسطہ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور کرسی اور عرش کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) عرش کے اوپر ہے اور وہ اسے جانتا ہے جس میں اور جس پر تم ہو۔ کہا جاتا ہے: کُرسی اور کِرسی اور جمع الکراسی ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کرسیہ کا معنی علمہ (1) (اس کا علم) ہے۔

اور علامہ طبری نے اسے ترجیح دی ہے اور کہا ہے: اسی سے وہ کراسہ (کاپی) بھی ہے جو علم کو جمع کرتی ہے۔ (اور مکتوبہ رجسٹر ہے) اور اسی سے علماء کو الکراسی کہا گیا ہے، کیونکہ ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

يَحُفُّ بِهِمْ بِيضُ الْوُجُوهِ وَعُصْبَةٌ　　كَرَاسِيُّ بِالْأَحْدَاثِ حِينَ تَنُوبُ

اچھی شہرت رکھنے والے اور علماء کی جماعتیں ان امور کے ساتھ گھیر لیتا ہے (2) جب وہ پیش آتے ہیں۔

اور کہا گیا ہے: کرسیہ سے مراد خدا تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جس کے ساتھ وہ آسمانوں اور زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں: اجعل لهذا الحائط كرسيا اس دیوار کی کرسی بناؤ یعنی وہ جس پر اس کا اعتماد اور سہارا ہو۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے قریب ہے جو انہوں نے وسع کرسیہ میں کیا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اور ہم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وسع کرسیہ میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تمام روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ کرسی سے مراد وہی کرسی ہے جو عرش کے ساتھ مشہور ہے۔ اور اسرائیل نے سدی سے اور انہوں نے ابو مالک سے اس قول وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک وہ چٹان جس پر ساتویں زمین ہے اور اس کی اطراف پر مخلوق کی انتہا ہے اس پر چار فرشتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے چار چہرے ہیں: ایک انسان کا چہرہ، ایک شیر کا چہرہ، ایک بیل کا چہرہ اور ایک گدھ کا چہرہ، پس وہ اس پر کھڑے ہیں اور انہوں نے زمینوں اور آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سر کرسی کے نیچے ہیں اور کرسی عرش کے نیچے ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کرسی کو عرش کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: اس میں اشارہ دو کرسیوں کی طرف

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 342، دار الکتب العلمیہ　　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 18

ہے ان میں سے ایک عرش کے نیچے ہے اور دوسری عرش پر رکھی ہوئی ہے۔

اور اسباط عن السدی عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرۃ الہمدانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عن مرۃ الہمدانی عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن ناس من اصحاب رسول اللہ ﷺ کی روایت میں ارشاد باری تعالیٰ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے تحت موجود ہے کہ آسمان و زمین کرسی کے درمیان میں ہیں اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔ اور معتزلہ ان کو بادشاہ کی عظمت اور جلالت سلطان پر محمول کرتے ہیں اور وہ عرش و کرسی کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور یہ کوئی شے نہیں ہے۔ اور اہل حق ان دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں بڑی وسعت ہے اور اس کے ساتھ ایمان لانا واجب ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے اور اس کی آواز کجاوے کے چرچرانے کی طرح چرچراہٹ ہے۔

علامہ بیہقی نے کہا: ہم نے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کی تفسیر میں جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عرش سے (نیچے) رکھی ہوئی ہے (جیسے) تخت سے قدم رکھنے کی جگہ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے مکان کا اثبات نہیں ہے۔ اور حضرت ابن بریدہ نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ سے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "کیا تم نے کوئی انتہائی عجیب چیز دیکھی ہے؟" انہوں نے کہا: میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے اس کے سر پر کھانے کا ایک ٹوکرا ہے۔ پس ایک شہسوار گزرا اور اس نے وہ ٹوکرا گرا دیا۔ پس وہ عورت بیٹھ گئی اور اپنا کھانا (طعام) جمع کرنے لگی۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے کہا: تیرے لئے اس دن ہلاکت اور بربادی ہو جس دن بادشاہ اپنی کرسی رکھے گا اور وہ مظلوم کے لئے ظالم کو پکڑے گا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: لاقُدِّسَتْ اُمَّةٌ (امت پاک نہ کی گئی) یا فرمایا: کیف تقدس امۃ (امت کیسے پاکی بیان کرتی ہے) اس کا کمزور اس کے طاقتور سے اپنا حق نہیں لے سکے گا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے قول میں ہے: "کرسی قدم رکھنے کی جگہ ہے" وہ مراد یہ لیتے ہیں: (کہ کرسی) عرش رحمٰن سے اس طرح ہے جیسے بادشاہوں کے تختوں سے قدم رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور یہ عرش کے سامنے بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی نسبت عرش کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کرسی کی نسبت بادشاہ کے تخت کی طرف ہے۔

اور حسن بن ابی الحسن نے کہا ہے کہ کرسی سے مراد نفس عرش ہے۔ اور یہ قول پسندیدہ نہیں ہے اور جس کا تقاضا احادیث کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ کرسی عرش کے سامنے پیدا کی گئی ہے اور عرش اس سے بڑا ہے (2)۔

اور ابو ادریس خولانی نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: آیۃ الکرسی (3) پھر فرمایا:

1۔ مجمع الزوائد، کتاب الفتن، جلد 5، صفحہ 375، حدیث نمبر 9054		2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 202، دار الکتب العلمیہ

3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 457

کتاب کے ساتھ قتال کرنے کے بارے سورۂ براءت میں حکم ارشاد فرمایا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے سبب نزول کے بارے میں صحیح حضرت زید کا بیٹا جو انصاری (1)

کے ساتھ پانی والا واقعہ ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ الممتحنہ میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۵) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے جو تلوار کے خوف سے اسلام لانے کے بعد مطیع اور منقاد ہو اسے مکرہ نہ کہو۔ یہی ان میں پانچواں قول ہے۔

(۶) اور چھٹا قول یہ ہے کہ یہ آیت قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جب وہ اہل کتاب میں سے ہوں کہ ان پر زبردستی نہ کی جائے جب وہ بڑے ہوں اور اگر وہ مجوسی ہوں چھوٹے ہوں یا بڑے یا بت پرست ہوں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے گا۔ کیونکہ جس نے انہیں قیدی بنا رکھا ہے وہ ان سے ان کے بت پرست ہونے کے ساتھ کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جاتا اور ان کی عورتوں سے وطی نہیں کی جا سکتی اور وہ مردار کھانے اور نجاستوں کے بارے اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور ان کے لئے انہیں نجس سمجھے گا اور ملک کے اعتبار سے ان سے نفع اٹھانا اس پر متعذر ہو جائے گا۔ تحقیق اس کے ملک کے لئے زبردستی کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ابن القاسم نے مالک سے روایت کیا ہے اور رہے اشہب تو انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے دین پر ہوں گے جس نے انہیں قیدی بنایا ہے۔ پس جب وہ انکار کریں تو انہیں اسلام پر مجبور کیا جائے اور چھوٹوں کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ اسی لئے انہیں دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی باطل دین کی طرف۔ نہ جا سکیں۔

پس تمام کی تمام انواع کفر جب جزیہ دینے لگیں تو ہم انہیں اسلام پر مجبور نہ کریں گے چاہے وہ عربی ہوں یا عجمی قریشی ہوں یا کوئی اور۔ ان کا بیان آگے آئے گا اور جزیہ کے بارے میں جو کہا ہے اور جس سے جزیہ قبول کیا جائے گا اس کا بیان سورۂ براءت میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ۔ شرط کی وجہ سے فعل کو جزم دی گئی ہے۔ الطاغوت مؤنث ہے طغی یطغی سے اور علامہ طبری نے یطغو بیان کیا ہے۔ جب کوئی حد سے زیادتی کرتے ہوئے تجاوز کر جائے (2) اور اس کا وزن فعلوت ہے۔

اور سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ مفرد مذکر اسم ہے گویا کہ یہ اسم جنس ہے اور قلیل و کثیر کے لئے واقع ہوتا ہے اور ابو علی کا مذہب یہ ہے کہ یہ مصدر ہے جیسا رغبوت اور جبروت اور اس کے ساتھ واحد اور جمع کی صفت لائی جا سکتی ہے اور اس نے اس کے لام کلمہ کی جگہ اور اس کے عین کلمہ کی جگہ بدل دیا گیا ہے جیسا کہ جبذ اور جذب ہے۔ پھر واو کو متحرک ہونے اور اس کے ماقبل کے متحرک ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا ہے اور طاغوت کہا گیا ہے اور یہی قول اخفش کا ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 343، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب [illegible]، حدیث نمبر 2187، [illegible]

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 25، دار احیاء التراث العربی

اختیار کیا ہے اور کہا گیا ہے: طاغوت کی اصل لغت میں الطغیان سے ماخوذ ہے اور یہ بغیر اشتقاق کے اپنا معنی ادا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: لآل یہ اللؤلؤ سے ہے۔

اور مبرد نے کہا ہے: یہ جمع ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے (1)۔

جوہری نے کہا ہے: الطاغوت سے مراد کاہن، شیطان اور ہر وہ ہے جو گمراہی میں سردار ہو اور کبھی یہ واحد ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ (النساء: 60) ((اس کے باوجود) چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لئے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا۔) اور کبھی جمع ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ (البقرہ: 257) (ان کے ساتھی شیطان ہیں۔) اور اس کی جمع طواغیت آتی ہے اور وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یہ معطوف ہے۔ اور فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى یہ جواب شرط ہے اور الوثقٰی کی جمع الوثق ہے جیسا کہ الفضلٰی کی جمع الفضل ہے۔ اور الوثقٰی: فُعْلٰی کے وزن پر الوثاقۃ سے ہے اور یہ آیت تشبیہ ہے اور مشبہ بہ کے بارے میں مفسرین کی عبارات مختلف ہیں۔

پس حضرت مجاہد نے کہا ہے: العروۃ سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا: اسلام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور یہ سب عبارات ایک ہی معنی کی طرف راجع ہیں۔ پھر فرمایا: لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (2) حضرت مجاہد نے کہا ہے: مراد یہ ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو تبدیل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ خود اپنے آپ کو تبدیل کر لیں یعنی ان سے ایمان کا نام زائل نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ کافر ہو جائیں۔

اور الانفصام کا معنی ایسا ٹوٹنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی نہ ہو۔ اور القصم کا معنی ایسا توڑنا ہے جس میں جدائی اور علیحدگی بھی ہو۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وحی ختم ہوئی تو آپ کی پیشانی پسینے سے تر آلود ہوتی (3)۔'' یعنی پیشانی پسینہ چھوڑ رہی ہوتی تھی۔

جوہری نے کہا: فصم الشیء اس نے اسے توڑ دیا اسے جدا کیے بغیر۔ آپ کہتے ہیں: فصمتہ فانفصم میں نے اسے توڑا تو وہ ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا انْفِصَامَ لَهَا اور اس کی مثل توڑ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ذوالرمہ نے ہرن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے وہ اسے چاندی کے بازوبند کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے:

كأنه دملج من فضة نبه في ملعب من جواري الحي مفصوم

بے شک اس نے اسے مفصوم قرار دیا ہے اس کے مڑنے اور ٹیڑھا ہونے کے سبب جب وہ سوتا ہے۔ اور مقصوم کو قاف کے ساتھ نہیں کہا اس لئے کہ یہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہوتا ہے۔ اور افصم المطر کا معنی ہے بارش تھم گئی۔ اور افصمت عنہ الحمی (اس سے بخار اتر گیا) اور جب کفر شیطان کے ساتھ ہے اور ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس کا زبان اقرار کرتی ہے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 344، دارالکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 2، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی، حدیث نمبر 2، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور حسن نے أَوْلِيٰٓؤُهُمُ الطَّوَاغِيتُ پڑھا ہے، مراد شیاطین ہیں۔ واللہ اعلم

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے (اے حبیب!) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ نے بادشاہی۔ جب کہ کہا ابراہیم (علیہ السلام) نے (اسے) کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے تو تو نکال لا اسے مغرب سے۔ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: أَلَمْ تَرَ یہ الف توقیفی ہے اور کلام میں تعجب کا معنی ہے یعنی انہوں نے اس کو تعجب میں ڈال دیا اور فراء نے کہا ہے: أَلَمْ تَرَ بمعنی هل رأیت ہے یعنی کیا آپ نے اسے دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا اور کیا آپ نے اسے دیکھا جو بستی کے پاس سے گزرا اور وہ نمروذ بن کوش بن کنعان بن سام بن نوح اپنے زمانے کا بادشاہ اور آگ اور پتھر والا تھا۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت ربیع، حضرت سدی، حضرت ابن اسحاق اور حضرت زید بن اسلم وغیرہم رحمہم اللہ کا ہے (1) اور اسے ہلاک کرنے کا واقعہ یوں ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ لڑنے کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر مچھروں کا ایک باب کھول دیا۔ پس انہوں نے سورج کو ڈھانپ لیا اور اس کے لشکر کو کھا گئے اور انہوں نے سوائے ہڈیوں کے اور کچھ نہ چھوڑا اور ان میں سے ایک اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور اسے کھاتا رہا یہاں تک کہ وہ چوہیا کی مثل ہو گیا اور اس کے بعد اس کے نزدیک لوگوں میں سے سب سے معزز وہ تھا جو اس کے دماغ پر بھاری ہتھوڑے کے ساتھ مارتا تھا۔ پس چالیس دن تک وہ اس آزمائش اور مصیبت میں مبتلا رہا۔

ابن جریج نے کہا ہے: زمین میں وہ پہلا بادشاہ تھا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول مردود ہے۔

اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: وہ پہلا حکمران ہے جس نے جبر و استبداد اور رعونت و سرکشی اختیار کی اور وہی بابل میں صاحب الصرح (محل کا مالک) تھا۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ پوری دنیا کا حکمران تھا اور یہ دو کافر بادشاہوں میں سے ایک ہے اور دوسرا بخت نصر ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا وہ نمرود بن فالخ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام تھا۔ ان تمام کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے (1)۔

اور سہیلی نے بیان کیا ہے کہ وہ نمرود بن کوش بن کنعان بن حام بن نوح تھا اور وہ سواد عراق کا بادشاہ تھا اور اسے اس ضحاک نے حکمران بنایا تھا جو اژدہاق سے معروف تھا اور اس کا نام بیوراسب بن اندراست تھا اور وہ تمام سلطنتوں کا بادشاہ تھا اور یہ وہی ہے جسے افریدون بن اثفیان نے قتل کیا تھا اور اس بارے میں حبیب کہتا ہے:

وَكَأَنَّهُ الضَّحَّاكُ مِنْ فَتَكَاتِهِ فِي الْعَالَمِينَ وَأَنْتَ أَفْرِيدُونُ

ضحاک سرکش اور جابر حکمران تھا اور اس کی حکومت ہزار برس تک رہی جس بارے میں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ پہلا حکمران ہے جس نے سولی دی اور پہلا حکمران ہے جس نے ہاتھ اور پاؤں کاٹے اور نمرود کا صلبی بیٹا تھا اس کا نام "کوش" تھا یا اس نام کی طرح کا کوئی نام تھا اور اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام نمرود الاصغر تھا اور نمرود الاصغر ایک سال تک حاکم رہا۔ اور نمرود الاکبر کی حکومت چار سو برس تک رہی جیسا کہ اس کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔

اس جھگڑے کے قصص میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے میلے کی طرف نکلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا۔ جب وہ واپس لوٹے تو آپ نے انہیں کہا: کیا تم ان کی عبادت کرتے ہو جو (ٹوٹ کر) گر جاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا: تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے اس رب کی عبادت کرتا ہوں جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: بے شک نمرود طعام (اناج) ذخیرہ کر لیتا تھا اور جب انہیں طعام کی حاجت ہوتی تھی تو وہ اس سے اسے خریدتے تھے اور جب وہ اس کے پاس آتے تھے تو اسے سجدہ کرتے تھے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پاس گئے تو آپ نے اسے سجدہ نہ کیا تو اس نے کہا: تجھے کیا ہے کہ تو مجھے سجدہ نہیں کرتا؟ آپ نے فرمایا: میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمرود نے آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ یہ نمرود بیٹھ گیا اور لوگوں کو اہل و عیال کے لئے طعام لے جانے کا حکم دینے لگا۔ پس جب بھی کوئی قوم آتی یہ ان سے پوچھتا: تمہارا رب اور تمہارا الٰہ کون ہے؟ تو وہ کہتے: تو ہے، تو یہ کہتا: انہیں طعام دے دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اپنے اہل و عیال کو طعام مہیا کرنے کے لئے اس کے پاس آئے تو اس نے آپ سے کہا: تمہارا رب اور تمہارا معبود کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ جب نمرود نے یہ سنا تو اس نے کہا: میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کے معاملہ کے ساتھ اس کا معارضہ کیا تو وہ کفر اختیار کرنے والا متحیر ہو گیا اور اس نے کہہ دیا: تم اسے اناج نہ دو۔ تو حضرت ابراہیم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

علیہ السلام بغیر کسی شے کے واپس اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گئے۔ راستے میں آپ ریت کے ٹیلے کے پاس سے گزرے جو آٹے کی مثل تھا۔ تو آپ نے اپنے دل میں کہا: اگر میں اس سے اپنا بورا بھر لوں تو جب میں اسے لے کر گھر داخل ہوں گا تو بچے خوش ہو جائیں گے یہاں تک کہ میں انہیں دیکھ لوں گا۔ پس آپ وہ لے گئے، جب آپ اپنے گھر پہنچے تو بچے خوش ہو گئے اور وہ دونوں بوروں کے اوپر کھیلنے لگے اور آپ تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ تو آپ کی زوجہ محترمہ نے کہا: اگر میں آپ کے لئے کھانا تیار کر دوں جب آپ بیدار ہوں گے تو آپ اسے موجود پائیں گے (اور تناول فرمائیں گے)۔ چنانچہ اس نے ایک بورا کھولا تو انہوں نے اسے اس سے بھی اچھا پایا جتنا سفید آٹا ہوتا ہے اور پھر اس کی روٹیاں پکا دیں اور جب آپ نیند سے بیدار ہوئے تو اس نے وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ وہی آٹا ہے جو آپ لائے ہیں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے آسانی پیدا فرما دی ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوبکر بن ابی شیبہ نے ابو صالح سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام طعام لانے کے لئے چلے اور آپ اس پر قادر نہ ہو سکے تو آپ سرخ سوتی ریت کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس سے بورے بھر لیے اور پھر اپنے گھر والوں کی طرف واپس لوٹ آئے۔ تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ سرخ گندم ہے۔ پس انہوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم ہی پایا اور جب اس میں سے کچھ کاشت کی تو جڑ سے شاخ کے سرے تک سٹہ نکلا جو دانوں سے بھرا ہوا تھا (2)۔

اور ربیع وغیرہ نے اس قصص میں کہا ہے کہ نمرود نے جب کہا: میں جلاتا بھی ہوں اور مارتا بھی ہوں تو اس نے دو آدمیوں کو حاضر کیا، ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہا: تحقیق میں نے اسے زندہ کر دیا اور اسے مار دیا۔ اور جب آپ نے اس پر سورج کا معاملہ لوٹایا تو وہ مبہوت اور متحیر ہو گیا (3)۔ اور الخبر میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ میں سورج کو مغرب سے طلوع کروں گا تاکہ وہ جان لے کہ میں اس پر قادر ہوں (4)۔ پھر نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے حکم دیا تو انہیں آگ میں پھینک دیا گیا اور اسی طرح جابر حکمرانوں کی عادت ہے کہ جب کسی شے کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے اور دلیل لانے سے عاجز ہو جائیں تو وہ سزا دینے میں لگ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے نجات عطا فرمائی جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور سدی نے کہا ہے: جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ سے نکلے تو انہوں نے آپ کو بادشاہ کے پاس پیش کر دیا اور اس سے پہلے آپ کو اس پر پیش نہیں کیا گیا تھا اور اس نے آپ سے گفتگو کی۔ اور آپ کو کہا: تیرا رب کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: میرا رب وہ ہے جو جلاتا بھی ہے اور مارتا بھی ہے۔ نمرود نے کہا: میں بھی زندہ کر سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں، میں چار

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 345، دار الکتب العلمیہ

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 330، حدیث نمبر 31819، مکتبۃ الزمان المدینۃ المنورہ

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348

4۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، حدیث نمبر 4269، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

"عمران" میں آئے گا اور حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آپس میں مکالمہ ہوا اور آدم علیہ السلام حجت کے ساتھ ان پر غالب آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سقیفہ کے دن جھگڑتے رہے، ایک دوسرے کو دور ہٹاتے رہے، تقریر کرتے رہے اور باہم مناظرہ کرتے رہے یہاں تک کہ حق اس کے بارے میں ظاہر ہو گیا جو اس کے اہل تھا اور انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینے کے بعد مرتدین کے بارے میں مناظرہ کیا علاوہ ازیں کثیر ایسے واقعات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ میں اس پر دلیل ہے کہ علم کے ساتھ حجت پیش کرنا، احتجاج کرنا مباح ہے اور غور و فکر کرنے والوں کے درمیان شائع ہے۔

مزنی صاحب شافعی نے کہا ہے: مناظرہ کے حقوق میں سے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا جائے اور اس سے جو شے واضح ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

اور بعض نے کہا ہے: مناظرہ صحیح نہیں ہوتا اور مناظرہ کرنے والوں کے درمیان حق ظاہر اور واضح ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین، عقل، فہم اور انصاف میں ایک دوسرے کے قریب ہوں یا ایک ہی مرتبہ میں مساوی اور برابر ہوں مگر اس میں ریاکاری اور باہمی عداوت، مخالفت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش ہوتی ہے۔

قراءات: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے أَلَمْ تَرْ را کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے متحرک پڑھا ہے اور یا جزم کے لئے حذف کر دی گئی ہے۔ اور أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ محل نصب میں ہے یعنی لان آتاه الله، یا بمعنی اجل ان آتاه الله۔ اور جمہور قراء نے انا احیی یعنی وصل کلام میں انا ہے نون کے بعد الف کو گرا کر پڑھا ہے اور نافع اور ابن ابی اویس نے اسے ثابت رکھا ہے، جب بھی یہ ہے قرآن میں ہمزہ اس کے ساتھ ملا ہے سوائے اس قول کے: اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ کیونکہ وہ اسے اس جگہ میں اس کی قلت کے سبب تمام قراء کی طرح گرا دیتے ہیں، کیونکہ یہ قرآن کریم میں صرف تین مقامات پر واقع ہوا ہے اور یا اپنے قلیل ہونے کی وجہ سے اس کے قائم مقام ہے جس کے بعد ہمزہ نہ ہو پس الف کو وصل کلام میں گرا دیا گیا۔

علمائے نحو نے کہا ہے: متکلم کی ضمیر اسم ہے اس میں ہمزہ اور نون ہے، اور جب تو کہے: أَنَا یا أَنَهْ تو الف اور ہا وقف میں حرکت کو بیان کرنے کے لئے ہیں اور جب کلمہ کسی شے سے متصل ہو تو دونوں ساقط ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ شے جس کے ساتھ کلمہ متصل ہوتا ہے وہ قائم مقام الف کے ہوتا ہے، پس یہ نہیں کہا جائے گا: انا فعلت الف کے اثبات کے ساتھ مگر شعر میں یہ شاذ ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

أنا سيف العشيرة فاعرفوني ... حُمَيدًا قد تذرّيت السناما

نحاس نے کہا ہے: اس بنا پر کہ نافع نے الف کو ثابت رکھا ہے اور پڑھا ہے "انا احیی وامیت" اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے۔ مکی نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک الف زائدہ ہے اور ان کے نزدیک اسم مضمر ہمزہ اور نون ہیں اور الف کو تقویت کے لئے زائد کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وقف کے لئے زائد کیا گیا ہے تاکہ نون کی حرکت ظاہر ہو۔ اور کوفیوں کے نزدیک انا مکمل طور پر اسم ہے۔ پس نافع نے ان کے قول کے مطابق اصل کی بنا پر الف کو ثابت رکھا ہے اور

جنہوں نے الف کو حذف کیا ہے تو انہوں نے تخفیف کے لئے اسے حذف کیا ہے کیونکہ فتحہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: اور رہا ان کا قول انا تو یہ اسم کنایہ ہے اور یہ اکیلا متکلم کے لئے ہے اور یہ مبنی برفتحہ ہے تاکہ اس کے اور ان حرف ناصب کے درمیان فرق ہو سکے اور آخر میں الف وقف میں حرکت کے بیان کے لئے ہے اور اگر درمیان کلام میں ہو تو یہ گر جاتا ہے سوائے لغت ردیہ کے، جیسا کہ شاعر نے کہا:

أنا سیف العشیرة فاعرفونی حمیدا قد تذریت السناما

اور بہت الرجل و بہت و بہت کا معنی ہے جب آدمی کے پاس کوئی دلیل باقی نہ رہے اور وہ متحیر ہو کر خاموش ہو جائے۔ یہ نحاس وغیرہ سے منقول ہے۔

اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور انہوں نے بعض عربوں سے اس معنی میں بہت بھی با اور ہا کے فتحہ کے ساتھ بیان کیا ہے(1)۔ ابن جنی نے کہا ہے: ابو حیوہ نے فَبَهُتَ الَّذِي كَفَرَ یعنی با کے فتحہ اور ہا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بہت میں ایک لغت ہے۔ فرمایا: اور ابن السمیقع نے فَبَهَتَ یعنی با اور ہا کے فتحہ کے ساتھ اس معنی پر پڑھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے متحیر کر دیا جس نے کفر کیا۔ پس الذی محل نصب میں ہے۔ فرمایا: اور یہ بھی جائز ہے کہ بہت فتحہ کے ساتھ بہت میں ہی ایک لغت ہو۔

فرمایا: ابوالحسن اخفش نے فبهِت کی قرات یوں کی ہے جیسا کہ خرق اور دہش۔

مزید کہا: اکثر نے ہا میں ضمہ پڑھا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ایک قوم نے اس کی قرات کی تاویل کی ہے جنہوں نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ بمعنی سب (گالی گلوچ دینا) اور قذف (تہمت لگانا) ہے۔ اور بلاشبہ نمرود ہی ہے جس نے اس وقت گالیاں دیں جب اس کے دلائل ختم ہو گئے اور اس کے پاس کوئی حیلہ نہ رہا (2)۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾

"یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر اور وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد۔ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک پھر زندہ کیا اسے۔ فرمایا: کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا؟ اس نے عرض کی: میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: نہیں، بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سو سال۔ اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان)

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 32، داراحیاء التراث العربیہ
2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 347، دارالکتب العلمیہ

کی طرف۔ یہ ابھی نہیں بدلا اور دیکھ اپنے گدھے کو اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشانی لوگوں کے لئے اور دیکھ ان ہڈیوں کو کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت، پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا۔ اَوْ معنی پر محمول کرتے ہوئے عطف کے لئے ہے اور امام کسائی اور فراء کے نزدیک تقدیر کلام یہ ہے: هل رأيت كالذی حاج ابراهيم فی ربه او كالذی مر على قرية۔

اور مبرد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے الم تر الی الذی حاج ابراهيم فی ربه، الم تر من هو! كالذی مر على قرية۔ پس کلام میں من ھو کے الفاظ مضمر ہیں۔

ابو سفیان بن حسین نے اَوَ كَالَّذِیْ میں واؤ کے فتحہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ واؤ عطف ہے اور اس پر الف استفہام داخل ہے جس کا معنی تقریر (1) (پختہ کرنا) ہے۔ اور القریۃ (یعنی خاص بستی) کو قریہ (کوئی بستی) کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں کا اجتماع تھا۔ یہ ان کے اس قول سے ہے: قریت الماء یعنی میں نے پانی جمع کیا۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

سلیمان بن بریدہ، ناجیہ بن کعب، قتادہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع، عکرمہ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے جو اس بستی کے پاس سے گزرا تھا وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

حضرات وہب بن منبہ، عبداللہ بن عبید بن عمیر، عبداللہ بن بکر بن مضر رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ ارمیا تھے اور وہ نبی تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے: ارمیا ہی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔ نقاش نے وہب بن منبہ سے اسے بیان کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے مگر یہ کہ وہ ایک نام ہو جو اس نام کے موافق ہو کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمعصر تھے اور یہ جو اس بستی کے پاس سے گزرے وہ ان کے بعد کے زمانہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے جیسا کہ اسے حضرت وہب بن منبہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: اگر خضر علیہ السلام ہی ارمیا ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ وہی ہوں کیونکہ حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے اب تک مسلسل موجود ہیں۔ اس بارے میں صحیح روایت اسی طرح ہے۔ اس کا بیان سورۃ الکہف میں آئے گا اور اگر وہ اس واقعہ سے پہلے وصال فرما چکے ہیں تو پھر ابن عطیہ کا قول صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

نحاس اور مکی نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی تھا اس کا نام معلوم نہیں۔ نقاش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: وہ حضرت لوط علیہ السلام کا غلام تھا (2)۔

سہیلی نے قتبی سے بیان کیا ہے وہ ان کے دو قولوں میں سے ایک کے مطابق شعیا تھے اور وہ جس نے اس بستی کو برباد ہونے کے بعد تعمیر (آباد) کیا تھا وہ کوشک الفارسی ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ربیع بن انس وغیرہم کے قول کے مطابق وہ بستی جس کا ذکر کیا گیا ہے وہ بیت المقدس ہے۔ فرمایا: وہ مصر سے آنے والا تھا اور اس کے جس طعام و

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دارالکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

شراب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سبز انجیر اور انگور اور نچوڑے سے بنا ہوا ایک چھوٹا سا برتن شراب کا تھا اور یہ بھی ہے کہ اس میں جوس تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پانی کا ایک مٹکا تھا یہی اس کی شراب تھی اور وہ جس نے اس وقت بیت المقدس کو خالی کر دیا وہ بخت نصر تھا اور وہ عراق پر لہراسب کی طرف سے پھر یستاسب بن لہراسب والد اسفند یاد کی جانب سے والی تھا۔

نقاش نے بیان کیا ہے کہ ایک قوم نے کہا ہے: یہ ایک لٹی کی ہوئی بستی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ابو صالح کی روایت میں کہا ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل سے جنگ لڑی اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا۔ وہ انہیں لے کر آیا اور ان میں عزیر بن شرخیا بھی تھے اور وہ بنی اسرائیل کے علماء میں سے تھے۔ پس وہ ان کے ساتھ بابل کی طرف آئے وہ ایک دن اپنے کسی کام سے ہرقل کی عبادت گاہ کی طرف دریائے دجلہ کے کنارے پر نکلے۔ پس وہ درخت کے سائے میں اترے اور وہ اپنے ایک گدھے پر سوار تھے۔ انہوں نے درخت کے سائے میں گدھا باندھا پھر بستی کا چکر لگایا اور وہاں کوئی رہائشی نہ دیکھا اور یہ بستی اپنی چھتوں کے بل گری پڑی تھی تو کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی ہلاکت و بربادی کے بعد زندہ کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ وہ بستی ہے جس سے موت کے ڈر سے ہزاروں افراد نکلے۔

ابن زید نے یہی کہا ہے۔ اور ابن زید سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ لوگ جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے وہ ہزاروں تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: تم مر جاؤ۔ ان کے پاس سے کوئی آدمی گزرا اور آنحالیکہ وہ خالی ہڈیاں تھے جو بالکل ظاہر تھیں۔ پس وہ آدمی کھڑے ہو کر دیکھنے لگا اور اس نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سو برس تک مردہ رکھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن زید کی جانب سے یہ قول آیت کے الفاظ کے متناقض ہے، کیونکہ یہ آیت ایسی بستی کو متضمن ہے جو گری پڑی ہے اور اس میں کوئی انیس و غمخوار نہیں ہے اور ھٰذِہٖ کے ساتھ اشارہ اسی بستی کی طرف ہے اور اسے زندہ کرنے سے مراد اسے آباد کرنا ہے اور اس میں عمارتوں اور رہنے والوں کا موجود ہونا ہے (1)۔

حضرت وہب بن منبہ، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع اور حضرت عکرمہ رحمہم اللہ نے کہا ہے: وہ بستی بیت المقدس ہے جسے بخت نصر بابلی نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور طویل حدیث میں ہے کہ جس وقت بنی اسرائیل ایسے واقعات سے دو چار ہوئے تو ارمیاہ یا عزیر اس بستی کے پاس ٹھہرے اور وہ بہت بڑے ٹیلے کی مانند تھی بیت المقدس کے وسط میں، کیونکہ بخت نصر نے اپنے لشکر کو اس کی طرف مٹی منتقل کرنے کا حکم دیا تھا یہاں تک کہ اس نے اسے پہاڑ کی طرح بنا دیا اور ارمیاہ نے گھروں کو دیکھا ان کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری پڑی ہیں۔ تو انہوں نے کہا: کیونکر اللہ تعالیٰ اسے اس کی موت کے بعد زندہ کرے گا۔

اور العریش کا معنی ہے: مکان کی چھت۔ اور ہر وہ شے جو اس لئے تیار کی جاتی ہے کہ وہ سایہ دے یا وہ چھپ لے تو وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 347، دار الکتب العلمیہ

عریش ہے اور اسی سے عریش البئر بھی ہے (کنویں کی منڈیر) اور اسی سے رب کریم کا ارشاد بھی ہے: وَمِمَّا يَعْرِشُونَ۔ سدی نے کہا ہے: کہتے ہیں: هي ساقطة على سقفها یعنی چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ اسے طبری نے اختیار کیا ہے اور سدی کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ بستی لوگوں سے خالی ہے اور گھر قائم ہیں۔ اور خاویة کا معنی خالیة (خالی ہونا) ہے۔ اور الخواء کا اصل (معنی) الخلو ہے۔ کہا جاتا ہے: خوت الدار و خويت تخوی خواء (یہ الف ممدودہ کے ساتھ بھی ہے) و خويا: اقوت یعنی گھر کا ساکنین سے خالی ہونا(1)۔ اور اسی طرح جب وہ ساقط ہو جائے، گر جائے اور اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد ہے: فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (نمل: 52) اس میں خاوية بمعنی خالیہ ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خاوية بمعنی ساقطة ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: فهي خاوية على عروشها یعنی وہ گرنے والی ہے اپنی چھتوں پر۔

الخواء الجوع پیٹ کے غذا سے خالی ہونے کے لئے بولا جاتا ہے اور خوت المرأة اور خويت بھی ہے خوی یعنی عورت کا پیٹ ولادت کے وقت خالی ہو گیا۔ اور خويت لها تخوية کہا جاتا ہے جب تو اس کے لئے کھانا تیار کرے جسے وہ کھائے گی اور اس سے مراد طعام ہے۔ اور الخوي فعيل کے وزن پر ہے اور اس سے مراد زمین کا نشیبی ہموار حصہ ہے۔ اور خوى البعير جب اونٹ کے بیٹھنے کے وقت اس کا پیٹ زمین سے دور ہو اور اسی طرح آدمی اپنے سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: أَنَّى يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس کا معنی ہے: کونسے طریقے اور کون سے سبب سے اللہ تعالیٰ اسے موت کے بعد زندہ کرے گا؟ ظاہر لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ بستی کو آبادی اور مکینوں کے ساتھ زندہ کرنے کے بارے سوال ہے، جیسا کہ اب ان خراب و برباد شہروں کے بارے کہا جاتا ہے جو آباد ہونے اور مکینوں سے دور ہوتے ہیں کہ یہ کیونکر اپنی بربادی کے بعد آباد ہوں گے۔ گویا کہ یہاں کھڑے ہونے والے کی طرف سے اظہار افسوس ہے جو اس شہر پر عبرت کی نظر ڈال رہا ہے جس میں اس کے گھر والے اور اس کے دوست احباب موجود تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس کی ذات میں ایسی شے سے مثال بیان فرمائی جو اس سے عظیم تر ہے جس کے بارے اس نے سوال کیا ہے اور وہ مثال جو اس کے لئے اس کی ذات میں بیان کی گئی ہے وہ احتمال رکھتی ہے کہ اس کا سوال بنی آدم کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کیونکر اس کے مردوں کو زندہ کرے گا(2)۔

علامہ طبری نے بعض سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: یہ قول احیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک ہے اور اسی لئے اس کی ذات میں اس کی مثال بیان کی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک داخل نہیں ہو سکتا کہ وہ بستی کو دوبارہ آباد کر کے اسے زندہ کر دے۔ بلاشبہ دوسری وجہ میں شک کا تصور صرف جاہل کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور درست یہ ہے کہ آیت میں شک کی کوئی تاویل نہ کی جائے(3)۔

قولہ تعالیٰ: فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ۔ مائة یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے اور عام بمعنی سال ہے۔ کہا جاتا ہے: سنون

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 39، داراحیاء التراث العربیہ
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دارالکتب العلمیہ
3۔ ایضاً

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ اس نے یہ قول اس بنا پر کیا جو اس کے نزدیک تھا اور جو اس کے گمان میں تھا اور اس بنا پر وہ اپنی خبر دینے میں جھوٹا نہیں ہو سکتا اور اسی کی مثل اصحاب کہف کا قول ہے: قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (الکہف:19) (بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ) حالانکہ وہ تین سو نو برس تک ٹھہرے رہے۔ جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور وہ جھوٹے نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس مدت کی خبر دی جو ان کے نزدیک تھی، گویا کہ انہوں نے کہا: جو ہمارے نزدیک ہے اور جو ہمارے گمان میں ہے (وہ یہ ہے) کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے۔ اور اس کی نظیر ذوالیدین کے قصہ میں حضور نبی کریم ﷺ کا قول بھی ہے: لم اقصر ولم انس (1) (یعنی نہ نماز کم ہوئی اور نہ میں بھولا۔)

اور لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے وہ اس بنا پر ہے کہ اس میں جھوٹ حقیقتاً موجود ہے لیکن ان کے سبب اس کا مواخذہ نہیں، ورنہ جھوٹ سے مراد کسی شے کے بارے میں ایسی خبر دینا ہے جو اس کی حقیقت کے خلاف ہو اور یہ علم اور جہالت کے سبب مختلف نہیں ہوتا اور یہ اصول کی نظر میں واضح اور بین ہے اور اس بنا پر جائز ہے کہ یہ کہا جائے: بے شک انبیاء علیہم السلام کسی شے کے بارے ایسی خبر دینے سے معصوم نہیں ہیں جو خلاف واقعہ ہو بشرطیکہ وہ بالقصد اور بالارادہ نہ ہو جیسا کہ وہ سہو ونسیان سے معصوم نہیں ہیں۔ اور یہ وہ ہے جو اس آیت سے تعلق رکھتا ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن جریج، قتادہ اور ربیع نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے ایک دن صبح کو موت دی پھر اسے غروب آفتاب سے پہلے زندہ کر کے اٹھا دیا گیا تو اس نے اسے ایک دن گمان کیا اور کہا: میں ایک دن ٹھہرا، پھر اس نے سورج کو باقی دیکھا اور اسے جھوٹا ہونے کا خوف لاحق ہوا تو اس نے کہہ دیا "یا دن کا کچھ حصہ" تو اسے کہا گیا: "بلکہ تو سو سال تک ٹھہرا رہا" اور بستی کی آبادی، اس کے درخت اور اس کی ان عمارتوں کو دیکھا جو اس پر دال تھیں(2)۔

قولہ تعالیٰ: فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ۔ طعام سے مراد وہ انجیر ہے جو اس نے اس بستی کے درختوں سے جمع کیا تھا جس کے پاس سے گزرا تھا۔ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ حضرت ابن مسعود نے اس طرح قرات کی ہے وھذا طعامك وھذا شرابك لم يتسنه (اور یہ تیرے کھانے اور تیرے پینے کا سامان ہے یہ باسی نہیں ہوا) اور طلحہ بن مصرف وغیرہ نے اس طرح پڑھا ہے: وانظر لطعامك وشرابك لمائة سنة(3) اور جمہور نے وصل کلام میں ہا کو ثابت رکھا ہے مگر دو قراء (حمزہ اور کسائی) اسے حذف کرتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پر وقف ہا کے ساتھ ہے اور طلحہ بن مصرف نے بھی لم یتسن وانظر پڑھا ہے یعنی میں ہا کو مدغم کیا گیا ہے(4)۔ اور جمہور کی قرات کے مطابق ہا اصلیہ ہے اور ضمہ کو جزم کے سبب حذف کر دیا گیا ہے اور یہ یتسنہ ہو جاتا ہے یہ السنہ سے ہے یعنی سالوں نے اسے تبدیل نہیں کیا۔ جوہری نے کہا ہے: اور کہا جاتا ہے سنون اور السنۃ یہ السنین کی واحد ہے۔ اور اس کے ناقص ہونے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک کے مطابق یہ واو کی بنا اور آخر میں ہا ہے۔ اور اس کی اصل سنھۃ، جبھۃ کی مثل ہے کیونکہ یہ سنھت النخلۃ وتسنھت سے ہے جب اس پر کئی

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 161۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ھل یاخذ الامام اذا شک بقول الناس، حدیث نمبر 873، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر الوجیز، جلد 1، صفحہ 348، دارالکتب العلمیہ

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 350

یعنی وہ اپنی طراوت اور عمدگی پر باقی رہا۔

قولہ تعالیٰ: وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ۔ حضرت وہب بن منبہ وغیرہ نے کہا ہے: اس کی ہڈیوں کے جڑنے اور اس کے ایک ایک عضو کے زندہ ہونے کی طرف دیکھ۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسی طرح زندہ کیا یہاں تک کہ وہ جڑی ہوئی ہڈیاں ہو گیا، پھر اس پر گوشت پیدا کر دیا یہاں تک کہ وہ کامل گدھا بن گیا۔ پھر اس کے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے اس میں روح پھونک دی تو گدھا کھڑا ہو کر ہینگنے لگا۔ یہی موقف اکثر مفسرین کا ہے۔

حضرت ضحاک اور حضرت وہب بن منبہ سے بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان دونوں نے کہا: بلکہ اسے کہا گیا: تو اپنے گدھے کی طرف دیکھ ذرا ٹھیک وہ اپنے باندھنے کی جگہ میں کھڑا ہے، سو برس میں اسے کوئی شے (آفت، تکلیف) نہیں پہنچی۔ اور وہ ہڈیاں جن کی طرف اس نے دیکھا ہے وہ اس کی اپنی ہڈیاں تھیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں اور اس کے سر کو پہلے زندہ کر دیا اور ابھی اس کا سارا جسم مردہ تھا۔ ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ارمیا اور اس کے گدھے کی طرف اتنی طویل مدت تک دیکھنے سے اندھا کیے رکھا (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ۔ فراء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ لِنَجْعَلَكَ میں واؤ داخل کی گئی ہے اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ یہ اپنے مابعد فعل کے لئے شرط ہے۔ اس کا معنی ہے: وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ، و دلالة على البعث بعد الموت جعلنا ذالك ۔ (اور یہ سب اس لئے) (کہ ہم بنائیں تجھے لوگوں کے لئے نشان) اور ہم نے بعث بعد الموت پر بطور دلیل اسے بنایا ہے۔ اور اگر تو چاہے تو واؤ کو محض زائدہ بنا لے۔ اور اعمش نے کہا ہے: اس کے نشانی ہونے کا محل یہ ہے کہ وہ اپنی اسی حالت پر نوجوان اٹھا جس حالت پر وہ اس دن تھا جس دن فوت ہوا اور اس نے بیٹے اور پوتے بڑھاپے کی حالت میں پائے۔ حضرت عکرمہ نے کہا ہے: جس دن وہ فوت ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس برس کی تھی (2)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عزیر اپنے گھر والوں سے نکلے اور پیچھے اپنی حاملہ بیوی چھوڑی۔ آپ کی عمر پچاس سال تھی اور اللہ تعالیٰ نے سو برس آپ کو مردہ حالت میں رکھا، پھر آپ کو اٹھایا اور آپ لوٹ کر اپنے گھر والوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ پچاس سال کے جوان تھے اور آپ کا بیٹا سو برس کا تھا۔ پس آپ کا بیٹا آپ سے پچاس برس بڑا تھا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو زندہ کیا تو وہ اپنے گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے تو نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے اور نہ ہی لوگ انہیں پہچان سکے۔ اور انہوں نے اپنے گھر میں ایک نابینا بڑھیا کو پایا وہ ان کی کنیز تھی۔ جب حضرت عزیر ان سے نکلے تھے اس وقت اس کی عمر بیس برس کی تھی۔ تو آپ نے اسے فرمایا: کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ اس نے کہا: ہاں، پھر وہ رونے لگی اور کہنے لگی: عزیر اتنے برس سے ہم سے جدا ہو گئے ہیں، آپ نے فرمایا: میں عزیر ہوں، اس نے کہا: بلاشبہ عزیر تو سو برس سے ہم سے گم اور مفقود ہیں۔ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے سو برس تک مجھے موت دیئے رکھی پھر اس نے مجھے زندہ فرما دیا ہے۔ بڑھیا نے کہا: عزیر تو مریض کے لئے مستجاب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

الدعوات تھے اور کسی مصیبت و اذیت میں مبتلا آدمی اگر آپ کو پا لیتا تھا تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میری بصارت مجھے لوٹا دے۔ سو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ اسی جگہ صحت یاب ہو گئی، گویا اسے رسیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ تو وہ کہنے لگی: میں شہادت دیتی ہوں بلاشبہ تو عزیر ہے۔ پھر وہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف چل پڑی اور ان میں حضرت عزیر کا بوڑھا بیٹا بھی تھا اس کی عمر ایک سو اٹھائیس برس تھی اور اس کے بیٹوں کے بیٹے بھی بوڑھے تھے۔ تو بڑھیا نے کہا: اے قوم! قسم بخدا! یہ عزیر ہے۔ تو آپ کا بیٹا لوگوں کے ساتھ آپ کی طرف آیا تو ان کے بیٹے نے کہا: میرے باپ کے دونوں کندھوں کے درمیان ہلال کی شکل سیاہ نشان تھا۔ سو اس نے اسے دیکھا تو وہ عزیر ہی تھے۔ اور کہا گیا ہے: آپ اس حال میں آئے کہ آپ کو بھیجنے والے تمام ہلاک ہو چکے تھے تو آپ ان کے لئے ایک نشانی تھے کہ آپ کی قوم میں سے زندہ تھے کیونکہ آپ کے احوال سننے کے سبب وہ یقین رکھتے تھے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اتنی مدت آپ کو موت دینے میں اور پھر اس کے بعد آپ کو زندہ کرنے میں بہت عظیم نشانی ہے اور آپ کا امر معاملہ آنے والے زمانے کے لئے علامت و نشانی ہے۔ بعض کو چھوڑ کر بعض کی تخصیص کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں (1)۔

قولہ تعالیٰ: وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا۔ علمائے کوفہ اور ابن عامر نے زا کے ساتھ قراءت کی ہے اور باقیوں نے را کے ساتھ، اور ابان نے حضرت عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے نَنْشُرُهَا یعنی نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور را کے ساتھ روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابن عباس، حسن اور ابو حیوہ نے قراءت کی ہے اور کہا گیا ہے: یہ دونوں لغتیں احیاء (زندہ کرنے) کے معنی میں ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: رجع رجوعا و رجعته اور غاض الماء و غضته، غیرت الدابة و غیرتها مگر لغت میں معروف یہ ہے: انشر الله الموتى فنشروا، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ کیا پس وہ زندہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (عبس) (پھر جب چاہے گا اسے زندہ کر دے گا) اور اس کا لفظ کپڑے کے نشر (لپیٹنے) کی مثل ہوتا۔ نشر المیت ینشر نشورا یعنی مرنے والا موت کے بعد زندہ ہو گیا۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

حتی یقول الناس مما راوا ٭ یا عجبا للمیت الناشر (2)

یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے جو کچھ انہوں نے دیکھا موت کے بعد زندہ ہونے والے میت کا واقعہ کتنا عجیب ہے۔

گویا موت ہڈیوں اور اعضاء کو لپیٹنے کا نام ہے اور احیاء اور اعضاء کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا نشر ہے۔

اور رہی نُنْشِزُهَا کی قراءت زا کے ساتھ تو اس کا معنی ہے: ہم انہیں اٹھاتے ہیں اور نشز کا معنی ہے زمین کی بلند اور اٹھی ہوئی جگہ۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تری الثعلب الحولی فیہا کانہ ٭ اذا ما علا نشزا حصان مجلل

اس میں نشزا بلند جگہ کے معنی میں ہی مذکور ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 350، دار الکتب العلمیہ

2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربی

کسی نے کہا ہے: معنی یہ ہے تو ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم کیسے زندہ کرنے کے لئے ان میں سے بعض کو اٹھا کر بعض پر ترکیب کے ساتھ رکھتے ہیں، کیونکہ النشوز کا معنی الارتفاع (بلند ہونا) ہے اور اسی سے المرأۃ النشوز ہے اس سے مراد ایسی عورت ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ موافقت کرنے سے بلند ہوتی ہے۔ (یعنی اس کے ساتھ موافقت نہیں کرتی) اور اسی سے رب العالمین کا یہ ارشاد ہے: وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا (المجادلہ: 11) (اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو) یعنی تم اٹھو اور مل جاؤ۔ اور یہ بھی ہے کہ را کے ساتھ قراءت ہو تو معنی احیاء (زندہ کرنا) ہے۔ اور ہڈیاں انفرادی طور پر زندہ نہیں ہوتیں یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور زا اس معنی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ یہ معنی انضمام (ملنا) ہے نہ کہ بمعنی احیاء۔ پس احیاء کے ساتھ آدمی متصف ہے نہ کہ انفرادی طور پر ہڈیاں اور یہ نہیں کہا جا سکتا: ھذا عظم حی (یہ زندہ ہڈی ہے)۔ لہٰذا معنی یہ ہوا: پس تو دیکھ ہڈیوں کی طرف ہم کیسے انہیں زمین میں ان کی جگہوں سے جسم کی طرف اٹھاتے ہیں (جس) جسم والے کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

اور نخعی نے نَشْرُھَا نون کے فتحہ، شین کے ضمہ اور زا کے ساتھ قراءت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ننشیھا یا کے ساتھ قراءت کی ہے۔

اور کسوہ سے مراد وہ کپڑے ہیں جو ڈھانپ لیں۔ اور گوشت کو ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور لبید نے اسلام کے لئے بطور استعارہ اسے استعمال کیا ہے۔ اور کہا ہے:

حتی اکتسیت من الاسلام سربالا (1)

(یہاں تک کہ میں نے اسلام سے لباس پہن لیا یعنی میں نے اسلام قبول کر لیا) اور یہ سورت کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۔ (اعلم) میں ہمزہ قطعی ہے اور یہ روایت ہے کہ اللہ جل ذکرہ نے اس کے بعض (حصے) کو زندہ فرمایا پھر اسے دکھایا کہ اس نے اس کے بقیہ حصے کو کیسے زندہ کیا ہے۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: بلاشبہ وہ دیکھنے لگا اللہ تعالیٰ کیسے بعض ہڈیوں کو بعض کے ساتھ جوڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول اس کے سر کو تخلیق فرمایا اور اسے کہا گیا: تو دیکھ تو اس وقت اس نے کہا: اعلم الف قطعی کے ساتھ یعنی اعلم ھذا میں اسے جان گیا۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ کا معنی یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے وہ شے اس کے لئے بالکل عیاں اور واضح ہو گئی جس سے وہ ناواقف تھا تو اس نے اپنے باطن دیکھنے کو قبول کر لیا اور اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا: اعلم۔ (میں جان گیا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، کیونکہ اس نے ایسی شے کو لازم کیا ہے لفظ جس کا تقاضا نہیں کرتا اور اس نے شاذ قول اور ضعیف احتمال کے مطابق تفسیر بیان کی ہے۔ یہ میرے نزدیک اس شے کے بارے میں اقرار نہیں ہے جس کا وہ اس سے پہلے

1۔ بحوالہ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 55، دار احیاء التراث العربیہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو۔ فرمایا: (اے ابراہیم) کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل۔ فرمایا: تو پکڑ لے چار پرندے پھر مانوس کر لے انہیں اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے۔"

لوگوں نے اس سوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے یہ شک کے سبب صادر ہوا یا نہیں؟ تو جمہور نے کہا ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں کوئی شک لاحق نہیں ہوا۔ بلاشبہ آپ نے معائنہ کا مطالبہ کیا اور وہ اس لئے کہ نفوس ہر اس شے کو دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں جس کے بارے انہیں خبر دی جائے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لیس الخبر کالمعاینة (1) (خبر معائنہ کی طرح نہیں ہے)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے آپ کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا، ابو عمر نے یہی کہا ہے۔

امام اخفش نے کہا ہے: اس سے دل کی رؤیت مراد نہیں لی گئی بلکہ آپ نے آنکھ کے ساتھ دیکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

اور حضرت حسن، قتادہ، سعید بن جبیر اور ربیع رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: آپ نے سوال کیا تاکہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں عنوان بنایا اور کہا: وقال آخرون سأل ذلک ربہ لأنہ شک فی قدرۃ اللہ تعالیٰ (اور دوسروں نے کہا: آپ نے اپنے رب سے یہ سوال کیا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک تھا۔) اور انہوں نے اس عنوان کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول ذکر کیا ہے آپ نے فرمایا: میرے نزدیک قرآن کریم میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید افزا نہیں۔

اور حضرت عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں وہ بعض داخل ہو گیا جو لوگوں کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ فرماتا ہے؟

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نحن أحق بالشک من ابراھیم الحدیث۔ (ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں)۔ پھر علامہ طبری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے (2)۔

میں کہتا ہوں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے ان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ مسند احمد، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 315، حدیث نمبر 3250
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 352، دار الکتب العلمیہ

نے فرمایا: ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں جب انہوں نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا دے مردوں کو کیسے تو زندہ فرماتا ہے؟ تو رب کریم نے فرمایا: کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے؟ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن صرف اس لئے ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے وہ رکن شدید (مضبوط سہارے) کی طرف پناہ لیتے تھے اور اگر میں قید میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا (1)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جو علامہ طبری نے عنوان بنایا ہے میرے نزدیک وہ مردود ہے اور جو عنوان کے تحت انہوں نے ذکر کیا ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کا تعلق ہے: ھی ارجی آیۃ تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ پر اور دنیا میں مردوں کے زندہ کرنے کے سوال پر رہنمائی موجود ہے اور یہ اس وہم میں ڈالنے والی نہیں ہے اور آپ کا یہ کہنا جائز ہے: ھی ارجی آیۃ (یہ زیادہ امید دلانے والی آیت ہے) یعنی یہاں یہ ایمان کافی ہے جو اپنے ساتھ کسی چھان بین اور بحث و تمحیص کا محتاج نہیں ہوگا۔

اور رہا حضرت عطا کا یہ قول: دخل قلب ابراھیم بعض ما یدخل قلوب الناس تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر وہ شک کرنے والے ہوتے تو یقیناً ہم ان کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتے اور ہم شک نہیں کرتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تو زیادہ مناسب ہے کہ وہ شک نہ کریں (2)۔ پس حدیث طیبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر مبنی ہے۔ اور وہ حدیث جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذالک محض الایمان (3) (وہ خالص ایمان ہے) تو یہ ایسے خطرات (کھٹکنے والی چیزوں) کے بارے میں ہے جو ثابت نہیں رہتے اور رہا شک تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دو امروں کے درمیان توقف کرتا ہے جس میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو۔ اور اس کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے نفی کی گئی ہے اور مردوں کو زندہ کرنا تو یہ سمع سے ثابت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بارے زیادہ جانتے تھے اور اس پر آپ کا یہ قول تیری رہنمائی کرتا ہے: ربی الذی یحیی و یمیت اور اس پر شک کرنا اس کے لیے بعید ہے جس کا قدم مقام ایمان میں ثابت ہو تو جو مرتبہ نبوت اور خلت پر فائز ہو اس کے بارے شک کیسے ہو سکتا ہے؟ اور انبیاء علیہم السلام تو کبائر سے معصوم ہیں اور بالاجماع ان صغیرہ گناہوں سے بھی جن میں رذالت ہوتی ہے اور جب تو آپ علیہ السلام کے سوال اور آیت کے تمام الفاظ میں غور و فکر کرے گا تو وہ قطعاً شک پیدا نہیں کرتے اور وہ اس طرح کہ سوال کیف کے ساتھ ہے اور اس کے ساتھ سوال کسی شے کی حالت کے بارے ہوتا ہے جو موجود ہو اور سائل اور مسئول دونوں کے نزدیک اس کا وجود مقرر اور ثابت ہو۔ مثلاً تیرا یہ قول: کیف علم زید (زید کا علم کیسا ہے؟) کیف نسج الثوب (کپڑے کی بناوٹ کیسی ہے) اور اسی طرح کی دیگر مثالیں۔ اور جب تو نے کہا: کیف ثوبک؟ (تیرا کپڑا کیسا ہے) اور کیف زید؟ (زید کیسا ہے) تو یہ تیرا سوال ان کے احوال میں سے کسی حال کے بارے ہے اور کبھی کیف کسی شی کے بارے خبر دینے کے لئے ہوتا ہے جس کی شان یہ ہو

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 477، وزارت تعلیم۔ ایضاً حدیث نمبر 3121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً
3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 79، وزارت تعلیم۔

کی اس کے بارے کیف سے سوال کیا جائے۔ جیسے تیرا یہ قول: کیف شئت فکن۔ (جس حالت میں تو چاہے تو ہو جا) اور اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: کیف کان بدء الوحی (وحی کا آغاز کیسے ہوا؟) اور اس آیت میں کیف زندہ کرنے کی ہیئت کے بارے سوال کرنے کے لئے ہے اور احیاء (زندہ کرنا) متقرر اور ثابت شدہ امر ہے۔

لیکن جب ہم نے کسی شے کے وجود کا انکار کرنے والے بعض لوگوں کو پایا ہے کہ وہ اس کے انکار کو اس شے کی حالت کے بارے سوال سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ شے فی نفسہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک دعویٰ کرنے والا یہ کہے: انا ارفع ھذا الجبل، میں اس پہاڑ کو اٹھا سکتا ہوں۔ تو اسے جھٹلانے والا کہتا ہے: مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھا سکتا ہے؟ تو عبارت میں یہی طریقہ مجاز ہے اور اس کا معنی ہے ایک بار بطور قیاس جھگڑنے کے تسلیم کرنا۔ گویا کہ وہ کہہ رہا ہے: میں فرض کرتا ہوں کہ تو اسے اٹھا سکتا ہے سو تو مجھے دکھا تو اسے کیسے اٹھائے گا۔ پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی عبارت اس انداز کے مجازی کے مطابق تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اسے خاص کر دیا اور اسے اس پر محمول کیا کہ آپ کے لئے حقیقت بیان فرما دی اور آپ کو فرمایا: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى تو اس سے امر مکمل ہو گیا اور ہر قسم کے شک سے پاک ہو گیا پھر آپ علیہ السلام نے وضاحت اور طمانیت کے ساتھ اپنے سوال کی علت بیان کی (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ جو ابن عطیہ نے ذکر کیا ہے وہ بڑی (انتہا کو) پہنچا ہوا ہے اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے بارے میں اس طرح کا شک جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ کفر ہے اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات دوبارہ اٹھائے جانے کے ساتھ ایمان لانے پر متفق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے رکھی ہے کہ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے اولیاء پر شیطان کو کوئی راہ اور غلبہ نہیں ہے۔ اور فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: 42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) اور اس لعین نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝ (ص) یعنی تیرے مخلص بندوں پر میرا تسلط نہیں ہو سکتا) اور جب شیطان کے لئے ان پر کوئی غلبہ اور تسلط نہیں ہے تو پھر وہ انہیں شک میں کیسے ڈال سکتا ہے؟ بلاشبہ آپ نے سوال کیا کہ آپ مردوں کے اجزاء بکھر جانے کے بعد ان کے جمع ہونے کی کیفیت اور پٹھوں اور جلدوں کو پھاڑنے اور بکھیرنے کے بعد انہیں جوڑنے کی کیفیت کا مشاہدہ کریں۔ وہ ارادہ یہ کیا کہ آپ علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ترقی کریں۔ پس آپ کا قول: اَرِنِیْ كَیْفَ یہ کیفیت کے مشاہدہ کی طلب پر دال ہے۔

اور بعض علمائے معانی نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہ رائے فاسد اور مردود ہے اس بیان کے سبب جو اس کے پیچھے ہے۔ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے اور آپ کا ارشاد اَوَلَمْ تُؤْمِنْ میں الف برائے استفہام نہیں ہے بلکہ یہ الف برائے ایجاب و تقریر ہے۔ جیسا کہ جریر نے کہا ہے:

أَلَسْتُمْ خَيْرَ مَنْ رَكِبَ الْمَطَايَا

کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو جو سواریوں پر سوار ہوئے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

(یعنی اس سے بہتر ہو تو گویا الف برائے ایجاب ہوا)

اور نُؤْمِن میں واؤ حالیہ ہے۔ اس کا معنی ایمان مطلق ہوا اور اس میں مردوں کو زندہ کرنے کی فضیلت داخل ہے۔

قولہ تعالیٰ: قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ یعنی میں نے تجھ سے سوال کیا ہے تا کہ میرا دل برہان (دلیل) کے ساتھ معلوم اور مشاہدہ کے مابین فرق حاصل ہونے سے مطمئن ہو جائے۔

اور طمانیت کا معنی اعتدال اور سکون ہے اور اعضاء کی طمانینت تو معروف ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ثم ارکع حتی تطمئن راکعا۔ (1) الحدیث (پھر تو رکوع کر یہاں تک کہ تو پورے اطمینان سے رکوع کرنے والا ہو) اور دل کی طمانیت یہ ہے کہ کسی شے معتقد میں اس کی فکر پرسکون ہو جائے (اور راحت میں بدل جائے۔) اور احیاء کے بارے میں فکر کرنا ممنوع نہیں ہے جیسا کہ آج ہمارے لئے ہے کہ ہم اس میں فکر کریں کیونکہ اس فکر میں ہی عبرت ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو مشاہدہ اور معاینہ کا ارادہ کیا تو احیاء کی صورت میں ان کی فکر ختم ہو جائے گی۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے: لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ کا معنی ہے تا کہ میرا دل محفوظ ہو جائے اور اسی طرح حضرت سعید بن جبیر سے بیان کیا گیا ہے۔ اور ان سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے تا کہ یقین میں اضافہ ہو جائے۔ ابراہیم اور قتادہ نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے: تا کہ وہ میرے ایمان کے ساتھ مزید ایمان کا اضافہ کرے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس معنی میں کوئی زیادتی ممکن نہیں ہوتی مگر فکر سے سکون حاصل کرنے کے ساتھ ورنہ یقین منقسم نہیں ہوتا (2)۔

سدی اور ابن جبیر نے بھی کہا ہے: کیا تم یقین نہیں رکھتے اس کے ساتھ کہ تم میرے خلیل ہو؟ آپ نے عرض کی: کیوں نہیں بلکہ (سوال اس لئے ہے) تا کہ میرا دل خلت کے ساتھ مطمئن ہو جائے۔

اور یہ قول بھی ہے: آپ نے دعا کی کہ وہ آپ کو دکھائے وہ کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے تا کہ وہ جان لے کہ اس کی دعا قبول کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: کیا تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں تمہاری دعا قبول کرتا ہوں؟ آپ نے عرض کی: ایمان تو ہے (لیکن سوال اس لئے کیا ہے) تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے کہ تو میری دعا قبول کرتا ہے۔

آپ کو اس پر برانگیختہ کرنے والے کے بارے میں اختلاف ہے۔ یہ کہا گیا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ آپ کو خلیل بنائے گا تو آپ نے اس پر کسی نشانی (کے حصول) کا ارادہ کیا۔

سائب بن جبیر نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے: (کہ وہ) نمرود کا یہ قول تھا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور حسن نے کہا ہے: انہوں نے ایک مردار دیکھا اس کا نصف حصہ خشکی میں پڑا تھا اسے درندے چیر پھاڑ کر کھا رہے تھے اور نصف حصہ سمندر میں تھا اسے سمندری جانور چیر پھاڑ رہے تھے تو جب آپ نے اسے متفرق ہوتا اور بکھرتا دیکھا تو آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، جلد 1، صفحہ 105، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب ابواب صفۃ الصلاۃ، حدیث نمبر 715، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 353، دار الکتب العلمیہ

اصلح ہوتا ہے جس میں پیشگی اذن نہ ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کے بارے علم دیا تھا اس سے پہلے کہ آپ کی اولاد ہو اور اس سے پہلے کہ آپ پر صحف نازل کرے۔ واللہ اعلم۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

"مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی ہے جیسے ایک دانہ جو اگاتا ہے سات بالیں (اور) ہر بال میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے"۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو قصے بیان کر دیے جن میں دلائل ہیں تو اس نے جہاد پر برانگیختہ کیا اور تو جان لے کہ جس نے اس برہان اور دلیل کے بعد جہاد کیا جسے نبی کے بغیر کوئی نہیں لا سکتا تو اس کے لئے اس جہاد میں ثواب عظیم ہے۔

البستی نے بڑی صحیح سند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی: "اے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما" تو پھر یہ آیت نازل ہوئی: مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن تو بڑھا دے اللہ اس قرض کو اس کے لئے کئی گنا۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر عرض کی: "اے میرے رب! میری امت کے لئے اور اضافہ فرما" تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (الزمر)

اس آیت کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے شرف اور اس کے حسن کی مثال بیان کرنے کے لئے ہیں اور یہ اس پر برانگیختہ کرنے والے کو متضمن ہیں۔ اور کلام میں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: مثل نفقۃ الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ۔ ان کے نفقہ کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے: مثل الذین ینفقون اموالھم کمثل زارع زرع فی الارض حبۃ فانبتت الحبۃ سبع سنابل یعنی ان کی مثال جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کسان کی مثل ہے جس نے زمین میں ایک دانہ کاشت کیا اور اس دانے نے سات بالیں اگائیں۔ یعنی سات بالیں نکالیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ پس صدقہ کرنے والے کو کاشت کرنے والے کے ساتھ تشبیہ دی اور صدقہ کو بیج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر صدقہ کے عوض سات سو نیکیاں عطا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے سات سو پر بڑھا دیتا ہے۔ پس صدقہ کرنے والے کی مثل کاشت کرنے والے کی مثل ہو جائے گی۔ (جیسا کہ) اگر وہ اپنے عمل میں حاذق (ماہر) ہو اور بیج عمدہ ہو اور زمین آباد ہو تو پیداوار زیادہ ہو جاتی ہے۔ پس اسی طرح اگر صدقہ کرنے والا جب صالح ہو، مال طیب اور پاک ہو اور وہ اسے اپنے محل میں خرچ کرتا ہو تو ثواب بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جس نے کہا ہے: آیت میں سات

ہے اور اس کی شاخ متناسل ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سنبل الدخن (باجرے یا مکئی کی بال) ہے۔ وہی وہ شے ہے جس کی ایک بال میں اتنی تعداد میں دانے ہوتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ باجرے کی بالیں میں سے ایک بال میں اس تعداد سے دوگنا زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ دانے ہوتے ہیں، ہم نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: گندم کی بالیں ایسی پائی جاتی ہیں جن میں سو دانے ہوتے ہیں۔ اور رہے تمام دانے تو وہ کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن مثال اس مقدار کے ساتھ بیان کی ہے۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ اس کا معنی ہے اگر وہ دانے پائے اور اس بنا پر کہ وہ اسے فرض کرے۔ پھر انہوں نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: اس کا معنی ہے: ہر بال نے سو دانے نکالے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: علامہ طبری نے حضرت ضحاک کے قول کو اسی طرح رکھا ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور یہ ضحاک کے قول سے لازم نہیں آتا اور ابو عمرو دانی نے بیان کیا ہے کہ بعض نے مائۃ کو اس تقدیر پر منصوب پڑھا ہے۔ انبتت مائۃ حبۃ۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یعقوب حضرمی نے کہا ہے: اور بعض نے یہ پڑھا ہے: فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةَ حَبَّةٍ یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انبتت مائۃ حبۃ ہے۔ اور اسی طرح بعض قراء نے پڑھا ہے: وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابَ جَهَنَّمَ اور یہ واعتدنا لهم عذاب السعير کی بنا پر ہے، یعنی واعتدنا للذين كفروا عذاب جهنم۔ (اور ہم نے جہنم کا عذاب تیار کیا ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا) اور ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے انبتت سبع سنابل میں تا کو سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں حروف مہموسہ میں سے ہیں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ابو عمرو نے شعر بیان کیا ہے:

یا لعن اللہ بنی السعلاۃ　　عمرو بن میمون شرار النات

مراد الناس (اناس) لئے ہیں اور سین کو تا میں بدل دیا ہے اور باقی قراء نے اصل کی بنا پر دونوں کو ظاہر کر کے پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں دو کلمے ہیں۔

مسئلہ نمبر 4۔ قرآن کریم اس بارے میں وارد ہوا ہے کہ نیکی کے جملہ اعمال میں ایک نیکی کا بدلہ اس کی مثل دس کے ساتھ ہے اور یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ جہاد پر خرچ کرنے کی نیکی کا عوض سات سو گنا ہے اور علماء نے اس قول **وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ** کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے: یہ ماقبل سات سو کے ذکر کے بیان اور تاکید کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں سات سو گنا سے بڑھ جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اور علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے: بلکہ یہ اس پر اطلاع دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے لئے عوض سات سو گنا سے بھی زیادہ کر دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کی ابتدائی تفسیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کے مطابق یہ قول زیادہ صحیح ہے۔ اور ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے: حدثنا ہارون بن عبد اللہ الحمال حدثنا ابن ابی فدیک عن

اور جب اس نے اس ارادہ سے مال خرچ کیا کہ وہ کسی بھی وجہ سے منفق علیہ سے جزا حاصل کرے تو اس طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہ کیا اور یہ تب ہے جب اس کے اس گمان کے پیچھے خرچ کرنے سے مقصود احسان جتانا اور اذیت پہنچانا ہو۔ اور اسی طرح جس نے کسی مضطر اور مجبور آدمی سے مشقت اور تکلیف دور کرنے کے لئے خرچ کیا تاکہ اس پر احسان جتلانے کے لئے جس پر خرچ کیا گیا ہے یا مشقت کے کسی دوسرے قرینہ کے سبب اذیت پہنچانے کے لئے تو اسی طرح اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ اس کا یہ عمل قبول کیا جائے گا جب اس کی عطا اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو اور اس کا زیادہ سے زیادہ ارادہ اس (اجر و ثواب) کی خواہش ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا:

یا عُمَرَ الخیرِ جُزیتَ الجنّہ   اُکْسُ بُنَیّاتی و اُمّہنّہ

اے عمر! بھلائی (دستگیری) کیجئے آپ کو جنت کی جزا دی جائے میری بچیوں اور ان کی ماں کو لباس پہنا دیجئے۔

و کُنْ لنا من الزمانِ جُنّہ   اُقسمُ باللہ لتفعلنّہ

تو ہمارے لئے (مصائب) زمانہ سے ڈھال بن جا۔ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں آپ ضرور ایسا کریں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں نہ کروں تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

اِذَنْ اَبا حفصٍ لأذهبنّہ

اے ابا حفص! تب میں چلا جاؤں گا۔

پھر آپ نے فرمایا: جب تو چلا گیا تو کیا ہوگا؟ اس نے عرض کی:

تکونُ عن حالی لَتُسْأَلَنّہ   یومَ تکونُ الأعطیاتُ مَنّہ

میرے حال کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا جس دن عطیات کی آرزو ہوگی۔

و مَوْقِفُ المسئولِ بَیْنَہُنّہ   اِمّا الی نارٍ و اِمّا جنّہ

اور ان کے درمیان مسئول کا موقف (ٹھہرنے کی جگہ) یا جہنم ہوگی یا جنت۔

پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگئی۔ پھر آپ نے فرمایا: اے غلام! اس دن کے لئے اسے میری یہ قمیص دے دو نہ کہ اس کے شعر کے لئے۔ قسم بخدا! میں اس کے سوا کسی کا مالک نہیں ہوں۔ ماوردی نے کہا ہے: جب عطا اس ارادہ پر ہو کہ وہ جزا اور شکر کی طلب سے خالی ہو اور احسان جتلانے اور شہرت سے بھی پاک ہو تو وہ خرچ کرنے والے کے لئے انتہائی اشرف و اعلیٰ ہے اور قبول کرنے والے کے لئے باعث مبارک ہے لیکن جب عطا کرنے والا اپنی عطا سے جزا کا خواہشمند ہو اور اس کے عوض شکر اور ثنا کا طالب ہو تو وہ شہرت کا طالب اور ریاکاری کرنے والا ہے۔ اور ان دونوں میں ایسی مذمت اور برائی ہے جو سخاوت کے منافی ہوتی ہے اور اگر اس نے جزا کا مطالبہ کیا تو وہ ایسا نفع کمانے والا تاجر ہے جو حمد اور مدح کا مستحق نہیں ہوتا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس قول باری تعالیٰ میں کہا ہے: وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝

(المحرر) یعنی آپ کسی کو ایسا عطیہ نہ دیں کہ آپ اس کے عوض اس سے افضل و اعلیٰ کی خواہش رکھتے ہوں۔

اور ابن زید نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو خود جہاد میں نہیں نکلتے بلکہ وہ خرچ کرتے ہیں اس حال میں کہ خود بیٹھے ہوتے ہیں اور اس سے پہلی آیت ان کے بارے میں ہے جو بنفس نفیس جہاد کے لئے نکلتے ہیں۔ فرمایا: اسی لئے ان پر شرط لگائی گئی ہے اور پہلوں پر کوئی شرط نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ اس میں اپنی رائے سے فیصلہ دینے کا اظہار ہو رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى المن کسی نعمت و احسان کا ذکر کرنا ہے اس کو شمار کرنے اور گننے کے لئے اور اس کے سبب (دوسرے کو) پریشان کرنے کے لئے۔ مثلاً وہ یہ کہے: قد احسنت الیک و نعشتک میں نے تجھ پر احسان کیا اور تجھے ہلاک ہونے سے بچا لیا۔ اور اسی کے مشابہ اور الفاظ۔

اور بعض نے کہا ہے: المن کا مفہوم ہے اس کے بارے میں گفتگو کرنا جو اس نے دیا یہاں تک کہ وہ گفتگو اس تک پہنچ جائے جسے دیا گیا اور وہ اس کے لئے باعث تکلیف ہو اور احسان جتلانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے(1)۔ اور یہ بھی ان تین میں سے ایک ہے جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور نسائی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تین آدمی ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا: اپنے والدین کی نافرمانی کرنے والا، مردوں کی طرح بننے والی عورت جو کہ مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرتی ہو اور دیوث (بے غیرت انسان)۔ اور تین ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے: اپنے والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور اس کے ساتھ احسان جتلانے والا جو کسی کو عطا کرے(2)۔'' اور مسلم کی بعض اسناد میں ہے: المنان (احسان جتلانے والا) وہ ہے جو کسی کو بغیر احسان جتلائے کوئی شے نہیں دیتا۔ اور الاذی سے مراد گالیاں دینا اور شکایت کرنا ہے اور یہ منّ سے اعم ہے، کیونکہ منّ، الاذی کا جز ہے لیکن اس کے کثیر الوقوع ہونے کے سبب اس پر نص وارد ہے۔

اور ابن زید نے کہا ہے: اگر تجھے گمان ہو کہ تیرا سلام اس پر ثقیل اور گراں ہوگا جس پر تو نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کچھ خرچ کیا ہے تو تو اس پر سلام نہ کر۔ اور آپ کو ایک عورت نے کہا: اے ابو اسامہ! میری ایسے آدمی پر رہنمائی کیجئے جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے کیونکہ وہ تو نکلتے ہیں (اور) وہ پھل کھاتے ہیں بلاشبہ میرے پاس تیر اور ترکش ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے اور تیرے ترکش میں تیرے لئے برکت نہ دے تحقیق تو نے انہیں دینے سے پہلے انہیں اذیت اور تکلیف دی ہے۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور اس کے پیچھے نہ احسان جتلایا اور نہ دکھ پہنچایا جیسا کہ اس کا یہ قول: تیرا اصرار اور تیری احتیاج کتنی شدید تھی! تیری جانب سے اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے۔ اور اسی

1۔ سنن ابی داؤد، باب ما جاء فی اسبال الازار، حدیث نمبر 3585، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　2۔ مسند امام احمد، حدیث 6180

تو کسی آرزو مند کی حاجت لوٹا کر اس کے چہرے پر نہ مار۔ پس تیری عزت کی بقا اس میں ہے کہ تجھ سے آرزو اور امید وابستہ کی جاتی رہے۔

تلقى الكريم فتستدل ببشره   وترى العبوس على اللئيم دليلا

تو کسی کریم اور سخی سے ملے تو تیرے لئے اس کی دلیل اس کی خندہ پیشانی ہے اور لئیم کی دلیل اس کے چہرے کی یبوست اور تیوری چڑھانا ہے۔

واعلم بأنك عن قليل صائر   خبرا فكن خبرا يروق جميلا

تو اس کے بارے میں جان لے کہ تو قلیل کی مدت سے خبر بننے والا ہے۔ پس تو ایسی خبر بن جا جو حسن و جمال کے اعتبار سے خوش کرنے والی ہو۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب سائل سوال کرے تو تم اس پر اس کا سوال کاٹ نہ دو یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے، پھر بڑے وقار اور نرمی کے ساتھ یا تھوڑے سے بدل کے ساتھ یا حسین انداز میں رد کے ساتھ اس پر جواب لوٹاؤ۔ تحقیق تمہارے پاس وہ آتے ہیں جو نہ انسانوں میں سے ہیں اور نہ جنات میں سے ہیں، وہ اس بارے میں تمہارے احسانات کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں۔"

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس کی دلیل ابرص (برص کا مریض) اقرع (گنجا) اور اعمیٰ (اندھا) والی حدیث ہے[1] اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک فرشتے نے مختلف صورتیں تبدیل کیں۔ ایک بار برص کے مریض کی، دوسری بار گنجے آدمی کی اور تیسری بار اندھے آدمی کی مسئول (جس سے سوال کیا جائے) کا امتحان لینے کے لئے۔

اور حضرت بشر بن حارث نے کہا ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا اور عرض کی: اے امیر المومنین! مجھے کوئی ایسی شے بتائیے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائے تو انہوں نے فرمایا: اغنیاء کا فقراء پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی رغبت اور آرزو رکھتے ہوئے لطف و مہربانی کرنا بہت اچھا ہے اور اس سے اچھا فقراء کا اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد اور یقین کرتے ہوئے اغنیاء پر برگشتہ پھرنا ہے۔ پھر میں نے کہا: اے امیر المومنین! کچھ اضافہ فرمائیے تو آپ نے پیٹھ پھیری اور آپ یہ کہنے لگے:

قد كنت ميتا فصرت حيا   وعن قليل تصير ميتا

تحقیق تو مردہ تھا اور تو زندہ ہو گیا اور پھر قلیل کے سبب تو مردہ ہو جائے گا۔

فاخرب بدار الفناء بيتا   وابن بدار البقاء بيتا

پس تو دار الفناء (دنیا) میں گھر گرا دے اور دار البقاء (آخرت) میں گھر بنا لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّ مَغْفِرَةٌ۔ یہاں مغفرت سے مراد محتاج کی بری حالت اور خصلت کو چھپانا ہے۔ اور اسی

1۔ صحیح بخاری، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3206، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تب بھی صدقہ میں احسان جتلاتا اور دکھ پہنچاتا بھی اس صدقہ کے سوا کسی صدقہ کو باطل نہیں کرتا۔

جمہور علماء نے اس آیت میں کہا ہے: بے شک وہ صدقہ جس کے دینے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احسان جتلائے گا یا اس کے سبب دکھ پہنچائے گا تو وہ قبول نہیں کیا جاتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ اس پر بطور امارہ فرشتہ کو مقرر کر دیتا ہے اور وہ اسے لکھتا ہی نہیں۔ اور یہ قول حسن اور اچھا ہے۔ اور عرب اس کے بارے کہتے ہیں جس کے ساتھ احسان جتلایا جاتا ہے: ید سوداء (سیاہ ہاتھ) (یعنی ایسی نعمت جس کو ضائع کر دیا گیا) اور جو کسی کو بغیر سوال کے عطا کرتا ہے اسے ید بیضاء (روشن ہاتھ) کہتے ہیں اور جو سوال کرنے پر عطا کرتا ہے اسے ید خضراء (سبز ہاتھ) کہتے ہیں۔ اور بعض بلغاء نے کہا ہے: جس نے اپنی نیکی کے ساتھ احسان جتلایا اس کا شکر ساقط ہو گیا، اور جس نے اپنے عمل کے ساتھ تکبر کیا اس کا اجر ضائع ہو گیا اور بعض شعراء نے کہا ہے:

وصاحب سلفت منه الی ید ... أبطا علیه مکافاتی فعادانی

میرا وہ ساتھی جس کی طرف سے مجھ پر پہلے احسان ہو چکا ہے اس پر میری طرف سے بدلہ مؤخر ہوا تو اس نے میرے ساتھ عداوت اختیار کر لی۔

لما تیقن ان الدهر حاربنی ... أبدی الندامة فیما کان أولانی

جب یقین ہو گیا کہ زمانے نے مجھ سے جنگ شروع کر دی ہے تو جو کچھ میرے قریب آیا اسی میں اس نے ندامت ظاہر کر دی۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

أفسدت بالمن ما أسدیت من حسن ... لیس الکریم اذا أسدی بمنان

تو نے احسان جتلانے کے ساتھ اس نیکی کو ضائع کر دیا جس کا تو نے احسان کیا اور کریم (سخی آدمی) جب احسان کرتا ہے تو وہ احسان نہیں جتلاتا۔

اور ابوبکر وراق نے کہا اور خوب اچھا کہا:

أحسن من کل حسن ... فی کل وقت و زمن

ہر اچھائی اور نیکی سے بڑھ کر اچھائی ہر وقت اور ہر زمانے میں۔

صنیعة مربوبة ... خالیة من المنن

وہ احسان ہے جو بڑھا دیا جائے اور آئندہ وہ احسان جتلانے سے خالی ہو۔

ابن سیرین نے ایک آدمی کو سنا وہ دوسرے کو کہہ رہا ہے: فعلت الیک وفعلت (میں نے تیرے ساتھ ایسا کیا اور ایسا کیا) تو آپ نے اسے کہا: تو خاموش رہ، نیکی کو جب شمار کر دیا جائے تو پھر اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایاکم والامتنان بالمعروف فانه یبطل الشکر و یمحق الاجر تم نیکی کے ساتھ احسان جتلانے سے بچو کیونکہ یہ شکر کو باطل کر دیتا ہے اور اجر کو مٹا ڈالتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت

دیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ احسان جتلانا اور اذیت پہنچانا شامل ہو جائے تو اس کے سبب وہ اپنی رک جاتا ہے اور اس
سے تضعیف کی زیادتی منقطع ہو جاتی ہے۔ پہلا قول اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔

صَفْوَانٍ جمع ہے اور اس کی واحد صَفْوَانَۃٌ ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: صفوان واحد ہے جیسا کہ حجر
اور کسائی نے کہا ہے: صفوان واحد ہے اور اس کی جمع صِفْوان، صُفِیّ اور صِفِیّ ہے۔ مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ
صُفِیّ صَفًا کی جمع ہے جیسا کہ قَفًا کی جمع قُفِیّ ہے اور اسی معنی سے الصَّفْوَاء اور الصَّفْوَاء ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت سعید
بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور زہری نے صَفَوَان فا کو متحرک پڑھا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔ اور قطرب نے صِفْوان بیان کیا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: صفوان اور صفوان یہ بھی جائز ہے کہ یہ جمع ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ واحد ہو۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ یہ واحد
ہو۔ اور دلیل یہ ارشاد گرامی ہے: عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ اگرچہ جمع کے لئے مذکر ضمیر لانا جائز ہوتا ہے مگر کوئی شے دلیل
قاطع کے بغیر اپنے باب سے نہیں نکل سکتی۔ اور رہا وہ جو امام کسائی نے جمع کے بارے میں بیان کیا ہے تو وہ فی الحقیقت صحیح نہیں
ہے۔ البتہ صِفِیّ صَفًا کی جمع ہے۔ اور صفا بمعنی صفوان ہے۔ اور اس کی نظیر وَرَل (گوہ کی مانند ایک جانور) اور وِرْلان، اخ
اور اخوان، اور کرا اور کروان (بھورے رنگ اور لمبی چونچ کا ایک پرندہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ رات کو نہیں سوتا ہے۔) ہے جیسا
کہ شاعر نے کہا ہے:

لنا يوم و للكروان يوم ... تطير البائسات و لا نطير

اور عربی میں کروان کی جمع کِرْوان ضعیف ہے اور صُفِیّ اور صِفِیّ صَفًا کی جمع بھی جیسا کہ عَصًا اور الوابل کا معنی ہے:
شدید بارش موسلا دھار بارش اور (یہی کہا جاتا ہے) وَبَلَتِ السَّمَاءُ تَبِلُ (آسمان موسلا دھار برسا) اور الارض مَوْبُولَةٌ (اور
زمین خوب تر ہو گئی) اخفش نے کہا ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: أَخْذًا وَبِيلًا یعنی ہم نے اسے انتہائی
سختی کے ساتھ پکڑ لیا۔ اور ضَرْبٌ وَبِيلٌ (سخت مار) اور عذاب وبیل (شدید عذاب) اور الصَّلْدُ کا معنی ہے: چکنا پتھر۔ امام
کسائی نے کہا ہے: صَلِدَ يَصْلَدُ صَلَدًا اس میں لام متحرک ہے فَهُوَ صَلْدٌ اس میں لام ساکن ہے۔ مراد ہر وہ شے ہے جو کسی
شے کو نہ اگائے۔ اور اسی سے جَبِينٌ أَصْلَدُ (روشن پیشانی) ہے۔ اصمعی نے رؤبہ کے لئے شعر کہا ہے:

براق أصلاد الجبين الأجله

نقاش نے کہا ہے: ہذیل کی لغت کے مطابق اصلد کا معنی اجرد (خالی ہونا) ہے۔

اور لَا يَقْدِرُونَ کا معنی ہے: ریاکار، کافر اور احسان جتلانے والا کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔ عَلٰى شَیْءٍ یعنی اپنے خرچ
کرنے سے کسی شے کے ثواب کا نفع اٹھانے پر (وہ قادر نہیں ہو سکیں گے) اور یہی ان کی کمائی ہے انہیں اس کی ضرورت اور
حاجت ہونے کے وقت، کیونکہ یہ غیر اللہ کے لئے (صدقہ) تھا۔ اور نفقہ کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے اس سے
کسب (کمائی) کا ارادہ کیا ہے۔

اور کہا گیا ہے: یہ ریاکار کے لئے اس کا ثواب باطل کرنے کی مثال بیان کی گئی ہے اور احسان جتلانے والے اور اذیت

ذکر کے ساتھ اور فعل متقدم کی فصاحت و بیان کے ساتھ، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَ اللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ (نوح) (اور اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا ہے) اور وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (المزمل) (اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو) لیکن جب فعل کے ساتھ وضاحت نہ ہو تو ایسا مصدر لانا جائز نہیں ہوتا جو اس کا ہم معنی نہ ہو۔ پھر تو کہے گا: میں اسے فلاں فلاں معنی پر محمول کرتا ہوں اس فعل کے لئے جس کا ذکر پہلے نہیں ہوا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کلام عرب کا صحیح راستہ ہے جس کے بارے تو نے جان لیا ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اگر ایسا ہوتا جیسا کہ حضرت مجاہد نے کہا ہے تو پھر وَ تَثَبُّتًا تثبت سے ہوتا جیسا کہ تکرمت تکرما ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ یہ احتسابا کے معنی میں ہے، یہ نہیں پہچانا جا سکتا مگر اس طرح کہ اس سے مراد لیا جائے کہ ان دلوں نے احتساب کرتے ہوئے ان کی خوب چھان بین کی اور یہ بعید ہے اور حضرت شعبی کا قول اچھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے پر اپنے دلوں کو پختہ رکھتے ہوئے۔ کہا جاتا ہے: ثبت فلانا فی ھذا الامر یعنی میں نے فلاں کو اس کام میں پختہ کر دیا۔ یعنی میں نے اس کے عزم اور ارادہ کی تصحیح کی اور میں نے اسی میں اس کی رائے کو قوی کر دیا۔ اثبتہ تثبیتا اور میں نے اسے بہت پختہ کر دیا۔ یعنی ان کے دل اللہ تعالیٰ کے وعدے کے ساتھ یقین رکھتے ہوئے اس میں بہت پختہ ہو گئے۔

اور بعض نے کہا ہے: وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر پختہ کر دے گا، ای و تثبیتا من انفسھم لثوابھا۔ یعنی تا کہ اس کے ثواب کے بارے ان کے دل پختہ ہو جائیں بخلاف اس منافق کے جو ثواب کا گمان بھی نہیں رکھتا۔

قولہ تعالیٰ: كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اس میں جنۃ کا معنی باغ ہے اور یہ وہ قطعہ زمین ہوتا ہے جس میں درخت اگائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اسے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور یہ لفظ جن اور جنون سے ماخوذ ہے کیونکہ یہ چھپے ہوتے ہیں اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اور ربوۃ کا معنی ہے: ایسی بلند جگہ جس میں بلندی تھوڑی ہو اور غالباً اس کے ساتھ مٹی کی کثافت اور کثرت بھی ہو۔ اور جو زمین اس طرح ہوتی ہے اس کی پیداوار اور نباتات اچھی ہوتی ہے۔ اسی لئے خاص طور پر ربوۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: اور ریاض الحزن اس میں سے نہیں ہے جیسا کہ طبری نے گمان کیا ہے۔ بلکہ یہ وہ ریاض ہے جو نجد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ تہامہ کے ریاض سے بہتر ہے اور نجد کی نباتات زیادہ معطر اور خوشبودار ہوتی ہیں۔ اور اس کی ہوا زیادہ ٹھنڈی اور راحت بخش ہوتی ہے اور نجد کو ہی حزن کہا جاتا ہے۔ اور تہامہ کی ہوا سوائے رات کے بہت کم صحت افزا اور نفع بخش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک اعرابیہ عورت نے کہا ہے: زوجی کلیل تہامۃ (میرا خاوند تہامہ کی رات کی مثل ہے)[1] اور سدی نے کہا: بربوۃ یعنی برباوۃ ہے یعنی زمین کا وہ حصہ جو پست ہو۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قلقۃ (دشواری، پریشانی) سے عبارت ہے اور ربوۃ کا لفظ ربا یربو سے ماخوذ ہے جب وہ بڑھ جائے اس میں اضافہ ہو جائے۔

1۔ صحیح بخاری، باب حسن المعاشرۃ مع الاہل، حدیث نمبر 4790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس کی اضافت باغ کی طرف یہ اضافت اختصاص ہے۔ جیسا کہ سرج الفرس اور باب الدار میں اضافت اختصاص ہے ورنہ پھل اس میں سے نہیں ہے جسے باغ کہا جاتا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے اُکْلَھَا ہمزہ کو ضمہ اور کاف کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح ہر وہ جو مونث کی طرف مضاف ہو۔ اور ابوعمرو نے ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے کہ جب اسے مذکر کی طرف مضاف کیا جائے مثلاً اُکُلَہٗ یا کسی بھی شے کی طرف مضاف نہ ہو مثلاً اُکُلٍ خَمْطٍ (سبا: 16) تو ابوعمرو نے اسے مثقل پڑھا ہے اور دوسرے دونوں نے مخفف پڑھا ہے۔

اور عاصم، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان تمام صورتوں میں جو ہم نے ذکر کی ہیں اسے مثقل پڑھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُکْل اور اُکُل دونوں ہم معنی ہیں۔

ضِعْفَیْنِ یعنی وہ دوسری زمین کے مقابلہ میں دوگنا پھل لایا۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے کہ وہ سال میں دو بار پھل لایا۔ اور پہلا قول زیادہ ہے۔ یعنی اس نے اپنی پیداوار ایک سال میں وہی جتنی پیداوار دوسری زمین دو سالوں میں دیتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بلند زمین کی مدح کی تاکید کے لئے ہے۔ اسی طرح کہ اگر اسے موسلا دھار بارش نہ بھی پہنچے تو اسے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اور یہی دوگنا پھل نکالنے میں شدید بارش کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور یہ زمین کے زرخیز اور طیب ہونے کی وجہ سے ہے۔ مبرد وغیرہ نے کہا ہے: تقدیر کلام میں فطل یکفیها۔ (پس شبنم ہی اسے کافی ہو جائے) اور زجاج نے کہا ہے: فالذی یصیبها طل (اور وہ جس پر شبنم پڑے) اور طل سے مراد کمزور سی بارش ہے جس کے قطرے باریک اور بالکل خفیف سے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے یہی کہا ہے اور یہ اس کی مشہور لغت ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے جن میں سے حضرت مجاہد ہیں کہ الطل کا معنی شبنم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مجاز اور تشبیہ ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور اہل لغت نے بیان کیا ہے: وَبَلَتْ اور اَوْبَلَتْ، طَلَّتْ اور اَطَلَّتْ۔ اور الصحاح میں ہے: الطل سے مراد انتہائی ضعیف اور کمزور بارش اور اس کی جمع الطِّلال ہے۔ اسی سے آپ کہتے ہیں: طُلَّتِ الارض و اطلها الندی زمین پر شبنم پڑی فھی مطلولۃ۔

ماوردی نے کہا ہے: شبنم کی کھیتی بارش کی کھیتی سے کمتر ہوتی ہے اور پیداوار کے لحاظ سے کم ہوتی ہے اور اس میں جب اور اگرچہ پیداوار اور نفع کم ہے۔

بعض نے کہا ہے: آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور اس کا معنی ہے: کمثل جنة بربوة اصابها وابل فان لم یصبها وابل فطل فآتت اکلها ضعفین۔ یعنی باغ کے اوراق (پتے) سبز ہو گئے اور اس کا پھل دوگنا نکلا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلی تاویل زیادہ صحیح ہے اور تقدیم و تاخیر کی کوئی حاجت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مخلص بندوں کے خرچ کئے ہوئے مال کے بڑھنے کو جن کے صدقات کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا رہتا ہے جیسا کہ گھوڑے اور اونٹ کے بچے کو بڑھاتا وغیرہ اسے باغ کے پودوں کے بڑھنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بلند جگہ پر واقع ہو بخلاف اس چکنی چٹان کے جس کی مٹی بہہ گئی

اور وہ صاف پتھر باقی رہ گیا۔

اور مسلم وغیرہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کوئی آدمی بھی جو اپنی پاکیزہ کمائی سے ایک کھجور صدقہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے دست قدرت کے ساتھ لے لیتا ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے اور اونٹ کے بچے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے" اسے موطا نے بھی روایت کیا ہے۔(1)

قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یہ وعدہ اور وعید ہے۔ زہری نے یعملون یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا وہ اس سے تمام لوگ مراد لیتے ہیں یا صرف خرچ کرنے والے مراد لیتے ہیں تو اس صورت میں یہ صرف وعدہ ہے۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

"کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے نہریں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس باغ کو بگولہ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے۔ ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔"

قولہ تعالیٰ: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ الآیہ۔ طبری نے سدی سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال ہے اور آپ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے۔ آپ نے بیان فرمایا: یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے ریاکاروں کے اعمال کے بارے بیان فرمائی ہے جنہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ باطل کر دے گا جس کی طرف وہ زیادہ محتاج ہوں گے جیسا کہ اس آدمی کی مثال جس کا ایک باغ ہو اور اس کے بچے ہوں اور وہ اسے کوئی نفع اور فائدہ نہ دیں اور وہ بوڑھا ہو جائے اور باغ کو تیز آندھی پہنچے جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے اور وہ اسے گم کر دے اس وقت جب وہ اس کا زیادہ محتاج ہو۔ اور ابن زید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد پڑھا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى الآیہ (البقرہ: 264) پھر فرمایا: پھر اس بارے میں مثال بیان فرمائی اور فرمایا: اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ الآیہ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ اس سے واضح اور زیادہ روشن ہے جسے طبری نے ترجیح دی ہے اور یہ آیت ریا کے نفقہ کی دوسری مثال نہیں ہے۔ یہی سیاق کلام کا تقاضا ہے۔ اور رہا اس کا معنی جو اس سیاق کے سوا ہے تو وہ ہر منافق یا کافر کے حال کے مشابہ ہے جو ایک عمل کرتا ہے اور وہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خوب اچھا کر رہا ہے اور جب وہ حاجت کے وقت وہاں آئے گا تو وہ کوئی شے نہ پائے گا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

"اے ایمان والو! خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے اور نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) تم نہ لو اسے بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے۔"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا۔ یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام امت کو ہے اور یہاں انفاق سے جو معنی مراد ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب، عبیدہ سلمانی اور ابن سیرین رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: اس سے مراد وہ زکوٰۃ ہے جو فرض کی گئی ہے۔ اس میں عمدہ شے کی بجائے ردی اور گھٹیا چیز خرچ کرنے سے لوگوں کو منع کیا گیا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: حضرت براء بن عازب، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کے قول سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے اور لوگوں پر مستحب قرار دیا گیا ہے کہ وہ نفلی صدقہ و خیرات نہ کریں مگر عمدہ اور جید چیز کے ساتھ۔ اور آیت دونوں وجہوں کو شامل ہے لیکن صاحب زکوٰۃ کا تعلق اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور امر وجوب پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اسے ردی شے دینے سے منع کیا گیا ہے اور یہ فرض زکوٰۃ کے ساتھ مخصوص ہے اور رہا نفلی صدقہ تو جس طرح آدمی کے لئے نفلی صدقہ میں قلیل شے دینا جائز ہوتا ہے تو اسی طرح اس کے لئے کم درجے کی شے نفلی صدقہ میں دینا جائز ہوگا اور درہم کھجور سے بہتر اور اچھا ہے۔

اور ندب والوں نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ افعل کا لفظ (مراد صیغہ امر ہے) ندب و استحباب کی صلاحیت رکھتا ہے جس طرح وہ فرض کی صلاحیت رکھتا ہے اور ردی اور گھٹیا شے دینے سے نفلی صدقہ میں بھی اسی طرح منع کیا گیا ہے جس طرح فرض میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کے لئے عمدہ اور اچھی شے دی جائے۔ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے ردی کھجوروں کا ایک خوشہ لٹکایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا: بئسما علق ھذا ردی شے ہے جو اس نے لٹکائی ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (1)۔ عنقریب یہ مکمل روایت آئے گی۔ اس قول کی بنا پر امر ندب و استحباب پر دلالت کرتا ہے لہٰذا انہوں نے مستحب قرار دیا کہ وہ نفلی صدقہ میں اچھی اور عمدہ شے کے سوا کوئی شے نہ دیں۔

اور جمہور متاولین نے کہا ہے: من طیبت کا معنی ہے: عمدہ اور پسندیدہ شے میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔ اور ابن زید نے

1۔ ابن ماجہ، باب النہی أن یخرج فی الصدقة شر ماله، حدیث نمبر 1821، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا ہے: حلال چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ کسب (کمائی) وہ ہوتا ہے جو بدن کی مشقت اور محنت سے حاصل ہو۔ اور یہی اجرت ہے اس کا حکم آگے آئے گا یا تجارت میں باہم گفتگو ہوتی ہے اور وہ بیع ہے اس کا بیان آگے آئے گا اور میراث اس میں داخل ہے کیونکہ غیر وارث نے اسے کمایا ہے۔ (حاصل کیا ہے)۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے بیان کیا ہے کہ ابن مبارک سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو کچھ کمانے کا ارادہ رکھتا ہو اور اپنی کمائی سے ارادہ اور نیت یہ کرتا ہو کہ وہ اس سے صلہ رحمی کرے گا، جہاد کرے گا اور وہ نیکی اور خیر کا کام کرنے والا ہے اور اس غرض سے کسب کی آفات اور مشقتوں میں داخل ہو جاتا ہے تو انہوں نے کہا: اگر اس کے پاس زندگی گزارنے کے لئے اتنی مقدار میں سامان اور قوت موجود ہو جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو لوگوں سے روک سکتا ہو (یعنی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت اسے نہ پڑے) تو پھر اس کسب کو ترک کرنا افضل ہے، کیونکہ جب اس نے حلال طلب کیا اور حلال میں ہی خرچ کیا تو اس سے اس کی کمائی کے بارے اور اس کے خرچ کرنے کے بارے سوال کیا جائے گا اور اسے چھوڑ دینا زہد ہے کیونکہ زہد حلال چھوڑنے میں ہی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: اس آیت کے مطابق والد کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی اولاد کی کمائی سے کھا سکتا ہے اور اس لئے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تمہاری اولاد تمہاری عمدہ اور اچھی کمائی میں سے ہے۔ پس تم اپنی اولاد کے اموال میں سے خوشی خوشی کھاؤ"۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی نباتات، معادن اور رکاز (زمین میں قدرتی طور پر گڑی ہوئی دھاتیں) یہ تین ابواب ہیں۔ یہ آیت ان تینوں کو متضمن ہے۔

پس رہی نباتات، دارقطنی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے سنت جاری ہے "کہ پانچ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔" اور ایک وسق ساٹھ صاع کا ہے اور وہ گندم، جو، کھجور اور کشمش میں سے تین سو صاع ہیں۔ اور زمین جو سبزہ وغیرہ اگاتی ہے اس میں زکوٰۃ نہیں ہے اور ایک قوم نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لئے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ بے شک یہ آیت عام ہے اور زمین سے قلیل یا کثیر مقدار میں پیدا ہونے والی تمام اقسام کی چیزوں کو شامل ہے اور انہوں نے امر کے ظاہر کو دیکھا کہ وہ وجوب کے لئے ہے۔ اس کا مکمل بیان سورۃ انعام میں آئے گا۔

اور جہاں تک معدن کا تعلق ہے تو ائمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جانوروں کا زخم رائیگاں ہے، کنواں ہدر ہے، معدن بھی ہدر ہے اور رکاز میں خمس ہے (2)"۔ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ معدن کا

1۔ سنن ابو داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یاکل من مال ولدہ، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب فی الرکاز الخمس، حدیث نمبر 1403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حکم رکاز کے حکم کے سوا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معادن اور رکاز کے مابین واؤ فصل کے ساتھ فرق بیان کیا ہے۔ اگر دونوں میں حکم ایک جیسا ہوتا تو آپ فرماتے: معدن جبار ہے اور اس میں خمس ہے۔ اور جب آپ نے یہ فرمایا: وفی الرکاز الخمس تو اس سے معلوم ہوا کہ رکاز کا حکم معدن کے حکم کے سوا ہے اس بارے میں جو اس سے پایا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

رکاز دراصل لغت میں اس سے مراد وہ سونا، چاندی اور جواہرات ہیں جو زمین میں گڑے ہوئے ہوں۔ تمام فقہاء کے نزدیک اسی طرح ہے، کیونکہ وہ سونے چاندی کے ان ٹکڑوں کے بارے میں کہتے ہیں جو معدن میں پائے جاتے ہیں اور زمین میں گڑے ہوئے ہیں وہ بغیر محنت اور مشقت کے نکال لیے جاتے، ان میں خمس ہے؛ کیونکہ وہ رکاز ہے اور امام مالک سے روایت ہے کہ معدن میں سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کا حکم اس شے کا حکم ہے جس میں عمل اور محنت کی مشقت کی جاتی ہے جو کچھ معدن سے نکالا جاتا ہے وہ رکاز میں داخل ہے۔ پہلا قول ہی آپ کے مذہب کا حاصل ہے اور اسی پر جمہور فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اور عبداللہ بن سعید بن ابی سعید مقبری نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکاز کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ سونا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں اس دن پیدا فرمایا جس دن آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا۔" یہ عبداللہ بن سعید متروک الحدیث ہیں۔ اسے ابن ابی حاتم نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے بھی یہ مروی ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے۔ علماء کی جماعت کے نزدیک دور جاہلیت میں لوگوں کے دفن کیے ہوئے اموال بھی رکاز ہیں وہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کرتے بشرطیکہ اس کا دفن اسلام سے پہلے اموال عادیہ (پرانے اموال) میں سے ہو۔ اور وہ جو زمانہ اسلام کے اموال میں سے ہو تو ان کے نزدیک اس کا حکم لقطہ کے حکم کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ رکاز جب پایا جائے تو اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے بیان کیا ہے: زمانہ جاہلیت کے دفینوں میں سے جو سرزمین عرب میں پایا جائے یا اس صحراء اور جنگلی زمین میں پایا جائے جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کی ملکیت میں آئی ہو تو وہ دفینہ اسی کے لیے ہوگا جس نے اسے پایا اور اس میں خمس ہوگا اور جو مسلمانوں کی زمین میں پایا جائے تو وہ لقطہ کی مثل ہوگا۔ مزید فرمایا: اور جو وہ جنگ کے علاقے میں پایا جائے تو وہ اس پوری جماعت (لشکر) کے لیے ہوگا جس نے اسے فتح کیا نہ کہ صرف پانے والے کے لیے اور جو کچھ صلح والے علاقے سے پایا جائے تو وہ اس شہر والوں کے لیے ہوگا نہ کہ عام لوگوں کے لیے اور اس میں پانے والے کے لیے کوئی شے نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ اہل دار میں سے ہو تو پھر وہ ان کے سوا اس کے لیے ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ وہ تمام صلح کرنے والوں کے لیے ہوگا۔

اسماعیل نے کہا ہے: بلاشبہ رکاز کا حکم مال غنیمت کے حکم کے ساتھ ہے کیونکہ وہ کافر کا مال ہے جسے مسلمان نے پایا ہے۔ پس اسے اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے جو کافر کو قتل کرے اور اس کا مال لے لے۔ پس اس کے لیے کل مال کے چار خمس ہوں گے۔

ابن القاسم نے کہا ہے: امام مالک معادن، دفائن، جواہرات، لوہا، تانبا اور اسی طرح کی دیگر چیزوں میں جو بطور رکاز پائی جاتی ہیں ان کے بارے کہتے تھے کہ ان میں خمس ہے۔ پھر آپ نے اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا: میں اس میں کوئی شے نہیں

رکھتا۔ پھر آخری بار جب ہم آپ سے جدا ہوئے تو آپ نے کہا: اس میں خمس ہے۔ اور عموم حدیث کی بنا پر یہی حکم ہے اور اسی پر جمہور فقہاء ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما نے ایسے رکاز کے بارے میں جو گھر میں پایا جاتا ہے کہا ہے: بلاشبہ یہ گھر کے مالک کے لئے ہے نہ کہ پانے والے کے لئے اور اس میں خمس بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے کہ وہ پانے والے کے لئے ہے نہ کہ صاحب خانہ کے لئے اور یہی ثوری کا قول ہے اور اگر وہ جنگل میں پایا جائے تو پھر تمام کے قول کے مطابق وہ پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں خمس ہوگا اور ان کے نزدیک صلح اور جنگ کی زمین کے مابین کوئی فرق نہیں ہے اور اسی طرح ان کے نزدیک عرب کی زمین اور دوسری زمین سب برابر ہے اور ان کے نزدیک پانے والے کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کا خمس اپنے لئے روک لے اگرچہ وہ خود محتاج ہو اور اس کے لئے وہ مساکین کو دینا بھی جائز ہے۔

اہل مدینہ اور اصحاب مالک میں سے کچھ ہیں جو ان سب میں سے کسی شے کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور انہوں نے کہا ہے: برابر ہے رکاز جنگ والی زمین یا صلح کی زمین میں پایا جائے یا سرزمین عرب میں ہو یا علاقہ حرب میں جب وہ کسی ایک کی ملکیت نہ ہو اور نہ کسی ایک نے اس کا دعویٰ کیا ہو تو وہ اپنے پانے والے کے لئے ہوگا اور اس میں ظاہر حدیث کے عموم کی بنا پر خمس ہوگا اور یہی لیث، عبداللہ بن نافع، شافعی اور اکثر اہل علم کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے جو معادن سے حاصل کی جاتی ہیں اور کانوں سے نکلتی ہیں ان میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: سونا یا چاندی میں سے جو کچھ کانوں سے نکلتا ہے اس میں کوئی شے واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ سونا بیس مثقال یا چاندی پانچ اوقیہ ہو جائے۔ پس جب یہ دونوں چیزیں اس مقدار کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور جو مقدار اس سے زائد ہو اس کے حساب سے اس کی زکوٰۃ بھی ہوگی جب تک وہ معدن میں پائی جائے اور اگر ایک بار وہ ختم ہو جائے اور پھر دوبارہ اس کے بعد پائی جائے تو پھر اس میں زکوٰۃ شروع کر دی جائے گی اور ان کے نزدیک رکاز کھیتی کی طرح ہے کہ جب کوئی شے نکلے گی تو اسی وقت اس سے زکوٰۃ لے لی جائے گی اور اس پر سال گزرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

سحنون نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس کی کئی کانیں ہوں کہ وہ ان میں سے ایک میں جو کچھ ہے اسے دوسری سے حاصل ہونے والی شے کے ساتھ نہیں ملائے گا اور نہ ہی زکوٰۃ ادا کرے گا مگر یہی کہ جب ان میں سے ہر ایک میں سے دوسو درہم یا بیس دینار حاصل ہوں۔ اور محمد بن مسلمہ نے کہا ہے: وہ بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے گا اور تمام کی زکوٰۃ ادا کرے گا جیسا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کیا جاتا ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے: معدن رکاز کی مثل ہے۔ پس سونے یا چاندی میں سے جو کچھ معدن میں پایا گیا خمس نکالنے کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس جس نے اپنے ہاتھ سے محنت کے ساتھ وہ شے حاصل کی جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو سال مکمل ہونے پر وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر اس پر سال گزر جائے اور

وہ نصاب اس کے پاس ہو۔ یہ تب ہے جب اس کے پاس اتنا سونا یا چاندی نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو۔ اور اگر اس کے پاس اس میں سے اتنا ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو وہ اسے اس کے ساتھ ملائے اور اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح ان کے نزدیک سال کے دوران جو نفع حاصل ہوگا اسے اپنی جنس کے نصاب کے ساتھ ملایا جائے گا اور اصل نصاب پر سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ یہی ثوری کا قول ہے۔

اور مزنی نے امام شافعی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ شے جس میں میں شک کرتا ہوں وہ وہی ہے جو معادن سے نکلتی ہے۔ مزنی نے کہا ہے: ان کی اصل کی بنیاد پر اولیٰ یہ ہے کہ جو کچھ معدن سے نکلتا ہے وہ فائدہ اور نفع ہو وہ اسے نکالنے کے بعد سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

اور لیث بن سعد نے کہا ہے: سونا اور چاندی میں سے جو کچھ بھی معادن سے نکلتا ہے وہ بمنزلہ نفع اور فائدہ کے ہے وہ نئے سرے سے اس پر سال پورا کرے گا۔ اور یہی امام شافعی کا اس بارے میں قول ہے جسے مزنی نے ان کے مذہب سے حاصل کیا ہے۔

اور اسی کے بارے میں داؤد اور ان کے اصحاب نے کہا ہے: جب اس پر اپنے مالک کے پاس پورا سال گزر جائے جس کی ملکیت صحیح ہو (تو اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی) کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے "جس نے مال حاصل کیا اس پر زکوٰۃ نہیں ہے یہاں تک کہ اس پر سال گزر جائے" اسے ترمذی اور دارقطنی نے بیان کیا ہے۔ (1)

اور انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے عبدالرحمن بن انعم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب میں سے ایک قوم کو کچھ وہ عطا فرمایا جو ابھی اپنی مٹی میں ملا ہوا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ یمن سے بھیجا تھا۔ (2)

حضرت امام شافعی نے کہا ہے: مؤلفۃ القلوب کا حق زکوٰۃ میں ہے تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ معادن کا طریقہ وہی ہے جو زکوٰۃ کا طریقہ ہے۔ (یعنی ان کے احکام ایک جیسے ہیں۔)

امام مالک کی دلیل حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمن کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ کو معادن قبلیہ (*) عطا فرمائیں اور یہ الفرع (**) کی طرف میں واقع ہیں اور ان معادن سے آج تک صرف زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ یہ حدیث منقطع الاسناد ہے۔ محدثین اس قسم کی حدیث سے استدلال نہیں کرتے لیکن آپ نے عمل کیا ہے اور ان کے نزدیک مدینہ منورہ میں اس کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور اسے دراوردی نے ربیعہ سے، انہوں نے حارث بن بلال المزنی

1۔ سنن ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 572، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3095، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

* قبلیہ (بفتحتین) یہ منسوب ہے قبل کی طرف جو ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے اور مدینہ طیبہ سے پانچ دن کے فاصلے پر ہے۔

** الفرع: [illegible] سے بائیں جانب [illegible] کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ اس کے اور مدینہ طیبہ کے درمیان مکہ کی راہ پر آٹھ برد کا فاصلہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار راتوں کی مسافت ہے۔

سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اسے بزار نے ذکر کیا ہے اور اسے کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت بلال بن حارث مزنی کو قبلیہ کی ساری کانیں عطا فرمائیں جو وہاں کی بلند زمین میں تھیں اور پست زمین میں تھیں۔ اور قدس (مشہور پہاڑ) سے وہ زمین عطا فرمائی جو کاشت کی صلاحیت رکھتی تھی اور آپ نے انہیں کسی مسلمان کا حق نہیں دیا۔ اسے بزار نے بھی ذکر کیا ہے اور بہت سے لوگوں نے اس کے ضعف پر اجماع کیا ہے۔ یہ حکم ان چیزوں کا ہے جنہیں زمین نکالے اور عنقریب سورۃ النحل میں ان چیزوں کا حکم آئے گا جو سمندر سے نکلیں کیونکہ وہ بھی زمین کا قسم ہے اور سورۃ الانبیاء (1) میں حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا معنی بیان ہوگا: العجماء جرحها جبار ہر ایک کا بیان اپنے محل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ۔ تَيَمَّمُوا کا معنی تقصدوا ہے۔ یعنی تم قصد و ارادہ نہ کرو۔ عنقریب سورۃ النساء میں عرب اشعار سے اس پر شواہد ذکر ہوں گے کہ التیمم کا معنی القصد ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آیت اس پر دلیل ہے کہ کمائی ہوئی شے طیب اور عمدہ بھی ہوتی ہے اور گھٹیا اور ردی بھی۔ امام نسائی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اس آیت کے بارے روایت کیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ فرمایا: وہ جعرور اور لون حبیق (یہ دونوں کھجور کی انتہائی ردی اور گھٹیا اقسام میں سے ہیں) ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو صدقہ میں لینے سے منع فرمایا ہے اور دارقطنی نے حضرت ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کے بارے حکم ارشاد فرمایا: تو ایک آدمی اسی قسم کی کھجوروں کا خوشہ لے کر آیا (جن کے پکنے اور مکمل ہونے کی صلاحیت ابھی ظاہر نہ ہوئی تھی)۔ سفیان نے کہا: یعنی بالکل ناکارہ اور ردی کھجوریں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: "یہ کون لے کر آیا ہے؟" اور کوئی کوئی شے بھی نہیں لاتا ہے مگر وہ اس کی طرف منسوب ہوتی ہے جو اسے لے کر آتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ۔ راوی نے بیان کیا اور حضور نبی مکرم ﷺ نے جعرور اور لون الحبیق سے منع فرمایا کہ ان دونوں (قسموں) کو صدقہ میں لیا جائے۔ زہری نے کہا ہے: یہ دونوں قسمیں مدینہ کی کھجوروں میں سے ہیں (2) اور اسے ترمذی نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3) اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

علامہ طبری اور نحاس نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ولا تأمموا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور حضرت مسلم بن جندب نے ولا تُيَمِّمُوا تاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے تَّيَمَّمُوا تاء مشدد پڑھا ہے اور اس لفظ میں کئی لغات ہیں ان میں سے أَمَمْتُ الشیء یعنی میم مخفف اور أَمَّمْتُهُ یعنی میم مشدد اور يَمَّمْتُهُ اور تَيَمَّمْتُهُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، حدیث نمبر 2661، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابو داؤد، باب ما لا یجوز من الثمرۃ فی الصدقۃ، حدیث نمبر 1369، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، باب و من سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2913، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہیں۔ اور ابو عمرو نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وَلَا تُؤَمِّمُوا تا مضموم کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ علامہ جرجانی نے کتاب "نظم القرآن" میں کہا ہے کہ لوگوں میں سے ایک فریق نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد الْخَبِيْثَ پر کلام مکمل ہے۔ پھر خبیث کے وصف میں دوسری خبر کی ابتدا کی اور فرمایا: مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور تم ردی چیز نہ لو بجز اس کے کہ تم نرمی کا برتاؤ کرو۔ گویا یہ معنی لوگوں کے لئے عتاب اور ڈانٹ ہے۔ اور مِنْهُ کی ضمیر الْخَبِيْثَ کی طرف راجع ہے۔ اور الْخَبِيْثَ سے مراد انتہائی گھٹیا اور ردی ہے۔ علامہ جرجانی نے کہا ہے: دوسرے فریق نے کہا ہے کہ کلام قول باری تعالیٰ مِنْهُ تک متصل ہے اور مِنْهُ میں ضمیر مَا كَسَبْتُمْ کی طرف راجع ہے۔ اور تُنْفِقُوْنَ گویا حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: انا اخرج اجاھد فی سبیل اللہ۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ یعنی تم اپنے قرضوں اور اپنے حقوق میں سے لوگوں سے نہیں لیتے مگر یہ کہ تم اس بارے میں نرمی کا برتاؤ کرو اور اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دو، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اس پر راضی نہیں ہوتے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو۔ اس کا یہ معنی حضرت براء بن عازب، حضرت ابن عباس اور حضرت ضحاک رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے۔

اور حسن نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے: اور تم اسے (ردی کو) نہ لو اگرچہ تم اسے بازار میں پاؤ کہ اسے بیچا جا رہا ہے مگر یہ کہ وہ تمہارے لئے اس کے ثمن کم کر دے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ دونوں قول آیت کے زکوٰۃ فرضیہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتے ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے: اگر یہ آیت فرض زکوٰۃ کے بارے میں ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ کیونکہ ردی اور عیب ناک چیز فرض میں کسی بھی حال میں لینا جائز نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی کے طریقہ پر اور نہ اس کے سوا کسی طریقہ پر، البتہ چشم پوشی کے بغیر بھی نفل میں یہ لی جا سکتی ہے۔

اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کا معنی ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اگر تمہیں وہ ہدیہ دیا جائے (تو تم ردی شے نہ لو) اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ مگر یہ کہ تم ہدیہ دینے والے سے حیا کرو اور اس سے وہ شے قبول کر لو جس کی نہ تمہیں حاجت ہے اور نہ وہ شے فی نفسہ کوئی قدر و منزلت رکھتی ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت کے نفلی صدقہ کے بارے میں ہونے کا شبہ دلاتا ہے اور ابن زید نے کہا ہے: اور تم حرام چیز نہ لو مگر یہ کہ تم اس کے مکروہ ہونے کے بارے میں اغماض برتو۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ جمہور کی قراءت اسی طرح ہے۔ یہ اغمض الرجل فی امر کذا سے ہے۔ جب آدمی کسی کام میں تساہل اور نرمی برتے اور اپنے بعض حق کے ساتھ راضی ہو جائے اور بعض سے درگزر کرے اور اسی معنی میں طرماح کا قول ہے:

لم یفتنا بالوتر قوم وللذ　　ل اناس یرضون بالاغماض

کسی قوم نے وتر کے بارے میں ہمیں فتویٰ نہیں دیا اور سہولت کے لئے لوگ محض حق کے ساتھ راضی ہو جاتے ہیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تغمیض العین سے لیا گیا ہو کیونکہ جو کروہ اور ناپسندیدہ شے پر صبر کا ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا:

الی کم وکم اشیاء منک تریبنی   اغمض عنها لست عنها بذی عمی

کتنے تک اور تیری طرف سے کتنی اشیاء مجھے شک میں ڈالتی ہیں میں ان سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں میں ان سے اندھا نہیں ہوں۔

اور یہ مکروہ کے وقت اغضاء (آنکھ بند کرنا) کی طرح ہے۔ اور نقاش نے یہی معنی اس آیت میں ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مکی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یا یہ عربوں کے اس قول سے ہے: اغمض الرجل اذا اتی غامضا من الامر۔ (یعنی جب کوئی کسی کام میں نرمی برتے تو کہا جاتا ہے: اغمض الرجل۔ (آدمی نے نرمی کا سلوک کیا۔) جیسا کہ تو کہتا ہے: اعمن یعنی وہ عمان آیا۔ اور اعرق یعنی وہ عراق آیا اور انجد و اغور یعنی وہ نجد اور غور آیا اور غور سے مراد تہامہ ہے۔ یعنی وہ اسے لینے کے لئے کوئی تاویل تلاش کرتا ہے۔

زہری نے اسے تاء کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے اور ان ہی سے تُغَمِّضُوا بھی مروی ہے۔ یعنی تاء کے ضمہ، غین کے فتحہ اور میم کے کسرہ اور اس کی شد کے ساتھ۔ پس پہلی قراءت اس معنی کی بنا پر ہے تم اپنے ہاتھ سے اس کا سودا ختم کر دو کہ وہ تمہارا ایجاز کم کر دے۔

اور دوسری قراءت اور یہی حضرت قتادہ کی قراءت ہے جو کہ نحاس نے ذکر کی ہے۔ یہ معنی ہے کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے کہ زہری کی دونوں قراءتوں کا معنی ہے: "یہاں تک کہ تم نقصان اور کمی کے ساتھ لے لو۔" اور مکی نے حسن سے بیان کیا ہے: اِلَّآ اَنْ تُغَمَّضُوْا یعنی میم مشدد اور مفتوح ہے اور قتادہ نے تُغْمَضُوْا بھی قراءت کی ہے یعنی تاء کے ضمہ، غین کے سکون اور میم مخفف مفتوح کے ساتھ۔ ابو عمرو الدانی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تمہارے لئے اس کی قیمت کم کر دی جائے۔

اسے نحاس نے حضرت قتادہ سے بیان کیا ہے اور ابن جنی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم اس حال میں پائے جاؤ کہ تم نے تاویل کے سبب یا نرمی کے سبب معاملے میں چشم پوشی کر لی ہے اور تم نے ادنیٰ چیز اپنے لئے لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور یہ تیرے اس قول کی طرح ہے: احمدت الرجل وجدته محمودا۔ (میں نے آدمی کی تعریف کی اور میں نے اسے محمود پایا) اس طرح کی کئی مثالیں ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: جمہور کی قراءت تجاوز (درگزر کرنے) اور آنکھیں بند کرنے کے معنی دیتی ہے، کیونکہ اغمض، غمض کے قائم مقام ہے۔ اور اسی بنا پر معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اسے لینے میں غور و فکر اور تاویل سے آنکھیں بند کرتے ہوئے آؤ، یا تو اس کے حرام ہونے کی وجہ سے ابن زید کے قول کے مطابق اور یا پھر اس لئے کہ ایک ہدیہ ہے یا اسے قرض میں لیا گیا ہے۔

دوسروں کے قول کے مطابق۔

اور مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے تُغْمِضُوْا پڑھا ہے تو معنی یہ ہے تم اسے لینے سے اپنی بصیرت کی نگاہیں بند رکھتے ہو۔

جوہری نے کہا ہے: أَغْمَضَ فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ کا معنی ہے جب بیع یا خرید کے معاملہ میں تو اس پر نرمی کرے۔ اور وہ چشم پوشی کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ کہا جاتا ہے: أَغْمِضْ لِي فِيمَا بِعْتَنِي۔ (میرے لئے چشم پوشی اور نرمی کر اس میں جو تو نے مجھے بیچی) گویا تو اس سے زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے اس کے ردی ہونے کے سبب اور اس کے ثمن میں سے کم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اَنْ محل نصب میں ہے اور تقدیر کلام ہے: إلا بأن۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ اللہ تعالیٰ نے صفت غنی پر متنبہ فرمایا کہ تمہارے صدقات کی اسے کوئی حاجت نہیں۔ پس جو قرب حاصل کرنا چاہے اور ثواب کا طالب ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صدقہ ادا کرے ایسی شے کے ساتھ جو قدر و منزلت والی ہو اور عمدہ باشان ہو کیونکہ وہ اسے اپنے لئے آگے بھیجتا ہے۔

اور حَمِيْدٌ کا معنی ہے: محمود فی کل حال ہر حال میں تعریف کیا ہوا۔ ہم نے ان دونوں اسموں کے معنی الکتاب الاسنی میں ذکر کر دیئے ہیں۔ والحمد للہ۔

اور زجاج نے قول باری تعالیٰ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ کے تحت کہا ہے: اس نے تمہیں حکم نہیں دیا ہے کہ تم حاجت اور تنگی کے سبب وہ صدقہ کرو البتہ اس نے تمہارے اخیار اور نیک لوگوں کا امتحان لیا ہے اور وہ ان تمام نعمتوں پر تعریف کیا گیا ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

"شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (وکرم) کا اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلشَّيْطٰنُ شیطان اور اس کے مادہ اشتقاق کا معنی پہلے گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور يَعِدُكُمْ کا معنی ہے: وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ الْفَقْرَ تنگدستی سے تاکہ تم خرچ نہ کرو۔

یہ آیت ماقبل سے متصل ہے اور یہ کہ شیطان اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کو روک رکھنے میں خاص دخل رکھتا ہے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ فحشاء (بے حیائی) کا حکم دیتا ہے اور فحشاء سے مراد معاصی اور ان میں خرچ کرنا ہے اور کہا گیا ہے: یعنی اس طرح کہ تم صدقہ نہ کرو تم گنہگار ہو جاؤ گے اور آپس میں جدا جدا ہو جاؤ گے اور الفقر فاء کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یہ ایک لغت ہے۔

جوہری نے کہا ہے: الفقر میں ایک لغت الفُقْر ہے، مثلاً الضُّعْف اور الضَّعف۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ کلام عرب میں الوعد کا لفظ جب مطلق ہو تو وہ خیر اور بھلائی کے لئے ہوتا ہے اور جب اسے موعود (وہ شے جس کا وعدہ کیا گیا) کے ساتھ مقید کر دیا جائے تو پھر وہ خیر اور شر دونوں کے لئے مقدر ہو سکتا ہے جیسے کہ بشارت۔ تو اس آیت میں لفظ الوعد کو دونوں معنوں کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں دو وعدے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں اور دو شیطان کی طرف سے۔

اور امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک شیطان کی جانب سے ایک وسوسہ ہے کہ وہ شر کے ساتھ خوفزدہ کرتا ہے اور حق کی تکذیب کی طرف راغب کرتا ہے اور فرشتے کا القاء یہ ہے کہ وہ خیر کا وعدہ دلاتا ہے اور حق کی تصدیق کی رغبت دلاتا ہے۔ پس جو کوئی اسے پائے تو اسے جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسرا وسوسہ پائے تو اسے چاہیے کہ وہ شیطان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1) اور غیر قرآن میں باء کو حذف کرنا بھی جائز ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ جیسے کہ شاعر نے کہا ہے:

أمرتك الخير فافعل ما أمرت به فقد تركتك ذا مال و ذا نشب

میں نے تجھے خیر کا حکم دیا ہے پس تو وہی کر جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے۔ تحقیق میں نے تجھے صاحب مال اور صاحب نسب چھوڑا ہے۔

اور المغفرۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر دنیا اور آخرت میں پردہ ڈالنا ہے اور فضل سے مراد دنیا میں رزق ہے اور آخرت میں وسعت اور نعمتیں ہیں۔ تمام کے بارے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نقاش نے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ اس بارے میں اس آیت سے مانوس ہوئے ہیں کہ فقر (تنگدستی) غنیٰ (دولتمندی، خوشحالی) سے افضل ہے، کیونکہ شیطان بندے کو غنیٰ اور خیر سے دور رکھتا ہے اور وہ اسے فقر کا خوف دلا کر اس سے دور کرتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت میں کوئی حجت قاطعہ نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ معارضہ قوی ہے اور روایت ہے کہ تورات میں ہے: "میرے بندے میرے رزق سے خرچ کر میں تجھ پر اپنا فضل وسیع کر دوں گا کیونکہ میرا ہاتھ کشادہ ہے اور وہ زیادہ کشادہ ہے۔" اور قرآن کریم میں اس کا مصداق یہ ارشاد گرامی ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سبا) (اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو تو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔)

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا ہے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوشحالی اور وسعت عطا فرماتا ہے اور وہ اسے جانتا ہے جہاں اسے رکھتا ہے اور وہ غیب و شہادۃ کا علم رکھتا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے دو نام ہیں ہم نے ان دونوں کا ذکر بھی تمام اسماء میں الکتاب الاسنیٰ میں کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر 2914، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والحمد للہ۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

"عطا فرماتا ہے دانائی جسے چاہتا ہے اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔"

قولہ تعالیٰ: يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے حکمت عطا فرما دیتا ہے۔ یہاں حکمت کے مفہوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد نبوت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی معرفت ہے یعنی اس کی فقاہت، ناسخ، منسوخ، محکم، متشابہ، غریب اور مقدم و مؤخر آیات کا علم۔ حضرت قتادہ اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم کی سمجھ اور فقاہت ہے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس سے مراد قول و فعل میں صائب اور درست ہونا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: حکمت سے مراد دین میں عقل و فہم کا رکھنا ہے۔ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت و پیروی، دین میں فقاہت اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: حکمت سے مراد خشیت ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی کا قول ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم میں فہم اور سمجھ رکھنا ہے اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے اور حسن نے کہا ہے: حکمت سے مراد ورع ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام اقوال ماسوائے سدی، ربیع اور حسن کے اقوال کے آپس میں ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں کیونکہ حکمت مصدر ہے الاحکام سے اور اس کا معنی ہے: قول و فعل میں پختہ اور مضبوط ہونا۔ پس کتاب اللہ حکمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی حکمت ہے اور فضیلت میں سے جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ سب حکمت ہے۔ اور اصل حکمت وہ شے ہے جس کے سبب انسان سفاہت اور بے وقوفی سے باز رہے، پس علم کو حکمت کہا گیا ہے کیونکہ اس کے سبب اس سے روکا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ سفاہت سے باز رہنے کو جانا جا سکتا ہے اور سفاہت سے مراد ہر وہ فعل ہے جو قبیح ہو۔ اور اسی طرح قرآن کریم، عقل اور فہم و فراست (یہ سب حکمت ہیں کیونکہ ان کے سبب سفاہت کے ارتکاب سے باز رہا جاتا ہے۔)

اور بخاری شریف میں ہے: من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر اور بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتا ہے۔) اور یہاں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (اور جسے دانائی عطا کی گئی یقیناً اسے بہت بھلائی دے دی گئی۔) (1) اور دوبارہ حکمۃ کا لفظ ذکر فرمایا اس کے لیے ضمیر ذکر نہیں فرمائی، اس کا اہتمام کرتے ہوئے اور اس کے شرف و فضل پر تنبیہ کرتے ہوئے جیسا کہ اس کا بیان اس قول باری تعالیٰ کے تحت گزر چکا ہے: فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا (البقرہ: 59)

1۔ صحیح بخاری، باب من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔ مروان بن محمد، رفدہ غسانی سے بیان کیا ہے کہ انہیں ثابت بن عجلان انصاری نے خبر دی ہے اس نے کہا: بیان کیا جاتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ فرماتا ہے اور جب وہ معلم کو بچوں کو حکمت کی تعلیم دیتے ہوئے سنتا ہے تو وہ اسے ان سے پھیر دیتا ہے۔ مروان نے کہا ہے: حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝ کہا جاتا ہے: بے شک جسے حکمت اور قرآن عطا کر دیے گئے تحقیق اسے اس سے افضل و اعلیٰ عطا کر دیا گیا جسے پہلی کتابوں اور صحف وغیرہ کا جمع علم عطا کیا گیا، کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝ (الاسراء)

اور اسے خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ جوامع الکلم ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے: جسے علم اور قرآن عطا کیا گیا ہے چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے اور اہل دنیا کے سامنے ان کی دنیا کی وجہ سے نہ جھکے، کیونکہ جو اسے عطا کیا گیا ہے وہ اس سے بہت افضل ہے جو اصحاب دنیا کو دیا گیا ہے (من اوتی العلم والقرآن ینبغی ان یعرف نفسہ ولا یتواضع لاھل الدنیا لاجل دنیاھم فانہ اعطی افضل اصحاب الدنیا) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع قلیل کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے: قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (النساء:77)

اور علم اور قرآن کو خَيْرًا كَثِيْرًا کا نام دیا ہے(2)۔

جمہور نے وَ مَنْ يُّؤْتَ فعل مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور زہری اور یعقوب نے وَ مَنْ يُّؤْتِ تا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ (یعنی فعل معروف) اس معنی کی بنا پر و من یؤت اللہ الحکمۃ اور حکمت اللہ تعالیٰ دانائی عطا فرماتا ہے۔ اس میں فاعل اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ہے۔ اور مَن مفعول اول مقدم ہے اور الحکمۃ مفعول ثانی ہے اور الالباب کا معنی عقول ہے اور اس کا واحد لب ہے اس کا ذکر بھی پہلے گزر چکا ہے۔

وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۝

”اور جو تم خرچ کرتے ہو یا منت مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور نہیں ہے ظالموں کیلئے کوئی مددگار۔“

یہ شرط اور جواب شرط ہے۔ عربوں کے رواج میں منتیں کثرت سے مانی جاتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو آدمی بطور نفل اور تبرع خرچ کرتا ہے اور ایک وہ جو آدمی اپنے لئے اسے لازم کرنے کے بعد خرچ کرتا ہے۔ اس آیت میں وعدہ اور وعید کا معنی موجود ہے، یعنی وہ آدمی جس کی نیت میں اخلاص ہو اسے ثواب دیا جائے گا اور جس نے ریاکاری یا کسی اور معنی مثلاً احسان جتلانے اور دکھ پہنچانے کے لئے خرچ کیا تو وہ ظالم ہوگا۔ اس کا عمل باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے لئے اس میں کوئی معاون و مددگار نہیں پائے گا۔ اور يَعْلَمُهٗ کا معنی ہے وہ اسے شمار کرتا ہے اور محفوظ رکھتا ہے، یہ مجاہد نے کہا ہے (ای یحصیہ) اور ضمیر واحد ذکر کی حالانکہ پہلے دو چیزوں کا ذکر کیا تو نحاس نے کہا ہے: تقدیر عبارت ہے وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

1۔ تفسیر ابن عطیہ، جلد 1، صفحہ 232

تُنفِقُوا فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهَا (یعنی جو تم خرچ کرتے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ سے جانتا ہے) اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ پر فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ پھر سے حذف کر دیا گیا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: وما انفقتم فان الله يعلمه۔ اور اس میں ھ ضمیر 'ما' کی طرف لوٹ رہی ہو۔ جیسا کہ سیبویہ نے (امرؤ القیس کے لئے) کہا ہے:

فتوضح فالمقراۃ لم یعف رسمها لما نسجتها من جنوب و شمال

اس میں فسجتھا میں ہا ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ یہ اس پر معطوف ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: يَعْلَمُهٗ میں واحد ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ دو چیزوں کا ذکر کیا ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ ارادہ اس کا کیا ہے جسے ذکر کیا گیا ہے یا جسے بیان کیا گیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حسین اور اچھا ہے کیونکہ کبھی ضمیر سے مراد وہ تمام ہوتے ہیں جو مذکور ہوتے ہیں اگرچہ وہ کثیر ہوں۔ نذر کی حقیقی تعریف یہ ہے: هو ما اوجبه المكلف على نفسه من العبادات مما لو لم يوجبه لم يلزمه (ان عبادات میں سے وہ عبادت جو مکلف نے اپنے اوپر لازم کی ہو کہ اگر وہ اسے لازم نہ کرتا تو وہ اس پر لازم نہ ہوتی۔) البتہ جب کوئی شخص آدمی اپنے ذمہ لازم کر لے تو تو کہتا ہے: نذر الرجل، ینذر ذال کے ضمہ کے ساتھ بھی ہے اور ذال کے کسرہ کے ساتھ بھی۔ اس کے کئی احکام ہیں جن کا بیان کسی اور جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

"اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا تم سے تمہارے بعض گناہ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے۔"

جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کیونکہ اس میں اظہار کی نسبت اخفاء افضل ہے اور اسی طرح تمام نفلی عبادات میں اخفاء افضل ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ریا ان سے دور رہتا ہے اور واجبات میں اس طرح نہیں ہے۔ حسن نے کہا ہے: زکوٰۃ میں اظہار احسن ہے اور نفل میں اخفاء افضل ہے کیونکہ یہ اس پر زیادہ دلالت کرتا ہے کہ اس سے ارادہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ نے نفل میں سری صدقہ کو اعلانیہ صدقہ پر فضیلت دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ستر گنا ہے اور فرضی صدقہ میں اعلانیہ کو سری پر فضیلت دی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس گنا ہے۔ فرمایا: تمام اشیاء میں جمیع فرائض اور نوافل اسی طرح ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس طرح کا قول رائے سے نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ تو امر توقیفی ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فرض نماز کے سوا آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے۔" اور یہ اس لئے ہے کہ فرائض میں ریا داخل نہیں ہوتا اور نوافل اس کے نشانے پر ہیں۔

اور امام نسائی نے حضرت عقبہ بن عامر جہنی سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک وہ آدمی جو قرآن بالجہر پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ بالجہر دیتا ہے اور جو قرآن سرا پڑھتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو صدقہ سرا دیتا ہے۔" اور حدیث میں ہے: "سرا صدقہ دینا رب العالمین کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے (1)۔"

ابن عربی نے کہا ہے: اعلانیہ صدقہ کی سری صدقہ پر فضیلت کے بارے میں اور نہ ہی سری صدقہ کی اعلانیہ صدقہ پر فضیلت کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے۔ البتہ اس کے بارے میں اجماع ثابت ہے۔ پس رہا نفلی صدقہ تو اس کے بارے صراحۃً قرآن کریم میں موجود ہے کہ یہ سرا دینا جہرا دینے سے افضل ہے۔ اس کے بارے ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک اس کا اطلاق غالب کیفیت پر ہے اور اس بارے میں تحقیق یہ ہے کہ صدقہ میں حالات مختلف ہوتے ہیں صدقہ دینے والے کی حالت کے ساتھ، جس کو صدقہ دیا جائے اس کی حالت کے سبب اور ان لوگوں کی حالت کے ساتھ جو صدقہ کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ رہا صدقہ دینے والا تو اس کے لئے اس میں سنت کے اظہار اور پیشوائی کا ثواب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے لئے ہے جس کی حالت قوی ہو اور اس کی نیت نیک اور اچھی ہو اور وہ اپنے بارے میں ریا سے محفوظ اور مامون ہو۔ اور رہا وہ آدمی جو اس مرتبہ سے ضعیف اور کمزور ہو تو اس کے لئے سرا صدقہ دینا افضل ہے۔

اور جہاں تک اس کا تعلق ہے جسے صدقہ دیا گیا ہے تو اسے سری صدقہ لوگوں کے اسے حقیر سمجھنے سے محفوظ کرنے والا ہے اور اس شے کی نسبت سے کہ اس نے غنی اور غیر محتاج ہونے کے باوجود صدقہ لیا ہے اور پاکدامنی وترک کر دیا ہے۔ اور رہا لوگوں کا حال تو ان کے اعتبار سے بھی سری صدقہ اعلانیہ سے افضل ہے اس جہت سے کہ وہ کبھی دینے والے کو ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں اور صدقہ لینے والے کو اس کا مستحق قرار نہیں دیتے اگرچہ ان کے لئے جہری صدقہ میں دلوں کو صدقہ کی طرف مائل اور راغب کرنے کا سامان بھی ہے لیکن آج کے دور میں یہ بہت قلیل ہے۔

یزید بن حبیب نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ پر صدقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ پس وہ سرا زکوۃ کی تقسیم کا حکم دے رہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے بالخصوص سلف صالحین کے نزدیک اور علامہ طبری نے کہا ہے: لوگوں نے اس پر اجماع کیا ہے کہ واجب صدقہ میں اظہار افضل ہے۔

میں کہتا ہوں: الکیا الطبری نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ مطلقاً صدقات میں اخفا اولیٰ ہے اور یہ فقیر کا حق ہے اور صاحب مال کے لئے جائز ہے کہ وہ صدقات بذات خود تقسیم کرے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کا ایک قول ہے اور ان کے دوسرے قول کے مطابق انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہاں صدقات سے مراد نفلی صدقات ہیں نہ کہ وہ فرض جسے ظاہر کرنا اولیٰ ہے تاکہ اسے کوئی تہمت لاحق نہ ہو۔ وہی لئے کہا گیا ہے کہ نفلی نماز انفرادی طور پر پڑھنا افضل ہے (یعنی بغیر جماعت کے) اور فرض نماز میں جماعت تہمت سے دور رکھنے والی ہے۔

اور مہدوی نے کہا ہے: آیت سے مراد فرض زکوۃ بھی ہے اور نفلی صدقات بھی۔ پس حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ

1۔ طبرانی کبیر، حدیث 8014

متقدین میں اخفا افضل تھا پھر اس کے بعد لوگوں کے خیالات اور گمان غلط ہو گئے تو علماء نے فرض میں اظہار کو مستحسن قرار دیا تاکہ کسی کے بارے عدم ادائیگی کا گمان نہ کیا جائے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول آثار و روایات کے خلاف ہے اور یہ ہمارے زمانے میں فرض صدقہ میں اخفا کے مستحسن ہونے کو مشتبہ کرتا ہے اور اس کے مانع کثیر ہیں اور سے اعلانیہ نکالنا ریا کے لئے پیش کرتا ہوگا۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے کہ یہ بھی جائز ہے کہ آیت سے فرض زکوٰۃ اور نفل صدقہ مراد لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اخفا کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے اور اظہار کا ذکر کیا ہے اور اس کی بھی مدح کی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دونوں کی طرف اکٹھا متوجہ ہوا جائے۔

اور نقاش نے کہا ہے: بے شک اس آیت کو اس قول باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا ہے: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً الآیہ (البقرہ: 274) (جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ (تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس)

قولہ تعالیٰ: فَنِعِمَّا هِیَ۔ یہ اظہار صدقہ پر تعریف ہے۔ پھر اس پر یہ حکم لگایا کہ اظہار سے اخفا بہتر ہے اسی لئے بعض علماء نے کہا ہے جب تو نیکی کرے تو اسے مخفی رکھو اور جب تیرے ساتھ نیکی کی جائے تو تو اسے پھیلا" (اذا اصطنعت المعروف فاسترہ واذا اصطنع الیک فانشرہ)

دعبل الخزاعی نے کہا ہے:

اذا انتقموا اعلنوا امرھم وان انعموا انعموا بالکتمام

جب وہ انتقام لیتے ہیں تو اپنے معاملے کا اعلان کرتے ہیں۔ اور اگر وہ نیکی اور احسان کریں تو وہ نیکی خاموشی اور پوشیدہ طور پر کرتے ہیں۔

اور سہل بن ہارون نے کہا ہے:

خل اذا جئتہ یوما لتسالہ اعطاك ما ملكت كفاه و اعتذرا

تو چھوڑ اسے جب تو کسی دن مانگنے اور سوال کرنے کے لئے اس کے پاس آئے اس نے تجھے وہ عطا کر دیا ہے جس کا تو مالک ہے تو اسے کافی سمجھ اور اس کا عذر قبول کر لے۔

یخفی صنائعہ واللہ یظھرھا ان الجمیل اذا اخفیتہ ظھرا

وہ اپنے کارناموں کو چھپاتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ نیکی کو جب تو مخفی رکھے تو وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: کوئی نیکی تین خصلتوں کے سوا مکمل نہیں ہوتی: اسے جلدی کرنا، اسے صغیر سمجھنا اور اسے مخفی رکھنا، جب تو نے اسے جلدی کر لیا تو تو نے اسے حاصل کر لیا اور جب تو نے اسے چھوٹا سمجھا تو تو نے اسے عظیم بنا دیا اور جب تو نے اسے مخفی رکھا تو تو نے اسے مکمل کر دیا اور بعض شعراء نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

زاد معروفك عندی عظما انہ عندك مستور حقیر

تیری نیکی میرے نزدیک بہت عظیم اور بڑی ہے بلاشبہ وہ تیرے نزدیک بھی زائد اور قبیح ہے۔

تقنابه كأن لم تأته — وهو عند الناس مشهور خطير

تو اسے بھلا دیتا ہے گویا تو نے اسے دیا ہی نہیں حالانکہ وہ لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مشہور ہوتی ہے۔

قراء نے قول باری تعالیٰ فَنِعِمَّا هِيَ میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابو عمرو اور نافع نے ورش کی روایت میں، عاصم نے روایت حفص میں اور ابن کثیر نے فَنِعِمَّا هِيَ کو نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے بھی اور نافع نے ورش کی روایت کے سوا میں اور عاصم نے ابو بکر اور مفضل کی روایت میں فَنِعْمَّا نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور تمام نے میم کو ساکن کیا ہے۔

اور قرآن کے علاوہ دوسرے کلام میں فَنِعْمَ مَا هِيَ پڑھنا بھی جائز ہے۔

نحاس نے کہا ہے لیکن چونکہ یہ سواد میں متصل ہے اس لئے ادغام لازم ہے۔

علمائے نحو نے نعم میں چار لغات بیان کی ہیں: نَعِمَ الرجلُ زیدٌ، یہ اصل ہے اور نِعِمَ الرجل یعنی عین کے کسرہ کی اتباع میں نون کے کسرہ کے ساتھ اور نَعْمَ الرجل یعنی نون کے فتحہ اور عین کے سکون کے ساتھ۔ پس اصل میں نَعِمَ تھا کسرہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور نِعْمَ الرجل اور یہ افصح اللغات ہے۔ اس میں بھی اصل نَعِمَ ہے۔ اور یہ مدح اور تعریف کے لئے میں واقع ہوتا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور عین کا کسرہ نون کو دے دیا گیا اور عین کو ساکن کر دیا گیا۔

اور جنہوں نے فَنِعِمَّا هِيَ پڑھا ہے تو اس کی دو تقدیریں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ان کی لغت کے مطابق ہو جو نِعِمَ کہتے ہیں اور دوسری تقدیر یہ ہے کہ یہ جید اور عمدہ لغت پر ہو۔ پس اصل نِعْمَ ہوگا۔ پھر التقائے ساکنین کی وجہ سے عین کو کسرہ دے دیا گیا۔ نحاس نے کہا ہے کہ ابو عمرو اور نافع سے عین کے ساکن ہونے کے بارے جو قول بیان کیا گیا ہے وہ محال ہے۔ محمد بن یزید سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر عین ساکن ہو اور میم مشدد ہو تو کوئی بھی اسے بولنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ وہ دو ساکنوں کو جمع کرنے کا تصور کرے گا اور حرکت دے گا اور اس کا کوئی بھی ادراک نہیں کرتا۔

اور ابو علی نے کہا ہے: جس نے عین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس نے دو ساکنوں کو جمع کر دیا ہے اور ان میں سے پہلا حرف مد ولین نہیں ہے اور وہ نحویوں کے نزدیک تب جائز ہوتا ہے جب کہ پہلا حرف مد ہو، کیونکہ مد حرکت کے عوض ہوتی ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے کہ دابّۃ اور ضوالّ وغیرہ۔ شاید ابو عمرو نے حرکت کو مخفی رکھا ہے اور اسے بغیر حرکت کے پڑھا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے بَارِئِكُمْ اور يَأْمُرُكُمْ میں اختلاس کیا ہے اور سامع نے مخفی اور خفا میں لطف کے سبب اخفا کو اسکان گمان کر لیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے اور جنہوں نے نَعِمَ نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کو اپنے اصل پر لاتے ہیں۔ اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

ما أقلت قدماي إنهم — نَعِمَ الساعون في الأمر المبر

میرے قدم کمزور نہیں ہیں بلاشبہ وہ نیکی کے معاملہ میں کوشش اور سعی کرنے والے بہت اچھے ہیں۔

کے پاس آیا اور اس نے کہا: مجھے کچھ عطا فرمائیے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس لك من صدقة المسلمین شئ (تیرے لئے مسلمانوں کے صدقہ میں سے کوئی شے نہیں ہے۔) پس وہ یہودی ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا تو یہ آیت نازل ہو گئی: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اسے مال عطا فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے آیت صدقات کے ساتھ منسوخ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، انہوں نے فرمایا: انصار میں سے کچھ لوگوں کی بنی قریظہ اور بنی نضیر کے ساتھ رشتہ داریاں تھیں اور وہ انہیں اس تصور اور رغبت کے تحت صدقات نہیں دیتے تھے کہ جب وہ محتاج ہوں گے تو اسلام قبول کر لیں گے۔ پس یہ آیت ان کے سبب سے نازل ہوئی۔

اور بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے دادا ابو قحافہ کو کچھ دے پھر وہ اس سے رک گئیں اس لئے کہ وہ کافر تھا۔ تب اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور علامہ طبری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ روکنے سے مقصود یہ تھا تاکہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور دین میں داخل ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ (ان کو سیدھی راہ پر چلانا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔)

اور یہ قول بھی ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ماقبل سے متصل نہیں ہے۔ پس یہ صدقات کے بارے میں اور انہیں کفار پر خرچ کرنے کے بارے میں ظاہر ہے بلکہ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی ابتدائے کلام ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ صدقہ جو ان کے لئے مباح کیا گیا ہے جیسا کہ مذکورہ آثار سے متضمن ہے نفلی صدقہ ہے اور جہاں تک فرض زکوٰۃ کا تعلق ہے تو وہ کسی کافر کو دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے: "مجھے حکم فرمایا گیا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کروں اور اسے تمہارے فقراء کی طرف لوٹا دوں (1)۔" ابن منذر نے کہا ہے: اہل علم میں سے وہ تمام جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں ان تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ ذمی کو مالوں کی زکوٰۃ میں سے کوئی شے نہ دی جائے گی، پھر انہوں نے ان میں سے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اسے بیان کیا ہے اور کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے: مسلمانوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ اس آیت کے تحت اپنے مشرک قرابتداروں کو فرض زکوٰۃ میں سے دیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ بالا جماع مردود ہے۔ واللہ اعلم۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انہیں صدقہ فطر دیا جا سکتا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ صدقہ پاک کرنے والا اور واجب ہے لہٰذا کسی کافر کو نہیں دیا جائے گا جیسا کہ چوپائے اور نقد مال کا صدقہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اغنوهم عن سؤال هذا الیوم تم انہیں اس دن یعنی عید الفطر کے دن سوال کرنے سے غنی کر دو۔ (یعنی تم انہیں اتنا دے دو کہ وہ اس دن سوال کرنے کے محتاج نہ رہیں۔)

1۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی الصدقہ، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ ان کے عید اور نماز عید میں مشغول ہونے کے سبب ہے اور یہ مشرکین میں ثابت نہیں ہوتا۔ اور صدقہ فطر غیر مسلم کو دینا ان کے قول کے مطابق جائز ہے جنہوں نے اسے سنت قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک دو قولوں میں سے ایک یہی ہے۔ اور یہی امام ابوحنیفہ کا قول ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے اور آیت لوگوں کو کھانا کھلانے اور صدقات کے اطلاق میں عام قرار دیتے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ حکم ان مسلمانوں کے لئے متصور ہے جو اہل ذمہ کے ساتھ اور اہل حرب میں سے جنہیں غلام بنایا گیا ہے ان کے ساتھ ہیں۔

میں کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے: وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ (الدھر: 8) (اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو)

اور اسیر (قیدی) دار الاسلام میں نہیں ہوتا ہے اور وہ مشرک ہی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنۃ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو۔)

پس ان آیات کا ظاہر انہیں جملہ صدقات دینے کے جواز کا تقاضا کرتا ہے مگر حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے فرض زکوٰۃ کو خاص کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: "ان کے اغنیاء اور خوشحال لوگوں سے صدقہ لو اور ان کے فقراء پر لوٹا دو (1)۔" اور اس پر علماء نے اتفاق کیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس جب وہ محتاج ہوں تو انہیں نفلی صدقات میں سے دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

ابن عربی نے کہا ہے: رہا گنہگار مسلمان تو اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسے صدقہ فطر دیا جائے گا مگر جب وہ ارکان اسلام نماز روزہ وغیرہ کو چھوڑ دے تو پھر اسے صدقہ نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے۔ اور تمام گنہگار جو گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں انہیں مسلمانوں میں سے شامل ہونے کی وجہ سے صدقہ دیا جائے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے (2) کہ ایک آدمی نے کسی غنی، چور اور زانی کو صدقہ دیا اور اس کا صدقہ قبول کر لیا گیا۔ اس کا بیان آیۃ الصدقات میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ اس میں قدریہ اور معتزلہ کے گروہوں کا رد ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔ یہ شرط اور اس کا جواب ہے۔ اور اس آیت میں خیر سے مراد مال ہے کیونکہ یہ انفاق کے ذکر سے مقترن ہے اور یہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد مال ہے اور جہاں ایسے قرینہ سے مقترن نہ ہو وہاں اس سے مراد مال ہونے پر دلالت کرتا ہو تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ یہ مال کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب اذا تصدق علی غنی وهو لا یعلم، حدیث نمبر 1332، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہے اور تقدیر عبارت ہے: الانفاق او الصدقة للفقراء۔ سدی، مجاہد وغیرہما نے کہا ہے: ان فقراء سے مراد فقراء مہاجرین ہیں جو قریش اور دوسرے قبائل سے تعلق رکھتے تھے، پھر یہ آیت ہر اس شخص کے لئے ہے جو مستقبل میں فقراء کی صفت کے تحت داخل ہوگا اور مہاجرین فقراء کو ذکر کے ساتھ خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ وہاں ان کے سوا کوئی (فقیر) نہ تھا۔ اور یہ فقراء اہل صفہ تھے اور تقریباً چار سو افراد تھے، وہ فقر و افلاس کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے۔ نہ ان کے اہل و عیال تھے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی مال تھا۔ پس ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ایک صفہ (سایہ دار چبوترہ) تعمیر کیا گیا۔ پس ان کو اہل صفہ کہا گیا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں اہل صفہ میں سے تھا جب شام ہوتی تھی تو ہم رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر حاضر ہوتے تھے تو آپ ﷺ ہر آدمی کو حکم ارشاد فرماتے تھے اور وہ ایک آدمی کو ساتھ لے جاتا تھا۔ اور اہل صفہ میں سے جو باقی رہ جاتے وہ دس یا اس سے کم افراد ہوتے تو حضور نبی کریم ﷺ اپنا شام کا کھانا لے آتے اور ہم آپ ﷺ کے ساتھ کھانا تناول کر لیتے اور جب ہم فارغ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: ناموا فی المسجد "مسجد میں جا کر سو جاؤ"۔

اور ترمذی نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: (یہ آیت) وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، ہم کھجوروں کے مالک تھے۔ فرمایا: ہر آدمی اپنے درخت سے اپنی حیثیت کے مطابق زیادہ یا کم کھجوریں لاتا تھا اور کوئی آدمی ایک خوشہ اور دو خوشے لے کر آتا تھا اور انہیں مسجد میں لٹکا دیتا تھا اور اہل صفہ کے لئے کوئی کھانے کی شے نہ ہوتی تھی تو ان میں سے جب کسی کو بھوک ستاتی تھی تو وہ اس خوشے کے پاس آ جاتا اپنا عصا مارتا تو اس سے خشک اور پکی کھجوریں گر پڑتیں اور وہ کھا لیتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اچھی اور عمدہ شے میں رغبت نہ رکھتے تھے اور وہ ایسا خوشہ لے آتے جس میں ردی اور گھٹیا قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ اور کوئی ایسا خوشہ لے کر آتا جو ٹوٹا ہوا ہوتا اور وہ اسے مسجد میں لٹکا دیتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ فرمایا: اگر تم میں سے کسی کو ایسا ہدیہ دیا جائے جیسا اس نے دیا ہے تو وہ اسے نہ لے گا مگر چشم پوشی کرتے ہوئے اور حیا کرتے ہوئے۔ فرمایا: پس اس کے بعد ہم میں سے ہر آدمی وہی لاتا تھا جو اس کے پاس عمدہ اور اچھی شے ہوتی تھی۔ فرمایا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔

ہمارے علماء نے بیان کیا ہے کہ وہ مسجد میں ضرورت کے تحت رہتے تھے اور ضرورت کے تحت ہی صدقہ وغیرہ کھاتے تھے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر خوشحالی کے دروازے کھول دیئے وہ اس حالت سے مستغنی ہو گئے اور نکل گئے پھر وہ مالک بن گئے اور حاکم بن گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فقراء مہاجرین کے وہ احوال بیان کئے جو ان پر رحم کرنے کو واجب کرتے ہیں اور فرمایا: الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اور معنی ہے وہ جو روک دیئے گئے۔ حضرت قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے: اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کا معنی ہے: جنہوں نے اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے اپنے کاروبار میں تصرف کرنے

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے قول باری تعالیٰ: لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: پس ایک گروہ نے کہا ہے جن میں طبری اور زجاج ہیں کہ اس کا معنی ہے: وہ قطعاً سوال نہیں کرتے اور یہ اس بنا پر ہے کہ وہ سوال سے کلی طور پر بچتے اور پاکدامن رہتے ہیں۔ یہی موقف جمہور مفسرین کا ہے اور پاکدامنی کی صفت ان کے لئے ثابت ہوتی ہے یعنی وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے نہ اصرار کے ساتھ اور نہ بغیر اصرار کے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد الحاف کی نفی ہے یعنی وہ اصرار اور لپٹے بغیر تو سوال کرتے رہتے ہیں' اور یہ فہم کے زیادہ قریب ہے۔ اور اس میں جلدی آنے والی شے ہے اور اس میں اس کی بری حالت پر تنبیہ ہے جو لوگوں سے لپٹ کر سوال کرتا ہے۔

مسلم نے روایت کی ہے اور الفاظ امام مسلم کے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم سوال میں اصرار نہ کرو، قسم بخدا! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی شے کا سوال نہیں کرتا تو اس کا سوال اس کے لئے مجھ سے کوئی شے نکال لاتا ہے اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ پس اس کے لئے اس میں برکت رکھ دی جائے گی جو کچھ میں نے اسے عطا کیا"۔

اور موطا میں ہے: حضرت زید بن اسلم نے حضرت عطاء بن یسار سے اور انہوں نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں اور میرے گھر والے بقیع غرقد میں اترے تو میرے گھر والوں نے مجھے کہا: تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا اور آپ سے ہمارے لئے کوئی چیز لے آ تاکہ ہم اسے کھائیں اور وہ اپنی حاجت اور ضرورت ذکر کرنے لگے۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کو سوال کرتے ہوئے پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرما رہے تھے: لا اجد ما اعطیک میں کوئی ایسی شے نہیں پاتا جو میں تجھے دوں۔ وہ آدمی آپ سے پیٹھ پھیر کر لوٹا اس حال میں کہ وہ بڑے غصے میں تھا اور کہہ رہا تھا مجھے اپنی عمر کی قسم بلاشبہ آپ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بے شک یہ مجھ پر غصے ہو رہا ہے کہ میں نے اسے دینے کے لئے کوئی شے نہیں پائی۔ تم میں سے جس نے اس حال میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ (چاندی) یا اس کے برابر (سامان) ہو تو تحقیق اس نے بالاصرار اور لپٹ کر سوال کیا"۔

اسدی نے کہا ہے: پس میں نے کہا ہمارے لئے تو دودھ دینے والی ایک اونٹنی اوقیہ سے بہتر ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں۔ اس آدمی نے بیان کیا: تو میں واپس لوٹ گیا اور میں نے آپ سے کچھ نہ مانگا، پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو اور کشمش لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے ہمارے لئے تقسیم فرمایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غنی فرما دیا۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے: اسی طرح اسے مالک نے روایت کیا ہے اور ہشام بن سعد وغیرہ نے ان کی اتباع کی ہے اور یہ حدیث صحیح ہے اور علماء کے نزدیک جب صحابی کا نام نہ لیا جائے تو اس کا حکم کسی دوسرے آدمی کے حکم کی طرح نہیں ہے جب اس کا نام نہ لیا جائے۔ کیونکہ تمام صحابہ کرام سے جرح اٹھ چکی ہے اور ان کے لئے عدالت ثابت ہے۔ یہ حدیث اس پر دلالت

تصدقوا (اے صحابہ!) تم صدقہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: تعطوھم تم انہیں دو۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اشفعوا توجروا اگر تم سفارش کرو تو تم اجر دیئے جاؤ گے (1) تو اس میں دوسرے کے لئے سوال کا اطلاق ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فرمایا: الا رجل یتصدق علی ھذا کیا کوئی آدمی نہیں جو اس پر صدقہ کر سکتا ہو؟ ابوبکر نے بیان کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو کہا گیا کہ ایک آدمی اس آدمی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: بے شک وہ محتاج ہے؟ تو آپ نے فرمایا: یہ تعریض ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بے شک سوال تب بنتا ہے کہ وہ کہے: اعطه تو اسے دے۔ پھر فرمایا: میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی ذات کے لئے سوال کرے تو پھر کسی دوسرے کے لئے یہ کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ البتہ میرے نزدیک تعریض کرنا پسندیدہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابوداؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے کہ فراسی (بنی فراس بن مالک کا کوئی آدمی) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں سوال کر سکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں اور اگر تو سائل ہے تو پھر ضروری ہے کہ تو صالحین سے مانگ۔" پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ ضرورت کے وقت اہل فضل وصلاح سے سوال کو مباح قرار دیا ہے اور اگر وہ اپنی حاجت اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرے تو یہ اولیٰ ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: لوگوں سے حاجات کا مطالبہ کرنا تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہے۔ پس تو اپنی حاجت اس کے پاس پیش کر جو ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے اور چاہیے کہ تیرا بھاگ کر جانا اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ماسوا سے کافی ہو جائے گا اور تو خوشحال اور مسرور زندگی گزارے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اگر بغیر مانگے کسی کے پاس کوئی شے آ جائے تو اس کے لئے جائز ہے وہ اسے قبول کر لے اور اسے رد نہ کرے کیونکہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا ہے۔ امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے اور انہوں نے حضرت عطا بن یسار سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف کچھ عطا (ہدیہ تحفہ) بھیجی تو آپ نے اسے واپس لوٹا دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فرمایا: "تم نے اسے کیوں لوٹا دیا ہے؟" تو آپ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے ہمیں بتایا نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ کوئی شے نہ لے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ وہ سوال کے بارے میں ہے اور رہی وہ شے جو بغیر مانگے مل جائے تو یقیناً وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمایا ہے۔" تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! میں کسی سے کسی شے کے بارے سوال نہیں کروں گا اور بن مانگے جو شے بھی میرے پاس آئے گی میں اسے لے لوں گا۔

یہ نص ہے۔ مسلم نے اپنی صحیح میں اور نسائی نے اپنی سنن میں (2) اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، حدیث نمبر 1342، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مجھے عطیات عطا فرماتے رہتے تھے تو میں عرض کرتا: آپ اسے عطا فرما دیجئے جو مجھ سے زیادہ اس کا محتاج ہے۔ حتیٰ کہ ایک بار آپ ﷺ نے مجھے مال عطا فرمایا تو میں نے عرض کی: آپ مجھ سے زیادہ ضرورت مند کو عطا فرما دیجئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسے لے لو اور اس مال میں سے جو تمہارے پاس آئے اور تم نہ اس پر جھانکنے والے ہو اور نہ سوال کرنے والا ہو تو اسے لے لو اور اسے اپنا مال بنا لو اور تم اس میں اپنے نفس کی اتباع و پیروی نہ کرو۔'' نسائی نے خذہ کے قول کے بعد یہ اضافہ نقل کیا ہے۔ ''پس تم اسے اپنے پاس جمع کر لو یا اسے صدقہ کر دو۔''

اور مسلم نے حضرت عبداللہ بن سعدی مالکی سے حدیث نقل کی ہے(1) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: ''اعطیت شیئا من غیر ان تسال فکل و تصدق'' (کہ جب تمہیں کوئی شے بغیر سوال کے دی جائے تو اسے کھاؤ اور صدقہ کرو) یہ روایت تمہارے لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل حدیث کی توضیح بیان کرتی ہے۔

الاثرم نے کہا ہے: میں نے ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ان سے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: ''جو شے تیرے پاس بغیر سوال اور بغیر اشراف کے آئے۔'' اس میں اشراف سے آپ نے کون سا ارادہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: کہ تو اس پر جھانکتا ہے اور اپنے دل میں یہ کہتا ہے: شاید یہ شے میری طرف بھیج دی جائے۔ آپ سے کہا گیا: اگرچہ وہ تعرض نہ بھی کرے؟ آپ نے فرمایا: ہاں وہ تو بس وہ (اشراف) دل کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر آپ سے کہا گیا: یہ تو بہت تنگی ہے! آپ نے فرمایا: اگرچہ یہ شدید ہے لیکن یہ اسی طرح ہے۔ آپ سے کہا گیا: اگر کوئی آدمی مجھے عادی نہ بنائے اور وہ میری طرف کوئی شے بھیجے مگر یہ کہ اس کا خیال میرے دل میں آئے اور میں کہوں: قریب ہے کہ وہ میری طرف کوئی شے بھیجے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ اشراف ہے۔ پس اگر وہ تیرے پاس آئے اس کے بغیر کہ تو اس کا تصور کرے اور نہ ہی وہ تیرے دل میں کھٹکے تو یہ وہ شے ہے جس میں اشراف نہیں ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: لغت میں الاشراف سے مراد اس شے کی طرف سر اٹھانا ہے جو اس آدمی کے پاس ہو جس کی حرص ہو اور اس شے میں بھی حرص اور طمع ہو۔ اور یہ کہ وہ انسان کو کوشش کرے اور یہ تعرض کرنے لگے۔ اور امام احمد نے اشراف کی تاویل میں جو کچھ کہا ہے وہ تضییق اور تشدید ہے اور وہ میرے نزدیک بعید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے اس سے درگزر فرمایا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں پیدا ہو جب تک زبان اس کے ساتھ نہ بولے اور نہ ہی اعضاء اس کے مطابق عمل کریں۔ نفس کے سوا گناہ نہیں ہے دل میں جو اعتقاد رکھے وہ تو دل کے فعل ہیں یہاں تک کہ وہ اس کے مطابق عمل کرے اور دل میں کھٹکنے والے خیال اور وہم سے بالاجماع درگزر کر لیا گیا ہے۔ (یعنی ان پر کوئی مواخذہ نہیں جب تک انہیں عملی جامہ نہ پہنایا جائے)

مسئلہ نمبر 8۔ کسی سے کچھ مانگنے میں اصرار کرنا اور اس سے مستغنی ہونے کے باوجود اس سے لیتے جانا حرام ہے حلال نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کثرت مال کے باوجود لوگوں سے ان کے اموال کے بارے سوال کیا تو وہ (آگ کے) انگارے مانگ رہا ہے چاہے وہ قلیل طلب کرے یا زیادہ مانگے۔'' اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6630، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روایت کیا ہے اور مسلم نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی مسلسل (بھیک) مانگتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے گا اور اس کے چہرے میں گوشت (☆) کا ٹکڑا تک نہ ہوگا۔" اسے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ نمبر 9۔ سائل جب محتاج ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تین بار تک عذر پیش کرتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے اپنا سوال بار بار کرے۔ اور اسے ذکر کرنا افضل ہے اور اگر وہ آدمی جس سے سوال کیا گیا ہے وہ اس کے بارے جانتا ہو اور وہ اس پر قادر بھی ہو جو مانگنے والا مانگ رہا ہے تو اس پر اسے عطا کرنا واجب ہے اور اگر وہ اس کے بارے ناواقف ہو تو وہ اسے اس خوف سے دے دے کہ ہو سکتا ہے وہ اپنے سوال میں سچا ہو اور وہ اسے واپس لوٹانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر 10۔ اور اگر وہ کسی شے کا محتاج ہو جس کے ساتھ وہ سنت کو قائم رکھ سکتا ہے مثلاً ایسے کپڑے کے ساتھ آراستہ ہونا جسے وہ عید اور جمعہ (کی نمازوں) میں پہنتا ہو۔ تو ابن عربی نے ذکر کیا ہے: "میں نے خلیفہ بغداد کی جامع مسجد میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: یہ تمہارا بھائی ہے جو تمہارے ساتھ جمعہ کی نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں جن کے ساتھ یہ جمعہ کی سنت کو قائم کر سکتا ہو۔ پس جب دوسرا جمعہ آیا تو میں نے اس پر دوسرا لباس دیکھا تو مجھے بتایا گیا۔ ابو طاہر برسی نے اسے یہ لباس پہنایا ہے اور مدح و تعریف حاصل کی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۞

"جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور علانیہ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس میں ایک مسئلہ ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابوذر، حضرت ابو امامہ، حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم، حضرت عبد اللہ بن بشر غافقی اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ آیت ان گھوڑوں کے چارے کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں باندھے گئے ہوں۔ اور ابن سعد نے طبقات میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے: مجھے محمد بن شعیب بن شابور سے خبر دی گئی ہے کہ انہوں نے کہا ہمیں سعید بن سنان نے یزید بن عبد اللہ بن عریب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے جد عریب کی سند سے خبر دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا گیا: اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ

1۔ صحیح بخاری، باب من سال الناس تکثرا، حدیث نمبر 1381، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ روز قیامت وہ اس حال میں آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی اور یہ بھی کہا گیا ہے یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے میں فقط ہڈیاں ہوں گی گوشت نہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

چھو کر۔ یہ حالت اس لئے ہوئی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو اور حرام کیا سود کو۔ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے تو وہ (سود سے) رک گیا تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اور جو شخص پھر سود کھانے لگے تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ناشکرے گنہگار کو۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور کرتے رہے اچھے عمل اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوۃ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔"

ان آیات سود کے احکام، بیع کی بعض صورتوں کے جواز اور اس کے لئے وعید کو متضمن ہیں جو کوئی سود کو حلال سمجھے اور اس پر عمل کرنے پر مصر ہو۔ اس میں اڑتیس مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا۔ يَاْكُلُوْنَ بمعنی یاخذون ہے (یعنی وہ جو سود لیتے ہیں) اور اخذ (لینے) کو اکل (کھانے) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ سود کھانے کے لئے ہی لیا جاتا ہے اور ربا کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ کہا جاتا ہے: ربا الشئ یربو جب کوئی شے زیادہ ہو جائے اور اسی معنی میں حدیث حبیب کی ہے فلا واللہ ما اخذنا من لقمۃ الا ربا من تحتھا (قسم بخدا! ہم نے جو لقمہ بھی لیا تو وہ اپنے نیچے سے اور زیادہ ہو گیا) مراد وہ کھانا ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

قیاس یہ ہے کہ یہ یاء کے ساتھ لکھا جائے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے، حالانکہ انہوں نے اسے قرآن کریم میں واؤ کے ساتھ لکھا ہے۔

پھر شریعت نے اس اطلاق میں تصرف کیا اور اسے بعض مواقع کے ساتھ محصور کر دیا۔ پس ایک بار اس کا اطلاق حرام کمائی پر کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے بارے میں فرمایا: وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کئے گئے تھے اس سے) اور اس سے وہ شرعی ربا مراد نہیں لیا جس کے حرام ہونے کا ہم پر حکم لگایا بلکہ اس سے حرام مال مراد لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدہ: 42) (قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو بڑے حرام خور ہیں) اس سے مراد مال حرام ہے رشوت وغیرہ۔ اور وہ جسے انہوں نے امیین کے اموال میں سے حلال سمجھ لیا تھا جہاں انہوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ (آل عمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملے میں کوئی گرفت) اس بنا پر اس میں نہی ہر مال حرام کو شامل ہے جس طریقے سے بھی مال کمایا جائے اور وہ ربا جس پر شرعی

1۔ صحیح بخاری، باب السمر مع الضیف والاہل، حدیث نمبر 567، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اصطلاح ہے وہ دو چیزیں ہیں: نسیئہ کو حرام قرار دینا اور نقود اور مطعومات میں تفاضل (زیادتی) جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے اور اس میں غالب وہی ہے جو عرب کرتے تھے قرض دینے والے کے لئے ان کا یہ قول ہے: اتقضی ام تربی؟ (کیا تو ادا کرے گا یا تو اضافہ کرے گا) پس وہ (قرض دینے والا) مال کی تعداد میں اضافہ کر دیتا اور قرض لینے والا اس پر صبر کرتا اور یہ سب حرام کر دیا گیا ہے اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اکثر وہ بیعیں جنہیں ممنوع قرار دیا گیا ہے ان میں ممنوع ہونے کی علت زیادتی کے معنی کا پایا جانا ہے یا تو عین مال میں زیادتی یا پھر (بائع اور مشتری میں سے) کسی ایک کے لئے تاخیر کے سبب منفعت میں زیادتی وغیرہ اور بیوع میں سے وہ جس میں زیادتی کا معنی نہ ہو جیسا کہ پھل کی بیع کرنا اس کے پکنے کی صلاحیت ظاہر ہونے سے پہلے اور اسی طرح وہ بیع جو جمعہ کے دن اذان کے وقت ہو اگر ان کے کرنے والے کو یہ کہا جائے سود کھانے والا تو یہ مجاز اور تشبیہا ہوگا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سونے کی بیع سونے کے عوض، چاندی کی بیع چاندی کے عوض، گندم کی بیع گندم کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض اور نمک کی بیع نمک کے عوض برابر برابر اور ہاتھوں ہاتھ ہے۔ پس جس نے زیادتی کی یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو اس نے سود لیا لینے اور دینے والا اس میں برابر ہیں۔"

اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: "جب یہ اصناف مختلف ہوں تو پھر ان کی بیع کرو جیسے تم چاہو بشرطیکہ دست بدست ہو۔" اور ابو داؤد نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سونے کی بیع سونے کے عوض اس کی ڈلیاں ہوں اور اس کا عین ہو، چاندی کی بیع چاندی کے عوض اس کی ڈلیاں ہوں اور اس کا عین ہو گندم کی بیع گندم کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، جو کی بیع جو کے عوض (یعنی) مد کی بیع مد کے عوض، کھجور کی بیع کھجور کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد اور نمک کی بیع نمک کے عوض (یعنی) مد کے بدلے مد۔ پس جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تحقیق اس نے سود لیا اور سونے کو چاندی کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے جبکہ ان میں سے چاندی کی مقدار زیادہ ہو درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی نسیئہ (ادھار) تو یہ جائز نہیں ہے اور گندم جو کے عوض بیچنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو ان دونوں میں زیادہ ہوں درآنحالیکہ بیع دست بدست ہو اور رہی ادھار تو یہ جائز نہیں۔(1)" علماء نے اس حدیث کے تقاضا کے مطابق قول پر اجماع کیا ہے اور اسی طریقہ پر مسلمان فقہاء کی جماعت ہے مگر گندم اور جو میں، کیونکہ امام مالک نے ان دونوں کو ایک صنف قرار دیا ہے۔ پس ان دونوں میں سے دو کی بیع ایک کے عوض جائز نہیں ہے۔ اور یہی قول لیث، اوزاعی اور مدینہ اور شام کے عظیم علماء کا ہے۔ اور امام مالک نے ان دونوں کی طرف السلت (جو کی ایک قسم جس پر چھلکا نہیں ہوتا) کی اضافت کی ہے اور لیث نے کہا ہے: السلت (جو) اور جو اور مکئی یہ ایک ہی صنف ہے اور ابن وہب نے بھی کہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جب حدیث صحیح ثابت ہے تو اس کے ساتھ کسی قول کی کوئی حیثیت نہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الصرف، حدیث نمبر 2907، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

والسلام نے فرمایا ہے: "جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو انہیں بیچو بشرطیکہ بیع دست بدست ہو۔" اور آپ کا یہ ارشاد بھی ہے: "گندم گندم کی بیع گندم کے عوض اور جو کی بیع جو کے عوض" تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یہ دونوں دو مختلف قسمیں ہیں جیسا کہ گندم اور کھجور مختلف ہیں کیونکہ دونوں کی صفات مختلف ہیں اور دونوں کے نام بھی مختلف ہیں۔ اور اگانے والے اور کاٹنے والے کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ جدائی اور فرق بالکل واضح اور بین ہے اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ، ثوری اور اصحاب حدیث کا یہی مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے نہی اور تحریم ڈھلے ہوئے دینار و درہم کے بارے میں وارد ہے نہ کہ سونے کی چڑیوں اور ڈھالی گئی چاندی کے بارے میں اور نہ ہی اس کے بارے میں جو ڈھلی ہوئی (چاندی) سے بنائی گئی ہو۔ اور کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نہی صرف اس کے بارے میں ہے جو اس سے خاص نمونہ پر تیار کی گئی ہو۔ یہاں تک کہ ان کی ملاقات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوگئی، جسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے، بیان فرمایا: ہم جہاد میں شریک ہوئے اور لوگوں پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران تھے۔ پس ہم نے بہت زیادہ مال غنیمت اکٹھا کیا اور ہمارے اس مال غنیمت میں چاندی کے برتن بھی تھے۔ تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو لوگوں کے عطیات میں انہیں بیچ ڈالنے کا حکم دیا، تو اس بارے میں لوگوں کے مابین تنازع شروع ہو گیا۔ پس اس کی اطلاع حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، آپ کھڑے ہوئے اور فرمایا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض اور نمک نمک کے عوض بیچنے سے منع کرتے ہوئے سنا ہے مگر (اس صورت میں کہ وہ) برابر برابر ہو، اور عین کے عوض عین ہو۔ جس نے زیادہ دیا یا زیادتی کا طالب ہوا تو تحقیق اس نے سود لیا۔ پس لوگوں نے جو لیا تھا وہ واپس لوٹا دیا۔ پھر یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: خبردار! سنو کیا حال ہے ان لوگوں کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث بیان کرتے ہیں حالانکہ ہم آپ کے پاس حاضر رہتے تھے اور آپ کی صحبت و معیت میں رہتے تھے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی احادیث نہیں سنیں۔ تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور دوبارہ وہی حدیث بیان فرمائی۔ پھر فرمایا: ہم ضرور بضرور اس کے بارے حدیث بیان کریں گے جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، اگرچہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اسے ناپسند کریں مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے کہ میں نے سیاہ رات میں آپ کے لشکر میں آپ کی صحبت اختیار نہیں کی۔ حماد نے یہی یا اسی طرح کہا ہے۔

ابن عبد البر نے کہا ہے: یہ بھی روایت ہے کہ یہ قصہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں کا آپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن عرف میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث محفوظ رہی۔ اور یہی وہ اصل ہے جس پر علماء نے ربا کے باب میں اعتماد اور بھروسہ کیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فعل کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ معاملہ حضرت امیر معاویہ

ڈھلے ہوئے دنانیر، میری اس چاندی کے بدلے ڈھلے ہوئے دراہم مجھے دے دے۔ کیونکہ مجھے خروج کے وقت روک دیا گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا جس کے ساتھ میں نکلا ہوں۔ تو ضرورت کے تحت اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے اور بعض لوگوں نے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قبس میں امام مالک سے تاجر کے سوا دوسروں کے بارے میں بھی اسے بیان کیا ہے کہ امام مالک نے اس میں تخفیف فرمائی ہے اور یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی وہ چاندی بیچے جس کا وزن ایک سو پانچ درہم تھا اور وہ اس کے بدلے اسے سو درہم دے اور یہ خالص ربا ہے۔ اور جس نے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے کہ اگر وہ اسے اس طرح کہے: یہ چاندی مجھے ڈھال دے اور اس پر تو اس سے اجرت کاٹ لے۔ یعنی جب وہ اسے ڈھال لے اور یہ اسے اس سے لے لے اور یہ اسے اس کی اجرت ادا کر دے۔ یہی جو امام مالک نے پہلے کہا ہے وہ وہی ہے جو آخر میں ہوگا۔ امام مالک نے مال کی طرف دیکھا ہے اور اس پر حال کا حکم مرتب کیا ہے اور تمام فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: اس میں امام مالک کی حجت واضح ہے۔

ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی ربا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے حرام کیا ہے: من زاد او ازداد فقد اربی (جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا تحقیق اس نے سود لیا)

ابن وہب نے اس مسئلہ میں امام مالک کا رد کیا ہے اور اس کا انکار کیا ہے۔

اور علامہ ابہری نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ تجارت کے فروغ کے لئے نرم رویہ اپنایا گیا ہے تاکہ تجارتی منڈی ختم نہ ہو جائے اور ربا (سود) نہیں ہے مگر اس پر جو اس سے زیادہ لینے کا ارادہ کرے جو اس کا قصد کرتا ہو اور اسے چاہتا ہو۔ اور ابہری بھول گئے اس کی اصل سد ذرائع میں ہے اور ان کا قول اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کپڑا ادھار بیچا اور وہ اسے خریدنے کی نیت اور ارادہ نہ رکھتا ہو پھر وہ اسے بازار میں پاتا ہے کہ اسے بیچا جا رہا ہے۔ بے شک اس کے لئے اس سے کم قیمت کے ساتھ اسے خریدنا جائز نہیں ہے جتنے کے ساتھ اس نے اسے بیچا تھا اگرچہ وہ اس کا قصد نہ بھی کرے اور خواہ اسے چاہے اور اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اگر ربا نہیں ہے مگر اسی پر جو اس کا قصد کرے تو پھر (ہر شے) فقہاء پر ہی حرام کی گئی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ہمارے بازار میں کوئی تجارت نہیں کرے گا مگر وہی جو اس کی خوب سمجھ بوجھ رکھتا ہو ورنہ وہ ربا کھائے گا۔ یہ اس کے لئے بالکل واضح ہے جسے انصاف عطا کیا گیا اور اسے رشد و ہدایت عطا فرمائی گئی۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک نے زیادتی (لینے دینے) سے روکنے میں انتہائی مبالغہ کیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے موہوم (متوہم) کو محقق (ثابت شدہ) کی مثل قرار دیا ہے۔ سو آپ نے ایک دینار اور ایک درہم کی بیع ایک دینار اور ایک درہم کے بدلے کرنے سے منع کیا ہے۔ یہ سد ذرائع کے لئے اور توہمات کی جڑ کاٹنے کے لئے ہے کیونکہ اگر زیادتی کا وہم نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ نہ کرتے اور تقسیم کے وقت مماثلت متعذر ہونے کو اس منع کی علت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے سونے اور چاندی کا تبادلہ سونے کے عوض لازم آتا ہے اور اس سے زیادہ واضح یہ ہے کہ انہوں نے تفاضل معنوی سے بھی منع

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الصدقۃ عن النبی، حدیث نمبر 449، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اس سے منع کیا ہے کہ کوئی اعلیٰ اور عمدہ سونے کے ایک دینار اور گھٹیا سونے کے ایک دینار کی بیع
اعلیٰ کے مقابلہ میں کرے اور گھٹیا پن کو لغو قرار دے۔ اور یہ آپ کی دقت نظر کی علامت ہے۔ پس یہ اس پر دلیل ہے کہ آپ
سے وہ روایت منکر ہے اور وہ صحیح نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ خطابی نے کہا ہے: تبر سے مراد سونے اور چاندی کا وہ ٹکڑا ہے جسے ابھی تک ڈھالا نہ گیا ہو اور نہ ہی
اس سے دراہم و دنانیر بنائے گئے ہوں۔ اس کی واحد تبرۃ ہے۔ اور العین سے مراد وہ ہے جس سے دراہم یا دنانیر بنائے
گئے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے کہ ایک مثقال عین سونا بیچا جائے مثقال اور اس کی تبریوں کے ساتھ جو ڈھالی
ہوئی نہ ہوں۔ اور اسی طرح مضروب چاندی اور غیر مضروب چاندی کے درمیان تفاوت کو بھی حرام قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم
کے اس ارشاد تبرھا وعینہا سواء کا یہی معنی ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کھجور کی بیع کھجور سے کرنا جائز نہیں ہے مگر برابر برابر۔ اور انہوں
نے ایک کھجور کی بیع دو کھجوروں کے ساتھ کرنے میں اور گندم کے ایک حب (دانہ یا دو جو کے برابر وزن) کی بیع دو حبوں کے
ساتھ کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ اور امام شافعی، امام احمد، اسحاق اور ثوری رحمہم اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ یہی امام مالک
کے قول کا قیاس ہے اور یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ شے جس میں ربا جاری ہوتا ہے اس کی کثیر مقدار میں تفاضل کے سبب تو یہ سارا
تو اس کی قلیل مقدار بھی اس میں داخل ہے۔ اور جنہوں نے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے
کہ ایک یا دو کھجوریں ضائع کرنے والے پر قیمت واجب نہیں ہوتی فرمایا: کیونکہ اس کا کوئی ماپ اور وزن نہیں ہے پس اس
میں تفاضل (زیادتی) جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ تو جان! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے کہ اس باب کے مسائل کثیر ہیں اور اس کی فروع پھیلی ہوئی ہیں اور وہ
شے جو تیرے لئے مضبوط ہو وہ یہ ہے کہ تو ربا کی اس علت میں غور و فکر کرے جس کا اعتبار ہر ایک نے کیا ہے۔
پس امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے کیل یا وزن ہوتی ہے۔ پس ہر وہ شے جس میں کیل یا
وزن داخل ہوگا آپ کے نزدیک وہ ایک جنس میں سے ہے اور اس کے بعض کی بعض کے ساتھ متفاضلاً یا نسیئۃً بیع کرنا
جائز نہ ہوگا۔ پس آپ نے مٹی کی مٹی کے ساتھ بیع متفاضل سے منع کیا ہے، کیونکہ اس میں کیل داخل ہوتا ہے اور ایک روٹی کی
بیع دو روٹیوں کے ساتھ کرنے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ آپ کے نزدیک یہ اس کیل میں داخل نہیں ہیں جو ربا کی اصل ہے۔
پس یہ اس جنس سے خارج ہوگئی جس میں ربا داخل ہوتا ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کی علت جنس کے اعتبار سے اس شے کا مطعوم (وہ شے جو کھائی جائے) ہونا ہے۔ یہ آپ کا
جدید قول ہے۔ پس آپ کے نزدیک آٹے کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی روٹی کی بیع روٹی کے ساتھ کرنا
جائز ہے نہ متفاضلاً اور نہ نسیئاً، چاہے روٹی خمیری ہو یا کاک ہو۔ اور آپ کے نزدیک ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے
کرنا جائز نہیں ہے، ایک انار کی بیع دو اناروں سے کرنا جائز نہیں ہے اور ایک تربوز کی بیع دو تربوزوں سے کرنا جائز نہیں ہے۔

دست بدست اور نقد بنقد، کیونکہ یہ سب کھایا جانے والا طعام ہے۔

اور آپ نے اپنے پہلے قول میں کہا ہے کہ ربا کی بات کیلی یا وزنی ہوتا ہے۔

اور اس بارے میں ہمارے اصحاب مالکیہ کی عبارات مختلف ہیں اور ان میں سے جو سب سے اچھی اور حسین ہے وہ یہ ہے کہ وہ شے اس جنس سے ہو جو خوراک بن سکتی ہو اور غالباً زندگی گزارنے کے لئے ذخیرہ کی جا سکتی ہو۔ جیسا کہ گندم، جو، کھجور اور نمک جن پر نص بیان کی گئی ہے اور وہ چیزیں جو ان کے معنی میں ہیں جیسا کہ چاول، مکئی، باجرہ اور تل اور وہ دانے جو بطور غذا استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً لوبیا، لہسن اور چنے وغیرہ۔ اور اسی طرح گوشت، دودھ، سرکہ اور تیل وغیرہ۔ اور پھل مثلاً انگور، کشمش اور زیتون وغیرہ اور انجیر میں اختلاف کیا گیا ہے اور شہد اور شکر ان کے ساتھ ملحق کیے جاتے ہیں۔ پس یہ تمام وہ چیزیں ہیں جن میں جنس کی جہت سے ربا داخل ہوتا ہے اور ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے: ”جب یہ اصناف مختلف ہوں تو تم جیسے چاہو ان کی بیع کرو بشرطیکہ وہ دست بدست ہو۔“ اور ان تازہ پھلوں میں ربا نہیں ہے جو باقی نہیں رہتے مثلاً سیب، تربوز، انار، ناشپاتی، ککڑی، کھیرا، بینگن اور اس کے علاوہ دیگر سبزیاں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: انڈے کی بیع انڈے کے ساتھ متفاضلاً جائز نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جو ذخیرہ کیے جا سکتے ہیں اور ان کے نزدیک برابر برابر بیع جائز ہوتی ہے۔

اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم نے کہا ہے: ایک انڈے کی بیع دو انڈوں سے اور زیادہ سے کرنا بھی جائز ہے کیونکہ یہ ان چیزوں میں سے ہیں جو ذخیرہ نہیں کی جا سکتیں۔ اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ الربا کے لفظ میں علماء نحو نے اختلاف کیا ہے۔ بصریوں نے کہا ہے: یہ واوی الفاظ میں سے ہے کیونکہ تو اس کے تثنیہ میں کہتا ہے: ربوان۔ سیبویہ نے یہی کہا ہے اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ یا کے ساتھ لکھا جائے گا اور اس کا تثنیہ یا کے ساتھ ہے کیونکہ اس کے اول میں کسرہ ہے۔

زجاج نے کہا ہے: میں نے کوئی خطا نہیں دیکھی جو اس سے زیادہ قبیح اور زیادہ شنیع ہو۔ لکھنے میں خطا ہی کافی نہ ہوئی یہاں تک کہ انہوں نے تثنیہ میں غلطی کی، حالانکہ وہ یہ پڑھتے ہیں: وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ۔ محمد بن یزید نے کہا ہے: مصحف میں الربا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس کے درمیان اور الزنا کے درمیان فرق ہو جائے۔ اور ربا واؤ کے ساتھ لکھنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ ربا یربو سے ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہے اور وہ الذین ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ حضرت ابن عباس، حضرت مجاہد، حضرت ابن جبیر، قتادہ، ربیع، ضحاک، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے ساتھ شیطان رکھا جائے گا وہ اس کا گلا دبا رہا ہو گا۔ اور تمام نے کہا ہے: اسے بطور سزا

ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ

مسئلہ نمبر 12۔ اس آیت میں جن کے انکار کے فاسد ہونے پر دلیل ہے جنہوں نے جن کی جانب سے گرانے کا انکار کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ یہ طبائع کے فعل میں سے ہے اور یہ کہ شیطان تو انسان میں چل سکتا ہے اور نہ اس کی جانب سے چھوا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے ان کا رد گزر چکا ہے۔

نسائی نے ابوالیسر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: رسول اللہ ﷺ اس طرح دعا مانگتے تھے: اللھم انی اعوذبک من التردی والھدم والغرق والحریق واعوذبک ان یتخبطنی الشیطان عند الموت واعوذبک ان اموت فی سبیلک مدبرا واعوذبک ان اموت لدیغا (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں (کنویں میں) گرنے سے اور (اس سے کہ مجھ پر کوئی عمارت) گر پڑے اور (پانی میں) غرق ہونے سے اور (آگ میں) جلنے سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ شیطان موت کے وقت مجھے پاگل بنا دے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تیرے راستے میں (میدان جہاد سے) پیٹھ پھیرتے ہوئے مروں اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ مجھے کسی شے کے ڈسنے سے موت آئے۔)

اور محمد بن مثنیٰ کی حدیث سے مروی ہے کہ ابوداؤد نے ہمام سے، انہوں نے حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ دعا مانگتے تھے: اللھم انی اعوذبک من الجنون والجذام والبرص وسیئ الاسقام (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں جنون سے، جذام سے، برص سے اور بیماریوں کی شدت اور تنگی سے)

اور مس کا معنی جنون ہے۔ کہا جاتا ہے مُسَّ الرجل وألِسَ، فھو ممسوس ومألوس جب وہ آدمی مجنون ہو، اور یہ آخرت میں ربا کی علامت ہوگی۔ اور حدیث اسراء میں روایت کیا گیا ہے: ”جبرائیل امین علیہ السلام مجھے لے کر چلے تو میں بہت سے لوگوں کے پاس سے گزرا، ان میں سے ہر آدمی کا پیٹ بہت بڑے گھر کی مثل ہے درآنحالیکہ وہ آل فرعون کے راستے پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور آل فرعون کو صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا ہے پس وہ شدید پیاسے اونٹوں کی مثل آتے ہیں وہ پتھروں اور درختوں سے ٹکراتے ہیں نہ وہ سنتے ہیں اور نہ عقل رکھتے ہیں پس جب ان بڑے پیٹوں والوں نے انہیں محسوس کیا تو وہ کھڑے ہوئے اور ان کے پیٹ ان پر غالب آگئے اور وہ گرنے لگے پھر ان میں سے کوئی کھڑا ہوتا تو وہ اس کا پیٹ اس پر بھاری ہو جاتا اور وہ گر پڑتا۔ پس وہ واضح استطاعت اور قدرت نہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ آل فرعون نے انہیں ڈھانپ لیا اور وہ انہیں آتے جاتے ہوئے روندنے لگے۔ پس دنیا اور آخرت کے درمیان برزخ میں یہی ان کا عذاب ہے۔ اور آل فرعون کہتے ہیں اے اللہ! کبھی قیامت قائم نہ کر، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (المومن) (اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں) میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ تو اس نے کہا: ”یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔“ اور مس سے مراد جنون ہے اور اسی سے اولق، الس اور الزود کے الفاظ بھی اسی معنی میں ہیں۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا تمام متاولین کے نزدیک اس کا معنی ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے اور ان کو کہا گیا ہے: فَلَهٗ مَا سَلَفَ (تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ہے) اور کسی گنہگار مومن کو یہ نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کی بیع توڑ دی جاتی ہے اور اس کا فعل رد کر دیا جاتا ہے اگرچہ وہ ناواقف ہو۔ اسی لئے حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ (جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کے بارے ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے) لیکن نافرمان اور معصیت کا ارتکاب کرنے والے اس آیت کی وعید سے ایک طرف ہو کر ہو جاتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بے شک قرض کی مدت پوری ہونے کے بعد اس میں زیادتی اسی طرح ہے جس طرح عقد کی ابتدا میں اصلی ثمن تھے۔ اور عربوں میں صرف یہی ربا معروف تھا جب اس کے قرض کی ادائیگی کا وقت آ پہنچتا تو وہ مقروض کو کہتے: کیا تو پورا ادا کرے گا یا اسے بڑھا دے گا یعنی قرض میں اضافہ کرے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اپنے ارشاد حق کے ساتھ ان کے قول کو رد کر دیا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا اور واضح کر دیا ہے جب مدت گزر جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو اسے آسانی اور خوشحالی آنے تک مہلت دی جائے اور یہی وہ ربا ہے جسے حضور نبی کریم ﷺ نے نویں ذی الحجہ کے دن اپنے قول کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ جب آپ نے فرمایا: "خبردار! سنو بلاشبہ تمام سود ختم کر دیا گیا۔ اور وہ پہلا سود جسے میں ختم کر رہا ہوں وہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود ہے وہ سارے کا سارا ختم کر دیا گیا ہے۔" پس آپ ﷺ نے اپنے چچا سے اور لوگوں میں سے خاص قریبی آدمی سے اس کا آغاز کیا۔ اور یہی امام وقت کے عدل کے طریقوں میں سے ہے کہ وہ عدل کو اپنی ذات پر اور اپنے خواص پر نافذ کرتا ہے اور پھر وہ تمام لوگوں میں پھیل جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یہ قرآن کریم کے عمومات میں سے ہے۔ اور اس پر الف لام جنس کیلئے ہے عہد کے لئے نہیں ہے کیونکہ اس سے پہلے بیع کا ذکر نہیں ہوا جس کی طرف رجوع کیا جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے) پھر استثنا فرمائی: اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے) (اس میں الانسان پر الف لام جنسی ہے) اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ بیع عام ہے تو پھر اسے اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جس ربا وغیرہ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے اور ان کا عقد کرنے سے روکا گیا ہے جیسے کہ خمر، مردار اور کسی حاملہ جانور کا حمل وغیرہ ذالک اور اس بارے میں بھی سنت ہے اور اجماع امت سے ثابت ہے اور اس کی نظیر یہ بھی ہے: اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔

اور وہ تمام کے تمام ظواہر جو عمومات کا تقاضا کرتے ہیں اور ان میں تخصیص داخل ہو سکتی ہے اور یہ اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

اور بعض نے کہا ہے یہ قرآن کریم کی وہ مجمل آیت ہے جس کی تفسیر بیع کی اس قسم کے ساتھ کی گئی ہے جو حلال کی گئی ہے اور اس کے ساتھ جو حرام کی گئی ہے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے بیع کو حلال کرنے اور اسے حرام کرنے کے بارے میں استعمال کیا جائے مگر تب جب اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں سے کوئی بیان مقترن ہو اگرچہ یہ تفصیل کے بغیر فی الجملہ

بیوع کی اباحت پر دال ہے اور یہ عموم اور مجمل کے درمیان فرق ہے۔ پس عموم فی الجملہ اور تفصیل کے ساتھ بیوع کی اباحت پر دلالت کرتا ہے جب تک وہ کسی دلیل کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔ اور مجمل ان کی اباحت پر تفصیل سے دلالت نہیں کرتا یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیان مقترن ہو۔ اور پہلا زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 16۔ البیع لغت میں مصدر ہے باع کذا بکذا۔ یعنی اس نے عوض دیا اور معوض لیا۔ اور یہ بائع (بیچنے والا) کا تقاضا کرتی ہے اور وہ مالک ہوتا ہے یا اس کا نائب ہوتا ہے اور مبتاع مشتری (خریدار) کا تقاضا کرتی ہے اور یہ وہ ہے جو ثمن ادا کرتا ہے۔ اور مبیع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور مبیع وہ شے ہوتی ہے جس کے ثمن لگائے جائیں یعنی جس کے مقابلے میں ثمن دیے جاتے ہیں۔ وہ اس بناء پر بیع کے چار ارکان ہوئے۔ بائع (بیچنے والا) مشتری (خریدار) ثمن (قیمت) اور مثمن (مبیع وہ شے جو بیچی جا رہی ہو) پھر عربوں کے نزدیک معاوضہ اپنے مضاف الیہ کے اختلاف کے سبب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر معاوضہ رقبہ یعنی ذات۔ کے مقابلہ میں ہو تو اسے بیع کا نام دیا گیا ہے اور اگر رقبہ کی منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اگر وہ منفعت بضع ہو تو اسے نکاح کا نام دیا گیا ہے اور اگر بضع کے سوا کسی اور منفعت کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام اجارہ ہے اور عین (دراہم و دنانیر) کی بیع عین کے عوض ہو تو وہ بیع النقد ہے اور وہی بیع الصرف ہے اور اگر بیع دین موجل کے ساتھ ہو تو وہ بیع سلم ہے۔ اس کا بیان آگے آیۃ الدین میں آئے گا۔ اور بیع الصرف کا حکم گزر چکا ہے اور اجارہ کا حکم سورۃ القصص میں آئے گا اور نکاح میں مہر کا حکم سورۃ النساء میں آئے گا ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے محل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 17۔ بیع قبول اور ایجاب (کلام) سے یہ مستقبل اور ماضی کے الفاظ کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ اس میں ماضی حقیقۃ ہوتی ہے اور مستقبل کنایہ ہوتا ہے اور یہ ایسے لفظ صریح اور کنایہ سے واقع ہو جاتی ہے جس سے ملکیت کا منتقل ہونا سمجھا جائے۔ چاہے وہ یہ کہے: بعتك هذه السلعة بعشرة میں نے تجھے یہ سامان دس کے عوض بیچا اور خریدنے والا کہے: اشتريتها۔ میں نے اسے خرید لیا۔ یا خریدنے والا پہلے کہے: اشتريتها۔ میں نے اسے خرید لیا اور پھر بیچنے والا کہے: بعتكها۔ میں نے اسے تجھے بیچ دیا یا بائع کہے: میں تجھے دس کے عوض بیچوں گا اور پھر مشتری کہے: میں خریدوں گا یا میں نے خرید لیا۔ اور اسی طرح ہے اگر وہ کہے: تو اسے دس کے عوض لے لے یا میں نے تجھے یہ دے دیا یا تو اسے لے لے یا تجھے اس میں برکت دی جائے اس کے عوض یا میں نے اسے تیرے حوالے کر دیا اور وہ دونوں بیع کا ارادہ رکھتے ہوں۔ تو ان تمام الفاظ کے ساتھ بیع لازم ہو جائے گی۔ اور اگر بائع نے کہا: میں نے تجھے دس کے عوض بیچ دی پھر وہ مشتری کے قبول کرنے سے پہلے رجوع کر لے تو امام مالک نے کہا ہے: اس کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں ہے یہاں تک کہ وہ مشتری کے قبول یا اس کے رد کو جان لے کیونکہ اس نے اپنی جانب سے اسے دے دیا ہے اور اسے اس پر ثابت کر دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز ہے کیونکہ ابھی اس پر عقد مکمل نہیں ہوا۔

اور اگر بائع کہے: میں نے تو مذاق کیا تھا تو اس بارے میں روایت مختلف ہے۔ پس آپ نے ایک بار کہا: بیع لازم ہو جائے گی اور اس کے قول کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور ایک بار فرمایا: سامان کی قیمت کی طرف دیکھا جائے گا۔ پس اگر ثمن اس

کی قیمت سے موافقت رکھتے ہوں تو بیع لازم ہوگی اور اگر متفاوت ہوں جیسا کہ غلام ایک درہم کے عوض اور گھر ایک دینار کے بدلے تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے اس سے بیع کا ارادہ نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ مذاق کرنے والا ہے تو بیع لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: وَحَرَّمَ الرِّبٰوا یہاں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد وہی ربا ہے جس کا کاروبار عرب کرتے تھے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، پھر یہ شامل ہوگا اسے جسے رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا ہے اور آپ ﷺ کی جانب سے اس کی بیع سے منع کیا گیا ہے جس میں ربا داخل ہو سکتا ہے اور جو بھی اس کے معنی میں بیوع ہیں ان سے منع کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ عقد ربا کو فسخ کر دیا گیا ہے وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ائمہ نے اسے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ برنی کھجوریں لے کر آئے، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا: "یہ کہاں سے لائے ہو؟" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہمارے پاس گھٹیا (ردی) کھجوریں تھیں تو میں نے ان میں سے دو صاع ایک صاع کے عوض بیچ دیں حضور نبی کریم ﷺ کے کھانے کے لئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمایا: "اوہ! یہ تو عین ربا ہے تو اس طرح نہ کر۔ البتہ جب تو کھجوریں بیچنے کا ارادہ کرے تو تو پہلے ایک بیع کے ساتھ انہیں بیچ دے پھر ان (کے ثمن) کے عوض وہ خرید لے۔" اور ایک روایت میں ہے "یہ ربا ہے پس تم اسے لوٹا دو پھر تم ہماری کھجوریں بیچو اور ان کے (ثمن کے) عوض ہمارے لئے کھجوریں خرید لو۔" (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: آپ ﷺ کا یہ ارشاد: اَوَّہ عینُ الربا سے مراد وہ ربا ہے جو فی نفسہٖ حرام ہے نہ کہ وہ جو اس سے مشابہت رکھتا ہے اور آپ کے قول: فَرُدُّوہُ عقد ربا کو فسخ کرنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور یہ بیع کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور یہی جمہور کا قول ہے۔ بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ کے کہ وہ فرماتے ہیں: بلاشبہ ربا کی بیع اپنے اصل کے اعتبار سے جائز ہے اس حیثیت سے کہ وہ بیع ہے اور اپنے وصف کے اعتبار سے ممنوع ہے اس اعتبار سے کہ وہ ربا ہے۔ پس ربا ساقط ہو جائے گا اور بیع صحیح ہو جائے گی اور اگر اس طرح ہوتا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تو حضور نبی کریم ﷺ اس عقد کو فسخ نہ کرتے اور آپ ایک صاع پر جو زیادتی تھی اسے واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرماتے اور یقیناً ایک صاع کے مقابلہ میں صاع کو صحیح قرار دیتے۔

مسئلہ نمبر 20۔ ہر وہ عقد جو واضح طور پر حرام ہو اور اسے فسخ کر دیا جائے تو مشتری پر سامان بعینہٖ واپس لوٹانا واجب ہے اور اگر مشتری کے ہاتھ سے وہ ضائع ہو گیا تو وہ اس سامان میں قیمت لوٹائے گا جس کی قیمت ہو اور وہ ہیں مکان، زمین، سامان اور حیوان وغیرہ۔ اور جن کی مثل موجود ہو اس کی مثل واپس لوٹائے گا وزنی چیزوں میں سے ہو یا کیلی چیزوں میں سے طعام ہو یا عروض (سامان) ہو۔

امام مالک نے کہا ہے: جس کا حرام ہونا بیّن ہو وہ واپس لوٹایا جائے گا چاہے وہ ضائع ہو یا نہ ہو۔ اور وہ جو اس میں سے ہو جسے لوگوں نے مکروہ جانا ہو تو اسے رد کر دیا جائے مگر یہ کہ سامان ضائع ہو جائے تو پھر اسے چھوڑ دیا جائے۔ (یعنی رد نہ کیا جائے۔)

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ حضرت امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ عنہما نے کہا ہے اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، حدیث نمبر 2145، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعالیٰ نے سود حرام کر دیا ہے کیونکہ ایک دوسرے کو قرض دیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ دینے کے مساوی ہوتا ہے" اسے بزار نے نقل کیا ہے اور اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ مالوں کے لئے باعث ضیاع اور لوگوں کے لئے باعث ہلاکت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ میں فعل کے آخر سے علامت تانیث ساقط ہے کیونکہ تانیث موعظة مؤنث غیر حقیقی ہے اور یہ کلام وعظ ہے اور حسن نے علامت تانیث کو ثابت رکھتے ہوئے فَمَنْ جَآءَتْهُ پڑھا ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جب حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے فعل کی خبر دی گئی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔ دارقطنی نے عالیہ بنت ایفع سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: میں اور ام محبہ مکہ کی طرف نکلیں اور ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس داخل ہوئیں اور آپ پر سلام عرض کیا تو آپ نے ہم سے پوچھا: تم کن میں سے ہو؟ ہم نے عرض کی: ہم اہل کوفہ میں سے ہیں۔ اس نے کہا: گویا آپ نے ہم سے اعراض کر لیا۔ پھر ام محبہ نے آپ سے عرض کی: اے ام المومنین! میری ایک کنیز تھی اور میں نے اسے حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو آٹھ سو درہم کے عوض انہیں عطیہ ملنے تک فروخت کر دیا۔ اور پھر انہوں نے اسے بیچنے کا ارادہ کیا تو میں نے ان سے اسے نقد چھ سو درہم کے عوض خرید لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں: پس آپ ہماری طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا: تیری بیع بہت بری ہے اور وہ بھی جو تو نے خریدی ہے۔ اور زید رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام پہنچا دے کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کئے ہوئے جہاد کو باطل کر دیا ہے مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔

پھر اس نے آپ سے عرض کی: آپ کی کیا رائے ہے اگر میں ان سے اپنے راس المال کے سوا اور کچھ نہ لوں؟ تب آپ نے کہا: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ (پس جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ (سود سے) رک گیا تو اس کے لئے ہے جو گزر چکا ہے۔) عالیہ ابو اسحاق ہمدانی کوفی السبیعی کی بیوی اور یونس بن ابی اسحاق کی ماں ہے۔ اور یہ حدیث امام مالک نے بیع الآجال کے بیان میں نقل کی ہے جو آپ سے ابن وہب نے روایت کی ہے۔ پس اگر بیوع میں ایسی شے ہو جو ممنوع تک پہنچنے تک پہنچاتی ہو تو آپ (امام مالک) نے اس بیع سے منع کیا ہے اگرچہ وہ جائز ہو۔ اور جمہور فقہاء نے اس اصل (قیاس) میں امام مالک سے اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: احکام کا دارومدار ظاہر پر ہے نہ کہ ظنون پر۔ اور ہمارے علماء کی دلیل سد ذرائع کے بارے میں قول ہے۔ پس اگر اسے تسلیم کر لیا جائے (تو ٹھیک) ورنہ ہم نے اس کی صحت پر استدلال بیان کیا ہے۔ اور وہ گزر چکا ہے۔ اور یہ حدیث نص ہے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ مذکورہ تنبیہ: یعنی زید: انہ قد ابطل جہادہ مع رسول اللہ الا ان یتوب یہ ارشاد توقیفی ہے۔ کیونکہ قطعاً رائے سے ایسا قول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اعمال کو باطل کرنے کی معرفت بغیر وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور صحیح مسلم (1) میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بے شک حلال واضح اور بیّن

1۔ صحیح مسلم، باب اخذ الحلال وترک الشبہات، حدیث نمبر 50، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور حرام بھی واضح اور بین ہے اور ان دونوں کے درمیان امور مشتبہات ہیں۔ لوگوں میں سے بہت سے انہیں نہیں جانتے پس جو کوئی شبہات سے بچتا رہا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جو کوئی شبہات میں پڑ گیا تو وہ حرام میں واقع ہو گیا، اس چرنے والے کی طرح جو چراگاہ کے ارد گرد چرتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ اس میں واقع (داخل) ہو جائے۔ خبردار! سنو بلاشبہ ہر مالک کے لئے ایک چراگاہ ہے۔ خبردار! سنو اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں"۔ (1)

اور وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ نے محرمات میں واقع ہونے کے خوف سے متشابہات میں پڑنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی ذریعہ کو بند کرنا اور ختم کرنا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک کبائر میں سے یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے۔" صحابہ نے عرض کی: آدمی اپنے والدین کو گالیاں کیسے دے سکتا ہے؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ دوسرے آدمی کے باپ کو گالیاں دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے اور وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے۔" پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریضاً کسی کے والدین کو گالیاں دینے کو اپنے والدین کو گالیاں دینے کی طرح قرار دیا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود پر لعنت فرمائی جب انہوں نے ان (چیزوں) کے ثمن کھائے جن کے کھانے سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ (2)

اور ابو بکر نے اپنی کتاب میں کہا ہے: صدقہ کے خوف سے متفرق اشیاء کو جمع نہیں کیا جائے گا اور مجتمع کو متفرق نہیں کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے درہم کی بیع دراہم کے ساتھ کرنے سے منع کیا ہے جبکہ ان کے درمیان کپڑا ہو۔ اور علماء نے بیع اور قرض کو جمع کرنے سے روکنے پر اتفاق کیا ہے اور اس پر کہ شراب کی قلیل مقدار حرام ہے اگرچہ وہ نشہ نہ بھی لائے اور اس پر کہ اجنبیہ عورت سے خلوت اختیار کرنا حرام ہے اگرچہ وہ عنین ہو اور اس پر کہ نوجوان عورت کے چہرہ کی طرف دیکھنا حرام ہے، علاوہ ازیں بہت سی چیزیں ہیں اور ان کے بارے قطعی اور یقینی علم ہے کہ شریعت نے ان سے بچنے کا حکم دیا ہے، اس لئے کہ وہ محرمات تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اور ربا اس کا زیادہ حق رکھتا ہے کہ اس کی چراگاہ کی حفاظت کی جائے اور اس کے راستوں کو بند کیا جائے۔

اور جنہوں نے ان اسباب کو مباح قرار دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے کنواں کھودنے اور پھندے گاڑنے کو بھی مباح قرار دیں۔ اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے اور یہ بھی کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آدمی کو زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار شے بیچنے کو منع کیا جائے گا بشرطیکہ یہ معروف ہو اور اس کی عادت ہو۔ اور یہ اسی باب کے معنی میں ہے۔ واللہ الموفق للصواب۔

مسئلہ نمبر 22۔ ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "جب تم زیادہ قیمت کے ساتھ ادھار چیزیں بیچنے لگو اور بیلوں کی دمیں پکڑنے لگو اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ اور جہاد چھوڑ دو تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسا رعب اور ذلت مسلط کر دے گا وہ اسے تم سے دور نہیں کرے گا یہاں تک

1۔ صحیح بخاری، [illegible]، حدیث نمبر 1359، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 6529

تک کہ تم اپنے دین کی طرف واپس لوٹ آؤ(1)۔" اس کی اسناد میں ابو عبد الرحمن خراسانی ہے، وہ مشہور راوی نہیں ہے۔

ابو عبید ہروی نے العینہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی اپنا سامان ثمن معلوم کے عوض کسی آدمی کو ایک مقررہ مدت تک ادھار بیچ دے اور پھر اسے اس سے ان ثمنوں سے کم کے عوض خرید لے جتنے کے عوض اسے بیچا تھا۔ فرمایا: اگر کسی نے عینہ کے طالب کی موجودگی میں ایک سامان دوسرے آدمی سے ثمن معلوم کے عوض خریدا اور اس پر قبضہ کر لیا پھر اسے عینہ کے طالب کو اس سے زیادہ ثمن کے عوض مقررہ مدت تک ادھار بیچ دیا جتنے کے عوض اسے خریدا تھا پھر وہ مشتری پہلے بائع سے نقد اس سے کم ثمن کے ساتھ بیچ دے تو یہ بھی عینہ ہے اور یہ پہلے سے زیادہ آسان ہے اور یہ بعض کے نزدیک جائز ہے اور صاحب عینہ کے پاس نقد موجود ہونے کی وجہ سے عینہ کا نام دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ العین سے مراد مال حاضر ہے اور مشتری یقیناً اسے خرید رہا ہے تاکہ وہ اسے حاضر مال کے عوض بیچے جو اسے جلدی مل جائے گا۔

مسئلہ نمبر 23۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جس نے کچھ سامان ایک خاص مدت تک ثمن کے عوض فروخت کیا پھر اسے خرید لیا یہ ثمن کے عوض جو اس ثمن کی جنس میں سے تھے جن کے عوض اسے بیچا تھا تو وہ اس سے خالی نہیں ہے کہ وہ اسے نقد ثمن کے عوض خریدے گا یا اسی مدت تک ادھار یا اس مدت سے کم تک جس تک اس نے اسے بیچا تھا یا اس تک جو اس مدت سے زیادہ تھی، ثمن مثلی کے عوض یا اس سے کم کے عوض یا اس سے زیادہ کے عوض۔ پس یہ تین مسائل ہیں۔ جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے تو اگر وہ مثل ثمن یا اکثر ثمن کے عوض خریدے تو یہ جائز ہے اور کم ثمن کے عوض ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مقتضا کے مطابق جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے چھ سو دے ہیں تاکہ وہ آٹھ سو لے لے اور سامان لغو ہو گیا۔ اور یہی خالص ربا ہے۔ اور رہا تیسرا مسئلہ کہ وہ اس سے زیادہ مدت تک ادھار لے لے، پس اگر اس نے صرف اسے ہی خرید یا کچھ اور بھی تو مثل ثمن یا اقل ثمن کے ساتھ یہ جائز ہوگی، البتہ زیادہ ثمن کے عوض جائز نہ ہوگی۔ اور اگر اس نے اس میں سے بعض حصہ خرید لیا تو پھر کسی حال پر بھی یہ خرید جائز نہ ہوگی نہ مثل ثمن کے ساتھ، نہ اقل کے ساتھ اور نہ ہی اکثر کے ساتھ۔ اس باب کے مسائل کو ہمارے علماء نے ستائیس مسائل میں محصور کیا ہے اور ان کا دار و مدار اسی پر ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ پس تو جان لے۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: فَلَهٗ مَا سَلَفَ یعنی سود کے معاملہ میں سے جو گزر چکا ہے اس پر نہ دنیا میں کوئی مواخذہ ہوگا اور نہ آخرت میں، سدی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے حکم ہے جس نے کفار قریش میں سے اسلام قبول کیا اور بنی ثقیف اور ان میں سے جو وہاں تجارت کرتے تھے (ان میں سے جس نے اسلام قبول کیا) اور سلف کا معنی ہے وہ تمام جو پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ اس میں چار تاویلات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہے کہ سود کا معاملہ اس کی یا دوسری چیزوں کی تحریم کو جاری رکھنے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی النہی عن العینۃ، حدیث نمبر 3003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری یہ کہ ضمیر ما سلف کی طرف لوٹ رہی ہو یعنی جو کچھ گزر چکا ہے اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اسے معاف کرنے کے بارے میں اور اس میں تاوان اور سزا کو ساقط کرنے کے بارے میں۔ اور تیسری یہ ہے کہ ضمیر سود لینے والے (ذی الربا) کی طرف لوٹ رہی ہے، اس معنی میں کہ اس کا معاملہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے کہ وہ اسے اس سے رکنے پر ثابت قدم رکھے یا اسے دوبارہ وہ باشی گناہ کی طرف لوٹا دے۔

اس قول کو نحاس نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے: یہ قول اچھا اور واضح ہے۔ یعنی مستقبل میں اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے اگر وہ چاہے تو اسے تحریم پر ثابت رکھے اور اگر چاہے تو اسے مباح قرار دے۔ اور چوتھی تاویل یہ ہے کہ ضمیر رکنے والے اور باز رہنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو لیکن اسے مانوس کرنے اور خیر اور بھلائی میں اس کی آرزو اور امید پھیلانے کے معنی میں، جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ اطاعت اور خیر کے سپرد ہے اور جیسا کہ تو کہتا ہے: اس کا معاملہ نمو اور توجہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کے سپرد ہے۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ عَادَ یعنی جو فعل ربا کی طرف لوٹ آیا (یعنی وہ پھر دوبارہ سود کھانے لگا) یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حضرت سفیان نے یہ کہا ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسروں نے کہا: جو لوٹا اور اس نے کہا بے شک بیع ربا کی مثل ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اگر ہم یہ کہیں کہ یہ آیت کافر کے بارے میں ہے تو پھر خلود سے مراد حقیقی طور پر ہمیشہ رہنا ہے۔ اور اگر ہم اسے گنہگار مسلمان کے بارے قرار دیں تو پھر خلود کا لفظ بطور مبالغہ کے معنی میں ہوگا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں: ملکًا خالدًا یہ ایسے دوام سے عبارت ہے جو حقیقی طور پر ہمیشہ باقی نہیں رہے گا۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا یعنی اس کی برکت ختم ہو جائے گی اگرچہ وہ زیادہ ہی ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ان الربا وان کثر فعاقبتہ الی قل (بلاشبہ سود اگرچہ بہت زیادہ ہو اس کا انجام قلیل ہی ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے کوئی صدقہ، حج، جہاد اور صلہ رحمی قبول نہیں کرے گا۔

المحق کا معنی النقص والذھاب ہے، کم ہونا یا گھٹنا اور ختم ہونا ہے اور اسی سے محاق القمر یعنی چاند کا گھٹنا بھی ہے۔ وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ یعنی وہ دنیا میں خیرات کو برکت کے ساتھ بڑھاتا ہے اور آخرت میں ان کا ثواب کئی گنا کر کے بڑھا دے گا۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "بے شک تم میں سے کسی کا صدقہ اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہوتا ہے اور وہ اسے اس کے لئے بتدریج بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑی اور گائے کے بچوں کی نشوونما کرتا ہے یہاں تک کہ قیامت کا دن آ جائے گا اور بے شک ایک لقمہ احد پہاڑ کی مثل ہو جائے گا۔"(1)

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الصدقۃ، حدیث نمبر 598، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔

صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، حدیث نمبر 1321، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن زبیر نے یُمْحِقُ یا کے ضمہ اور حا کے کسرہ کو مشدد اور یُرْبِی را کو فتحہ کے ساتھ اور با کو مشدد پڑھا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروی ہے۔

مسئلہ نمبر 28۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ اس میں کفار کی صفت اثیم مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے، اس حیثیت سے کہ دونوں لفظ مختلف ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کفار میں اشتراک کے معنی کو زائل کرنے کے لئے یہ صفت لگائی گئی ہے کیونکہ کبھی اس کا اطلاق اس کسان پر بھی ہوتا ہے جو زمین میں دانا چھپاتا ہے۔ (یعنی کاشت کرتا ہے) ابن فورک نے یہی کہا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ اور نماز اور زکوٰۃ کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا ہے حالانکہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہیں متضمن اور شامل ہے۔ تو یہ ان دونوں کے شرف وعظمت اور ان کی قدر ومنزلت پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ دونوں اعمال کی اصل ہیں، نماز بدنی اعمال کی اصل ہے اور زکوٰۃ مالی اعمال کی اصل ہے۔

مسئلہ نمبر 29۔ قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ظاہر یہ ہے کہ وہ اس سود کو باطل کر دے جس پر قبضہ نہیں ہوا ہے، اگرچہ آیت تحریم کے نازل ہونے سے پہلے اس کا عقد ہو چکا ہو۔ اور جب اس پر قبضہ ہو چکا ہو تو پھر اس کے فسخ کے پیچھے نہ پڑے۔

تحقیق کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی ثقیف کے سبب نازل ہوئی۔ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس پر معاہدہ کیا تھا کہ ان کے سود کا مال جو لوگوں پر ہے تو وہ انہیں کے لئے ہے اور جو لوگوں کا ان پر ہے تو وہ ان سے ختم کر دیا گیا ہے، پھر جب ان کے سود کی مقررہ مدتیں آ پہنچیں تو انہوں نے اہل مکہ کی طرف تقاضا کے لئے (پیغام) بھیجا۔ قرضے بنی عبدہ کے تھے اور وہ بنو عمرو بن عمیر ثقیف میں سے تھے اور یہ بنی مغیرہ مخزومیوں پر تھے۔ اور بنو مغیرہ نے کہا: ہم کوئی شے نہیں دیں گے کیونکہ سود ختم کر دیا گیا ہے۔ اور انہوں نے اپنا معاملہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لکھا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حضرت عتاب رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا اور ثقیف نے بھی اس کے بارے جان لیا اور وہ (سود کا مطالبہ کرنے) سے رک گئے۔ یہی آیت کا سبب نزول ہے اور یہ اس مجموعے کا اختصار ہے جو ابن اسحاق، ابن جریج اور سدی وغیرہم نے روایت کیا ہے اور اس کا معنی یہ ہے تم اپنے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے درمیان کوئی آڑ اور رکاوٹ بنا لو اپنے باقی ربا کو چھوڑ کر اور اس سے درگزر کر کے۔

مسئلہ نمبر 30۔ قولہ تعالیٰ: اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ اس بنا پر ثقیف کے حق میں شرط محض ہے کیونکہ یہ حکم ان کے اسلام میں داخل ہوتے ہی پہلے پہل نازل ہوا۔ اور جب ہم آیت کو ان کے بارے میں مقدر قرار دیں جن کا ایمان پختہ ہو چکا تھا تو پھر یہ مبالغہ کی جہت پر شرط مجازی ہے جیسا کہ تو اس کے بارے میں کہتا ہے جس کی ذات کو تو ابھارنے کا ارادہ رکھتا ہو "اگر تو مرد ہے تو تو اس طرح کر۔" اور نقاش نے مقاتل بن سلیمان سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ اس آیت میں اِنْ بمعنی

اذن ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ مردود ہے اور لغت میں معروف نہیں ہے۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا سے مراد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایمان لانا ہو اور ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لانا مراد ہو، کیونکہ اس کے بغیر پہلا ایمان نفع نہیں دے گا اور یہ اس کے سبب مردود ہے جو آیت کے سبب نزول میں بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یہ وعید ہے اگر انہوں نے سود نہ چھوڑا اور جنگ و قتل کی دعوت دیتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن سود کھانے والے کو کہا جائے گا: جنگ کے لئے اپنے ہتھیار لے لے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے: جو کوئی سود پر قائم رہے اور اس سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ اس سے سود کا مال واپس لے لے، پس اگر وہ باز آ جائے (تو ٹھیک ہے) ورنہ وہ اسے قتل کر دے۔

اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو قتل کی دھمکی دی ہے اور انہیں مباح قرار دیا ہے جہاں بھی وہ پکڑے جائیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اگر تم باز نہ آئے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے والے ہو، یعنی تم ان کے دشمن ہو۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر کسی شہر والوں نے سود پر اسے حلال سمجھتے ہوئے صلح کر لی تو وہ مرتد ہو گئے اور ان کے بارے میں حکم مرتدین کے حکم کی طرح ہوگا۔ اور اگر وہ اسے حلال نہ سمجھیں تو امام وقت کے لئے ان سے جنگ لڑنا جائز ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اعلان فرمایا ہے فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (پھر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے اعلان جنگ سن لیں) اور ابو بکر نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے "فَآذِنُوْا" پڑھا ہے۔ اس معنی کی بنیاد پر کہ تم اپنے سوا کو بتا دو کہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے حالت جنگ میں ہو۔

مسئلہ نمبر 32۔ ابن بکیر نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اے ابا عبداللہ! میں نے ایک آدمی کو نشہ کی حالت میں دیکھا، وہ گانے کی طرح کچھ کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ چاند کو پکڑ لے، سو میں نے کہا میری بیوی کو طلاق اگر ابن آدم (انسان) کے پیٹ میں شراب سے بڑھ کر کوئی بری شے داخل ہوتی ہو۔ تو آپ نے اسے فرمایا: تو واپس چلا جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ پھر وہ دوسرے دن آیا تو آپ نے اسے پھر فرمایا: تو واپس لوٹ جا یہاں تک کہ میں تیرے مسئلہ میں غور و فکر کر لوں۔ وہ پھر تیسرے دن آیا تو آپ نے اسے فرمایا: تیری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے میں نے کتاب اللہ اور حضور نبی کریم ﷺ کی سنت میں خوب چھان بین کی، گہری غور و فکر کی تو میں نے سود سے بڑھ کر کوئی بری شے نہ دیکھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنگ کا اعلان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 33۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ سود کھانا اور اس کے مطابق کاروبار کرنا گناہ کبیرہ میں سے ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے جیسا کہ ہم اسے بیان کریں گے۔

حضور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یاتی علی الناس زمان لا یبقی أحد الا آکل الربا ومن لم یاکل الربا أصابه غباره (لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ سود کھانے والا ہوگا اور جس نے نہ کھایا تو اس کا غبار اس تک پہنچ جائے گا۔)

اور دار قطنی نے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: لدرھم ربا أشد عند اللہ تعالیٰ من ست وثلاثین زنیة فی الخطیئة (سود کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ میں چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ شدید ہے۔)

اور آپ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: الربا تسعة وتسعون بابا أدناها کاتیان الرجل بأمه (1) (سود کے ننانوے دروازے ہیں اور ان میں سے ادنیٰ آدمی کا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کی مثل ہے) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سود کھانے والا، کھلانے والا، اسے لکھنے والا اور اس کی شہادت دینے والا سب پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔

اور امام بخاری نے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (2) کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے خون کے ثمن (قیمت) کتے کے ثمن اور بدکاری کی کمائی سے منع فرمایا ہے اور سود کھانے اور کھلانے والے پر (ہاں) گودنے اور گدوانے والی پر اور تصویر بنانے والے پر لعنت کی ہے۔ نهی رسول الله ﷺ عن ثمن الدم وثمن الکلب وکسب البغی ولعن آکل الربا وموکله والواشمة والمستوشمة والمصور اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو اور ان میں ہے وآکل الربا اور سود کھانے والا۔"

اور مصنف ابی داؤد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اسے لکھنے والے اور اس پر شاہد بننے والے سب پر لعنت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ الآیہ۔ ابو داؤد نے سلیمان بن عمرو سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے (4) کہ انہوں نے کہا: میں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "خبردار! سنو بے شک دور جاہلیت کے سودوں میں سے ہر سود ختم کر دیے گئے ہیں تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہوں گے نہ تم ظلم کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے گا" اور آگے پوری حدیث بیان کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کے ساتھ رجوع راس الاموال کی طرف لوٹا دیا اور انہیں فرمایا: سود لینے میں "تم ظلم نہ کرو" "اور تم پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا" کہ تمہارے راس

1۔ سنن ابن ماجہ، باب التغلیظ فی الربا، حدیث نمبر 2264، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر 2084، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1127، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، باب فی وضع الربا، حدیث نمبر 7898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تو اموال میں سے کوئی شے روک لی جائے اور تمہارے اصول ختم ہو جائیں۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر ٹال مٹول کر کے ظلم نہیں کیا جائے گا، کیونکہ غنی کا ٹال مٹول کرنا بھی ظلم ہے (1)۔ اور یہ بھی معنی ہو کہ فیصلہ سود ختم کرنے کے ساتھ ہی ہوگا اور اسی طرح صلح کا طریقہ ہے اور یہی صلح کے زیادہ مشابہ شے ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کعب بن مالک کی طرف ابن ابی حدرد کے قرض میں نصف ختم کرنے کے بارے اشارہ کیا اور کعب نے کہا: جی ہاں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کو فرمایا: "اٹھو اور اسے ادا کر دو" تو تمام علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر بالقضاء کو مصالحات میں سنت کے طور پر لیا ہے۔ عنقریب سورۃ النساء میں صلح کا بیان آئے گا اور ان کا بھی جن میں صلح جائز ہوتی ہے اور جن میں جائز نہیں ہوتی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 35۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ یہ تاکید ہے کہ (ربا) کو باطل کرنے کی جس پر قبضہ نہیں کیا گیا اور راس المال کو لینے کی جس میں سود نہیں۔ پس بعض علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ ہر وہ شے جو بیع پر قبضہ کرنے سے پہلے ان چیزوں میں سے طاری ہو جو عقد کی تحریم کو ثابت کرتی ہیں تو وہ عقد کو باطل کر دیتی ہیں جیسا کہ جب کوئی مسلمان شکار خریدے پھر مشتری یا بائع قبضہ سے پہلے احرام باندھ لے تو بیع باطل ہو جائے گی، کیونکہ اس پر قبضہ سے پہلے وہ شے طاری ہو چکی ہے جس نے عقد کے حرام ہونے کو ثابت کر دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس (ربا) کو باطل قرار دیا ہے جس پر قبضہ نہیں ہوا، کیونکہ اس پر وہ طاری ہو چکی ہے جس نے قبضہ سے پہلے اس کی تحریم کو ثابت کر دیا ہے اور اگر اس پر پہلے قبضہ کر لیا گیا ہو تو پھر اس پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور یہی امام شافعی کے اصحاب کا بھی قول ہے اور اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ قبضہ سے پہلے بائع کے ہاتھ میں مبیع کا ہلاک ہونا اور مبیع میں قبضہ کا ساقط ہو جانا عقد کے باطل ہونے کو واجب کرتا ہے۔ بخلاف بعض سلف کے اور یہ اختلاف امام احمد سے روایت کیا جاتا ہے۔

اور اس کے قول کے مطابق جاری ہو سکتا ہے جو یہ کہتا ہے: بے شک ربا میں عقد فی الاصل منعقد ہو چکا تھا اور پھر وہ قبضہ سے پہلے طاری ہونے والے اسلام کے سبب باطل ہو گیا۔ اور رہے وہ جنہوں نے اصل میں ربا کے انعقاد کا انکار کیا ہے تو (ان کے نزدیک) یہ کلام صحیح نہیں ہے، وہ یہ کہ سود (تمام) ادیان میں حرام کر دیا گیا ہے اور وہ جو دور جاہلیت میں اس کا کاروبار کرتے تھے تو وہ مشرکین کی عادت تھی اور ربا میں سے جس پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے وہ ان اموال کے قائم ہونے کی جگہ میں ہے جو ان تک غصب اور سلب کے ذریعہ پہنچے ہیں تو اس پر کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ پس اس بنا پر استشہاد صحیح نہیں ہوگا ان مسائل میں جو انہوں نے ذکر کیے ہیں اور ہم سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا ربا کی تحریم پر مشتمل ہونا مشہور ہے اور کتاب اللہ میں مذکور ہے، جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں یہودیوں کے بارے بیان کیا گیا ہے: وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء: 161) (اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ ان کی قوم نے ان کا انکار کیا اور کہا: اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا

1۔ صحیح بخاری، باب الحوالۃ، حدیث نمبر 2125، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یَّعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (ہود: 87) (کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں)

پس اس بنا پر اس سے استدلال درست نہ ہوگا۔ ہاں اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ عقود جو دارالحرب میں واقع ہوں جب امام وقت ان پر غالب آئے تو وہ فسخ کے احکام جاری نہیں کرے گا اگرچہ وہ عقود فاسد ہی ہوں۔

مسئلہ نمبر 36۔ ارباب ورع وزہد میں سے بعض غلو کرنے والوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حلال مال میں جب حرام مال اس طرح مل جائے کہ تمیز ممکن نہ رہے پھر وہ ملے جلے مال میں سے حرام مال کی مقدار مال نکال دے تو پھر بھی (باقی مال) حلال اور پاک نہ ہوگا، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو مال نکالا گیا ہے وہ حلال ہو اور جو باقی ہے وہ حرام ہو۔ ابن عربی نے کہا ہے: یہ دین میں غلو ہے۔ کیونکہ ہر وہ مال جس میں تمیز کرنا (اور اسے علیحدہ علیحدہ کرنا) ممکن نہ رہے تو پھر اس سے مقصود اس کی مالیت ہوتی ہے نہ کہ اس کا عین۔ اور اگر مال ضائع ہو جائے تو پھر اس کی مثل مال اس کے قائم مقام ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے مالوں کا مخلوط ہو جانا اس کی تمیز اور علیحدگی کے اعتبار سے اتلاف اور ضیاع ہی ہے جیسا کہ ہلاک کر دینا اس کے عین (ذات) کے لئے اتلاف اور ضیاع ہے اور مثل ضائع ہونے والے مال کے قائم مقام ہوتی ہے اور یہ حسی اور معنوی طور پر واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علماء نے کہا ہے اموال حرام میں سے جو آدمی کے قبضہ میں ہو اگر وہ سود کا مال ہے تو اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے اس کے پاس واپس کر دے جس پر سود لگایا تھا اور اگر وہ حاضر نہ ہو تو اسے تلاش کرے اور اگر اسے پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر چاہیے کہ وہ اسے صدقہ کر دے۔ اور اگر اس نے وہ مال ظلماً لیا ہو تو جس کے ساتھ اس نے ظلم کیا ہے اس کے ساتھ بھی اسے اسی طرح معاملہ کرنا چاہیے۔ اور اگر اس پر معاملہ مشتبہ ہو جائے اور وہ یہ نہ جان سکے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے اس حلال میں سے حرام کتنا ہے تو جو مال اس کے قبضے میں ہے اس میں سے وہ مقدار تلاش کرے جس کا لوٹانا اس پر واجب ہے، یہاں تک کہ اسے اس میں کوئی شک نہ رہے کہ جو مال باقی ہے وہ خالص اس کا اپنا ہے۔ پس جو مال اس نے اپنے قبضے سے زائل کیا ہے وہ ان لوگوں کو واپس لوٹائے گا جن کے بارے یہ معروف ہو کہ اس نے ان پر ظلم کیا ہے یا ان سے بطور سود لیا ہے اور اگر وہ ایسے آدمی کو پانے سے مایوس ہو جائے تو پھر اس کی طرف سے وہ مال صدقہ کر دے۔

اور اگر مظالم اس کے ذمہ کا احاطہ کئے ہوئے ہوں اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس پر جو کچھ واجب الادا ہے وہ اسے کثیر ہونے کے سبب کبھی بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا تو اس کی توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب اپنی ملکیت سے زائل کر دے، چاہے مساکین کو دے دے اور چاہے تو ایسے کاموں میں خرچ کر دے جو عام مسلمانوں کی منفعت اور صلاح کے لئے ہوں، یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی شے باقی نہ رہے سوائے اس کم سے کم لباس کے جس میں نماز جائز ہوتی ہے اور وہ اتنا کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ سکے اور وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہے۔ اور ایک دن کی خوراک (باقی رہ جائے) کیونکہ یہ وہ مقدار ہے جو اضطراری حالت میں دوسرے کے مال سے لینا واجب ہوتی ہے اگرچہ وہ اسے ناپسند کرے جس سے وہ لے رہا ہے۔ اور اکثر علماء کے قول کے مطابق یہاں مفلس علیحدہ اور جدا ہو گیا، کیونکہ مفلس کے پاس لوگوں کے

ڈالی جانے والی، کیونکہ یہ طعام کے بدلے طعام ادھار بیچنے کے معنی میں ہے اور اسی طرح یہ زمین کا کرایہ ان کے نزدیک اس شے سے دینا بھی جائز نہیں ہے جو زمین سے نکلے گی اگرچہ وہ کھایا اور پیا جانے والا طعام نہ بھی ہو سوائے لکڑی نکالنے اور اچھی زمین کی لکڑی کے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ بیع مزابنہ کے معنی میں ہے۔ (بیع مزابنہ سے مراد بغیر کیل اور وزن کے صرف اندازے کے ساتھ کسی شے کی بیع کرنا ہے) یہی وہ ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب سے محفوظ ہے۔

اور ابن سحنون نے مغیرہ بن عبدالرحمن مخزومی مدنی سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ زمین کو اس اناج کے عوض کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو اس سے نہ پیدا ہوتا ہو اور یحییٰ بن عمر نے مغیرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ تمام اصحاب مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور ابن حبیب نے ذکر کیا ہے کہ ابن کنانہ کہتے تھے: زمین کو ایسی شے کے عوض کرایہ پر نہیں دیا جائے گا کہ جب وہ شے زمین میں لوٹائی جائے تو وہ اگ پڑے۔ اور اس کے سوا تمام ایسی اشیاء کے عوض کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو کھائی جاتی ہوں اور ان کے عوض جو نہ کھائی جاتی ہوں چاہے وہ زمین سے پیدا ہوں یا نہ ہوں۔ اور اسی طرح یحییٰ بن یحییٰ نے بھی کہا ہے اور کہا ہے: بے شک یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں سے ہے۔ (ابن حبیب نے) کہا ہے اور ابن نافع کہا کرتے تھے: زمین کو طعام وغیرہ میں سے ہر شے کے عوض کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جو زمین سے پیدا ہو یا نہ پیدا ہو ما سوائے گندم اور اس جیسی اجناس کے، کیونکہ یہ محاقلہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ (اور محاقلہ سے مراد کھیتی کو پکنے سے پہلے فروخت کر دینا ہے۔)

اور امام مالک نے الموطا میں کہا ہے: وہ آدمی جو اپنی سفید زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ثلث اور ربع کے عوض دے دیتا ہے تو یہ اس میں سے ہے جس میں دھوکہ داخل ہے کیونکہ پیداوار ایک بار کم ہوتی ہے اور دوسری بار زیادہ ہوتی ہے اور بسا اوقات بالکل کچھ بھی نہیں ہوتا تو زمین کا مالک مقررہ کرایہ ترک کرنے والا ہو جائے گا۔ بے شک اس کی مثال اس آدمی کی مثل ہے جس نے کسی مزدور کو معین شے کے عوض سفر کے لئے اجرت پر لیا پھر مستاجر نے اجیر کو کہا: میں اپنے اس سفر سے جو نفع حاصل کروں گا اس کا دسواں حصہ تجھے دوں گا یہ تیرے لئے اجرت ہوگی۔ تو یہ حلال نہیں ہے اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

امام مالک نے کہا ہے: کسی آدمی کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو، اپنی زمین کو، اپنی کشتی کو اور اپنے جانور کو اجرت پر دے مگر ایسی معلوم شے کے عوض جو زائل اور ہلاک نہ ہو اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ان دونوں کے اصحاب رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل، لیث، ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے: کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک خاص جز مثلاً ثلث اور ربع وغیرہ کی شرط پر دے دے۔ یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور انہوں نے خیبر کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے باسیوں کو ان کی اپنی زمینوں پر ان سے حاصل ہونے والی پیداوار اور پھلوں میں سے نصف کی شرط پر عامل مقرر کیا۔ امام احمد نے کہا ہے کہ کھیت کے کرائے سے نہی کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب

الالفاظ ہے اور وہ صحیح نہیں ہے اور قصہ خیبر کے بارے قول اولیٰ اور ارجح ہے اور وہ حدیث صحیح ہے۔(1)

تابعین کی ایک جماعت اور ان کے بعد آنے والوں نے اسے جائز قرار دیا ہے کہ آدمی اپنی کشتی اور اپنی سواری کسی کو دے جس طرح کہ وہ اپنی زمین اس جز کے بدلے دیتا ہے جو اس پیداوار میں سے ہو جو اللہ تعالیٰ اسے محنت کے سبب عطا فرمائے گا۔ اور انہوں نے اس میں اپنی اصل اور بنیاد اس مضاربت کو بنایا ہے جس پر اجماع ہے۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ المزمل میں اس ارشاد کے تحت آئے گا: وآخرون يضربون في الارض يبتغون من فضل الله۔

اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول کے بارے کہا ہے کہ ہم بٹائی پر کھیتی کرتے تھے اور ہم اس میں کوئی حرج نہ دیکھتے تھے یہاں تک کہ ہمیں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، یعنی ہم زمین اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے بعض کے عوض کرائے پر دیتے تھے۔ امام شافعی نے فرمایا: اس میں قصہ خیبر والی حدیث کا نسخ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو شے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نسخ کے بارے قول کو صحیح قرار دیتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے ائمہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ دارقطنی کے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ (پکنے سے پہلے کھیتی فروخت کر دینا) مزابنہ (اندازے سے بیچ کرنا) مخابرہ (بٹائی پر کھیتی کا کام کرنے) اور الثنیا (عقد بیع کے وقت مبیع میں سے مجہول شے کی استثنا کر دینا) سے منع فرمایا ہے مگر یہ کہ (جس شے کی استثنا کی گئی ہے) وہ معلوم ہو۔ یہ روایت صحیح ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے(2) کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ میں نے پوچھا۔ مخابرہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تو زمین نصف یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض لے لے۔

مسئلہ نمبر 38۔ یہ قراءتوں کے بیان میں ہے۔ جمہور نے ما بقی میں یا کو متحرک پڑھا ہے اور حسن نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اسی کی مثل جریر کا قول ہے:

هو الخليفة فارضوا ما رضي لكم ماضي العزيمة ما في حكمه جنف

اور عمر بن ربیعہ نے کہا ہے:

كم قد ذكرتك لو أجزى بذكركم يا أشبه الناس كل الناس بالقمر
إني لأجذل أن أمسي مقابله حبا لرؤية من أشبهت في الصور

اس کی اصل ما رضی اور ان أمسی ہے۔ اور انہوں نے انہیں سکون دیا ہے اور شعر میں ایسا کثرت سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں یا کو الف کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو جس طرح الف پر حرکت نہیں آ سکتی تو اسی طرح یہاں یا پر بھی حرکت نہیں آ سکتی۔ اور اس لغت میں سے جس کی طرف دعوت دینا میں پسند کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ میں تجھے اس کی نصیحت

1۔ صحیح بخاری، باب اذا لم یشترط السنین فی المزارعۃ، حدیث نمبر 2161، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب فی المخابرۃ، حدیث نمبر 2958، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرد یں وہ واؤ اور یا کو ساکن کرتا ہے۔ حسن نے ما بقی الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لغت طی ہے۔ وہ جاریہ کے لئے جاراۃ اور ناصیہ کے لئے : ناصاۃ بولتے ہیں۔ اور شاعر کا قول ہے:

لعمرك لا أخشى التصعلك ما بقي　　على الأرض قيسيّ يسوق الأباعرا

ابو السمال نے تمام قراء کے درمیان سے من الربوا مشددہ کے کسرہ، با کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو الفتح عثمان بن جنی نے کہا ہے: دو اعتبار سے یہ حرف شاذ ہے: ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں کسرہ سے ضمہ کی طرف خروج ہے اور دوسرا اس اعتبار سے کہ اس میں اسم کے آخر میں ضمہ کے بعد واؤ واقع ہے اور مہدوی نے کہا ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے الف کو یہ پڑھا ہے تو وہ اس سے اس واؤ کی طرف جھک گئی جس سے الف ہے اور سوائے اس وجہ کے کسی پر اسے محمول نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کلام میں کوئی اسم نہیں جس کے آخر میں واؤ ساکن ہو اور اس سے پہلے ضمہ ہو۔ کسائی اور حمزہ نے الربا میں کسرہ کے ثقل کی وجہ سے امالہ کیا ہے۔ اور باقیوں نے با کے فتح کی وجہ سے اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔

ابو بکر نے عاصم اور حمزہ سے فاذنوا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (یعنی تم دوسروں کو آگاہ کر دو) اور باقیوں نے فأذنوا پڑھا ہے یعنی تم آگاہ ہو جاؤ۔ (ی کہتا سمعی اذن) یہ تیرے اس قول سے ہے: اذن علم (میں جانتا ہوں) اسے ابو عبید نے اصمعی سے بیان کیا ہے۔ اور اہل لغت نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: أذنت به اذنا، یعنی میں نے اس کے بارے جان لیا۔ اور مفسرین میں سے حضرت ابن عباس، مجاہد وغیرہ نے کہا ہے: فاذنوا کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنگ یقینی سمجھو۔ اور یہ معنی الاذن ہے اور ابو علی وغیرہ نے قرأۃ المد کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے: کیونکہ جب انہیں ان دوسروں کو خبردار کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے تو انہیں تو لامحالہ انہوں نے آگاہی بتایا۔ مزید کہا: ان کے بتانے میں ان کا علم ہے اور ان کے علم میں ان کا اعلام (بتانا) نہیں ہے۔ اور علامہ طبری نے قرأۃ القصر کو ترجیح دی ہے، کیونکہ یہ ان کے ساتھ مختص ہے۔ بے شک انہیں مد کی قرأت پر اپنے سوا آگاہ کرنے کے بارے حکم دیا گیا ہے اور تمام قراء نے لا تظلمون تا کے فتح کے ساتھ اور ولا تظلمون تا کے ضمہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور مفضل نے عاصم سے لا تظلمون، ولا تظلمون یعنی پہلی میں تا کو ضمہ کے ساتھ اور دوسرے میں تا کو فتح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور ابو علی نے کہا ہے: جماعت کی قرأت ترجیح پاتی ہے کیونکہ یہ وان تبتم کے قول سے مناسبت رکھتی ہے اس میں کہ دونوں فعلوں کی اسناد فاعل کی طرف ہے اور تظلمون تا کے فتح کے ساتھ بھی آتا ہے اور یہ اپنے ماقبل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک، اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم جانتے ہو"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ جب اللہ تعالیٰ نے سود لینے والوں کو ان کے اصل اموال کے

بارے حکم فرمایا اور آ نہی لیکن وہاں کے پاس ہو جو مال کو پانے والے ہوں تو تنگدستی کی حالت میں خوشحال ہونے تک مہلت دینے کا ارشاد فرمایا اور وہ یہ کہ ثقیف نے جب اپنے ان اموال کا مطالبہ کیا جو بنی مغیرہ پر قرض تھے تو بنی مغیرہ نے تنگدستی کا عذر پیش کیا اور کہا: ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے اور انہوں نے اپنے پھلوں کے تیار ہونے کے وقت تک مہلت کا مطالبہ کیا۔ تب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ۔(1)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ اس ارشاد کے ساتھ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ صاحب قرض کے اپنے مدیون (مقروض) سے مطالبہ کے ثبوت اور اس کی رضا کے بغیر اس کا مال لینے کے جائز ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ غریم جب امکان کے باوجود قرض ادا کرنے سے رکا رہے تو وہ ظالم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اپنے راس المال کے مطالبہ کو جائز قرار دیا ہے تو جب اس کے لئے مطالبہ کا حق ہے تو پھر وہ جس پر قرض ہے لامحالہ اسے ادا کرنا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ مہدوی اور بعض علماء نے کہا ہے یہ آیت اس طریقہ اور رواج کے لئے ناسخ ہے جو زمانہ جاہلیت میں تنگدست کو بیچنے کے بارے میں تھا اور مکی نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کرم ﷺ نے ابتدائے اسلام میں اس کے بارے حکم فرمایا تھا۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: پس اگر حضور نبی کرم ﷺ کا فعل ثابت ہے تب تو یہ نسخ ہے ورنہ یہ نسخ نہیں ہے(2)۔

امام طحاوی نے کہا ہے: ابتدائے اسلام میں قرض میں آزاد آدمی کو بیچ دیا جاتا تھا جب اس کے پاس اتنا مال نہ ہوتا جسے وہ اپنے قرض میں ادا کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور ارشاد فرمایا: وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ اور انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دار قطنی نے مسلم بن خالد زنجی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہمیں زید بن اسلم نے ابن البیلمانی سے اور انہوں نے سرق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کا مجھ پر کچھ مال تھا یا کہا مجھ پر قرض تھا۔ پس وہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گیا اور آپ نے میرے لئے کوئی مال نہ پایا تو آپ نے مجھے اس سے بیچ دیا یا فرمایا اس کے لئے فروخت کر دیا۔ بزار نے اسے اس سے طویل سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور مسلم ابن خالد الزنجی اور عبدالرحمن بن البیلمانی دونوں قابل حجت نہیں ہیں اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا ہے: ارشاد باری تعالیٰ: فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ تمام لوگوں کے لئے عام ہے پس ہر وہ جو تنگدست ہو اسے مہلت دی جائے۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ، حسن اور عام فقہا رحمہم اللہ کا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے سب سے اچھا قول حضرت عطاء، ضحاک اور ربیع بن خثیم کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر تنگدست کے لئے ہے کہ اسے ربا اور تمام قرضوں میں مہلت دی جائے گی اور یہ قول تمام اقوال کو جامع ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ آیت عام ناسخ ہو ربا کے بارے میں نازل ہوئی ہو پھر دوسرے قرضوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 376
2۔ ایضاً

کا حکم بھی اس کے حکم کی طرح ہو گیا ہو۔ اور اسی لئے بعض کے رفع کے ساتھ قرأت اسی معنی میں ہے وان وقعنا ذو عسرۃ من الناس اجمعین (اور اگر تمام لوگوں میں سے مقروض تنگدست واقع ہو۔)

اور حضرت ابن عباس اور شریح رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ آیت ربا کے بارے میں خاص ہے اور رہے قرضے اور دیگر تمام معاملات تو ان میں مہلت نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ان کے مالکوں کو ادا کرے گا یا اس سے اسے محبوس کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اسے پورا کر دے اور یہی ابراہیم کا قول ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ (النساء: 58) (بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں۔)

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس پر مرتب ہوتا ہے جب فقر و افلاس شدید اور تنگی درپیش ہو کرنے الا نہ ہو اور اگر وہ اس کے فقدان اور فقر کی حالت بالکل صریح اور واضح ہو تو پھر بالضرور اس کے لئے مہلت کا حکم ہوگا (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ جس آدمی کے قرض زیادہ ہوں اور اس کے قرض خواہ اپنے مال کا مطالبہ کریں تو حاکم کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے اپنے کل مال سے فارغ کر دے اور اس کے لئے اتنا مال چھوڑ دے جو اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کر سکے۔ ابن نافع نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کے لئے کچھ نہیں چھوڑے گا مگر صرف اتنا جو اسے ڈھانپ سکتا ہو۔ اور مشہور یہ ہے کہ وہ اس کے لئے اتنا روزینہ لباس چھوڑ دے گا جس میں کوئی شے فالتو اور اضافی نہ ہو اور اس سے اس کی چادر نہیں کھینچی جائے گی بشرطیکہ وہ اسے بطور تہبند پہنتا ہو۔ اور اس کی بیوی کا لباس چھوڑنے میں اور اگر وہ عالم ہے تو اس کی کتابیں فروخت کرنے میں اختلاف ہے۔ اس کے لئے نہ گھر چھوڑا جائے گا اور نہ خادم اور نہ ہی جمعہ کا لباس چھوڑا جائے گا جبکہ اس کی قیمت کم نہ ہو اور اس وقت اسے محبوس کرنا حرام ہوتا ہے اور اس میں اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور الفاظ مسلم شریف کے ہیں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی کو ان پھلوں میں نقصان ہو گیا جو اس نے خریدے تھے تو اس کا قرض بہت بڑھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تصدقوا علیہ تم اس پر صدقہ کرو پس لوگوں نے اس کے لئے صدقہ دیا لیکن وہ اس مقدار کو نہ پہنچ سکا جس سے اس کا قرض پورا ہو سکتا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قرض کا مطالبہ کرنے والوں کو فرمایا: خذوا ما وجدتم ولیس لکم الا ذالک (تم جو پاؤ وہ لے لو اور تمہارے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔) اور مصنف ابی داؤد میں ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرض خواہ (قرض کا مطالبہ کرنے والے) کے لئے یہ زائد نہیں کہا کہ "وہ ان کے لئے اپنا مال چھوڑ دے" اور یہ نص ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو محبوس کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا اور وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے جیسا کہ شریح نے کہا ہے اور نہ ہی اسے لازم پکڑنے (یعنی اس کے ساتھ ساتھ رہنے) کا حکم فرمایا، بخلاف امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کیونکہ انہوں نے کہا ہے: وہ اس کے ساتھ ساتھ رہیں گے کیونکہ ممکن ہے اس کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 377

مال ظاہر ہو جائے اور قرض خواہ اسے مال کی مقدار کا پابند نہیں کر سکے گا اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک، شافعی، ابو حنیفہ وغیرہم رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مفلس کو قید کیا جائے گا یہاں تک کہ اس کے پاس مال کا نہ ہونا ظاہر ہو جائے اور امام مالک کے نزدیک اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس پر یہ تہمت نہ ہو کہ اس نے اپنا مال غائب کر دیا ہے اور اس کا جھگڑا ہونا بھی ظاہر نہ ہو اور اسی طرح اسے محبوس نہ کیا جائے گا اگر اس کی تنگدستی درست ہو جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر مفلس کا مال جمع کر لیا جائے پھر وہ قرض کا مطالبہ کرنے والوں تک پہنچنے سے پہلے اور بیع سے پہلے ضائع ہو جائے تو مفلس پر اس کی ضمانت ہوگی اور قرض خواہوں کا قرض اس کے ذمہ ثابت رہے گا اور اگر حاکم نے اس کا مال فروخت کر دیا اور اس کے ثمن پر قبضہ کر لیا پھر قرض خواہوں کے قبضہ سے پہلے وہ ثمن ضائع ہو گئے تو اس کی ضمانت ان پر ہوگی اور مفلس اس سے بری الذمہ ہوگا اور محمد بن عبد الحکم نے کہا ہے اس کی ضمانت ہمیشہ مفلس سے ہی ہوگی یہاں تک کہ وہ غرماء تک پہنچ جائے۔

مسئلہ نمبر 7۔ العسرة کا معنی ہے مال نہ ہونے کی جہت سے حال کا تنگ ہونا اور اسی سے جیش عسرة ہے۔ (یعنی وہ لشکر جس کے پاس مالی حالت تنگ تھی۔) اور النظرة کا معنی التاخیر (مہلت دینا) ہے۔ اور میسرة مصدر بمعنی الیسر (خوشحال ہونا) ہے۔ اور ذو اس کان تامہ کی وجہ سے مرفوع ہے جس کا معنی وجد اور حدث ہے۔ یہ سیبویہ اور ابو علی وغیرہما کا قول ہے۔ اور سیبویہ نے کہا ہے:

فدی لبنی ذهل بن شيبان ناقتي ... اذا كان يوم ذو كواكب اشهب

اور نصب بھی جائز ہے۔ مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ میں ہے وَإِنْ كَانَ ذَا عُسْرَةٍ اس معنی کی بنا پر "کہ اگر مطلوب (مقروض) تنگدست ہو" اور اعمش نے وَإِنْ كَانَ مُعْسِرًا فَنَظِرَةٌ پڑھا ہے۔ ابو عمرو الدانی نے احمد بن موسیٰ سے روایت کیا ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے۔ نحاس، مکی اور نقاش نے کہا ہے: اس قراءت پر آیت کا تعلق ربا کے ساتھ مختص ہو جائے گا اور جمہور نے ذو پڑھا ہے ان کی قراءت کے مطابق یہ آیت ان تمام کے بارے میں عام ہے جن پر قرض ہو اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور مہدوی نے بیان کیا ہے کہ مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں فإن كان ذو عسرة فا کے ساتھ ہے اور معتمر نے حجاج الوراق سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں وإن كان ذا عسرة ہے۔ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے اور جماعت کی قراءت نظرة ظا کے کسرہ کے ساتھ ہے اور مجاہد، ابو رجاء اور حسن نے فَنَظْرَةٌ ظا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور وہ یہی ہیں جو کہتے ہیں: قد كرم زيد، بمعنی كرم زيد اور وہ کہتے ہیں كبد بمعنی كبد۔ اور اکیلے نافع نے ميسرة سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

نحاس نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے فَنَاظِرُهُ إِلَى مَيْسُرِهِ حکایت کیا ہے یعنی صیغہ امر اور میسرہ میں سین کا ضمہ اور ہا کو کسرہ اور

کلام میں یاء کو ثابت رکھتے ہوئے بیان کیا ہے۔ اور فنظرۃ بھی پڑھا گیا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: فنظرۃ جائز نہیں ہے۔ سورۃ النحل میں ہے، کیونکہ وہ ایک عورت ہے جس نے اس کے ساتھ اپنی ذات کے بارے کلام کیا ہے۔ یہ نظرت تنظر نہی ناظرۃ سے ہے اور جو سورۃ البقرہ میں ہے وہ التاخیر بمعنی مہلت دینا سے ہے۔ یہ تیرے اس قول سے ہے۔ انظرتک بالدین یعنی میں نے تیرا قرض مؤخر کر دیا ہے اور اسی سے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ (الحجر) (پھر مہلت دے مجھے اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے) ابو اسحاق الزجاج نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے: یہ مصادر کے اسماء میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (واقعہ) (نہیں ہو گا جب یہ برپا ہو گی (اسے) کوئی جھٹلانے والا) اور اسی طرح یہ ارشاد ہے۔ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ (القیامۃ) (خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہو گا) اور اسی طرح خائنۃ الاعین وغیرہ ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَأَنْ تَصَدَّقُوا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر خیرٌ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ تنگدست پر صدقہ کرنے کو مستحب قرار دیا ہے اور اسے مہلت دینے کہ اسے بہتر بنا دیا ہے۔ سدی، ابن زید اور ضحاک نے بھی کہا ہے۔

اور علامہ طبری نے کہا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارا غنی اور فقیر پر صدقہ کرنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور پہلا قول صحیح ہے اور آیت میں غنی داخل نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ بن خصیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس نے تنگدست مقروض کو مہلت دی اس کے لئے ہر دن کے عوض صدقہ (کا ثواب) ہے۔" پھر میں نے عرض کی (کیا) ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر دن کے عوض صدقہ ہے جب تک قرض کی ادائیگی کا وقت نہ پہنچے اور ادائیگی کا وقت آ جانے کے بعد اگر اس نے اسے مؤخر کر دیا تو اس کے لئے ہر دن کے عوض اس کی مثل صدقہ (کرنے کا ثواب) ہے۔"

اور مسلم نے حضرت ابو مسعود سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک آدمی کا محاسبہ کیا گیا تو اس کے لئے خیر اور نیکی میں سے کوئی شے نہ پائی گئی سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرتا تھا اور خوشحال تھا تو وہ اپنے غلاموں کو حکم دیتا تھا کہ وہ تنگدست سے چشم پوشی کریں، اسے معاف کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا: ہم اس سے زیادہ اس کا حق رکھتے ہیں کہ ہم اسے معاف کر دیں۔"

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے مقروض کو تلاش کیا تو وہ آپ سے چھپ گیا پھر آپ نے اسے پا لیا تو اس نے کہا: بلاشبہ میں تنگدست ہوں۔ آپ نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کی قسم۔ اس نے کہا: (ہاں) اللہ کی قسم۔ تو آپ نے بیان کیا: بلاشبہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان فرماتے ہوئے سنا ہے: من سرہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفس عن معسر او یضع عنہ (جسے یہ شے خوش کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے یوم قیامت کی تکالیف سے نجات عطا فرمائے تو

اور یہ آیت تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے اور ایسا حکم ہے جو ہر انسان کے ساتھ خاص ہے۔ اور یوما مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے نہ کہ ظرف ہونے کی بنا پر۔ ترجعون فیہ الی اللہ یہ اس کی صفت ہے۔

ابو عمرو نے اسے تا کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے: اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿ (الغاشیہ) (بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔) اور حضرت ابی بن کعب کی قرأت پر قیاس کرتے ہوئے یوما تصیرون فیہ الی اللہ (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹو گے۔) اور باقیوں نے اسے تا کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مثلاً ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (انعام: 62) (پھر لوٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف) وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ (اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا) اور یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے اعتبار سے ہے۔ یوما تردون فیہ الی اللہ (یعنی وہ دن جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

اور حسن نے یرجعون یا کے ساتھ پڑھا ہے یہ اس معنی کی بنا پر ہے کہ تمام لوگ لوٹائیں جائیں گے۔

ابن جنی نے کہا ہے: گویا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ اس بنا پر نرمی اور مہربانی فرمائی کہ وہ ان کی طرف رجعت کے ذکر کے ساتھ متوجہ ہوا کیونکہ یہ ان میں سے ہے جس کے ساتھ دل پھٹنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: وَاتَّقُوْا يَوْمًا پھر رجعت کے ذکر میں ان کے ساتھ انتہائی نرمی فرماتے ہوئے غیب کی طرف رجوع فرمایا اور جمہور علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ دن جس سے ڈرایا گیا ہے یہ قیامت قائم ہونے، حساب و کتاب اور پوری پوری جزا ملنے کا دن ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے: اس سے مراد موت کا دن ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: آیت کے الفاظ کے حکم کے مطابق پہلا قول زیادہ صحیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِلَى اللّٰهِ میں مضاف محذوف ہے۔ اس کی تقدیر عبارت ہے الی حکم اللہ و فصل قضائه (یعنی تم لوٹائے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقدیر کے فیصلے کی طرف) وَهُمْ یعنی جمع ضمیر کل کے معنی پر محمول ہے نہ کہ لفظ پر۔ مگر حسن کی قرأت میں یرجعون ہے تو اس کے مطابق وھم میں ضمیر یرجعون میں جمع ضمیر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور اس آیت میں اس پر نص ہے کہ ثواب اور عقاب کسب اعمال کے متعلق ہیں اور یہ جبریہ کا رد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ
كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ

کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہے جیسا کہ امام مالک نے کہا ہے، کیونکہ انہوں نے قرض اور تمام عقود مداینات میں کوئی فرق نہیں کیا۔ اور شوافع نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے: اس آیت میں تمام قرضوں میں تاجیل کے جواز پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلاشبہ اس میں گواہ بنا لینے کا حکم ہے جب وہ دین مؤجل ہو، پھر دین میں تاجیل کے جواز اور اس کے ممتنع ہونے کے بارے دوسری دلیل سے جانا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِدَیْنٍ یہ تاکید ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: وَلَا طٰٓىِٕرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ (انعام: 38) (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے) فَسَجَدَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۝ (الحجر) (پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے) اور دین کی حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت ہے ہر اس معاملہ سے جس میں دو عوضوں میں سے ایک نقد ہو اور دوسرا دوسرے کے ذمہ ادھار ہو، کیونکہ عربوں کے نزدیک عین وہ ہے جو حاضر ہو اور دین وہ ہے جو غائب ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَعَدْتَنَا بِدِرْهَمَيْنَا طِلَاءً ... وَشِوَاءً مُعَجَّلًا غَيْرَ دَيْنِ

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

لِتَرْمِ بِيَ الْمَنَايَا حَيْثُ شَاءَتْ ... إِذَا لَمْ تَرْمِ بِي فِي الْحَلْقَتَيْنِ

إِذَا مَا أَوْقَدُوْا حَطَبًا وَنَارًا ... فَذَاكَ الْمَوْتُ نَقْدًا غَيْرَ دَيْنِ

تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس معنی کو اپنے اس قول حق کے ساتھ بیان کیا ہے اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ابن منذر نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اس پر دلیل ہے کہ بیع سلم کرنا مجہول مدت تک جائز نہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی کتاب اللہ کے معنی کی مثل پر دلیل ہے۔ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور وہ پھلوں میں قرض دو تین سال کے لئے لیا کرتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو کوئی کھجوروں کے عوض قرض کسی کو دے تو اسے چاہیے کہ وہ معین کیل اور وزن، معین مدت تک قرض دے" (1)۔

اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اسے بخاری، مسلم وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اہل جاہلیت کے لوگ اونٹوں کے گوشت کی بیع اونٹنی کے حمل کے حاملہ ہونے تک کرتے تھے حبل الحبلہ کا معنی ہے کہ اونٹنی بچہ جنے پھر وہ حاملہ ہو جو جنا گیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع فرمایا (2)۔ اہل علم میں سے وہ تمام جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ان کا اس پر اجماع ہے کہ جائز بیع سلم وہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے ساتھی کے ساتھ ایسے طعام (اناج) کی بیع سلم کرے جس کی مقدار معلوم ہو اور وصف بھی معلوم ہو، وہ عام زمین کے اناج میں سے ہو جس کی مثل میں وہ غلطی اور خطا نہ کرے، معین کیل کے ساتھ، مدت معلومہ تک معلوم دنانیر یا دراہم کے عوض، جو وہ اسے مسلم فیہ کے بدلے دے گا وہ ان

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم، حدیث نمبر 2085، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، باب السلم الی تنتج الناقۃ، حدیث نمبر 2086، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس جب دونوں ہی حاجت میں مشترک ہیں تو دونوں کے لئے اس معاملہ میں رخصت دی گئی ہے عرایا اور دیگر اصول حاجات ومصالح پر قیاس کرتے ہوئے۔

اور رہی دوسری شرط تو وہ یہ ہے کہ اس کی صفت بیان کی گئی ہو۔ یہ متفق علیہ ہے اور اسی طرح تیسری شرط بھی ہے اور اندازہ تین وجہوں سے ہو سکتا ہے۔ کیل (ماپ) وزن اور عدد۔ اور اس کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے اور وہ یا تو لوگوں کا عرف ہوگا یا عرف شرعی ہوگا۔

اور رہی چوتھی شرط تو وہ یہ ہے کہ مسلم فیہ موجل ہو اور اس میں اختلاف ہے پس امام شافعی نے کہا ہے: بیع سلم حال جائز ہوتی ہے اور اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

ابن عربی نے کہا ہے: مدت مقرر کرنے میں مالکیہ مضطرب ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اسے ایک دن کی طرف لوٹا دیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے بعض علماء نے کہا ہے: بیع سلم حال جائز ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں تاجیل (مدت مقررہ) کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مبیع کی دو قسمیں ہیں: معجل اور وہ معین ہے اور دوسری موجل، پس اگر بیع سلم حال ہو اور مسلم الیہ کے پاس اس وقت موجود ہو تو بیع ما لیس عندک کے باب سے ہو جائے گی۔ پس مدت کا مقرر ہونا اور مہلت ہونا ضروری ہے تا کہ ہر عقد اپنی صفت اور اپنی شرائط کے مطابق خالص ہو۔ اور اس میں احکام شرعیہ جاری ہو سکتے ہوں۔

اور ہمارے علماء کے نزدیک اس کی ابتدائی مدت ہے جتنی مدت میں منڈیاں متغیر ہوتی رہتی ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی: إلى أجل معلوم یہ بیع سلم کہنے والے کے قول سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: سلم حال میں سے ہمارے علماء نے جسے جائز قرار دیا ہے وہ وہ ہے جس کا بھاؤ شہروں میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ پس سلم ان چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن میں اور اس کے درمیان ایک دن یا دو دن یا تین دن باقی ہوں۔ اور رہا ایک ہی شہر تو اس میں جائز نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا بھاؤ ایک ہی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اور رہی پانچویں شرط اور وہ یہ ہے کہ اجل معلوم ہو تو امت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجل (مدت کے تعین) کے بارے فرمایا ہے۔

اور امام مالک فقہائے امصار میں سے اس میں منفرد ہیں کہ پاک توڑنے اور فصل کاٹنے کے وقت تک بیع سلم جائز ہے۔ کیونکہ انہوں نے اسے مدت معلوم ہی قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: یسئلونك عن الاھلة کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

اور رہی چھٹی شرط تو وہ یہ ہے کہ ادائیگی کے وقت وہ موجود ہو تو اس میں بھی امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں اور اگر مدت پوری ہونے پر اس کی مبیع ناپید ہو جائے تو تمام علماء کے نزدیک عقد فسخ ہو جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ بیع سلم کی شرائط میں سے یہ نہیں ہے کہ مسلم الیہ مسلم فیہ کا مالک ہو بخلاف بعض سلف کے

کیونکہ امام بخاری نے محمد بن مجالد سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ عبداللہ بن شداد اور ابو بردہ نے مجھے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی طرف بھیجا اور ان دونوں نے کہا: ان سے پوچھو کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے زمانہ میں گندم میں بیع سلم کرتے تھے؟ تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم شام کے رہنے والے کسانوں سے گندم، جو اور زیتون میں معلوم کیل کے ساتھ معلوم مدت تک بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے کہا: کون ہے جس کے پاس اس کی اصل ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہم اس کے بارے ان سے سوال کرتے رہے پھر ان دونوں نے مجھے عبدالرحمن بن ابزی کی طرف بھیجا سو میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کے عہد مقدس میں بیع سلم کرتے تھے اور ہم ان سے نہ پوچھتے کیا ان کی کھیتی ہے یا نہیں (1)؟ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عقد کے وقت سے لے کر مدت مقررہ تک مسلم فیہ کا پایا جانا شرط قرار دیا ہے، اس خوف کی وجہ سے کہ مسلم فیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ نہ پائی جائے تو وہ دھوکہ اور نقصان ہوگا۔ اور تمام فقہاء نے آپ کی مخالفت کی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ مدت مقررہ مکمل ہونے کے وقت اس کے موجود ہونے کا لحاظ رکھا جائے گا۔

علمائے کوفہ اور ثوری نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر مسلم فیہ ایسی شے ہو جس کا بوجھ ہو اور اسے اٹھانے میں مشقت ہو تو پھر محل قبض کا ذکر کیا جائے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جب مسلم فیہ سپرد کرنے کی جگہ کا ذکر نہ کیا گیا تو بیع سلم فاسد ہوگی۔ اور اوزاعی نے کہا ہے: وہ مکروہ ہوگی۔ اور ہمارے نزدیک اگر وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے تو عقد فاسد نہ ہوگا اور محل قبض متعین ہو جائے گا۔ امام احمد، اسحاق اور محدثین کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس جگہ کا ذکر موجود نہیں ہے جس میں مسلم فیہ پر قبضہ کیا جائے گا۔ اگر یہ بیع سلم کی شرائط میں سے ہوتی تو یقیناً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے اسی طرح بیان فرما دیتے جس طرح آپ نے کیل، وزن اور اجل (مدت) کے بارے بیان فرما دیا ہے اور اسی کی مثل حضرت ابن ابی اوفی کی حدیث ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ابو داؤد نے سعد الطائی سے، انہوں نے عطیہ بن سعد سے اور انہوں نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی نے کسی شے میں بیع سلم کی تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کسی اور کی طرف نہ پھیرے (2)۔“ ابو محمد عبدالحق بن عطیہ نے کہا ہے: وہ عوفی ہے (یہ عطیہ بن سعد کا لقب ہے) اور کسی نے بھی اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا ہے، اگرچہ بزرگ اور اجلہ راویوں نے اس سے روایت نقل کی ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس آدمی کے بارے میں حکم یہ ہے جس نے معلوم قیمت کے ساتھ مقررہ مدت تک کسی اناج میں بیع سلم کی۔ پس مدت گزر گئی اور خریدنے والے نے بائع کے پاس اس شے میں سے ادا کرنے کے لئے کوئی شے نہ پائی جسے اس نے اس سے خریدا تھا تو وہ اس سے اقالہ کر لے اور اسے چاہیے کہ وہ اس سے چاندی یا سونے یا بعینہٖ اس ثمن کے سوا جو اس نے اسے دیئے تھے نہ لے اور نہ اس ثمن کے عوض وہ اس سے کوئی اور شے خریدے، یہاں تک کہ وہ ان پر

1۔ صحیح بخاری، کتاب السلم، حدیث نمبر 2088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب السلف لا یحول، حدیث نمبر 3008، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قبضہ کرے اور وہ اس لئے ہے کہ جب اس نے ان شخصوں کے علاوہ کے لئے جو اس نے دیے تھے، اس نے انہیں ایسے
سودے کی طرف پھیر دیا جو اس طعام کے سوا ہو جو اس نے اس سے خریدا تھا تو یہ طعام کو پورا کرنے سے پہلے اسے بیچنا لازم آتا
ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: تحقیق رسول اللہ ﷺ نے طعام کو پورا کرنے سے پہلے اس کی بیع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قول تعالیٰ: فَاكْتُبُوْهُ یعنی تم قرض اور مدت کو لکھو۔ اور کہا جاتا ہے: کتابت کا حکم دیا گیا ہے لیکن
مراد لکھنا اور گواہ بنانا ہے کیونکہ تحریر گواہوں کے بغیر حجت نہیں ہوتی۔ اور کہا جاتا ہے: ہمیں کتابت کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ہم
بھول نہ جائیں۔

ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں حماد بن سلمہ سے، انہوں نے علی بن زید سے، انہوں نے یوسف بن مہران سے اور انہوں
نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد
میں فرمایا ہے: اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (آخر آیت تک) بلاشبہ جس نے سب سے اول انکار کیا وہ حضرت
آدم علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد دکھائی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا جس کا نور انتہائی روشن اور چمکدار
تھا تو آپ نے عرض کی: اے میرے رب! یہ کون ہے؟ رب کریم نے فرمایا: یہ تیرا بیٹا داؤد علیہ السلام ہے۔ عرض کی: اے
میرے پروردگار! اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ساٹھ برس۔ عرض کی: اے میرے رب! اس کی عمر میں اضافہ فرمادے۔ تو رب
کریم نے فرمایا: نہیں مگر یہ کہ تو اپنی عمر میں سے اس میں اضافہ کر دے۔ عرض کی: میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: ہزار برس۔ آدم
علیہ السلام نے عرض کی: میں نے چالیس برس اسے عطا کر دیے۔ راوی نے بیان فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے اس پر تحریر لکھوائی اور اس پر
اپنے ملائکہ کو گواہ بنالیا۔ پس جب وفات کا وقت آپہنچا اور ملائکہ حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا: ابھی میری عمر سے چالیس
برس باقی ہیں۔ ملائکہ نے کہا: بلاشبہ آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد علیہ السلام کو ہبہ کر دیے تھے تو آپ نے فرمایا: میں نے کسی کو
کوئی شے ہبہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا: سو اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر نکالی اور اس پر ملائکہ گواہ تھے اور ایک روایت میں ہے:
اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کے لئے سو برس اور آدم علیہ السلام کے لئے ان کی عمر ہزار برس مکمل کر دی۔ [1] اسے ترمذی
نے بھی نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاكْتُبُوْهُ میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ وہ قرض کے بارے تحریر لکھے اس
طرح جو اس کی مکمل وضاحت کرنے والی ہو اور اس سے ہر قسم کے وہم کو دور کرنے والی ہو ایسے اختلاف کے بارے میں جس
کا وہم باہم معاملات کرنے والوں کے درمیان ہو سکتا ہے اور اگر وہ دونوں اپنا معاملہ حاکم کے سامنے پیش کریں تو وہ تحریر
حاکم کی ایسی راہنمائی کرنے والی ہو جس کے مطابق وہ فیصلہ کر سکے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرضوں کا لکھنا ان کے مالکوں پر واجب ہے اس آیت کے ساتھ اسے
فرض کیا گیا ہے، چاہے وہ بیع کے سبب ہو یا قرض کی صورت میں ہو تاکہ اس میں بھول یا انکار ممکن نہ ہو سکے۔ اور یہی طبری کا

1۔ جامع ترمذی، حدیث نمبر 3002-3250، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کا اختیار ہے اور ابن جریج نے کہا ہے: جس کسی کا کوئی قرض ہو اسے چاہیے کہ وہ لکھ لے اور جو کوئی شے فروخت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ گواہ بنا لے۔

اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ارشاد باری تعالیٰ: فَإِنْ أَمِنَ یہ حکم تحریر کے لئے ناسخ ہے اور اسی طرح ابن جریج نے بیان کیا ہے اور ابن زید نے بھی کہا ہے۔ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے اور ربیع نے یہ موقف اپنایا ہے کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ اس میں تخفیف فرمائی: فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا۔

اور جمہور نے کہا ہے: اموال کی حفاظت اور شک کو زائل کرنے کے لئے لکھ لینا مستحب ہے۔ اور جب مقروض متقی ہو تو تحریر اس کے لئے ضرر رساں نہیں اور اگر وہ ایسا نہ ہو تو تحریر اس کے قرض کے بارے اور صاحب حق کی حاجت کے بارے ایک اعتماد اور یقین دہانی ہے۔ بعض نے کہا ہے: اگر تو گواہ بنا لے تو یہ احتیاط ہے اور اگر تو امین بن جائے تو یہ بھی حلال ہے اور اس کی گنجائش ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی قول صحیح ہے اور اس میں نسخ مرتب نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لئے اس شے کے بارے میں لکھنا مستحب قرار دیا ہے جسے وہ ہبہ کرے اور اسے چھوڑ دے یہ اجماع سے ثابت ہے اور اس کا مستحب ہونا محض لوگوں کے اعتماد اور بھروسے کی بنا پر ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ حضرت عطا وغیرہ نے کہا ہے: کاتب پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ شعبی نے بھی کہا ہے اور یہ اس وقت ہے جب اس کے سوا کوئی کاتب موجود نہ ہو تو پھر اس پر واجب ہے کہ وہ لکھے۔ سدی نے کہا ہے: اس پر لکھنا واجب ہے جب وہ فارغ ہو۔ پہلے سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے اور دوسرے میں اسے ثابت رکھا گیا ہے کیونکہ دوسرا غائب کے لئے ہے اور پہلا مخاطب کے لئے ہے۔ اور کبھی یہ مخاطب میں ثابت ہوتی ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلْتَفْرَحُوا یہ تاء کے ساتھ ہے اور غائب میں حذف ہو جاتی ہے اور اسی سے شاعر کا یہ قول ہے:

محمد تفد نفسك كل نفس　　إذا ما خفت من شئ تبالا

اس میں تَفْدِ سے، محذوف ہے یہ مونث غائب کا صیغہ ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: بِالْعَدْلِ یعنی حق اور انصاف کے ساتھ، یعنی صاحب حق کے لئے نہ اس سے زیادہ لکھا جائے گا اور نہ اس سے کم۔ اور فرمایا: بَّيْنَكُمْ یہ نہیں کہا أحدكم کیونکہ جب وہ آدمی جس کا قرض ہے وہ اس کی کتابت میں شک کر سکتا ہے جس پر قرض ہے اور اسی طرح اس کا برعکس بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کاتب ایسے آدمی کو مقرر کیا ہے جو ان دونوں کے سوا ہو عدل کے ساتھ لکھے اس کے دل میں اور اس کے قلم میں دونوں میں سے ایک کی دوسرے پر ترجیح نہ ہو۔ (یعنی ایک جانب اس کا جھکاؤ نہ ہو)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بے شک لوگ جب معاملات کرتے ہیں تو کوئی بھی معاملہ سے جدا نہیں ہوتا اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو لکھ سکتے ہیں اور وہ بھی جو نہیں لکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ ان کے درمیان ایک کاتب عدل وانصاف کے

مشین کما اهتزت رماح تسفهت أعاليها مر الرياح النواسم

اس میں بدنی کمزوری اور ضعف کے معنی میں مذکور ہے۔

یعنی اس نے اسے کمزور اور نرم پایا تو اس نے اسے حرکت دی۔

تحقیق انہوں نے کہا ہے: الضعف ضاد کے ضمہ کے ساتھ بدن کی کمزوری کے لئے اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ رائے میں کمزوری کے لئے آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہیں اور پہلی زیادہ صحیح ہے۔

جبکہ ابوداؤد نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک آدمی خرید و فروخت کرتا تھا اور اس کی عقل میں ضعف (کمزوری) تھی۔ پس اس کے گھر والے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی: یا نبی اللہ! ﷺ فلاں کو روک دیجئے کیونکہ وہ خرید و فروخت کرتا ہے اور اس کی عقل میں ضعف ہے، چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے بلایا اور اسے بیع کرنے سے روک دیا تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ میں تو ایک ساعت بھی خرید و فروخت کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر تو خرید و فروخت کو چھوڑ نہیں سکتا تو پھر یہ کہہ کر لے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں (1)۔" اسے ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ سلمی ترمذی نے حدیث انس سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور کہا ہے: بے شک ایک آدمی کی عقل میں ضعف تھا اور آگے حدیث ذکر کی (2) اور امام بخاری نے اسے تاریخ میں ذکر کیا ہے اور اس میں یہ کہا ہے: "جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر دھوکہ نہیں ہے اور تو ہر سامان میں تین راتوں کے خیار کے ساتھ خرید و فروخت کر۔" یہ آدمی حبان بن منقذ بن عمرو انصاری تھا اور یحییٰ اور واسع ابن حبان کا والد تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ منقذ یحییٰ اور واسع کا دادا تھا۔ یہ دونوں امام مالک کے شیخ تھے اور منقذ کا والد حبان تھا۔ اس کی عمر ایک سو تیس برس تھی۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں ایک غزوہ میں زخمی ہو گئے اور زخم ان کے دماغ میں لگا جس سے ان کی عقل اور زبان میں وہم اور خلل پیدا ہو گیا۔

اور دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: حبان بن منقذ کمزور آدمی تھا اور اس کی قوت بصارت بھی کمزور تھی اس کے سر میں [illegible] اس کے سر میں زخم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے ہر اس شے میں تین دن کا خیار رکھ دیا جو وہ خریدے گا اور اس کی زبان بھی بوجھل تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: تو خرید و فروخت کر اور یہ کہہ کہ کوئی دھوکہ فریب قبول نہیں۔" پس میں اسے یہ کہتے ہوئے سنا کرتا تھا: لا خذابة لا خذابة۔ اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ الخلابة کا معنی الخدیعة (دھوکہ دہی) ہے۔ اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: اذا لم تغلب فاخلب (3) (جب تو غالب نہ آ سکے تو پھر حیلے اور چال سے مقصد تلاش کر۔)

مسئلہ نمبر 18۔ علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جسے تجربہ کی قلت اور عقل کے ضعف کی وجہ سے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو کیا اس پر پابندی عائد کی جائے یا نہیں؟ تو امام احمد اور اسحاق نے اس پر پابندی کا قول کیا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب فی الرجل یقول فی البیع لا خلابة، حدیث نمبر 3038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع، باب ما جاء فیمن یخدع فی البیع، حدیث نمبر 1171، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ایضاً، حدیث 1171

دوسروں نے کہا ہے اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی۔ دونوں قول ایک ہی مذہب میں ہیں۔ اور صحیح پہلا قول ہے اس آیت کی بنا پر۔ اور حدیث طیبہ میں اس قول کی بناء پر۔ یا نبی اللہ احجر علی فلان (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! ﷺ فلاں پر پابندی لگا دیجئے) البتہ اس قول کی بنا پر پابندی کا ترک کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یا نبی اللہ انی لا اصبر عن البیع (اے اللہ تعالیٰ کے نبی! ﷺ میں بیع سے رک نہیں سکتا۔) تو آپ ﷺ نے اس کے لئے بیع کو مباح قرار دیا اور اسے اس کے ساتھ خاص کر دیا کیونکہ وہ جسے خرید و فروخت میں دھوکہ دیا جاتا ہو چاہیے کہ اس پر پابندی لگا دی جائے بالخصوص جب اس کی عقل ناقص اور فاسد ہو۔ اور جو شے اس کی خصوصیت پر دلالت کرتی ہے وہ وہ روایت ہے جسے محمد بن اسحاق نے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا ہے محمد بن یحییٰ بن حبان نے مجھے بیان کیا ہے کہ وہ میرے دادا منقذ بن عمرو تھے اور وہ وہ آدمی تھے جن کے سر میں زخم آگیا تو ان کی زبان میں لکنت آگئی اور ان کی عقل چھن گئی (یعنی کمزور ہوگئی) اور وہ تجارت نہیں چھوڑتے تھے اور انہیں ہمیشہ دھوکہ دیا جاتا تھا۔

پس وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "جب تو بیع کرے تو یہ کہا کر کوئی دھوکہ (قبول) نہیں پھر تو جو سامان بھی خریدے گا تیرے لئے تین راتوں کا خیار ہوگا پس اگر تو اس پر راضی ہو جائے تو اسے اپنے پاس رکھ لے اور اگر راضی نہ ہو تو اسے اس کے مالک کے پاس لوٹا دے" اور انہوں نے طویل عمر پائی ہے وہ ایک سو تیس برس تک زندہ رہے ہیں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب لوگ پھیل گئے اور تعداد میں کثیر ہو گئے تو وہ بازار میں خرید و فروخت کرتے تھے اور شے لے کر اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے حالانکہ انہوں نے ثمن فاحش کھایا ہوتا، پھر گھر والے انہیں ملامت کرتے تھے اور کہتے کس کے لئے خریدتے ہو؟ تو وہ کہتے: مجھے خیار حاصل ہے اگر میں پسند کروں تو لے لوں اور اگر نہ پسند کروں تو واپس لوٹا دوں، تحقیق رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین دن کا خیار عطا فرمایا ہے۔ پس وہ دوسرے دن یا تیسرے دن سامان اس کے مالک پر واپس لوٹا دیتے تو وہ کہتا: قسم بخدا میں اسے قبول نہیں کروں گا، تحقیق تو نے یہ سامان لے لیا ہے اور مجھے درہم دے دیئے ہیں تو وہ کہتے: بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تین دنوں کا اختیار عطا فرمایا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تو وہ تاجر کو کہتا: تجھ پر افسوس ہے! بلاشبہ یہ سچ بول رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تین دنوں کا خیار عطا فرمایا تھا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ ابو عمر نے الاستیعاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے: بخاری نے تاریخ میں عیاش بن ولید عن عبد الاعلیٰ عن ابن اسحاق کی سند سے اسے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: **اَوْ ضَعِيْفًا** ضعیف سے مراد وہ آدمی ہے جس کی عقل میں نقص اور فساد داخل ہو چکا ہو لکھوانے سے اس کی فطرت اور طبیعت عاجز ہو یا تو اس کے بولنے میں رکاوٹ ہونے کی وجہ سے یا اس کے گونگا ہونے کی وجہ سے یا اداء کلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اور یہ بھی کہ کبھی اس کا ولی باپ ہوتا ہے یا وصی۔ اور وہ جو املا کرانے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا وہ صغیر ہے اور اس کا ولی اس کا وصی ہوگا یا اس کا باپ ہوگا۔ اور وہ غائب ہے جو گواہی دینے سے غائب ہو یا تو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی عذر کی وجہ سے اور اس کا ولی اس کا وکیل ہوگا اور رہا گونگا تو یہ جائز ہے کہ وہ بھی ضعفاء میں سے ہو۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ وہ ان میں سے ہو جو استطاعت نہیں رکھتے۔ پس یہی وہ اصناف ہیں جو ممتاز ہو سکتی ہیں ان کا

نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ اس کے مطابق ہوتی ہے تو ایسا بھی نہیں۔

اور یہ کہنے والا کہتا ہے: قرض کی مقدار میں قسم کے ساتھ مرتہن کے قول کی تصدیق کی جائے گی یہاں تک کہ وہ رہن کی قیمت کے مساوی ہو۔ اور عرف اس پر نہیں ہے بسا اوقات قرض رہن سے کم ہوتا ہے اور یہی اس میں غالب ہے، پس اس کے اس قول کا کوئی نتیجہ نہیں۔

مسئلہ نمبر 22۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ مراد ولی ہے تو اس میں اس پر دلیل ہے کہ اس کا اقرار اپنے یتیم کے خلاف جائز ہے کیونکہ جب اس نے اسے املا کرایا تو اس کا قول اس پر اس بارے میں نافذ ہو گیا جو اس نے اسے لکھوایا۔

مسئلہ نمبر 23۔ اور وہ سفیہ جس پر پابندی عائد کی گئی ہو اس کا اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا فاسد ہے اس پر اجماع ہے یہ ہمیشہ کے لئے فسخ کر دیا گیا ہے نہ یہ کوئی حکم ثابت کرے گا اور نہ کسی شے میں موثر ہو گا۔ پس اگر سفیہ تصرف کرے اور اس پر کوئی پابندی نہ ہو تو اس بارے میں اختلاف ہے اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 24۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ۔ الاستشہاد کا معنی ہے شہادت طلب کرنا (یعنی شاہد بنانا) اور لوگوں کے بیچ یہ اختلاف ہے کہ کیا یہ فرض ہے یا مستحب؟ اور صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 25۔ قولہ تعالیٰ: شَهِيدَيْنِ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے ساتھ شہادت کو حقوق مالیہ، بدنیہ اور حدود میں مرتب فرمایا ہے اور سوائے زنا کے ہر شے میں دو گواہ مقرر کئے ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ اور شہید مبالغہ کا وزن ہے اور اس میں اس پر دلالت ہے جو شہادت دے اور وہ اس کی طرف سے بار بار ہو تو گویا یہ اس کے عادل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 26۔ قولہ تعالیٰ: مِن رِّجَالِكُمْ یہ کفار، بچوں اور عورتوں کو چھوڑنے کے بارے نص ہے اور رہے غلام! تو لفظ انہیں شامل ہے اور مجاہد نے کہا ہے: مراد آزاد مرد ہیں اور قاضی ابو اسحاق نے اسے ہی اختیار کیا ہے اور اس میں مبالغہ کی حد تک بحث کی ہے اور علماء نے غلاموں کی شہادت کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ پس شریح، عثمان البتی، احمد، اسحاق اور ابو ثور رحمہم اللہ نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل ہو اور انہوں نے آیت کے لفظ کو غلبہ دیا ہے اور امام مالک، ابو حنیفہ، شافعی اور جمہور علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے: غلام کی شہادت جائز نہیں ہوتی اور انہوں نے غلامی کے نقص کو غلبہ دیا ہے اور عامر شعبی اور نخعی نے تھوڑی سی شے میں اسے جائز قرار دیا ہے اور صحیح جمہور کا قول ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ اور خطاب مِن رِّجَالِكُمْ تک جاری ہے۔ پس ظاہر خطاب ان لوگوں کو شامل ہو گا جو آپس میں قرض کا لین دین کرتے ہیں اور غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر کسی شے کے مالک نہیں ہوتے۔

اور اگر وہ کہیں کہ آیت کے اول حصہ کا خاص ہونا اس کے آخر کے عموم کے ساتھ تعلق کے مانع نہیں ہے تو انہیں کہا جائے گا اسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد خاص کر رہا ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس پر دلیل ہے کہ اندھے اہل شہادت میں سے ہیں لیکن تب جب انہیں یقینی علم ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شہادت کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو اس سورج کو دیکھ رہا ہے پس تو اس کی مثل پر شہادت دے یا چھوڑ دے" اور یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد کا اس شے کو دیکھنا شرط ہے جس کے بارے وہ شہادت دے رہا ہے نہ کہ وہ ایسے استدلال کے ساتھ شہادت دے جس میں اس کے خطا کرنے کا احتمال اور امکان ہو۔ البتہ اس کا اپنی بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہوتا ہے جب وہ اس کی آواز پہچان لے، کیونکہ وطی کو عمل کرنا غلبہ ظن کے ساتھ جائز ہے، پس اگر شب زفاف کوئی عورت اس کی طرف بھیجی گئی اور اسے کہا گیا یہ تیری بیوی ہے اور وہ اسے نہ پہچانتا ہو تو اس کے لئے اس سے وطی کرنا جائز ہے اور اس کے لئے ہدیہ قبول کرنا حلال ہوتا ہے قاصد کے قول کے ساتھ جو اس کے پاس آئے۔ اور اگر کوئی خبر دینے والا اسے زید کے بارے میں اقرار یا بیع یا قذف یا غصب کی خبر دے تب اس کے لئے مخبر عنہ کے خلاف شہادت دینا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ شہادت کا راستہ یقین ہے اور ان کے سوا میں ظن غالب کا استعمال جائز ہوتا ہے اور اسی لئے امام شافعی، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب اسے نابینا ہونے سے پہلے اس کا علم ہو تو اندھا ہونے کے بعد اس کی شہادت جائز ہے۔ اور اس کے اور مشہود علیہ کے درمیان حائل ہونے والا اندھا پن مشہود علیہ میں غیبت اور موت کے طاری ہونے کی طرح ہے۔ اور یہ ان کا مذہب ہے اور وہ جو اندھے کو اس بارے میں ادائے شہادت سے روکتے ہیں جو شہادت اس نے بصارت کے ساتھ لی ہو اس کی کوئی وجہ اور علت نہیں ہے۔ اور اس کی شہادت اس نسب کے بارے میں صحیح ہوگی جو خبر مشہور سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ وہ کسی شے کے بارے خبر دے جس کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو۔

اور علماء میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اندھے کی شہادت کو ان چیزوں میں قبول کیا ہے جن کی شہادت کا ذریعہ آواز ہے کیونکہ انہوں نے اس کے ساتھ استدلال کو حد یقین تک پہنچنے والا خیال کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ آوازوں کا مشتبہ ہونا شکلوں اور رنگوں کے مشتبہ ہونے کی طرح ہی ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آنکھ والے کے لئے بھی آواز پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ نابینا آدمی کا طلاق وغیرہ میں آواز پر شہادت دینا جائز ہے جب کہ وہ آواز کو پہچانتا ہو۔ ابن القاسم نے بیان کیا ہے کہ میں نے امام مالک سے کہا: ایک آدمی دیوار کے پیچھے سے اپنے پڑوسی کی آواز کو سنتا ہے اور اسے دیکھتا نہیں اور وہ سنتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے کیا وہ اس پر شہادت دے سکتا ہے درآنحالیکہ اس نے اس کی آواز پہچان لی ہو؟ تو امام مالک نے فرمایا: اس کی شہادت جائز ہے۔ اور یہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، قاسم بن محمد، شریح الکندی، شعبی، عطاء بن ابی رباح، یحییٰ بن سعید، ربیعہ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور لیث رحمہم اللہ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 27۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ معنی یہ ہے کہ اگر طالب دو مرد گواہ نہ لا سکے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتیں لے آئے، یہ جمہور کا قول ہے۔ فَرَجُلٌ یہ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور

وَّامْرَاَتٰنِ رَجُل پر معطوف ہے اور خبر محذوف ہے۔ (تقدیر کلام یہ ہے) فرجل وامراتان یقومان مقامھما۔ یعنی ایک مرد اور دو عورتیں دو مردوں کے قائم مقام ہو جائیں گے۔ اور غیر قرآن میں نصب بھی جائز ہے (یعنی) فاستشھدوا رجلا وامراتین۔ یعنی تم گواہ بناؤ ایک مرد اور دو عورتیں۔ اور سیبویہ نے بیان کیا ہے: ان خنجرا فخنجرا (اگر وہ خنجر لے کر آئے تو تم بھی خنجر لے کر آؤ) اور ایک قوم نے کہا ہے: بلکہ معنی یہ ہے پس اگر دو مرد نہ ہوں، یعنی وہ نہ پائے جائیں تو دو عورتوں کو گواہ بنانا جائز نہ ہوگا مگر مرد نہ ہونے کی صورت میں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(1): یہ ضعیف ہے اور آیت کے الفاظ یہ معنی نہیں دیتے، بلکہ اس سے ظاہر جمہور کا قول ہے، یعنی اگر گواہ بنانے والے کے پاس دو مرد نہ ہوں یعنی اگر صاحب حق اسے چھوڑ دے یا کسی عذر کے سبب اس کا قصد کرے تو اسے چاہیے کہ وہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنا لے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مردوں کی موجودگی کے باوجود ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے سوا کسی اور میں اس کا ذکر نہیں فرمایا اور جمہور کے قول کے مطابق اسے صرف اموال میں جائز قرار دیا گیا ہے بشرطیکہ ان دونوں کے ساتھ ایک مرد بھی ہو۔ بلاشبہ یہ اموال میں ہو سکتا ہے ان کے سوا میں نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اموال کو پختہ کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے اسباب کثیر بنائے ہیں کیونکہ انہیں حاصل کرنے کی جہتیں کثیر ہیں اور ان کے ساتھ عموم بلویٰ ہونے اور ان کا کاروبار بار بار ہونے کی وجہ سے۔ پس ان میں مضبوطی اور توثیق کو کبھی لکھوانے کے ساتھ، کبھی گواہ بنا لینے کے ساتھ، کبھی رہن کے ساتھ اور کبھی ضمان کے ساتھ رکھ دیا۔ اور ان تمام میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کے ساتھ داخل کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ سے یہ وہم نہیں ہوتا کہ یہ بضع کے ساتھ مہر کے قرض پر اور دم عمد کی صلح پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ شہادت شہادت علی الدین نہیں ہے، بلکہ وہ شہادت علی النکاح ہے اور علماء نے ان معاملات میں اکیلی عورتوں کی شہادت جائز قرار دی ہے جن پر ضرورت کے وقت ان کے سوا کوئی اور مطلع نہیں ہو سکتا اور اسی طرح ضرورت کے وقت بچوں کی شہادت کی اجازت دی گئی ہے ان زخموں اور جھگڑوں میں جو ان کے آپس کے درمیان ہوں۔

تحقیق علماء نے زخموں میں بچوں کی شہادت کے بارے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ ہے:

مسئلہ نمبر 28۔ امام مالک نے اسے جائز قرار دیا ہے جب تک وہ مختلف اور متفرق نہ ہوں۔ اور ان میں سے دو سے کم کی شہادت جائز نہیں ہے نہ بڑے کی چھوٹے پر اور نہ چھوٹے کی بڑے پر۔ اور علماء میں سے جو بچوں کے آپس کے جھگڑوں میں ان کی شہادت کے ساتھ فیصلے کرتے تھے وہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مالک نے کہا ہے: ہمارے نزدیک اس پر اجماع کیا گیا ہے۔

اور امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے بچوں کی شہادت کو جائز قرار نہیں دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ رِّجَالِكُمْ اور مِمَّنْ تَرْضَوْنَ اور ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور یہ صفات بچوں میں موجود نہیں ہوتیں۔

مسئلہ نمبر 29۔ جب اللہ تعالیٰ نے دو عورتوں کی شہادت کو ایک آدمی کی شہادت کا بدل قرار دیا ہے تو پھر یہ ضروری

1۔ محرر الوجیز

ہے کہ ان دونوں کا حکم ایک مرد کے حکم کی طرح ہو، پس اسی طرح ہمارے نزدیک آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کھائے اور امام شافعی کے نزدیک بھی اسی طرح ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ بھی قسم کھا سکتا ہے کیونکہ مطلقاً دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کا عوض ہے۔ اور اس میں امام اعظم ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے اختلاف کیا ہے اور وہ شاہد کے ساتھ قسم کے قائل نہیں اور انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے شہادت کو تقسیم کیا اور اسے متعدد شمار کیا لیکن شاہد اور یمین کا ذکر نہیں کیا، لہٰذا اس کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز نہیں، کیونکہ جو حکم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ قسم اس پر زائد ہے اور یہ نص پر زیادتی ہے اور یہ نسخ ہے اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان میں سے ثوری، اوزاعی، عطا، حکم بن عتیبہ اور ایک جماعت ہے۔

بعض نے کہا ہے: شاہد کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا قرآن کے ساتھ منسوخ ہے اور عطا نے یہ گمان کیا ہے کہ سب سے پہلے عبدالملک بن مروان نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور حکم نے کہا ہے: قسم اور شاہد کے ساتھ فیصلہ کرنا بدعت ہے اور سب سے پہلے اس کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے فیصلہ کیا اور یہ سب غلط اور وہم ہے جو حق میں سے کسی شے کا فائدہ نہیں دیتا اور جو نفی کرے اور ناواقف ہو وہ اس کی طرح نہیں جو ثابت کرے اور جانتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیہ۔ میں وہ نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا شاہد کے ساتھ قسم کے بارے میں فیصلہ رد ہو سکتا ہو۔ وہ تو اس میں یہ ہے کہ ان حقوق کے ساتھ نہیں ملایا جاتا اور نہ یہ کہ شہادت کے ساتھ صرف انہی چیزوں میں حق حاصل ہوتا ہے جن کا ذکر آیت میں کیا گیا ہے کسی اور کا نہیں، کیونکہ وہ مطلوب کے انکار اور طالب کی قسم کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے۔ بے شک وہ اس کے ساتھ بالاجماع مال کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کا ذکر کتاب اللہ میں نہیں ہے اور یہ ان کے خلاف قطعی رد ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے یہ قول کیا ہے ان کے خلاف حجت یہ ہے کہ انہیں کہا جائے گا: آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر ایک آدمی دوسرے آدمی کے خلاف مال کا دعویٰ کرے تو کیا مطلوب اس کے بارے قسم نہیں دے گا جو حق اس پر ہے؟ پس اگر وہ قسم کھا لے تو وہ حق اس سے باطل ہو جائے گا اور اگر وہ قسم سے انکار کر دے تو پھر صاحب حق (مدعی) قسم اٹھائے گا کہ اس کا حق یقینی ہے اور اس کا حق مدعی علیہ پر ثابت ہو جائے گا۔ پس یہ ایسی شے ہے جس میں لوگوں میں سے کسی کے نزدیک اور شہروں میں سے کسی شہر میں کوئی اختلاف نہیں۔ پس کون سی شے ہے جسے انہوں نے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب میں اسے پایا ہے؟ پس جس نے اس کا اقرار کیا تو اسے چاہیے کہ وہ شاہد کے ساتھ قسم کا بھی اقرار کرے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پھر تعجب ہے کہ مشہور اور صحیح احادیث کے باوجود انہوں نے اسے بدعتی قرار دیا جس نے ان کے مطابق عمل کیا، یہاں تک کہ اس کے فیصلے کو توڑ دیا اور اس کی رائے کو حقیر سمجھا اس کے باوجود کہ اس کے مطابق خلفائے اربعہ، اُبی بن کعب، معاویہ، شریح، عمر بن عبدالعزیز اور آپ نے اس کے بارے اپنے عمال کی طرف لکھا ایاس بن معاویہ، ابو سلمہ بن عبدالرحمن، ابو الزناد اور ربیعہ رحمہم اللہ نے عمل کیا ہے اور اسی لئے امام مالک نے کہا ہے: اس بارے میں جو دلیل دی ہے جو سنت کے عمل میں سے گزر چکا ہے، کیا آپ ان کے بارے رائے رکھتے ہیں کہ ان کے احکام توڑ دیئے جائیں

گے اور ان کی بدعت کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے؟ یہ شدید عدم توجہ اور غفلت ہے اور ایسی رائے ہے جو پختہ اور مضبوط نہیں۔ ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔

حضرت عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ صرف اموال میں ہے۔ اسے سیف بن سلیمان نے قیس بن سعد سے انہوں نے عمرو بن دینار سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: اس حدیث کی یہ سند اصح الاسناد ہے اور یہ حدیث ہے جس کی اسناد میں کسی کے لئے کوئی طعن نہیں ہے۔ اس حدیث کے بارے اہل معرفت کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔ یحییٰ القطان نے کہا ہے: سیف بن سلیمان ثبت اور مضبوط راوی ہیں میں نے ان سے زیادہ حافظ کوئی نہیں دیکھا اور نسائی نے کہا ہے: یہ اسناد جید ہے، سیف ثقہ راوی ہے اور قیس ثقہ راوی ہے اور مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ابوبکر البزار نے کہا ہے: سیف بن سلیمان اور قیس بن سعد دونوں ثقہ راوی ہیں اور جو ان دونوں کے بعد ہیں وہ ثقاہت اور عدالت میں اپنی شہرت کے سبب ذکر سے مستغنی ہیں اور صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی نہیں جس نے شاہد کے ساتھ قسم کا انکار کیا ہو، بلکہ اس کے بارے ان سے قول مروی ہیں اور مدینہ طیبہ کے جمہور اہل علم اسی موقف پر ہیں اور اس میں حضرت عروہ بن زبیر اور ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہم سے اختلاف مروی ہے۔ معمر نے کہا ہے: میں نے زہری سے یمین مع الشاہد کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ ایسی شے ہے جسے لوگوں نے ایجاد کیا ہے۔ دو شاہدوں کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ جب قضا کے والی بنے تو پہلا فیصلہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ کیا اور امام مالک اور آپ کے اصحاب، امام شافعی اور آپ کے متبعین، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، ابو ثور، داؤد بن علی اور محدثین کی ایک جماعت رحمۃ اللہ علیہم نے یہی کہا ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے متواتر آثار ہیں اور کئی صدیوں سے اہل مدینہ کا اس پر عمل ہے۔ اور امام مالک نے فرمایا ہے: ہر شہر میں ایک شاہد اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ اور آپ نے الموطا میں اس کے سوا کسی مسئلہ کے لئے حجت اور دلیل بیان نہیں فرمائی اور آپ کے ساتھ یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں کیا گیا اور نہ ہی مدینہ طیبہ اور مصر وغیرہا میں آپ کے اصحاب میں سے کسی سے اختلاف کیا گیا ہے اور ہر شہر میں مالکی اس کے سوا اپنے مذہب سے نہیں پہچانے جاسکتے سوائے ہمارے پاس اندلس میں، کیونکہ یحییٰ [ابن یحییٰ] نے گمان کیا ہے کہ انہوں نے لیث کو اس کے مطابق فتویٰ دیتے نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے یہ موقف اپنایا ہے۔ اور اس مسئلہ میں یحییٰ نے امام مالک سے اختلاف کیا ہے باوجود اس کے کہ یہ ان کی سنت اور دار الہجرت کے عمل سے مخالفت ہے۔

پھر یمین مع الشاہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ایک حکم کی زیادتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنی پھوپھی اور اپنی خالہ پر نکاح کرنے سے منع فرمایا ہے (1) (یعنی پہلے کسی آدمی کے نکاح میں پھوپھی ہو اور پھر اسے دوسرا نکاح بھتیجی یا بھانجی

1۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لا تنکح المرأۃ علی عمتہا، حدیث نمبر 4718، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حلال ہو اور پھر بھانجی آجائے تو یہ دونوں ایک آدمی کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔) اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:24) (اور حلال کردی گئی ہیں تمہارے لئے ماسوا ان کے) اور جیسے کہ آپ ﷺ نے گھریلو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا اور درندوں میں سے ہر ذی ناب کا، باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّآ اَجِدُ (الانعام:145) (آپ فرما دیجئے میں نہیں پاتا) اور اسی طرح مسح علی الخفین کا حکم ہے حالانکہ قرآن کریم میں صرف پاؤں کو دھونے یا ان کا مسح کرنے کے بارے وارد ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے جائز ہو کہ قرآن کریم نے رسول اللہ ﷺ کے یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلے کو منسوخ کر دیا ہے تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشاد: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:275) اور اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء:29) (مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔) بیع مزابنہ، بیع الغرر، ان چیزوں کی بیع جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں، یہاں تک کہ وہ تمام بیوع جو ممنوع ہیں ان کی نفی کے لئے ناسخ ہیں اور یہ کسی کے لئے بھی جائز نہیں، کیونکہ سنت کتاب اللہ کے لئے مبین اور وضاحت کرنے والی ہے۔

اور اگر کہا جائے: بے شک جو حدیث میں وارد ہے اور وہ ایک معین فرد کے بارے فیصلہ ہے اور اس میں عموم نہیں ہے تو ہم کہیں گے: بلکہ وہ اس قاعدہ کی تقعید (رائے دینا) سے عبارت ہے، گویا کہ انہوں نے یہ کہا: رسول اللہ ﷺ نے یہ ایک شاہد اور قسم کے ساتھ حکم ثابت کیا ہے اور جو اس تاویل کی شہادت دیتی ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حقوق میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔ اور قیاس اور نظر و فکر کے اعتبار سے ہم قسم کو دو عورتوں کی نسبت زیادہ قوی پاتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا لعان میں کوئی دخل نہیں ہے اور قسم لعان میں داخل ہوتی ہے۔ اور جب حدیث صحیح ہے تو پھر اس کے ساتھ کلام کرنا واجب ہے اور سنت اس کی محتاج نہیں ہوتی جو اس کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ جو اس سے مخالفت کرے گا وہی اس کے خلاف حجت بن جائے گی۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 30۔ اور جب یہ بات پختہ ہو گئی اور یمین مع الشاہد کے ساتھ حکم ثابت ہو گیا تو قاضی ابو محمد عبد الوہاب نے کہا: یہ اموال اور ان کے متعلقات کے بارے ہے بدنی حقوق کے بارے نہیں، جو بھی یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ کرنے کا قائل ہے ان تمام کی طرف سے اس پر اجماع ہے۔ فرمایا: کیونکہ اموال کے حقوق ابدان کے حقوق سے پست اور گھٹیا ہوتے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں عورتوں کی شہادت قبول ہے۔ اور عمداً زخم لگانے کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ کا قول مختلف ہے کیا اس میں ایک گواہ اور قسم کے ساتھ قصاص ثابت ہو سکتا ہے؟ اس میں دو روایتیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے ساتھ قصاص اور دیت کے درمیان اختیار ثابت ہو جائے گا اور دوسری یہ ہے کہ اس سے کوئی شے بھی ثابت نہ ہو گی کیونکہ یہ بدنی حقوق میں سے ہے۔ فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔

امام مالک نے الموطا میں کہا ہے: وہ (یمین مع الشاہد کے ساتھ فیصلہ) صرف اموال میں ہوتا ہے اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا ہے اور مازری نے کہا ہے: بغیر کسی اختلاف کے اسے صرف مال میں قبول کیا جائے گا اور محض نکاح اور طلاق میں

بغیر کسی اختلاف کے اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر شہادت کا مضمون مال نہ ہو لیکن وہ مال تک پہنچانے والی ہو جیسا کہ وصیت اور موت کے بعد نکاح کے بارے شہادت دینا یہاں تک کہ اس کے ثابت ہونے سے صرف مال وغیرہ کا مطالبہ کیا جائے گا تو اس کی قبولیت میں اختلاف ہے۔ پس جنہوں نے مال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول کیا ہے جیسے وہ اسے مال میں قبول کرتے ہیں اور جنہوں نے حال کا لحاظ رکھا ہے انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

اور مہدوی نے کہا ہے: تمام فقہاء کے قول کے مطابق حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں اور اسی طرح اکثر علماء کے قول کے مطابق نکاح اور طلاق میں بھی (ان کی شہادت جائز نہیں) اور یہی امام مالک اور امام شافعی وغیرہما کا مذہب ہے، وہ صرف اموال میں شہادت دے سکتی ہیں اور ہر وہ معاملہ جس میں وہ خود شہادت نہیں دے سکتیں، وہاں میں اپنے سوا کسی اور کی شہادت پر بھی شہادت نہیں دے سکتیں، چاہے ان کے ساتھ کوئی مرد ہو یا نہ ہو اور وہ شہادت نقل نہیں کر سکتیں مگر مرد کے ساتھ (جبکہ) انہوں نے مرد اور عورت سے شہادت نقل کی ہو۔ اور ان تمام معاملات میں دو عورتوں کی شہادت کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا جن میں ان کے سوا کوئی حاضر نہ ہو سکتا ہو، جیسا کہ ولادت اور ولادت کے وقت بچے کا رونا وغیرہ۔ یہ سب امام مالک کا مذہب ہے اور بعض مسائل میں اختلاف ہے۔

مسئلہ نمبر 31۔ قولہ تعالیٰ: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ یہ رجل و امراتان کی صفت ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے۔ ابن بکیر وغیرہ نے کہا ہے: یہ حکام کو خطاب کیا گیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ عمدہ قول نہیں ہے، بلکہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے لیکن جن کا اس قضیہ کے ساتھ تعلق ہے وہ صرف حکام ہیں اور یہ کتاب اللہ میں بہت زیادہ ہے کہ ان احکام میں خطاب عام ہوتا ہے جن کے ساتھ تعلق بعض کا ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 32۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ گواہوں میں سے وہ بھی ہیں جو پسند نہیں کئے جاتے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو عدالت پر محمول نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ ان کے لئے ثابت ہو جائے اور یہ معنی اسلام پر زائد ہے اور یہ جمہور کا قول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا ہے: ہر وہ مسلمان جس کا اسلام ظاہر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ظاہری فسق سے سلامت اور محفوظ ہو تو وہ عادل ہے اگرچہ وہ مجہول الحال ہو۔

اور شریح، عثمان البتی اور ابو ثور نے کہا ہے: وہ مسلمانوں میں سے عادل لوگ ہیں اگرچہ وہ غلام ہوں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس انہوں نے حکم کو عام قرار دیا ہے اور اس سے شہری کے خلاف بدوی (جنگل میں رہنے والا) کی شہادت کا قبول ہونا لازم آتا ہے بشرطیکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو اور یہی امام شافعی اور ان کی موافقت کرنے والوں نے کہا ہے اور وہ (بدوی بھی) ہمارے مردوں اور ہمارے اہل دین میں سے ہے۔ اور اس کا بدوی ہونا اس کے دوسرے شہر سے ہونے کی طرح ہے اور قرآن کریم میں آیات عمومات عادلوں کی شہادت قبول کرنے پر دال ہیں اور وہ بدوی اور شہری کو مساوی قرار دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اور مزید ارشاد فرمایا: وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ (اور تم اپنے میں سے عدل کرنے والوں کو گواہ بناؤ) پس مِنْكُمْ میں خطاب مسلمانوں کو ہے اور یہ یقیناً اس کا تقاضا کرتا ہے کہ عدالت کا

معنی بالضرور اسلام پر زائد ہو (یعنی وہ مسلمان ہونے کے ساتھ عادل بھی ہو) کیونکہ صفت موصوف پر زائد ہوتی ہے اور اسی طرح ممن ترضون بھی اسی کی مثل ہے، بخلاف اس کے جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے پھر اس کا پسندیدہ ہونا معلوم نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی حالت کو آزما لیا جائے، پس اس سے لازم آتا ہے کہ فقط ظاہر اسلام پر اکتفا نہ کیا جائے۔ امام احمد بن حنبل، امام مالک نے ان سے ابن وہب کی روایت میں شہری کے خلاف بدوی کی شہادت رد ہونے کا موقف اپنایا ہے، اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بدوی کی شہادت شہر میں رہنے والے کے خلاف جائز نہیں ہوتی (1)۔" اور صحیح یہ ہے کہ اس کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل اور پسندیدہ ہو جیسا کہ اس کا بیان سورۃ النساء اور سورۃ البراۃ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سفر یا حضر میں شہری کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور جب وہ سفر میں ہو تو اس کی شہادت قبول ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: عدالت سے مراد احوال دینیہ میں اعتدال ہے اور یہ تب مکمل ہوتا ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والا ہو اپنی مروت کی حفاظت کرنے والا ہو اور گناہ صغیرہ کو ترک کرنے کا محافظ ہو اور امانت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے چھپایا نہ جائے (غفلت نہ برتی جائے) اور کہا گیا ہے: عادل قرار دینے والے کے گمان میں باطن صاف ہو اور سیرت مستقیم ہو اور یہ معنی باہم متقارب ہیں۔

مسئلہ نمبر 33۔ جب شہادت ولایت عظیمہ اور مرتبہ منیفہ ہے اور یہ غیر کے قول کو غیر کے خلاف قبول کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں رضا اور عدالت کی شرط لگائی ہے۔ پس شاہد کے حکم میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و اوصاف کے ساتھ منفرد ہو اور فضائل و کمالات سے آراستہ اور مزین ہو، یہاں تک کہ اسے دوسروں پر فضیلت و برتری حاصل ہو اور وہی فضیلت اس کا قول قبول کرنے کے بارے اس کے لئے رتبہ اختصاص ثابت کرتی ہو اور اس کی شہادت کے ساتھ مطلوب کے ذمہ کے مشغول ہونے کے بارے حکم لگایا جا سکتا ہو۔ ہمارے علماء کے نزدیک اجتہاد اور امارات و علامات کے ساتھ استدلال کرنے کے جواز پر اسی شے میں جس کے معانی اور احکام مخفی اور پوشیدہ ہوں یہ بہت بڑی دلیل ہے۔ اس کا بیان سورۂ یوسف میں تفصیل کے ساتھ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں ایسی دلیل موجود ہے جو امر کو حکام کے اجتہاد کے سپرد کرنے پر دلالت کرتی ہے اور بسا اوقات وہ شاہد میں غفلت یا شک کو دیکھ لیتا ہے اور اس وجہ سے اس کی شہادت رد کر دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 34۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اموال میں ظاہر اسلام پر اکتفا کیا جائے گا لیکن حدود میں نہیں۔ اور یہ متناقض ہے جو آپ کے کلام کو ساقط کر دیتا ہے اور آپ پر ان کے مقاصد کو رد کر دیتا ہے، کیونکہ ہم کہتے ہیں: یہ حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس شہادت میں فقط بیرونی پر ہی اکتفا نہ کیا جائے گا جیسا کہ حدود میں۔ ابن عربی نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 35۔ جب اللہ تعالیٰ نے حقوق مالیہ میں شاہد کے لئے عدالت اور رضا کی شرط عائد کی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تو پھر نکاح میں ان کا شرط ہونا بدرجہ اولیٰ ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جہاں انہوں نے فرمایا: بے شک

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب من لا تجوز شہادتہ، حدیث نمبر 2367، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نکاح دو فاسق آدمیوں کی شہادت کے ساتھ منعقد ہو جاتا ہے۔ سو آپ نے اموال میں جس احتیاط کا حکم دیا ہے اس کی نکاح سے نفی کر دی ہے حالانکہ یہ زیادہ اولیٰ اور ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ حل و حرمت اور حد و نسب تعلق رکھتے ہیں (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رضا اور عدالت کی شرط عائد کی ہے اور اس کا پسندیدہ ہونا محض اسلام سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو اس کے احوال میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور نقطہ اس کے اس قول سے دھوکہ نہیں کھایا جائے گا کہ میں مسلمان ہوں۔ بسا اوقات اس میں ایسی چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جو اس کی شہادت کو رد کرنے کا موجب ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۝ (البقرہ) (اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو دنیاوی اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے (اور اللہ تعالیٰ) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا) اور مزید فرمایا: وَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ الآیہ (المنافقون: 4) (اور جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے ...)

مسئلہ نمبر 36۔ قولہ تعالیٰ: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ابو عبید نے کہا ہے: تَضِلَّ بمعنی تنسیٰ ہے (کہ ان میں سے ایک بھول جائے) اور شہادت میں ضلال کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کچھ حصہ بھول جائے اور کچھ یاد ہو اور آدمی اس کے درمیان حیران باقی رہ جاتا ہے یہی ضلال ہے اور جو پوری شہادت بھول جائے تو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاتا: ضل فیہا۔ (وہ اس میں بھول گیا) حمزہ نے جزا کے معنی کی بنا پر ان میں ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اور فَتُذَكِّرَ میں فا کو اس کا جواب قرار دیا ہے۔ اور شرط اور جواب شرط رَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ کی صفت ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہیں۔ اور فَتُذَكِّرُ استیناف کی بنا پر مرفوع ہے۔ جیسا کہ یہ قول مرفوع ہے وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ (المائدہ: 95) (اور جو (اب) پھر کیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے) یہ سیبویہ کا قول ہے۔

اور جنہوں نے ان میں ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے تو یہ مفعول لہ ہے اور اس میں عامل محذوف ہے اور جماعت کی قرأت کے مطابق فَتُذَكِّرَ منصوب ہے اور اس فعل پر معطوف ہے جس کو ان کے ساتھ نصب دی گئی ہے۔

نحاس نے کہا ہے: تَضِلَّ تا اور ضاد کے فتح کے ساتھ پڑھنا جائز ہے اور تِضِلَّ تا کے کسرہ اور ضاد کے فتح کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ پس جس نے کہا: تِضِلَّ یہ ان کی لغت پر ہے جنہوں نے کہا ہے: ضَلِلْتُ تَضَلُّ۔ اور اسی پر آپ تِضَلُّ کہتے ہیں اور تا کو کسرہ دیا جاتا ہے تاکہ وہ ماضی فعلت ہونے پر دلالت کرے۔ اور جحدری اور عیسیٰ ابن عمر نے اَنْ تُضَلَّ تا کو ضمہ ضاد کو فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ بمعنی تُنْسٰی (یعنی اگر ان میں سے ایک بھلا دی جائے) اور اسی طرح ان دونوں سے ابو عمرو الدانی نے بیان کیا ہے۔ اور نقاش نے جحدری سے تا کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ نقل کیا ہے بمعنی اَنْ تُضِلَّ الشَّهَادَةَ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 255

(کہ وہ شہادت کو بھلا دے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: أَضْلَلْتُ الفرس والبعير (میں نے گھوڑے اور اونٹ کو گم کر دیا۔) جب وہ دونوں تجھ سے ضائع ہو جائیں اور چلے جائیں پھر تو انہیں نہ پا سکے۔ (تب یہ جملہ کہا جاتا ہے)

مسئلہ نمبر 37۔ قولہ تعالیٰ: فَتُذْكِرَ ابن کثیر اور ابو عمرو نے ذال اور کاف کو مخفف پڑھا ہے اور اس پر معنی یہ ہوگا کہ وہ اسے شہادت میں مذکر کی طرف لوٹا دے، کیونکہ عورت کی شہادت نصف شہادت ہے اور جب دو عورتوں نے شہادت دی تو دونوں کا مجموعہ ایک مرد کی شہادت کی طرح ہوگا۔ سفیان بن عیینہ اور ابو عمرو بن العلاء نے یہی کہا ہے۔ اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ وہ ضلال جس کا معنی نسیان ہے اس کے مقابلہ میں صرف ذکر (یاد دہانی) ہی آسکتا ہے اور یہی جماعت کی قرأت کا معنی ہے۔ فَتُذَكِّرَ یعنی وہ دوسری اسے آگاہ کرے جب وہ غافل ہو جائے اور بھول جائے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو عمرو کی قرأت اس کی طرف راجع ہے، یعنی اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے، کہا جاتا ہے: تَذَكَّرْتُ الشيء وأذكرته غيري وذكّرته (میں نے اسے یاد دلایا) ان تمام کا معنی ایک ہے، الصحاح میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ نمبر 38۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا حسن نے کہا ہے: یہ آیت دو امروں کو جمع کیے ہوئے ہے اور وہ دونوں یہ ہیں کہ تو انکار نہ کرے جب تجھے تحصیل شہادت کے لئے بلایا جائے اور تب جب تجھے ادائے شہادت کی طرف بلایا جائے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ، ربیع اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یعنی (تو انکار نہ کرے جب تجھے بلایا جائے) تاکہ تو شہادت اخذ کر لے اور اسے کتاب میں ثابت اور محفوظ کرے۔ اور مجاہد نے کہا ہے: آیت کا معنی ہے جب تجھے ادائے شہادت کے لئے بلایا جائے درآنحالیکہ وہ شہادت تجھے حاصل ہو چکی ہو۔ اور نقاش نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کی ہے کہ آپ نے آیت کی اس طرح تفسیر بیان فرمائی ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: پس جب تجھے بلایا جائے تاکہ تو پہلے شہادت دے تو تو اگر چاہے تو جا اور اگر چاہے تو نہ جا۔ ابو مجلز، عطا، ابراہیم، ابن جبیر، سدی، ابن زید وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس بنا پر متعاقدین کے پاس گواہوں کا حاضر ہونا واجب نہیں ہے، البتہ قرض دینے والے دونوں افراد پر لازم ہے کہ وہ گواہوں کے پاس حاضر ہوں۔ پس جب وہ دونوں ان کے پاس حاضر ہوں اور وہ دونوں انہیں کتاب میں اپنی شہادت ثبت اور محفوظ کرنے کی درخواست کریں تو یہی وہ حالت ہے جو اس ارشاد سے مراد لینا جائز ہے: وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا یعنی گواہ انکار نہ کریں جب انہیں شہادت کے اثبات کے لئے بلایا جائے اور جب ان کی شہادت ثابت ہو جائے، پھر انہیں حاکم کے پاس شہادت ادا کرنے کے لئے بلایا جائے تو یہ وہ وقت ہے جیسا کہ جب حاکم کے پاس ان دونوں کی حاضری ہوگی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور ابن عطیہ نے کہا ہے جیسا کہ حسن نے کہا ہے: آیت ندب کے اعتبار سے دو امروں کو جمع کیے ہوئے ہے۔ پس مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی معاونت کرنا مستحب ہے۔ پس جب گواہوں کی کثرت کے سبب وسعت ہو اور حق کے معطل ہونے سے محفوظ و مامون ہو تو یہ دعوت مستحب ہے اور جسے بلایا گیا ہے اس کے لئے معمولی عذر کے سبب پیچھے رہ جانا جائز ہے

اور اگر وہ بغیر عذر کے بھی پیچھے رہ جائے تو نہ اس پر گناہ ہے اور نہ اس کے لئے ثواب ہے۔

اور جب ضرورت ہو اور حق کے معطل ہونے کا تھوڑا سا بھی خوف ہو تو ندب قوی ہو جائے گا اور یہ وجوب کے قریب ہو جائے گا اور جب اسے یہ علم ہو کہ شاہد کے شہادت سے پیچھے ہو جانے کے سبب حق ضائع اور تلف ہو جائے گا تو پھر اس پر شہادت دینا واجب ہے، بالخصوص جب شہادت اسے حاصل ہو چکی ہو اور دعوت اسے ادا کرنے کے لئے ہو، کیونکہ یہ فرض زیادہ پختہ کرنے والی ہے۔ کیونکہ یہ گردن میں قلادہ ہے اور امانت ادا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت سے اس پر دلیل ظاہر ہوتی ہے کہ امام کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے گواہوں کا انتظام کرے اور بیت المال سے ان کے لئے ان کی ضروریات پوری کرے اور ان کا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے تحمل شہادت کے بغیر اور کوئی کام نہ ہو۔ اور اگر اس طرح نہ ہوا تو حقوق ضائع اور باطل ہو جائیں گے تو معنی یہ ہو گا: گواہ انکار نہ کریں جب وہ لوگوں کے حقوق اخذ کریں کہ وہ انہیں ادا کریں گے۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کہا جائے: یہ شہادت تو بالاجرت ہے تو ہم کہیں گے: یہ خالصۃً ایسی قوم کی شہادت ہے جنہوں نے اپنے حقوق بیت المال سے پورے کئے اور یہ قاضیوں اور والیوں کی تنخواہوں اور ان جمیع مصالح کی طرح ہے جو مسلمانوں کے لئے معاون ہوتے ہیں۔ اور یہ (شہادت) بھی من جملہ انہی میں سے ہے۔ واللہ اعلم۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا پس ان کے لئے مقرر کر دیئے۔

مسئلہ نمبر 39۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا یَاْبَ الشُّھَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شاہد وہ ہے جو حاکم کے پاس چل کر جاتا ہے اور یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے مطابق ہر زمانے میں عمل کیا گیا ہے اور ہر امت نے اسے سمجھا ہے۔ اور ان کی امثال میں سے یہ ہے: فی بیتہ یؤتی الحکم (ان کے گھر میں منصف (فیصلہ کرنے والا ثالث) کو لایا جائے گا)۔

مسئلہ نمبر 40۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا تو غلام گواہوں کی جماعت سے خارج ہو گیا اور یہی مخاطب کے عموم کو خاص کر رہا ہے، کیونکہ اس کے لئے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے (شہادت کے لئے) آنا صحیح ہے، کیونکہ وہ بذات خود مستقل بالعلم نہیں ہے۔ بلکہ وہ غیر کی اجازت سے تصرف کرتا ہے، نتیجتاً وہ منصب شہادت سے اسی طرح گر گیا جیسا کہ وہ ولایت کے مرتبہ سے گر گیا ہے۔ ہاں بلکہ! جیسا کہ وہ جمعہ، جہاد اور حج کے فرض کی ادائیگی سے گرا ہوا ہے (1)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 41۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ شہادت کی طرف بلانے کی حالت میں ہے۔ رہا وہ جس کے پاس کسی آدمی کے حق میں شہادت ہو اور اس کا وہ مستحق جو اس سے نفع حاصل کر سکتا ہے وہ اسے نہ جانتا ہے تو ایک قوم نے کہا ہے: اس شہادت کو ادا کرنا مستحب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا یَاْبَ الشُّھَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا اور بلانے کے وقت اللہ تعالیٰ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 257

نے ادائے شہادت کو فرض قرار دیا ہے اور جب نہ بلایا جائے تو پھر شہادت دینا مستحب ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''گواہوں میں سے بہترین وہ ہے جو اپنی شہادت دینے کے لئے آئے اس سے قبل کہ اسے اس کے لئے کہا جائے'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ شہادت دینا فرض ہے اگرچہ اس کے بارے درخواست نہ کی جائے جبکہ حق کے ضائع یا فوت ہونے کا خوف ہو یا اس پر طلاق یا عتق کا خوف ہو جیسے بیوی ہونے کے اعتبار سے اس سے استمتاع کرنے اور غلام سے خدمت لینے کا تصرف حاصل تھا وغیرہ ذالک۔ پس جس نے اس میں سے کوئی شی ذخیرہ کر رکھی ہو تو اس شہادت کو ادا کرنا اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ اس کی ادائیگی کو اس پر موقوف نہیں کرے گا کہ اسے شہادت کے لئے کہا جائے اور وہ اس طرح حق کو ضائع کر دے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ (الطلاق: 2) (گواہی ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے دو) اور مزید فرمایا: اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۞ (الزخرف) (ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت ملتی ہے: انصر اخاک ظالما او مظلوما (تو اپنے بھائی کی مدد کر چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو) تو اس پر اس کی مدد کرنا متعین ہو گیا اس شہادت کی ادائیگی کے ساتھ جو اس کے پاس ہو اس حق کو زندہ کرنے کے لئے جسے انکار مار دے (ضائع کر دے)۔

مسئلہ نمبر 42۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ وہ آدمی جس پر شہادت دینا واجب ہو ان وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر جو ہم نے ذکر کی ہیں اور وہ اسے ادا نہ کرے تو یہ شاہد اور شہادت میں عیب ہے اور اس میں حقوق اللہ اور حقوق عباد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ ابن القاسم وغیرہ کا قول ہے۔ اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شہادت حقوق عباد میں سے کسی حق کے بارے ہو تو وہ خاص طور پر اس شہادت میں عیب ہوگا اور اس کے بعد اسے ادا کرنا اس کے لئے مناسب نہ ہو گا۔ پہلا قول صحیح ہے کیونکہ وہ شے جو اس کے عیب کو ثابت کر رہی ہے وہ اس کا اس امر کو ادا نہ کرنے کے سبب فاسق ہو جانا ہے جس امر کی ادائیگی بغیر عذر کے اس پر واجب تھی اور فسق مطلق شہادت کی اہلیت کو سلب کر لیتا ہے اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 43۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد: خیر الشهداء الذی یاتی بشهادته قبل ان یسألها اور اس ارشاد کے درمیان جو حدیث عمران بن حصین میں ہے کوئی تعارض نہیں (وہ ارشاد یہ ہے) ان خیرکم قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم (بے شک تم میں سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو ان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں) پھر عمران نے کہا: میں نہیں جانتا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے بعد دو بار ذکر فرمایا یا تین بار۔ پھر ان کے بعد قوم ہوگی جو شہادت دیں گے اور انہیں شاہد نہیں بنایا جائے گا وہ خیانت کریں گے اور انہیں امین نہیں بنایا جائے گا وہ نذریں مانیں گے اور پوری نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا (1)۔'' دونوں کو صحیحین نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث تین وجوہ پر محمول ہے: ان میں سے ایک یہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب ما یحذر من زهرة الدنیا، حدیث نمبر 5948، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے کہ اس سے مراد جھوٹا گواہ ہو کیونکہ وہ ایسی شے کے بارے گواہی دیتا ہے جس پر اسے شاہد نہ بنایا گیا ہو۔ یعنی ایسی شے کے بارے میں جسے نہ اس نے خود اخذ کیا ہو اور نہ ہی اس جانب اس کی توجہ کرائی گئی ہو۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے باب الجابیہ پر خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں اسی طرح قیام فرما تھے جیسے میں تم میں کھڑا ہوں پھر آپ نے فرمایا: یایھا الناس اتقوا اللہ فی اصحابی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم ثم یفشو الکذب وشھادۃ الزور (اے لوگو! میرے اصحاب کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے آئیں گے پھر جھوٹ اور جھوٹی شہادت پھیل جائے گی) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ ہو جسے حرص اور طمع اس شے کے نافذ کرنے پر برانگیختہ کرے جس کے ساتھ وہ شہادت دے گا لہٰذا وہ درخواست سے قبل ہی شہادت دینے میں جلدی کرتا ہے۔ پس یہ شہادت مردود ہے کیونکہ یہ ایسی خواہش پر دلالت کرتی ہے جو شاہد پر غالب ہوتی ہے اور تیسری وجہ یہ ہے جسے ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے جو کہ اس حدیث کے بعض طرق کے راوی ہیں: وہ ہمیں عہد اور شہادت سے منع کرتے تھے اور ہم ابھی بچے تھے۔

مسئلہ نمبر 44۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ تَسْـَٔمُوْٓا کا معنی ہے تم ملول اور تم اکتاؤ نہیں۔

اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے سَئِمْتُ اَسْاَمُ سَاَمًا و سَاَمَۃً و سَآمًا [و سَآمَۃً] و سَاَمًا (اکتا جانا) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيَاةِ وَمَنْ يَعِشْ ... ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا اَبَالَكَ يَسْاَمِ

میں زندگی کی تکالیف سے اکتا گیا اور جو اسی برس تک زندہ رہا، تیرا باپ نہ ہو وہ اکتا ہی جاتا ہے۔

اَنْ تَكْتُبُوْهُ یہ فعل کے سبب محل نصب میں ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا یہ دونوں تکتبوہ میں ضمیر سے حال ہیں۔ اور صغیر کو اس کے خاص اہتمام کے سبب مقدم ذکر کیا گیا ہے اور یہ نہی اکتانے سے ہے۔ بلاشبہ یہ اس لئے وارد ہوئی ہے کیونکہ ان کے درمیان قرضوں کا لین دین کثرت سے تھا لہٰذا ان کے بارے یہ خوف ہونے لگا کہ وہ لکھنے سے اکتا جائیں (1) اور کوئی یہ کہنے لگے: قرضے کی یہ مقدار تو بالکل قلیل اور تھوڑی ہے مجھے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے قلیل و کثیر میں لکھنے کی انتہائی تاکید فرمائی۔ ہمارے علماء نے کہا ہے مگر وہ شے جو اپنی کمی اور اقرار و انکار میں نفس کے اس کی طرف جھکاؤ نہ ہونے میں وہ قیراط اور اسی کی طرح کی ہو (تو اس میں لکھنے کی ضرورت نہیں)۔

مسئلہ نمبر 45۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ اَقْسَطُ بمعنی اعدل (یہ تحریر زیادہ عدل کرنے والی ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک) یعنی یہ کہ قلیل و کثیر مقدار کو لکھ لیا جائے اور اس پر گواہ بنا لئے جائیں۔ (2)

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ احکام القرآن، صفحہ 257، جلد 1، دار الفکر لبنان

وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یعنی یہ شہادت کو صحیح کرنے والی اور اسے محفوظ بنانے والی ہے۔ وَ اَدْنٰی اس کا معنی ہے اقرب۔ زیادہ قریب ہے۔ اور تَرْتَابُوْا بمعنی تم شک کرو۔ (یعنی یہ تحریر تمہیں شک سے بچانے کا بہت آسان اور قریب ترین طریقہ ہے۔)

مسئلہ نمبر 46۔ قولہ تعالیٰ: وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ یہ اس پر دلیل ہے کہ شاہد جب کتاب دیکھے اور اسے شہادت یاد نہ ہو تو وہ اسے ادا نہیں کرے گا کیونکہ اس پر اس میں شک داخل ہو چکا ہے اور وہ شہادت نہیں دے سکتا مگر اسی شے کی جسے وہ جانتا ہو لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہے: یہ میری تحریر ہے اور اب مجھے وہ یاد نہیں جو میں نے اس میں لکھا۔(1)

ابن منذر نے کہا: اہل علم میں سے اکثر وہ ہیں جن سے روایات محفوظ کی جاتی ہیں وہ اس سے منع کرتے ہیں کہ کوئی شاہد اپنے خط پر شہادت دے جب اسے شہادت یاد نہ ہو۔

اور امام مالک نے اس کے جواز پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ مَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا۔

اور بعض علماء نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے کتابت کی نسبت عدالت کی طرف کی ہے تو اس میں اس کے لئے وسعت و گنجائش ہے کہ وہ اپنے خط پر شہادت دے اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو۔

ابن مبارک نے معمر سے ابن طاؤس عن ابیہ کی سند سے ایک آدمی کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ شہادت پر شہادت دیتا ہے اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ فرمایا: کوئی حرج نہیں کہ وہ شہادت دے، بشرطیکہ وہ تحریری معاہدہ میں اپنی علامت یا اپنے ہاتھ کی تحریر کو پالے۔ ابن مبارک نے کہا: میں نے یہ بہت اچھا سمجھا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی اخبار و روایات مروی ہیں کہ آپ نے کئی ایک اشیاء میں دلائل و شواہد کے ساتھ فیصلہ کیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے رسل عظام علیہم السلام سے بھی ایسی روایات ہیں جو اس مذہب کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الاحقاف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 47۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَكُمْ اس میں اَنْ استثناء ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے یا اول کلام سے نہیں ہے(2)۔ اخفش (ابو سعید) نے کہا ہے: ای الا ان تقع تجارۃ (مگر یہ کہ تجارت واقع ہو)۔ پس کان بمعنی وقع اور حدث کے ہے۔ اور ان کے سوا کسی اور نے کہا ہے: تُدِیْرُوْنَهَا یہ خبر ہے۔ اور اکیلے عاصم نے کان کی خبر ہونے کی بنا پر تجارۃً پڑھا ہے(3) اور اس کا اسم اس میں مخفی ضمیر ہے اور حاضرۃً یہ تجارۃً کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے الا ان تکون التجارۃ تجارۃ حاضرۃ۔ یا الا ان تکون المبایعۃ تجارۃ حاضرۃ (مگر یہ کہ سودا دست بدست ہو) یہی ابو علی فارسی نے اسے اسی طرح مقدر کیا ہے اس کی نظائر اور اس پر استشہاد پہلے گزر چکا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے ان پر لکھنے کی مشقت کو ملاحظہ فرمایا تو اس کے ترک پر نص بیان فرمائی اور ہر اس بیع میں حرج کو رفع کر دیا جو نقد و نقد ہو اور غالباً یہی بیع ہوتی ہے جبکہ وہ قلیل شے ہیں جو مثلاً کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ، نہ کہ کثیر میں جیسا کہ املاک وغیرہ (یعنی املاک کی خرید و فروخت میں چونکہ عوض کثیر ہوتا ہے اس لئے اسے لکھنا لازم ہے۔) سدی اور ضحاک نے کہا ہے:

1۔ احکام القرآن، صفحہ 258، جلد 1، دار الفکر لبنان 2۔ المحرر الوجیز، صفحہ 383، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت 3۔ ایضاً

یہ (رخصت) اس سودے میں ہے جو دست بدست ہو۔(1)

مسئلہ نمبر 48۔ قولہ تعالیٰ: تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ یہ ارشاد باہم قبضہ کرنے اور معوض کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جب گھر، زمین اور حیوانوں میں سے کثیر جدائی اور غلطی کو قبول نہیں کرتے اور نہ انہیں چھوڑا جا سکتا ہے تو ان کے سودے میں لکھ لینا اچھا ہے اور اس میں قرضے کا لین دین ملحق ہو جائے گا (2) تو گویا تحریر اس کے لئے زوال اور معیوبی کا باعث ہوگی جبکہ یہ قریب ہے کہ احوال بدل گئے اور دلوں کی کیفیت میں تغیر آنے سے زوال یا نزاع طاری ہو جائے۔ پس جب وہ معاملہ میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گے اور دونوں اپنے اپنے عوض پر قابض ہوں گے اور دونوں میں سے ہر ایک اس شے کے ساتھ مجلس عقد سے جدا ہوگا جو اس نے اپنے ساتھی سے خریدی ہے تو عرفاً و عادۃً تنازع کا خوف کم ہوگا مگر قلیل اور پوشیدہ اسباب کے ساتھ شریعت نے نقد اور ادھار دونوں حالتوں میں ان مصالح پر آگاہ کیا ہے (3) اور جس پر غائب ہوا جا سکتا ہے اور جس پر غائب نہیں ہوا جا سکتا تحریر، شہادت اور رہن کے ساتھ۔

امام شافعی نے کہا ہے: بیوع تین ہیں: ایک وہ بیع جو کتابت اور گواہوں کے ساتھ ہو اور دوسری وہ بیع جو رہن کے عوض ہو اور تیسری وہ بیع جو امانت کے ساتھ ہو اور پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب نقد کے عوض بیع کرتے تھے تو گواہ بنا لیتے تھے اور جب ادھار کوئی شے بیچتے تھے تو اسے لکھ لیتے تھے۔(4)

مسئلہ نمبر 49۔ قولہ تعالیٰ: وَاَشْهِدُوْٓا علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور تم گواہ بنا لیا کرو چھوٹے سودے پر بھی اور بڑے سودے پر بھی (5)۔ اور لوگوں نے اس کے واجب ہونے یا مستحب ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے (6)، پس حضرات ابو موسیٰ اشعری، ابن عمر، ضحاک، سعید بن مسیب، جابر بن زید، مجاہد، داؤد بن علی اور ان کے بیٹے ابو بکر رحمہم اللہ علیہم نے کہا ہے: بیع کے وقت گواہ بنانا واجب ہے (7)۔ اور اس بارے میں ان میں سے زیادہ شدت حضرت عطا نے کی ہے انہوں نے کہا ہے: تو گواہ بنا لے جب تو کوئی شے فروخت کرے اور جب تو کوئی شے خریدے درہم کے عوض یا نصف درہم کے عوض یا چوتھائی درہم کے عوض یا اس سے بھی کم کے عوض، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ (اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید و فروخت کرو)

اور ابراہیم نے کہا ہے: گواہ بنا لے جب کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے اگرچہ وہ سبزی کی گٹھی ہو۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اسے ترجیح دی ہے ان میں سے علامہ طبری بھی ہیں اور انہوں نے کہا ہے: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے جب وہ کوئی شے فروخت کرے اور جب کوئی شے خریدے مگر یہ کہ اس پر گواہ بنا لیا جائے، ورنہ وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 383، دار الکتب العلمیہ بیروت   2۔ ایضاً

3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 258، دار الفکر بیروت   4۔ ایضاً

5۔ جامع البیان، صفحہ 158، جلد 3-4، دار احیاء التراث العربی   6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 384، دار الکتب العلمیہ لبنان   7۔ ایضاً

کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والا ہوگا اور اسی طرح اگر وہ مقررہ مدت تک ادھار ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ لکھوالے اور گواہ بنا لے اگر وہ کوئی کاتب پائے۔

اور علامہ شعبی اور حسن نے یہ موقف اپنایا ہے کہ اس امر کا اطلاق محض ندب (1) اور ارشاد پر ہے وجوب پر نہیں ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہی قول امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ اور ابن عربی نے یہ قول کیا ہے کہ یہ تمام کا قول ہے فرمایا: اور یہی صحیح ہے۔ اور ضحاک کے سوا کسی سے بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ وجوب کے لئے ہے۔ فرمایا: تحقیق حضور نبی کریم ﷺ نے بیع کی اور اسے تحریر کیا۔ فرمایا: اور آپ ﷺ کی تحریر کا نسخہ یہ ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم هذا ما اشتری العداء بن خالد بن هوذة من محمد رسول الله ﷺ، اشتری منه عبدا - او امة - لا داء ولا غائلة ولا خبثة بيع المسلم المسلم (بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ وہ ہے جسے عداء بن خالد بن ہوذہ نے محمد رسول اللہ ﷺ سے خریدا ہے، اس نے آپ ﷺ سے غلام یا کنیز خریدی۔ اس میں کوئی بیماری نہیں، کوئی شر اور فساد نہیں، اور کوئی پلیدی اور نجاست نہیں اور یہ مسلمان کی بیع مسلمان کے ساتھ ہے۔) تحقیق آپ ﷺ نے بیع کی اور کسی کو گواہ نہیں بنایا۔ اور آپ ﷺ نے گھوڑا خریدا اور اپنی زرہ یہودی کے پاس رہن رکھی اور آپ نے کوئی گواہ نہیں بنایا۔ اگر گواہ بنانا امر واجب ہوتا تو جھگڑے کے خوف کی وجہ سے رہن کے ساتھ بھی واجب ہوتا۔ (2)

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے سوا دوسروں سے وجوب ذکر کیا ہے۔ اور عداء کی اس حدیث کو دارقطنی اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد اسلام قبول کیا۔ اور وہ کہتے ہیں: ہم نے حنین کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ لڑی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں غلبہ نہیں دیا اور نہ ہماری مدد کی، پھر وہ اسلام لائے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا کیا۔ اسے ابو عمر نے ذکر کیا ہے اور انہوں نے راوی کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے: اصمعی نے کہا ہے: میں نے سعید بن ابی عروبہ سے غائلہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد بھاگ جانا، چوری کرنا اور زنا کرنا ہے اور میں نے ان سے الخبثہ کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: مسلمانوں کے عہد میں رہنے والوں کی خرید و فروخت کرنا (یعنی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت رہ رہا ہو)۔

اور امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: اس میں وجوب تو باعث قلق و اضطراب ہے اور رہا تاکید میں تو وہ بہت مشکل اور شاق ہے اور جو کچھ اکثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بسا اوقات ایک تاجر گواہ بنانے کو ترک کر کے دوستی کا ارادہ اور قصد کرتا ہے اور کبھی بعض شہروں میں اس کی عادت اور رواج ہوتا ہے (کہ گواہ نہیں بنایا جاتا) اور کبھی وہ عالم اور باعزت بڑے آدمی سے حیا محسوس کرتا ہے لہٰذا اس پر گواہ نہیں بنایا جاتا، پس یہ سب استئمان (امین بنانا) میں داخل ہیں اور امر بالاشہاد مستحب باقی رہ جاتا ہے، کیونکہ اس میں اغلباً مصلحت ہوتی ہے جب اس سے مانع کوئی عذر موجود نہ ہو جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ لبنان

2۔ احکام القرآن، صفحہ 259، جلد 1، دار الفکر بیروت۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث 2241، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مہدوی، نحاس اور مکی نے ایک قوم سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا (1) اور نحاس نے اسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ اور کہا اس آیت نے اپنے ماقبل کو منسوخ کر دیا ہے۔(2)

نحاس نے کہا ہے: یہ حسن، حکم اور عبدالرحمن بن زید کا قول ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے اس کا کوئی معنی نہیں کیونکہ یہ حکم پہلے کا مغایر اور اس کے سوا ہے۔ اور بلاشبہ یہ حکم اس کے بارے ہے جو لکھنے والا کاتب نہ پائے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَإِن كُنتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا یعنی پھر وہ اس سے رہن کا مطالبہ نہ کرے فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ (البقرہ: 283) (اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۔ پھر اگر اعتبار کرے کوئی تم میں سے دوسرے پر تو چاہیے کہ ادا کرے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۔) فرمایا: اگر اس کا پہلے کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: وَإِن كُنتُم مَّرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ الآیۃ (النساء: 43) (اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے) یہ اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ الآیۃ (المائدہ: 6) (اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو۔) اور پھر یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد گرامی: فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (پس جو (غلام کو) نہ پائے تو وہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے۔) اس ارشاد کے لئے ناسخ ہو: فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ (پس ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔)

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ: فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا کا ابتدائے آیت سے جو کہ امر بالاشہاد پر مشتمل ہے

1۔ المحرر الوجیز، صفحہ 384، جلد 1، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ جامع البیان، جلد 3، صفحہ 141، داراحیاء التراث العربی، ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 2355، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نزول میں متاخر ہو اور ناسخ اور ناظر مرتب نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل ہوئے۔ اور ایک حالت میں اکٹھے نازل ہونے والے دو حکموں کو ناسخ ومنسوخ قرار دینا جائز نہیں ہوتا۔ فرمایا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب ان سے کہا گیا آیۃ الدین منسوخ ہے تو آپ نے فرمایا: نہیں قسم بخدا! آیۃ الدین محکم ہے اس میں کوئی نسخ وغیرہ نہیں۔ فرمایا: اشہاد یعنی گواہ بنا لینے کا حکم طمانیت کے لئے فرمایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے دین کی توثیق اور پختگی کے لئے کئی طرق ارشاد بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک لکھوانا ہے، ایک رہن رکھنا ہے اور ایک گواہ بنا لینا ہے۔ اور علمائے امصار کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ رہن بطریق ندب مشروع ہے نہ کہ بطریق وجوب۔ پس گواہ بنانے میں بھی حکم اسی کی مثل سمجھا جائے گا اور لوگ ہمیشہ سفر وحضر، بر وبحر اور صحرا وپہاڑ میں بغیر گواہ بنائے خرید وفروخت کرتے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ لوگ اسے جانتے ہیں لیکن کوئی انکار نہیں کرتا تو اگر گواہ بنانا واجب ہوتا تو وہ اس واجب کو ترک کرنے والے پر اعتراض کرنا قطعاً ترک نہ کرتے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام حسین بصورت استدلال ہے اور اس سے حسین تر وہ ہے جو ترک اشہاد کے بارے میں صریح سنت میں وارد ہے اور وہ وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے طارق بن عبداللہ محاربی سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: ”ہم ربذہ اور جنوب ربذہ سے ایک قافلہ کی صورت میں آئے اور مدینہ طیبہ کے قریب آکر ہم نے پڑاؤ ڈالا اور ہمارے ساتھ ہماری ایک عورت پالکی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پس اس اثنا میں کہ ہم وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے پاس ایک آدمی آیا اس پر دو سفید کپڑے تھے اور اس نے سلام کیا اور ہم نے بھی اس پر سلام کا جواب لوٹایا تو اس نے پوچھا: یہ قافلہ کہاں سے آیا ہے؟ تو ہم نے کہا: ربذہ سے اور ربذہ کے جنوب سے۔ راوی کہتے ہیں: اور ہمارے ساتھ ایک سرخ اونٹ تھا تو اس نے پوچھا کیا تم مجھے اپنا یہ اونٹ بیچتے ہو؟ تو ہم نے کہا: ہاں۔ انہوں نے پوچھا: کتنے کے عوض؟ ہم نے کہا: کھجور کے اتنے اتنے صاع کے عوض۔ اس نے کہا: ہم اس میں سے کوئی شے کم نہیں کرائیں گے (یعنی پورا پورا ادا کریں گے) اور کہا: میں اسے پکڑ لوں، پھر اس نے اونٹ کو سر سے پکڑا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ میں داخل ہو گیا اور ہم سے اوجھل ہو گیا اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ہم نے کہا: تم نے اپنا اونٹ ایسے آدمی کو دے دیا ہے جسے تم پہچانتے ہی نہیں! تو اس پالکی میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا: تم ایک دوسرے کو ملامت نہ کرو میں نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا ہے وہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے، میں نے کسی آدمی کا چہرہ اس کے چہرہ سے بڑھ کر چودھویں رات کے چاند سے زیادہ مشابہ نہیں دیکھا۔ تو جب شام ہوئی تو ہمارے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم فرمایا ہے کہ تم اس سے کھاؤ یہاں تک کہ تم خوب سیر ہو جاؤ اور تم اپنا کیل کر لو یہاں تک کہ تم اپنا حق پورا کر لو۔ اس نے بیان کیا: پس ہم نے کھایا یہاں تک کہ ہم سیر ہو گئے۔ اور ہم نے کیل کیا یہاں تک کہ ہم نے اپنا حق پورا کر لیا۔(1)

اور زہری نے عمارہ بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان کے چچا نے انہیں بتایا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ الحدیث۔ اور اس میں ہے: پس اعرابی نے

1۔ سنن الدار قطنی، کتاب البیوع، صفحہ 45، حدیث 186، جلد 3، دار المحاسن قاہرہ

ہو تو یہ بھی ایک ایسا عذر ہے جو رہن کے مطالبہ کو ثابت کرتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی جس سے آپ نے جو ادھار لینے کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا: یا شاید محمد (ﷺ) میرا مال لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اس نے جھوٹ بولا ہے بلاشبہ میں زمین میں بھی امین ہوں اور آسمان میں بھی امین ہوں اگر وہ مجھ پر اعتبار کرتا تو میں یقیناً اسے ادا کر دیتا تم میری زرہ اس کے پاس لے جاؤ (1)"۔ پس آپ ﷺ کا وصال ہوا درآنحالیکہ آپ کی زرہ اس کے پاس گروی پڑی ہوئی تھی۔ ابھی اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جمہور علماء نے کہا ہے: سفر میں گروی رکھنا نص قرآن سے ثابت ہے اور حضر میں گروی رکھنا سنت رسول ﷺ سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے اور ہم نے حضر میں آیت سے معنوی طور پر اس کے جائز ہونے کو بیان کیا ہے کیونکہ کبھی اعذار حضر میں بھی مترتب ہوتے ہیں اور سوائے حضرت مجاہد، ضحاک اور داؤد کے کسی سے بھی حضر میں اس کا ممنوع ہونا مروی نہیں ہے، اس حال میں کہ وہ آیت سے استدلال کرتے ہیں اور آیت میں کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ یہ کلام اگرچہ شرط کے مخرج میں نکلا ہے سو اس سے مراد غالب احوال ہیں۔ اور آیت میں حالت سفر میں رہن کا ہونا ان چیزوں میں سے نہیں ہے جو حالت سفر کے بغیر ممنوع ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت مذکور ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک یہودی سے ایک معین مدت تک اناج خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی (2)۔ اسے نسائی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور آپ کی زرہ یہودی کے پاس گھر والوں کے لئے تیس صاع جو کے عوض گروی پڑی ہوئی تھی (3)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا جمہور نے کاتباً پڑھا ہے بمعنی وہ آدمی جو لکھتا ہے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابی، حضرت مجاہد، حضرت ضحاک، حضرت عکرمہ اور حضرت ابو العالیہ رضی اللہ عنہم نے وَلَمْ تَجِدُوْا كِتَابًا پڑھا ہے (4)۔ ابوبکر انباری نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر بیان کی ہے اور فرمایا ہے: "اس کا معنی ہے پس اگر تم دوران سفر سیاہی نہ پاؤ" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كُتَّابًا بھی مروی ہے (5)۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قراءت شاذ ہے اور قراءت عامہ اس کے خلاف ہے۔ اور بہت کم ہی کوئی شے قراءت عامہ سے خارج ہوتی ہے مگر اس میں طعن ہوتا ہے اور کلام تو کاتب کے بارے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے ارشاد فرمایا ہے: وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل وانصاف کے ساتھ لکھے) اور كُتَّاب پوری جماعت کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: کتاب اس اعتبار سے حسین ہے کہ ہر مصیبت کے لئے ایک کاتب ہو، پس یہ جمع کے لئے کہا گیا ہے: ولم تجدوا کتابا۔ (اور تم لکھنے والے نہ پاؤ) مہدوی نے ابو العالیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کُتُبًا پڑھا ہے اور یہ کتاب کی جمع ہے اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دارالکتب العلمیہ۔ ایضاً سنن ترمذی، حدیث نمبر 1134، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، روایت اسحٰق

2۔ صحیح مسلم، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 31، وزارت تعلیم۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب البیوع، صفحہ 1028، جلد 1، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 229 4۔ الکشاف، جلد 1، مکتب الاعلام الاسلامی 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

والخبز واللحم لهم راهن — وقهوة راووقها ساكب (1)

اس میں راہن ہمیشہ رہنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

جوہری نے کہا ہے: رهن الشيء رهنا۔ ای دام، یعنی شے ہمیشہ رہی اور أرهنت لهم الطعام والشراب اور میں نے ان کے لیے طعام و شراب ہمیشہ رکھا، اور وہ طعام راهن اور الراهن کا معنی الثابت (یعنی ثابت رہنے والا، ہمیشہ رہنے والا) اور الراهن کا معنی ہے اونٹوں اور لوگوں میں سے کمزور ہونے والا۔

شاعر کا قول ہے:

اما ترى جسمي خلا قد رهن — هزلا وما مجد الرجال في السمن

اس میں رهن کمزور ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ رہن جو کہ وثیقہ اور ضمانت کے معنی میں ہے کہا جاتا ہے وہ ارہن سے ہے۔ أرهنت ارهانا (میں نے شے گروی رکھی) اسے ان میں سے بعض نے بیان کیا ہے۔

اور ابو علی نے کہا ہے: أرهنت في السلعة (میں نے مہنگائی میں اضافہ کر دیا) اور رہی قرض اور بیع کی صورت تو اس میں ہے رهنت۔ (2) (یعنی میں نے قرض اور بیع کے عوض شے گروی رکھی۔)

اور ابو زید نے کہا ہے: أرهنت في السلعة ارهانا (میں نے سامان کی قیمت خوب چڑھا دی) اور یہ مہنگائی کے معنی میں خاص ہے۔

کسی شاعر کا قول ہے:

عيدية أرهنت فيها الدنانير

عیدیہ میں دینار بڑھا دیئے گئے ہیں۔

شاعر اونٹنی کا وصف بیان کر رہا ہے اور عید مہرہ کا ایک قبیلہ ہے اور مہرہ کے اونٹ بڑے عمدہ اور اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں۔

اور زجاج نے کہا ہے: گروی رکھنے کے معنی میں کہا جاتا ہے: رهنت اور أرهنت (میں نے گروی رکھی)

ابن اعرابی اور اخفش نے یہی کہا ہے۔ عبداللہ بن ہمام السلولی نے کہا ہے:

فلما خشيت أظافيرهم — نجوت وأرهنتهم مالكا (3)

اس میں أرهنتهم گروی رکھنے کے معنی میں ہے۔

ثعلب نے کہا ہے: تمام رواۃ نے وأرهنتهم کہا ہے اس بنا پر کہ رهنته اور أرهنته دونوں جائز ہیں سوائے اصمعی کے کیونکہ انہوں نے اسے وأرهنهم روایت کیا ہے۔ اس بنا پر کہ انہوں نے فعل مضارع کا عطف فعل ماضی پر کیا ہے اور یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 386، دار الکتب العلمیہ — 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 387 — 3۔ ایضاً

کے اس قول کے مشابہ قرار دیا ہے: ثمنت و اثمنت وجهه اور یہ مذہب حسن ہوتا اچھا ہے، کیونکہ یہ دو لغتیں ہیں اور اصل کو پہلے فعل کے لئے حال بنایا گیا ہے اس معنی کی بنا پر قمت صاکا وجهه یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا اور آنحالیکہ وہ ان کے پاس مقیم تھا، کیونکہ یہ نہیں کہا جاتا: ارهنت الشیئ، بلکہ یہ کہا جاتا ہے: رهنته (میں نے شئے گروی رکھی) اور آپ کہتے ہیں رهنت لسانی بکذا، (میں نے اپنی زبان اتنے کے عوض گروی رکھ دی) اور اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا: ارهنت، اور ابن السکیت نے کہا ہے: اس میں: ارهنت بمعنی اسلفت ہے۔ (یعنی میں نے قرض دیا) اور مرتہن وہ ہوتا ہے جو گروی کے طور پر شئے لیتا ہے اور وہ شئے جو گروی رکھی جائے وہ مرهون اور رهین کہلاتی ہے اور اس کی مؤنث رهینة ہے اور راهنت فلانا علی کذا مراهنة کا معنی ہے میں نے فلاں کو اتنے کی شرط پر خطرے میں ڈال دیا (ای خاطرته) اور ارهنت به ولدی ارهانا ای اخطرتهم به خطرا۔ یعنی میں نے اس کے عوض اپنی اولاد کو خطرے میں ڈال دیا۔ (یعنی شرط پر رکھ دیا) اور الرهینة الرهائن کی واحد ہے۔ یہ تمام جوہری سے منقول ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: بیع اور قرض کے معاملہ میں بلا اختلاف کہا جائے گا: رهنت رهنا۔ پھر اسی مصدر سے اس شئے کا نام رکھ دیا گیا ہے جو دی جاتی ہے۔ تو کہتا ہے: رهنت رهنا جیسا کہ کہا جاتا ہے رهنت ثوبا۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ ابو علی نے کہا ہے: جب رہن بمعنی ثبوت اور دوام ہے تو اسی وجہ سے فقہاء کے نزدیک رہن باطل ہو جاتی ہے جب وہ کسی وجہ سے مرتہن کے قبضے سے نکل کر راہن کے پاس چلی جائے، کیونکہ وہ اس سے نکل چکی ہے جو اختیار مرتہن کو اس کے بدلے دیا گیا تھا (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے نزدیک اس بارے میں بھی مختلف علیہ ہے کہ رہن جب راہن کی طرف مرتہن کے اختیار سے لوٹ جائے تو رہن باطل ہو جائے گی اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ عاریۃ یا ودیعۃ (امانت کے طور پر) لوٹے تو پھر رہن باطل نہ ہوگی۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: اس کا راہن کے قبضہ کی طرف لوٹنا مطلق سابقہ حکم کو باطل نہیں کرتا اور ہماری دلیل **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ** ہے۔ پس جب مرہونہ شئے قابض کے ہاتھ سے نکل جائے تو یہ الفاظ لغۃً اس پر صادق آتے ہیں اور اسی طرح حکماً بھی صادق آتے ہیں اور یہ واضح ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ جب کوئی قولاً گروی رکھے اور فعلاً اس پر قبضہ نہ کرے تو وہ حکماً ثابت نہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ**

امام شافعی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے صرف اسی رہن کا حکم ارشاد فرمایا ہے جو موصوف بالقبض ہو اور جب صفت نہ پائی جائے تو پھر ضروری ہے کہ حکم بھی نہ پایا جائے (3) اور یہ بالکل عیاں اور ظاہر ہے۔

اور مالکیہ نے کہا ہے: رہن عقد کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے اور راہن کو رہن دینے پر مجبور کیا جائے گا تاکہ مرتہن اسے خاص کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ** (المائدہ:1) (پورا کرو (اپنے) عہدوں کو) اور یہ بھی ایک عقد ہے اور مزید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 387، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 386 3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 260

ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ (الاسراء: 34) (وعدہ پورا کرو) اور یہ بھی ایک عہد ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: المسلمون عند شروطهم (1) (مومنین اپنی شروط کے ساتھ ہوتے ہیں) اور یہ بھی ایک شرط ہے۔ پس ہمارے نزدیک قبضہ کمال کو ہونے کے لئے شرط ہے اور ان دونوں ائمہ کے نزدیک قبضہ رہن کے صحیح ہونے اور لازم ہونے کے لئے شرط ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: مَّقْبُوْضَةٌ یہ تمام مرتہن کی رہن کے ساتھ بینونت اور علیحدگی کا تقاضا کرتا ہے اور لوگوں نے مرتہن کے قبضہ کے صحیح ہونے پر اجماع کیا ہے اور اسی طرح اس کے وکیل کے قبضہ پر (بھی اجماع ہے) اور عادل آدمی کے قبضہ کے بارے اختلاف ہے جو رہن کو اس کے ہاتھوں پر رکھے گا۔ پس امام مالک اور آپ کے تمام اصحاب اور جمہور علماء نے کہا ہے: عادل کا قبضہ کرنا قبضہ ہے اور ابن ابی لیلیٰ، قتادہ، حکم اور عطا رحمہم اللہ نے کہا ہے: وہ قبضہ نہیں ہے اور رہن مقبوض نہیں ہوگی مگر تب جب وہ مرتہن کے پاس ہو اور انہوں نے اسے تعبد دیکھا ہے۔ اور جمہور کا قول معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، کیونکہ جب وہ عادل کے پاس ہو گیا تو وہ لغۃً اور حقیقۃً مقبوض ہو گیا، کیونکہ عادل آدمی صاحب حق کا نائب ہے اور وہ قائم مقام وکیل کے ہے اور یہ ظاہر ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ اور اگر رہن کو عادل آدمی کے قبضہ میں رکھ دیا جائے اور وہ ضائع ہو جائے تو نہ مرتہن ضامن ہوگا اور نہ وہ جس کے قبضہ میں اسے رکھا گیا، کیونکہ مرتہن کے قبضہ میں تو کوئی شے نہیں آئی جس کا وہ ضامن ہوگا اور جس کے قبضہ میں وہ شے رکھی گئی ہے وہ امین ہے اور امین ضامن نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 10۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَّقْبُوْضَةٌ تو ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ لفظ اپنے ظاہر اور مطلق ہونے کے ساتھ تقاضا کرتا ہے کہ مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے، بخلاف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ کے (2)۔ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی گھر کا تیسرا حصہ، نصف غلام اور تلوار کا نصف حصہ بطور رہن رکھے، پھر انہوں نے کہا ہے: جب دو آدمیوں کا ایک آدمی پر مال (قرض) ہو اور وہ دونوں اس میں شریک ہوں اور وہ آدمی اس کے عوض دونوں کے پاس زمین رہن رکھ دے تو وہ جائز ہے بشرطیکہ دونوں اس پر قبضہ کر لیں۔

ابن منذر نے کہا ہے: یہ مشترک شے کو رہن رکھنے کی اجازت ہے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نصف گھر کا مرتہن ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے: مشترک شے کو رہن رکھنا جائز ہے جیسا کہ اسے بیچنا جائز ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ ہمارے علماء کے نزدیک جو شے ذمہ میں ہو اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بھی مقبوض ہے بخلاف ان کے جنہوں نے اس سے منع کیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے دو آدمی باہم کاروبار کریں ان میں سے ایک کا دوسرے کے ذمہ قرض ہو۔ پس اس نے اپنا وہی قرض اس کے پاس رہن رکھوا دیا جو اس کے ذمہ واجب الادا ہو۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہر وہ سامان جس کی بیع کرنا جائز ہے اس کو رہن رکھنا بھی جائز ہے اور اسی علت کی وجہ سے ہم نے اس شے کو رہن رکھنا جائز

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاجارۃ، جلد 1، صفحہ 303، وزارت تعلیم۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ، حدیث 3123، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 261

لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان ہے(1)''۔

اور یہی امام شافعی، شعبی اور ابن سیرین کا قول ہے اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب کا قول ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: رہن کے منافع راہن کے لئے ہیں اور اس کا نفقہ بھی اسی پر ہے اور مرتہن رہن سے کسی قسم کی منفعت حاصل نہیں کر سکتا سوائے وثیقہ کی حفاظت کرنے کے۔

خطابی نے کہا ہے: یہی اقوال میں سے اولیٰ اور زیادہ صحیح ہے اس کی دلیل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: ''رہن ملکیت میں نہیں آئے گا وہ اپنے اس مالک کے لئے ہوگا جس نے اسے رہن رکھا ہے۔ (اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا تاوان (ترچ) ہے)''[خطابی نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: من صاحبہ، لصاحبہ کے معنی میں ہے۔] عرب لام کی جگہ من استعمال کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ان کا قول ہے:

أمن أم أوفى دمنة لم تكلم

میں (مفسر) کہتا ہوں: لصاحبہ صراحۃً موجود ہے لہٰذا تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور امام طحاوی نے کہا ہے: یہ اس وقت تھا جبکہ ربا مباح تھا اور منفعت لانے والے قرض سے منع نہیں کیا گیا تھا اور نہ ایک شے کے بدلے دوسری شے لینے سے منع کیا گیا تھا اگرچہ وہ دونوں غیر مساوی ہوں پھر اس کے بعد ربا حرام کر دیا گیا۔ اور امت نے اس پر اجماع کیا ہے کہ مرہونہ لونڈی کے ساتھ راہن کے لئے وطی کرنا جائز نہیں اور اسی طرح اس کا اس سے خدمت لینا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ شعبی نے کہا ہے: وہ رہن سے کسی بھی اعتبار سے نفع حاصل نہیں کرے گا اور یہی شعبی ہیں جنہوں نے حدیث روایت کی ہے اور اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے اور ان کے نزدیک وہ جائز نہیں مگر وہ منسوخ ہو چکا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے: اس پر اجماع ہے کہ مرہونہ شے کا دودھ اور اس کی پشت راہن کے لئے ہے اور وہ اس سے خالی نہیں ہوگا کہ مرتہن کا اپنے لئے دودھ دوہنا راہن کی اجازت کے ساتھ ہوگا یا اس کی اجازت کے بغیر ہوگا، پس اگر وہ اس کی اجازت کے بغیر ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے: ''کوئی بھی کسی کے جانور کا دودھ نہ دوہے مگر اس کی اجازت کے ساتھ (2)'' یہ اس کا رد کرتی ہے اور اس کے نسخ کا تقاضا کرتی ہے اور اگر اجازت کے ساتھ ہو تو پھر مجہول غرر اس شے کی بیع جو تیرے پاس نہ ہو اور اس کی بیع جو ابھی پیدا نہیں کی گئی کی تحریم کے بارے میں مجمع علیہ اصول ہے، چنانچہ یہ بھی اسے رد کر دے گا کیونکہ یہ ربا کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اگر مرتہن نے رہن سے نفع اٹھانے کی شرط لگائی تو اس کی دو حالتیں ہیں: اگر وہ قرض کے عوض ہو تو پھر جائز نہیں ہے اور اگر وہ بیع یا اجارہ کی وجہ سے ہو تو جائز ہے، کیونکہ وہ مذکور ثمن کے عوض سامان کو بیچنے والا ہو جائے گا اور

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 526
2۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، جلد 2، صفحہ 80، وزارت تعلیم۔ صحیح بخاری، کتاب اللقطہ، حدیث نمبر 2255، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہن کے منافع مدت معلوم تک ہیں گویا کہ وہ بیع اور اجارہ ہے اور جہاں تک قرض کا تعلق ہے تو وہ ایسا قرض ہو جائے گا جو منفعت کو لایا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ قرض دینے کا مقصود تو یہ ہے کہ وہ باعث قربت ہو اور جب اس میں نفع داخل ہو جائے گا تو وہ جنس میں زیادتی ہو جائے گی اور وہی ربا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ رہن کا ملکیت میں آنا جائز نہیں اور وہ یہ کہ مرتہن شرط لگا لے کہ مرہونہ شے اس کے حق کے عوض ہو جائے گی اگر اس نے مقررہ مدت تک وہ حق ادا نہ کیا اور یہ جاہلیت کے افعال میں سے تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے اس ارشاد کے ساتھ باطل کر دیا: لا یغلق الرھن (1) رہن ملکیت میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح ہم نے اسے قاف کو رفع دینے کے ساتھ خبر پر مقید کر دیا ہے۔ یعنی لیس یغلق الرھن۔ آپ کہتے ہیں: أغلقت الباب فھو مغلق۔ (میں نے دروازہ بند کیا پس وہ بند ہو گیا) اور غلق الرھن فی ید مرتھنہ یہ تب کہا جاتا ہے جب اسے اس کے قبضہ سے چھڑایا نہ جا سکے جیسا کہ شاعر نے کہا:

أجارتنا من يجتمع يتفرق ... ومن يك رهناً للحوادث يغلق

اور زہیر نے کہا ہے:

وفارقتك برهن لا فكاك له ... يوم الوداع فأمسى الرهن قد غلقا (2)

مسئلہ نمبر 14۔ دارقطنی نے سفیان بن عیینہ کی حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے زیاد بن سعد سے، انہوں نے زہری سے، انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رہن ملکیت میں نہیں آئے گی اسی کے لئے اس کے منافع ہوں گے اور اسی پر اس کا تاوان (اخراجات) ہوگا (3)"۔ زیاد بن سعد ثقہ حفاظ میں سے ایک ہیں اور یہ اسناد حسن ہے۔ اور اسے مالک نے ابن شہاب سے اور انہوں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رہن ملکیت میں نہیں آئے گی (4)"۔

ابو عمر نے کہا ہے: اسی طرح اسے روایت کیا ہے ہر اس راوی نے جس نے امام مالک سے الموطا روایت کی ہے جہاں تک میں جانتا ہوں مگر معن بن عیسیٰ نے اسے متصل بیان کیا ہے اور معن ثقہ راوی ہے مگر مجھے یہ خدشہ ہے کہ اس میں علی بن عبدالحمید غضائری عن مجاہد بن موسیٰ عن معن بن عیسیٰ سے خطا ہوئی ہے۔ اور اس میں ابو عبداللہ عمروس نے زہری سے اپنی اسناد کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: لہ غنمہ وعلیہ غرمہ (5) اور راویوں نے ان الفاظ کے رفع میں اختلاف کیا ہے۔ سو ابن ابی ذئب اور معمر وغیرہما نے انہیں مرفوع قرار دیا ہے اور اسے ابن وہب نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یونس نے کہا ابن شہاب نے بیان کیا ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: رہن اسی کے لئے ہے جس نے اسے رہن رکھا ہے اسی کے لئے اس کے منافع ہیں اور اسی پر اس کا خرچ ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 528 | 2۔ ایضاً | 3۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

4۔ موطا امام مالک، کتاب الاقضیہ، صفحہ 637 | 5۔ سنن دارقطنی، کتاب البیوع، جلد 3، صفحہ 33

اور ابن شہاب نے خبر دی ہے کہ یہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں ہے (1) مگر معمر نے اسے ابن شہاب سے مرفوع ذکر کیا ہے اور معمر ابن شہاب سے روایت کرنے میں تمام لوگوں سے بڑھ کر مضبوط اور ثقہ ہے۔ اور اس کے مرفوع ہونے پر یحییٰ بن ابی انیسہ نے ان کی اتباع کی ہے۔ اور یحییٰ قوی راوی نہیں ہے۔ دراصل اہل علم کے نزدیک یہ حدیث مرسل منقول ہے اگرچہ کثیر جہتوں سے یہ متصل بھی ہے لیکن رواۃ اسے معلل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے باوجود یہ حدیث ہے جسے ان میں سے کسی نے مرفوع بیان نہیں کیا اگرچہ اس کی تاویل اور اس کے معنی میں اختلاف ہے۔

اور اسے دارقطنی نے بھی اسماعیل بن عیاش عن ابن ابی ذئب عن الزہری عن سعید عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند سے مرفوع بیان کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: اسماعیل نے ابن ابی ذئب سے اس کا سماع نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے اسے عباد بن کثیر عن ابن ابی ذئب سے سنا ہے اور عباد ان کے نزدیک ضعیف ہے، قابل حجت نہیں ہے اور اسماعیل بھی ان کے نزدیک حدیث میں غیر مقبول ہے جب وہ اپنے شہر والوں کے علاوہ کسی اور سے حدیث بیان کرے۔ اور جب وہ شامیوں سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث صحیح ہوتی ہے اور جب وہ اہل مدینہ وغیرہم سے حدیث بیان کرے تو اس کی حدیث میں بہت زیادہ خطا اور اضطراب ہوتا ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ رہن کی نمو اور بڑھوتری اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے اگر وہ ایسی ہو جسے الگ نہ کیا جا سکتا ہو جیسا کہ اس کا موٹا تازہ ہونا، یا وہ نسل ہو جیسا کہ ولادت اور جنین اور وہ جو اس معنی میں ہو جیسا کہ کھجور کے پودوں کو ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگانا؛ اور جو ان کے سوا ہو مثلاً غلہ، پھل، دودھ اور اون وغیرہ یہ اس میں داخل نہ ہوں گے مگر یہ کہ وہ (مرتہن) اس کی شرط لگالے۔ اور ان دونوں قسموں کے درمیان فرق یہ ہے کہ اولاد زکوٰۃ میں ماؤں کے تابع ہوتی ہے اور اون، دودھ اور درختوں کا پھل اسی طرح نہیں ہیں، کیونکہ یہ زکوٰۃ میں اصل کے تابع نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس کی صورت میں ہیں اور نہ اس کے معنی میں اور نہ یہ اس کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔ پس ان کا اپنا حکم ہے ان کے لئے اصل کا حکم نہیں ہے بخلاف بچے اور جنین کے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ نمبر 16۔ اور اس آدمی کا رہن رکھنا جائز ہے جس کے مال کو قرض محیط ہو جب تک کہ وہ اسے مفلس قرار نہ دے اور مرتہن قرض خواہوں کی نسبت رہن کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ امام مالک اور لوگوں کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے اور امام مالک سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔ اور عبد العزیز بن ابی سلمہ نے یہ کہا ہے کہ قرض خواہ مرتہن کے ساتھ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ وہ جس پر پابندی عائد نہ کی گئی ہو تو اس کے تصرفات بیع و شراء میں سے تمام احوال میں صحیح ہوتے ہیں اور قرض خواہوں نے اس شرط پر اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ وہ خرید و فروخت کرے اور (قرض) ادا کرے۔ اس باب میں امام مالک کا قول مختلف نہیں ہے اور رہن بھی اسی طرح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا الآیہ یہ شرط ہے اور اس کے ساتھ اس کی وصیت کو مربوط کیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 528

گیا ہے جس پر ادا کرنے اور مال سپرد کرنے کا حق ہے۔ حتیٰ کہ وہ جس پر حق ہے صاحب حق کے نزدیک امین اور ثقہ ہو تو جس پر قبضہ کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنی امانت اسے ادا کر دے۔ اور قولہ: فَلْيُؤَدِّ یہ الاداء سے ماخوذ ہے اور یہ جواب ہے (اور یہی جواب شرط ہے) اور ہمزہ کی تخفیف بھی جائز ہے۔ اور ہمزہ کو واؤ کی صورت میں نقل کیا گیا ہے اور اسے الف سے نہیں بدلا گیا اور نہ ہی ذٰی ہی بنایا گیا ہے کیونکہ الف کا ماقبل صرف مفتوح ہو سکتا ہے اور یہ امر وجوب کے معنی میں ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ قرضوں کی ادائیگی واجب ہونے پر اجماع ہے اور اس بارے میں حاکم کے حکم کے ثبوت پر اور اس کے مقروضوں کو اس پر مجبور کرنے پر اجماع ہے اور مزید قرینہ غیر کا مال حرام ہونے میں صحیح کی احادیث ہیں۔ (1)

مسئلہ نمبر 18۔ قولہ تعالیٰ: اَمَانَتَهٗ الامانة مصدر ہے اور اس کے ساتھ اس شے کا نام رکھا گیا ہے جو کسی کے ذمہ میں ہو۔ اور اس کی اضافت اس کی طرف ہے جس پر قرض ہے۔ اس حیثیت سے اس کی اس کی طرف ایک نسبت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ (النساء: 5) (اور نہ دو بے وقوفوں کو اپنے مال۔)

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اس بارے میں کہ وہ حق میں سے کوئی شے نہ چھپائے۔ اور قولہ: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ یہ قول باری تعالیٰ: ولا یضار کی کتمان کے ساتھ کی تفسیر ہے اور شاہد کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ شہادت چھپانے کے ساتھ ضرر پہنچائے اور یہ نہی متعدد قرائن کے ساتھ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان میں سے ایک وعید ہے اور نہی کا محل وہاں ہے جہاں شاہد کو حق کے تلف ہونے کا خوف ہو۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: شاہد پر شہادت دینا لازم ہے جہاں اسے شہادت دینے کے لئے بلایا جائے اور وہاں وہ خبر دے جہاں اس سے خبر کا مطالبہ کیا جائے۔ فرمایا: اور تو یہ نہ کہہ اخبر بہا عند الامیر (میں اس کے بارے امیر کے پاس خبر دوں گا) بلکہ (یہ کہہ) اخبرہ بہا (میں اسے اس کے بارے خبر دوں گا) شاید وہ رجوع کر لے اور واپس لوٹ آئے۔)

ابو عبد الرحمن سلمی نے ولا یکتموا یا کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے نہی الغائب بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ جب حق پر گواہ موجود ہوں تو ان پر اس کی ادائیگی علی الکفایہ متعین ہے پس اگر دو اسے ادا کر دیں اور حاکم انہیں دو پر اکتفا کر لے تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جائے گا اور اگر وہ اس کے ساتھ اکتفا نہ کرے تو اسے جاری رکھنا متعین ہے یہاں تک کہ اثبات واقع ہو جائے۔ اور یہ صاحب حق کی دعوت کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے پس جب وہ اسے کہے کہ: تو میرا حق زندہ (ثابت) کر اس شہادت کو ادا کر کے جو میرے لئے تیرے پاس ہے تو وہ اس پر متعین ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 21۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ اس میں دل کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ چھپانا اس کے افعال میں سے ہے اور کیونکہ وہ ایسا گوشت کا ٹکڑا ہے جس کی اصلاح سے سارے کا سارا بدن اصلاح پا جاتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے (2)۔ پس یہاں کل بدن کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (اور یہ اول سورۃ) میں گزر چکا ہے۔ اور الکیا نے کہا ہے: جب اس نے اس کا قصد کیا کہ وہ اسے ادا نہیں کرے گا اور شہادت کی ادائیگی زبان سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6991، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب ایمان، جلد 1، صفحہ 13، وزارت تعلیم

ترک کر دی تو گناہ دونوں وجہوں کی طرف راجع ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اٰثِمٌ قَلْبُهٗ یہ مجاز ہے اور یہ حقیقۃً وعید پر دلالت کو پختہ کرنے والا ہے اور یہ معانی کے اعتبار سے بیان کی عمدگی اور اعراب کی لطافت میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: دل کا گناہ اسے مسخ کرنے کا سبب ہے اور اللہ تعالیٰ جب دل کو مسخ کر دیتا ہے تو وہ اسے منافق بنا دیتا ہے اور اس پر مہر لگا دیتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

(اور اس کا بیان سورت کی ابتدا میں آچکا ہے) اور قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ کی وجہ سے مرفوع ہے اور اٰثِمٌ، اِنَّ کی خبر ہے اور اگر چاہے تو اٰثِمٌ کو مبتدا ہونے کے سبب رفع دے لے اور قَلْبُهٗ فاعل مسد الخبر بن جائے گا اور پھر جملہ اِنَّ کی خبر ہوگا۔ اور اگر چاہے تو اٰثِمٌ کو رفع دے اس بنا پر کہ یہ مبتدا مؤخر کی خبر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قَلْبُهٗ، اٰثِمٌ سے بدل بعض من الکل ہو۔ اور اگر چاہے تو اسے اٰثِمٌ کی ضمیر سے بدل بنالے۔

چوبیس مسائل کی تکمیل اور تتمہ کے طور پر میں نے یہاں تین مسائل بیان کیے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت اور کتابت کا جو حکم فرمایا ہے یہ دونوں فریقوں کی اصلاح اور منافع کے لئے ہے اور ایسے فساد اور تنازع کی نفی کے لئے ہے جو دونوں کو باہمی فساد اور خرابی تک پہنچانے والا ہے تاکہ شیطان اسے حق کا انکار کرنے اور شریعت نے اس کے لئے جو حد مقرر کی ہے اس سے تجاوز کرنے یا مقدار مستحق پر اقتصار کو ترک کرنے پر نہ اکسائے اور اسی وجہ سے شریعت نے ان مجہول چیزوں کی بیع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جن میں عادت اور رواج یہ ہو کہ وہ فریقین کو فساد اور اختلاف تک پہنچا دیتی ہوں اور وہ باہمی کینہ اور ایک دوسرے سے جدائی واقع کرنے والی ہوں۔ اور انہی میں سے وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ حرام قرار دیا ہے جوا اور شراب نوشی وغیرہ: اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ الآیہ (المائدہ: 91) (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ)

پس جس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و زواجر کے بارے میں اس کے ادب سکھانے کے ساتھ ادب سیکھ لیا اس نے دین اور دنیا کے منافع جمع کر لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ الآیہ۔ (النساء: 66) (اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے لوگوں کے اموال اس ارادہ سے لئے کہ وہ انہیں ادا کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا (یعنی ادائیگی کے اسباب مہیا فرما دے گا) اور جس نے انہیں ضائع کرنے کے ارادہ سے لئے تو اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دے گا (1)۔" اور نسائی نے حضرت میمونہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قرض لیا تو انہیں کہا گیا: اے ام المومنین! آپ قرض لے رہی ہیں اور آپ کے پاس اسے ادا کرنے کے وسائل نہیں ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: میں نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 321۔ ایضاً، حدیث نمبر 2212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "جس نے قرض لیا اور وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کی معاونت فرمائے گا (1)۔" اور طحاوی، ابو جعفر طبری اور حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم نفسوں کو ان کے امن کے بعد خوفزدہ نہ کرو۔" صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیا ہے؟ فرمایا: "وہ قرض ہے (2)۔" اور بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں اس طرح ذکر کیا: اللهم انی اعوذ بك من الهم والحزن والعجز والكسل والجبن والبخل وضلع الدين وغلبة الرجال (3) (اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم اور حزن سے، عجز اور سستی و غفلت سے، بزدلی اور بخل سے، قرضے کے بوجھ اور لوگوں کے غلبے سے۔) علماء نے کہا ہے: ضلع الدین سے مراد یہ ہے کہ مقروض ایسے وسائل نہ پائے کہ وہ قرض ادا کر سکے۔ اور یہ عربوں کے اس قول سے بنایا گیا ہے: حمل مضلع یعنی بہت بھاری اور ثقیل بوجھ اور دابۃ مضلع یعنی ایسا جانور جو بوجھ اٹھانے کی قوت نہ رکھتا ہو۔ صاحب العین نے یہی کہا ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدَّيْنُ شَيْنُ الدِّيْنِ (4) (قرض دین کے لئے عیب ہے۔) اور آپ سے یہی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الدَّيْنُ هَمٌّ بِاللَّيْلِ وَ مَذَلَّةٌ بِالنَّهَارِ (5) (قرض رات کا غم ہے اور دن کی ذلت ہے۔) علماء نے کہا ہے بلاشبہ یہ عیب اور ذلت ہے کیونکہ اس میں دل و دماغ مشغول رہتے ہیں اور ادائیگی کا غم اور فکر لازم ہوتا ہے۔ اور مقروض کے لئے ملاقات کے وقت ذلت اور پستی کا سامنا ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے وقت تک مؤخر کرکے اس کا احسان برداشت کرتا ہے۔ اور بسا اوقات وہ اپنی طرف سے اسے پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے اور پھر اس کے خلاف کرتا ہے یا مقروض اس کے سبب سے گفتگو کرتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا وہ اس کے لئے قسم کھاتا ہے اور اسے توڑ دیتا ہے۔ وغیرہ ذالک۔ اسی وجہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گناہ اور قرض سے پناہ مانگتے تھے۔

اور المغرم سے مراد قرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک آدمی جب قرض ادا کرتا ہے تو وہ گفتگو کرتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے اور وہ وعدہ کرتا ہے اور اس کا خلاف کرتا ہے (6)۔" اور یہ بھی کہ بسا اوقات وہ مر جاتا ہے اور وہ قرض ادا نہیں کر چکا ہوتا۔ پس وہ اس کے عوض گروی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بندہ مومن کی روح اپنی قبر میں اس کے قرض کے عوض گروی ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف سے اسے ادا کر دیا جائے (7)۔" اور یہ تمام کے تمام اسباب دین میں عیب ہی ہیں۔ ان سے دین کا حسن و جمال ضائع ہو جاتا ہے اور اس کا کمال کم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

1۔ سنن نسائی، کتاب البیوع، جلد 2، صفحہ 232
2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 4، صفحہ 146
3۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 942۔ ایضاً حدیث نمبر 5005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 231
5۔ ایضاً
6۔ صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، جلد 1، صفحہ 322
7۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176، ایضاً حدیث 2403، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 3۔ جب اللہ تعالیٰ نے لکھنے، گواہ بننے اور کوئی شے بطور گروی لینے کا حکم ارشاد فرمایا تو یہ اموال کی حفاظت اور انہیں بڑھانے کا لحاظ رکھنے پر نص قطعی ہے۔ اور یہ جاہل متصوفہ اور ان کی رعایت کرنے والے وہ لوگ جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے ان کا رد ہے کہ وہ اپنے تمام اموال سے فارغ ہو جاتے ہیں (یعنی وہ فقراء و مساکین وغیرہ کو دے دیتے ہیں) اور وہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی کفایت اور حاجت کے لئے بھی کچھ نہیں چھوڑتے، پھر جب وہ محتاج ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے فقیر ہوتے ہیں تو پھر یا تو وہ بھائیوں کے احسانات یا ان کے صدقات کا طالب ہوتا ہے یا پھر وہ دنیاداروں اور ان میں سے ظلم کرنے والوں سے کچھ لیتا ہے اور یہ فعل مذموم اور ممنوع ہے۔

ابو الفرج جوزی نے کہا ہے: مجھے ان زہد و ورع اختیار کرنے والوں سے زیادہ تعجب نہیں جنہوں نے اپنی کم علمی کے سبب ایسے کیا، بلکہ زیادہ تعجب ان اقوام کے بارے ہے جو صاحب فہم و عقل ہیں انہوں نے اس پر جیسے برانگیختہ کیا۔ اور انہوں نے اس کے بارے حکم دیا باوجود اس کے کہ شرع اور عقل اس کے خلاف ہیں۔ پس محاسبی نے اس بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے اور ابو حامد طوسی نے اسے پختہ اور مضبوط کیا ہے اور اس کی مدد کی ہے اور میرے نزدیک حارث ابو حامد کی نسبت زیادہ معذور ہے، کیونکہ ابو حامد زیادہ فقیہ ہے مگر ان کے تصوف میں داخل ہونے نے ان پر ان کی مدد و نصرت لازم کر دی جو اس میں پہلے داخل ہو چکے ہیں۔

محاسبی نے اپنے طویل کلام میں کہا ہے: تحقیق مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ جب حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا: بلاشبہ ہم عبد الرحمن پر اس مال کے بارے میں خوف کھا رہے ہیں جو انہوں نے چھوڑا، تو حضرت کعب نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تم عبد الرحمن رضی اللہ عنہ پر خوف کھا رہے ہو؟ انہوں نے پاکیزہ مال کمایا، پاکیزہ اور طیب مال خرچ کیا اور حلال و طیب مال چھوڑا۔ پس یہ خبر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو وہ حضرت کعب کو تلاش کرنے کے ارادے سے غصے کی حالت میں نکلے اور اونٹ کے جبڑے کی ہڈی کے پاس سے گزرے تو اسے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا اور پھر حضرت کعب کی تلاش میں نکل پڑے، تو حضرت کعب کو بتایا گیا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ آپ کو تلاش کر رہے ہیں تو وہ بھاگتے ہوئے نکل گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گئے ان سے مدد لینے لگے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ پس حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت کعب کی تلاش میں نشانات کی اتباع کرتے ہوئے آئے یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آ کر رک گئے، جب اندر داخل ہوئے تو حضرت کعب اٹھے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھاگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: اے یہودیہ کے بیٹے! تو یہ گمان رکھتا ہے کہ جو کچھ حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے چھوڑا ہے اس کے بارے کوئی حرج نہیں ہے۔ تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن باہر تشریف لائے اور فرمایا: "کثیر مال و دولت والے ہی قیامت کے دن قلیل مال و دولت والے ہوں گے سوائے ان کے جنہوں نے اس اس طرح خرچ کیا(1) (یعنی نیکی اور صدقہ میں وافر مال خرچ کیا)۔ محاسبی نے کہا ہے: پس یہ عبد الرحمن اپنی فضیلت کے باوجود قیامت کے دن

1۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 152۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاستقراض، باب اداء الدیون، مطبوعہ المکتبۃ القدوسیہ، حدیث نمبر 2213

اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ (1) (اے اللہ! اس کے مال و اولاد میں کثرت فرما اور اس کے لئے اس میں برکت عطا فرما۔) اور حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنا سارا مال صدقہ کردوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے لئے کچھ مال روک لے یہ تیرے لئے بہتر ہے(2)"۔

علامہ جوزی نے کہا: یہ احادیث کتب صحاح میں نقل کی گئی ہیں اور یہ اس عقیدہ اور نظریہ کے خلاف ہیں جو متصوفہ رکھتے ہیں کہ مال کی کثرت حجاب اور سزا ہے اور یہ کہ اسے محفوظ رکھنا توکل کے منافی ہے اور کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اس کے فتنہ اور آزمائش سے ڈرایا جاتا ہے اور بلاشبہ خلق کثیر نے اس کے خوف کی وجہ سے اس سے اجتناب کیا ہے۔ اور یہ کہ اسے جمع کرنا اس وجہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ کہ دل بہت کم فتنوں سے سلامت اور محفوظ رہتا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے دل کا ذکر آخرت میں مشغول ہونا نایاب ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کے فتنہ سے ڈرایا گیا ہے۔

اور جہاں تک مال کمانے کا تعلق ہے تو اگر کوئی صرف گزر اوقات کے لئے حلال کمانے پر اکتفا کرے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور رہا وہ جس نے مال جمع کرنے اور حلال مال کثرت سے طلب کرنے کا قصد کیا تو اس کے مقصود اور مدعا میں دیکھا جائے گا۔ پس اگر اس نے فخر و مباہات کا قصد کیا تو یہ مقصود بہت برا ہے اور اگر اس نے اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی پاکدامنی کا قصد کیا اور اس نے حوادثات زمانہ کے لئے مال ذخیرہ کیا اور اس نے بھائیوں کی خوشحالی، فقراء کو غنی بنانے اور نیکی کے کام کرنے کا قصد کیا تو اسے اس ارادہ پر ثواب و اجر عطا کیا جائے گا اور اس نیت کے ساتھ مال جمع کرنا کثیر طاعات و عبادات سے افضل ہے اور صحابہ کرام میں سے کثیر مخلوق کی نیتیں مال جمع کرنے میں سلیم اور حسین تھیں کیونکہ مال جمع کرنے سے ان کے مقاصد مستحسن تھے، پس وہ اس کے حریص ہوئے اور انہوں نے اس میں زیادتی اور کثرت کی دعائیں کیں۔ اور جب ایک معظم آدمی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیز رفتار گھوڑ دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس نے گھوڑا دوڑایا یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو گیا پھر اس نے اپنا کوڑا پھینک دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے اتنی (جگہ) دے دو جہاں اس کا کوڑا پہنچا ہے(3)"۔

اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے وسعت و خوشحالی عطا فرما اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: وَ نَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ (یوسف:65) (اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ) اور حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا: فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (القصص:27) (پھر اگر تم پورے کرو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی) اور حضرت ایوب علیہ السلام کو جب صحت عطا فرما دی گئی تو ان پر سونے کی ٹڈیوں کا بہت بڑا گلہ اڑایا گیا تو آپ پکڑ کر اپنے کپڑے میں ڈالنے لگے اور ان میں کثرت و زیادتی کی طلب کرنے لگے تو آپ کو کہا گیا: کیا

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل، جلد 2، صفحہ 298۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 362۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ براءۃ، حدیث نمبر 4308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 2، صفحہ 156۔ ابی داؤد، باب فی اقطاع الارضین، حدیث نمبر 2870، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آپ سیر نہیں ہوتے ہیں؟ تو آپ نے عرض کی: اے میرے پروردگار! کیا فقیر بھی تیرے فضل سے سیر ہو سکتا ہے؟ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا انحصار طبائع اور مزاجوں پر ہے۔

اور جہاں تک محاسبی کے کلام کا تعلق ہے تو وہ فاسد ہے وہ علم سے جاہل ہونے پر دلالت کرتا ہے اور انہوں نے حضرت کعب اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث ذکر کی ہے وہ محال ہے۔ وہ جاہل کی وضع کردہ ہے۔ اور متصوفہ کے ساتھ ان کے ملنے کی وجہ سے حدیث کی عدم صحت ان پر مخفی رہی ہے اور بعض نے اس کے بارے روایت کیا ہے کہ اگرچہ اس کی سند ثابت نہیں ہے، کیونکہ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے اور وہ مطعون راوی ہے۔

یحییٰ نے کہا ہے اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا اور تاریخ میں ثابت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا وصال ۲۵ھ میں ہوا۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا وصال ۳۲ھ میں ہوا۔ تحقیق وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد بھی سات برس تک زندہ رہے۔ پھر وہ الفاظ جو انہوں نے اپنی حدیث میں ذکر کیے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کی حدیث موضوع ہے، پھر صحابہ کرام یہ کیسے کہہ سکتے ہیں: ہم عبدالرحمن پر خوف کھا رہے ہیں! کیا حلال مال جمع کرنے کی اباحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا ہے پھر اباحت کے ہوتے خوف کی کیا وجہ ہے؟ کیا شریعت ایک شے کے بارے میں اجازت دیتی ہے پھر اسی پر سزا دیتی ہے؟ یہ تو فہم و ادراک کی قلت کی وجہ سے ہے، پھر کیا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ پر اعتراض کر سکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایسی چیزوں کے سبب بہتر اور افضل ہیں جن کے سبب وہ ایک دوسرے کے قریب بھی نہیں ہو سکتے؟ پھر ان کا کیسے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعلق ہو گا؟ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے سیرت صحابہ کو آزمایا اور اس کا تجربہ کیا ہی نہیں، کیونکہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تین سو بہار چھوڑے تھے اور ہر بہار میں تین قنطار تھے! اور البہار کا معنی بوجھ ہے۔

اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا مال دو لاکھ پچاس ہزار تھا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نوے ہزار ترکہ میں چھوڑے۔ اور اکثر صحابہ کرام نے مال کمایا اور اسے پیچھے چھوڑا اور ان میں سے کسی نے بھی کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور رہا یہ قول: ان عبد الرحمن یحبو حبوا یوم القیامۃ تو یہ اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے حدیث کو پہچانا اور سمجھا ہی نہیں۔ اور میں تو اللہ تعالیٰ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ عبدالرحمن قیامت کے دن گھسٹ کر چلیں، کیا آپ انہیں جانتے نہیں ہیں جو (اسلام قبول کرنے میں) سبقت لے جانے والے ہیں اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی بشارت دی گئی ہے اور آپ اہل بدر میں سے ہیں اور مجلس شوریٰ کے ممبر ہیں تو کیا آپ گھسٹ کر چلیں گے؟ پھر حدیث عمارہ ابن زاذان روایت کرتے ہیں اور امام بخاری نے کہا ہے: بسا اوقات ان کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ اور امام احمد نے کہا ہے: یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منکر احادیث روایت کرتا ہے اور ابو حاتم رازی نے کہا ہے: یہ قابل حجت نہیں ہے اور دار قطنی نے کہا ہے: یہ ضعیف ہے۔ اور آپ کا یہ قول: ترک المال الحلال افضل من جمعہ (مال حلال کو چھوڑ دینا اسے جمع کرنے سے افضل ہے) اس طرح نہیں ہے اور جب نیت اور قصد صحیح ہو تو بلا اختلاف علماء کے نزدیک اسے جمع کرنا افضل ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب

جو یہ کہتے تھے: اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے جو مال طلب نہیں کرتا وہ اس کے ساتھ اپنا قرض ادا کر سکتا ہے اور اس کے ساتھ اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور اگر وہ مر جائے تو وہ اسے اپنے بعد والوں کے لئے بطور میراث چھوڑ دے اور حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے چار سو دینار پیچھے چھوڑے اور حضرت سفیان ثوری نے دو سو دینار پیچھے چھوڑے اور وہ کہتے تھے: المال فی هذا الزمان سلاح اس زمانے میں مال ہتھیار ہے اور اسلاف ہمیشہ مال کی تعریف کرتے رہے بطور حوادثات زمانہ اور فقراء کی امداد کے لئے اسے جمع کرتے رہے۔ البتہ ان میں سے ایک گروہ نے عبادات میں مشغول ہونے اور یکسوئی کو ترجیح دیتے ہوئے مال سے پرہیز کی ہے۔ پس انہوں نے تھوڑے مال پر ہی قناعت کی۔ پس اگر قائل یہ کہے: بے شک مال کو کم کرنا قرب الٰہی کے لئے اولیٰ ہے لیکن وہ مرتبہ اتم کو اس کے ساتھ تنگ کرنے والا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اموال کی حفاظت اور ان کا خیال رکھنے پر جو روایات دلالت کرتی ہیں ان میں سے گھٹیا مال اور اعلیٰ مال کے لئے قتال کو مباح قرار دینا بھی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من قتل دون ماله فهو شهيد (1) (جو اپنے حقیر اور گھٹیا مال (کی حفاظت) میں قتل کر دیا گیا تو وہ شہید ہے) اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۗ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رکھو حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ پھر بخش دے گا جسے چاہے گا اور عذاب دے گا جسے چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

قولہ تعالیٰ: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اس میں دو مسئلے ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ لوگوں کا اس ارشاد باری تعالیٰ کے معنی میں اختلاف ہے اور اس بارے میں چار اقوال ہیں۔

(1) کہ یہ ارشاد منسوخ ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم، حضرت شعبی، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین، حضرت محمد بن کعب، حضرت موسیٰ بن عبیدہ رحمہم اللہ اور صحابہ کرام اور تابعین میں سے ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور یہ کہ یہ تکلیف اور پابندی ایک سال تک باقی رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ کشادگی اور وسعت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اور یہ حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عطا، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت محمد بن کعب رحمہم اللہ وغیرہم کا قول ہے)۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ فرمایا: ان میں سے کوئی شے ان کے دلوں میں داخل ہوئی (یا) شے میں سے کوئی ان کے دلوں میں داخل نہ ہوئی تو حضور نبی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدیات، جلد 1، صفحہ 170۔ صحیح بخاری، باب من قتل دون مالہ، حدیث نمبر 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم کہو ہم نے سنا، ہم نے اطاعت کی اور ہم نے تسلیم کر لیا۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (فرمایا: ”میں نے کر دیا“) رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (فرمایا: ”میں نے کر دیا“) رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (فرمایا: ”میں نے کر دیا“)(1) اور ایک روایت میں ہے۔ پس جب انہوں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا عنقریب اس کا ذکر آئے گا۔

(۲) حضرت ابن عباس، حضرت عکرمہ، حضرت شعبی اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ نے فرمایا: یہ آیت محکم مخصوص ہے اور یہ اس شہادت کے معنی میں ہے جسے چھپانے سے منع کیا گیا ہے، پھر اس آیت میں بتایا کہ شہادت کو چھپانے والا اسے چھپانے والا ہے جو اس کے دل میں ہے اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔

(۳) یہ آیت اس شک و یقین کے بارے ہے جو نفوس پر طاری ہوتے ہیں، حضرت مجاہد نے بھی یہی کہا ہے۔(2)

(۴) یہ آیت محکم ہے اور عام ہے منسوخ نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا ان اعمال پر بھی حساب لے گا جو انہوں نے کئے اور ان پر بھی جو انہوں نے کئے تو نہیں مگر ان کے دلوں میں ثابت اور پختہ ہو گئے اور انہوں نے انہیں مخفی رکھا اور ان کی نیت اور ارادہ کر لیا۔ پس اللہ تعالیٰ مومنوں کی مغفرت فرما دے گا اور اس کے ساتھ اہل کفر و نفاق کو پکڑ لے گا(3)، علامہ طبری نے ایک قوم سے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (اس میں) وہ وارد کیا ہے جو اس سے مشابہ ہے۔

علی بن ابی طلحہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی، لیکن جب اللہ تعالیٰ مخلوق کو جمع فرمائے گا تو ارشاد فرمائے گا: ”میں تمہیں اس کے بارے بتاتا ہوں جو تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو۔“ پس مومن کو اللہ تعالیٰ اس کے بارے بتائے گا اور پھر ان کی مغفرت فرما دے گا۔ اور رہے شک کرنے والے تو اللہ تعالیٰ ان کے بارے انہیں بتائے گا جس تکذیب وغیرہ کو انہوں نے چھپائے رکھا تھا۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ اور اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (البقرہ: 225) یعنی شک اور نفاق میں سے جو تمہارے دلوں نے کیا اس پر تمہارا مواخذہ کیا جائے گا(4)۔

اور حضرت ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے بارے آگاہ فرمائے گا جسے وہ چھپاتا تھا تاکہ وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ اور حدیث میں ہے: ”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں مخفی رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا اور مخفی دلی باتیں باہر نکل آئیں گی۔ میرے لکھنے والے فرشتوں نے نہیں لکھے مگر تمہارے وہی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 388، دار الکتب العلمیہ
3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 173
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 174

اعمال جو ظاہر ہوئے اور میں ان پر بھی مطلع ہوں جن پر وہ مطلع نہیں ہوئے تو انہوں نے ان کی خبر دی اور نہ ہی انہیں لکھا۔ پس میں ان کے بارے تمہیں خبر دوں گا اور ان پر تمہارا محاسبہ بھی کروں گا اور پھر جسے میں چاہوں گا اسے بخش دوں گا اور جسے چاہوں گا اسے عذاب دوں گا (1)۔" پس وہ مومنوں کو بخش دے گا اور کافروں کو عذاب دے گا" اس باب میں یہ صحیح روایت ہے۔ اور اسی پر حدیث نبوی بھی دلالت کرتی ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔ (جسے کہا جائے گا) تحقیق حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے" بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کی ان چیزوں کو معاف فرما دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوں گی جب تک کہ وہ ان کے ساتھ کلام نہ کریں یا ان کے مطابق عمل نہ کریں (2)۔" چنانچہ ہم کہتے ہیں: یہ ارشاد احکام دنیا پر محمول ہے۔ مثلاً طلاق، عتاق اور وہ بیع جس کا حکم ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے ساتھ کلام نہ ہو اور جو آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ بندے کا اس پر مواخذہ ہوگا وہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آخرت میں ہوگا۔

حسن نے کہا ہے: یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے (3)۔ علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور دوسروں نے اسی معنی کی طرح بیان کیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مذکور ہے مگر انہوں نے یہ کہا ہے: بے شک وہ عذاب جو اس کی جزا ہوتا ہے جو دلوں میں کھٹکے اور اس کے بارے فکر و غور ہو وہ دنیوی مصائب و آلام اور دنیا کی تمام تکالیف کے ساتھ ہے پھر اسی معنی کی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی (پانچواں قول ہے) اور علامہ طبری نے اس کو ترجیح دی ہے کہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہی درست ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ کا معنی ہے ان چیزوں میں سے جو تمہاری وسعت اور تمہارے کسب کے تحت ہیں۔ اور یہ ان چیزوں کے ساتھ ہیں جن کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اور جن کے بارے فکر کی جاتی ہے۔ پس جب لفظ ایسے ہیں جن میں دلوں میں کھٹکنے والی چیزیں داخل ہو سکتی ہیں تو صحابہ کرام اور حضور نبی مکرم ﷺ خوفزدہ ہو گئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے دوسری آیت کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی جس کا اس نے ارادہ کیا اور اسے خاص کر دیا اور اس کے حکم پر نص بیان فرما دی کہ وہ کسی نفس کو مکلف نہیں بنائے گا مگر (اس کا) جو اس کی وسعت میں ہوگا۔ اور دلوں میں پیدا ہونے والے خیالات ایسے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا دفاع وسعت میں ہے، بلکہ وہ امر غالب ہے اور وہ ان امور میں سے نہیں ہے جو کمائے جاتے ہیں۔ پس اس بیان اور وضاحت سے مقصود ان کے لئے کشادگی پیدا کرنا اور ان کی پریشانی کا ازالہ کرنا ہے۔ اور باقی آیت محکم ہے اس میں کوئی نسخ نہیں ہے اور جس سے نسخ کا وہم دور کیا جا سکتا ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ یہ آیت خبر کے انداز میں ہے اور اخبار میں نسخ داخل نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی نسخ کا قول کرے تو وہ اس حکم پر مترتب ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو اس وقت لاحق ہوا جب وہ اس آیت سے گھبرائے اور اس کی دلیل ان کے لئے حضور نبی مکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہے: قولوا سمعنا و اطعنا اس سے یہ علم ثابت ہو رہا ہے کہ وہ اس ارشاد پر ثابت

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، صفحہ 174

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 78

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

قدم ہو جائیں اور اسے لازم پکڑ لیں اور بخشش و غفران کے بارے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا انتظار کریں۔ پس جب یہ حکم ثابت کر دیا گیا تو پھر اس میں نسخ کا واقع ہونا صحیح ہے۔ اور اس وقت آیت اس قول باری تعالیٰ کے مشابہ ہو گی: اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال: 65) پس یہ الفاظ بھی الفاظ خبری ہیں لیکن اس کا معنی ہے: لتلزموا هذا و اثبتوا عليه و اصبروا بحسبه تم اسے لازم پکڑ لو اور اس پر ثابت قدم ہو جاؤ اور اس کے مطابق صبر کرو۔ پھر اس کے بعد اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس بارے میں جو میں جانتا ہوں اس پر لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں ہے اور یہ منسوخ ہے دو سو کے مقابلے میں ایک سو کے صبر کرنے (والے حکم) کے ساتھ۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: سورۃ البقرہ میں یہ آیت اس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں اضمار اور تقیید ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یحاسبکم به الله ان شاء وانه تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا اگر اس نے چاہا۔ اور اس بنا پر کوئی نسخ نہیں ہے۔

اور نحاس نے کہا ہے: اس آیت میں جو احسن قول کیا گیا ہے اور وہ ظاہر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے وہ حضرت ابن عباس بنی نہا کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، پھر نجوی کے بارے میں حضرت ابن عمر بنی نہا کی حدیث (اس میں) داخل کر دی گئی ہے جسے بخاری، مسلم وغیرہما نے روایت کیا ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں۔ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "مومن کو قیامت کے دن اپنے رب سے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ رب کریم اپنا دست قدرت اس پر رکھ دے گا اور وہ اسے اس کے گناہوں کے بارے اقرار کرائے گا اور فرمائے گا کیا تو (اپنے ان گناہوں کو) پہچانتا ہے؟ تو وہ مومن عرض کرے گا اے میرے رب! میں پہچانتا ہوں۔ رب کریم فرمائے گا: کیونکہ میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور بلاشبہ آج کے دن بھی میں تیرے لئے انہیں بخش دوں گا اور پھر نیکیوں کا نامہ عمل اسے عطا فرمائے گا اور رہے کفار اور منافقین! تو انہیں ساری مخلوق کے سامنے بلایا جائے گا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو جھٹلایا (2)"۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مومنین میں سے ان کے بارے نازل ہوئی ہے جو کافروں کو ولی مقرر کرتے تھے۔ یعنی اے مومنین! کفار کی ولایت کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اس کا اعلان کر دو یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ تمہارا حساب لے گا۔ واقدی اور مقاتل نے یہ کہا ہے۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے جو کہ آل عمران میں ہے استدلال کیا ہے۔ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ یعنی کفار کی ولایت میں سے جو تمہارے سینوں میں ہے اگر تم اسے چھپاؤ یا تم اسے ظاہر کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اس پر اس کا ماقبل قول دلالت کرتا ہے: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران: 28) (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر۔)

میں (مفسر) کہتا ہوں اس میں (حقیقت سے) بعد اور دوری ہے، کیونکہ آیت کا سیاق اس کا تقاضا نہیں کرتا اور جو صورۃ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 389، دار الکتب العلمیہ

2۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 360۔ صحیح بخاری، باب ستر المومن علی نفسه، حدیث نمبر 5609، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آل عمران میں ہے وہ ثابت اور واضح ہے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس آیت کے ساتھ اپنی قوم کے پاس تشریف لاتے تھے لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ابن کثیر، نافع، ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے فیغفر اور ویعذب کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف جواب شرط پر کیا گیا ہے اور ابن عامر اور عاصم نے دونوں میں رفع کے ساتھ قطعی طور پر پڑھا ہے۔ یعنی فھو یغفر و یعذب۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اعرج، ابو العالیہ اور عاصم جحدری سے دونوں میں نصب کے ساتھ مروی ہے اس بنا پر کہ ان سے پہلے اَنْ مضمر ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا عطف معنی پر ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: فیضاعفہ لہ (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور باہم مشاکلت کی وجہ سے لفظ پر عطف عمدہ ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

ومتی ما یع منک کلاماً یتکلم فیجبک بعقل

نحاس نے کہا ہے اور طلحہ بن مصرف سے روایت ہے یحاسبکم بہ اللہ یغفر یعنی بغیر فا کے بدل کی بنا پر۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: جعفی اور خلاد نے اسی طرح پڑھا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں اسی طرح ہے۔ ابن جنی نے کہا ہے: یہ یحاسبکم سے بدل ہونے کی بنا پر ہے اور یہ محاسبہ کی تفسیر ہے۔ اور یہ شاعر کے اس قول کی طرح ہے:

رویدا بنی شیبان بعض وعیدکم تلاقوا غدا خیلی علی سفوان

تلاقوا جیادا لا تحید عن الوغی اذا ما غدت فی المأزق المتدانی

اور یہ بدل کی بنا پر ہے۔ شاعر نے فعل کو مکرر ذکر کیا ہے۔ کیونکہ فائدہ اس قول میں ہے جو اس کے پیچھے آرہا ہے (2)۔ نحاس نے کہا ہے: اگر بغیر فا کے ہو تو جزم کی نسبت رفع زیادہ عمدہ ہے۔ وہ حال کے محل میں ہو جائے گا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

متی تاتہ تعشو الی ضوء نارہ تجد خیر نار عندھا خیر موقد

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 302، دارالکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 390، دارالکتب العلمیہ

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن۔ یہ سب دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے اور انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔ اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔ اے ہمارے رب! نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں اے ہمارے رب! نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں اے ہمارے پروردگار! نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں اور درگزر فرما ہم سے اور بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر تو ہی ہمارا دوست (مددگار) ہے۔ تو مدد فرما ہماری قوم کفار پر"۔

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک سے روایت ہے کہ یہ آیت قصہ معراج میں عطا ہوئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بعض روایات میں اسی طرح مروی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: تمام قرآن سوائے اس آیت کے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام لے کر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شب معراج سماعت فرمائی۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا واقعہ معراج سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ لیلۃ المعراج تو مکہ مکرمہ میں تھی اور یہ ساری سورت مدنی ہے۔

پس جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق شب معراج سے ہے انہوں نے فرمایا کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بلندیوں کی جانب چڑھے اور آسمانوں میں بلند مقام پر پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام بھی تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ سے آگے گزر گئے تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے عرض کی: بلاشبہ میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور نہ ہی آپ کے سوا کسی کو اس مقام سے تجاوز کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے گزر گئے یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچے جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اپنے رب کریم کو سلام عرض کیجئے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: التحیات للّٰہ والصلوٰت والطیبات۔ (قولی عبادات، بدنی عبادات اور مالی عبادات سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ (اے نبی کریم تجھ پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں۔) تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ آپ کی امت کے لئے بھی سلام میں حصہ موجود ہو۔ چنانچہ عرض کی: السلام علینا و علی عباد اللّٰہ الصالحین (1) (سلام ہو ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں پر۔) تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام اور آسمانوں میں رہنے والے تمام ملائکہ نے کہا:

1۔ صحیح بخاری، باب التشہد فی الآخرۃ، حدیث نمبر 788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ یہ معنی شکر کی بنا پر ہے یعنی رسول نے تصدیق کی۔ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (اس (کتاب) کی جو اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی۔) پس حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بھی کرامت وفضیلت میں شریک کرنے کا ارادہ فرمایا تو کہا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ یعنی وہ کہتے ہیں ہم تمام رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی کے ساتھ کفر نہیں کرتے اور نہ ہی ان کے درمیان کوئی فرق کرتے ہیں جس طرح کہ یہود ونصاریٰ نے فرق کیا... تو آپ کے رب نے آپ کو فرمایا اس آیت کے بارے ان کی قبولیت کیسی ہے جسے میں نے نازل کیا ہے؟ اور وہ یہ قول باری تعالیٰ ہے: اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کی: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (انہوں نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ہم طالب ہیں تیری بخشش کے اے ہمارے رب! اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے۔) یعنی الْمَصِیْرُ بمعنی المرجع (لوٹنے کی جگہ) ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی طاقتها۔ (اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر جتنی اس کی طاقت ہو۔)

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: الا دون طاقتها مگر اس کی طاقت سے کم۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ یعنی اس کے لئے اس خیر اور نیکی کے عمل کا اجر ہوگا جو اس نے کیا۔ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور اس پر اس برے عمل کا وبال ہوگا جو اس نے کیا۔ تو اس وقت حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا: مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔ تب حضور نبی کریم ﷺ نے کہا: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اے ہمارے رب! ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یعنی لاعلم رہیں اَوْ اَخْطَاْنَا یا ہم خطا کر بیٹھیں یعنی اگر ہم ارادۃً کریں۔

اور کہا جاتا ہے: اگر ہم عمل کر بیٹھیں بھول کر اور خطاءً۔ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ سے کہا: آپ کو یہ عطا کر دیا گیا تحقیق آپ کی امت سے خطا اور نسیان اٹھا لئے گئے ہیں۔(1)

پس آپ کسی دوسری شے کی التجا کیجئے۔ تو آپ نے کہا: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا، اِصْرًا سے مراد ثقل اور بوجھ ہے۔ (یعنی اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال) كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا (جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔) اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے ظلم کے سبب پاکیزہ چیزیں بھی حرام قرار دیں۔ اور وہ جب رات کے وقت گناہ کرتے تھے تو وہ اسے اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے تھے اور ان پر نمازیں پچاس تھیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے تخفیف کر دی اور ان سے پچاس نمازیں فرض کرنے کے بعد کم کر دیں(2)۔ پھر عرض کی: رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وہ کہہ رہے ہیں: ایسے عمل کا بوجھ ہم پر نہ ڈال جسے کرنے کی طاقت ہم نہیں رکھتے کہ پھر تو ہمیں عذاب دے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جو ہم پر گراں اور مشکل ہو، کیونکہ اگر انہیں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا تو وہ اس کی طاقت رکھتے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب طلاق المکرہ والناسی، حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، [illegible]، حدیث نمبر 2968، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان کی زبانیں پست ہو گئیں۔ تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ٭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَیْكَ الْمَصِیْرُ۔

پس جب انہوں نے یہ کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا فرمایا "ہاں" رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا فرمایا: "ہاں" رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ فرمایا: "ہاں" وَ اعْفُ عَنَّا ٭ وَ اغْفِرْ لَنَا ٭ وَ ارْحَمْنَا ٭ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ فرمایا: "ہاں"۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: پہلی روایت میں یہ قول قد فعلت اور اس روایت میں لفظ نعم یہ اس پر دلیل ہے کہ حدیث بالمعنی نقل کی گئی ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور جب اس پر امر متحقق ہو گیا کہ انہوں نے کہا: سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی تعریف اور مدح کی اور ان سے مشقت کو دور کر دیا جو انہیں دلوں میں کھٹکنے والی چیزوں کے سبب ملی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی طرف کامل متوجہ ہونے کا ثمرہ ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے اس کا برعکس ظاہر ہوا ان کی مذمت کی اور انہیں ذلت، محتاجی اور جلاوطنی جیسی مشقتوں میں ڈال دیا جب انہوں نے یہ کہا تھا: سمعنا وعصینا ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احسان اور مہربانی سے اپنے عذاب اور سزا سے پناہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو عرض کی گئی کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس کا گھر ہر رات چراغوں کے ساتھ روشن ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا: شاید وہ سورۃ البقرہ پڑھتا ہو۔ سو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: میں نے سورۃ البقرہ میں سے اٰمَنَ الرَّسُوْلُ پڑھی ہے (2)۔ یہ تب نازل ہوئی جب حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب پر وہ وعید شاق گزری جو اللہ تعالیٰ نے ان امور پر حساب لینے کے بارے انہیں فرمائی جنہیں ان کے دلوں نے چھپا رکھا ہوا ہے، تو انہوں نے اس کے بارے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں شکوہ کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "شاید تم یہ کہہ رہے ہو سمعنا وعصینا جیسا کہ بنی اسرائیل نے کہا تھا" تو انہوں نے عرض کی: نہیں بلکہ سمعنا واطعنا۔ بلکہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ نازل فرمائی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اور ان کے لئے حق ہے کہ وہ ایمان لائیں (3)۔"

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اٰمَنَ اس کا معنی صدق ہے یعنی تصدیق کی۔ یہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو نازل کیا گیا وہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 77

2۔ فضائل القرآن، سورۃ البقرہ کی آخری آیات، صفحہ 229، دار ابن کثیر دمشق بیروت

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3، حصہ 4، صفحہ 178-179

قرآن کریم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا ہے۔ وآمن المومنون کل آمن باللہ یہ لفظ پر (عطف کی بنا پر ہے (1)۔ اور غیر قرآن میں معنی پر (عطف کرتے ہوئے) آمنوا پڑھنا بھی جائز ہے۔

نافع، ابن کثیر، عاصم ابوبکر کی روایت میں اور ابن عامر رحمہم اللہ نے وَكُتُبِهٖ صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور انہوں نے سورۃ التحریم میں کتٰبہ صیغہ واحد پڑھا ہے۔ اور ابو عمرو نے یہاں اور سورۃ التحریم میں وکُتُبِہٖ صیغہ جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے دونوں میں کتابہ واحد کے ساتھ قرأت کی ہے۔ پس جنہوں نے جمع پڑھا ہے انہوں نے کتب کی جمع کا ارادہ کیا ہے اور جنہوں نے مفرد پڑھا ہے انہوں نے اس مصدر کا ارادہ کیا ہے جو ہر لکھی ہوئی شے کو جامع ہوتا ہے جس کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو (2)۔ اور جنہوں نے واحد پڑھا ہے ان کی قرأت میں بھی یہ جائز ہے کہ اس سے مراد جمع لیا جائے، اس اعتبار سے کہ کتاب اسم جنس ہے۔ پس دونوں قرأتیں مساوی طور پر برابر ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (البقرہ: 213) (تو بھیجے اللہ نے انبیاء خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب۔)

جماعت نے وَرُسُلِهٖ سین کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح رسلنا، رسلکم و رسلک میں ہے سوائے ابو عمرو کے اور ان سے رسلنا و رسلکم کی تخفیف مروی ہے۔ اور ان سے رسلک میں تثقیل اور تخفیف دونوں مروی ہیں۔ ابو علی نے کہا ہے: جنہوں نے رسلک کو تثقیل کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ کلمہ کی اصل ہے اور جنہوں نے تخفیف کی ہے تو اسی طرح آحاد میں تخفیف کی جاتی ہے، مثلاً عُنُق و طُنُب۔ اور جب آحاد میں تخفیف کی جاتی ہے تو یہاں جمع میں زیادہ مناسب ہے جو زیادہ ثقیل ہے۔ فرمایا اس کا (یہ) معنی کی ہے۔ اور جمہور لوگوں نے لَا نُفَرِّقُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور معنی یہ ہے یقولون لا نفرق (3) (وہ کہتے ہیں ہم فرق نہیں کرتے) اور قول حذف کر دیا گیا۔ اور قول کا حذف کرنا کثیر اور زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ علیہم من کل باب سلام علیکم یعنی یقولون سلام علیکم۔ (وہ کہیں گے تم پر سلام ہو) اور مزید فرمایا: ویتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، ای یقولون ربنا (وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب!) اور اسی طرح (ان میں ہے) جو اس کی مثل ہیں۔ سعید بن جبیر، یحییٰ بن یعمر، ابوزرعہ بن عمرو بن جریر اور یعقوب نے لا یفرق یا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ لفظ کل کی بنا پر ہے۔

ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لا یفرقون (4) ہے۔ اور بَیْنَ اَحَدٍ مفرد پڑھا ہے آحاد نہیں کہا ہے، کیونکہ احد واحد اور جمع تمام کو شامل ہوتا ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ۝ (الحاقہ) اس میں حٰجِزِیْنَ احد کی صفت ہے، کیونکہ اس کا معنی جمع ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ما احلت الغنائم لاحد سود الرؤس غیرکم (5) (تمہارے سوا بڑے سرداروں میں سے کسی کے لئے غنائم حلال نہیں کی گئیں۔) اس میں سود

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 391، دارالکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً، صفحہ 392　　4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 134۔ جامع ترمذی، باب سورۃ الانفال، حدیث نمبر 3010، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الرؤس، احد کی صفت ہے۔ اور رؤبہ نے کہا ہے:

إذا أمور الناس بينت دينكا   لا يرهبون أحدا من دونكا

جب لوگوں کے امور تیرے دین کے تابع بنا دیے گئے ہیں تو وہ تیرے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

اس آیت کا معنی ہے: بے شک مومنین یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں اس حیثیت سے کہ وہ بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا اس میں حذف ہے، یعنی سمعنا سماع قابلین ہم نے قبول کرنے والوں کے سماع کی طرح سنا۔ اور کہا گیا ہے: سَمِعْنَا بمعنی قبلنا ہے (یعنی قبول کرنا) جیسا کہ کہا جاتا ہے: سمع اللہ لمن حمدہ، تو اس میں حذف نہ ہوگا۔ المختصر یہ قول اپنے کہنے والے کی مدح کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعت کا معنی حکم کو قبول کرنا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: غُفْرَانَكَ یہ مصدر ہے جیسا کہ کفران اور خسران ہیں۔ اور اس میں عامل فعل مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: اغفر غفرانك (تو اپنی بخشش عطا فرما) زجاج نے یہی کہا ہے اور ان کے سوا دوسروں نے کہا ہے: نطلب او نسأل غفرانك (ہم مانگتے ہیں تیری بخشش کے طالب ہیں۔) وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ یہ دوبارہ زندہ کیے جانے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا اقرار ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو کہا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ پر اور آپ کی امت پر ثنا کو حلال کیا ہے سو آپ مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا۔" پس آپ نے آخر سورت تک التجا کی (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا تکلیف سے مراد وہ امر ہے جس کے ساتھ کسی کو آزمایا جائے اور تکلفت الامر کا معنی ہے میں نے اسے کام کرنے کی تکلیف دی۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے اور الوسع کا معنی ہے طاقت اور کوشش۔ اور یہ یقینی خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نص یوں فرمائی ہے کہ وہ آیت نازل ہونے کے وقت سے بندوں کو دل یا دیگر اعضاء بدن کے اعمال میں سے کسی عبادت کا پابند اور مکلف نہیں بنائے گا مگر اسی کا جو مکلف کی وسعت اور طاقت میں ہوگی اور اس کے ادراک اور اس کی فطرت کے تقاضا کے مطابق ہوگی تو اس سے مسلمانوں سے وہ غم اور پریشانی دور ہوگی جو دلوں میں آنے والے تصورات کا حساب لینے کے حکم سے انہیں لاحق ہوئی تھی (2)۔ اور اس آیت کے معنی میں وہ روایت ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا: میں نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کی جب سے اس کی ماں نے جنم دیا ہے، کیونکہ میں ایک دن ان کے پیچھے پیچھے گیا اور مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی وہ اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے گھی کی مشک کے سوا کچھ نہ پایا اس میں گھی کے کچھ اثرات تھے، چنانچہ انہوں نے اسے ہمارے سامنے پھاڑ دیا اور ہم نے اسے چاٹنا شروع کر دیا جو اس میں گھی اور کھجوروں کا اثر تھا۔ اور وہ کہنے لگے:

ما كلف الله نفسا فوق طاقتها   ولا تجود يد إلا بما تجد

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 392، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بنایا اور یا تحدی کی شے تجاوز کرتا ہے جو دو دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی احکام میں تکلیف مالا یطاق کے جائز ہونے کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے جبکہ اس پر ان کا اتفاق ہے کہ شریعت میں تکلیف مالا یطاق واقع نہیں ہے اور اس آیت نے اس کے معدوم ہونے کے بارے آگاہ کیا ہے۔ ابو الحسن اشعری اور متکلمین کی ایک جماعت نے کہا ہے: تکلیف مالا یطاق عقلاً جائز ہے۔ اور یہ عقائد شرعیہ میں سے کسی شے کو ساقط نہیں کرتی اور یہ مکلف کو عذاب دینے پر علامت ہے اور اس کے بارے میں (حکم) قطعی ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کسی مصور کو غلو پر گرہ لگانے کا پابند کیا جائے۔(1)

اور اس کے جواز کے قائلین نے اختلاف کیا ہے کہ آیا یہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں واقع ہے یا نہیں ہے؟ پس ایک جماعت نے کہا ہے: یہ ابولہب کے بارے میں نازل ہونے والی سورت میں واقع ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام شریعت کے ساتھ ایمان لانے کا مکلف بنایا اور من جملہ یہ بھی ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا، کیونکہ اس پر دونوں ہاتھوں کے ٹوٹنے اور آتش جہنم میں پھینکے جانے کا حکم لگایا گیا ہے اور یہ اس پر مطلع کرتا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ تحقیق اسے ایمان لانے کا مکلف بنایا باوجود اس کے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔

اور ایک جماعت نے کہا ہے: یہ کبھی واقع نہیں ہوئی۔ اور اس پر اجماع بیان کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ سَیَصْلٰی نَارًا کا معنی یہ ہے: اگر وہ اس میں پہنچا(2) اسے ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

اور یُکَلِّفُ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک محذوف ہے اور وہ عبادۃً یا شیئًا ہے(3)۔ پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم پر اپنا لطف و انعام فرمایا۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں ایسے امور کا مکلف بنا دیتا جو مشقت آمیز اور اذیت رساں ہوتے ہیں جیسا کہ دس کے مقابلہ میں ایک کا ثابت قدم رہنا، انسان کا ہجرت کرنا اور اپنے وطن سے نکلنا اور اپنے گھر والوں، اپنے وطن اور اپنے کاروبار سے کلیۃً علیحدگی اختیار کرنا، لیکن اس نے ہمیں ایسے کاموں کا جو حد مشقت آمیز ہوں اور ایسے امور جو اذیت اور تکلیف پہنچانے والے ہوں ان کا مکلف اور پابند نہیں بنایا۔ جیسا کہ اس نے ہم سے پہلے لوگوں کو مکلف بنایا مثلاً اپنے نفسوں کو قتل کرنا اور اپنے کپڑوں اور جسم پر پیشاب لگ جانے والی جگہ کا ٹ دینا وغیرہ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سہولت عطا فرمائی اور نرمی فرمائی اور ہم سے اس بوجھ اور طوق کو دور فرما دیا جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ فللہ الحمد والمنۃ والفضل والنعمۃ۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے وہ نیکیوں اور برائیوں کا ارادہ فرما رہا ہے۔ (یعنی اس کے لئے اجر ہوگا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا۔) سدی نے یہی کہا ہے۔ اور مفسرین کی جماعت میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں، ابن عطیہ نے یہ کہا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: 164) (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ) اور

1۔ جامع صحیح، باب من کذب فی حلمہ، حدیث نمبر 6520، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دارالکتب العلمیہ

3۔ ایضاً

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (انعام: 164) (اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے) اور دل میں پیدا ہونے والے تصورات اور اسی طرح کے دیگر وساوس انسان کی کمائی اور کسب میں سے نہیں ہیں۔ اور نیکیوں کے ذکر میں لَهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ یہ ان میں سے ہیں جنہیں کرنے سے آدمی خوش ہوتا ہے اور ان کے ساتھ مسرت محسوس کرتا ہے لہٰذا انہیں اس کی ملکیت کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے اور سیئات کے ذکر میں عَلَيْهَا ذکر ہوا ہے اس لئے کہ وہ بھاری بوجھ ہیں اور انہیں اٹھانا انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، اور وہ اسی طرح ہے جیسے تو کہتا ہے: لی مال وعلی دین (میرے لئے مال ہے اور مجھ پر قرض ہے یعنی مال میری ملکیت ہے اور قرض مجھ پر بوجھ ہے۔)

فعل کسب کو مکرر (دوبار) لایا گیا ہے اور باب مختلف ذکر کیا ہے تاکہ فرق کلام حسین ہو جائے جیسا کہ فرمایا: فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ (الطارق) (پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں)

ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں میرے لئے جو ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ نیکیاں وہ ہیں جو بغیر تکلف کے کمائی جاتی ہیں کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کے حکم کے راستہ پر اور طریقہ شریعت پر ہوتا ہے اور برے اعمال تکلف اور مبالغہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں، کیونکہ انہیں کمانے والا اللہ تعالیٰ کی نہی کے حجاب کو پھاڑ کر ان کے بارے میں تکلف کرتا ہے اور ان کی طرف تخطا اور تخطی کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے۔ لہٰذا آیت میں اس فعل کا دو بابوں سے آنا اس معنی کی حفاظت کے لئے انتہائی حسین ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ بندوں کے افعال پر ائمہ نے جو کسب اور اکتساب کا اطلاق کیا ہے وہ صحیح ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے ان پر خلق اور خالق کا اطلاق نہیں کیا ہے، بخلاف ان کے جنہوں نے بدعتی گروہوں میں سے اس کا اطلاق کرنے کی جرأت کی ہے۔ اور ہمارے ائمہ میں سے جنہوں نے بندے پر اس کا اطلاق کیا ہے اور یہ کہ وہ فاعل (کام کرنے والا) ہے تو وہ خالصتہً مجاز ہے۔ اور مہدوی وغیرہ نے کہا ہے: آیت کے معنی میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: فی نفسہٖ یہ صحیح ہے لیکن یہاں آیت کے سوا سے ثابت ہے[1]۔

مسئلہ نمبر 8۔ الکیا طبری نے کہا ہے: قولہ تعالیٰ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ جس نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا بھاری ہتھیار کے ساتھ یا گلا گھونٹ کر یا پانی میں غرق کر کے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں اس کی ضمان ہوگی، بخلاف اس کے جس نے اس کی دیت عاقلہ پر قرار دی ہے اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ باپ سے قصاص کا ساقط ہونا اس کے شریک سے اس کے ساقط ہونے کا تقاضا نہیں کرتا اور یہ قول عاقلہ پر حد واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے جب وہ مجنون کو اپنی ذات پر قدرت دے۔

اور قاضی ابوبکر بن عربی نے کہا: "ہمارے علماء نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ قصاص باپ کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے اور خطا کرنے والے کے شریک پر واجب ہے بخلاف امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے قتل کا کسب کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے: جس پر قصاص واجب نہیں ہوتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 393، دارالکتب العلمیہ

اس کا ایسے آدمی کے ساتھ شریک ہونا جس پر قصاص واجب ہوتا ہے اس حکم کے سقوط میں شبہ نہیں بن سکتا جیسے شبہ کے سبب ساقط کر دیا جاتا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اس کا مفہوم یہ ہے اس گناہ سے درگزر فرما لے جو ہم سے ان دونوں طریقوں پر یا ان میں سے ایک طریقہ پر صادر ہوتا ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان وما استکرھوا علیہ (2) (میری امت سے خطا، نسیان اور اس (گناہ) کو جس پر انہیں مجبور کیا جائے اٹھا لیا گیا ہے۔ یعنی ایسے گناہ پر مواخذہ نہ ہوگا۔) اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ گناہ اٹھا لیا گیا ہے۔ البتہ ان احکام میں اختلاف ہے جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ کیا وہ اٹھا لئے گئے ہیں اور اس سے کوئی شے لازم نہ آئے گی یا اس کے سارے احکام لازم آئیں گے؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ واقعات مختلف ہونے سے یہ بھی مختلف ہوتے ہیں، پس ایک قسم وہ ہے کہ وہ بالاتفاق ساقط نہیں ہوتی مثلاً تاوان، دیات اور فرض نمازیں۔ اور ایک قسم وہ ہے جو بالاتفاق ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً قصاص اور کلمہ کفر زبان پر لانا۔ اور تیسری قسم وہ ہے جس میں اختلاف ہے مثلاً وہ آدمی جس نے رمضان المبارک میں بھول کر کھا لیا یا بھول کر حانث ہو گیا (یعنی قسم توڑ دی) اور وہ کام جو ان کی مثل ہوں اور خطا اور بھول کر واقع ہو سکتے ہوں اور وہ فروع میں معروف ہوں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا۔ اِصْرًا کا معنی ثقل اور بوجھ ہے۔ امام مالک اور ربیع نے کہا ہے: الامر سے مراد انتہائی سخت اور مشکل امر ہے(3) اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ امر سے مراد عمل کی شدت اور سختی ہے اور وہ جو بنی اسرائیل پر انتہائی شدید اور سخت تھے مثلاً پیشاب وغیرہ کے مسائل۔ اور ضحاک نے کہا ہے: وہ انتہائی تکلیف دہ اور شدید امور برداشت کرتے تھے اور یہ امام مالک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی طرح ہی ہے۔ اور اسی سے نابغہ کا قول ہے:

یا مانع الضیم ان یغشی سراتھم والحامل الاصر عنھم بعد ما عرقوا

حضرت عطا نے کہا ہے: الاصر سے مراد شکل مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دینا ہے۔ اور ابن زید نے بھی یہی کہا ہے اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہے جس میں نہ توبہ ہو اور نہ ہی کفارہ ہو(4)۔ اور لغت میں اصر کا معنی عہد ہے۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ اور الاصر کا معنی تنگی، گناہ اور بوجھ ہے اور الاصار سے مراد وہ رسی ہے جس کے ساتھ بوجھ وغیرہ باندھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اَصَرَ یَاْصِرُ اَصْرًا بمعنی حبسہ یعنی اس نے اسے روک لیا۔ اور الاصر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسی سے ہے۔ جوہری نے کہا ہے: اسم ظرف مَأْصِر اور مَأْصَر ہے اور جمع مآصر ہے اور عام طور پر تو کہتا ہے معاصر۔

1۔ احکام القرآن جلد 1، صفحہ 284

2۔ کنز العمال جلد 4، صفحہ 233، حدیث نمبر 10307۔ ایضاً ابن ماجہ باب طلاق المکرہ والناسی حدیث نمبر 2034، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز جلد 1، صفحہ 394، دارالکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

ابن خویز منداد نے کہا ہے اور ممکن ہے کہ اس کے ظاہر سے ہر اس عبادت میں استدلال کیا جائے جس کے بوجھ اور ثقیل ہونے کا مصمم دعویٰ کرے۔ پس یہ اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: 78)

اور اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: الدین یسر فیسروا ولا تعسروا (1) (دین آسان ہے پس تم آسانی پیدا کرو اور تنگی اور مشکل نہ بناؤ)۔ اللھم شق علی من شق علی امۃ محمد ﷺ۔ (اے اللہ! اس پر مشقت ڈال دے جس نے امت محمد ﷺ پر مشقت ڈالی ہے)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسی طرح الکیا الطبری نے کہا ہے: اس سے حرج اور تنگی کی نفی میں استدلال کیا جاتا ہے اور جس کا ظاہر تخفیف اور نرمی کے میلان کے منافی ہو۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو ہم پر شدت اور تنگی نہ کر جس طرح تو نے ان پر تنگی کی جو ہم سے پہلے تھے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: ہم پر ایسے اعمال کا بوجھ نہ ڈال جنہیں کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے، اور اسی طرح ابن زید نے کہا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: تو ہماری شکلیں بندروں اور خنزیروں میں مسخ نہ کر دے۔ اور سلام بن سابور نے کہا: وہ جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ وہ شہوت پرستی ہے۔ اسے نقاش نے حضرت مجاہد اور حضرت عطا سے بیان کیا ہے اور روایت ہے کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں کہا کرتے تھے: واعوذبک من غلمۃ لیس لھا عدۃ (میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس شہوت پرستی سے جس کی عدت نہ ہو)۔ سدی نے کہا ہے: اس سے مراد وہ تنگی اور بیڑیاں ہیں جو بنی اسرائیل پر مسلط تھیں (2)۔

قولہ تعالیٰ: وَاعْفُ عَنَّا اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ عفوت عن ذنبہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب تو اسے چھوڑ دے اور اسے سزا نہ دے۔ وَاغْفِرْ لَنَا ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے (ان پر پردہ ڈال دے) اور الغفر کا معنی پردہ ہے۔ وَارْحَمْنَا اور رحمت فرما جس کا آغاز تیری جانب سے ہم پر ہو۔ اَنْتَ مَوْلٰىنَا تو ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے۔ اور یہ آیات مخلوق کی تعلیم کے لئے بیان کی گئی ہیں کہ وہ کیسے دعا مانگیں گے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ جب اس سورت کی قرأت سے فارغ ہوتے تو کہتے: آمین۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس کے بارے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہو، پس اگر ایسا ہے تو یہ کمال ہے اور اگر یہ سورۃ الحمد پر قیاس کے سبب ہے اس حیثیت سے کہ وہاں دعا ہے اور یہاں بھی دعا ہے تو یہ اچھا ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: میں گمان نہیں رکھتا کہ کسی نے اسلام کو سمجھا ہو اور اس کا ادراک کیا ہو اور وہ ان دونوں (آیات) کو پڑھے بغیر سو جائے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: امام مسلم نے اسی معنی میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ

1۔ کشف الخفاء للعجلونی، جلد 1، صفحہ 498، [illegible]
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 394، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 395

ﷺ نے فرمایا: ”جس نے رات کے وقت سورۃ البقرہ کی یہ دونوں آیتیں پڑھیں تو یہ اسے کافی ہیں(1)۔“ کہا گیا ہے: یہ اسے قیام اللیل سے کافی ہیں (یعنی یہ اس طرح ہے گویا اس نے رات کو عبادت کرتے ہوئے گزارا) جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”اللہ تعالیٰ نے کچھ جنت کے خزانوں میں سے دو آیتیں نازل فرمائی ہیں، ان کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا ہے، رحمٰن نے مخلوق کو پیدا کرنے سے ایک ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے انہیں تحریر فرمایا، جس نے عشاء کے بعد ان دونوں کو دوبار پڑھا تو وہ دونوں اس کے لئے قیام اللیل سے کافی ہوں گی۔ اور وہ آمن الرسول سے آخر سورۃ البقرہ تک ہیں(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ دونوں اسے شیطان کے شر سے (محفوظ رکھنے کے لیے) کافی ہوں گی اور اسے اس پر کوئی غلبہ نہ ہو سکے گا۔ اور ابو عمرو الدانی نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے سے دو ہزار برس پہلے ایک کتاب لکھی پس اس سے یہ تین آیات نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۃ البقرہ کو ختم کیا گیا جس نے انہیں اپنے گھر میں پڑھا تین راتوں تک شیطان اس کے گھر کے قریب نہیں آئے گا(3)۔

اور روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: أُوتِيتُ هٰذِهِ الْآيَاتِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِنْ كَنْزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ لَمْ يُؤْتَهُنَّ نَبِيٌّ قَبْلِي(4) (مجھے سورۃ البقرہ کی یہ آخری آیات عرش کے نیچے والے خزانے سے عطا کی گئی ہیں اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو عطا نہیں کی گئیں۔) اور یہ حدیث صحیح ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ میں فرشتے کا سورۃ الفاتحہ کے ساتھ انہیں لے کر نازل ہونے کا ذکر گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 271۔ ایضاً صحیح بخاری، باب فضل سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 4624، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 333

3۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 112۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ماجاء فی آخر سورۃ البقرہ، حدیث نمبر 2807، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 151

سورۃ آل عمران

آیاتہا ۲۰۰ | ۳ سورۃ آل عمران مدنیۃ ۸۹ | رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۭ

"الف۔ لام۔ میم۔ اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الٓمّٓ ۚ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یہ بالاجماع مدنی سورت ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ تورات میں اس کا نام طیبہ ہے(1)۔ اور حسن، عمرو بن عبید، عاصم بن ابی النجود اور ابو جعفر الرواسی نے الٓمّٓ۔ اللّٰہُ الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، اس تقدیر پر کہ الٓمّٓ پر وقف ہے۔ جیسے کہ واحد، اثنان، ثلاثۃ، اربعۃ وغیرہ میں وقف مقدر کرتے ہیں، حالانکہ وہ انہیں اکٹھا اور ملا کر پڑھتے ہیں۔

اخفش سعید نے کہا ہے: الٓمّٓ اللّٰہُ التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے۔ ثقیل ہونے کی وجہ سے عرب اس طرح نہیں کہتے۔ نحاس نے کہا ہے: میم کا فتحہ قرأت عامہ ہے اور متقدمین علمائے نحو نے اس میں گفتگو کی ہے۔ پس سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے میم کو فتحہ دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے فتحہ کو اختیار کیا ہے تاکہ کسرہ اور یا اور اس کے ماقبل کے کسرہ کے درمیان اسے جمع نہ کیا جائے۔

اور کسائی نے کہا ہے: حروف تہجی کے ساتھ الف وصل مل جائے اور تو الف وصل کو حذف کر دے تو اسے الف کی حرکت سے میم کو حرکت دے گا اور یہ کہے گا: الم اللہ، والم اذکر، والم اقتربت۔

اور امام فراء نے کہا ہے: الٓمّٓ اللّٰہُ کی اصل وہی ہے جسے رواسی نے پڑھا ہے پھر ہمزہ کی حرکت میم پر ڈال دی گئی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے الحی القیام پڑھا ہے(2) اور خارجہ نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں الحی القیم ہے۔ وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں آتے ہیں ان کے بارے علماء کی آرا سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس حیثیت سے اس سورت میں اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ایسا جملہ آیا ہے جو قائم بنفسہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام اقوال متصور ہو سکتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 397

مسئلہ نمبر 2۔ امام نسائی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور سورۂ آل عمران شروع کی اور پڑھا الٓمّٓ ۔ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اور پہلی رکعت میں سو آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں باقی بیس آیات پڑھیں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: دو رکعتوں میں ایک سورت نہیں پڑھی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لئے یہ جائز ہے۔ اور امام مالک نے المجموعہ میں کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ [illegible] بالشان نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف تلاوت فرمائی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا (2)۔ اسے نسائی نے بھی بیان کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس سورت کی فضیلت میں کئی آثار و اخبار موجود ہیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورت یہودیوں سے امان ہے۔ اور فقراء اور محتاجوں کے لئے یہ خزانہ ہے۔ اور یہ آخرت میں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑا کرے گی اور رات کے وقت جس نے اس کی آخری آیات پڑھیں اس کے لئے ساری رات قیام کرنے کی طرح ثواب لکھا جائے گا۔ وغیر ذالک۔
دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابو عبید قاسم بن سلام نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے عبید اللہ اشجعی نے بتایا، انہوں نے کہا مجھے مسعر نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے جابر نے اس حالت میں واقع ہونے سے پہلے بتایا جس میں وہ واقع ہوئے کہ حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فقراء و محتاجوں کے لئے سورۂ آل عمران بہترین اور اچھا خزانہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے (3)۔ (یعنی نوافل میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔)

محمد بن سعید نے عبد السلام سے، جریری سے، انہوں نے ابی السلیل سے بیان کیا ہے: ایک آدمی وادی [illegible] میں پہنچا اور اس نے وادی میں پناہ لی اور یہ وہ وادی ہے جس میں جو بھی چھپا تھا اسے سانپ ڈس لیتے تھے اور اس وادی کے کنارے پر دو راہب تھے۔ پس جب شام ہوئی تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: قسم بخدا! یہ آدمی ہلاک ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے: پس اس آدمی نے سورۂ آل عمران پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں راہبوں نے کہا: اس نے سورۂ طیبہ پڑھی ہے شاید یہ نجات پا جائے گا۔ راوی کہتا ہے: پس اس آدمی نے صبح بالکل صحیح کی۔ اور مکحول سے روایت ہے: جس نے جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھی رات تک ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس نے رات کے وقت سورۂ آل عمران کی آخری آیات پڑھیں تو اس کے لئے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا گیا۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

اور مسلم نے نواس بن سمعان کلابی سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: کل قیامت کے دن قرآن کو اور اہل قرآن کو لایا جائے گا جو اس کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے لئے تین مثالیں بیان فرمائیں جنہیں میں ابھی تک نہیں بھولا، فرمایا: گویا کہ یہ دونوں دو بادل ہیں یا دو سیاہ سائبان ہیں ان کے درمیان روشنی ہے یا گویا

1۔ سنن نسائی، کتاب الافتتاح، جلد 1، صفحہ 154 | 2۔ ایضاً | 3۔ فضائل القرآن، [illegible] صفحہ 238

یا دونوں پرندوں کا گروہ ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑیں گی(1)۔

مسلم نے ہی حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے شفیع بن کر آئے گا تم زہراوین (یعنی) سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس حال میں آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا گویا کہ یہ دو سائے ہیں یا گویا کہ یہ دونوں پرندوں کے غول ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اسے لینا برکت ہے اور اسے چھوڑنا حسرت ہے اور جادوگر اس کی استطاعت نہیں رکھیں گے۔'' معاویہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلة سے مراد جادوگر ہیں(2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ سورۃ البقرہ اور آل عمران کا نام الزهراوين رکھا گیا ہے۔ اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(1) بلاشبہ یہ دونوں روشن کرنے والیاں ہیں۔ (زهراوين) الزهر اور الزُّهْرَةُ سے بنایا گیا ہے چونکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کی وجہ سے ان کے قاری کے لئے ان کے انوار یعنی معانی ظاہر اور روشن ہو جاتے ہیں۔ (اس لئے ان کا نام زہراوین رکھا گیا)

(۲) پھر اس لئے کہ ان کی قرأت پر قیامت کے دن نور تام مرتب ہوگا۔ اور یہی دوسرا قول ہے۔

(۳) ان دونوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو متضمن ہونے میں شریک ہیں۔ جیسا کہ ابو داؤد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے والهكم اله واحد لا اله الا هو الرحمن الرحيم اور وہ آیت جو آل عمران میں ہے الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (3) اسے ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ الغمام کا معنی ہے وہ بادل جو گھنا اور لٹکا ہوا ہو اور الغيابة کا معنی بھی یہی ہے جب کہ وہ سر کے قریب ہو۔ اور یہی ظلة بھی ہے اور روایت کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کی تلاوت کرنے والا ان کے ثواب کے سائے میں ہوگا جیسا کہ ایک آدمی اپنے صدقہ کے سائے میں ہوگا'' اور قول تحاجان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ملائکہ پیدا فرمائے گا جو ان کے ثواب کے عوض پڑھنے والے کی جانب سے جھگڑا کریں گے(4)۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے: ''بلاشبہ جس نے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ ستر فرشتے پیدا فرمادے گا جو اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔''

اور قول: بينهما شرق۔ سے راء کے سکون اور اس کے فتحہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور یہ روشنی پر تنبیہ ہے کیونکہ جب فرمایا: سوداوان اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریک ہیں تو اپنے قول بينهما شرق سے اس کی نفی کی گئی۔ یعنی یہ

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 270

2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 210۔ ایضاً باب الدعاء، حدیث نمبر 1276، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 171، حدیث نمبر 6109

(ان کے بارے) ارشاد فرمایا آتوٰیۃ اور بالحق میں بالکتاب سے حال کے محل میں ہے۔ اور با محذوف کے متعلق ہے تقدیر عبارت ہے آتیا بالحق اور یہ نزّل کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تیسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور مُصَدِّقًا حال مؤکدہ ہے حال منتقلہ نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر مصدق یعنی غیر موافق ہو۔ یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے اس میں الانتقال کو مقدر مانا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ وہ مصدق لنفسہ بھی ہے اور مصدق لغیرہ بھی۔

قولہ تعالیٰ: لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یعنی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ اور تورات کا معنی روشنی اور نور ہے۔ یہ مشتق ہے وَرَی الزَّنْدُ اور وَرِیَ سے یہ دونوں لغتیں ہیں جب چقماق سے آگ نکلے (تو کہا جاتا ہے وَرَی الزند) اور اس کی اصل تَوْرِیَۃٌ بروزن تَفْعِلَۃ ہے۔ تا زائدہ ہے اور یا متحرک ہے اس کا ماقبل مفتوح ہے اسے الف سے بدل دیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تَفْعِلَۃٌ ہو اور پھر راء کسرہ سے فتحہ کی طرف منتقل ہو جائے، جیسا کہ انہوں نے جاریۃ میں جاراۃ اور ناصیۃ میں ناصاۃ کہا ہے اور یہ دونوں وزن فراء سے منقول ہیں۔

اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل وزن فَوْعَلَۃٌ ہے۔ پس اصل وَوْرَیَۃٌ ہوئی، پھر پہلی واؤ کو تا سے بدل دیا گیا جیسا کہ تَوْلَجٌ میں بدل گیا ہے اور یہ اصل میں وَوْلَجٌ تھا فَوْعَلٌ کے وزن پر اور یہ وَلَجْتُ سے ماخوذ ہے(1)، اور پھر یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا گیا۔ اور فَوْعَلَۃٌ کا وزن تَفْعِلَۃٌ کی نسبت زیادہ (قلیل استعمال) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ التوراۃ یہ التَّوْرِیَۃ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے کسی شے کے بارے تعریض کرنا اور اسے دوسرے سے چھپانا تو گویا تورات میں زیادہ کنایات ہیں اور بغیر کسی تصریح اور وضاحت کے اشارات ہیں، یہ مورج کا قول ہے۔

اور جمہور نے پہلا قول اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِیَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ مراد تورات اور انجیل ہیں۔ انجیل اِفْعِیْلٌ کے وزن پر النَّجْلُ سے ماخوذ ہے اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی جمع اَنَاجِیْل اور تورات کی تَوَارٍ بنائی جاتی ہے۔ پس انجیل علوم اور حکم (کے معنی) کے لئے اصل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: لعن اللہ ناجلیہ یعنی اللہ اس کے والدین پر لعنت کرے۔ کیونکہ والدین اس کی اصل ہیں (اس لئے انہیں ناجلیہ کہا گیا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نَجَلْتُ الشَّیْءَ سے ہے جب تو کسی شے کو نکالے (تو یہ جملہ بولتا ہے) پس انجیل کے ساتھ علوم و حکم نکالے گئے ہیں اور اسی معنی میں اولاد اور نسل کو اس کے نکلنے کی وجہ سے نجل کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الی معشر لم یورث اللؤم جدهم | اصاغرهم و کل فحل لهم نجل

اس میں لفظ نجل نکالنے کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

النجل سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور استنجلت الارض کا معنی ہے زمین پانی رسنے کی وجہ سے دلدلی ہو گئی۔ اور اسی کو منجال کہتے ہیں جب اس سے پانی نکلنے لگے۔ پس اسی معنی کی بنا پر اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 398، دارالکتب العلمیہ

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین اور نہ آسمان میں۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشیاء کے بارے تفصیلی علم رکھنے کی خبر ہے اور اس کی مثل قرآن کریم میں کثیر آیات ہیں۔ پس وہ جانتا ہے اسے بھی جو ہو چکا اسے بھی جو ہو گا اور اسے بھی جو نہ ہو گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ یا اس کے بیٹے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان پر کئی اشیاء مخفی ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

"وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے وہی غالب ہے حکمت والا ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے رحموں میں انسان کی تصویریں بنانے کی خبر دی ہے۔ اور رحم کی اصل رحمۃ سے ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم کیا جاتا ہے۔ اور صورۃ کا اشتقاق صارہ، یصورہ سے ہے جب وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، پس صورت مائل ہوتی ہے ایک شبیہ اور ہیئت کی طرف۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کو بیان کرتی ہے اور اس کے ضمن میں نجران کے عیسائیوں کا رد ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج اور المومنون میں تصویر کی شرح اور وضاحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ابن مسعود میں (1) بھی اس کی وضاحت کی ہے، جیسا کہ وہاں ان کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس میں طبیعتین کا بھی رد ہے کیونکہ وہ اسے مستقل فاعل بناتے ہیں اور ان کا رد آیۃ التوحید میں گزر چکا ہے اور مسند ابن سنجر میں حدیث ہے۔ (اس کا نام محمد بن سنجر ہے) "بے شک اللہ تعالیٰ جنین کی ہڈیاں اور اس کی غضاریف (نرم ہڈیاں جو کھائی جا سکتی ہیں) مرد کی منی سے، اور اس کی چربی اور گوشت عورت کی منی سے پیدا فرماتا ہے (2)۔"

اور اس میں اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صریحاً موجود ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ (الحجرات: 13) (اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے) اور صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے "کہ ایک یہودی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں ایک شے کے بارے آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سوائے نبی یا ایک آدمی یا دو آدمیوں کے اہل زمین میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: "تجھے نفع ہو گا اگر میں تجھے بتا دوں؟" اس نے کہا: میں کان لگا کر پورے غور سے سنوں گا۔ پھر اس نے کہا: میں بچے کے بارے آپ سے پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آدمی کا پانی سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد۔ اور جب وہ دونوں جمع ہو جاتے ہیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

ہو تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچہ مذکر پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہو تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے(1)۔ اس حدیث کا بیان سورۃ الشوریٰ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر2۔ قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَشَآءُ یعنی جیسے وہ چاہتا ہے خوبصورت یا بدصورت، سیاہ اور سفید، طویل اور قصیر، تام الخلقت یا ناقص الاعضاء، صحیح سالم یا بیمار (یہاں تک کہ اس کا قول العزیز الحکیم ہے) اور سعید و شقی۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا کہ آپ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور حدیث سننے کے خواہش مند تھے تو آپ نے کچھ نہ فرمایا۔ (پھر) فرمایا: میں تم سے چار چیزوں کے سبب مشغول ہوں اور میں حدیث بیان کرنے کے لیے فارغ نہیں ہوں۔ تو آپ سے عرض کی گئی: وہ کون سی مشغولیت ہے؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں یوم میثاق میں غور و فکر اس حیثیت سے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جنت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ جہنم میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ تو میں نہیں جانتا اس وقت میں کون سے فریق میں تھا۔ اور دوسری یہ ہے کہ جب میری صورت بنائی گئی تو اس فرشتے نے کہا جو رحم پر مقرر ہے: اے میرے رب! یہ شقی ہے یا سعید (2)؟ تو میں نہیں جانتا اس وقت اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ جس وقت ملک الموت میری روح قبض کرے گا تو وہ کہے گا: اے میرے رب! کفر کے ساتھ یا ایمان کے ساتھ؟ تو میں نہیں جانتا کیا جواب دیا جائے گا۔ اور چوتھی شے یہ ہے کہ وہ کہے گا: وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (یٰسٓ) اور (ترجمہ) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ۔ تو میں نہیں جانتا میں کون سے فریق میں ہوں گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ یعنی اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور نہ کوئی مصور (تصویر بنانے والا) ہے اور یہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الٰہ اور معبود ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی تصویر بنائی گئی ہے حق یہ ہے کہ وہ مصور ہیں۔ الْعَزِيزُ سے مراد وہ ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا۔ الْحَكِيمُ سے مراد ذو الحکمت (صاحب حکمت) یا محکم (مضبوط بنانے والا اور پختہ کرنے والا) ہے۔ یہ معنی پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۖ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

”وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر یہ کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا ان کے صحیح معنی کو بجز اللہ تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے اس کے ساتھ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 145
2۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ، حدیث نمبر 2969، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۞ ام المومنین نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں تو وہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے یہ نام رکھا ہے لہٰذا تم ان سے بچو(1)۔"

ابو غالب نے بیان کیا ہے: میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے گدھے پر سوار تھے، یہاں تک کہ جب وہ مسجد دمشق کے راستے تک پہنچ گئے تو وہاں کچھ سر کھڑے کیے گئے، تو آپ نے پوچھا: یہ سر کن کے ہیں؟ تو بتایا گیا: یہ خوارج کے سر ہیں جو عراق سے لائے گئے ہیں۔ تو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کے کتے ہیں۔ آگ کے کتے ہیں، آگ کے کتے ہیں! آسمان کے سائے کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، اچھائی اور مبارک اس کے لئے جس نے انہیں قتل کیا اور انہوں نے اسے قتل کیا۔ انہوں نے یہی جملہ طوبی لمن قتلهم و قتلوه تین بار کہا۔ پھر رونے لگے۔ تو میں نے عرض کی: اے ابو امامہ! کون سی شے تمہیں رلا رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا: ان کے لئے رحمت ہو۔ بے شک وہ اہل اسلام میں سے تھے پھر اس سے نکل گئے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الی آخر الآیات۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ (آل عمران: 105) (اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں)

تو میں نے کہا: اے ابو امامہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے کہا: کیا یہ ایسی شے ہے جو تم اپنی رائے سے کہہ رہے ہو یا ایسی شے ہے جسے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ جب تو میں جرأت کرنے والا ہوں، بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا! (نہیں) بلکہ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (کئی بار) سنا ہے نہ ایک بار، نہ دو بار، نہ تین بار، نہ چار بار، نہ پانچ بار، نہ چھ بار، نہ سات بار اور انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھ لیں۔ بیان کیا: ورنہ انہیں خاموش کرا دیا جاتا(2) انہوں نے یہ تین بار کہا پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور بقیہ تمام فرقے جہنم میں ہوں

1۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339۔ ایضاً صحیح بخاری، باب منہ آیات محکمات، حدیث نمبر 4183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مجمع الزوائد للطبرانی، جلد 8، صفحہ 267، حدیث نمبر 8634۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث 2928، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور یقیناً یہ امت ان پر ایک فرقے کا اضافہ کرے گی ایک جنت میں ہوگا اور باقی تمام جہنم میں ہوں گے(1)"۔

مسئلہ نمبر 2۔ محکمات اور متشابہات کے بارے میں متعدد اقوال پر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ وہی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور وہی حضرت شعبی اور حضرت سفیان ثوری وغیرہما کے قول کا مقتضا بھی ہے کہ محکمات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کی تاویل معروف ہو اور اس کا معنی و تفسیر سمجھے جا سکیں۔ اور متشابہ وہ ہے جسے جاننے کے لئے کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو یا ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے نہ کہ اپنی مخلوق کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا ہے: اس کی مثال میں قیامت قائم ہونے کا وقت ہے، یاجوج اور ماجوج اور دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے اور اسی طرح سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات ہیں(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احسن قول ہے جو متشابہ کے بارے کیا گیا ہے اور ہم نے سورۃ البقرہ کے اوائل میں ربیع بن خثیم سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں سے جو چاہا اسے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا(3) الحدیث۔

اور ابو عثمان نے کہا ہے: محکم سے مراد وہ سورۃ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ اور محمد بن فضل نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ اخلاص ہے کیونکہ اس میں فقط توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) (یہ وہ کتاب ہے محکم و مستحکم بنا دی گئی ہیں جس کی آیتیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کا تمام متشابہ ہے، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کے معنی میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ کا معنی نظم اور وصف میں اس کی آیات پختہ اور مضبوط ہیں اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں اور كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا کا معنی ہے کہ اس کی بعض آیات بعض کے مشابہ ہیں اور بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اور وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ سے مراد یہ معنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں تشابہ احتمال اور اشتباہ کے باب سے ہے جیسا کہ قول میں ہے اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا یعنی وہ گائے ہم پر ملتبس ہو گئی ہے۔ یعنی یہ (لفظ) گائیوں میں سے بہت سی نوع کا احتمال رکھتا ہے۔ اور محکم سے مراد وہ ہے جو اس کے مقابلہ میں ہو، اور وہ وہ ہے جس میں کوئی التباس نہ ہو اور وہ سوائے ایک وجہ کے اور کوئی احتمال نہ رکھتا ہو۔

اور کہا گیا ہے: بے شک متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، پھر جب ان وجوہ کو ایک وجہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور باقی باطل قرار دی جائیں تو وہ متشابہ محکم ہو جاتا ہے۔ پس محکم ہمیشہ اصل ہوتا ہے اور فروع اس کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور متشابہ وہی فرع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں فرمایا: محکمات سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ تین آیات تک، اور سورۃ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 273، حدیث نمبر 8051

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 401، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 400

إِخْفَائُهٗ۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ایک مثال ہے جو آپ نے محکمات کے بارے میں بیان فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا: محکمات سے مراد قرآن کریم کی ناسخ آیات، احکام حرام کو بیان کرنے والی اور اس کے فرائض کو بیان کرنے والی وہ آیات ہیں جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور متشابہات سے مراد اس کی منسوخ آیات، اس کی مقدم و مؤخر آیات، اس کی امثال، اس کی اقسام اور وہ جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: محکمات سے مراد ناسخ آیات ہیں اور متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ اور یہی حضرت قتادہ، ربیع اور ضحاک نے کہا ہے (1)۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: محکمات وہ آیات ہیں جن میں رب کریم کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو دور کرنے کا ذکر ہے، جس معنی پر انہیں وضع کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں پھیرا جا سکے اور نہ ان میں کوئی تحریف کی جا سکے۔ اور متشابہات وہ ہیں جن میں تصریف و تحریف اور تاویل ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بندوں کو آزمایا ہے۔ مجاہد اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں سب سے احسن قول یہی ہے (2)۔

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ محکمات اور متشابہات کے بارے کہا گیا ہے ان میں احسن یہ ہے کہ محکمات وہ ہیں جو قائم بنفسہ ہیں ان میں کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وَلَمْ يَكُن لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص: 4) اور وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور متشابہات مثلاً ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً میں ان ارشادات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: 48)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ نحاس نے کہا ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے جسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے اور وہی وضع زبان پر جاری ہے اور وہ یہ کہ محکم احکم سے اسم مفعول ہے اور الاحکام کا معنی الاتقان (پختہ کرنا) ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لفظ واضح المعنی ہو اس میں کوئی اشکال اور تردد نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ (محکم) اپنے مفرد کلمات کے واضح ہونے اور ان کی ترکیب کے پختہ اور مضبوط ہونے میں اسی طرح ہوتا ہے اور جب دو امروں میں سے کوئی ایک مختل ہو جائے تو اس میں تشابہ اور اشکال آ جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: متشابہ کی کئی وجوہ ہیں، ایک وہ ہے جس کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے وہ یہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو کہ دو آیتوں میں سے کون سی آیت نے دوسری کو منسوخ کر دیا ہے جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ایسی حاملہ عورت کے بارے جس کا خاوند فوت ہو جائے یہ نظریہ ہے کہ وہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ کے ساتھ عدت گزارے گی اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے اور وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 401

گزر گیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فلا انساب بینھم، تو یہ نفخہ اولیٰ کے بارے میں ہے پھر صور میں پھونکا جائے گا اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہو گا وہ گر پڑے گا سوائے اس کے جس کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس وقت ان کے درمیان نہ نسب ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے پوچھیں گے۔ پھر دوسرے نفخہ میں ان میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

اور جہاں تک ما کنا مشرکین اور ولا یکتمون اللہ حدیثا کا تعلق ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص والوں کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا تو مشرکین کہیں گے! آؤ ہم کہتے ہیں: ہم مشرک نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے اعمال کے بارے ان کے اعضاء گفتگو کریں گے تو اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کو نہیں چھپائے گا اور اسی وقت کفار یہ خواہش کریں گے کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں تخلیق فرمایا پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی تو دو دنوں میں انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنا دیا۔ پھر زمین کو بچھایا اور اس سے پانی اور گھاس نکالی اور اس میں پہاڑ، درخت، ٹیلے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب دوسرے دو دنوں میں تخلیق فرما دیا۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (نازعات) پس زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ چار دنوں میں تخلیق کیا گیا اور دو دنوں میں آسمان بنایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وکان اللہ غفورا رحیما (یعنی وہ ذاتی طور پر غفور اور رحیم ہے یعنی وہ ہمیشہ رہا اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر اسے اس کے مطابق کیا جو ارادہ فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے! بچا ہے کہ تجھ پر قرآن مختلف نہ ہو کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اس میں اُخَرُ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اسے الف لام سے معدول کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اصل یہ ہے کہ یہ الف لام کے ساتھ صیغہ صفت ہو جیسا الکبر اور الصغر۔ پس جب اسے الف لام کے جاری ہونے کی جگہ سے معدول کر دیا گیا تو یہ غیر منصرف ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: انہوں نے اسے منصرف نہیں کہا کیونکہ اس کا واحد منصرف نہیں ہوتا چاہے وہ معرفہ ہو یا نکرہ۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ غضاب اور عطاش بھی منصرف نہ ہوں۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ اور مبرد نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے: بے شک لبید اور حطما بھی دونوں صفتیں ہیں اور یہ دونوں منصرف ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اُخر الف لام سے معدول ہو، کیونکہ اگر یہ الف لام سے معدول ہوتا تو یہ معرفہ ہوتا، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ سحر تمام اقوال میں معرفہ ہے کیونکہ یہ السحر سے معدول ہے اور امس اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ذهب امس، یہ الامس سے معدول ہے، پس اگر اخر بھی الف لام سے معدول ہوتا تو وہ بھی معرفہ ہوتا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نکرہ کے ساتھ اس کی صفت بیان کی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 712

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ، اَلَّذِیْنَ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ہے۔ اور زَیْغٌ کا معنی جھکاؤ اور کجی ہے اور اسی سے زاغت الشمس (سورج کا ڈھلنا) اور زاغت الابصار (آنکھوں کا جھکنا) ہے۔ اور کہا جاتا ہے: زاغ یزیغ زیغا جب وہ قصد اور ارادہ ترک کردے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) اور یہ آیت کفار، زندیقوں، جاہلوں اور تمام بدعتی گروہوں کو عام ہے۔ اگرچہ اس وقت اس سے اشارہ نجران کے عیسائیوں کی طرف تھا۔ اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے اس ارشاد فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر یہ حروریہ اور سبائیوں کے گروہ نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے گزر چکی ہے۔ وہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ہمارے شیخ ابو العباس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: متشابہ کی پیروی کرنے والے اس سے خالی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی پیروی کریں اور اسے جمع کریں قرآن کریم میں تشکیک تلاش کرنے کے لئے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، جیسا کہ زنادقہ اور قرآن کریم میں طعن زنی کرنے والے قرامطہ نے کیا۔ یا وہ متشابہ کے ظواہر کے مطابق اعتقاد رکھنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، جیسا کہ ان مجسمہ نے کیا جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث طیبہ سے ان آیات و روایات کو جمع کیا جن کا ظاہر (اللہ تعالیٰ کی) جسمیت پر دلالت کرتا ہے یہاں تک کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم مجسم ہے اور وہ صورت مصورہ ہے اس کا چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، پاؤں اور انگلیاں بھی اعضاء ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بری اور بلند ہے یا وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں ان کی تاویلات کو ظاہر کرنے کے لئے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کے لئے یا جیسا کہ صبیغ نے کیا جس وقت اس نے کثرت سے اس بارے سوال کئے۔ پس یہ چار اقسام ہو گئیں:

(1) ان کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو قبول کئے بغیر ان کے بارے میں قتل کا حکم دیا ہے۔

(2) صحیح قول ان کی تکفیر کا ہے، کیونکہ ان کے اور بتوں اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اور اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے جیسا کہ مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے

(3) چونکہ اس کی تاویل کے جواز میں اختلاف ہے لہٰذا اس بنا پر اس کے جائز ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ سلف کا مذہب متشابہ کی تاویل کے لئے تعرض کو ترک کرنا ہے باوجود اس کے کہ انہیں ان کے ظاہر معنی کے محال ہونے کا یقین تھا۔ پس وہ کہتے: تم اسے یوں گزر جاؤ جیسے وہ آئے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی تاویلات کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے ایسے معنی پر محمول کیا جائے بغیر یقین کے جس پر لفظ محمول کرنا صحیح ہو جیسا کہ مجمل کی تعیین کی جاتی ہے۔

(4) اس میں حکم ادب بلیغ کا ہے جیسا کہ حضرت عمر نے صبیغ کے ساتھ کیا اور ابو بکر انباری نے کہا ہے: ائمہ سلف اسے سزا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 1، صفحہ 402، دار الکتب العلمیہ

اور یہ سے مراد چالیس ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ اور یہاں تاویل بمعنی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: تاویل هذه الكلمة على كذا (یعنی اس کلمہ کی تفسیر اس معنی پر ہے)۔ اور یہ ما یؤول الامر الیہ کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے (یعنی جس کی طرف امر لوٹتا ہے) اور اس کا اشتقاق آل الامر الی کذا یؤول الیہ سے ہے یعنی بمعنی صار ہے۔ اور أولته تأویلا بمعنی صیرته ہے (یعنی میں نے اس کی تاویل کی) اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف کی اور کہا: هو إبداء احتمال في اللفظ مقصود بدليل خارج عنه۔ یعنی کسی لفظ میں مقصود احتمال کو خارجی دلیل کے ساتھ ظاہر کرنا۔ اور تفسیر سے مراد لفظ کا بیان اور اس کی وضاحت کرنی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا رَيْبَ فِيهِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔ اور تفسیر کی اصل فسر ہے اور اس کا معنی بیان ہے۔ کہا جاتا ہے: فسرت الشيء (بالتخفیف) أفسره (بالکسر) فسرا اور تاویل معنی کا بیان ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہ قول لا شك فيه عند المؤمنين یعنی مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں۔ یا یہ کہ یہ فی نفسہ حق ہے لہٰذا اس کی ذات شک کو قبول نہیں کرتی۔ اور بلاشبہ شک کرنے والے کا وصف ہے۔ اور جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دادا کے بارے میں اب (باپ) ہونے کا قول ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی ہے: يَا بَنِي آدَمَ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ ابتدا کلام ہے اور اس کا ماقبل سے تعلق منقطع ہے یا یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور واو جمع کے لئے ہے۔ اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ ماقبل سے منقطع ہے اور یہ کہ قول باری تعالیٰ إِلَّا اللَّهُ پر جملہ کلام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اور کئی دوسروں کا ہے۔ اور یہی امام کسائی، اخفش، فراء اور ابو عبید وغیرہم کا مذہب ہے۔ ابو نہیک اسدی نے کہا ہے: بے شک تم اس آیت کو ملاتے ہو حالانکہ یہ اس سے منقطع ہے۔ اور راسخین کے علم کی انتہا نہیں مگر ان کے اس قول پر: آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ اور اسی کی مثل حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے۔ اور علامہ طبری نے اسی طرح یونس، ابن وہب اور مالک بن انس سے بیان کیا ہے[1]۔ اور اس بنا پر يَقُولُونَ، الرَّاسِخُونَ کی خبر ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ کتاب جس کے ساتھ ایمان لانے اور جس کی تصدیق کرنے کا ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے اس کی آیات کی دو قسمیں بنا دی ہیں۔ ایک محکم اور دوسری متشابہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے قائل سے فرمایا: هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا تو بتا دیا کہ کتاب میں متشابہ کو اپنے علم کے ساتھ خاص کر دیا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس کی تاویل کو نہیں جانتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کی تعریف بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ اور اگر ان کی طرف سے ایمان صحیح نہ ہوتا تو وہ اس پر تعریف کے مستحق نہ ہوتے۔ اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت میں وقف تام اللہ تعالیٰ کا قول ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ اور جو اس کے بعد ہے وہ دوسرا کلام ہے اور وہ یہ قول ہے: وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

نہیں حاصل کر سکتا، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور شوکانی اور بعض حذاق اور متبحر علماء میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ راسخین
حق یہ کا علم نہیں رکھتے تو انہوں نے متشابہ کی اسی نوع کا ارادہ کیا ہے اور رہا وہ جسے وجوہ لغت پر اور کلام عرب کی طرز پر محمول کرنا
ممکن ہوتا ہے تو اس میں تاویل کی جا سکتی ہے اور اس کی صحیح تاویل جانی جا سکتی ہے اور اس سے اسے زائل کیا جا سکتا ہے جس کا
تعلق غیر صحیح تاویل کے ساتھ ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول: وَرُوْحٌ مِّنْهُ
پس کسی کو راسخ کا نام نہیں دیا جا سکتا مگر یہی جب وہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) ہر کسی کی قدرت و استطاعت کے مطابق اس نوع
میں سے تھوڑا کا علم رکھتا ہو۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہ سے مراد منسوخ ہے تو اس قول کی بنا پر راسخین کو تاویل کے علم میں داخل
کرنا صحیح ہے لیکن متشابہات کو اس نوع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے(1)۔

الرُّسُوْخُ کا معنی ہے کسی شے میں ثابت ہونا۔ اور ہر ثابت راسخ ہوتا ہے۔ اور اجرام میں اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے پہاڑ
اور درخت زمین میں راسخ کر دیے(2)۔ شاعر نے کہا ہے:

لقد رسخت فی الصدر منی مودۃ — لیلی أبت آیاتھا أن تغیرا

میری طرف سے لیلیٰ کے لئے محبت سینے میں راسخ ہو گئی اس کی علامات نے انکار کر دیا کہ وہ متغیر ہوں۔
اور رسخ الایمان فی قلب فلان یرسخ رسوخا۔ فلاں کے دل میں ایمان راسخ ہو گیا۔
اور بعض نے بیان کیا ہے: رسخ الغدیر اس کا معنی ہے تالاب کا پانی بہہ پڑا۔ اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے پس یہ
اضداد میں سے ہے۔

اور رسخ و رضخ و رسب و رسب تمام ثبت فیہ کے معنی میں ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ سے راسخین فی العلم کے
بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "وہ وہ ہے جس کی قسم سچی ہو اور اس کی زبان سچ بولے اور اس کا دل مستقیم اور سیدھا ہو۔" من
برت یمینہ وصدق لسانہ واستقام قلبہ(3) اور اگر کہا جائے: قرآن کریم میں متشابہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے: وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر
یہ ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) تو اللہ تعالیٰ نے کیونکر تمام
قرآن کو واضح نہیں بنایا؟ تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر اس میں حکمت علماء کی فضیلت کا اظہار
ہے، کیونکہ اگر سارا قرآن واضح ہوتا تو علماء میں سے بعض کی بعض پر فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اسی طرح وہ کرتا ہے جو کوئی شے
تصنیف کرتا ہے کہ اس کے بعض مقامات کو واضح ذکر کرتا ہے اور بعض کو مشکل بنا دیتا ہے اور اس میں (علماء کی) جماعت کے
لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ شے جسے پانا آسان ہو اس کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اس میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کے محکم و متشابہ کی طرف لوٹ رہی
ہے اور تقدیر عبارت ہے: کلہ من عند ربنا۔ اور لفظ کُلٌّ کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ — 2۔ ایضاً، صفحہ 404 — 3۔ جامع البیان للطبری، جز 3-4، صفحہ 217

كأنّ　ابيبيهن　بالقاع　القرق　أيدي　جوار　يتعاطين　الورق

القرق اور القرقۃ القاع میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا میں مِنْ بمعنی عند ہے، ابوعبیدہ نے یہی کہا ہے۔ أُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ، الوقود یہ جلنے والی لکڑی کا نام ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرف نے وُقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے حطب وقود النار۔(1) اور عرب کلام میں یہ جائز ہے کہ جب واؤ مضموم ہو تو اسے ہمزہ سے بدل دیا جائے لہٰذا اُقود پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اُقتت۔

اور وُقود واؤ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے اور وقدت النار تقد کہا جاتا ہے جب آگ بھڑک اٹھے۔ ابن مبارک نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کو عبور کرے گا اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کرتے ہوئے) گھوڑے سمندروں میں ڈال دیئے جائیں گے، پھر کچھ قومیں آئیں گی وہ قرآن کریم پڑھیں گے اور جب وہ اسے پڑھیں گے تو کہیں گے: کون ہم سے بڑھ کر قاری ہے اور کون ہم سے بڑھ کر عالم ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں کوئی خیر اور بھلائی دیکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ”وہ تم میں سے ہوں گے اور وہ اس امت میں سے ہوں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہوں گے(2)“۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⓫

”(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آلِ فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے“۔

الداب کا معنی عادت اور طریقہ ہے۔ اور دأب الرجل فی عملہ یدأب دأبا و دؤوبا کہا جاتا ہے جب وہ اپنے کام میں کوشش کرے اور خوب محنت کرے اور أدأبتہ أنا اور أدأب بعیرہ جب وہ اونٹ کو چلانے میں خوب تھکا دے۔ اور الداٰئبان سے مراد رات اور دن ہیں۔ ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے یعقوب کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کہ دَأَب کہ یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور انہوں نے مجھے کہا اور آنحالیکہ میں نوجوانی کی حالت میں تھا۔ کون سی شے پر کَدَأَب جائز ہو سکتا ہے؟ تو میں نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ دئب یدأب دأبا سے ہے۔ تو انہوں نے میری بات کو قبول کر لیا اور میرے چھوٹا ہونے کے باوجود میری عمدہ وضاحت پر اظہار تعجب و مسرت کیا اور میں نہیں جانتا کیا یہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نحاس نے کہا ہے: یہ قول غلط ہے، بالیقین دئب نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ کہا جائے گا دأب یدأب دؤوبا [ودأبا] اسی طرح نحویوں نے بھی بیان کیا ہے، ان میں سے امام فراء نے اسے کتاب المصادر میں بیان کیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ　　2۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 212، حدیث نمبر 29121

كَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا　　وَجَارَتِهَا أُمِّ الرَّبَابِ بِمَأْسَلِ

یہی وہاں دأب تو یہ کہنا جائز ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: شَعْرٌ و شَعَرٌ، نَهْرٌ و نَهَرٌ کیونکہ اس میں حروف حلقی میں سے ایک حرف ہے۔ اور الکاف میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے: یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام ہے دَأْبُهُمْ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفار کا رویہ اسی طرح ہے جیسے آل فرعون کا رویہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اور فراء کا خیال ہے کہ معنی یہ ہے: عرب آل فرعون کے کفر کی طرح کافر ہو گئے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: یہ جائز نہیں کہ کاف کفروا سے متعلق ہو کیونکہ کفروا صلہ میں داخل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ أَخَذَهُمُ اللَّهُ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں شدید پکڑ لیا جیسا کہ اس نے آل فرعون کو پکڑا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس ارشاد کے متعلق ہے لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ یعنی انہیں دولت نے کوئی فائدہ نہ دیا جیسا کہ آل فرعون کو ان کے مال اور اولاد نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور یہ ان کے لئے جواب ہے جو جہاد سے پیچھے رہ گئے۔ اور انہوں نے کہا: ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں لفظ وقود سے مقدر شدہ کوئی فعل عامل ہو۔ اور تشبیہ نفس احتراق (جلنے) میں ہو۔ اور اس کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (المومن) (اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

پہلا قول ارجح ہے(1) اور علماء میں سے کئی ایک نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ کا معنی ہے جیسا کہ آل فرعون کی عادت اور رویہ تھا، وہ کہہ رہے ہیں: ان کافروں کا انداز اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اسی طرح ہے جیسے کہ آل فرعون نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اپنایا۔ اور کہا: یہ معنی ازہری نے بیان کیا ہے۔ اور رہا وہ قول جو سورۃ الانفال میں ہے كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں قتل اور قید کی سزا دی گئی جیسے کہ آل فرعون کو غرق اور ہلاکت کی سزا دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: بِآيَاتِنَا یہ احتمال رکھتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جن کی تلاوت کی گئی ہے (یعنی آیات متلوہ) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جو وحدانیت پر بطور دلیل بیان کی گئی ہیں۔ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ

تو اس میں معنی کو اپنایا گیا ہے اور لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس کا قول ہے:

برهرهة　　رؤدة　　رخصة　　كخرعوبة　　البانة　　المنفطر

اور اس میں المنفطر ذکر کیا، کیونکہ انہوں نے قضیب کے معنی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اسے مذکر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان صفت سے فاصلہ کیا گیا ہے اور جب اسم اور فعل کے درمیان صفت حائل ہو تو فعل مذکر لایا گیا۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں اس قول کے تحت گزر چکا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ (البقرہ:180) (فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے) فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کے دو گروہ جو بدر کے دن ملے تھے۔ فِئَةٌ جمہور نے فِئَةٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے یعنی احدهما فئة۔

اور حسن اور مجاہد نے فِئَةٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے فِي فِئَتَيْنِ کا بدل ہونے کی بنا پر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی عبلہ نے دونوں میں نصب پڑھی ہے (1)۔

احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھنا جائز ہے، یعنی التقتا مختلفتين مؤمنة وكافرة۔ زجاج نے کہا ہے: نصب پڑھی گئی ہے یعنی اعنی۔ دو لوگوں کی جماعت کو فئة کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اسی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے شدت اور تکلیف کے وقت۔

اور زجاج نے کہا ہے: الفئة کا معنی جدا کرنا اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور یہ فأوت رأسه بالسيف سے ماخوذ ہے۔ (یعنی میں نے تلوار کے ساتھ اس کا سر جدا کر دیا) اور کہا جاتا ہے: فأيته۔ (یہ تب کہا) جب تو اسے پھاڑ دے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں سے اشارہ ان کی طرف ہے جو غزوہ بدر کے دن ملے تھے (2)۔ اور اس کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے۔

پس کہا گیا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مومنوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ خطاب تمام کفار کو کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور ان میں سے ہر احتمال کے مطابق قوم نے قول کیا ہے (3)۔ اور مومنین کو خطاب کا فائدہ انہیں ثابت قدم رکھنا اور انہیں تشجیع دلانا ہے یہاں تک کہ وہ دوگنا اور کئی چند تک آگے بڑھے جیسا کہ واقع ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ابو علی نے کہا ہے: اس آیت میں رؤیت سے مراد آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے (4)۔ مکی اور مہدوی نے کہا ہے: اس پر رَأْيَ الْعَيْنِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور نافع نے تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، صفحہ 407
3۔ ایضاً، صفحہ 406
4۔ ایضاً، صفحہ 407

نے یا کے ساتھ۔ مِّثْلَيْهِمْ کو تَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم سے حال ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور جمہور لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ترون کا فاعل مومنین ہیں۔ اور اس کے ساتھ ضمیر متصل کفار کے لئے ہے(1)۔

اور ابو عمرو نے اس کا انکار کیا ہے کہ اسے ترونہم تا کے ساتھ پڑھا جائے۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور اگر اس طرح ہوتا تو پھر مِثْلَيْكُمْ ہوتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ لازم نہیں آتا، لیکن یہ جائز ہے کہ وہ مثلی اصحابکم ہو۔ مکی نے کہا ہے: تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ لَكُمْ میں خطاب کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہو۔ اور ھا اور میم (ھم) مشرکین کے لئے ہو۔ اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مثليكم کاف کے ساتھ پڑھیں اور یہ خط کی مخالفت کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن یہ کہ کلام خطاب سے غیب کی طرف نکلنے پر واقع ہو جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ اور یہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ یہاں پہلے خطاب کیا پھر فرمایا: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: 39) اور غیب کی طرف رجوع کیا۔

پس مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین کے لئے ہو، یعنی اے مسلمانو! تم مشرکوں کو دو چند دیکھ رہے تھے اس تعداد سے جس پر وہ تھے اور معنوی طور پر یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکوں کو زیادہ نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے انہیں مومنین کی نگاہوں میں کم کر دیا، تو پس معنی یہ ہوگا: اے مومنین! تم مشرکوں کو تعداد میں اپنے سے دو چند دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، پس اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مسلمانوں کی نظروں سے کم کر دیا اور انہیں اپنی تعداد سے دو گنا مشرکین دکھائے تاکہ ان کے دل قوی اور مضبوط ہو جائیں اور ان میں جرأت و دلیری آ جائے۔ اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان میں سے سو افراد دو سو کافروں پر غالب آ جائیں گے۔ اور مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کر دیا تاکہ وہ ان پر حملے کی جرأت کریں اور پھر ان میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نافذ ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مِّثْلَيْهِمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہو یعنی اے مسلمانو! تم مسلمانوں کو اس تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے جس پر تم تھے۔ یعنی تم اپنے آپ کو اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا اس لئے کیا تاکہ ان کے نفوس مشرکین کے ساتھ مقابلے کے لئے قوی اور طاقتور ہو جائیں۔ پہلی تاویل اولیٰ اور اوضح ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا (الانفال: 43) (یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل)

اور یہ ارشاد: وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا (الانفال: 44) (اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے اپنے پہلو میں ایک آدمی کو کہا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: میں انہیں سو گمان کر رہا ہوں۔ پس جب ہم نے قیدیوں کو پکڑا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہزار تھے(2)۔ اور علامہ طبری نے ایک قول سے بیان کیا ہے کہ انہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظروں میں مومنین کی تعداد کو دوگنا کر دیا یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک ان سے دوگنا تھے۔ اور طبری نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی طرح کئی جہتوں سے یہ مردود ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مومنوں کی نگاہوں میں کم کر دیا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے(1)۔ اور اس تاویل کی بنا پر وَ تَرَوْنَ کافروں کے لئے ہو گا یعنی اے کافرو! تم مومنوں کو ان کی اصلی تعداد سے دوچند دیکھ رہے تھے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم انہیں اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فراء نے گمان کیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم انہیں دوگنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ تین گنا تھے۔ اور یہ بعید ہے لغت میں غیر معروف ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ باب الغلط ہے۔ اس میں غلطی تمام قیاسوں میں ہے، کیونکہ ہم کسی شے کی مثل کو اس کا مساوی سمجھتے ہیں اور ہم اس کی دو مثل اسے سمجھتے ہیں جو دو بار اس کے مساوی ہوتی ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: فراء نے اس کا قول بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: جیسا کہ تو کہتا ہے اور تیرے پاس غلام ہو کہ میں اس کی مثل کا محتاج ہوں۔ پس تو اس کا اور اس کی مثل کا محتاج ہو گا۔ اور تو یہ کہے: میں اس کی دو مثل کا محتاج ہوں تو تو تین کا محتاج ہو گا۔ اور معنی اور لغت اس کے خلاف ہے جو اس نے کہا۔

اور وہ جو فراء نے اس میں بیان کیا ہے کہ مشرکین غزوہ بدر کے دن مومنین سے تین گنا تھے۔ پس اسے یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہوں مگر ان کی اسی تعداد پر (جس پر وہ تھے) اور یہ بعید ہے اور معنی اس کے مطابق نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو اعتبارات سے ان کی تعداد دوگنی کر دکھائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اس میں ثبات اور فائدہ دیکھا، کیونکہ مومنین کے دل اس کے ساتھ قوی ہو جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامت و نشانی ہو جائے۔ اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یا کی قراءت تو ابن کیسان نے کہا ہے: یَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم (یعنی ضمیر) وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پر عائد ہے اور یہ اضمار میں سے ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

یہ اس پر دلیل ہے کہ کافر دکھائی دینے میں مسلمانوں کی دو مثل تھے حالانکہ تعداد میں وہ تین مثل تھے۔ فرمایا یہاں رؤیت یہود کے لئے ہے اور مکی نے کہا ہے: یہاں رؤیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والے گروہ کے لئے ہے اور جس کو دیکھا گیا وہ کافروں کا گروہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا گروہ کافروں کے گروہ کو مومنین کے گروہ کا دوگنا دیکھ رہا تھا حالانکہ کافروں کا گروہ مومنین سے تین گنا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نظروں میں کم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تکلم میں خطاب یہودیوں کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور طلحہ بن مصرف نے تُرَوْنَهُمْ تا ضمہ کے ساتھ اور سلمی نے تا ضمہ کے ساتھ فعل مجہول کی بنا پر پڑھا ہے(2)۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً، صفحہ 406

کیا گیا ہے" اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے (1)۔ اور اس تمثیل کا فائدہ یہ ہے کہ جنت حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تبھی جب مصائب و مکروہات کے جنگل کو کاٹ دیا جائے اور ان پر صبر کیا جائے اور جہنم سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تب جب شہوات کو چھوڑ دیا جائے اور نفس کو ان سے چھٹکارا دلا دیا جائے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: "جنت کا راستہ ٹیلوں کے سبب کٹھن اور دشوار ہے اور جہنم کا راستہ نرم ہموار زمین ہونے کے سبب سہل ہے۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی یہی ہے: حفت الجنة بالمکارہ وحفت النار بالشہوات (2) یعنی جنت کا راستہ مشکل ہے کیونکہ اس میں چلنے کے لئے کئی ٹیلوں سے اوپر چڑھنا پڑتا ہے، اور جہنم کا راستہ آسان ہے اس میں نہ کوئی ناہمواری ہے اور نہ دشوار گزاری۔ اور یہی معنی اس قول کا ہے: سہل بسہوۃ اور یہ قاف کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ النِّسَآءِ ان کی عادت اور روایت کی وجہ سے لوگوں کا کثرت سے ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا جال (پھندا) اور مردوں کے لئے فتنہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی شدید فتنہ نہیں چھوڑا (3)" اسے بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔ پس عورتوں کا فتنہ تمام اشیاء سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کہا جاتا ہے: عورتوں میں دو فتنے ہیں اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔ پس وہ دو جو عورتوں میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطع رحمی تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماؤں اور بہنوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ آدمی کو حلال و حرام مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور رہے بیٹے! تو ان میں صرف ایک فتنہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان کے لئے مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تسکنوا نساءکم الغرف ولا تعلموهن الکتاب (4) (تم اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں سکونت نہ دو اور تم انہیں لکھنا نہ سکھاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو آگاہ کیا (اور نیچے رہنے کی تلقین فرمائی۔) کیونکہ ان کے لئے بالا خانوں میں سکونت اختیار کرنے میں مردوں کی طرف دیکھنا (آسان) ہے۔ اور اس میں ان کے لئے نہ حفاظت ہے اور نہ پردہ۔ کیونکہ وہ مردوں پر جھانکتی رہیں گی جس کا نتیجہ فتنہ اور آزمائش ظاہر ہو جائے گی اور کیونکہ یہ مرد سے پیدا کی گئی ہیں لہٰذا ان کی خواہش اور قصد مرد کی جانب ہوتی ہے۔ اور مرد میں شہوت پیدا کر دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے لئے باعث راحت و تسکین بنا دیا گیا ہے۔ پس دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں اور انہیں لکھنے کی تعلیم دینے میں یہ فتنہ بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعيمها واهلها، جلد 2، صفحہ 378

2۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب حجبت النار بالشہوات، حدیث نمبر 6006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب ما یتقی من شؤم المرأة، حدیث 4705، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 380، حدیث نمبر 44996

ابن سیدہ نے المحکم میں بیان کیا ہے اور کہا ہے: لغت بربر کے مطابق ایک قنطار ہزار مثقال کا ہے اور ربیع بن انس نے کہا ہے: قنطار سے مراد مال کثیر ہے جو بعض بعض پر پڑا ہوا ہو(1)۔

اور عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے۔ اور اسی کے مطابق یہ ارشاد ہے: وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا (النساء: 20) یعنی تم نے ان میں سے کسی کو مال کثیر دیا۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: "بے شک صفوان بن امیہ زمانہ جاہلیت میں ایک قنطار کو پہنچ گیا اور اس کا باپ بھی قنطار کو پہنچ گیا"۔ یعنی اس کا مال قنطار ہو گیا۔ اور حکم سے روایت ہے: قنطار وہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ اور الْمُقَنْطَرَةِ کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس طبری وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تضعیف (دو چند کیا ہوا) گویا قناطیر سے مراد تین قنطار اور مقنطرہ سے مراد نو ہیں(2)۔ اور فراء سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: القناطیر قنطار کی جمع ہے اور المقنطرۃ الجمع الجمع ہے۔ پس وہ نو قنطار ہو جائیں گے۔ سدی نے کہا ہے: مقنطرہ سے مراد ڈھالا ہوا ہونا یا جو نقدی ہے یہاں تک کہ وہ دراہم یا دینار ہو جائے۔ مکی نے کہا ہے: یہ المقنطرۃ المکملۃ (یعنی تین کے اوپر خزانے)(3) (مکمل قنطار)۔ اور اسے ہروی نے بیان کیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بِدَرٌ مُبَدَّرَةٌ (دس ہزار کی تھیلی جو ان سے بھری ہوئی ہو) اور الوف مؤلفۃ (ہزاروں جو جمع کئے گئے ہوں)۔ اور بعض نے کہا ہے: اور اسی لئے بناء (عمارت) کو اس کی بناوٹ ایک دوسرے کے اوپر پختگی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے قنطرہ کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان اور فراء نے کہا ہے: نو قنطار سے کم مقنطرہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المقنطرۃ حضور مال اور اس کے بھاری بھر کم ہونے کی طرف اشارہ ہے(4)۔

اور سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں سے نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا اسے قانتین میں لکھا جائے گا اور جس نے ہزار آیتوں کے ساتھ قیام کیا تو اسے مقنطرین (خزانہ جمع کرنے والے) میں لکھا جائے گا(5)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ الذہب مؤنث ہے کہا جاتا ہے: ھی الذہب الحسنۃ (یہ حسین سونا ہے) اس کی جمع ذہاب اور ذہوب آتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذہبۃ کی جمع ہو۔ اور جمع اذہاب بنائی جائے۔ اور ذہب فلان مذہباً حسناً (فلاں خوب اچھی طرح گزر گیا) اور الذہب اہل یمن کا ایک پیمانہ بھی ہے۔ اور رجل ذہب جب کوئی آدمی سونے کی کان دیکھے اور حیرت زدہ ہو جائے۔ اور الفضۃ یہ معروف ہے اور اس کی جمع فضض ہے۔ پس الذہب، الذہاب سے ماخوذ ہے۔ اور الفضۃ یہ انفض الشی (شے کا متفرق ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور اسی سے فَضَضْتُ الْقَوْمَ فَانْفَضُّوا ہے۔ یعنی میں نے قوم کو تقسیم کیا تو وہ تقسیم ہو گئی۔ اور یہ اشتقاق ان دونوں کے زوال اور ان کے عدم ثبوت کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا کہ واقع میں کہا گیا ہے۔ اور اس معنی میں جو سب سے اچھا کہا گیا ہے وہ بعض کا یہ قول ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دارالکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بہترین گھوڑا وہ سیاہ رنگ کا گھوڑا ہے جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو اور اس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ بھی سفید ہو۔ (پھر وہ جس کی پیشانی اور چاروں پاؤں سفید ہوں) طلق الیمین ہو (یعنی اس کا دایاں پاؤں سفید نہ ہو) اور اگر سیاہ (ادہم) گھوڑا نہ ہو تو پھر کمیت (جس کا رنگ سیاہی مائل ہو) گھوڑا اسی وضع پر ہو (1)۔"

اسے ترمذی نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور مسند دارمی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں [میں کون سا گھوڑا خریدوں؟] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہوں اور محجل طلق الیمین ہو۔ (یعنی اس کی پیشانی اور تین پاؤں سفید ہوں) یا پھر اسی صورت پر کمیت گھوڑا خرید لے تو غنیمت پائے گا اور تو سلامت رہے گا (2)۔" اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں کے بعد گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ شے کوئی نہ تھی (3)۔ اور امام احمد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں: ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے باعث ستر (پردہ) ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے بوجھ ہوتا ہے (4)۔" یہ حدیث طویل اور مشہور ہونے کے سبب ذکر سے مستغنی ہے۔ گھوڑوں کے احکام کا ذکر سورۃ الانفال اور النحل میں آئے گا جو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: الْمُسَوَّمَةِ مراد چراگاہوں میں چرنے والے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: سامت الدابۃ والشاۃ جب گھوڑا اور بکری چرنے کے لئے جائے تسوم سوما فھی سائمۃ (5)۔ اور اسمتھا انا جب تو انہیں چرنے کے لئے چھوڑے فھی مسامۃ اور سومتھا تسویما فھی مسومۃ۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب سے پہلے جانور چرانے سے اور دودھ والے جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے (6)۔ (اس حدیث میں السوم کا لفظ چرنے کے معنی میں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فِيهِ تُسِيمُونَ (النحل) (جس میں تم (مویشی) چراتے ہو) اخطل نے کہا ہے:

مثل ابن بزعة او كآخر مثله   اولى لك ابن مسيمة الاجمال

مراد اونٹ کو چرانے والے کا بیٹا ہے اور السوام سے مراد چرنے والا جانور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ ابن زید نے یہی کہا ہے (7)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً ترمذی، باب کتاب الجہاد، حدیث 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131، حدیث نمبر 2433   3۔ سنن نسائی، کتاب الخیل والسبق والرمی، جلد 2، صفحہ 122

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السبق والرمی، جلد 10، صفحہ 15

صحیح بخاری، باب شرب الناس والدواب من الانہار، حدیث 2198، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دارالکتب العلمیہ   6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، صفحہ 160

7۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دارالکتب العلمیہ

اور اشرف ترین کاموں سے رزق طلب کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ اس لئے ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کے بارے میں ہل چلانے میں مشغول ہونے، گھوڑوں کی سواری اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ضائع کرنے کا اندیشہ لاحق ہوا، کیونکہ اگر وہ ہل چلانے میں مشغول ہو گئے تو پھر ان پر وہ امم اور گروہ غالب آجائیں گے جو گھوڑوں کی سواری ان کی کمائی — اسباب زندگی تلاش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے انہیں جہاد سے اسباب زندگی تلاش کرنے پر بھروسہ کرنے، مسلسل زمین کی آبادی اور مشقت کو لازم پکڑنے سے منع فرمایا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جوان ہو اور خوب مضبوط اور طاقتور بنو اور اونٹوں کی سواری چھوڑ دو اور گھوڑوں پر کود کر بیٹھو تم پر اونٹ نچانے والے غالب نہیں آئیں گے۔ پس آپ نے انہیں مسلسل گھوڑے رکھنے اور ان پر اچھل کر بیٹھنے کے لئے اپنے ابدان کی ورزش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا یا کوئی فصل کاشت کی اور اس سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو اس کے لئے وہ صدقہ ہوگا (1)"۔

علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور تونگر ہوتی ہے۔ پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے سبب ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لئے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ سامان جس سے دنیا میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ باقی نہیں رہتا اور اس میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور آخرت کے بارے ترغیب ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ دنیا تو سامان ہے اور سامان دنیا میں سے کوئی شے نیک اور صالح عورت سے افضل نہیں (2)"۔

اور ایک حدیث میں ہے: "تو دنیا میں زہد اختیار کر اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا (3)" یعنی دنیوی مال و سامان میں جاہ و حشمت اور ضرورت سے زائد مال کو چھوڑ دے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "سوائے ان خصائل کے ابن آدم (انسان) کا کوئی حق نہیں ہے۔ گھر جو اسے سکونت دے، کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو چھپا دے اور خشک روٹی اور پانی (4)"۔ ترمذی نے اسے مقدام بن معدیکرب کی حدیث سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312، ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 134، ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 311، ایضاً، ابن ماجہ، صفحہ 4091، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57، ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

سحری کا وقت خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بارے میں ظن غالب یہ ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ (میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا) "کیا شب آپ نے اس دعا کو سحری کے وقت تک مؤخر کر دیا (1)" اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دریافت فرمایا: "رات کے کون سے حصہ میں (دعا) زیادہ سنی جاتی ہے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سحری کے وقت عرش وجد کناں ہوتا ہے۔" کہا جاتا ہے سحر اور سحر یعنی حا کے فتحہ اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: سحر سے مراد وہ وقت ہے جب رات واپس پلٹ رہی ہوتی ہے یہاں تک کہ فجر ثانی طلوع ہو جائے اور ابن زید نے کہا ہے: سحر سے مراد رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے ائمہ حدیث نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) ہر رات جب رات کا تیسرا انتہائی حصہ گزر رہا ہوتا ہے آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون ہے وہ جو مجھ سے دعا مانگ رہا ہو کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں، کون ہے وہ جو مجھ سے سوال کر رہا ہو کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے وہ جو مجھ سے مغفرت طلب کر رہا ہو کہ میں اس کی مغفرت فرما دوں پس وہ اسی طرح ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔" اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں حتی ینفجر الصبح "یہاں تک کہ صبح پھوٹ پڑتی ہے (2)۔" یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔ اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اولیٰ اور ارجح وہ ہے جو نسائی کی کتاب میں بطور تفسیر موجود ہے۔

حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف حصہ گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے پس وہ کہتا ہے: کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے اس کی دعا قبول کی جائے گی، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے اس کی مغفرت کر دی جائے گی، کیا کوئی سائل اور حاجتمند ہے اسے عطا کیا جائے گا" اسے ابو محمد عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے (3)۔ اور یہ ارشاد اشکال کو رفع کر دیتا ہے اور ہر احتمال کو واضح کر دیتا ہے۔ اور بے شک پہلے ارشاد میں مضاف محذوف ہے یعنی عبارت اس طرح ہے ينزل مَلَكُ ربنا فيقول۔ اور ينزل یا کو ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ وباللہ توفیقنا۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی وصفاتہ العلیٰ میں کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 190۔ ایضاً ترمذی، حدیث نمبر 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، باب صلوٰۃ اللیل، صلاۃ مسافرین، جلد 1، صفحہ 258۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الدعاء فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1077، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الاحکام ...، جلد 1، صفحہ 239، دار الکتب العلمیہ بیروت

مسئلہ: استغفار کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مغفرت طلب کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے اور کئی دوسری آیات میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری کے وقت ستر مرتبہ استغفار کریں (1)۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے: جب رات کا پہلا حصہ ہوتا ہے تو ایک منادی ندا دیتا ہے: چاہیے کہ اطاعت و عبادت گزاری کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سحری تک اسی طرح نماز پڑھتے رہتے ہیں اور جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: مغفرت طلب کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ مغفرت طلب کریں۔ پس دوسرا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: خبردار! چاہیے کہ غافل لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ پس وہ اپنے بستروں سے اسی طرح اٹھتے ہیں جیسا کہ مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں اپنے گھروں کو آباد کرنے والوں کی طرف، میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کی طرف اور سحری کے وقت تہجد پڑھنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کے سبب ان سے عذاب پھیر دیتا ہوں۔ "ان اللہ یقول انی لاھم بعذاب اھل الارض فاذا نظرت الی عمار بیوتی والمتحابین فی والمتھجدین والمستغفرین بالاسحار صرفت عنھم العذاب بھم" (2)۔

حضرت مکحول نے کہا ہے: جب امت میں پندرہ افراد موجود ہوں جو ہر روز پچیس مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ عام عذاب کے ساتھ اس امت کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اسے ابو نعیم نے کتاب الحلیہ میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت نافع نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رات بھر جاگتے رہتے تھے پھر فرماتے: اے نافع! کیا سحری کا وقت ہو گیا ہے؟ میں عرض کرتا: نہیں۔ پھر آپ دوبارہ نماز پڑھنے لگ جاتے۔ پھر آپ پوچھتے، تو جب میں عرض کرتا: ہاں! سحری کا وقت ہو چکا ہے۔ تو آپ بیٹھ جاتے اور استغفار کرنے لگتے (3)۔ اور ابراہیم بن حاطب نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سحری کے وقت مسجد کے ایک کونے میں ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری اطاعت و پیروی کی، یہ سحری کا وقت ہے تو میری مغفرت فرما دے۔ یارب امرتنی فاطعتک وھذا سحر فاغفرلی۔ پس میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد حضور قلب کے ساتھ زبان سے استغفار کرنا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (5)۔ واللہ اعلم۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: اے میرے بیٹے! مرغ تجھ سے زیادہ دانا اور عقل مند نہ ہونے پائے کہ وہ تو سحری کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ
2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 501، حدیث نمبر 9051
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامۃ(1) (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جب وہ فوت ہو جائیں گے تو یوم قیامت تک سمندر میں مچھلیاں ان کے لیے مغفرت طلب کرتی رہیں گی۔) اس باب میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ غالب القطان نے بیان کیا ہے: میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا اور میں حضرت اعمش کے قریب اترا۔ اور میں ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ پس جب رات ہوئی تو میں نے بصرہ میں نزول کا ارادہ کیا وہ اٹھے اور انہوں نے رات کے وقت نماز تہجد ادا کی اور یہ آیت تلاوت کی شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ اعمش نے کہا میں اس بارے شہادت دیتا ہوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور میں یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (فقط) اسلام ہے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا۔ پس میں صبح کے وقت ان کی طرف گیا اور میں نے انہیں الوداع کہا پھر کہا: بلاشبہ میں نے تمہیں یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے بارے میں تمہیں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں ایک سال تک تمہارے پاس رہا ہوں تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: قسم بخدا! میں ایک سال تک اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بیان کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس میں اٹھا اور میں نے ان کے دروازے پر اس دن کے بارے لکھ دیا، پس جب سال گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابو محمد! سال گزر چکا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابو وائل نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یجاء بصاحبہا یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالیٰ عبدی عہد الی وانا احق من وفی ادخلوا عبدی الجنۃ(3) (اس آیت پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے نے میرے ساتھ عہد کیا ہے اور میں کسی بھی وفا کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہوں پس تم میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔)

ابو الفرج الجوزی نے کہا ہے: غالب القطان سے مراد غالب بن خطاف القطان ہے جو اعمش سے حدیث شَهِدَ اللّٰهُ روایت کرتے ہیں اور یہ حدیث معضل ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: اس کی حدیث میں ضعف ہیں اور وہ ضعیف ہے۔ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غالب بن خطاف القطان ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ابن معین نے کہا: ثقہ ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ صدوق اور صالح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تیرے لیے اس کی عدالت اور ثقاہت کے لیے یہی کافی ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی کتابوں میں اس کی حدیث نقل کی ہے اور تیرے لیے یہ کافی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 135، حدیث نمبر 28679

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157۔ ایضاً ابی داؤد، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 440

اور یہ دونوں شرع میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بولا جاتا ہے اور اس سے مراد اس کا اپنا اصل معنی
اور دوسرے کا معنی لیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس میں تصدیق اور اعمال دونوں داخل ہیں اور اسی کے مطابق
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے: الایمان معرفۃ بالقلب و قول باللسان و عمل بالارکان (ایمان سے مراد دل
سے معرفت حاصل کرنا، زبان سے قول کرنا اور ارکان کے مطابق عمل کرنا ہے)۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1)۔ اور یہ پہلے
گزر چکا ہے اور تحقیق کی جگہ اور شرعاً یہ عمل ہے اور بیان اس کے علاوہ دوسری سنت کے باب میں ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے خبر دی ہے کہ وہ
حق کے بارے علم رکھتے تھے اور یہ کہ وہ دنیا کے حشمت اور طالب تھے۔ حضرت ابن عمر وغیرہ نے یہی کہا ہے (2)
اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اور نہیں جھگڑا کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی آپس میں حسد کرتے
ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (صحیح) علم آگیا۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: اس آیت سے
مراد نصاریٰ ہیں اور یہ قرآن کے عیسائیوں کے لئے زجر ہے (3)۔ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: اس سے مراد یہود ہیں اور
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا لفظ یہود و نصاریٰ تمام کو شامل ہے (4)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب عطا کی گئی اور حضور نبی کریم ﷺ
کی نبوت کے بارے میں نہیں جھگڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس صحیح علم آگیا تھا۔ یعنی آپ ﷺ کی صفت اور نبوت کا
بیان ان کی کتابوں میں آچکا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس آیت سے مراد یہ ہے) جنہیں انجیل عطا کی گئی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے
میں جھگڑا نہیں کیا اور آپ کے بارے میں انہوں نے متفرق اقوال نہیں کئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آگیا تھا کہ اللہ
تعالیٰ یکتا اور منفرد معبود ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور بغیاً مفعول من
اجلہ ہونے کی وجہ سے یا الَّذِيْنَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (5)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

"پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ فرما دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہئے ان لوگوں سے جنہیں دی گئی کتاب اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم (بھی) اسلام لاتے ہو؟ پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو نہیں آپ کے ذمہ مگر (پیغام) پہنچا دینا (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔"

1۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، صفحہ 8، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دارالکتب العلمیہ
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے (1)"۔ اسے المہدوی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اور شعبہ نے ابو اسحاق عن ابی عبیدہ عن عبد اللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے پھر ان کے آخر میں ان کی سبزیوں کے بازار لگ گئے (2)۔ پس اگر کہنے والا کہے کہ وہ جنہیں یہ نصیحت کی گئی ہے انہوں نے کسی نبی کو تو قتل نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان کے قتل کے ساتھ راضی ہیں جنہوں نے قتل کیا ہے پس یہ بھی انہیں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے بھی حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ قتال کیا اور انہوں نے ان کے قتل کا ارادہ اور قصد کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ (الانفال: 30) (اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں۔)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے (3)"۔

اور درہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "(وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا (4)"۔ اور قرآن کریم میں ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ یَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (التوبہ: 67) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق بنا دیا ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ مومن کے اوصاف میں سے خاص ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا سرخیل اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس پر قتال کرنا ہے۔ پھر امر بالمعروف ہر ایک کے لائق اور مناسب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اسے سلطان وقت قائم کرتا ہے کیونکہ حدود کا قیام اسی کے سبب ہوتا ہے تعزیر اس کی رائے کے سپرد ہوتی ہے، قید کرنا اور چھوڑنا اسی کے حوالے ہوتا ہے اور جلا وطنی وغیرہ کے احکام اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس وہ ہر شہر میں نیک، صالح، طاقتور، عالم اور امانتدار آدمی مقرر کرے گا اور اسے ان احکام کے نفاذ کا حکم دے گا اور اس طرح پر حدود بغیر کسی زیادتی کے جاری رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو)

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 297
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 77، حدیث نمبر 5564
4۔ مسند امام احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 432

نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل السنت کے نزدیک ناہی کے لئے عادل ہونا شرط نہیں ہے بخلاف مبتدعہ کے وہ کہتے ہیں: کسی کو عادل کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ ساقط الاعتبار ہے، کیونکہ عدالت تو مخلوق میں سے قلیل لوگوں میں محصور ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے اور اگر وہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کریں: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 44) (کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو) اور قول باری تعالیٰ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے۔ (الصف) (بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو) تو انہیں کہا جائے گا: ان آیات میں وہ عمل کرنے پر مذمت بیان کی گئی ہے جس سے منع کیا گیا ہے نہ کہ یہ مذمت نہی عن المنکر کرنے پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس عمل سے منع کیا گیا ہے اسے کرنے والا اس کی نسبت زیادہ قبیح ہے جو اسے نہیں کرتا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں اسی طرح گھومتا رہے گا جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گھومتا ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل سورۃ البقرہ میں قول باری تعالیٰ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کے تحت بیان کر دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ مسلمانوں نے اس بارے میں اجماع کیا ہے جو ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ منکر کو تبدیل کرنا ہر اس پر واجب ہے جو اس پر قادر ہو اور جبکہ اس فریضہ (تغییر منکر) کی ادائیگی میں اسے ایسی ملامت اور خوف لاحق ہو جو باعث اذیت نہ ہو پھر بھی اس فریضہ کی ادائیگی اس پر واجب ہے اور اگر وہ قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے روکے اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (برا جانے) اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور جب وہ اپنے دل سے برا جانے تو پھر وہ اپنے لازم عائد ہونے والی ذمہ داری ادا کرے جب وہ اس کے سوا کچھ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ بیان فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں بہت زیادہ احادیث مروی ہیں لیکن وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مقید ہیں۔ حسن نے کہا ہے: بلاشبہ مومن کو امید کے لیے اور جاہل کو تعلیم کے لیے کلام کی جاتی ہے۔ پس وہ جس نے اپنی تلوار یا کوڑا رکھ دیا اور پھر کہا: اِتَّقِنِيْ اِتَّقِنِيْ (مجھ سے بچ اور ڈر) تو اس میں تیرے لئے کچھ (خطرہ) ہے اور نہ اس کے لئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے آدمی کے بارے میں جو منکر (برائی) کو دیکھے اور اسے تبدیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ اعتراف کرے کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے (1)۔ ابن لہیعہ نے اعرج سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔" صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کا اپنے آپ کو ذلیل کرنا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ ایسی بلا اور مصیبت سے تعرض کرتا ہے جس کے لئے وہ استطاعت نہیں رکھتا (2)"۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسے علی بن زید بن جدعان عن الحسن بن جندب عن حذیفہ عن النبی

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 2، صفحہ 28، حدیث نمبر 2178

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 298، ... حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ﷺ کی سند سے بیان کیا ہے (1)۔ اور ان دونوں میں کلام ہے۔ اور بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: آدمی جب کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تین بار یہ کہے اللّٰھم ان ھذا منکر (اے اللہ! بلاشبہ یہ منکر (برائی) ہے) پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اس نے وہ کر دیا جو اس پر (لازم) تھا۔

ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ جسے برائی کے زوال کی امید ہو اور اس کی تبدیلی سے اسے اپنی ذات پر ضرب یا قتل کا خوف ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس خطرہ کے وقت اس کا اس مشقت میں پڑنا جائز ہے اور اگر برائی کے زوال کی امید نہ ہو تو پھر ان کے نزدیک کون سا فائدہ ہے۔ فرمایا: قسم بخدا! میرے نزدیک جب نیت خالص ہے تو اسے چاہیے وہ اس مشقت میں پڑ جائے کیفیت جو بھی ہو اور کسی کی پرواہ نہ کرے (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو ابو عمر نے اجماع کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت قتل کا خوف ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (لقمان: 17) (نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔) اور یہ اشارہ اذیت پہنچانے کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنی زبان سے روک دے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے (3)''۔ علماء نے کہا ہے: ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف امراء (حکام وقت) پر لازم ہے اور زبان کے ساتھ امر بالمعروف علماء کے ذمہ ہے اور دل کے ساتھ ضعفاء یعنی عوام الناس پر لازم ہے۔ پس روکنے کے لئے برائی کا ازالہ کرنا جب زبان کے ساتھ ممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے۔ اور اگر اس کے لئے سزا یا قتال کے بغیر ازالہ ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ بھی کرے۔ اور اگر برائی قتال کے بغیر زائل ہو جائے تو پھر قتال جائز نہیں اور یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے: فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (الحجرات: 9) (تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف)

اور اسی پر علماء نے اس کی بنیاد رکھی ہے کہ جب کوئی کسی کی ذات پر یا مال پر حملہ آور ہو اپنی ذات سے یا اپنے مال سے یا کسی اور کی ذات سے دور ہٹائے تو اس کا تو حق ہے لیکن اس پر کوئی شے (بطور تاوان) لازم نہیں۔ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ اس نے بکر کا مال (اتلاف یا ضائع کرنے کا) قصد کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے اسے روکے جبکہ مال کا مالک اس پر قادر نہ ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 266

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 51۔ ایضاً ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حدیث نمبر 4002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نبوت کا انکار کر دیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: "تم میرے پاس تورات لے آؤ اس میں میری صفات موجود ہیں۔" تو انہوں نے انکار کر دیا (1)۔ جمہور نے لِیَحْکُمَ پڑھا ہے اور ابو جعفر یزید بن القعقاع نے لِیُحْکَمَ یا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور پہلی قرأت احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: 29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جس کو دعوت دی جائے اس کا حاکم کے پاس پیش ہونا واجب ہے کیونکہ اسے کتاب اللہ کی طرف دعوت دی گئی ہے، پس اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو وہ مخالف ہو گیا اور مخالفت اور مخالف کی قدر و منزلت کے مطابق اس پر ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کرنا متعین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکم ہمارے پاس اندلس اور دار عرب میں جاری ہے لیکن دیار مصر میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ وہ حکم ہے جسے ہم نے سورۃ النور میں پوری تفصیل کے ساتھ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (النور) (اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں روگردانی کرنے لگتی ہے ... (بلکہ درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں)

اور زہری نے حسن سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے اس کے خصم نے مسلمان حکام میں سے کسی حاکم کے پاس بلایا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظالم ہو اور اس کا کوئی حق نہ ہو (3)"۔ ابن عربی نے کہا ہے: "یہ حدیث باطل ہے اور رہا آپ کا یہ قول فَهُوَ ظَالِمٌ تو یہ کلام صحیح ہے اور جہاں تک فلا حق لہ کا تعلق ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو انہ علی غیر الحق (کہ وہ غیر حق پر ہو) ابن خویز منداد مالکی نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جسے حاکم کی مجلس کی طرف بلایا جائے اس پر واجب ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ حاکم فاسق ہے یا اسے مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان عداوت کا علم ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے بھی شریعت ہیں سوائے اس حکم کے جس کے منسوخ ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اور یہ کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے اس کا بیان آگے آرہا ہے۔ اور یہ کہ تورات نہ ہم پڑھیں گے اور نہ جو کچھ اس میں ہے اس پر ہم عمل کریں گے، کیونکہ وہ جن کے قبضہ میں ہے وہ اس پر امین نہیں ہیں اور انہوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور اگر ہم جان لیں کہ اس میں کوئی شئے ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ہمارے لئے اس کی قرأت جائز ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت کعب کو فرمایا: "اگر تو جان لے کہ یہ وہی تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران پر

1۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416-415، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

3۔ سنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب آداب القاضی، جلد 10، صفحہ 140

اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور اپنی امت کے ساتھ ملک فارس اور روم کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہودیوں نے کہا: یہ بعید از امکان ہے! ملک فارس اور روم کہاں محمد (ﷺ) کے پاس آسکتے ہیں! وہ ان سے کہیں زیادہ عزت والے اور طاقتور ہیں۔ کیا محمد (ﷺ) کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کافی نہیں ہوا کہ یہ ملک فارس اور روم کا طمع کر رہے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے اس قول میں باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی: "بے شک عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں" اور وہ اس طرح کہ یہ اوصاف ہر صحیح الفطرت آدمی کے لئے یہ واضح اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کوئی شے نہیں رکھتے (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے عناد اور ان کے کفر کے بارے آگاہ کیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات اور معجزات عطا فرمائے ہیں جو ان کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ لیکن اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں منفرد اور یکتا ہے۔ ارشاد گرامی ہے: تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ اور یہ فرمایا: تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۖ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۖ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ تب اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام الٰہ ہوتے تو یہ اختیار ان کے پاس بھی ہوتا۔ پس اس میں بڑی عبرت ہے اور یہی واضح نشانی ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلِ اللّٰهُمَّ علمائے نحو نے لفظ اللّٰهُمَّ کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں ہا مضموم ہے اور میم مفتوح مشدد ہے اور یہ منادیٰ ہے (3) اور اعشیٰ کے قول میں میم مخفف بھی مذکور ہے۔

کحلفة من ابی رباح یسمعها اللھم الکبار

جیسے کہ ابو رباح کی دعا سے انتہائی عظمت و شان والا معبود حقیقی سن رہا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور تمام بصریوں نے کہا ہے: اللھم کی اصل یا اللہ ہے پس جب کلمہ کو حرف ندا یا کے بغیر استعمال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بدل میم مشددہ کو بنا دیا پس وہ دو حروف لائے اور وہ دو میمیں ہیں، دو حرفوں کے عوض اور وہ دونوں یا اور الف ہیں۔ اور ہا پر ضمہ یہ اسم منادیٰ مفرد کا ضمہ ہے۔ اور الفراء اور علمائے کوفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللھم میں اصل یا اللہ امنا بخیر ہے۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا اور دونوں کلموں کو ملا دیا گیا اور ہا پر ضمہ یہ وہی ضمہ ہے جو امنا میں تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو حرکت منتقل ہو گئی (4)۔

نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی خطا ہے اور اس میں قول وہی ہے جو امام خلیل اور سیبویہ نے کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ محال ہے کہ وہ ضمہ چھوڑ دیا جائے جو منادیٰ مفرد پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ لفظ اللہ میں امّ کا ضمہ رکھا جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اسم میں الحاد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ زجاج کی طرف سے انتہائی غلو اور زیادتی ہے (5)۔ اور انہوں نے

1۔ اسباب النزول للواحدی، صفحہ 63
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے کبھی کبھی یا اللہ اُمّنا بخیر کہا۔ اور تب ہی عرب یہ کہتے ہیں: یا اللّٰھم۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ کبھی کبھی حرف ندا اللّٰھم پر داخل ہو جاتا ہے اور اس پر انہوں نے راجز کا یہ قول بیان کیا ہے: غفرت او عذبت یا اللّٰھما (اے اللہ! تو بخش دے یا تو عذاب دے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وما عليكِ أن تقولي كلّما سبّحتِ أو هلّلتِ يا اللّهمّ ما

تجھ پر لازم نہیں کہ جب بھی تو سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ کہے تو کہے یا اللّٰھم ما (اے اللہ!)

اُرْدُدْ علينا شيخنا مسلّما فإنّنا من خيره لن نُعدَما (1)

تو ہم پر ہمارے شیخ کو صحیح سالم لوٹا دے پس ہمیں ان کی خیر و برکت سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔

کسی اور نے کہا:

إنّي إذا ما حدثٌ ألمّا أقول يا اللّهمّ يا اللّهمّا

بلاشبہ جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو میں کہتا ہوں اے اللہ! اے اللہ!

انہوں نے کہا ہے: اگر میم حرف ندا کا عوض ہوتی تو یہ دونوں اکٹھے نہ ہوتے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ شاذ ہے اور اس کا قائل معروف نہیں اور اسے چھوڑا نہیں جا سکتا ہے جو کتاب اللہ میں ہے (2) اور یہ تمام دیوان العرب میں ہے اور اسی کی مثل اس قول میں بھی وارد ہے۔

هما نفثا في فيّ من فمويهما على النابح العاوي أشدّ رجام

کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ فم اور ابنم میں میم مخفف کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میم مشدد کا اضافہ نہیں کیا جاتا (3)۔ اور بعض نحویوں نے کہا ہے جو کچھ کوفیوں نے کہا ہے وہ خطا اور غلطی ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے کہا ہے تو پھر یہ کہنا واجب اور ضروری ہے: اللّٰھم اور اسی پر اقتصار نہ کیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ دعا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کہتے ہیں: انت اللّٰھم الرزاق۔ پس اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے تو تو نے مبتدا اور خبر کے درمیان دو جملوں کے ساتھ فاصلہ کر دیا۔ نضر بن شمیل نے کہا ہے: جس نے اللّٰھم کہا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے تمام اسماء کے ساتھ پکارا۔ اور حسن نے کہا ہے: اللّٰھم دعا کو جامع ہوتا ہے (4)۔

قولہ تعالیٰ: مٰلِکَ الْمُلْکِ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل سے عرض کی کہ وہ آپ کی امت کو ملک فارس عطا فرما دے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ملک فارس اور روم آپ کی امت کو عطا فرما دے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 445

تعظیم وثنا کی وجہ سے ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور مٰلِکَ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہے اس بنا پر کہ یہ ندا ثانی ہے، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ اسے اللّٰهُمَّ کی صفت بنایا جائے کیونکہ اس کے ساتھ میم ملی ہوئی ہے۔ اور محمد بن یزید اور ابراہیم بن سری الزجاج نے ان سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: مٰلِکَ ترکیب میں اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی طرح فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ میں ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہی ابوالعباس المبرد کا مذہب ہے اور جو سیبویہ نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اسماء موصوفہ میں اللّٰهُمَّ کی طرح کوئی شے نہیں ہے کیونکہ یہ اسم مفرد ہے اور اس کے ساتھ (اسم) صوت کو ملایا گیا ہے اور اصوات کی صفت نہیں لگائی جاتی جیسا غاق اور اس کے مشابہ الفاظ۔ اور اسم مفرد کا حکم یہ ہے کہ اس کی صفت نہ لگائی جائے اگرچہ علماء (نحو) نے کئی مقامات پر اس کی صفت لگائی ہے۔ اور جب یہاں وہ اسم ملا دیا گیا جس کی صفت نہیں لگائی جاتی تو پھر تو اس کی یہ ہے کہ صفت نہ لگائی جائے کیونکہ یہ صوت کے ساتھ ملنے کے سبب صوت کی طرح ہو گیا ہے۔ جیسا کہ حَیَّهَلْ تو اس کی صفت نہیں لگائی گئی (1)۔ اور الْمُلْكَ یہاں مراد نبوت ہے (2)۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد غلبہ ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ مراد مال اور غلام وغیرہ ہیں (3)۔ زجاج نے کہا ہے: معنی ہے (اے) بندوں کے مالک اور اس (شے) کے مالک جس کے وہ مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی ہے اے دنیا اور آخرت کے مالک (4)۔ اور تُؤْتِی الْمُلْكَ کا معنی ہے: تو ایمان اور اسلام عطا کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ یعنی جسے تو چاہتا ہے کہ تو اسے وہ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح اس کا مابعد بھی ہے۔ اور اس میں محذوف (کلام) مقدر ماننا ضروری ہے۔ یعنی وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ اَنْ تَنْزِعَهُ مِنْهُ، پھر اسے حذف کر دیا گیا۔

اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

ألا هل لهذا الدهر من متعلل   على الناس مهما شاء بالناس يفعل

زجاج نے کہا ہے: (اس میں اصل عبارت اس طرح ہے۔) مهما شاء ان يفعل بالناس يفعل (جب وہ لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا چاہے تو وہ کر دیتا ہے۔) اور قول باری تعالیٰ: وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ کہا جاتا ہے: عزّ کا معنی ہے جب وہ بلند ہو اور غالب ہو۔ اور اسی سے ہے وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ (وہ خطاب میں مجھ پر غالب آ گیا۔) وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ذل يذل ذلا (جب وہ غالب آئے اور مسلط ہو جائے۔)

طرفہ نے کہا ہے:

بطيء عن الجلى سريع إلى الخنا   ذليل بأجماع الرجال ملهد

بِیَدِكَ الْخَیْرُ یعنی تیرے ہی قبضہ میں ہے خیر اور شر اور اسے (یعنی شر کو) حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ   2۔ معانی القرآن للنحاس، جلد 2، صفحہ 8   3۔ ایضاً   4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے: مومن جب کفار کے درمیان موجود ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ انہیں زبان کے ساتھ دھوکہ دیتا رہے جب اسے اپنی ذات پر خوف ہے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ اور تقیہ حلال نہیں ہوتا مگر تب جب قتل کا خوف ہو یا اعضائے بدن کٹنے کا خوف ہو یا احتمال شدید اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اور جسے کفر پر مجبور کیا گیا تو اس کے لئے صحیح یہ ہے کہ وہ سولی چڑھ جائے اور کفریہ کلمات زبان پر نہ لائے (یعنی اس پر کلمہ کفر کہنا واجب نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ۔ حمزہ اور کسائی نے تقاۃ میں امالہ کیا ہے(1) اور باقیوں نے اسے پر پڑھا ہے۔ اور تقاۃ اصل میں وقیۃ بروزن فعلۃ ہے جیسا کہ تؤدۃ اور تہمۃ ہیں پھر واؤ کو تا سے اور یا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بدری اور متقی صحابی تھے اور ان کا یہود کے ساتھ معاہدہ تھا۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ غزوۂ احزاب کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ ﷺ! بلاشبہ میرے ساتھ یہود کے پانچ سو آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ نکلیں تو ہم ان کے سبب دشمن پر غالب آسکیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ الآیہ۔(2)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے وہ بعض گفتگو کی جس کا مشرکین نے ان سے ارادہ کیا، اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ زجاج نے کہا ہے: ای و یحذرکم اللہ ایاہ اور اللہ تعالیٰ تمہیں ڈراتا ہے پھر تم اس سے (یعنی اپنے آپ سے) اس کے سبب (یعنی تقیہ کے سبب) مستغنی ہو گئے اور وہ مستقل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک پس اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے اور جو میری حقیقت ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے اور وہ جو تیری حقیقت ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی سزا سے ڈراتا ہے۔ (ہذا) یہ ازباب التقریبی کی مثل ہے اور فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ تو میری غیب اور مخفی بات کو جانتا ہے۔ اور النفس کو ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ انفرادی نفس میں ہی ہوتا ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ای والی جزاء اللہ المصیر اور اللہ تعالیٰ کی جزا کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے کا اقرار ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کرو اسے جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 419، دار الکتب العلمیہ
2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 86
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 420، دار الکتب العلمیہ

نہیں وہ سینوں میں مخفی اور چھپی چیزوں کو اور ان تمام کو جن پر وہ مشتمل ہیں جاننے والا ہے اور ان تمام کے بارے جاننے والا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور انہیں جاننے والا ہے جنہیں یہ گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ علام الغیوب ہے اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شے غائب ہے اس کی ذات پاک ہے لا الہ الا ہو عالم الغیب والشہادۃ۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُۥٓ أَمَدًۢا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ ٱللَّهُ نَفْسَهُۥ ۗ وَٱللَّهُ رَءُوفٌۢ بِٱلْعِبَادِ ۝

"جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔"

یَوْمَ منصوب ہے اور اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ۔ یَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ یَوْمَ تَجِدُ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منقطع ہو (یعنی مذکورہ ارشادات میں سے کسی کے ساتھ بھی متصل نہ ہو) اس بنا پر کہ اس سے پہلے اذکر فعل مضمر ہو۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: ان اللہ عزیز ذو انتقام۔ یوم تبدل الارض۔

اور مُّحْضَرًا، ما کے صلہ میں ضمیر محذوف سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یوم تجد کل نفس ما عملتہ من خیر محضرا اور یہ اس بنا پر ہے کہ تجد، وجدان الضالۃ (گمشدہ کو پانا) سے ماخوذ ہو۔ اور وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوٓءٍ میں ما پہلے ما پر معطوف ہو۔ اور تَوَدُّ دوسرے ما سے حال ہونے کے محل میں ہے۔ اور اگر تجد کو بمعنی تعلم بنایا جائے تو پھر مُحْضَرًا مفعول ثانی ہے۔ اور اسی طرح تَوَدُّ بھی دوسرے مفعول کے محل میں ہوگا۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی یوم تجد کل نفس جزاء ما عملت محضرا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ اور تَوَدُّ بھی مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ما بمعنی جزا ہو۔ کیونکہ تَوَدُّ مرفوع ہے۔ اور اگر یہ ماضی ہوتا تو اس کا جزا ہونا جائز ہوتا۔ اور کلام کا معنی اس طرح ہوتا: وما عملت من سوء ودت لو ان بینها و بینه امدا بعیدا (اور جو کچھ برائی اس نے کی تھی وہ تمنا کرتا ہے کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان مدت دراز حائل ہو جاتی) یعنی جیسا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بعد ہے۔ اور جب ما کو شرطیہ بنایا جائے تو فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے مگر یہ کہ تو اسے حذف فا پر محمول کرے۔ اور تقدیر کلام یہ ہو: و ما عملت من سوء فهی تود۔ ابو علی نے کہا ہے: میرے نزدیک فراء کے قول کا یہی قیاس ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ میں کہا ہے کہ یہ حذف فا کی بنا پر ہے۔ اور الامد کا معنی غایت (انتہا) ہے اور اس کی جمع آماد ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استولی علی الامد۔ یعنی غالب سابقہ اور سبقت لیتے ہوئے غالب آ گیا۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

نحن الذين نحب ربنا (1) ہم وہ ہیں جو اپنے رب سے محبت کرتے ہیں۔

اور روایت ہے کہ مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، واللہ انا لنحب ربنا قسم بخدا! ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (2) ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک محبۃ کا معنی ہے ارادۃ الشیء علی قصد لہ کسی شے کا قصد کرتے ہوئے اس کا ارادہ کرنا۔ اور ازہری نے کہا ہے: بندے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کا معنی اس کا ان دونوں کی اطاعت کرنا اور ان کے حکم کی اتباع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت کا معنی اس کا ان پر مغفرت اور بخشش کے ساتھ انعام فرمانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ یعنی وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن کی محبت ہے اور قرآن کریم کی محبت کی علامت حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرآن کی محبت اور حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور سنت کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرے اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے بغض رکھے اور دنیا سے بغض کی علامت یہ ہے کہ وہ اس سے صرف زاد راہ اور گزارے کی مقدار حاصل کرے۔

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا: "(کہ تم میری اتباع کرو) نیکی، تقویٰ، تواضع اور ذلت النفس میں" اسے ابو عبداللہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے (3)۔ اور حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: من اراد ان یحبہ اللہ فعلیہ بصدق الحدیث واداء الامانۃ وان لا یؤذی جارہ۔

جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ سچی بات کرے، امانت ادا کرے اور یہ کہ وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرمانے لگتا ہے تو وہ جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر (4)۔ پس حضرت جبریل امین بھی اس سے محبت فرمانے لگتے ہیں، پھر وہ آسمان میں ندا دیتا ہے اور کہتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تم بھی اس سے محبت کرو تو پھر اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ فرمایا: پھر اسے زمین میں قبول عام عطا فرما دیا جاتا ہے اور جب وہ کسی بندے کو مبغوض جانتا ہے تو جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پس تو بھی اسے ناپسند کر، پھر جبریل امین علیہ السلام بھی اسے ناپسند کرتے ہیں پھر

1۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66

2۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 272

3۔ نوادر الاصول فی معرفۃ احادیث الرسول، مکتبہ ... صفحہ 199

4۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر 2970، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ ہے کہ آپ کو کشتی پر اٹھایا اور پانچویں یہ کہ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے احکام شریعہ کو منسوخ کیا۔ آپ سے پہلے خالاؤں اور پھوپھیوں سے شادی کرنا حرام نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پانچ چیزوں کے ساتھ چنا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو الانبیاء بنایا۔ کیونکہ یہ روایت ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک آپ کی صلب سے ایک ہزار نبی تشریف لائے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا، تیسری یہ کہ آپ کو نمرود سے نجات عطا فرمائی (اور اسے آپ کے لیے گلزار بنا دیا) اور چوتھی یہ کہ آپ کو لوگوں کا امام بنایا اور پانچویں یہ کہ آپ کو چند کلمات کے ساتھ آزمایا اور آپ کو توفیق عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ نے انہیں مکمل فرما لیا۔ (یعنی آپ تمام آزمائشوں میں کامیاب وکامران ہوئے) اور جو رہا قول وَآلَ عِمْرَانَ اگر عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو عالمین پر چن لیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم پر من وسلویٰ نازل فرمایا اور عالم میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک کے لیے بھی ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر عمران حضرت مریم علیہا السلام کے باپ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مریم کو چن لیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے جنم دیا اور عالم میں کسی کے لیے بھی ایسا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

"یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ذُرِّيَّةً کا معنی اور اس کا مادہ اشتقاق سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ ای فی حال کون بعضھم من بعض یعنی اس حال میں کہ وہ بعض بعض سے ہیں، ای ذریۃ بعضھا من ولد بعض یعنی ایک نسل ہے درآنحالیکہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ کوفیوں نے کہا ہے: یہ قطع پر بھی ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ بدل ہے ای اصطفٰی ذریۃ بعضھا من بعض (یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا ایک نسل کو جن میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں) اور بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ کا معنی ہے یعنی دین میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں (باہم معاون ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یعنی ضلالت وگمراہی میں (وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں) حسن اور قتادہ نے بھی کہا ہے (1) اور بعض نے کہا ہے: وہ چنا ہوا اصطفاء اور نبوت میں ایک دوسرے کا بعض ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے اور یہ (معنی) سب سے مشہور ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 10

"جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے سو قبول فرمالے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا، (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا اسے (تو حیرت و حسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ ابو عبیدہ نے کہا ہے: اِذْ زائدہ ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے اذکر اذ۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے واصطفیٰ آل عمران اذ قالت امراۃ عمران۔ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو چن لیا جب عمران کی بیوی نے عرض کی۔ اور وہ حنہ بنت فاقوذ بن قبیل حضرت مریم علیہا السلام کی ماں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی تھی۔ یہ عربی نام نہیں ہے اور نہ ہی عربی میں کسی عورت کا نام حنہ معروف ہے۔ عربی میں ابو حنہ البدری ہے۔ اور اس میں کہا جاتا ہے کہ یہ ابو حبہ ہے اور یہی اصح ہے اور اس کا نام عامر ہے۔ اور دیر حنہ کی خانقاہ شام میں ہے اور ایک دوسری بھی ہے جسے بھی دیر حنہ کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابو نواس نے کہا ہے:

یا دیر حنة من ذات الاکیراح ... من یصح عنک فانی لست بالصاحی

اس میں یا دیر حنہ سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اور عرب میں حبہ تو کثیر ہیں، ان میں سے ایک ابو حبہ الانصاری ہیں اور ابو السنابل بن بعکک جو کہ حدیث سبیعہ میں مذکور ہیں (1)۔ وہ بھی حبہ ہیں اور خنہ نون کے ساتھ تو کوئی معروف نہیں سوائے حنہ بنت یحییٰ بن اکثم القاضی کے اور یہ محمد بن نصر کی ماں ہے اور جنہ تو کوئی معروف نہیں سوائے ابو جنہ کے اور یہ ذی الرمہ شاعر کا ماموں ہے۔ یہ سب ابن ماکولا کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا نذر کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہ (نذر) ان پر لازم نہیں ہوتی مگر اسی طرح جس طرح کہ بندہ خود اسے اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ جب حاملہ ہوئیں تو انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نجات عطا فرمائی اور میں نے اسے جنا جو میرے پیٹ میں ہے تو میں اسے (سب کاموں سے) آزاد کر دوں گی۔ اور لک کا معنی ہے لعبادتک یعنی تیری عبادت کے لئے اور محررا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی انی نذرت لک ما فی بطنی غلاما محررا اور تفسیر، سیاق کلام اور اعراب (ترکیب) کے اعتبار سے پہلا مفہوم زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ جہاں تک ترکیب کا تعلق ہے تو نعت کا منعوت کے قائم

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من شهد بدرا، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پس حضرت مریم اور ان کا بیٹا اگرچہ دونوں شیطان کے چوکے سے بچا لیے گئے ہیں لیکن ان دونوں کو اس کی ملازمت اور مقارنت سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝

"پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنا دیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لیے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔ وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔"

قولہ تعالیٰ: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ اس کا معنی ہے: اسے سعداء کے راستے پر چلایا۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: تقبل کا معنی ہے تربیت میں تکفل بننا اور اس کے معاملات کو ادا کرنا۔ اور حسن نے کہا ہے تَقَبُّل کا معنی ہے کہ اس کے رب نے اسے رات دن میں سے کبھی ایک ساعت بھی اذیت اور تکلیف نہیں دی۔ اور وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا سے مراد ہے اس کی خلقت کو بغیر کسی کمی و بیشی کے صحیح بنایا، پس وہ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا عام بچہ سال میں نشوونما پاتا ہے۔ قبول اور نبات دونوں مصدر ہیں لیکن اپنے فعل کے ہم وزن مصدر نہیں۔ فی الحقیقت مصدر تقبلا اور انباتا ہیں۔

شاعر نے کہا:

أكفرا بعد رد الموت عني ... و بعد عطائك المائة الرتاعا

شاعر کی مراد بعد اعطائک ہے۔ لیکن جب کہا انبتها تو یہ نبت پر دلیل ہے (انبات نبت کو متلزم ہے)

اسی طرح امرؤ القیس نے کہا ہے۔

فصرنا الى الحسنى ورق كلامنا ... و رضت فذلت صعبة اى اذلال

یہاں پر ذلت کا مصدر ذل ہے۔ لیکن اس نے اسے اذللت کے معنی پر لوٹا دیا ہے۔ اور اسی طرح ہر اس کا حال ہے جو اس باب میں آتا ہے۔ پس تقبل اور قبل کا معنی ایک ہے۔ یہی معنی ہوا فقبلها ربها بقبول حسن کہ اس کے رب نے اسے اچھی

طرح قبول کر لیا۔

اور اسی کی مثل رؤبہ کا قول ہے۔

وقد تقبلت امعاؤه العصب

اس میں تقبلت اور قبلت کا معنی ایک ہے۔

اور اسی کی مثل القطامی کا قول ہے:

وخير الامر ما استقبلت منه ... وليس بان تتبعه اتباعا

کیونکہ تتبعت اور تبعت دونوں ہم معنی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وَ اَنْزَلَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَنْزِيْلًا کیونکہ نزل اور انزل کا معنی ایک ہے۔ اور مفضل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے۔ وانبتها فنبتت نباتا حسنا۔ (اس کے رب نے اسے پروان چڑھایا اور وہ خوب اچھی طرح پروان چڑھی۔) اور معنی کی رعایت کرنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور قبول میں اصل ضمہ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ دخول اور خروج ہے اور فتحہ کلمی حروف میں آیا ہے جیسا کہ ولوع اور وزوع۔ یہ کلمات ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ابو عمرو، کسائی اور ائمہ نے یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے "قبول" کو اصل کی بنا پر قاف کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ ملا دیا (سپرد کر دیا)۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ اس کی دیکھ بھال کے ضامن بن گئے۔ کوفیوں نے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وكفلها ربها زكريا، یعنی اس کی کفالت ان کے ذمہ لازم کر دی۔ اور اس پر انہیں مقرر کر دیا اور اسے ان کے لئے آسان بنا دیا۔

اور مصحف ابی میں ہے واكفلها متعدی میں ہمزہ تشدید کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس سے پہلے فَتَقَبَّلَهَا اور اَنْۢبَتَهَا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں خبر دی اس کے بارے جو اس کے ساتھ کیا۔ پس اسی وجہ سے كفلها تشدید کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقیوں نے فعل کی نسبت حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف کرنے کی بنا پر اسے مخفف پڑھا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس کی کفالت اور اس کے معاملات کے والی اور نگران بن گئے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (ان میں سے کون مریم کی نگرانی کرے گا؟) مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ تشدید بھی تخفیف کی طرف ہی لوٹتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ضامن اور نگران بنے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے کفیل بنے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کے ساتھ ہی بنے۔ پس اس بنا پر دونوں قراءتیں باہم متداخل ہیں۔

عمرو بن موسیٰ نے عبداللہ بن کثیر اور ابو عبداللہ المزنی سے وَكَفِلَهَا فا کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے كَفَلَ يَكْفُلُ اور كَفِلَ يَكْفَلُ (یعنی یہ دونوں باب ہیں) اور میں نے كَفُلَ نہیں سنا حالانکہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

پانے والی کا حجرہ پر رکھی اور آپ اس پر دروازہ بند کر جاتے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی اس تک پہنچ یا داخل نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔ پس جب وہ حائضہ ہوئی تو آپ اسے اپنے گھر کی طرف نکال کر لے گئے اور وہ اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی اور کلبی کے قول کے مطابق اس کی خالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی۔ مقاتل نے کہا ہے: اس کی بہن حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ تھی۔ اور جب وہ حیض سے پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر لیا تو آپ اسے محراب کی طرف لوٹا دیے۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے حیض نہ آتا تھا اور وہ اس سے پاک رہتی تھی۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے پاس آتے تو آپ اس کے پاس موسم سرما کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل موسم سرما میں پاتے تھے تو آپ نے فرمایا: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں۔ تو اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کی خواہش کی اور کہا: بے شک وہ جو اس کے پاس پھل لاتا ہے وہ مجھے بچہ عطا کرنے پر بھی قادر ہے اور انّی کا معنی ہے من این کہاں سے۔ ابو عبیدہ نے یہی کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہاں میں تساہل ہے کیونکہ این جگہ اور مکان کے بارے سوال کے لئے آتا ہے اور انّی مذاہب اور جہات کے بارے سوال کے لئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کون سے مذاہب اور کون سی جہات سے تیرے لئے یہ ہیں۔ کمیت نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے:

أنّى و من أين آبك الطرب　　من حيث لا صبوة ولا ريب

اس میں انّی جہات اور این مکان کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور عِنْدَهَا کے سبب منصوب ہے یعنی کل وَجَدَ (ہر بار داخل ہوتے وقت) اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝ کہا گیا ہے: یہ مریم کے قول میں سے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور یہی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا اور بچے کی التجا کا سبب بن گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِیَّا رَبَّهٗ۔ هُنَالِكَ محل نصب میں واقع ہے، کیونکہ یہ ظرف ہے اور یہ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ در اصل یہ ظرف مکان ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: هُنَالِكَ ظرف زمان کے لئے ہے اور هناك ظرف مکان کے لئے آتا ہے اور کبھی اسے اس کی جگہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اور هَبْ لِیْ کا معنی ہے مجھے عطا فرما مِنْ لَّدُنْكَ اپنی بارگاہ سے ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً صالح اور نیک نسل (بچہ) ذُرِّیَّةٌ واحد اور جمع اور مذکر اور مونث تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں واحد کے لئے ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا دلالت کرتا ہے کیونکہ یہاں اولیاء نہیں فرمایا۔ اور طَیِّبَةً کو مونث لایا گیا ہے کیونکہ لفظ ذُرِّیَّةٌ مونث ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول:

أبوك خليفة ولدته أخرى　　وأنت خليفة ذاك الكمال

اس میں لفظ خلیفہ کے مونث ہونے کی وجہ سے ولدتہ کو مونث لایا گیا ہے

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اي رجل مات وترك ذرية طيبة أجرى

فانه له مثل اجرهم ولم ينقص من اجورهم شيئا (جو کوئی آدمی فوت ہوا اور اس نے نیک اور صالح اولاد پیچھے چھوڑی تو اللہ تعالیٰ اسے ان کے اعمال کے اجر کی مثل اجر عطا فرمائے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی شی کم نہ ہوگی۔) سورۃ البقرہ میں لفظ ذُرِّيَّةً کا مادہ اشتقاق گزر چکا ہے۔ اور طَيِّبَةً کا معنی ہے صالح، نیک اور بابرکت۔ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ بلاشبہ تو ہی دعا کو قبول فرمانے والا ہے اور اسی سے سمع اللہ لمن حمدہ لائی گئی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بچے کی طلب اور خواہش کرنے پر دلیل ہے اور یہ مرسلین اور صدیقین کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً (الرعد: 38) (اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد)

اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تجرد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرما دیا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اس کی اجازت عطا فرما دیتے تو ہم خصی ہو جاتے اور ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت ہے، جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور تم شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا اور جو کوئی قدرت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کر لے اور جو (قدرت) نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ یہی اس کے لئے وجاء (شہوت نکاح کو کاٹنے کا ذریعہ) ہے۔(1)

اور اس میں ان بعض جاہل متصوفہ کا رد ہے جنہوں نے کہا ہے: جو بچے کی خواہش اور طلب رکھتا ہے وہ احمق ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کند ذہن اور بے وقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿﴾ (الشعراء) (اور بنا دے میرے لئے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں)

اور مزید فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (الفرقان: 74) (اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور امام بخاری نے تو اس عنوان سے باب باندھا ہے باب طلب الولد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دن فرمایا جس وقت ان کا بیٹا فوت ہوا: ''کیا تم نے آج رات مباشرت کی ہے؟'' انہوں نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: بارك الله لكما في غابر ليلتكما (اللہ تعالیٰ تمہاری گزشتہ رات کے بارے میں تم دونوں کو برکت عطا فرمائے) فرمایا: پس وہ حاملہ ہو گئی(2)۔ اور بخاری میں ہے: سفیان نے بیان کیا ہے انصار میں سے ایک آدمی نے کہا ہے: میں نے نو بچے پائے ہیں ان تمام نے قرآن کریم پڑھا ہے(3) اور یہ بھی عنوان ہے باب الدعاء بكثرة الولد مع البركة (برکت کے ساتھ اولاد کی کثرت کی دعا کا بیان) اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ام سلیم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا خادم انس

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر 1835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب العقیقہ، حدیث 5048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ صحیح بخاری، باب من لم یظہر حزنہ عند المصیبۃ، حدیث 1210، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بچا ہی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیما اعطیتہ (اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں کثرت عطا فرما اور جو تو نے عطا فرمایا ہے اس میں اس کے لئے برکت عطا فرما)۔(1)

اور حضور ﷺ نے فرمایا: "اے اللہ! ابو سلمہ کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اسے اچھا خلیفہ (نائب) عطا فرما"۔ اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا: "تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی (عورت) سے شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا(2)"۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس معنی میں بہت سی روایات ہیں جو بچے کی طلب پر ابھارتی ہیں اور اس طرف متوجہ کرتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد اس کے نفع اور فوائد کا امیدوار رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اذا مات احدکم انقطع عملہ الا من ثلاث جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہوجاتے ہیں سوائے تین کے۔ اس میں ذکر فرمایا: او ولد صالح یدعو لہ یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔ اگر اس حدیث کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا تو اس میں یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس جب یہ ثابت ہوگیا تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے بچے اور اپنی بیوی کی ہدایت کے لئے تضرع اور التجا کرتا رہے کہ وہ دونوں کو بہت اچھی، پاکدامنی اور ہدایت کی توفیق عطا فرمائے اور یہ کہ وہ دونوں دین اور دنیا میں اس کے معاون و مددگار رہیں یہاں تک کہ دونوں کے سبب اس کی منفعت اور فوائد دنیا اور آخرت میں عظیم ہوجائیں۔ کیا آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے قول میں غور نہیں کرتے وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (مریم) اور عرض کی ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اور کہا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی اور کہا: اللھم اکثر مالہ وولدہ وبارک لہ فیہ اسے بخاری(3) اور مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٣٩﴾

"پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین سے۔"

قولہ تعالیٰ: فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ حمزہ اور کسائی نے فناداہ مذکر ہونے کی بنا پر الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں اس میں امالہ کرتے ہیں کیونکہ یہ (الف) اصل میں یا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چوتھی جگہ ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود

1۔ صحیح بخاری، باب من دعا لصاحبہ بطول العمر وبکثرۃ مالہ، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء، حدیث نمبر 1754، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من زار قوما فلم یفطر عندھم، حدیث نمبر 1848، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یونس کی قرأت الف کے ساتھ ہی ہے اور یہی ابو عبید کی پسند ہے۔

اور جریر نے مغیرہ کے واسطے سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ ؓ پورے قرآن میں ملائکہ کو مذکر قرار دیتے ہیں۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم انہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے اسے مشرکین کے خلاف اختیار کیا ہے کیونکہ مشرکین نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

نحاس نے کہا ہے: یہ ایسا استدلال ہے جس سے کوئی شے حاصل نہیں کی جا سکتی کیونکہ عرب کہتے ہیں: قالت الرجال اور قال الرجال اور اسی طرح النساء کے ساتھ بھی کرتے ہیں (یعنی مذکر و مونث دونوں طرح استعمال کر لیتے ہیں۔) اور ان پر قرآن کریم سے استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے کہ ان کے خلاف قرآن کریم سے اس طرح حجت لائی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کریں: وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ الخ ان کے خلاف اس ارشاد میں حجت ہے: أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ یعنی انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا، پس وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ تحقیق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ظن اور محض خواہش ہے۔ رہا فَنَادَاهُ تو یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر جائز ہے اور فَنَادَتْهُ جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: الملائکة ذوی العقول میں سے جمع تکسیر ہے اور یہ تانیث میں قائم مقام غیر ذوی العقول کے ہے۔ آپ کہتے ہیں: ھی الرجال، وھی الجذوع، وھی الجمال، وقالت الاعراب۔ اور اس سے یہ ارشاد اور تقویت دیتا ہے۔ وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ اور دوسری جگہ مذکور ہے: وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ پس اس جمع کو مذکر و مونث دونوں طرح لایا گیا ہے اور سدی نے کہا ہے: اکیلے حضرت جبرائیل امین نے انہیں ندا دی۔ (فناداه جبرائيل وحده) اور اسی طرح حضرت ابن مسعود ؓ کی قرأت میں ہے اور قرآن کریم میں ہے: يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور روح سے مراد وحی ہے۔ اور عربی میں یہ جائز ہے کہ واحد کے بارے جمع کے لفظ کے ساتھ خبر دی جائے اور قرآن کریم میں آیا ہے: الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ۔ الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے جیسا کہ آگے آئے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں تمام ملائکہ نے ندا دی اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی ندا ان کی جانب سے آئی۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ اس میں وَهُوَ قَائِمٌ مبتدا اور خبر ہے۔ اور يُصَلِّي محل رفع میں ہے اور اگر چاہے تو ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں رکھ لے۔ أَنَّ اللَّهَ اصل میں بان اللہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنّ پڑھا ہے یعنی قالت ان اللہ۔ پس ندا بمعنی قول ہے۔ يُبَشِّرُكَ تشدید کے ساتھ اہل مدینہ کی قرأت ہے۔ اور حمزہ نے يَبْشُرُكَ مخفف پڑھا ہے۔ اسی طرح حمید بن قیس مکی نے کہا ہے مگر یہ کہ انہوں نے شین کو کسرہ یا ضمہ اور با کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ تینوں لغات ایک معنی میں ہیں۔

پہلی کی دلیل اور یہ ایک جماعت کی قرأت ہے کہ اس مادہ سے جو بھی فعل ماضی یا امر کا صیغہ قرآن کریم میں ہے وہ مثقل

اور قرآن کریم میں ہے: وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا "اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے" اور الحصیر سے مراد ملک ہے کیونکہ اسے روک لیا جاتا ہے۔

اور لبید نے کہا ہے:

وقماقم غلب الرقاب كأنهم　　　جن لدى باب الحصير قيام

اس میں باب الحصیر سے مراد ملک ہے۔

پس حضرت یحییٰ علیہ السلام حصور تھے یہ وزن فعول بمعنی مفعول ہے یعنی آپ عورتوں کے ساتھ مباشرت نہ کر سکتے تھے۔ گویا کہ انہیں اس سے روک لیا گیا جو کچھ مردوں میں ہوتا ہے۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور فعول بمعنی مفعول لغت میں کثیر الاستعمال ہے۔ اسی سے حلوب بمعنی محلوبہ ہے۔

شاعر نے کہا:

فيها اثنتان وأربعون حلوبة　　　سودا كخافية الغراب الأسحم

اس میں حلوبہ سے استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، قتادہ، عطا، ابو الشعثاء، حسن، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے: (حصورا) اس سے مراد وہ ہے جو عورتوں سے باز رہتا ہے اور قدرت کے باوجود وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ اور دو اعتبار سے یہی صحیح قول ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ ان کی مدح اور تعریف ہے اور بلاشبہ تعریف اکثر فعل کسب کے سبب ہوتی ہے نہ کہ فطری اور طبعی فعل پر۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فعول لغت میں فاعل کے صیغوں میں سے ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

ضروب بنصل السيف سوق سمانها　　　إذا عدموا زادا فإنك عاقر

اس میں بھی استشہاد لفظ ضروب سے ہے۔

پس معنی یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ اور شاید یہ ان کی شریعت میں تھا اور رہی ہماری شریعت تو اس میں نکاح ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حصور سے مراد وہ عنین ہے جس کا ذکر نہ ہو کہ وہ اس کے سبب وطی کر سکتا ہو اور نہ اسے انزال ہوتا ہو۔ یہ حضرت ابن عباس سے بھی، حضرت سعید ابن مسیب اور ضحاک نے کہا ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "ہر انسان اللہ تعالیٰ سے گناہ کے ساتھ ملاقات کرے گا درآنحالیکہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ اس کے سبب اسے عذاب دے گا یا پھر رحم فرمائے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے، کیونکہ وہ وَ سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ تھے۔ پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک زمین کے ایک تنکے کی طرف نیچے کیا اور اسے اٹھا لیا اور فرمایا: "ان کا ذکر اس تنکے کی مثل تھا" اور قول

نے باب الاشارۃ فی الطلاق والامور کے عنوان سے ان کا قصد کیا ہے۔(1)

اور حضرت عطاء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ سے تین دن کے روزے کا قصد کیا ہے اور وہ جب روزہ رکھتے تھے تو وہ صرف اشارے سے ہی گفتگو کرتے تھے۔ اور یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض ان افراد نے کہا ہے جو سنت کے ساتھ قرآن کریم کا نسخ جائز قرار دیتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کلام کرنے سے روک دیا گیا حالانکہ وہ اس پر قادر تھے اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لا صمت یوما الی اللیل (کسی دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں) اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں (2)۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کسی آفت کے سبب کلام سے روک دیا گیا جو انہیں لاحق ہوئی اور اس نے انہیں کلام سے روک دیا اور وہ آفت صحت کے باوجود کلام پر قادر نہ ہونا ہے۔ اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث طیبہ لا صمت یوما الی اللیل کا معنی یہ ہے کہ پورا دن رات تک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی (جائز) نہیں ہے اور رہی فضول اور بے فائدہ گفتگو تو اس سے تو خاموشی اچھی اور بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی زبان بند ہونے کے باوجود اپنے دل میں ذکر کو نہ چھوڑے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ذکر کا معنی گزر چکا ہے۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر کسی کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو وہ یقیناً حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب دی جاتی اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اس آدمی کو دی جاتی جو دوسرے آدمیوں کے ساتھ میدان جہاد میں ہوتا ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

وَسَبِّحْ یعنی صل ہے، یعنی تو نماز پڑھ۔ اس میں صلوٰۃ (نماز) کو سُبْحَة کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی برائی اور نقص سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہ بیان کی جاتی ہے۔ اور العشی، عشیۃ کی جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واحد ہے اور اس سے مراد سورج کے زوال پذیر ہونے کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے۔ یہ حضرت مجاہد سے منقول ہے۔ اور موطا میں قاسم بن محمد سے منقول ہے: میں نے لوگوں کو نہیں پایا مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز عشی کے وقت ادا کرتے تھے اور الابکار سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا وقت ہے۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۝

”اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور چن لیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے۔“

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب الاشارۃ فی الطلاق، حدیث 4883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء متی ینقطع الیتم، حدیث نمبر 2485، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت فاطمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما ہیں"۔

پس قرآن و احادیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہے حضرت بی بی حوا علیہا السلام سے لے کر اس آخری عورت تک جس پر قیامت قائم ہوگی (سب سے افضل ہے) کیونکہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تکلیف، اخبار، اور بشارت کے بارے میں وحی ان تک اسی طرح پہنچائی ہے جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام تک پہنچائی، پس اس طرح یہ نبیہ تھیں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے پس یہ تمام عورتوں سے افضل ہیں مطلقاً اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں پھر ان کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور پھر ان کے بعد آسیہ رضی اللہ عنہا۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سارے جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہے" یہ حدیث حسن ہے اشکال کو دور کر رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو عورتوں میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا اور وہ یہ کہ روح القدس ان سے ہم کلام ہوئے اور ان کے قریب ہوئے اور عورتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور جب انہیں بشارت دی گئی تو کسی نشانی کا مطالبہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نشانی کا مطالبہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مقدس میں صدیقہ کا نام دیا ہے اور فرمایا: وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ اور فرمایا: وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدیقہ ہونے کی شہادت دی اور ان کے لئے کلمات بشارت کی تصدیق کرنے کی شہادت دی اور ان کے لئے عجز و انکساری اور اطاعت شعاری کی شہادت دی۔ اور بلاشبہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کی طرف دیکھا اور کہا: کیونکر میرے لئے بچہ ہو سکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہو چکی ہے سو نشانی طلب کی اور حضرت مریم کو بچے کی بشارت دی گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ وہ باکرہ ہے اور اسے کسی بشر (انسان) نے مس نہیں کیا تو اسے کہا گیا: كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے۔

پس انہوں نے اسی پر اختصار کیا اور اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کر دی اور کوئی ایسی علامت اور نشانی طلب نہ کی جس سے اس امر کی حقیقت کو جانا جا سکتا ہو۔ بنات آدم میں سے سارے جہان کی عورتوں میں کسی عورت کے لئے اس قسم کے مناقب نہیں ہیں۔ اسی لئے یہ روایت ہے کہ وہ جنت کی طرف رسل علیہم السلام کے ساتھ چلے جانے والوں میں جا ملیں گی۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "اگر میں قسم کھاؤں کہ میری امت کے سابقین سے پہلے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے ان سے کچھ زائد افراد کے ان میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام ہیں تو میں یقیناً اپنی قسم میں سچا ہوں۔"

تحقیق اس پر یہ فرض اور لازم ہو جاتا ہے جس پر ظاہری علم کھلا اور اس نے اشیاء ظاہرہ سے اشیاء باطنہ پر استدلال کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو جان لے (1): انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔) لواء الحمد یوم القیامۃ بیدی و مفاتیح الکرم بیدی و انا اول خطیب و اول شفیع و اول مبشر و اول و اول (قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور کرم کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں پہلا خطیب ہوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میں سب سے پہلے بشارت دینے والا ہوں گا اور میں (فلاں میں) اول ہوں گا اور (فلاں میں) اول ہوں گا)(2) اور رسل علیہم السلام کو دنیا میں یہ سرداری حاصل نہیں ہوئی مگر باطن میں کسی امر عظیم کے سبب (انہیں یہ مقام ملا) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی شان ہے کہ انہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صدیقہ اور کلمات کی تصدیق کرنے کی شہادت نصیب نہیں ہوئی مگر ایسے مرتبہ کے سبب جو انتہائی قرب عطا کرنے والا ہے۔

اور جنہوں نے یہ کہا کہ وہ نبیہ نہیں انہوں نے کہا ہے: ان کا فرشتے کو دیکھنا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو دحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا گیا جس وقت انہوں نے اسلام اور ایمان کے بارے سوال کئے تھے اور اس رؤیت کے باوجود صحابہ کرام انبیاء نہیں ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے اور اکثر اسی موقف پر ہیں۔ واللہ اعلم۔

یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِیْ وَ ارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ۝

"اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہو اپنے رب کی اور سجدہ کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔"

مراد یہ ہے کہ اے مریم! نماز میں قیام طویل کر۔ یہ مجاہد سے منقول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تو اطاعت و عبادت پر دوام اختیار کر۔ قنوت کے بارے تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: جب ملائکہ نے انہیں یہ کہا تو وہ نماز میں کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ ان کے قدم ورم آلود ہو گئے۔ اور ان سے خون اور پیپ بہنے لگی۔ وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ یہاں رکوع پر سجود کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور اس بارے میں اختلاف سورۃ البقرہ میں اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ۔ پس جب تو کہے: قام زید و عمرو تو یہ مراد لینا جائز ہے کہ عمرو زید سے پہلے کھڑا ہوا ہو۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا: وارکعی واسجدی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ کہا گیا ہے اس کا معنی ہے افعلی کفعلهم تو ان کی طرح کا عمل کر اگرچہ تو ان کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز باجماعت ہے۔ یہ بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ۝

"یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر الشفاعہ، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاس جب بے شک رہے تھے وہ (بطور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ یعنی یہ جو حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے واقعات ہم نے ذکر کئے ہیں یہ اخبار غیب میں سے ہیں۔ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت پر دلیل ہے اس حیثیت سے کہ آپ نے حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کے واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ ﷺ نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا؛ آپ ﷺ نے اسے بیان فرمایا اور اہل کتاب نے اس بارے آپ کی تصدیق کی۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ میں ضمیر کو ذٰلِكَ کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اس کی یاد دلائی گئی ہے اور الایحاء یہاں نبی ﷺ کی طرف کچھ بھیجنے کے معنی میں ہے۔ اور وحی الہام، اشارہ اور کئی دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے۔ اور لغت میں اس کی اصل خفیہ کسی شے سے آگاہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے الہام کو بھی وحی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے ہے وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اور قول باری تعالیٰ: وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اور کہا گیا ہے: اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ کا معنی ہے "میں نے انہیں حکم دیا"۔ کہا جاتا ہے: وحی، اوحی، رمی اور ارمی یہ ہم معنی ہیں۔ عجاج نے کہا ہے: اوحی لھا القرار فاستقرت یعنی اس نے زمین کو قرار پکڑنے کا حکم دیا پس وہ قرار پذیر ہو گئی۔

اور حدیث میں ہے: الوحی الوحی مراد انتہائی سرعت اور تیزی ہے اور اس سے فعل توحیت توحیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: الوحی کا معنی اشارہ، کتابت اور رسالۃ (پیغام) ہے۔ اور ہر وہ شے جسے تو کسی غیر کی طرف القاء کرے یہاں تک کہ وہ اسے جان لے وہی وحی ہے وہ جیسے بھی ہو۔ اور الوحی کا معنی السریع ہے۔ اور الوحی کا معنی الصوت آواز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استوحیناهم یعنی ہم نے ان کی مدد طلب کی۔

کسی نے کہا:

اوحیت میمونا لھا والازراق

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ یعنی اے محمد ﷺ! آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ۔ اقلام، قلم کی جمع ہے۔ یہ قلمه سے ہے اس کا معنی ہے: فلاں نے اسے کاٹ دیا۔ کہا گیا ہے: قداحهم وسهامهم یعنی مراد ان کے تیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی وہ قلمیں مراد ہیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے اور یہی معنی اجود ہے کیونکہ ازلام (جوئے کے تیر) سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ذٰلِكُمْ فِسْقٌ۔

مگر وہ ان کی اجازت دیتا ہے اس طور پر کہ وہ انہیں اس طرز پر استعمال نہ کریں جس طرح دور جاہلیت میں کرتے تھے۔

اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ یعنی کون مریم کی پرورش اور تربیت کرے گا؟ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ اور ان کے نکاح میں اشیع بنت فاقود تھی جو کہ مریم کی ماں حنہ بنت فاقود کی بہن

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ جب کسی آزردہ کو پھونک مارتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا تو اسی وجہ سے آپ کا نام مسیح پڑ گیا۔ اس بنا پر یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ آپ کو برکت کا تیل لگایا گیا تھا، انبیاء علیہم السلام کو جو تیل لگایا جاتا ہے وہ انتہائی خوشبودار ہوتا ہے، پس جب وہ لگایا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے چونکہ ان کے دونوں (پاؤں کے) تلووں کو مس کیا گیا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: "کیونکہ حسن و جمال نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ ان پر ظاہر اور عیاں تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ اور ابو الہیثم نے کہا ہے: مسیح، مسیخ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے مسحہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی حسین اور مبارک پیدا فرمایا اور مسخہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی ملعون اور قبیح پیدا کیا۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: المسیح الصدیق یعنی مسیح کا معنی صدیق ہے۔ اور مسیح کا معنی ممسوح (کانا) ہے۔ اور دجال کو یہی نام دیا گیا ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: مسیح دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اصل میں مشیح یعنی شین کے ساتھ ہے وہ پھر اسے عربی کی طرف منتقل کیا گیا ہے جیسا کہ موشی کو عربی میں موسیٰ بنا دیا گیا ہے اور رہا دجال تو اس کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ایک آنکھ مسح کر دی گئی ہے اور دجال کے لئے جیسے جو میم کے کسرہ اور سین کی شد کے ساتھ کہا گیا ہے اور بعض اسی طرح خا نقطے والی کے ساتھ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مسیخ یعنی میم مفتوح ہے خا نقطے والی ہے اور سین مخفف ہے۔ پہلا زیادہ مشہور ہے اور اکثر کا قول اسی کے مطابق ہے۔ اور اس کا وہ نام اس لئے ہے کیونکہ وہ زمین میں گھومتا پھرتا رہے گا اور سوائے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس کے تمام شہروں میں داخل ہوگا اور یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ پس دجال زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے چکر لگائے گا، گھومے گا اور ابن مریم علیہ السلام بخشش و عطا کے لئے سیاحت کریں گے۔ اور اس بنا پر کہ اس کی ایک آنکھ بند کر دی گئی ہے فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔

اور شاعر نے کہا:

إن المسیح یقتل المسیخا

بے شک مسیح علیہ السلام مسیخ (دجال) کو قتل کر دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سوا کوئی شہر نہیں ہے مگر دجال اس میں داخل ہوگا (1)"۔ الحدیث۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے "سوائے کعبہ اور بیت المقدس کے"۔ اسے ابو جعفر طبری نے ذکر کیا ہے اور ابو جعفر طحاوی نے "مسجد طور" کا اضافہ ذکر کیا ہے اور اسے انہوں نے جنادہ بن ابی امیہ عن بعض اصحاب النبی ﷺ عن النبی ﷺ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث بیان کی ہے "کہ وہ ساری زمین پر غالب آ جائے گا سوائے حرم پاک اور بیت المقدس کے اور وہ مومنین کو بیت المقدس میں محصور کر دے

1۔ صحیح بخاری، باب لا یدخل الدجال المدینة، حدیث نمبر 1748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گیا" اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: "پس ہمارے درمیان وہ اسی طرح ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق سے سفید منارہ کے پاس نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو اس سے چاندی کے جیسے گریں گے جو اپنی ہیئت و شکل میں موتیوں کی مثل ہوں گے۔ پس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگا کہ وہ آپ کی سانس کی بو کو پائے مگر وہ مر جائے گا۔ اور آپ کی سانس کی انتہا وہاں تک ہوگی جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی پس آپ اسے تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد (لد فلسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے) کے پاس پائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ الحدیث۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے کسی سے مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے، اس بنا پر عیسیٰ المسیح سے بدل کل ہوگا۔ اور عیسیٰ بھی اسم ہے اسی وجہ سے وہ غیر منصرف ہے۔ اور اگر آپ اسے عربی قرار دیں تو پھر اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے معرفہ یا نکرہ ہونے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث موجود ہے (اور یہ قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ مشتق ہوگا عاسہ یعوسہ سے یعنی جب کوئی کسی کے لئے تدبیر اور انتظام کرے اور اس پر ثابت ہو جائے اور قائم رہے۔

وَجِيهًا کا معنی ہے شریف، صاحب قدر و منزلت اور یہ لفظ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقربین میں سے ہوگا۔ یہ وَجِيهًا پر معطوف ہے یعنی معنی مقربا۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور وجیہ کی جمع وُجہاء اور وِجاہ آتی ہے۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ اس کا عطف بھی وَجِيهًا پر کیا گیا ہے۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور الْمَهْدِ سے مراد بچے کی خواب گاہ اور اس کا بچھونا ہے۔ اور مَهَّدْتُ الْاَمْرَ کہا جاتا ہے جب تو اسے تیار کرے اور ہموار کر دے۔ اور قرآن کریم میں ہے: فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (الروم) (تو وہ اپنے لئے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں) اور امتهد السنام کا معنی ہے کسی شے کا اس طرح بلند ہونا جس طرح اونٹ کی کوہان بلند ہوتی ہے۔ وَكَهْلًا الکہل سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جو بچپن اور شیخوخیت کے درمیان ہوتا ہے (یعنی پکی عمر) اور امرأة کہلة پکی عمر کی عورت۔ اور اکتہلت الروضة جب باغ میں کلیاں عام ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ آپ پنگھوڑے میں لوگوں سے بطور معجزہ اور علامت کے گفتگو کرتے تھے اور پکی عمر میں وحی اور رسالت کے سبب گفتگو کرتے تھے۔

ابو العباس نے کہا ہے: آپ نے پنگھوڑے میں لوگوں سے اس وقت گفتگو کی جب آپ نے اپنی ماں کی برأت کا اظہار فرمایا اور کہا: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ الآیہ۔ اور رہی حالت کہولت کی گفتگو تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو آسمان سے نازل فرمانے کا ارادہ وقت آپ کو تینتیس برس کی عمر والی حالت پر نازل فرمائے گا اور یہی کہولت کی حالت ہے تو آپ انہیں فرمائیں گے: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ جیسا کہ آپ نے پنگھوڑے میں کہا تھا۔ پس یہ دونوں معجزے اور دلائل ہیں۔

مہدوی نے کہا ہے: آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرما دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ان سے گفتگو کریں گے اور کہولت کی حالت میں ان سے گفتگو کرنے تک وہ زندہ رہیں گے، جبکہ عادت یہ ہے کہ جس کسی نے گہوارے میں گفتگو کی وہ زندہ نہیں رہا۔

زجاج نے کہا ہے: وَ كَهْلًا بمعنی ویکلم الناس کہلا ہے۔ اور فراء اور اخفش نے کہا ہے: یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے۔ اور کہا گیا ہے اس کا معنی ہے اور وہ لوگوں سے عمر پختگی اور کہولت کی عمر میں گفتگو کریں گے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ الکھل کا معنی حلیم اور بردبار ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: لغت میں یہ معنی معروف نہیں۔ اہل لغت کے نزدیک الکھل سے مراد چالیس سال کے قریب کی عمر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: سولہ برس تک کی عمر کو حدث (لڑکپن) کہا جاتا ہے۔ پھر تیس سال تک جوانی ہوتی ہے۔ اور پھر تیسویں سال میں کہولت شروع ہو جاتی ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ اس کا عطف وَجِيْهًا پر کیا گیا ہے یعنی و ھو من العباد الصالحین۔ (اور وہ نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔) ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ادریس نے حصین سے اور انہوں نے ہلال بن یساف سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: گہوارے میں تین کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، صاحب یوسف اور صاحب جریج۔ اسی طرح کہا اور صاحب یوسف۔

اور یہی صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''گہوارے میں سوائے تین کے کسی نے کلام نہیں کی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور صاحب جریج اور صاحب الجبار اور یہاں دوران ہوا جب بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔'' اور انہوں نے طویل حدیث بیان کی۔ اور حضرت صہیب کی حدیث میں اصحاب اخدود کے واقعہ میں یہ بھی آیا ہے: ''کہ ایک عورت کو لایا گیا تاکہ اسے ایمان لانے کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک (شیر خوار) بچہ بھی تھا۔'' اور مسلم کے علاوہ میں ہے: ''وہ شیر خوار تھا تو عورت آگ میں کودنے سے ذرا خوفزدہ ہوئی تو اس بچے نے کہا یا امہ اصبری فانک علی الحق اے میری ماں! تو صبر کر (یعنی آگ میں ڈالے جانے سے خوفزدہ نہ ہو) کیونکہ تو حق پر ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: گہوارے میں چھ نے کلام کی ہے۔ شاہد یوسف، فرعون کی بیوی کی ماشطہ کا بچہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ، صاحب جریج اور صاحب جبار اور انہوں نے اخدود کا ذکر نہیں کیا اور انہوں نے صاحب الاخدود کو ساقط کر دیا ہے اور اس حیثیت کلام کرنے والے سات ہو جائیں گے۔ اس کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے: ''کہ گہوارے میں تین کے سوا کسی نے کلام نہیں کی'' آپ نے کلام حصر کے ساتھ فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے خبر دی جن کا علم آپ کو اس وقت بذریعہ وحی عطا فرمایا گیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے چاہا آپ کو آگاہ فرمایا اور آپ نے اس کے بارے خبر دی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا صاحب یوسف تو اس کے بارے کلام آگے آئے گا۔ اور صاحب جریج، صاحب الجبار اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، جلد 1، حدیث 3178، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صاحب الاخدود کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ اور عنقریب اصحاب اخدود کا قصہ "سورۃ البروج" میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جہاں تک فرعون کی بیوی کی ماشطہ کے بچے کا ذکر ہے تو اسے علامہ بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب مجھے سفر معراج پر لے جایا گیا تو میں نے انتہائی طیب اور اچھی خوشبو میں سے پائی تو میں نے کہا: یہ خوشبو کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا: فرعون کی بیٹی کی ماشطہ اور اس کی اولاد کی۔ اس کی کنگھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی تو اس نے کہا: بسم اللہ (اللہ تعالیٰ کے نام سے) تو اس پر فرعون کی بیٹی نے کہا: کیا وہ میرا باپ ہے؟ اس نے جواب دیا: ربی و ربك و رب ابيك (اس کے نام سے جو) میرا رب ہے اور تیرا رب ہے اور تیرے باپ کا بھی رب ہے۔ اس نے کہا: کیا میرے باپ کے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے۔ اس نے کہا

نہیں فرعون نے اسے بلایا اور کہا: کیا تیرا میرے سوا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں میرا اور تیرا رب اللہ ہے

اس نے کہا پھر اس نے تانبے کے ٹکڑے پگھلانے کا حکم دیا پس اسے گرم کیا گیا پھر اس نے اسے اس میں پھینک دینے کا حکم دیا تو ماشطہ نے کہا: مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری اور میرے بچے کی ہڈیوں کو ایک ہی جگہ میں جمع کر دینا۔ اس نے کہا: یہ تیرے لئے اس حق کے عوض میں ہے جو تیرے لئے ہم پر لازم ہے۔ پس اس نے ان کے بارے حکم دیا تو انہیں ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا یہاں تک کہ وہاں میں شیرخوار بچے تک جا پہنچا تو اس نے کہا: اے ماں! تو کود جا اور میں تاخیر نہ کر کیونکہ ہم حق پر ہیں۔ راوی نے کہا چار بچوں نے صغر سنی میں گفتگو کی۔

ایک یہ بچہ ہے، دوسرا شاہد یوسف، تیسرا صاحب جریج اور چوتھا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝

"مریم بولیں اے میرے پروردگار! کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ؟ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے۔ فرمایا بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ رَبِّ مریم بولیں اے میرے سردار۔ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کو خطاب کر رہی ہیں، کیونکہ جب وہ ان کے پاس انسانی شکل میں آئے اور اسے کہا: بلاشبہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ وہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند بچہ عطا فرمائے تو جب مریم نے ان کا یہ قول سنا تو آپ نے ان سے بچے کے طریقے کے بارے پوچھا اور کہا: میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا؟ یعنی نکاح کے ساتھ (سورۃ مریم میں ہے) وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ (مریم) (اور نہ میں بدچلن ہوں)

انہوں نے یہ بطور تاکید ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کا یہ قول لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ (مجھے کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا) حرام اور حلال دونوں طریقوں کو شامل ہے۔ آپ کہتی ہیں: وہ عادت جاریہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جاری کر رکھی ہے وہ یہ ہے

کہ بچہ پیدا ہوتا ہے نکاح سے یا زنا سے۔ اور کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بھی بعید نہیں سمجھا لیکن ارادہ یہ کیا کہ یہ بچہ کیسے ہوگا؟ کیا مستقبل میں خاوند کی جانب سے یا ابتداءً ہی اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرمائے گا؟ اور روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جس وقت مریم کو کہا: كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (بات یونہی ہے اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے) قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (اس نے کہا اسی طرح ہے تیرے رب نے فرمایا ہے وہ مجھ پر آسان ہے)

انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان اور ان کی آستین میں پھونک ماری۔ ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اپنی انگلی کے ساتھ ان کی قمیص کی آستین کو پکڑا اور وہ اسی ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اس کا بیان سورۃ مریم میں آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے: جبریل امین کی پھونک مریم کے رحم پر پڑی تھی وہ اس کے سبب حاملہ ہو گئی۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ تخلیق حضرت جبریل امین علیہ السلام کی پھونک سے ہو کیونکہ اس طرح جزوی طور پر بچہ ملائکہ میں سے ہو جائے گا اور اس کا بعض انسانوں میں سے ہوگا لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور ان کی اولاد سے عہد و پیمان لیا تو کچھ پانی باپوں کی صلبوں میں رکھ دیا اور کچھ ماؤں کی رحموں میں، پس جب یہ دونوں پانی جمع ہوں تو بچہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی اکٹھے مریم میں رکھ دیئے کچھ ان کی رحم میں اور کچھ ان کی صلب میں، پس جبریل امین نے اس میں پھونک ماری تاکہ ان کی شہوت بھڑک جائے، کیونکہ عورت کی شہوت میں جب تک ہیجان پیدا نہ ہو وہ حاملہ نہیں ہوتی، پس جب حضرت جبریل امین کی پھونک سے ان کی شہوت میں انگیخت پیدا ہوئی تو وہ پانی جو ان کی صلب میں تھا وہ رحم میں آ گرا اور اس طرح دونوں پانی آپس میں مل گئے تو اس طرح استقرار حمل ہو گیا۔ پس اسی کے بارے ارشاد باری تعالیٰ: اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا یعنی جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے کُن تو ہو جا۔ تو وہ شے ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾

"اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل۔ اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف (وہ انہیں آ کر کہے گا کہ) میں آ گیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان

صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو اور

(لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو

کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے

تمہارے لئے اگر تم ایماندار ہو۔"

قولہ تعالیٰ: وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ابن جریج نے کہا ہے: الکتاب سے مراد کتابت کرنا اور لکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات اور انجیل کے علاوہ کوئی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائی۔

وَ رَسُوْلًا (یعنی) اور ہم اسے رسول بنائیں گے یا وہ ان سے رسول کی حیثیت سے ہمکلام ہوگا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے اور اخفش نے کہا ہے: اگر چاہے تو وَ نُعَلِّمُهُ میں واؤ کو مقحم بنا دے اور رسولاً کو ضمیر سے حال بنا دے تو تقدیر کلام ہوگی ویعلمہ الکتاب رسولا (اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب سکھائے گا اس حال میں کہ وہ رسول ہوگا) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے "انبیاء بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں" اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ یعنی میں تمہارے لئے تصویر اور شکل بنا دیتا ہوں۔ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ اعرج اور ابو جعفر نے کہیۃ شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ۔

اور الطیر مذکر و مؤنث دونوں ہو سکتا ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ اور ان میں سے ایک میں پھونک مارتا ہوں یا پیکر میں پھونکتا ہوں تو وہ پرندہ اڑنے والا ہو جائے گا۔ اور طائر اور طیر بیتاجر اور تجر کی مثل ہیں۔

وہب نے کہا ہے: وہ اڑتا رہا جب تک لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے اور جب وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گیا تو مردہ ہو کر گر پڑا تا کہ مخلوق کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل سے ممتاز ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے چمگادڑ کے سوا کوئی شے نہ بنائی کیونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ کامل ترین پرندہ ہے تاکہ وہ قدرت میں انتہا کو پہنچ جائے، کیونکہ اس کے پستان بھی ہیں، دانت بھی اور کان بھی ہیں اور اسے حیض بھی آتا ہے، وہ پاک بھی ہوتا ہے اور بچے بھی جنتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ خلقت میں تمام سے عجیب تر ہے اور اس کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اس میں گوشت بھی ہے اور خون بھی، وہ بغیر پروں کے اڑتا ہے اور حیوانوں کی طرح بچوں کو جنم دیتا ہے اور وہ اس طرح انڈے نہیں دیتا جس طرح باقی تمام پرندے انڈے دیتے ہیں، اس کی چھاتی ہوتی ہے اور اس سے دودھ نکلتا ہے، وہ نہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں۔ بلکہ وہ صرف دو ساعتوں میں دیکھ سکتا ہے، ایک ساعت سورج غروب ہونے کے بعد اور ایک ساعت طلوع فجر کے بعد اس سے پہلے کہ وہ خوب روشن ہو۔ اور وہ اس طرح ہنستا ہے جس طرح آدمی ہنستا ہے اور اسے اسی طرح حیض آتا ہے جس طرح عورت کو حیض آتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک ان کا آپ سے اس بارے میں سوال کرنا تعنت اور سرکشی کی بنا پر تھا تو انہوں نے کہا: ہمارے لئے

چمگادڑ بناؤ اور اس میں روح ڈال دو اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں، پس آپ نے مٹی لی اور اس سے چمگادڑ بنایا پھر اس میں پھونک ماری تو وہ زمین و آسمان کے درمیان اڑنے لگا۔ اس میں مٹی اور پھونک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے، جس طرح کہ پھونک جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔

قولہ تعالیٰ: وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ ۔ الاکمہ وہ جو اندھا اور نابینا پیدا ہوتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اسی طرح ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ جو اندھا پیدا کیا جاتا ہے علاوہ رؤبہ کے بارے کسی نے کہا:

فارتد ارتداد الاکمہ

ابن فارس نے کہا ہے: الکمہ کا معنی اندھا پن (یعنی) انسان پیدا ہوتا ہے اس حال میں کہ اسے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ سوید نے کہا ہے: کمھت عیناہ حتی ابیضتا (اس کی آنکھیں اندھی ہیں یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئیں)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ جو دن کے وقت تو دیکھتا ہے لیکن رات کے وقت نہیں دیکھ سکتا۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اعمش ہیں، البتہ لغت میں اس کا معنی کئی اندھا پن ہے۔ کہا جاتا ہے: کَمِہَ یَکْمَہُ کَمْہًا اور کَمَّہْتُہَا۔ انا کا معنی ہے جب تو اسے اندھا کر دے۔ اور برص تو معروف بیماری ہے یعنی وہ سفید داغ جو ساری جلد پر چھا جاتے ہیں (اور اسے سفید کر دیتے ہیں) اور الابرص کا معنی قمر (چاند) بھی ہے اور سام ابرص (چھپکلی) تو معروف ہے اور اس کی جمع اباریص آتی ہے۔ ان دونوں بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ یہ دونوں عاجز کر دینے والی ہیں (یعنی) ان کا علاج انتہائی مشقت آمیز اور مشکل ہے گویا لاعلاج بیماریاں ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی جنس سے انہیں معجزہ دکھا دیا۔

وَأُحْيِي الْمَوْتَى بِإِذْنِ اللَّهِ ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا: عازر کو وہ آپ کا دوست تھا، بڑھیا کے بیٹے کو، العاشر کی بیٹی کو اور سام بن نوح کو۔ فاللہ اعلم۔ رہے عازر تو وہ چند دن قبل وفات پا گئے تھے تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی چربی ٹپکنے کے قریب ہو گئی پس وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ اور رہا ابن العجوز تو آپ اس کے پاس سے گزرے اسے چارپائی پر اٹھایا جا رہا تھا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے پہن لئے اور چارپائی اپنی گردن پر اٹھائی اور اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور جہاں تک بنت العاشر کا تعلق ہے تو آپ ایک رات اس کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اس کے بعد زندہ ہو گئی اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ پس جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: بلاشبہ آپ انہیں زندہ کرتے ہیں جن کی موت قریب قریب واقع ہوئی ہے تو شاید وہ ابھی تک مرے ہی نہ ہوں بلکہ ان پر سکتہ طاری ہوا ہو تو آپ ہمارے لئے سام بن نوح کو زندہ کریں۔ تو آپ نے انہیں فرمایا: تم اس کی قبر کے بارے میری راہنمائی کرو۔ چنانچہ آپ نکلے اور آپ کے ساتھ قوم بھی نکلی یہاں تک کہ اس کی قبر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اپنی قبر سے اس حال میں نکلا کہ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تیرا سر کیسے سفید ہو گیا ہے حالانکہ تمہارے زمانے میں بڑھاپا نہیں تھا؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ! بلاشبہ تو نے مجھے بلایا ہے اور میں نے یہ آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے: روح اللہ کو جواب دو تو میں نے یہ گمان کیا کہ

وَمُصَدِّقًا اس کا عطف وَرَسُولًا پر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ میں تمہارے پاس تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں۔ لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ اس کی جو مجھ سے پہلے آئی۔ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ اس میں حذف ہے، یعنی ولاحل لكم جئتكم (اور میں آیا ہوں تاکہ تمہارے لئے حلال کر دوں میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں) بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یعنی کھانے کی اشیاء میں سے بعض جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں۔

کہا گیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ تورات میں نہ تھیں، مثلاً شحوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کر دیا تھا اور وہ تورات میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ بعض بمعنی کل ہو۔

اور لبید نے کہا ہے:

تَرَّاكُ أَمْكِنَةٍ إِذَا لَمْ أَرْضَهَا ... أَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوسِ حِمَامُهَا

اس میں بعض بمعنی کل استعمال ہوا ہے۔

یہ قول اہل لغت میں سے اہل نظر وفکر کے نزدیک غلط ہے۔ کیونکہ بعض اور جزء اس جگہ پر بمعنی کل نہیں ہو سکتے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کیا جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حرام کیا تھا مثلاً شحوم کھانا وغیرہ اور آپ نے ان کے لئے قتل، چوری اور زنا وغیرہ کو حلال نہیں کیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی نرمی اور ملاطفت کے ساتھ ان کے پاس تشریف لائے ان چیزوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونٹوں کی تحریم اور شحوم وغیرہ اشیاء کی تحریم کا حکم لے کر ان کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے بعض کی حلت کا حکم لے کر آئے۔

نخعی نے بعض الذی حرم علیکم پڑھا ہے۔ یعنی یہ کرم وشرف کی مثل ہے، بمعنی صار حراما۔ یعنی وہ حرام ہو گیا، کے معنی میں ہے۔ اور کبھی بعض بمعنی کل کی جگہ رکھا جاتا ہے جبکہ وہاں ایسا قرینہ موجود ہو جو اس پر دلالت کرے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا:

أَبَا مُنْذِرٍ أَفْنَيْتَ فَاسْتَبْقِ بَعْضَنَا ... حَنَانَيْكَ بَعْضُ الشَّرِّ أَهْوَنُ مِنْ بَعْضِ

اور یہاں بعض الشر اھون سے مراد کل ہے۔ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ اسے یہاں واحد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ آیات تھیں، اس وجہ سے کہ یہ آپ کی رسالت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے جنس واحد ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٥٢﴾

ترجمہ: پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (وانکار) (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار

سفر کا ارادہ کیا تو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: میرے پاس مختلف رنگوں کے بہت سے کپڑے ہیں اور میں نے تمہیں رنگنا سکھا دیا ہے پس تم انہیں رنگ دینا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مٹکا رنگ کا بنایا اور اس میں تمام کپڑے ڈال دیے اور کہا: تم اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسی طرح ہو جاؤ جیسے میں تم سے ارادہ رکھتا ہوں۔ پس حواری آیا اور سارے کپڑے مٹکے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو کہا: تو نے انہیں خراب کر دیا ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرخ، زرد، سبز اور دیگر ان رنگوں میں کپڑے نکالے جو رنگ ان میں سے ہر کپڑے پر لکھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر حواری بہت متعجب ہوا اور اس نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس نے لوگوں کو آپ کی طرف بلایا پس وہ آپ کے ساتھ ایمان لے آئے اور وہی حواری تھے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کے خواص تھے اور وہ اس سے اپنے دلوں کی صفائی اور طہارت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بادشاہ تھے، اس طرح کہ بادشاہ نے کھانے کی دعوت کی اور لوگوں کو اس پر بلایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو پیالہ تھا وہ ختم نہ ہوا تو بادشاہ نے آپ کو کہا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں عیسیٰ ابن مریم ہوں تو اس نے کہا: میں اپنی یہ سلطنت چھوڑتا ہوں اور تمہاری اتباع کرتا ہوں۔ پس وہ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چل پڑا تو وہی حواری ہیں، یہ ابن عون نے کہا ہے۔ لغت میں الحور کا اصل معنی سفیدی ہے اور حورت الثیاب کا معنی ہے میں نے کپڑے کو خوب صاف کیا، سفید کیا اور الحواری من الطعام ما حور یعنی جو کھانا خوب اچھی طرح بنایا جائے۔ اور احور کا معنی ابیض (سفید تر) ہے۔ اور الجفنة المحورة: سفید چمڑے سے بنی ہوئی بڑا پیالہ۔ اور حواری کا معنی مددگار بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لکل نبی حواری و حواری الزبیر(1) (ہر نبی کا حواری (مددگار) ہے اور میرا حواری زبیر ہے) اور الحواریات سفید عورتیں۔

اور کسی نے کہا:

فقل للحواريات يبكين غيرنا ... ولا تبكنا الا الكلاب النوابح

پس تو ان سفید عورتوں سے کہہ دے وہ ہمارے سوا اوروں پر روئیں اور ہم پر نہ روئیں مگر بھونکنے والے کتے۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٣﴾

”اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔“

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے بِمَآ اَنْزَلْتَ یعنی اس کے ساتھ جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اس پر جو تو نے اپنے حکم میں سے ظاہر اور بیان کیا۔ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ شاہدین سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت ہے۔

1۔ صحیح بخاری، باب فضل الطلیعة، حدیث نمبر 2634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے اور ہمیں تمام ان کے اسماء کے ساتھ لکھ دے اور ہمیں ان کی جملہ ان میں سے بنا دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ ہمیں ان کے ساتھ لکھ دے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق وسچائی کے ساتھ شہادت دی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝

"اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور موثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَمَكَرُوْا مراد بنی اسرائیل کے وہ کفار ہیں جن سے آپ نے کفر محسوس کیا یعنی آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی قوم اور ان کی ماں نے اپنے درمیان سے نکال دیا تو آپ حواریوں کے ساتھ ان کی طرف لوٹ کر آئے اور ان میں اعلانیہ دعوت و رشاد کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بنایا اور انہوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، پس یہی ان کا مکر اور خفیہ تدبیر ہے۔ اور مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے جسے وہ نہ جانتے ہوں۔ فراء وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب بھی انہوں نے کوئی گناہ اور غلطی کی تو ہم نے انہیں ایک تازہ اور نئی نعمت عطا کر دی۔

اور زجاج نے کہا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر جزا اور بدلہ دینا ہے، پس جزا اور بدلے کو اسی کا نام دے دیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لغت میں مکر کا اصل معنی حیلہ کرنا اور دھوکہ دینا ہے۔ اور مکر کا معنی خدالۃ الساق (پنڈلی کا بھر جانا) ہے اور امرأۃ ممکورۃ الساقین (ایسی عورت جس کی دونوں پنڈلیاں گول اور بھری ہوئی ہوں) اور مکر کپڑوں کی ایک قسم بھی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے مراد گیرو اور سرخ مٹی ہے، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ دوسروں کے سامنے کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے اٹھا لیا اور وہ اس طرح ہوا کہ یہودی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تو آپ ان سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرائیل امین نے آپ کو روشندان سے آسمان کی طرف اٹھا لیا تو ان کے بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث آدمی کو کہا اسے یہودا کہا جاتا تھا: تو اس پر داخل ہو اور اسے قتل کر دے، پس وہ روشندان سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ مشابہ بنا دیا، پس جب وہ نکلا تو انہوں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ دیکھا چنانچہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا اور پھر اسے سولی دے دی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا: اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چہرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا بدن ہمارے اپنے ساتھی کے بدن سے مشابہ ہے، پس اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں؟ اور اگر یہ عیسیٰ ہیں تو پھر ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ تو پھر ان کے درمیان جنگ

شروع ہوگئی اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ یہی اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ اس کے علاوہ بھی (بہت کچھ) کہا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ ماکرین مکر یمکر مکرا سے اسم فاعل ہے اور بعض علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں شمار کیا ہے اور جب وہ اس کے ساتھ پکاریں تو اس طرح کہتے ہیں: یا خیر الماکرین امکرلی۔ (اے بہترین تدبیر کرنے والے میرے لئے تدبیر فرما) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی دعا میں کہتے تھے(1): اللھم امکرلی ولا تمکر بی (اے اللہ! میرے حق میں تدبیر فرما اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما) ہم نے اسے "الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ" میں ذکر کیا ہے۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى إِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ إِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾

"یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں سے) جنہوں نے (تیرا) انکار کیا اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک، پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى إِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ، إِذْ میں عامل یا تو مکروا ہے یا فعل مضمر ہے۔ اہل معانی کی ایک جماعت جن میں ضحاک اور فراء بھی ہیں انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ إِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَىَّ کے بارے کہا ہے کہ اس میں تقدیم وتاخیر ہے، کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور معنی یہ ہے: انی رافعک الیّ ومطھرک من الذین کفروا ومتوفیک بعد ان تنزل من السماء (میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان لوگوں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے تیرا انکار کیا اور تمہیں آسمان سے اتارے جانے کے بعد تمہیں موت دوں گا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿﴾ (طٰہٰ) (اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔) اس میں تقدیر عبارت یہ ہے: ولولا کلمۃ سبقت من ربک واجل مسمی لکان لزاما۔

شاعر نے کہا ہے:

الا یا نخلۃ من ذات عرق ... علیک ورحمۃ اللہ السلام

اس میں تقدیر عبارت علیک السلام ورحمۃ اللہ۔ یعنی اس میں بھی تقدیم وتاخیر ہے۔

حسن اور ابن جریج نے کہا ہے: متوفیک کا معنی ہے: میں تمہیں قبضہ میں لینے والا ہوں اور بغیر موت کے آسمان کی طرف

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء النبی ﷺ، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم کیسے (شان سے) ہو گے جب ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا" اور ایک روایت میں الفاظ فامکم منکم ہیں۔ ابن ابی ذئب نے کہا: تم جانتے ہو تم میں سے امکم کیا ہے؟ میں نے کہا: آپ ہی مجھے بتائیے۔ تو انہوں نے کہا: پس تمہاری امامت (فامکم) تمہارے رب تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے(1)۔ ہم نے "کتاب التذکرہ" میں اس بارے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ والحمد للہ۔

اور مُتَوَفِّيكَ اصل میں مُتَوَفِّيُكَ ہے اور ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور یہ انّ کی خبر ہے۔ اور رَافِعُكَ اس پر معطوف ہے اور اسی طرح مُطَهِّرُكَ اور وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ بھی ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اصل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا پر وقف تام ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول حسن ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی اتباع کی۔ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا حجت اور قیام دلیل کے ساتھ غالب ان پر جنہوں نے کفر کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: بالعز والغلبۃ۔ یعنی عزت اور غلبے کے ساتھ کفر کرنے والوں پر غالب۔ اور ضحاک اور محمد بن ابان نے کہا ہے: مراد حواری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۝

"تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔ اور وہ جو ایمان لائے اور کئے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے۔ یہ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی۔"

قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ یعنی میں انہیں دنیا میں قتل، سولی، قید اور جزیہ کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ سخت عذاب دوں گا۔

ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ، ذَٰلِكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اس کی خبر نَتْلُوهُ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الامر ذالک ہو یعنی مبتدا مضمر ہو۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

"بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے،

1۔ صحیح مسلم، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام حدیث نمبر 3193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ یہ آیت قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ اور تشبیہ اس بنا پر واقع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک شے دوسری شے کے مشابہ ہوتی ہے جب وہ دونوں ایک وصف میں جمع ہوں اگرچہ فی الحقیقت دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے پیدا نہیں کیا گیا پس اس جہت سے دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن جس شے میں دونوں کو تشبیہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں کی خلقت کی اصل مٹی سے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نفس مٹی سے پیدا نہیں کئے گئے، بلکہ مٹی کو کیچڑ بنایا پھر اسے صلصال (سوکھی ہوئی بجنے والی مٹی) بنایا پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا تو اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرا، پھر آپ کو بغیر باپ کے بشر بنایا۔

اور یہ آیت وفد نجران کے سبب نازل ہوئی جبکہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے انکار کیا: ان عیسی عبد اللہ و کلمتہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کوئی بندہ دکھائیں جو بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہو تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " آدم علیہ السلام جو ان کے باپ تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تمہارے لئے تعجب خیز ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا صرف باپ نہیں لیکن آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں" اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (وہ آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لائیں گے) اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ (مگر ہم آدم علیہ السلام کے بارے میں آپ کے پاس حق لے کر آئے)۔ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (اور کتنی اچھی تفسیر بیان کی) اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم تم سے پہلے مسلمان تھے تو آپ نے فرمایا: "تم نے جھوٹ بولا ہے تین چیزیں تمہیں اسلام سے روک رہی ہیں۔ ایک تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور دوسرا تمہارا خنزیر کھانا اور تیسرا تمہارا صلیب کو سجدہ کرنا۔" تو انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۞ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۫ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۞ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بلایا تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی۔ تب انہوں نے کہا: کیا اس کے سوا بھی کوئی شے آپ ہم پر پیش فرمائیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یا جزیہ یا جنگ تو انہوں نے ان میں سے جزیہ کا اقرار کیا اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ اٰدَمَ پر کلام مکمل ہو گیا۔

أ، دل　كلمة　لا　ضيه　فيه　يستوى　بيننا　فيها　السَّواء

مجھے کوئی ایسا کام دکھاؤ جس میں ظلم نہ ہو اور اس میں ہمارے درمیان عدل کیا جاتا ہو۔

فراء نے کہا ہے: عدل کے معنی ادا کرنے کے لئے برابری اور متوسط کہا جاتا ہے، پس جب تو سین کو فتحہ دے گا تو اسے مد کے ساتھ پڑھے گا اور جب تو سین پر کسرہ یا ضمہ پڑھے گا تو اسے قصر کے ساتھ پڑھے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَكَانًا سُوًى فرمایا: اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں ہے الی كلمة عدل بيننا وبينكم اور قعنب (ابو السمال العدوی) نے كلمة لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لام کی حرکت کاف کو دے دی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: كبد، اس کا معنی یہ ہے تم اسے قبول کرو جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور وہی وہ کلمہ عادلہ مستقیمہ ہے جس میں حق سے کہیں اور ورا میلان اور جھکاؤ نہیں اور اس کی تفسیر اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ کی ہے۔ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ اس میں أن، كلمة سے بدل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے یا مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے هي أن لا نعبد الا الله۔ یا پھر یہ أن مفسرہ ہے اور اس کا کوئی محل نہیں اور اس کے ساتھ نَعْبُدَ اور جو اس پر معطوف ہے اس پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں، پس جزم اس بنا پر کہ یہ مفسرہ بمعنی ای ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَنِ امْشُوا اور یہ جائز ہو، یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ نَعْبُدَ کو رفع دیا جائے اور یہ اور اس کا مابعد خبر ہو، اور بمعنی انه لا نعبد رفع دیا جائز ہے اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے أَفَلَا يَرَوْنَ أَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا (طہ) (کیا یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا)

اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بھی یہ جزم کے ساتھ ہیں اس وہم کی بنا پر کہ اول کلام میں أن نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ یعنی ہم کسی شے کو حلال کرنے یا اسے حرام کرنے میں اس کی اتباع اور پیروی نہ کریں گے مگر اسی میں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابا من دون الله اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی حرام کردہ اور حلال کردہ چیزوں کو قبول کرنے میں اپنے رب کے رتبہ اور درجہ میں رکھا ان چیزوں کے بارے میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ حرام کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا۔

اور یہ ایسے استحسان کے بارے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کا انحصار کسی دلیل شرعی پر نہ ہو، الکیا الطبری نے کہا ہے: مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ کے وہ استحسانات جو ان اندازوں اور تقدیرات کے بارے ہیں جو انہوں نے بذات خود بغیر واضح دلائل کے مقرر کئے۔ اور اس میں ان روافض کا بھی رد ہے جو یہ کہتے ہیں: دلیل شرعی کا سہارا لئے بغیر بھی امام کا قول قبول کرنا واجب ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو بغیر اس کے کہ وہ کوئی مستند دلیل شرعی بیان کرے۔ ارباب، رب کی جمع ہے اور یہاں دُونِ بمعنی غیر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی اگر وہ اس سے اعراض کریں جس کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ تو تم کہہ دو گواہ رہنا ہم دین اسلام کے ساتھ متصف ہیں، اس کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں اور ہم ان احسانات اور انعامات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم پر ہیں ہم کسی کو رب بنانے والے نہیں ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی ملائکہ کو، کیونکہ وہ ہماری مثل بشر ہیں وہ ہمارے حدوث کی طرح حادث ہیں۔ اور راہبوں سے کسی ایسی شے کو قبول نہیں کریں گے جسے انہوں نے ہم پر حرام کیا ہو جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر حرام نہ کیا ہو، کہ ہم انہیں رب بنالیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: یَتَّخِذَ بمعنی یسجد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک سجدہ (تعظیمی) جائز تھا پھر حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو منع فرمادیا جب انہوں نے سجدہ کرنے کا ارادہ کیا جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہمارے بعض بعض کے لئے جھک سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: "نہیں" پھر ہم نے عرض کی: کیا ہم آپس میں ایک دوسرے سے معانقہ کرسکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ تم ایک دوسرے سے مصافحہ کرو۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے (1)۔ اس بارے میں مزید بیان سورۂ یوسف میں آئے گا اور سورۂ واقعہ میں کہ قرآن یا اس کے جز کو بغیر طہارت کے چھونا کیسا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

"اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔"

قولہ تعالیٰ: يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ، لِمَ اصل میں لما ہے، استفہام اور خبر کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے الف کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور یہ آیت یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب نازل ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی بایں طور کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہی آپ کے بعد ہوئے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ الآیہ۔

زجاج نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ تورات و انجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں میں ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کیا تم اپنی دلیل اور قول کے بطلان کو نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

1۔ سنن ابن ماجہ، باب المصافحۃ، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ اور مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور لفظ هٰذَا محل رفع میں ہے اور الذین پر معطوف ہے، اور النبی۔ هٰذَا کی صفت ہے یا عطف بیان ہے اور اگر اسے محل نصب میں رکھا جائے تو بھی کلام میں جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اتبعوہ کی ھا ضمیر پر ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کا مددگار ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان لکل نبی ولاۃ من النبیین وان ولی منهم أبی وخلیل ربی۔ بے شک ہر نبی کا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی (نہ کوئی) مددگار ہے اور ان میں سے میرے مددگار میرے باپ (جد اعلیٰ حضرت ابراہیم) اور میرے رب کے خلیل ہیں (1)۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران: 68) (بے شک سب لوگوں سے زیادہ نزدیک ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم)۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

"دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔"

یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت بنی نضیر، قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔ اور یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے: وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا (بقرہ: 109) (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے۔) اس قول کی بنا پر من تبعیض کے لئے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد جمیع اہل کتاب ہیں۔ تو پھر من بیان جنس کے لئے ہوگا۔

اور لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ کا معنی ہے وہ تمہیں دین اسلام سے رجوع اور اس کی مخالفت کے سبب معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دیں۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: يُضِلُّوْنَكُمْ کا معنی ہے يُهْلِكُوْنَكُمْ یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔

اور اسی میں اخطل کا قول ہے:

كُنْتَ الْقَذَى فِي مَوْجِ أَكْدَرَ مُزْبِدٍ قَذَفَ الْأَتِيُّ بِهِ فَضَلَّ ضَلَالًا

اس میں فضل ضلالا بمعنی هلک هلاکا ہے۔

وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ اس میں نفی اور اثبات ہے (یعنی اور دوسروں سے ضلالت وگمراہی کی نفی ہے اور ان کی اپنی ذاتوں کے لئے اس کا اثبات ہے۔ یعنی وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو) وَمَا يَشْعُرُوْنَ یعنی وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَ تَكْفُرُوْنَ کا معنی ہے: وہ اسلام کی صحت کو نہیں جانتے حالانکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اسے جانیں اور سمجھیں، کیونکہ اس کی براہین ظاہر اور دلائل واضح ہیں۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝

"اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ ہو۔"

یعنی ان آیات کے صحیح ہونے کے تم خود گواہ ہو جو تمہارے پاس تمہاری کتابوں میں ہیں، یہ حضرت قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اور تم ان کی مثل انبیاء علیہم السلام کی ان آیات و علامات کے گواہ ہو جن کے بارے تم خود اقرار کرتے ہو۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

"اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔"

تلبیس کا معنی ہے الخلط یعنی ملا دینا (گذشتہ) سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اس آیت کا معنی اور جو آیت اس سے پہلے ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اسے جواب استفہام ہونے کی وجہ سے تَكْتُمُوْا پڑھنا بھی جائز ہے۔ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝

"کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کردو اس کا سر شام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔"

یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صیف وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے اپنی قوم کے سفلہ اور احمق لوگوں کو کہا کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو ایمان والوں پر اتاری گئی صبح کے وقت۔ وَجْهَ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور اول حصہ ہے۔ اور اس کے بہت حسین ہونے کی وجہ سے اسے وجہ کا نام دیا گیا ہے اور اس کا اول وہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے (مراد صبح ہے۔)

شاعر نے کہا ہے:

وتضیء فی وجه النهار منيرة   كجمانة البحری سل نظامها

دن کی صبح کو روشنی اس طرح منور کرتی ہے جیسا کہ موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔

اور ایک دوسرے نے کہا:

من كان مسرورا بمقتل مالك   فليأت نسوتنا بوجه نهار

اور حسن اور مجاہد سے مروی ہے کہ آیت کا معنی ہے: تم کسی کی بات نہ مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور تم یہ نہ مانو کہ وہ تم پر تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، پس دین کے اعتبار سے تم ان سے زیادہ صحیح ہو۔ اَنْ اور يُحَآجُّوْكُمْ دونوں محل جر میں ہیں، ای بأن يحاجوكم ای باحتجاجهم یعنی تم اس بارے میں ان کی تصدیق نہ کرو کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ (اور یہ بھی نہ مانا کرو) کہ کسی کو اتنا دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے مثلاً تورات، من و سلویٰ اور سمندر کا پھٹنا اور علاوہ ازیں دیگر علامات و فضائل۔

پس اَنْ يُّؤْتٰٓى، اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ کے بعد موخر ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

اور اخفش نے کہا ہے: معنی یہ ہے اور تم مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور مت مانو یہ کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے ورنہ اس کی تصدیق کرو کہ وہ تم پر کوئی حجت لا سکتے ہیں، یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام معطوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اور تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ پس استفہام پر مد بھی اسی انکار کی تاکید کے لئے ہے جو انہوں نے کہا ہے: "بے شک کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، کیونکہ علمائے یہود نے انہیں کہا ہے: تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے یعنی کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، پس کلام اپنی ترتیب پر ہے اور اَنْ محل رفع میں ہے ان کے قول کے مطابق جنہوں نے تیرے اس قول میں رفع دیا ہے۔ أزيد ضربته، اور خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: أن يؤتى احد مثل ما أوتيتم تصدقون أو تقرون، ای ایتاء موجود مصدق أو مقر به، ای لا تصدقون بذلك۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر اَنْ محل نصب میں ہو جیسا کہ تیرے اس قول میں جائز ہے أزيدا ضربته اور عربی میں یہ زیادہ قوی ہے کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی: أتقرون أن يؤتى او أتشيعون ذالك او تذكرون ذالك ونحوه۔

اور ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: آن بمعنی أَأَنْ ہے پھر لام جر تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا اور اسے مد کے ساتھ بدل دیا گیا جیسا کسائی کی قراءت جس نے اس طرح پڑھا ہے أن كان ذا مال یعنی اصل میں أَأَنْ ہے۔ اور اس قراءت کی بنا پر قولہ تعالیٰ کا ارشاد: أَوْ يُحَآجُّوْكُمْ مومنین کو خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے، یا پھر او بمعنی أن ہوگا، کیونکہ یہ دونوں حرف شک اور جزا ہیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وإن يحاجوكم عند ربكم يا معشر المؤمنين۔

پس تم فرما دیجئے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہدایت اور فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ہم اسی کے تابع ہیں۔

اور جس نے لفظ مد کے ساتھ پڑھا ہے اس نے کہا ہے: بے شک بخل کی نفی ان کے قول وَلَا تُؤْمِنُوْۤا میں ان کے انکار پر دلالت کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان سے کہا: تم اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے، یعنی تمہارے پاس جو ایمان ہے اور نہ ہی کوئی حجت، یعنی علم و حکمت، کتاب، دلیل، من و سلویٰ اور سمندر کا پھٹنا وغیرہ فضائل و کرامات کا معنی پر عطف کیا گیا ہے، یعنی بلاشبہ یہ سب صرف تم ہی میں موجود ہیں پس تم یہ بات مت مانو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ پس اس قرات کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور لام زائدہ ہے اور من احد اور ان میں سے نہیں ہے ورنہ کلام جائز نہیں ہوگا۔ اور اخفش نے کہا ہے کیونکہ اولیٰ کا معنی ہے۔ پس ان کے صدر میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ وہ فعل مقدر کا منصوب ہے اور جزا دینے والا عامل نہ ہونے کی وجہ سے ان کا محل نصب میں ہے اور خلیل نے کہا ہے: بلکہ محل جر میں ہے کیونکہ اس سے پہلے جر دینے والا لفظ محذوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام زائدہ نہیں ہے اور تُؤْمِنُوْۤا یہ تقروا پر محمول ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ تم مت مانو سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: تم کسی کے بارے مت خبر دو جو تمہاری کتاب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں تاکہ بتوں کی عبادت اور ان کی تصدیق کی طرف کوئی راہ نہ ہو۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہودیوں کا کلام ان ارشاد پر ختم ہو چکا ہو: وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ اور پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہو: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ یعنی بلاشبہ بیان حق ہی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ یہ (اس معنی میں) بالکل بین اور ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔ اور لا، ان کے بعد مقدرہ ہے۔ یعنی لئلا یؤتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی لئلا تضلوا، ان کا ذکر کیا جائے اور یہ اسی کے کلام میں ان کا داخل ہونا صحیح ہے، اور ان بمعنی لئلا اور لان آتا ہے۔

جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

فقلت له لا تبك عينك انما ... نحاول ملكا او نموت فنعذرا

اس میں او نموت الا ان نموت کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وكنت اذا غمزت قناة قوم ... كسرت كعوبها او تستقيما

اس میں او تستقیما بمعنی الا ان تستقیم کے معنی میں ہے اور اسی کی مثل ان کا یہ قول ہے: لا نلتقی او تقوم الساعة

مضمر ہو اور اَنْ کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور اَوْ کے بعد اَنْ کو مضمر کیا جاتا ہے جب وہ حتی اور اِلّا اَنْ کے معنی میں ہو۔

اور حسن نے اِنْ یؤتی یعنی تا کو کسرہ کے ساتھ اور یا کو مفتوح پڑھا ہے معنی یہ ہو گا اِنْ یؤتی احدٌ احدًا مثل ما اوتیتم (کہ کوئی کسی کو اتنا دے گا جتنا تمہیں دیا گیا ہے۔) اس میں سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اس میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ خیر اور نیکی کی طرف ہدایت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ اسے اپنے انبیا علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو عطا فرماتا ہے، سو تم انکار نہ کرو کہ تمہارے سوا کسی کو اس کی مثل عطا کیا جائے جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے، پس اگر وہ اس کا انکار کریں تو ان سے فرما دیجئے اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے: آپ فرما دیجئے ہدایت تو وہی ہے جو اس اللہ کی ہدایت ہو جس نے جو مومنین کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے کے بارے عطا فرمائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اور بعض اہل اشارات نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: تم (حسن) معاشرت نہ رکھو سوائے ان کے جو تمہارے احوال اور تمہارے طریقہ میں تم سے موافقت کرتے ہیں، کیونکہ جو تم سے موافقت نہیں کرتا وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

"خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔"

یعنی وہ اپنی نبوت اور ہدایت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے، یہ قول حسن اور مجاہد وغیرہما کا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: وہ خاص کر لیتا ہے اسلام اور قرآن کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ ابو عثمان نے کہا ہے: یہ مبہم تر قول ہے جس کے ساتھ امیدوار کی امید اور خوفزدہ ہونے والے کا خوف باقی رہتا ہے۔ "اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔"

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے یہ اس (بد دیانتی) کی وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام (ان اہل کتاب میں سے تھے) وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اس سے مراد فنحاص بن عازوراء یہودی ہے، ایک آدمی نے اس کے پاس کچھ دینار امانت رکھے تو اس نے اس میں خیانت کی۔

اور یہ بھی قول ہے کہ ان سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ ابن وثاب اور اشہب عقیلی نے مَنْ اِنْ تِيْمَنْهُ قرأت کی ہے اور یہ ان کی لغت پر ہے جو نستعین پڑھتے ہیں اور یہ بنی بکر اور بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں مالك لا تيمنا على يوسف کے الفاظ ہیں، جبکہ باقیوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور کسائی نے يؤدهي اور اس میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو، اعمش، عاصم اور حمزہ نے ابو بکر کی روایت میں ہا پر وقف کرکے پڑھا ہے یعنی يؤده اليك۔ نحاس نے کہا ہے: بعض نحویوں کے نزدیک ہا کو ساکن کرنا بغیر شعر کے جائز نہیں ہے اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ جنہوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ کہ انہیں وہم ہوا ہے کہ جزم ہا پر واقع ہوئی ہے اور ابو عمرو نے اس سے پاک قرار دیا کہ اس کی مثل اس پر جائز ہو اور ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ہا کو کسرہ دیتے ہیں اور یہی یزید بن قعقاع کی قرأت ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ بعض عربوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ ہا کو جزم دیتے ہیں جب اس کا ماقبل متحرک ہو، وہ کہتے ہیں: ضربته ضربا شديدا جیسا کہ وہ انتم اور قمتم کی میم کو سکون دیتے ہیں اور اس کی اصل رفع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لما رأى ألا دعه ولا شبع مال الى ارطاة حقف فاضطجع

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس مقام پر ہا کو ساکن کرنا جائز ہے کیونکہ وہ جزم کے محل میں واقع ہے اور یہ یا گر جانے والی ہے۔ ابو المنذر سلام اور زہری نے يؤده بغیر واؤ کے ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ، حمید اور مجاہد نے يؤدهو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے اس کے لئے واؤ کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ضمہ سے ادا ہوتی ہے اور ہا بعیدۃ المخرج ہے۔ (یعنی اس کی ادا کا محل بعید ہے)

سیبویہ نے کہا ہے: مذکر میں واؤ مؤنث میں الف کے قائم مقام ہے اور اسے یا سے بدل دیا جاتا ہے کیونکہ یا زیادہ خفیف ہے جبکہ اس کا ماقبل کسرہ دیا ہوا ہو اور یا حذف ہوتی ہے اور کسرہ باقی رہتا ہے۔ کیونکہ یا کبھی حذف ہو جاتی ہے اور فعل مرفوع ہو تو اسے اپنے حال پر ثابت رکھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں کچھ خائن ہیں اور کچھ امین ہیں اور مومنین ان میں تمیز نہیں کر سکتے، پس چاہیے کہ وہ ان تمام سے اجتناب کریں اور اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی اسی طرح ہیں، اس لئے کہ ان میں خیانت زیادہ پائی جاتی ہے، پس کلام غالب کے بارے میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قنطار کی تفسیر پہلے گزر

نچلی ہے اور ہاد یعنی چار تو وہ چوتھی قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط درمیانے جو کے تین حصوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کا مجموعہ بہتر
جو ہیں اور اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ جس نے کثیر کی حفاظت کی اور اسے ادا کر دیا تو (حفاظت اور ادائیگی) قلیل میں بدرجہ اولیٰ
ہوگی اور جس نے تھوڑے میں خیانت کی یا اسے روک کر رکھا تو وہ کثیر میں اور زیادہ ہوگی۔ اور یہ مفہوم خطاب کے ساتھ قول پر
بہت بڑی واضح دلیل ہے۔ اور اس میں علماء کے مابین بہت زیادہ اختلاف ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو
قسمیں ذکر کی ہیں جو ادا کرتا ہے اور وہ جو ادا نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کبھی لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے
جو ادا نہیں کرتا اگرچہ تو اس کے پاس ہمیشہ کھڑا رہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ غالب اور معتاد ہیں اور
تیسری نادر ہے۔ لہٰذا کلام غالب کے بارے ہے۔ اور طلحہ بن مصرف اور ابو عبدالرحمن السلمی وغیرہما نے دمت دال کے کسرہ کے
ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور کسر وائدہ والسراۃ کی لغت ہے، یہ دمت تدام سے ماخوذ ہے جیسا خفت تخاف ہے۔
اور اخفش نے دمت تدوم بیان کیا ہے۔ اور یہ شاذ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ غریم (مقروض) کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡهِ قَآئِمًا اور دیگر علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض بغداد کے رہنے والوں نے بہت زیادہ قرض دینے والے کو حبس میں رکھنے پر اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِدِیۡنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیۡكَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡهِ قَآئِمًا تو جب اسے لازم پکڑنا اور تصرف سے اسے روکنا جائز ہے تو اسے حبس میں رکھنا بھی جائز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡهِ قَآئِمًا کا معنی ہے جب تک وہ تیری وجہ سے تجھ سے ڈرتا ہے اور تجھ سے حیا محسوس کرتا ہے، کیونکہ حیا آنکھوں میں ہوتا ہے، کیا آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جانتے نہیں ہیں: لا تطلبوا من الاعمی حاجۃ فان الحیاء فی العینین تم اندھے سے حاجت کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ حیا آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اور جب تو اپنے بھائی سے حاجت کا مطالبہ کرے تو تو اپنے چہرے کو متوجہ کرلے اس کی طرف، یہاں تک کہ وہ حیا محسوس کرنے لگے تو وہ اسے (حاجت کو) پورا کر دے گا۔ اور کہا جاتا ہے: قَآئِمًا کا معنی ملازماً ہے (یعنی اسے لازم پکڑتے ہوئے) پس اگر تو نے اسے مہلت دی تو وہ تیرا انکار کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: قیام سے مراد مسلسل مطالبہ کرنا ہے نہ کہ عین قیام مراد ہے۔ اور دینار اصل میں دنّار ہے کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لیے دونوں نونوں میں سے ایک کو یاء سے بدل دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع دنانیر آتی ہے اور تصغیر دُنَیۡنِیۡر بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ دین میں امانت انتہائی عظیم المرتبت ہے اور اس کی عظمت و قدر میں سے یہ ہے کہ یہ اور رحم (صلہ رحمی) پل صراط کی دونوں جانبوں پر کھڑے ہوں گے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور اسے عبور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا مگر وہی جو ان دونوں کی حفاظت اور پاسداری کرے گا۔

اور مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں رفع امانت کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اور السنة، السنی کی جمع ہے لغت میں جس نے مذکر قرار دیا ہے اور جس نے مؤنث قرار دیا ہے اس نے السن کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرما دے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہی کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے۔"

مَا كَانَ اس کا معنی ہے ما ینبغی یعنی نہیں چاہیے، جیسا کہ فرمایا: وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا اور مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا اور مَا يَكُوْنُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا تمام میں مراد یہی ہے کہ نہیں چاہیے (مناسب نہیں) اور لفظ بشر واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے کیونکہ یہ قائم مقام مصدر کے ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کے مطابق یہاں مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکم سے مراد علم اور فہم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکم سے مراد احکام ہیں۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی نبوت کے لئے جھوٹوں کو نہیں چنتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ نبوت کی آیات و علامات اس سے سلب کر لیتا۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اور يَقُوْلَ کے درمیان اشتراک کی بنا پر ثُمَّ يَقُوْلَ کو نصب دی گئی ہے یعنی کسی نبی کے لئے نبوت کا ہونا اور اس کا یہ قول: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جمع نہیں ہو سکتے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ یعنی البتہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی ان سے کہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ پوری سورۃ قول باری تعالیٰ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تک کا سبب نزول نجران کے نصاریٰ تھے لیکن یہودیوں کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا کیونکہ انہوں نے بھی انکار اور عناد انہی کی طرح کیا۔

رَبّٰنِيّٖنَ اس کا واحد ربانی ہے یہ الرب کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی صغار علم کے ساتھ اپنے بڑا ہونے سے پہلے تربیت کرتا ہے گویا کہ وہ امور کو آسان بنانے میں رب سبحانہ کی اقتدا کرتا ہے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض نے کہا ہے یہ اصل میں ربی تھا پھر مبالغہ کے لئے اس میں الف اور نون داخل کر دیئے گئے جیسا کہ عظیم اللحیہ کے لئے کہا جاتا ہے: لحیانی اور عظیم الجمہ (بہت ہی زیادہ) کے لئے جمانی اور غلیظ الرقبہ (موٹی گردن والا) کے لئے رقبانی کہا جاتا ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے: الربانیون سے مراد ارباب علم ہیں۔ ان کا واحد ربان ہے۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے ربه یربه فهو ربان جب وہ اسے مدبر بنائے اور اس کی اصلاح کرے، اس بنا پر اس کا معنی ہے یدبرون امور الناس ویصلحونها وہ لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور اس میں الف اور نون مبالغہ کے لئے ہیں جیسا کہ ان کا قول ریان اور عطشان ہے پھر اس کے ساتھ یائے نسبت ملا دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لحیانی،

مکی نے کہا ہے: تشدید ابلغ ہے، کیونکہ ہر معلم عالم بمعنی یَعْلَمُ ہوتا ہے لیکن ہر وہ جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلم نہیں ہوتا، پس تشدید علم اور تعلیم دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم ابلغ اور زیادہ قابل تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے۔ جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ فرمایا: تم حکماء علماء ہو جاؤ۔ پس یوں کہا جانا بعید ہے کونوا فقہاء حکماء علماء بتعلیمکم۔ یعنی تم اپنی تعلیم کے ساتھ فقہاء حکماء علماء ہو جاؤ۔ حسن نے کہا ہے: تم اپنے علم کے ساتھ حکماء علماء ہو جاؤ۔ اور ابو حیوہ نے تُدْرِسُوْنَ۔ اَدْرَسَ یُدْرِسُ (یعنی باب افعال) سے پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے تَعَلَّمُوْنَ تاء کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اصل میں تتعلمون تھا۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۟

"اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو۔"

ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے اَنْ یُّؤْتِیَهُ پر عطف کرتے ہوئے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یہ قول تقویت دیتا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم آپ کو رب بنالیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۟ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اور اس میں ضمیر بشر کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں وہ انسان حکم نہیں دے گا بشر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور باقیوں نے اسے پہلے کلام سے جدا ہونے اور استئناف کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دے گا کہ تم بنالو اور اس قرأت کو یہ تقویت دیتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَلَنْ يَّاْمُرَكُمْ ہے پس یہ استئناف پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر بھی اللہ عزوجل کے لئے ہے۔ اسے مکی نے ذکر کیا ہے اور سیبویہ اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریج اور ایک جماعت نے کہا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم نہیں دیں گے۔ یہی قرأت ابو عمرو، کسائی اور اہل حرمین کی ہے۔

اَنْ تَتَّخِذُوا کہ تم ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو خدا بنالو۔ یہ نصاریٰ میں موجود تھا وہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی تعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں خدا بنالیا۔ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ انکار اور تعجب کے طریق پر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر حرام قرار دیا کہ وہ لوگوں کو ایسے بندے بنا دیں کہ وہ ان کے خدا بن جائیں البتہ مخلوق پر ان کی حرمت کو لازم کر دیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی وأمتی (اے میرے بندے اور اے میری بندی) بلکہ یہ کہنا چاہیے فتای و فتاتی (اے میرے جوان اور اے میری

کہا گیا ہے کہ جنہوں نے لِمَا میں لام کو کسرہ دیا ہے وہ لام بمعنی بعد ہے یعنی بعد ما آتیتکم من کتاب وحکمۃ (بعد اس کے کہ میں تمہیں کتاب وحکمت عطا کر دوں۔)

جیسا نابغہ نے کہا ہے:

توھمت آیات لھا فعرفتھا لستۃ اعوام ذا العام سابع

مجھے اس کی نشانیوں کا وہم ہوا تو میں نے اسے چھ سال بعد پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔ اس میں لستۃ اعوام بمعنی بعد ستۃ اعوام ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے لَمَّا کو مشدد پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے حین آتیتکم یعنی جب میں تمہیں عطا کر دوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں اصل تخفیف ہو۔ پھر مِن زائد کر دیا گیا جو ان کے مذہب کے مطابق جو اس کی زیادتی کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ لمن ما ہو گیا اور پھر ادغام کے لئے نون کو میم سے بدل دیا گیا، پس تین میم جمع ہو گئے تو ان میں پہلے میم کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا۔ اور اہل مدینہ نے تعظیم کی بنا پر آتَیْنٰکُمْ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے آتَیْتُکُمْ صیغہ واحد پڑھا ہے۔

پھر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی بلکہ بعض کو عطا کی گئی ہے، لیکن غلبہ انہیں دیا گیا ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی ہے۔ اور مراد تمام انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لینا ہے پس جنہیں کتاب عطا نہیں کی گئی تو وہ بھی ان کے حکم میں ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے کیونکہ انہیں حکم اور نبوت عطا فرمائے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جنہیں کتاب نہیں دی گئی تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب لے لیں (اور اس کے احکام پر عمل کریں۔) نتیجتاً یہ بھی ان کی صفت کے تحت داخل ہو گئے جنہیں کتاب دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔ ءَاَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ماخوذ ہے۔ اور الاصر اور الأصر دو لغتیں ہیں اور اس سے مراد العہد ہے۔ لغت میں الاصر کا معنی ثقل (بوجھ) ہے۔ اور عہد کو اصر کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بہت بڑی رکاوٹ اور سختی ہے۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا بمعنی اعلموا۔ فرمایا پس تم جان لو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: تم بیان کرو کیونکہ شاہد وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعوی کی تصحیح کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم گواہ بنا لو اپنے آپ پر اور اپنے تابعین پر۔ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ اور میں بھی تم پر اور ان پر گواہوں میں سے ہوں۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا "پس تم ان پر گواہ رہنا" تو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔"

من شرطیہ ہے پس انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں سے جس نے وعدہ لئے جانے کے بعد ایمان سے منہ پھیر لیا فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس وہ ایمان سے خارج ہیں اور فاسق بمعنی خارج۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

سے سجدہ کرتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔) وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۞ (الرعد) (اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ کرتے ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس صورت پر پیدا فرمایا جس کا ان سے ارادہ فرمایا، پس ان میں سے کچھ حسین ہے اور کچھ قبیح، کچھ طویل ہے اور کچھ چھوٹے قد کی، کچھ صحت مند ہے اور کچھ بیمار اور تمام کے تمام مجبوراً جھکے ہوئے ہیں۔ پس صحیح رضامندی اور خوشی سے اطاعت کرنے والے ہیں اور اسے پسند کرنے والے ہیں اور مریض جھکتے ہیں، اطاعت اختیار کرتے ہیں اگرچہ وہ مجبور ہوں۔ اور الطوع کا معنی ہے سہولت کے ساتھ جھکنا اور اتباع کرنا۔ اور الکرہ وہ ہوتا ہے جو مشقت کے ساتھ ہو، مجبوراً ہو اور دل سے اس کا انکار ہو۔ اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں اور حال کے محل میں واقع ہیں یعنی یہ طائعین اور مکرھین کے معنی میں ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے فرمایا: وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: "ملائکہ نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور انصار اور عبد القیس نے زمین میں"۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میرے اصحاب کو گالی گلوچ نہ دو کیونکہ میرے اصحاب اللہ تعالیٰ کے خوف سے اسلام لائے اور لوگ تلوار کے خوف سے اسلام لائے"۔ (1)

اور مجاہد نے کہا ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جس نے بغیر کسی بحث مباحثہ کے اسلام قبول کیا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جسے حجت اور دلیل نے توحید کی جانب مجبور کر دیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: 61) (اور اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے)

حسن نے کہا ہے: یہ (لفظ) عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے۔ اور آپ سے مروی ہے اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ اور کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: مجبوری سے اطاعت کرنے والا منافق ہے جسے اس کا عمل کوئی نفع نہ دے گا۔ اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں، حال کے محل میں واقع ہیں۔ حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی سواری سرکش ہو جائے یا وہ بدکنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے کان میں یہ آیت پڑھے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا الی آخر الآیہ۔

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۞

1۔ مجمع الزوائد، باب فضل النبی ... مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تَابُوْا (آل عمران) (کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی)

پس اس کی قوم نے اسے اس کی طرف بھیج دیا تو جب اس پر یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میری قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں کو سچا قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تائب ہو کر واپس لوٹ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے توبہ کو قبول فرما لیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دیتے تھے اور کفر کرنے والوں کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعا مانگتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے سرکشی کی اور کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ (آل عمران) (ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔)

پھر کہا گیا ہے: كَيْفَ لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے یعنی لا یہدی اللہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: كيف يكون للمشركين عهد عند الله وعند رسوله یعنی لا يكون لهم عهد (ان کے لئے کوئی عہد نہیں ہو سکتا۔)

اور شاعر نے کہا ہے:

كيف نومي على الفراش ولما　　يشمل القوم غارة شعواء

اس میں بھی کیف نومی سے مراد ہے لا نوم لی یعنی میرے لئے کوئی نیند نہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا اور جو کوئی ظالم ہو اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا، حالانکہ ہم نے بہت سے مرتدین کو دیکھا کہ وہ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی اور کثیر ظالموں کو دیکھا انہوں نے اپنے ظلم سے توبہ کر لی۔ تو اسے کہا جائے گا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا جب تک وہ اپنے کفر اور اپنے ظلم پر قائم رہے اور انہوں نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور توبہ کر لی تو اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں توفیق دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

”ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کر لی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)“۔

یعنی اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور لعنۃ اللہ والملائکۃ کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ یعنی نہ انہیں موخر کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی استثناء فرمائی اور ارشاد فرمایا: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مراد حارث بن سوید ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ معنوی طور پر آیت میں ہر وہ داخل ہے جس نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور اس کے لئے مخلص ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔"

حضرت قتادہ، عطا خراسانی اور حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا اور پھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر لیا۔ اور ابوالعالیہ نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و صفت کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا پھر اپنے کفر پر قائم رہ کر انہوں نے اس میں اضافہ کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ازْدَادُوْا كُفْرًا وہ کفر میں بڑھتے ہی گئے ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے کئے۔ اور یہ علامہ طبری کا اختیار کردہ ہے، اور یہ آیت ان کے نزدیک یہود کے بارے میں ہے۔
لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یہ اس آیت کی وجہ سے مشکل ہے: وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ (الشوریٰ: 25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے۔)
سو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے موت کے وقت ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (النساء: 18) (اور نہیں ہے توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آجائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب)
اور حضرت حسن، قتادہ اور عطا رحمہم اللہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان (روح) حلقوم تک نہ پہنچے[1]۔" اور اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی وہ حالت جس پر وہ کفر کرنے سے پہلے تھے (اس پر نہیں لوٹ سکتے) کیونکہ کفر نے اسے ضائع کر دیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی جب وہ اپنے کفر سے دوسرے کفر کی طرف رجوع کریں، بلاشبہ ان کی توبہ قبول

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جائے گی جب انہوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تکالیف زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں پس اگر ہمارے لئے واپسی ممکن ہوئی تو ہم اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی درآنحالیکہ وہ کفر پر مقیم رہیں پس اسے غیر مقبولہ کا نام دیا ہے کیونکہ قوم کا عزم صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ مکمل طور پر قبول فرماتا ہے بشرطیکہ عزم و ارادہ صحیح ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۟

"جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لئے) بطور معاوضہ دے اتنا سونا ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔"

المِلء کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مقدار ہے جو کسی شے کو بھر دیتی ہے اور الملء فتحہ کے ساتھ مصدر ہے تیرا کسی شے کو بھر دینا اور کہا جاتا ہے: أعطني ملأه وملأيه وثلاثة أملائه۔ اور وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ میں واؤ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقحم اور زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے: فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا لَوِ افْتَدٰى بِهٖ۔ اور علمائے نحو میں سے اہل نظر نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ واؤ مقحم ہو کیونکہ یہ معنی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: سو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے بطور فدیہ دے۔ اور ذَهَبًا فراء کے قول کے مطابق بطور تفسیر منصوب ہے۔ مفضل نے کہا ہے: تفسیر کے لئے شرط یہ ہے کہ کلام تام ہو اور وہ مبہم ہو، جیسے تیرا یہ قول ہے: عندي عشرون، اس میں عدد معلوم ہے اور معدود مبہم ہے، پس جب تو نے درہماً کہا تو تو نے تفسیر بیان کر دی۔ بلاشبہ اسے بطور تمیز نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو اسے کسرہ دے رہا ہو، اور نہ ہی اسے کوئی رفع دینے والا عامل ہے۔ اور نصب خفیف ترین حرکت ہے اور یہ ہر اس کے لئے بنائی گئی ہے جس میں کوئی عامل نہ ہو۔ اور کسائی نے کہا ہے: اسے مِن کو مضمر کر کے نصب دی گئی ہے۔ یعنی اصل میں تھا: مِن ذَهَبٍ، جیسے کہ اس قول میں ہے: أو عدل ذلك صياما، أي من صيام۔

اور بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے لئے زمین بھر سونا ہو کیا تو اسے بطور فدیہ دے سکتا ہے؟ تو وہ کہے گا: ہاں۔ پھر اسے کہا جائے گا: تحقیق تجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کیا گیا تھا جو اس سے بہت زیادہ آسان تھی۔" یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے قد كنت کی بجائے كذبت، قد سئلت کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (تو نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ تجھ سے اس کا سوال کیا گیا تھا۔)(1)

1۔ صحیح بخاری، باب من نوقش الحساب عذب، حدیث نمبر 6057، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ۝

"ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بیشک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ کرام نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ تو ابو طلحہ نے کہا: ہمارا رب ہمارے مالوں کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے پس یا رسول اللہ ﷺ! آپ گواہ رہیں میں نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دے دی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تو اسے اپنے قرابتداروں حسان بن ثابت اور ابی بن کعب میں تقسیم کر دے۔"(1)

اور موطا میں ہے: "ان کے اموال میں سے ان کے نزدیک پسندیدہ بیرحاء تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا اور رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا عمدہ اور عیب پانی نوش فرماتے تھے۔" پھر آگے وہی حدیث ذکر کی۔ تو اس آیت میں خطاب کے ظاہر اور اس کے عموم کو عمل میں لانے پر دلیل موجود ہے، کیونکہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سے وہ معنی مذکورہ کلام سے نہیں سمجھے۔ کیا آپ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں کہ جب انہوں نے آیت لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا الآیہ سنی تو انہوں نے توقف کی ضرورت محسوس نہیں کی یہاں تک کہ دوسری آیت کے ذریعے اس کا بیان اور وضاحت آ جائے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خرچ کریں یا کوئی سنت مرشد آ جائے جو اس کی وضاحت کرنے والی ہو، کیونکہ وہ تو بہت سی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا کہ آپ نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کا قصد کیا اسے شبل کہا جاتا تھا اور کہا: اے اللہ! یقیناً تو جانتا ہے کہ میرے نزدیک میرے اس گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ مال کوئی نہیں ہے، پس آپ اسے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس لے آئے اور عرض کی: یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان ہے (اسے قبول فرمائیے)۔ تو آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو فرمایا: "اسے قبضہ میں لے لو" تو گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے اپنے دل میں کچھ (بوجھ سا) پایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان اللہ قد تقبلها منك بےشک اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول فرمایا ہے۔ اسے اسد بن موسیٰ نے ذکر کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام نافع کو آزاد کیا اور اس میں حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے انہیں ہزار دینار عطا کئے۔ صفیہ بنت ابی عبید نے کہا ہے: میں اس کے بارے گمان کرتی ہوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔

اور شبل نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب الزکاۃ علی الاقارب، حدیث نمبر 1368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 377

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدائن کسریٰ کی فتح کے دن جلولاء کے قیدیوں سے ان کے لئے ایک لونڈی خرید لیں تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا تو اس نے آپ کو بہت خوش کیا تو انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور حضرت ثوری سے مروی ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ربیع بن خثیم کی ام ولد نے بیان کیا ہے کہ جب ان کے پاس کوئی سائل آتا تو وہ مجھے فرماتے اے فلانہ! سائل کو شکر دے دو، کیونکہ ربیع شکر بہت پسند کرتا تھا۔ سفیان نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی (یہی) تاویل کرتے ہیں: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ شکر کی بوریاں خریدتے تھے اور انہیں صدقہ کر دیتے تھے تو آپ سے عرض کی گئی: آپ اس کی قیمت کیوں نہیں صدقہ کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا: کیونکہ شکر میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زیادہ پسندیدہ اور محبوب شے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کروں۔

اور حسن نے کہا ہے: یقیناً تم اسے ہرگز نہیں پا سکو گے جسے تم پسند کرتے ہو مگر اسے چھوڑ کر جس کی تم خواہش اور چاہت رکھتے ہو اور تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے جس کی تم آرزو رکھتے ہو مگر اس پر صبر کرتے ہوئے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ البر کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے: اس سے مراد جنت ہے، یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، عمرو بن میمون اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے منقول ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لن تنالوا ثواب البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم نیکی کا ثواب ہرگز نہیں پا سکتے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔) اور النوال کا معنی عطا ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے تولته تنویلا یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ اور نالنی من فلان معروف ینالنی یعنی وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ سو معنی یہ ہوگا: تم ہرگز جنت تک نہیں پہنچ سکو گے اور نہ تم اسے پا سکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں میں سے جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے: البر سے مراد عمل صالح (نیکی) ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: "تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی عمل صالح کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور عمل صالح جنت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (1)" سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا ہے: البر سے مراد طاعت ہے۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: تم ہرگز دین اور تقویٰ کا شرف و مرتبہ نہ پا سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو درآنحالیکہ تم صحت مند اور حریص ہو، تم زندگی کی آرزو رکھتے ہو اور فقر و افلاس سے ڈرتے ہو۔ اور حسن سے منقول ہے کہ حَتّٰى تُنْفِقُوْا سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ مجاہد اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو خیر اور نیکی کی راہ میں مثلاً صدقہ یا علاوہ ازیں دیگر طاعات وغیرہ اور یہ جامع معنی ہے۔ اور نسائی نے صعصعہ بن معاویہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے کہا: میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا تو میں نے کہا کوئی حدیث بیان فرمائیے تو انہوں نے کہا: ہاں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5629، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو مسلمان آدمی اپنے ہر مال سے جوڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو جنت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور ان میں سے ہر کوئی اسے اس کی طرف بلائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: اگر تو وہ (مال) اونٹ ہیں تو پھر دو اونٹ (صدقہ کرے) اور اگر وہ گائیں ہیں تو پھر دو گائیں (صدقہ کرے)۔ اور ابوبکر الوراق نے کہا ہے: (اللہ تعالیٰ نے) اس آیت کے ساتھ مکارم اخلاق پر ان کی راہنمائی کی ہے۔ یعنی تم ہرگز اپنے ساتھ میری نیکی کو نہیں پا سکو گے مگر اس طرح کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو اور اپنے اموال اور جاہ و حشمت میں سے ان پر خرچ کرو، پس جب تم اس طرح کرو گے تو پھر میری نیکی، احسان اور میرا لطف و مہربانی تمہیں آ پہنچیں گی۔

حضرت مجاہد نے کہا: یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا۔ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ یعنی جب وہ جانتا ہے تو اس پر جزا عطا فرمائے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ اتاری گئی تورات۔ آپ فرمائیے: لاؤ تورات پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حِلًّا یعنی حلال۔ (کھانے کی ہر چیز حلال تھی۔) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: آپ ہمیں بتائیے کون سی شے اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کی تھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ جنگل میں رہتے تھے اور وہ عرق النساء (کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے اور وہ اونٹوں کے گوشت اور ان کے دودھ کے سوا کوئی پسندیدہ اور مناسب شے نہ پاتے تھے۔" انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ (1) الحدیث ذکر کی۔ اور کہا جاتا ہے: (بے شک آپ نے) نذر مانی کہ اگر آپ اس بیماری سے شفایاب ہو گئے تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور آپ کے نزدیک پسندیدہ کھانا پینا اونٹ کا گوشت اور ان کا دودھ تھا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام حران سے بیت المقدس کا ارادہ کرتے ہوئے آئے جبکہ آپ اپنے بھائی عیصو سے بھاگے، آپ انتہائی مضبوط اور قوی آدمی تھے، پس آپ کی ملاقات ایک

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرشتے سے ہوئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ ڈاکو ہے چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ لڑائی کی کہ آپ اس کو پچھاڑ دیں تو فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ران پر کچوکا لگایا اور پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اور یعقوب علیہ السلام اس کی طرف دیکھتے رہے تو اس طرح آپ پر عرق النساء کی بیماری غالب آگئی اور اس کے سبب شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئے اور اسی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی بلکہ آپ چیختے ہوئے رات گزارتے تھے۔ تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں شفا عطا فرمادی تو (وہ رگ نہیں کھائیں گے) اور نہ ہی وہ ایسا کھانا کھائیں گے جس میں رگ ہوگی تو انہوں نے اسے اپنے اوپر حرام کرلیا تو اس کے بعد ان کے بیٹے بھی ان کی پیروی کرنے لگے اور وہ گوشت سے رگوں کو نکال دیتے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرشتے کا کچوکا لگانے کا سبب یہ تھا کہ وہ نذر مانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ بیٹے عطا فرمائے اور وہ صحیح سالم بیت المقدس آئے تو وہ ان میں سے آخری کو ذبح کریں گے۔ پس وہ ان کی نذر سے نکلنے کے لئے تھا؛ حضرت ضحاک سے بھی منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ تحریم حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اجتہاد سے تھی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے؟ تو اس میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ فرمایا: اِلَّا مَا حَرَّمَ اور یہ کہ نبی کو جب اس کا اجتہاد کسی حکم تک پہنچا دے تو وہ دین ہوتا ہے اور اس کی اتباع ہمارے اوپر لازم ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس پر پختہ فرما دیتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی اتباع لازم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کو اجازت دی ہوتی ہے اور وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد کا موجب متعین ہو جاتا ہے جب وہ اس پر قادر ہو اور اگر اس کے لئے اس کی تحریم کے بارے پہلے اجازت نہ ہو تو وہ تحلیل و تحریم کی جانب بغیر اجازت کے نہیں بڑھتا۔ ہمارے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح روایت کے مطابق شہد کو حرام کیا(1) یا اپنی کنیز ماریہ کو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریم کی توثیق نہ کی اور یہ ارشاد نازل ہوا لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق ارشاد لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ تقاضا کرتا ہے کہ یہ ماریہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

اور امام شافعی نے یہ رائے بیان کی ہے کہ اس صورت میں کفارہ کا واجب ہونا غیر معقول ہے تو آپ نے اسے محل نص کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ دراصل کفارہ ہر مباح کو حرام قرار دینے کی صورت میں ہے اور آپ نے اسے قسم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء میں مبتلا ہوئے تو حکماء نے آپ کے لئے یہ تجویز کیا کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز کریں چنانچہ آپ نے اسے اپنے آپ پر حرام قرار دیا۔ پھر یہودیوں نے کہا: بلاشبہ ہم اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام

1۔ صحیح بخاری، باب لم تحرم ما احل اللہ لک، حدیث نمبر 4862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرار دیتے ہیں کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے حرام قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریم کا حکم تورات میں نازل فرمایا ہے، تو پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی اور ان کا رد کر دیا اور فرمایا: اے محمد! ﷺ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی وہ نہ لا سکے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ زجاج نے کہا ہے: ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت کے لئے اس آیت میں بہت بڑی دلیل ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ یہ ان کی کتاب میں نہیں ہے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تورات لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ یعنی انہوں نے یہ پہچان لیا کہ آپ ﷺ نے حق کے سبب یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور عطیہ العوفی نے کہا ہے: یہ ان پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے کی وجہ سے حرام ہوا اور وہ یوں کہ حضرت اسرائیل نے اس وقت کہا جب انہیں عرق النساء کا مرض لاحق ہوا: قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے عافیت و صحت عطا فرمائی تو کوئی بچہ اسے (گوشت کو) نہیں کھائے گا۔ حالانکہ وہ ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا۔ اور کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تورات میں ان پر حرام نہیں کیا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا۔ اور بنی اسرائیل جب بڑے بڑے گناہ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ ان پر پاکیزہ اور طیب کھانا حرام کر دیتا یا ان پر عذاب نازل کر دیتا اور وہ موت ہے جیسا کہ اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ الآیہ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لئے) اور ارشاد گرامی ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام) (اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور ... یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں۔)

مسئلہ نمبر 4۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ دوائے عرق النساء ... ہمیں ہشام بن عمار اور راشد بن سعید رملی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مسلم، ہشام بن حسان، انس بن سیرین تمام نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: "عرق النساء کا علاج جنگلی بکری کی دم ہے جسے پگھلا دیا جائے، پھر اسے تین (3) حصوں میں تقسیم کیا جائے، پھر ہر روز ایک جز نہار منہ پیا جائے۔"(1)

اور ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرق النساء کے بارے میں ارشاد فرمایا: "عربی مینڈھے کی دم لی جائے نہ وہ چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت بڑا اور اسے چھوٹا چھوٹا کاٹ لیا جائے اور پھر اس کی چربی پگھلا کر نکال لی جائے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر روز ایک تہائی حصہ نہار منہ پی لیا جائے۔" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سو سے زیادہ افراد کو اس کے بارے بتایا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

1۔ سنن ابن ماجہ، باب دواء عرق النساء، حدیث نمبر 3453، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تندرست ہو گئے۔

حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: حجاج بن یوسف کے زمانے میں عرق النساء کے متعلق ایک شیخ نے مجھے بتایا: میں تجھے عظمت و جلال والے اللہ کی قسم دیتا ہوں اگر تو (اس سے) تندرست نہ ہو تو میں تجھے آگ کے ساتھ داغ دوں گا یا تجھے استرے کے ساتھ چیر دوں گا۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا: تحقیق میں نے اس کا تجربہ کیا تو اسے کہہ اور تو اس جگہ پر اسے پھونک دے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

"آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے اللہ نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے۔"

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ بلاشبہ وہ تورات میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کے دین کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ ان کے باطل دعویٰ کو انتہائی رد کرنا اور لوٹانا ہے جیسے کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۚ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے، بڑا بابرکت اور ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لئے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔ اور اللہ کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک اللہ بے نیاز ہے سارے جہان سے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسجد حرام"۔ میں نے عرض کی: پھر کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ نے فرمایا: "مسجد اقصیٰ"۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چالیس سال۔ پھر ساری زمین تیرے لئے مسجد بنا دی گئی جہاں کہیں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تو تو وہیں نماز پڑھ لے"۔(1)

حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے پہلے کوئی عبادت خانہ نہیں بنایا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت سے پہلے بیوت تو کثیر تھے لیکن یہاں بیت سے مراد وہ ہے جو عبادت کے لئے سب سے

1۔ صحیح بخاری، جلد اول، کتاب الانبیاء، حدیث نمبر 3115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اول بنایا گیا۔

اور حضرت مجاہد نے بیان کیا: مسلمان اور یہودی ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے پس یہودیوں نے کہا: بیت المقدس کعبہ سے افضل اور اعظم ہے، کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا: (نہیں) بلکہ کعبہ معظمہ افضل ہے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور سورۃ البقرہ میں بیت اللہ کی بناوٹ اور سب سے اول جس نے اسے بنایا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کی کسی شے کو تخلیق فرمانے سے دو ہزار برس پہلے اس بیت کی جگہ کو تخلیق فرمایا اور اس کی بنیادیں نیچے والی ساتویں زمین میں ہیں اور جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے، جیسا کہ اسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کو بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں اور اعزاز کا سوال کیا: انہوں نے اللہ تعالیٰ سے (ایسا) حاکم بنانے جو اس کی اتباع کی، کہ وہ انہیں حکومت عطا فرمائے۔ پس وہ انہیں عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملک کی التجا کی کہ آپ کے بعد کسی کے لئے ایسی بادشاہی نہ ہو پس وہ بھی آپ کو عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی جب وہ مسجد بنانے سے فارغ ہوئے کہ جو کوئی اس میں آکر نماز ادا کرے تو وہ اسے گناہوں سے اسی طرح پاک کر دے جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا پس یہ اعزاز بھی انہیں عطا کر دیا گیا۔“ دونوں حدیثوں کے درمیان اشکال ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیان طویل مدت کا فاصلہ ہے اہل تواریخ نے کہا ہے: وہ مدت ہزار برس سے زیادہ ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا جس کی بنیاد ان سے (کسی اور) نے رکھی تھی۔ اور یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس یہ جائز ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس کو تعمیر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ملائکہ نے ہی بیت اللہ کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسے بنایا ہو، یہ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو زمین میں گھر بنانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ کہ وہ اس کا طواف کریں اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے بنایا جو پہلے بنایا جا چکا تھا اور اس کا طواف کیا، پھر ان کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بناوٹ کو مکمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ یہ اِنَّ کی خبر ہے اور اس میں لام برائے تاکید ہے اور بکہ سے مراد وہ خاص جگہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے اور مکہ تو سارا شہر ہے۔ یہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور محمد بن شہاب نے کہا ہے کہ بکہ سے مراد مسجد ہے اور مکہ سے مراد سارا حرم ہے اس میں گھر داخل ہوتے ہیں۔ اور مجاہد

نے کہا ہے: بکّۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ پس اس میں میم کو باء سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: طین لازب و لازم۔ حضرت ضحاک اور مورج نے یہی کہا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ بکّۃ، البک سے مشتق ہے اور اس کا معنی ازدحام اور بھیڑ ہے۔ جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تباک القوم۔ طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور ازدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکہ رکھا گیا ہے۔ اور البک کا معنی ہے دق العنق۔ گردن توڑنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس میں ظلم و زیادتی کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پیس پیس کر دیا۔ اور رہا مکہ تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودا اور مغز کو خشک کر دیتی ہے۔ یہ معنی ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: مککت العظم اذا اخرجت ما فیہ۔ یعنی ہڈیوں میں جو کچھ ہے تو وہ سب نکال لے تب کہتے ہیں مککت العظم (میں نے ہڈی کو خالی کر لیا) اور مك الفصيل ضرع امه وامتكه جب بچھڑا اپنی ماں کے تھن میں موجود سارا دودھ چوس لے اور اسے پی لے تب یہ کہا جاتا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مكت فلم تبق في اجوافها دررا

انہوں نے دودھ چوس لیا اور ان میں کوئی دودھ نہ چھوڑا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اسے ہلاک اور تباہ کر دیتا ہے جو اس میں ظلم و زیادتی کرے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ لوگ اس میں تمسخر کرتے تھے اور ہنستے تھے اور یہ معنی اس ارشاد باری تعالیٰ سے لیا گیا ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً یعنی وہ اس میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور یہ اس کے منصرف ہونے کو ثابت نہیں کرتا کیونکہ مکۃ ثنائی مضاعف ہے۔ اور مکاء ثلاثی معتل ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُبٰرَكًا اسے مبارک بنایا کیونکہ اس میں عمل کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برکت کا معنی کثرۃ الخیر ہے۔ وہ یا لفظ وضع کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا بکّۃ سے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور معنی یہ ہے: الذی استقر ببکۃ مبارکا (یعنی وہ جو مکہ میں قیام پذیر رہا جس میں برکت رکھ دی گئی۔)

اور غیر قرآن میں مبارک پڑھنا بھی جائز ہے یا تو اس لئے کہ یہ خبر ثانی ہے یا اس لئے کہ یہ الذی سے بدل ہے یا اس بنا پر کہ مبتدا مضمر ہے۔ وَهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ اس پر معطوف ہے۔ اور یہ وهو هدى للعالمين کے معنی میں ہوگا۔ اور غیر قرآن میں اسے مبارک جر کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں یہ البیت کی نعت اور صفت ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اسے مبتدا یا صفت ہونے کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اہل مکہ، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ نے آیۃ بینۃ واحد پڑھا ہے۔ یعنی مقام ابراہیم واحد اور ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقام

نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ (الفیل) (کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔)

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: آیت صورۃً تو خبر ہے حالانکہ اس میں معنی امر کا ہے، تقدیر کلام یہ ہے ومن دخله فامنوه (اور جو اس میں داخل ہو جائے تو تم اسے امن اور پناہ دے دو۔) جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (یعنی نہ تم برائی کی باتیں کرو اور نہ فسق کا ارتکاب کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد کرو۔) اسی معنی کی وجہ سے امام سابق حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس کے سبب وہ حد کا مستحق بن گیا پھر اس نے حرم پاک میں پناہ لے لی تو اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے امن اور پناہ کو واجب قرار دیا جو اس میں داخل ہو گیا اور یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر افراد ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے (1): ”ہر وہ جس نے یہ کہا ہے وہ دو اعتبار سے وہم میں مبتلا ہوا ہے۔“ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آیت کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر ہے اور اس سے مستقبل کے حکم کا اثبات مقصود نہیں اور دوسرا یہ ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ امن اور پناہ گزر چکی ہے اور یہ کہ قتل و قتال اس کے بعد اس میں واقع ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبر واقع نہ ہوئی بخلاف اس کے جس کی خبر دی گئی ہے، پس یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: جب وہ حرم میں پناہ لے لے تو اسے نہ کھلایا جائے گا اور نہ پلایا جائے گا، نہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کلام اس سے کی جائے گی یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پس اسے نکلنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ اس کا امن میں ہونا اور محفوظ ہونا صحیح نہ ہوگا۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: حرم پاک میں اعضاء میں قصاص واقع ہو سکتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی امن صحیح نہیں ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ حرم پاک میں حدود قائم کی جا سکتی ہیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثوری نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس کسی نے حرم میں حد کا ارتکاب کیا تو اس پر حرم میں حد قائم کی جائے گی اور اگر حل میں اس کا ارتکاب کیا اور پھر حرم میں پناہ لے لی تو اس سے نہ کلام کی جائے اور نہ خرید و فروخت کی جائے یہاں تک کہ وہ حرم پاک سے نکل آئے تو پھر اس پر حد قائم کی جائے گی اور یہی امام شعبی کا قول ہے اور یہی کوفیوں کی حجت اور دلیل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت کے معنی سے یہی سمجھے ہیں اور وہ حبر الامۃ اور عالم الامۃ ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد یہ نعمتوں کے شمار کرنے کا ارادہ اور قصد کیا گیا ہے جو ان سے جاہل اور ناواقف ہے اور عرب میں ان کے منکر بھی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) (کیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 284

اور یہ اشعار بھی کہے:

یا کعبۃ اللہ دعوۃ اللاجی دعوۃ مستشعر و محتاج

اے کعبہ معظمہ! جو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے پناہ لینے والے کے لئے دعا ہے اور شعار پہننے والے اور محتاج کے لئے جائے دعا ہے۔

ودع احبابہ و مسکنہ فجاء ما بین خائف راجی

اپنے احباب اور اپنے مکینوں کو الوداع کہہ کر پس (ہر کوئی) بیم و رجا کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔

ان یقبل اللہ سعیہ کرما نجا والا فلیس بالناجی

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ اس کی سعی قبول فرمالی تو وہ نجات پا گیا ورنہ کوئی نجات پانے والا نہیں۔

وانت ممن ترجی شفاعتہ فاعطف علی وافد بن حجاج

اور تو ان میں سے ہے جن کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے پس تو وافد بن حجاج پر مہربانی فرما۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو کوئی عمرہ قضا کے سال حضور نبی رحمت ﷺ کی معیت میں اس میں داخل ہوا وہ امان میں آ گیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہے اور یہ آیت شکار کے امان میں ہونے کے بارے ہے اور یہ شاذ ہے اور قرآن کریم میں ہے: فَمِنْهُمْ مَنْ يَمْشِي عَلٰى بَطْنِهِ الآیہ۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وللہ اس میں لام ایجاب والزام کے لئے ہے پھر اسے ارشاد باری تعالیٰ: علی کے ساتھ مؤکد کیا۔ یہ عربوں کے نزدیک الفاظ وجوب کی تاکید لگانے والے حروف میں سے ہے۔ پس جب کوئی عربی یہ کہے: لفلان علی کذا تو تحقیق اس نے اسے مؤکد کر دیا اور اپنے اوپر واجب کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بلیغ ترین الفاظ وجوب کے ساتھ حج کا ذکر کیا اپنے حق کی تاکید لگاتے ہوئے اور اس کی حرمت کی تعظیم کرتے ہوئے۔ اور اس کے فرض ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور یہ ساری عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بیان کی ہے اور اسے حضور نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ حدیث باطل ہے صحیح نہیں ہے اور ان کی وجوہ (اور دلائل) میں اجماع مدافعت کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں حضرت سفیان ثوری نے علاء بن مسیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”رب کریم فرماتا ہے بلاشبہ میں نے اپنے بندے کو صحت اور وافر رزق عطا فرمایا ہے اور اس نے ہر چار سال میں میری طرف محروم کے لئے کوئی

شے نہیں لوٹائی۔" یہ علاء بن مسیب بن رافع کاہلی کوفی کی مشہور حدیث ہے اور آپ محدثین کی اولاد میں سے ہیں۔ اور ان سے کئی ایک نے روایت کیا ہے ان میں سے بعض نے پانچ سال کا ذکر کیا ہے اور بعض نے سنداً اسی طرح بیان کی ہے۔ عن العلاء عن یونس بن خباب عن ابی سعید۔ علاوہ ازیں بھی اس میں اختلاف ہے۔

اور ملاحدہ نے حج کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: چونکہ اس میں کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور یہ حیاء کے خلاف ہے اور سعی کرنا ہے اور یہ وقار کو ختم کر دیتی ہے اور بلا مقصد کنکریاں مارنا خلاف عقل ہے۔ پس انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حج کے یہ تمام افعال باطل ہیں، کیونکہ وہ ان کی حکمت اور علت کو نہیں پہچان سکے اور وہ اس سے جاہل ہیں کہ مولیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسے ان تمام افعال کا مقصود اور مدعا بھی سمجھائے گا جس کا وہ اسے حکم دے گا اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بندہ ہر اس فعل کے فائدہ سے آگاہ ہو جس کا وہ مکلف ہے، بلکہ اس پر تو اطاعت کرنا متعین ہو جاتا ہے اور فائدہ کا مطالبہ اور مقصود کے بارے سوال کئے بغیر پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے تھے:

لبیک حقا حقا تعبدا ورقا لبیک الٰہ الحق۔ (1)

اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: ایها الناس قد فرض الله علیکم الحج فحجوا (اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو) تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہر سال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم (اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یقیناً وہ (ہر سال) واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھتے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم مجھے اس (شے) کے بارے چھوڑ دو جو میں تمہارے لئے چھوڑ دوں کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف رکھنے کے سبب ہی ہلاک اور برباد ہوئے ہیں۔ پس جب میں تمہیں کسی شے کے بارے میں حکم دوں تو تم اسے بجا لاؤ جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور جب میں تمہیں کسی شے سے منع کر دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔" یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس حدیث نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ جب خطاب مکلفین پر کسی شے کی فرضیت کے بارے ان کی طرف متوجہ ہو تو اسے ایک بار کرنا ہی کافی ہوتا ہے اور وہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ استاذ ابو اسحاق الاسفرائینی وغیرہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے اصحاب نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا حج ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔" اور یہ ان کے رد کے بارے میں نص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے۔ (حج) ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے، حالانکہ حج عربوں کے نزدیک معلوم اور ان میں مشہور تھا اور یہ ان اعمال میں سے تھا جن میں وہ اپنی مسکینی اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری اور اپنے دین ابراہیمی پر قائم رہنے میں رغبت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ پس جب دین اسلام آیا تو انہیں اس کے بارے خطاب کیا گیا جسے وہ جانتے تھے اور وہ شے ان پر لازم کی گئی

1۔ ابن ماجہ، کتاب الحج، حدیث نمبر 2910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گئے وہ پہچانے تھے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرض حج سے پہلے حج ادا فرمایا (1) اور آپ ﷺ نے عرفات میں وقوف کیا اور آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور دین میں کوئی تبدیلی نہ کی جسے انہوں نے تبدیل کر لیا تھا جس وقت قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے: ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے نہیں نکلیں گے اور ہم مذہب میں بڑے سخت ہیں جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو میں جانتا ہوں اس میں عجیب تر یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ہجرت سے پہلے دو بار حج ادا فرمایا اور آپ سے اس کے سبب فرض ساقط ہو گیا، کیونکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا پر لبیک کہی جب انہیں یہ کہا گیا: وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (آپ لوگوں میں حج کے بارے اعلان کر دیں۔)

الکیا الطبری نے کہا ہے: یہ بعید ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ کی شریعت میں یہ موجود ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ یعنی آپ کی شریعت میں حکم خطاب کے ساتھ آپ پر اس کا واجب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب انہیں کیا ہے جنہوں نے حج ادا نہیں کیا، یہ ایسا فیصلہ اور تخصیص ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ اس پر حج واجب نہ ہو جس نے دین ابراہیمی کے مطابق حج کر لیا، اور یہ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کتاب وسنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے نہ کہ علی الفور۔ یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے جو ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمہم اللہ کا قول ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور متاخرین، لیکن میں سے بعض اہل بغداد نے یہ کہا ہے کہ اس کی ادائیگی علی الفور واجب ہوتی ہے اور اس پر قدرت رکھتے ہوئے اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ سورۃ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا (الحج: 27) (اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ) اور سورۃ حج مکیہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ۔ اور یہ سورۃ غزوہ احد کے سال 3ھ میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے 10ھ تک حج ادا نہیں فرمایا۔

رہی سنت تو ضمام بن ثعلبہ سعدی کی حدیث ہے جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھے وہ حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اسلام کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے کلمہ شہادت، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کا ذکر فرمایا۔ اسے حضرت ابن عباس (2)، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور ان تمام میں حج کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ فرض قرار دیا گیا ہے، اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اپنے سیاق کے اعتبار سے احسن اور اتم ہے۔ اور اس کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے، سو بعض نے کہا ہے 5ھ، بعض نے کہا ہے 7ھ اور بعض نے کہا ہے اس کا وقت 9ھ ہے اور ابن ہشام

1۔ ابن ماجہ، باب حجۃ رسول اللہ ﷺ، حدیث نمبر 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ماجاء فی العلم وقولہ تعالیٰ رب زدنی علما، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے تو ہم نے اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا کہ غلامی کی حالت میں اس کے حج کو حجۃ الاسلام شمار نہ کیا جائے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس کسی بچے نے حج کیا پھر اس نے حج کی استطاعت پائی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی غلام نے حج کیا پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے۔" ابن عربی نے کہا ہے: "ہمارے بعض علماء نے نرمی سے کام لیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ غلام پر حج ثابت (لازم) نہیں اگرچہ آقا اسے اجازت دے دے کیونکہ وہ فی الاصل کافر تھا اور کافر کا حج کسی شمار میں نہیں اور پھر جب اس پر غلامی کی ضرب بطور سزا کے لگا دی گئی تو وہ حکم حج کا مخاطب نہ رہا۔

یہ تین وجوہ سے فاسد ہے پس تم انہیں جان لو۔

(۱) بلاشبہ اہل حرب کفار فروعات شریعہ کے مخاطب ہیں اور اس بارے میں امام مالک کے قول میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) تمام عبادات نماز، روزہ وغیرہ اس پر لازم ہوتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ غلام ہے اور اگر وہ یہ فعل اپنی حالت کفر میں کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حج بھی انہیں کی مثل ہے۔

(۳) یہ کہ کفر اسلام کے سبب ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کا ختم ہونا بھی ثابت ہے۔ پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں معتمد علیہ آقا کے حقوق کا مقدم ہونا ہے۔ واللہ الموفق۔"

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: **مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا** "من" محل جر میں بدل بعض من الکل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے، یہ اکثر نحویوں کا قول ہے۔

اور کسائی نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ من حج البیت کے سبب محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ان یحج البیت من۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرط ہے اور استطاع محل جزم میں ہے اور جواب شرط محذوف ہے یعنی من استطاع الیہ سبیلا فعلیہ الحج۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: عرض کی گئی: یا رسول اللہ ﷺ! کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں بلکہ صرف ایک بار حج کرنا فرض ہے۔" پھر عرض کی گئی: یہ سبیل کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "زاد راہ اور سواری" اور انہوں نے اسے حضرت انس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم سے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قولہ تعالیٰ: **وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا** بیان فرمایا کہ اس کے بارے پوچھا گیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "تو اونٹ کی پشت پائے۔"

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ اپنی جامع میں ذکر کی ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ آدمی جب زاد

راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج واجب ہے۔ اور ابراہیم بن یزید خوزی مکی کی قوت حفظ کے بارے میں بعض اہل حدیث نے کلام کیا ہے (1) اور ان دونوں نے اسے وکیع سے اور دار قطنی نے سفیان بن سعید سے اسے نقل کیا ہے۔۔۔۔ اور انہوں نے کہا کہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کون سی شے حج کو واجب کر دیتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زاد راہ اور سواری پر قدرت“ عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم حاجی کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غبار آلود بالوں والا جس نے خوشبو کا استعمال ترک کر دیا ہو۔“ اور پھر ایک دوسرا کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم حج کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: العج والثج۔ وکیع نے کہا ہے: العج سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور الثج سے مراد قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے۔ یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ زاد راہ اور سواری پر قادر ہونا حج واجب ہونے کے لئے شرط ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطا اور حضرت مجاہد رحمہم اللہ ہیں۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی، حضرت ثوری، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت عبد العزیز بن ابی سلمہ اور حضرت ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنایا ہے اور اسی کی مثل عبدوس نے سحنون سے ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: استطاعت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کے ساتھ قدرت رکھتا ہو اور وہ اتنا مال پاتا ہو جو اسے حج کے لئے پہنچا سکے گا۔ اور دوسری یہ ہے کہ وہ اپنے بدن میں کمزور ہو اور وہ اپنی سواری پر ثابت نہ رہ سکتا ہو اور وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی اطاعت و پیروی کرتا ہو (اس میں کہ) جب وہ اسے حکم دے کہ وہ اس کی جانب سے اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے حج کرے۔ (یعنی اپنی جانب سے کسی دوسرے کو حج پر بھیج سکتا ہو)

جیسا کہ اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ وہ جو اپنے بدن کے ساتھ استطاعت اور قدرت رکھتا ہے تو اس پر کتاب اللہ کے اس ارشاد کے ساتھ فَمَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا حج فرض لازم ہوتا ہے اور وہ جو استطاعت بالمال رکھتا ہے تو اس پر سنت کے مطابق حج فرض لازم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث خثعمیہ آگے آ رہی ہے۔

اور مستطیع بنفسہ سے مراد وہ قوی اور طاقتور آدمی ہے جسے سواری پر سوار ہونے کی مشقت کے بغیر کوئی مشقت لاحق نہ ہو کیونکہ یہ قوی جب زاد راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس کی ذات پر فرض حج لازم ہوتا ہے اور جب زاد راہ اور سواری دونوں کے نہ ہونے یا ان میں سے ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے پس اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہو تو وہ زاد راہ پائے یا راستے میں زاد راہ کمانے پر قادر ہو اپنے کاروبار اور پیشہ سے مثلاً کھینچنے اور سینگی لگانا اور حجامۃ (پچھنا) یا اس طرح کا کوئی کام تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پیدل حج کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ امام شافعی نے کہا ہے: مرد عورت کے مقابلہ میں کم معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ زیادہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اور یہ حکم ان کے نزدیک بطریق

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما یوجب الحج، حدیث نمبر 2885، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استحباب ہے جبکہ بطریق وجوب بھی اگر وہ راستے میں لوگوں سے مانگنے کے سبب زاد راہ پر قادر ہو تو اس کے لئے حج کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بوجھ اور بھاری ہو جائے گا۔

اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ چلنے پر قادر ہو اور زاد راہ پالے تو اس پر حج کرنا فرض ہے اور اگر وہ سواری کا مالک نہ ہو البتہ وہ راستے میں چلنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ زاد راہ کا مالک ہو تو اس پر فرض حج کی ادائیگی واجب ہے اور اگر وہ زاد راہ کا مالک نہ ہو لیکن وہ راستے میں اپنی حاجت کے مطابق کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے بھی غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ ایسے اہل مروت میں سے ہو جو بذات خود کمائی نہیں کر سکتے تو اس پر واجب نہ ہوگا اور اگر وہ ان میں سے ہو جو تجارت یا کسی کاروبار کے ذریعہ اپنی کفایت اور ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس پر فرض حج لازم ہے اور اسی طرح اگر اس کی عادت لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اس پر بھی فرض حج لازم ہے۔

اور اسی طرح امام مالک نے چلنے کی طاقت رکھنے والے پر حج کو واجب کیا ہے اگرچہ اس کے ساتھ زاد راہ اور سواری نہ بھی ہو۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اگر وہ جوان، طاقتور اور صحت مند ہو اور اس کا مال نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کھانے کے عوض اپنے آپ کو اجرت پر دے دے یا اپنے کسی ساتھی کو یہاں تک کہ وہ اپنا حج پورا کرلے۔

تو حضرت مقاتل نے انہیں کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل چل کر آئیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر ان میں سے کسی کی مکہ مکرمہ میں میراث ہو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بلکہ وہ تو اس کی طرف چلے گا اگرچہ سرین کے بل گھسٹ کر ہی آنا پڑے، پس اسی طرح اس پر حج بھی واجب ہوگا۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا اس میں رجالا بمعنی مشاۃ ہے یعنی پیدل چلتے ہوئے۔

انہوں نے کہا ہے: کیونکہ فرائض اعیان میں سے حج عبادات بدنیہ میں سے ہے لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرائط میں سے زاد راہ اور نہ ہی سواری ہو جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔

انہوں نے کہا: اگر زاد راہ اور سواری کے بارے خوزی کی حدیث صحیح ہے تو ہم نے اسے عوام الناس پر محمول کیا ہے اور ان میں سے اکثر وہ دور کے علاقوں میں رہنے والے ہیں۔ اور مطلق کلام کو غالب احوال پر محمول کرنا شریعت میں بہت زیادہ ہے اور کلام عرب اور اس کے اشعار میں وافر ہے۔

ابن وہب، ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں لوگ اپنی طاقت، اپنی سہولت اور اپنی مضبوطی کی مقدار پر ہیں۔ اشہب نے مالک کو کہا: کیا وہ زاد راہ اور سواری ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں قسم بخدا وہ نہیں ہے مگر لوگوں کی طاقت کی مقدار پر، کبھی آدمی زاد راہ اور سواری پاتا ہے لیکن وہ چلنے پر قدرت نہیں رکھتا اور دوسرا پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب استطاعت پائی جائے اور حج کا فرض متوجہ ہو تو کبھی ایسا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جو حج سے روک

دیتا ہے مثلاً قرض خواہ اسے نکلنے سے روک دے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کر دے۔ اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کے بچے ہوں اس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس پر حج لازم نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے لئے اتنا نفقہ ہو جو اس کے جانے سے لے کر واپس لوٹنے تک غائب رہنے کی مدت کے لئے کافی ہو، کیونکہ اہل و عیال کا یہ خرچہ تو علی الفور فرض ہے اور حج علی التراخی فرض ہے، پس عجلت والے کو مقدم کرنا اولیٰ ہے اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آدمی کے لئے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔" اور اسی طرح والدین ہیں آدمی ان پر ہلاکت اور مصیبت لانے اور ان کی مہربانیوں اور شفقتوں کا عوض اور بدلہ نہ دینے سے خوفزدہ رہتا ہے، پس اس کے لئے حج کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر وہ اسے شوق و محبت اور وحشت کی وجہ سے روک لیں تو اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

اور عورت کو اس کا خاوند روک سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ روکنا جائز ہے، بالخصوص جب ہم نے یہ کہا ہے کہ حج علی الفور لازم نہیں ہوتا۔ اور سمندر اس کے وجوب کے مانع نہیں ہوتا جبکہ غالب گمان سلامتی کا ہو جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ جانتا ہو کہ اس کا سر نہیں چکرائے گا۔ اور اگر اس پر غالب گمان ہلاکت یا سر چکرانے کا ہو یہاں تک کہ وہ نماز بھی معطل کر دے تو پھر نہیں۔ اور اگر وہ سواروں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کے سبب سجدہ کرنے کی جگہ نہ پائے تو امام مالک نے کہا ہے: جب وہ رکوع و سجود کی استطاعت نہ رکھے مگر اپنے بھائی کی پشت پر تو پھر وہ اس پر سوار نہ ہوگا۔ پھر کہا: کیا وہ وہاں سوار ہو سکتا ہے جہاں وہ نماز نہ پڑھ سکے؟ اس کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے جو نماز کو ترک کر دے۔ اور حج ساقط ہو جاتا ہے جب راستے میں ایسا دشمن ہو جو جانوں کو ضائع کرنے کا سبب ہو یا سوال کر لوٹتا ہو جبکہ وہ کسی مخصوص دشمنی کے ساتھ دھمکائے یا وہ کسی برباد اور ہلاک کرنے والی مقدار کے ساتھ دھمکائے اور اگر دشمنی ہلاک و برباد کرنے کی نہ ہو تو حج کے ساقط ہونے میں اختلاف ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا اور حج کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور مانگنے والے پر حج واجب ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی عادت ہو اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پائے گا جو اسے عطا کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر واجب نہ ہوگا اس بنا پر کہ اس میں استطاعت کی رعایت لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب موانع زائل ہو جائیں اور اس کے پاس دراہم و دنانیر میں سے ایسی کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو اور اس کے پاس سامان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لئے اپنے سامان میں سے وہ بیچ دے جو اس حال میں بیچا جا سکتا ہے جب اس پر دین اور قرض ہو۔ اور ابن القاسم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مشکیزہ ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ نہ ہو، کیا وہ حج اسلام کے لئے اسے بیچ دے گا اور اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا اور آتا تھا لیکن ان کے لئے کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ اس پر ہے اور وہ اپنی اولاد کو صدقہ میں چھوڑ دے گا۔ لیکن صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "آدمی کے لئے گناہ کے اعتبار سے یہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کر دے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔" اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے مذہب سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حج لازم نہیں ہوتا مگر

اس کے لئے جس کے پاس اتنے اخراجات موجود ہوں جو جانے سے لے کر لوٹنے تک کافی ہوں۔ آپ نے یہ الاملاء میں کہا ہے: اگرچہ اس کے اہل وعیال نہ ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: رجوع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر اپنے شہر کے قیام کو ترک کرنے میں کوئی بڑی مشقت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ اس کے اہل ہیں اور نہ کوئی عیال اور ہر شہر (ملک) اس کے لئے وطن ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ انسان اپنے وطن سے جدائی کے سبب اسی طرح وحشت سی محسوس کرتا ہے جس طرح وہ اپنے گھر والوں کے فراق میں مضطرب رہتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ باکرہ عورت جب زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اسے اس کے شہر سے جلا وطن کر دیا جاتا ہے چاہے وہاں اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

امام شافعی نے "الام" میں کہا ہے: جب آدمی کا گھر اور خادم ہو اور اس کے پاس اپنے گھر والوں کے لئے اتنا خرچہ موجود ہو جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کافی ہو جائے تو اس پر حج لازم ہوگا۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ اعتبار کیا ہے کہ حج کا مال خادم اور گھر سے فالتو اور زائد ہو، کیونکہ آپ نے اسے گھر والوں کے نفقہ پر مقدم کیا ہے، گویا کہ آپ نے کہا ہے: ان تمام کے بعد (اس کے پاس حج کا مال ہو)۔

اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس پر لازم ہے کہ گھر اور خادم فروخت کر دے اور اپنے گھر والوں کے لئے گھر اور خادم کرائے پر لے اور اگر اس کے پاس ایسا سامان ہو جس کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہو اور اس کا نفع علی الدوام اس کی ذاتی اور اہل وعیال کی کفایت کی مقدار ہو اور جب وہ اصل مال سے کچھ خرچ کر دے تو اس کا نفع مختل ہو جائے اور وہ اس کی حاجت و ضرورت کے لئے کافی نہ ہو تو کیا اصل مال سے اس پر حج لازم ہوگا یا نہیں؟

اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح اور مشہور ہے، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اس کی زمین ہو اس کا غلہ اسے کافی ہو رہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حج میں اصل زمین فروخت کر دے، پس اسی طرح سامان بھی ہے اور ابن شریح نے کہا ہے: وہ اس پر لازم نہ ہوگا اور وہ سامان کو باقی رکھے گا اور اس کے اصل سے حج نہیں کرے گا، کیونکہ اس پر حج اس مال سے واجب ہوتا ہے جو اس کی کفایت اور حاجت سے فالتو ہو۔ پس یہ گفتگو استطاعت بالبدن والمال کے بارے میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مریض اور معضوب (جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو) اور العضب کا معنی کاٹنا ہے اور اسی سے تلوار کا نام عضب رکھا گیا ہے گویا کہ جو اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ وہ سواری کو مضبوطی سے تھامنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اس پر مضبوطی سے بیٹھ سکتا ہو تو وہ اسی کی طرح ہے جس کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں، کیونکہ وہ کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ علماء نے ان دونوں کے حکم میں اختلاف کیا ہے اس اجماع کے بعد کہ حج کے لئے چلنا ان دونوں پر لازم نہیں، کیونکہ حج اللہ تعالیٰ نے قدرت رکھنے والے پر فرض کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور مریض اور معضوب دونوں میں استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: جب آدمی معضوب ہو تو اس سے حج کا فریضہ بالکل ساقط ہو جاتا ہے، چاہے وہ اس پر قادر ہو کہ جو اس کی طرف سے مال کے عوض یا بغیر مال کے حج کر سکتا ہو اس پر حج فرض لازم نہ ہوگا۔ اور اگر اس پر حج واجب ہو گیا پھر اس کا

کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور وہ اپاہج ہو گیا تو اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور یہ جائز نہ ہوگا کہ اس کی زندگی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی اس کی طرف سے حج کرے، بلکہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جائے اور اس کے ترکہ کے تیسرے حصہ سے حج کیا جائے تو یہ نفل ہوگا۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ پس اس میں یہ خبر ہے کہ اس کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس نے خود کوشش کی۔

پس جس نے کہا ہے: اس کے لئے اس کے سوا کسی اور نے سعی کی ہے تو اس نے ظاہر آیت کا خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے مطابق یہ استطاعت رکھنے والا نہیں ہے۔ کیونکہ حج سے مراد مکلف آدمی کا بذات خود بیت اللہ شریف کا قصد کرنا ہے۔ کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور اس سے عاجز ہونے کے ساتھ اس میں نیابت درست نہیں جیسا کہ نماز میں (نیابت درست نہیں ہوتی)۔ اور محمد بن منکدر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ایک حج کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا (ایک) مرنے والے کو (دوسرا) اس کی طرف سے حج کرنے والے کو اور (تیسرا) اسے بھیجنے والے کو" اسے ابو القاسم سلیمان بن احمد نے بیان کیا ہے اور اسی طرح سند بیان کی ہے حدثنا عمرو بن حصین السدوسی قال حدثنا ابو معشر عن محمد بن المنکدر۔ اور آگے انہوں نے اسے بیان کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو معشر کا نام نجیح ہے اور وہ ان کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اپاہج مریض وہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو اور شیخ کبیر جو ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی بات مانے اور پیروی کرنے کے لئے تیار ہو جب وہ اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دے تو وہ بھی من وجہ استطاعت رکھنے والا ہے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اتنے مال پر قادر ہو کہ وہ اس کے عوض ایسے آدمی کو اجرت پر لے سکے جو اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ وہ اس پر حج کا فریضہ لازم کر رہا ہے۔ اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے شیخ کبیر (انتہائی بوڑھا آدمی) کو فرمایا جو حج نہ کر سکے وہ ایک آدمی کو تیار کرے جو اس کی طرف سے حج کرے گا اور یہی موقف ثوری، امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، ابن مبارک، احمد اور اسحاق نے اختیار کیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو طاعت و نیابت اس کے لئے پیش کرے اور وہ اس کی طرف سے حج کرے۔ پس امام شافعی، احمد اور ابن راہویہ کے نزدیک اس پر بھی حج لازم ہوگا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: صرف طاعت و پیروی پیش کرنے کے ساتھ کسی حال میں حج لازم نہیں ہوگا۔

امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ بنی خثعم کی ایک عورت نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بلاشبہ حج اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر فرض ہے، میں نے اپنے باپ کو انتہائی بوڑھا پایا ہے، وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ

بالاجماع اس سے ابتدا ہوتی ہے کیونکہ یہ بندہ کی تقصیر ہے اور اللہ تعالیٰ مستحق ہے۔

ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک خثعمیہ کی حدیث اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں اضطراب ہے۔ اور ابن وہب اور ابو مصعب نے کہا ہے: یہ صرف اولاد کے حق میں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ ایسے بوڑھے کے بارے میں ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہ ہو اور وہ حج نہ کر سکے۔ حج کی رخصت کے لیے ہے اور اس آدمی کے بارے میں رخصت ہے جو فوت ہو گیا اور وہ حج نہ کر سکا کہ اس کی طرف سے اس کا بیٹا حج کرے اگرچہ وہ اس بارے میں وصیت نہ بھی کرے اور یہ اس کی طرف سے جائز ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اس میں یہ منصوص ہے اور اس کے نام میں اس کے بارے کلام ہے۔ اور خثعمیہ کی حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے اور یہ حسن کے اس قول کی تردید کرتی ہے کہ عورت کا مردوں کی جانب سے حج کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب مکلف کے پاس ایسی زاد راہ نہ ہو جسے وہ راستے میں استعمال کرے تو اس پر حج لازم نہیں۔ اور اگر اسے کوئی اجنبی ایسا مال ہبہ کرے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو تو اسے قبول کرنا بالاجماع اس پر لازم نہیں کیونکہ اس میں احسان کا احساس اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی آدمی نے اپنے باپ کو مال ہبہ کیا تو امام شافعی نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ آدمی کا بیٹا اس کی اپنی کمائی ہے، اس میں اس پر کوئی احسان نہیں ہے۔

اور امام مالک اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس پر لازم نہیں ہے کیونکہ اس میں حرمت ابوت کا ساقط ہونا ہے، جب کہ یہ کہا جاتا ہے قد جزاہ و قد وفاہ تحقیق اس نے اسے جزا دی اور اس نے اس کے ساتھ وفا کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ حضرت ابن عباس، حسن وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کوئی فرض حج کا انکار کرے اور وہ اسے واجب نہ جانے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: بے شک وہ جس نے حج کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے ترک کر دیا تو وہ کافر ہے۔

اور ترمذی نے حارث سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جو آدمی مالک ہو زاد راہ کا اور ایسی سواری کا جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر (کوئی حرج) نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اور وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا" ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اس سند کے سوا نہیں پہچانتے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول راوی ہے اور حارث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے(1)۔ اور اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور عبد خیر بن یزید نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: "اے لوگو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں پر

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج، حدیث 740، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حج فرض کیا ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جس نے نہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ جس حال پر چاہے مر جائے اگر چاہے تو وہ یہودی یا نصرانی ہو یا مجوسی مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو بیمار ہو یا جابر سلطان (کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو)۔ خبردار! جو ایسا ہو اس کے لئے میری شفاعت میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے حج تک پہنچا سکتا ہو اور اس نے حج نہ کیا یا اس کے پاس اتنا مال ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی تو وہ موت کے وقت رجعت (واپسی) کا سوال کرے گا" تو کہا گیا: اے ابن عباس! بے شک ہم تو اسے کافروں کے لئے دیکھتے رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے تم پر قرآن کریم پڑھتا ہوں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (9) (المنافقون) (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔ اور خرچ کرو اس رزق سے جو ہم نے تمہیں دیا اس سے پیشتر کہ آجائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تا کہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔)

حسن بن صالح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: یعنی میں زکوٰۃ دوں گا اور میں حج کروں گا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کسی آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: من حج لا یرجو ثوابا او جلس لا یخاف عقابا فقد کفر به (جس نے حج کیا اور ثواب کی امید نہ رکھی یا بیٹھا رہا اور سزا کا خوف نہ رکھا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا۔)

اور حضرت قتادہ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں لوگوں کو شہروں کی طرف بھیجوں اور وہ ایسے آدمی پر نظر رکھیں جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا پس وہ اس پر جزیہ لگا دیں، یہی اس کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا ہو تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المنافقون، حدیث 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

"آپ فرمائیے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ آپ فرمائیے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔"

قولہ تعالیٰ: قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی (اے اہل کتاب!) تم کیوں کر اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیرتے ہو۔ مَنْ اٰمَنَ (اسے جو ایمان لا چکا) حسن نے تُصِدُّوْنَ تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ قراءت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (یعنی) صدّ اور اَصَدَّ مثلاً صَلَّ اللحمُ اور اَصَلَّ جب گوشت بدبودار ہو جائے، اور خَنِمَ اور اَخْنَمَ بھی ہے جب تغیر اور تبدیلی آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم اس کے لئے چاہتے ہو (یعنی تَبْغُوْنَهَا بمعنی تطلبون لھا ہے) پھر اس سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ وَاِذَا كَالُوْهُمْ میں کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغیت له كذا یعنی طلبته میں نے اسے طلب کیا ہے۔ اور ابغیته کذا یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ اور العوج کا معنی جھکاؤ اور ٹیڑھا ہونا ہے: دین میں، قول میں اور عمل میں اور ہر وہ جو سیدھے راستے سے نکل جائے۔ (یہ معنی تب ہے جب عین مکسور ہو) اور اگر عین مفتوح ہو تو پھر معنی ہے دیوار کا ٹیڑھا ہونا اور ہر کھڑے ہونے والے شخص کا ٹیڑھا ہونا۔ یہ ابو عبیدہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ کا معنی ہے وہ اس کی دعوت سے ٹیڑھا ہونے کی قدرت نہیں رکھتے اور صاحب ذکر عوجہ کا معنی ہے (سیدھا) کھڑا ہوا اور ٹھہرا۔ اور العاج ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں۔

شاعر کا قول ہے:

هل انتم عائجون بنا لعنا   نرى العرصات او اثر الخيام

اس میں عائجون ٹھہرنے والے کے معنی میں ہے۔

اور الرجل الاعوج کا معنی ہے بد اخلاق آدمی اور وہ جس کا ٹیڑھا پن واضح اور ظاہر ہو اور الاعوج من الخیل سے مراد وہ گھوڑا ہے جس کی ٹانگوں میں ٹیڑھا پن اور دوری ہو۔ اور اعوجیۃ من الخیل کی نسبت ایسے گھوڑے کی طرف کی جاتی ہے جو زمانہ جاہلیت میں (تیز رفتار ہو) اور دوسروں پر سبقت لے جانے والا ہوتا۔

اور کہا جاتا ہے: فرس مُعَنْتَب یعنی جب گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بغیر پھیلاؤ کے دوری ہو اور یہ مدح اور تعریف ہے اور کہا جاتا ہے: العنتب یعنی دونوں پنڈلیوں میں ٹیڑھا پن ہونا۔ خلیل نے کہا ہے: انشنب بمعنی شدت (اور قوت) سے متصف ہے اور یہ اعوجاج (ٹیڑھا پن) نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ یعنی حالانکہ تم عقلمند ہو (اور سمجھ بوجھ رکھتے ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے: حالانکہ تم تورات میں ا[illegible]

لکھے ہوئے ہو گواہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین جس کے بغیر کوئی دین قبول نہ کیا جائے گا وہ اسلام ہے، کیونکہ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نعت (اور اوصاف کا بیان) ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝

"اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ لوٹا دیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافر (بنا کر)۔"

یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اوس اور خزرج کے درمیان اس فتنہ کو دوبارہ بھڑکانے کا ارادہ کیا جو ایک بار حضور نبی کریم ﷺ کے سبب سے ختم ہو چکا تھا۔ پس وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا اور انہیں شعر سنانے لگا جو دونوں قبیلوں میں سے ایک نے اپنی جنگ کے بارے کہے تو دوسرے قبیلے نے کہا: تحقیق ہمارے شاعر نے فلاں فلاں دن کہا، تو گویا ان کے دلوں میں اختلاف اور شدت داخل ہو گئی تو انہوں نے کہا: آؤ ہم جنگ کو پھر سے اسی طرح شروع کریں جس طرح چل رہی تھی۔ تو انہوں نے آواز دی: ہائے اوس، ہائے اوس۔ اور دوسروں نے پکارا: ہائے آل خزرج، پس وہ اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھائے اور لڑنے کے لئے صفیں باندھ لیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان آ کر کھڑے ہو گئے اور بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔ پس جب انہوں نے آپ ﷺ کی آواز سنی تو وہ آپ کے لئے خاموش ہو گئے اور توجہ سے سننے لگے اور جب آپ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہتھیار پھینک دیئے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے اور رونے لگے؛ یہ حضرت عکرمہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور جس نے ایسا کیا وہ شاس بن قیس یہودی تھا، اس نے اوس اور خزرج کے خلاف سازش کی اور انہیں وہ جنگیں یاد دلانے لگا جو ان کے درمیان واقع ہوئی تھیں اور حضور نبی مکرم ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور آپ نے انہیں نصیحت فرمائی تو قوم نے پہچان لیا کہ یہ شیطان کا مکر و فریب اور ان کے دشمن کا مکر ہے۔ پس انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں وہ سنتے ہوئے اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مراد اوس و خزرج ہیں۔ اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یعنی شاس اور اس کے ساتھی (اگر تم کہا مانو گے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا) يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ لوٹا دیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافر (بنا کر)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کوئی ہماری طرف آنے والا نہ تھا جو ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، پس آپ نے ہماری طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ہم رک گئے (باز آ گئے) اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملات کی اصلاح فرما دی۔ پس ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ کوئی شخص نہ تھا جو ہم نے

ابن جریج نے کہا ہے: يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: أعصم به واعتصم اور تمسك و استمسك جب وہ اس کے ساتھ چمٹ جائے اور غیر کو چھوڑ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور اعتصمت فلانا (یعنی) میں نے اس کے لیے وہ تیار کیا جسے وہ مضبوطی سے پکڑ سکتا ہے اور ہر وہ جو کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو وہ معصم اور معتصم ہے، اور جو کسی شے کو روکنے والا ہو تو وہ عاصم کہلاتا ہے۔

جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

أنا ابن العاصمين بني تميم إذا ما أعظم الحدثان نابا

اس میں عاصمین (روکنے والے) کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

يظل من خوفه الملاح معتصما بالخيزرانة بعد الأين والنجد

اس میں معتصم مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فأشرط فيها نفسه وهو معصم وألقى بأسباب له وتوكلا

پس اس نے اس میں اپنی جان کو پیش کر دیا حالانکہ وہ اسے روکنے اور بچانے والا تھا اور اس نے اسباب (وسائل) پھینک دیئے اور توکل اپنا لیا۔

اور عصمه الطعام: یعنی کھانے نے اس سے بھوک کو دور کر دیا۔ عرب کہتے ہیں: عصم فلانا الطعام ای منعه من الجوع۔ پس اسی لیے انہوں نے سویق (ستو) کی کنیت ابو عاصم رکھی ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: عرب روٹی کو عاصم اور جابر کا نام دیتے ہیں۔

جیسا کہ شعر میں ہے:

فلا تلوميني ولومي جابرا فجابر كلفني الهواجرا

پس تو مجھے ملامت نہ کر بلکہ تو روٹی کو ملامت کر پس روٹی نے ہی مجھے دوپہر کے وقت مشقت میں ڈال رکھا ہے۔

اور وہ اسے عامر کا نام بھی دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا:

أبو مالك يعتادني بالظهائر يجيء فيلقي رحله عند عامر

بھوک کو دوپہر کے وقت میرے پاس آنے کی عادت ہے وہ آتی ہے اور روٹی کے پاس اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہے۔

ابو مالک بھوک کی کنیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

"اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔"

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

امام بخاری (نحاس) نے مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حق تقاتہ ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی وان یشکر فلا یکفر (1) (حق تقاتہ کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اسے بھلایا نہ جائے اور شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اس پر کون قادر ہو گا؟ اور یہ ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔) تو اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، یہ حضرت قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد گرامی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس آیت کا بیان ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ نسخ تب ہوتا ہے جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو اور جمع کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ نہیں ہے البتہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم (ملامت کرنے والے کی ملامت) کی پرواہ نہ ہو۔ اور تم عدل و انصاف کو قائم کرو اگرچہ وہ تمہاری ذاتوں اور تمہارے بیٹوں کے خلاف ہی ہو۔

نحاس نے کہا ہے: جب بھی آیت میں مسلمانوں پر کسی واجب کا ذکر کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں تو اس میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

"اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی (وہ) نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے

1۔ ناسخ و منسوخ للنحاس، صفحہ 299، تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 537

معاویہ نے ہجری (مراد ابراہیم بن مسلم الہجری ہے) سے، انہوں نے ابوالاحوص سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ یہ قرآن ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔"

اور بقی بن مخلد نے اسی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: حدثنا یحییٰ بن عبد الحمید حدثنا ھشیم عن العوام بن حوشب عن الشعبی عن عبداللہ بن مسعود وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا فرمایا: حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

اور آپ سے اور کئی دوسروں سے بھی کئی وجوہ سے مروی ہے اور تمام کا معنی باہم متقارب اور ایک دوسرے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ الفت و محبت کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور فرقت و جدائی سے منع فرما رہا ہے، کیونکہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت اتفاق (باعث) نجات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے۔

اس نے کہا:

ان الجماعة حبل الله فاعتصموا منه بعروته الوثقى لمن دانا

اس میں حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

مسئلہ نمبر2۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَفَرَّقُوْا یعنی تم اپنے دین میں جدا جدا نہ ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے ادیان میں جدا جدا ہو گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ مختلف اغراض اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے جدا جدا نہ ہو جاؤ، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلہ میں بھائی بھائی ہو جاؤ تو وہ ان کے لئے باہمی قطع تعلقی اور باہمی عداوت و دشمنی سے رکاوٹ اور رد کے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا مابعد ارشاد گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے: وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

اور اس میں فروعات میں اختلاف کے حرام ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ وہ کوئی اختلاف نہیں، بلکہ اختلاف وہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا متعذر ہو اور رہا مسائل اجتہادیہ کا حکم تو ان میں اختلاف فرائض اور معانی شرع کی باریکیاں اور لطائف نکالنے اور مستنبط کرنے کے سبب سے ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش آنے والے حوادث و واقعات کے احکام میں مسلسل اختلاف بھی کرتے رہے اور اس کے باوجود باہم ایک دوسرے سے محبت اور الفت سے پیش آتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میری امت کا اختلاف رحمت ہے" اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو جھگڑے اور فساد کا سبب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہودی اکہتر فرقوں میں یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اسی کی مثل (فرقوں میں تقسیم ہوئے) اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔" ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔ (1)

1۔ ابن ماجہ، باب افتراق الامم، حدیث نمبر 3980، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے (1)۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً میری امت پر بالکل برابر برابر وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی اپنی ماں کے پاس اعلانیہ (برائی کے لئے) آتا تھا تو یقیناً میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو اسی طرح کا فعل کرے گا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک گروہ کے وہ تمام کے تمام جہنم میں ہوں گے" صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما انا علیہ واصحابی جو اس (دین) پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ انہوں نے اسے عبداللہ بن زیاد الافریقی کی حدیث سے عبداللہ بن یزید عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے اس سند کے سوا سے نہیں پہچانتے۔ ابو عمر نے کہا ہے: عبداللہ افریقی ثقہ ہے اور اس کی قوم نے اس کی توثیق کی ہے اور انہوں نے اس کی تعریف کی ہے اور دوسروں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور ابوداؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خبردار! تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور یہ ملت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور وہ الجماعۃ ہے۔ بلاشبہ عنقریب میری امت سے کچھ جماعتیں نکلیں گی ان کے ساتھ خواہشات اس طرح چلیں گی جس طرح الکلب (باؤلے کتا کاٹنے کی بیماری) اپنے مریض کے ساتھ چلتی ہے اور اس کے بدن کی کوئی رگ اور جوڑ باقی نہیں رہتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے" (2)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ وحدہ کے بارے میں اخلاص ہو اس کی عبادت میں کوئی اس کا شریک نہ ہو، وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اور وہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جسے رسل علیہم السلام لے کر آئے اور انہوں نے اسے اپنے رب کی طرف سے پہنچایا اس سے پہلے کہ احادیث میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو اور اھواء و خواہشات میں اختلاف ہو اور اس کی تصدیق سب سے آخر میں نازل ہونے والی کتاب اللہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنْ تَابُوْا فرمایا: پس اگر وہ بتوں اور ان کی عبادت کو چھوڑ دیں۔ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ اور دوسری آیت میں فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبہ: 11) (پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں۔)

انہوں نے اسے نصر بن علی جہضمی عن ابی احمد عن ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ (3)
ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: اگر کہا جائے یہ فرقے تو معروف ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم افتراق اور اصول فرقوں کو

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء فی افتراق ہذہ الامۃ، حدیث نمبر 2565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، حدیث نمبر 3981، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 69، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جانتے ہیں اور پھر فرقوں میں سے ہر گروہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اگرچہ ہم نے ان فرقوں کے اسماء اور ان کے مذاہب کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اصولی فرقوں میں سے یہ ہمارے لئے بالکل ظاہر ہیں حروریہ، قدریہ، جہمیہ، مرجئہ، رافضہ، اور جبریہ۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: اصل گمراہ فرقے یہی چھ فرقے ہیں، وہ ان میں سے ہر فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہے تو اس طرح بہتر فرقے ہو گئے۔

حروریہ بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ازرقیہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو مومن نہیں جانتے۔ اور انہوں نے اہل قبلہ کو کافر قرار دیا سوائے ان کے جنہوں نے ان کے قول کو قبول کیا۔

(۲) اباضیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے ہمارے قول کو لے لیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اس سے اعراض کیا تو وہ منافق ہے۔

(۳) ثعلبیہ: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور نہ کوئی تقدیر بنائی۔

(۴) خازمیہ: انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے ایمان کیا ہے اور تمام مخلوق معذور ہے۔

(۵) خلفیہ: ان کا گمان ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس نے بھی جہاد ترک کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) کوزیہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مس کرے کیونکہ پاک چیز کو نجس سے نہیں پہچانا جا سکتا اور نہ کوئی اس کے ساتھ کسی کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے اور غسل کر لے۔

(۷) کنزیہ: انہوں نے کہا ہے: کوئی کسی کو یہ اختیار اور گنجائش نہ دے کہ وہ اپنا مال کسی کو دے دے، کیونکہ بسا اوقات وہ مستحق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے زمین میں جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اہل حق ظاہر ہو جائیں۔

(۸) شمراخیہ: انہوں نے کہا ہے: اجنبی عورتوں کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ خوشبودار پودے (پھول) ہیں۔

(۹) اخنسیہ: انہوں نے کہا ہے: میت کو اس کی موت کے بعد کوئی خیر و شر لاحق نہیں ہوتا۔

(۱۰) محکمیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے مخلوق کی طرف فیصلہ لوٹایا تو وہ کافر ہے۔

(۱۱) معتزلہ: انہوں نے کہا ہے: ہم پر حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا معاملہ مشتبہ ہے لہٰذا ہم دونوں فریقوں سے بری ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) میمونیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے اہل محبت کی رضا کے بغیر کوئی امام نہیں ہو سکتا۔

اور قدریہ بھی بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

(۱) احمریہ: یہ وہ فرقہ ہے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عدل کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے امور کا مالک بنائے اور وہ ان کے اور ان کے گناہوں کے درمیان حائل رہے۔

(۲) ثنویہ: ان کا خیال ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔

(۳) معتزلہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور انہوں نے [صفات] ربوبیت کا انکار کیا ہے۔

(۴) کیسانیہ: انہوں نے کہا ہے: ہم نہیں جانتے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے اور نہ ہم یہ

جانتے ہیں کہ آیا اس کے بعد لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا انہیں سزا دی جائے گی۔

(5) شیطانیہ: ان کا کہنا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا ہے۔

(6) شریکیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک کفر کے سوا تمام برائیاں مقدر ہیں۔

(7) وہمیہ: انہوں نے کہا ہے: مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کے لئے کوئی ذات نہیں اور نہ ہی نیکی اور بدی کے لئے کوئی ذات ہے۔

(8) زبریہ: انہوں نے کہا ہے: ہر کتاب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہے چاہے وہ ناسخ ہو یا منسوخ۔

(9) مسعدیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(10) ناکثیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ دی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(11) قاسطیہ: انہوں نے ابراہیم بن نظام کی اس کے اس قول میں اتباع اور پیروی کی ہے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ شے ہے تو وہ کافر ہے۔

اور جہمیہ بارہ فرقوں میں منقسم ہیں۔

(1) معطلہ: انہوں نے خیال کیا ہے کہ ہر وہ شے جس پر انسان کا وہم واقع ہو سکتا ہے تو وہ مخلوق ہے اور یہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے تو وہ کافر ہے۔

(2) مریسیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی اکثر صفات مخلوق ہیں۔

(3) ملتزقہ: انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں موجود ہے۔

(4) واردیہ: انہوں نے کہا ہے: وہ آدمی جہنم میں داخل نہ ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جو اس میں داخل ہوا وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔

(5) زنادقہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے رب ثابت کرے، کیونکہ وہ اس کے ادراک کے بغیر اثبات نہیں ہو سکتا اور جس کا ادراک نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

(6) حرقیہ: انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ کافر کو ایک بار آگ جلا دے گی پھر وہ ہمیشہ جلا ہوا باقی رہے گا وہ وہاں آگ کی حرارت نہیں پائے گا۔

(7) مخلوقیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔

(8) فانیہ: ان کا گمان ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فنا ہو جائیں گی اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ انہیں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

(9) عبدیہ: انہوں نے رسل علیہم السلام کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حکماء تھے۔

(۱۰) واقفیہ: انہوں نے کہا: نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مخلوق ہے۔

(۱۱) قبریہ: یہ عذاب قبر اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۲) لفظیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے۔

اور مرجئہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) تارکیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مخلوق پر کوئی فریضہ نہیں ہے سوائے اس کے ساتھ ایمان لانے کے، پس جو کوئی اس کے ساتھ ایمان لایا تو اسے چاہیے وہ جو چاہے کرے۔

(۲) سائبیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جو چاہیں کریں۔

(۳) راجیہ: انہوں نے کہا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے کو طائع اور گناہ کرنے والے کو عاصی نہیں کہا جائے گا کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کیا ہے۔

(۴) سالبیہ: انہوں نے کہا ہے کہ طاعت ایمان میں سے نہیں ہے۔

(۵) بہیشیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ایمان علم ہے اور جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے نہیں پہچانتا تو وہ کافر ہے۔

(۶) عملیہ: ان کا کہنا ہے کہ ایمان عمل کا نام ہے۔

(۷) منقوصیہ: انہوں نے کہا ہے: ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

(۸) مستثنیہ: انہوں نے کہا ہے: استثناء ایمان میں سے ہے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہنا)

(۹) مشبہہ: انہوں نے کہا ہے: آنکھ آنکھ کی طرح ہے اور ہاتھ ہاتھ کی طرح ہے (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک)

(۱۰) حشویہ: انہوں نے کہا ہے: تمام احادیث کا حکم ایک ہے، پس ان کے نزدیک نفل کو ترک کرنے والا فرض کو چھوڑنے والے کی طرح ہے۔

(۱۱) ظاہریہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے قیاس کی نفی کی ہے۔

(۱۲) بدعیہ: وہ پہلا آدمی جس نے اس امت میں ان واقعات کا آغاز کیا۔

اور رافضیہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) علویہ: انہوں نے کہا کہ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا لیکن حضرت جبریل امین نے خطا کی (اور پیغام رسالت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیا)۔

(۲) امریہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے کام میں شریک ہیں۔

(۳) شیعیہ: ان کا موقف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں اور آپ کے بعد آپ کے ولی ہیں، اور امت نے دوسروں کی بیعت کے سبب کفر کیا ہے۔

(۷) سابقیہ: ان کا کہنا ہے: جو چاہے وہ عمل کرے اور جو چاہے وہ عمل نہ کرے، کیونکہ سعید کو اس کے گناہ کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور شقی اور بد بخت کو اس کی نیکی کوئی فائدہ نہ دے گی۔

(۸) حبیبیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام پی لیا تو اس سے ارکان کی عبادت ساقط ہو گئی۔

(۹) خوفیہ: ان کا نظریہ ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اس کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس سے ڈرے، کیونکہ ایک دوست اپنے دوست سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

(۱۰) فکریہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے علم میں اضافہ کیا تو اس نے اپنی مقدار عبادت اس سے ساقط کر دی۔

(۱۱) خشبیہ: انہوں نے کہا ہے: دنیا بندوں کے درمیان برابر ہے، ان کے درمیان اس میں کوئی فضیلت نہیں جس کے لئے ان کے باپ آدم نے انہیں وارث بنایا ہے۔

(۱۲) منیہ: انہوں نے کہا ہے: ہماری طرف سے فعل ہے اور ہمارے لئے استطاعت وقدرت ہے۔

وہ فرقے جو اس امت میں زائد ہوئے ان کا بیان عنقریب سورۃ الانعام کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک الحنفی کو کہا: اے حنفی! جماعت کو لازم پکڑ لے جماعت کو اختیار کر لے، کیونکہ سابقہ امتیں اپنے تفرق کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزیں پسند فرماتا ہے اور تین چیزیں ناپسند فرماتا ہے: وہ تمہارے لئے پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور یہ کہ تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور وہ تمہارے لئے یہ تین چیزیں ناپسند کرتا ہے: قیل وقال، کثرت سوال اور مال کو ضائع کرنا۔"

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی کتاب اور اپنے نبی مکرم ﷺ کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا واجب قرار دیا ہے اور اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرنا لازم قرار دیا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اعتقاداً اور عملاً کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے پر اجتماع کریں اور یہی کلمات میں اتفاق پانے اور متفرقات کو منتظم کرنے کا وہ سبب ہے جس کے ساتھ دنیا اور دین کے مصالح مکمل ہوتے ہیں اور وہ اس میں اختلاف سے بچاؤ اور سلامتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمع اور اکٹھا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس افتراق سے منع کیا ہے جو اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) میں موجود تھا۔ مکمل آیت کا یہی معنی ہے اور اس میں اس اصول کے صحیح ہونے پر دلیل بھی موجود ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو یاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سب سے عظیم اور بڑی نعمت اسلام، اللہ تعالیٰ نے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع ہے، کیونکہ اس کے سبب عداوت اور نفرت وفرقت زائل ہو گئی اور باہمی محبت والفت پیدا ہو گئی۔ اور اس میں مراد قبیلہ اوس اور خزرج ہیں اور یہ آیت عام ہے۔

نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیان جنس کے لئے ہے اور معنی یہ ہے چاہیے کہ تم تمام کے تمام اسی طرح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ انہیں معین کیا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ الآیہ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔)

اور تمام لوگوں کو قدرت نہیں دی گئی اور ابن زبیر نے پڑھا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ويستعينون اللہ علی ما اصابہم (اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں جو کچھ انہیں پہنچے) ابوبکر الانباری نے کہا ہے: یہ زیادتی ابن زبیر کی طرف سے تفسیر ہے اور یہ ان کا اپنا کلام ہے اس میں نقل کرنے والوں میں سے بعض نے غلطی کی ہے اور اس نے اسے الفاظ قرآن کے ساتھ ملا دیا ہے، جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس کی صحت پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے جو میرے باپ نے مجھے اس سند سے بیان کی ہے حدثنا [حسن] بن عرفۃ حدثنا وکیع عن ابی عاصم بن ابی عون عن صبیح انہوں نے کہا: میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس طرح پڑھتے ہوئے سنا: وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ويستعينون اللہ علی ما اصابہم اور کوئی عقلمند اس میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس زیادتی کے قرآن میں سے ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے تھے، کیونکہ آپ نے اسے اپنے اس مصحف میں نہیں لکھا جو امام المسلمین ہے بلکہ آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنے کے لئے اور رب العالمین کے کلام کو موکد کرنے کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے بہت بڑا۔''

جمہور مفسرین کے قول کے مطابق مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اس امت کے مبتدع (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) لوگ ہیں۔ اور ابو امامہ نے کہا ہے: وہ لوگ حروریہ ہیں، اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔ اور جابر بن عبداللہ نے کہا ہے: كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ جَآءَهُمُ جمع کی بنا پر مذکر کا صیغہ ہے اور جاءتھم جماعت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے اور کالے ہوں گے کئی منہ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے

ہاں۔ تو اس نے کہا: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا اور میں نے آپ سے سنا وہ اس میں یہ بات زیادہ بیان کرتے تھے: ''تو میں کہوں گا بلاشبہ وہ تو میرے ہیں تو کہا جائے گا بلاشبہ آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے۔ اس کے لئے ہلاکت ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے جس نے میرے بعد (دین) تبدیل کر لیا۔''(1)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے پاس حوض پر آئے گا تو انہیں حوض سے نکال دیا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں تو وہ فرمائے گا آپ کے علم میں وہ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے بلاشبہ یہ لوگ اپنی ایڑیوں کے بل مرتد ہو گئے۔''(2)

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں تغیر و تبدل کیا یا کسی بدعت کا ارتکاب کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو اور نہ اس کے بارے اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ حوض سے بھگائے جانے والوں میں سے ہوگا اور اس سے دور کیے جانے والوں میں سے ہوگا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ مطرود اور بعید وہ ہوگا جس نے جماعت مسلمین سے اختلاف کیا اور ان کے راستے سے علیحدہ ہو گیا جیسا کہ خوارج اپنے مختلف فرقوں کی بنا پر اور روافض اپنی واضح گمراہی کی بنا پر اور معتزلہ طرح طرح کی خواہشات اور ہوا پرستی کی بنا پر، یہ تمام کے تمام دین میں تبدیلی لانے والے اور بدعت کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور اسی طرح وہ ظالم جو ظلم و ستم میں حد کو پار کرتے ہیں اور اہل حق کو قتل اور ذلیل و رسوا کرنے میں انتہائی زیادتی کرنے والے ہیں اور وہ جو اعلانیہ کبیرہ گناہ کرنے والے ہیں اور جو معاصی اور گناہوں کو حقیر اور ہلکا سمجھنے والے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرنے والوں، خواہش پرستوں اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کی جماعت، ان تمام کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہی اس آیت سے مراد ہوں۔ اور خسارہ اسی طرح ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ کسی کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا سوائے اس انکار کرنے والے کافر کے جس کے دل میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

اور ابن قاسم نے کہا ہے: کبھی اہل اہواء کے سوا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اہل اہواء کی نسبت زیادہ شریر ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہیں: اخلاص کی تکمیل گناہوں سے اجتناب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ اس کلام میں حذف ہے یعنی فیقال لھم۔ (تو انہیں کہا جائے گا) أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد) یعنی یوم میثاق کو جب انہوں نے کہا: بلیٰ (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہود کے لئے ہے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے (آپ کا انکار کیا اور) آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا: یہ خطاب منافقین کے لئے ہے کہا جائے گا: کیا تم نے سراً اور خفیہ کفر کیا تھا اعلانیہ اقرار کرنے کے بعد۔ اور اہل عرب کا اس پر اجماع ہے کہ أَمَّا کے جواب میں فاء کا لانا ضروری ہے کیونکہ اس کا معنی میرے اس قول میں ہے: أما زيد فمنطلق،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب فی الحوض، وقول تعالیٰ انا اعطیناک الکوثر، حدیث نمبر 6097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث 6096

مهما یکن من شئ فزید منطلق۔

اور قول باری تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اور اس کے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہوں گے۔ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی وہ ہمیشہ اس کی جنت اور دار عزت و کرامت میں باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں میں سے بنائے اور بدعتوں اور ضلالتوں کی راہوں سے ہمیں بچائے اور محفوظ رکھے اور ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے۔ آمین۔

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

"یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام۔"

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور مراد قرآن کریم ہے۔ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ یعنی آپ پر جبریل امین کو نازل کرتے ہیں سو وہ آپ پر آیات پڑھتا ہے۔ بِالْحَقِّ یعنی صدق و سچائی کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور اس کے دلائل ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تِلْكَ بمعنی هٰذه ہے۔ لیکن جب یہ گزر گئیں تو اس طرح ہو گئیں گویا یہ دور اور بعید ہیں۔ لہٰذا تِلْكَ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اٰیٰتُ اللّٰهِ تِلْكَ سے بدل ہو۔ اور وہ نعت اور صفت نہ ہو، کیونکہ مبہم مضاف کے ساتھ نعت نہیں بن سکتا۔ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی وہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہ دے گا۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ مہدوی نے کہا ہے: اس کی ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کافرین کے احوال کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرے گا تو اس کے متصل بعد اپنی قدرتوں کی وسعت اور ظلم سے اپنے مستغنی ہونے کا ذکر کیا، اس لئے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ابتدائے کلام ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان کیا ہے کہ زمین و آسمان میں سب کا سب اسی کا ہے یہاں تک کہ وہ اسی سے سوال کریں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

"ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو

فاضل اور مفضول دونوں قسم کے لوگ جمع تھے۔ آپ کے زمانہ میں منافقین کی وہ جماعت جو ایمان کا ظاہر کرتے تھے اور وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے جن پر یا ان میں سے بعض پر حدود قائم کی گئیں بھی جمع تھے۔ اور آپ نے ان کے لئے ہی کہا جو تم چور، شرابی اور زانی کے بارے میں کہتے ہو۔ اور آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے فرمایا: لا تسبوا اصحابی (تم میرے صحابہ کرام کو گالی گلوچ نہ دو۔ (1)) اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: لا تسب من هو خير منك (تو اسے گالی نہ دے جو تجھ سے بہتر ہے) اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طوبى لمن رآني وآمن بي وطوبى سبع مرات لمن لم يرني وآمن بي (سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات بار سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا)

اور مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے: عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیه عن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے افضل ہے۔“ ہم نے عرض کی: ”ملائکہ“ آپ نے فرمایا: ”ان کے بارے تو حق ہے ان کے علاوہ کون ہیں؟“ ہم نے عرض کی: انبیاء علیہم السلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ان کے بارے تو حق ہے بلکہ ان کے علاوہ کون ہے“ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ایمان کے اعتبار سے مخلوق میں سے افضل وہ قوم ہے جو ابھی مردوں کی صلبوں میں ہے وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ ورق (کتاب) پائیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کریں گے پس وہی ایمان کے اعتبار سے افضل الخلق ہیں۔“

اور صالح بن جبیر نے ابو جمعہ سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم سے کوئی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور دو تختیوں کے درمیان ایک کتاب پائیں گے جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہ ایمان لے آئیں گے اور وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔“ ابو عمر نے کہا ہے: ابو جمعہ صحابی ہیں اور ان کا نام حبیب بن سباع ہے اور صالح بن جبیر تو تابعین میں سے ہیں۔ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ تمہارے پیچھے دن آنے والے ہیں کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا ان میں عمل کرنے والے کے لئے اس کی مثل عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا (2)“ (یعنی ان کے اجر کی مثل اسے اجر دیا جائے گا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ان میں سے (پچاس آدمیوں کی مثل)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(نہیں) بلکہ تم میں سے“ (پچاس آدمیوں کی مثل)۔

ابو عمر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض محدثین خاموش ہیں۔ اور انہوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تاویل میں کہا ہے: جس نے تمہارے فعل کی مثل فعل کیا وہ تمہاری مثل ہے۔ احادیث کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی (روایات) خصوصیت کی بنا پر ہیں۔ واللہ الموفق۔

1۔ مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب تحریم سب الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310
2۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر 4003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

يُقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ اور اگر وہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو شکست خوردہ ہو کر بھاگ جائیں گے، یہ کلام بھی مکمل ہو گیا۔ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اسی لئے ان میں نون ثابت ہے۔ اور اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے معجزہ ہے، کیونکہ یہودیوں میں سے جو بھی لڑا وہ اپنی پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝

"مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت (و رسوائی) جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) اور یہ مستحق ہو گئے ہیں غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی، یہ اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق یہ (بے باکی) اس لئے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے۔ سب یکساں نہیں اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے گا اس کا اجر کا۔ اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو"

قولہ تعالیٰ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی جہاں کہیں یہ پائے گئے اور یہ سے کلام مکمل ہوا۔ اور ان پر ذلت مسلط کرنے کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ یہ استثنا منقطع ہے یہ اول کا جز نہیں ہے۔ یعنی بجز ان کے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کو مضبوط کرتے ہیں وہ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ مراد وہ ذمہ داری (معاہدہ) ہے جو لوگوں کی جانب سے ان پر ہے۔ اور الناس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ مومنین ہیں جنہیں وہ خراج ادا کرتے ہیں اور وہ انہیں امن اور پناہ دیتے ہیں۔ کلام میں اختصار ہے اور معنی یہ ہے: الا ان یعتصموا بحبل من اللہ، پھر اس سے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔ فراء نے یہی کہا ہے۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ لوٹ آئے ہیں اللہ کے غضب کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور تقدیر کلام ہے من اهل الکتاب امة قائمة و اخری غیر قائمة۔ پس پہلے پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابوذؤیب کا قول بھی ہے:

عصانی الیها القلب انی لامرہ　　مطیع فما ادری ارشد طلابها (1)

میں اس کی طرف مائل ہونے میں دل نے میرا ساتھ نہ دیا بلاشبہ میں تو اس کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہوں سو میں نہیں جانتا کہ اس سے (کس کا) طالب کرنا ہدایت ہے (یا گمراہی)۔ تو اس میں مراد أرشدٌ ام غیّ ہے اور اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے کہا ہے: امۃ، سواء کے سبب مرفوع ہے (2) اور تقدیر عبارت ہے: لیس یستوی امة من اهل الکتاب قائمة یتلون آیات الله و امة کافرة۔ (اہل کتاب میں سے ایک گروہ جو حق پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ اور کفر کرنے والا گروہ برابر نہیں ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کئی اعتبار سے غلط ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ جب سواء کے ساتھ رفع دیا گیا ہے تو اس کو لیس کے اسم کی طرف ہونے والی کوئی شے نہیں ہے اور رفع ایسی شے کے سبب دیا جا رہا ہے جو فعل کے قائم مقام نہیں ہے اور اسے مضمر ماننے کا جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کافر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لہٰذا اسے مضمر ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی مثل ہے: اکلونی البراغیث (3) اور ذهبوا اصحابك۔ نحاس نے کہا ہے: یہ غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اکلونی البراغیث ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

اور آناء اللیل اس سے مراد رات کی ساعتیں ہیں (4)۔ اس کا واحد إنْیٌ و أنًی اور إنًی ہے۔ اور یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یَسْجُدُوْنَ بمعنی یصلون (وہ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔

یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے، کیونکہ تلاوت رکوع و سجود میں نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ۔ ای یصلون۔ اور سورۃ الفرقان میں ہے: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ اور سورۃ النجم میں ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد صرف معروف سجدہ ہی لیا جا رہا ہے۔ اور جب نزول اسے رد کر رہا ہے اور یہ کہ مراد عشاء کی نماز ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ پس عیسائی پوجا کرنے والوں پر جو تہائی رات بیت جاتی ہے تو وہ سو جاتے اور مومنین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز عشاء کے لئے کھڑے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب ان کے قیام کا ذکر کیا تو فرمایا وَهُمْ یَسْجُدُوْنَ یعنی (سجدوں کے) ساتھ قیام کی تھی۔ اور ثوری نے کہا ہے: یہ مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیام لیل کے بارے میں ہے۔

اور ابن شعیب کے ایک آدمی سے روایت ہے وہ کتابیں پڑھتا تھا اس نے کہا: بلاشبہ ہم رب العالمین کے کلام میں سے ایک

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 1، صفحہ 492
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534
5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 493

کیا ہے اور اس کا تعلق سابقہ اس ارشاد کے ساتھ ہے: اِنْ تُطِيعُوْا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اور البطانۃ مصدر ہے اور اس کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کا نام رکھا جا سکتا ہے اور بطانۃ الرجل سے مراد وہ خاص دوست اور افراد ہیں جو اس کے خفیہ معاملات پر بھی آگاہ ہوتے ہیں اور یہ اصل میں البطن سے ماخوذ ہے جو الظہر کے خلاف ہے۔ اور بطن فلان بفلان یبطن بطونا و بطانۃ جب کوئی کسی کے ساتھ خاص ہو اور اس کے اندرونی معاملات میں تہ تک پہنچا ہوا ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اولئك خلصاني نعم و بطانتي — و هم عيبتي من دون كل قريب

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کفار، یہود اور اہل اہواء کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں اور وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کریں اور اپنے معاملات ان کے سپرد کریں۔ اور کہا جاتا ہے: کل من کان علی خلاف مذهبك و دينك فلا ينبغي لك ان تحادثه۔ یعنی ہر وہ جو تیرے مذہب اور تیرے دین کے خلاف ہے اس کے ساتھ تیرا مشاورت اور گفتگو کرنا مناسب نہیں۔

شاعر نے کہا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرينه — فكل قرين بالمقارن يقتدي

مرد آدمی سے سوال نہ کر بلکہ اپنے ساتھی سے سوال کر۔ پس ہر ساتھی اپنے مصاحب کی ہی اقتدا کرتا ہے اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو اس کے بارے غور و فکر کرنی چاہیے جسے وہ دوست بنا رہا ہے"(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم لوگوں کو ان کے بھائیوں (دوستوں) پر قیاس کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس معنی اور سبب کو بیان فرمایا جس کے لئے اس نے اس تعلق اور دوستی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: **لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا**۔ خبال بمعنی فساد ہے یعنی تمہارے فساد اور بربادی میں وہ کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑیں گے۔ یعنی اگرچہ وہ ظاہر میں تمہارے ساتھ قتال اور جنگ نہیں کریں گے لیکن مکر و فریب اور دھوکہ دینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قول باری تعالیٰ: **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَأْلُوْنَكُمْ خَبَالًا** کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ان سے مراد خوارج ہیں۔" اور روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب، باب من یؤمر ان یجالس، جلد 2، صفحہ 308۔

ایضاً جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء من اخذ المال ... حدیث 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً جامع ترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء من اخذ المال، جلد 2، صفحہ 60/513 ... آباد

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ کو وہ پیش کیا اور آپ کو تعجب میں ڈال دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کتاب (تحریر) لائے اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے؟ تو انہوں نے عرض کی: وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: کیوں! کیا وہ جنبی ہے؟ انہوں نے عرض کی: وہ نصرانی ہے تو آپ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا: تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خائن قرار دیا ہے۔ (لا تدنهم وقد اقصاهم الله ولا تكرمهم وقد اهانهم الله ولا تأمنهم وقد خونهم الله)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ (لا تستعملوا اهل الكتاب فانهم يستحلون الرشا واستعينوا على اموركم وعلى رعيتكم بالذين يخشون الله تعالى) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا: یہاں حیرہ کی عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ نے فرمایا: میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا (1)۔ پس اہل ذمہ کو کاتب بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا کوئی بیع و شراء کے معاملات وغیرہ میں سے کسی میں ان کا تصرف کرنا اور انہیں نیابت کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس زمانے میں اہل کتاب کو کاتب اور امین بنانے کے سبب احوال بدل چکے ہیں اور وہ والیان اور امراء کے کند ذہن اور جاہل ہونے کے سبب سردار بن گئے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے دو راز دان اور خواص ہیں ان میں سے ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسرا اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسے اس پر ابھارتا ہے پس معصوم (اور محفوظ) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا (اور بچا لیا)۔ (2)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں عربی نہ کھدواؤ (3)"۔ حسن بن ابی الحسن نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی اور فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے معاملات میں سے کسی کے بارے مشرکین سے مشاورت نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کندہ نہ کراؤ۔ حسن نے کہا: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ الآیہ (4)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، جلد 2، صفحہ 1066، ...، ایضاً صحیح بخاری، حدیث 6121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد بن حنبل، کتاب مسند المکثرین، باب مسند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 99، مطبوعہ دار صادر 4۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 298

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِّنْ دُوْنِكُمْ ای من سواکم (یعنی تم اپنے سوا کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ)

فراء نے کہا: وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ بمعنی سوی ذالک۔ یعنی اس میں دُوْنَ بمعنی سوی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِنْ دُوْنِكُمْ یعنی سیرت اور حسن مذہب میں (کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ) اور لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کا معنی ہے وہ ایسے معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے جس میں تمہارے لئے فساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور یہ جملہ مِّنْ دُوْنِكُمْ کی صفت کے محل میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لا آلو جهدا یعنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا (کوئی کوتاہی نہیں کروں گا) اور اَلَوْتُ اَلْوًا کا معنی ہے میں نے کوتاہی کی۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

> وما المرء ما دامت حُشاشةُ نفسه ... بمدركِ أطرافِ الخطوبِ ولا آلِ

اس میں ولا آل کا لفظ مذکورہ معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور الخبال، الخبل ہے اور الخبل کا معنی فساد اور بگاڑ ہے اور یہ افعال، ابدان اور عقول میں ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: من أصيب بدم أو خَبل (1) یعنی وہ جسے ایسا زخم لگا جو عضو کو ضائع اور فاسد کر دے۔ اور الخبل کا معنی اعضاء کا فاسد ہونا ہے اور رَجُلٌ خَبْلٌ و مُخْتَبَلٌ (فاسد اور بگڑا ہوا آدمی) اور خَبَلَهُ الْحُبُّ (یعنی محبت نے اسے بگاڑ دیا)

اوس نے کہا ہے:

> أبني لُبَينى لستم بيدٍ ... إلا يدًا مخبولةَ العضدِ

یہ فاسدۃ العضد ہے۔ (یعنی کٹا ہوا فاسد بازو)

فراء نے کہا ہے:

> نظر ابن سعدٍ نظرةً ويْتَ بها ... كانت لصحبك والمطيِّ خبالا

اس میں بھی خبال بمعنی فساد ہے۔

اور خَبَالًا مفعول ثانی کے اعتبار سے منصوب ہے، کیونکہ الالو دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی حیثیت سے منصوب مان لے یعنی یخبلونکم خبالا۔ اور اگر چاہے تو حرف جر کے حذف کے سبب منصوب تصور کرے یعنی اصل میں بالخبال تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا: اوجعته ضربا (یعنی بالضرب میں نے اسے مار کے ساتھ تکلیف دی۔) اور قول باری تعالیٰ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ میں ما مصدریہ ہے۔ یعنی ودوا عنتكم یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے (2) اور اس کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ یعنی تمہارے لئے عداوت اور تکذیب ان کے منہ سے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، من قتل له قتيل فهو بالخيار۔ بين احدى ثلاث

ایضاً سنن ابن ماجہ، حدیث 2613، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 537

تبدیل کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ دانتوں کے ساتھ کاٹنا اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قریب المرگ آدمی پر ہاتھ کو (دانتوں کے ساتھ) پکڑنا ہوتا ہے اور اسی طرح شرمندہ آدمی کا ہاتھوں کو لگانا بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں غمزدہ اور پریشان حال آدمی کا زمین پر بیٹھ کر لکیریں لگانا اور کنکریوں کو گننا بھی اسی قبیلے سے ہے۔ اور یہ عض ضاد ساقط کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور عظ ازمان ظا اور ضاد کے ساتھ۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وعظ زمان یا بن مروان لم یدع　　من المال الا مسحت او مجلف

اس میں عظ زمان عض ازمان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

الانامل کا واحد انملۃ (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ اور میم کو فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔ اور ابو جوزاء نے جب یہ آیت تلاوت کی تو اس نے کہا: یہ اباضیہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صفت قیامت تک آنے والے بہت سے اہل بدعت میں پائی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اگر کہا جائے: وہ کیسے نہیں مرے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو فرمائے: کن (تو ہو جا) فیکون (تو وہ ہو جاتی ہے)؟ تو اس کی طرف سے دو جواب دیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے　اس بارے میں مفسرین میں سے علامہ طبری اور کثیر نے کہا ہے: یہ ان کے لیے بددعا ہے۔ یعنی اے محمد ﷺ! آپ کہیے تم مسلسل اپنے غصہ میں جلتے رہو یہاں تک کہ تم مر جاؤ۔ اور اس پر توجیہ یہ ہے کہ آپ ان کے لیے ان کے سامنے اور پیچھے بددعا کرتے رہیں بغیر عنت کرنے کے۔ (1)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہیں خبر دے دو کہ وہ اسے ہرگز نہ پا سکیں گے جس کی آرزو اور خواہش رکھتے ہیں، کیونکہ موت اس کے قریب ہے تو اس معنی کی بنا پر دعا کا معنی زائل ہو گیا اور تقریع اور غصہ دلانے کا معنی باقی رہا اور یہ معنی مسافر بن ابی عمرو کے قول کے ساتھ بھی جاری ہوتا ہے:

ویتمنی فی ارومتنا　　ونفقا عین من حسدا

اور اسی معنی کی طرف یہ قول باری تعالیٰ بھی راہنمائی کرتا ہے: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ (الحج: 15) (اور جو شخص یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال کر) اسے کاٹ دے۔)

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿١٢٠﴾

1۔ تفسیر طبری، کتاب آل عمران، جلد 4، صفحہ 87، اسلام آباد

"(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (پڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ سلمی نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تا کے ساتھ۔ اور یہ لفظ عام ہے ہر اس شے کو شامل ہے جو اچھی ہو سکتی ہے اور بری ہو سکتی ہے۔ اور مفسرین نے جو (خصب) شادابی (جدب) خشک سالی، مومنین کا اجتماع اور ان کے درمیان فرقت کا ہونا اور دیگر ان جیسے اقوال مثالیں ذکر کی ہیں اور یہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور آیت میں معنی یہ ہے کہ ہر وہ جس کی یہ حالت ہو کہ اس میں شدید عداوت اور حقد و کینہ ہو اور مسلمانوں پر تکالیف آنے کے وقت اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہو وہ اس اہل نہیں کہ اسے راز دار بنایا جائے بالخصوص جہاد جیسے اس امر عظیم میں جو کہ دنیا و آخرت کا سرمایہ ہے۔

کسی کہنے والے نے کتنا خوب کہا ہے:

کل العداوة قد ترجی افاقتها ... الا عداوة من عاداك من حسد

ہر عداوت اور دشمنی کے ختم ہونے کی امید کی جا سکتی ہے سوائے اس کی عداوت کے جس نے تیرے ساتھ حسد کیا۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر تم ان کی اذیت رسانی پر صبر کرتے رہو (1) اور اطاعت اور مومنین کی محبت و دوستی پر صبر کرتے رہو وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا کہا جاتا ہے: ضارہ یضورہ ویضیرہ ضیرا وضورا، پس اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کے ضرر اور نقصان کی نفی کی شرط بیان کی ہے اور یہ مومنین کے لئے تسلی اور ان کے دلوں کے لئے باعث تقویت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: پس حرمیان اور ابو عمرو نے لا یضرکم پڑھا ہے یہ ضارہ یضیرہ سے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول لا ضیر ہے۔ اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ جب راء سے ضمہ کو حذف کر دیا گیا تو راء اور یاء دونوں ساکن باقی رہ گئیں لہٰذا یا کو حذف کر دیا گیا اور اسے ہی حذف کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ضارہ یضورہ سنا ہے اور انہوں نے لا یضورکم کی اجازت دی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرات میں لا یضورکم ہے۔ [اور کوفیوں نے لا یضرکم را کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضرّ یضرّ سے ہے۔] اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فا کو مضمر ماننے کی تقدیر پر مرفوع ہو اور معنی ہو: فلا یضرکم (پس وہ تمہیں نقصان نہ دے گا)

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے:

من یفعل الحسنات اللہ یشکرها

(جو نیکیاں کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی قدر افزائی فرمائے گا۔) یہ کسائی اور فراء کا قول ہے، یہ تقدیم کی نیت پر مرفوع ہوگا۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 538

جو کہ شعر میں ہے:

فلك إن يضرر أخوك تضرر

(یا تجھے تو پچھاڑ دیا جائے گا اگر تیرے بھائی کو پچھاڑ دیا گیا۔)

آیت کا مفہوم یہ ہوگا: یعنی کہ ان تصبروا وتتقوا (تمہارا صبر کرنا اور تمہارا ڈرنا (اور تقویٰ اختیار کرنا) تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے جزم دی جائے اور دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے راء کو ضمہ دیا جائے کیونکہ وہ ضمہ کے بعد واقع ہے۔ اور اسی طرح فعل مجزوم ہونے کی بنا پر راء کے فتحہ کی قرأت بھی ہے اور اجتماع ساکنین کی صورت میں فتحہ کے خفیف حرکت ہونے کی وجہ سے یضرکم وضرکم پڑھا گیا ہے۔ اسے ابوزید نے مفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور مفضل ضبی نے عاصم سے لا یضرِّکم گمان کیا ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے راء کو کسرہ دیا گیا ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

"اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھر والوں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ، اذ میں عامل فعل مضمر ہے اور تقدیر کلام ہے: واذکر اذ غدوت، یعنی اور آپ یاد کرو (اے محبوب) جب آپ صبح سویرے چلے۔ مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یہ غزوہ احد تھا اور اسی کے بارے یہ مکمل آیت نازل ہوئی۔ اور مجاہد، حسن، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ غزوہ خندق کے بارے ہے۔ اور حسن سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بارے ہے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ احد کے بارے ہے (1) اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں۔) اور یہ بلاشبہ غزوہ احد میں ہوا تھا۔ اور مشرکین نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ طیبہ پر (چڑھائی کا) قصد کیا تاکہ وہ ان سے غزوہ بدر کی ناکامی اور شکست کا بدلہ و انتقام لیں، پس وہ احد پہاڑ کے نزدیک مدینہ طیبہ کے بالمقابل وادی کے کنارے جا اترے۔ یہ ۳ھ بارہ شوال بدھ کا دن تھا، ہجرت سے بتیسواں مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ جمعرات کے دن وہاں مقیم ہو گئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مدینہ طیبہ میں تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی تلوار میں دندانے پڑ گئے ہیں اور یہ کہ آپ کے لئے گائے ذبح کی جا رہی ہے اور یہ کہ آپ نے اپنا دست مبارک محفوظ اور مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے ایک گروہ شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے خاندان میں سے ایک آدمی کو بھی شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ محفوظ زرہ مدینہ طیبہ ہے۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539

اسے مسلم نے نقل کیا ہے(1)۔ اور یہ سب کچھ اسی کے مطابق ہے جو کچھ اس غزوہ میں سے معروف و مشہور ہے۔ اور تبوؤ کا اصل معنی ہے گھر بنانا (ٹھکانا بنانا) بوأته منزلا کہا جائے گا جب تو کسی جگہ سکونت اختیار کرے اور اسی معنی میں حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار (2) (جس نے جان بوجھ کر میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے) یعنی اس میں گھر بنالے۔ پس تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا معنی ہے آپ ان کے لئے صف بندی کی جگہیں بنا رہے تھے اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ ایک سونے والا دیکھتا ہے گویا کہ میں پے در پے مینڈھے کے ساتھ ہوں اور گویا میری تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو میں نے تعبیر یہ کی کہ میں قوم کے مینڈھے کو قتل کروں گا اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹنے کی تعبیر یہ کی کہ میری آل میں سے ایک آدمی شہید کر دیا جائے گا۔" پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور رسول اللہ ﷺ نے طلحہ کو قتل کیا اور وہ (کفار کا) علمبردار تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے بیان کیا ہے: مہاجرین کا علمبردار رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک آدمی تھا تو اس نے کہا: میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کروں گا جو میرے ساتھ ہے تو طلحہ بن عثمان جو کہ سعید بن عثمان کلبی کا بھائی تھا اس نے اسے کہا: اے عاصم! کیا تیرے لئے مقابلے کی طاقت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پس وہ آدمی اس پر تیزی سے جھپٹا اور طلحہ کے سر پر تلوار دے ماری یہاں تک کہ تلوار اس کی داڑھی پر لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا تو علمبردار کا قتل ہونا رسول اللہ ﷺ کے خواب کی تصدیق ہے بکبش مردف کبشا۔

إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لئے اس نے اس لغزش سے بچا لیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو۔"

اِذْ میں عامل تُبَوِّئُ یا سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہے۔ اور دو جماعتوں سے مراد خزرج میں سے بنو سلمہ اور اوس میں سے بنو حارثہ ہیں اور یہ دونوں غزوہ احد میں لشکر کے دو پہلو تھے(3)۔ اور اَنْ تَفْشَلَا کا معنی ہے کہ وہ بزدلی کا اظہار کریں (اور ہمت ہار دیں)۔ بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا فرمایا: ہمارے دو گروہ بنو حارثہ اور بنو سلمہ تھے اور ہم پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ نازل نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اللّٰهُ وَلِيُّهُمَا (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بنو حارث جو خزرج اور بنو نبیت تھے اور بنو نبیت اوس میں سے عمرو بن مالک تھے۔

اور فشل سے مراد بزدلی ہے۔ اس کا لغوی معنی یہی ہے اور دونوں گروہوں کا ارادہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب لشکر کے

1۔ بخاری کتاب المناقب، حدیث 3352 ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسلم المقدمہ، جلد 1، صفحہ 7، اسلام آباد

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 541 4۔ صحیح بخاری تفسیر سورۂ آل عمران حدیث نمبر 4192 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کے بعد عبداللہ بن ابی اپنے منافق ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا (تو انہوں نے بھی ارادہ کر لیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی حفاظت فرمائی اور یہ واپس نہ لوٹے۔ ان کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرما رہا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہوں نے (لشکر کے ساتھ) نکلنے سے (پیچھے) بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا اور وہ ان میں سے صغیر (چھوٹے) تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے دلوں میں آنے والا خیال تھا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر مطلع فرما دیا تو ان کی بصیرت میں اضافہ ہو گیا اور اس بزدلی اور سستی کا مظاہرہ ختم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور ان میں سے بعض نے بعض کی مذمت کی اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے یہاں تک کہ آپ مشرکین کے قریب جا پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور پھر عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ آیا، کیونکہ اس کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا جب اس نے مدینہ طیبہ میں بیٹھے رہنے اور وہیں قتال کرنے کا اشارہ دیا تھا اگر دشمن ان پر حملہ آور ہوا اور اس کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی (1) اور اکثر انصار نے اس کا انکار کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان میں سے وہ شہید ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ساتھ عزت و تکریم عطا فرمائی۔ امام مالک نے فرمایا ہے: غزوہ احد میں مہاجرین میں سے چار اور انصار میں سے ستر افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

مقاعد: مقعد کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیٹھنے کی جگہ اور یہ موقف کے قائم مقام ہے لیکن لفظ قعود ثبوت پر دال ہے اور بالخصوص تیر اندازی ثابت قدم تھے۔ مختصراً غزوہ احد کا یہی مفہوم ہے۔ اس کا تفصیلی اور شافی بیان آگے آئے گا۔

اس دن مشرکین کے ساتھ سو گھوڑ سوار تھے اور ان پر خالد بن ولید سربراہ تھے اور اس دن مسلمانوں کے ساتھ کوئی گھوڑا نہ تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور پتھر کے ساتھ نچلی طرف سے دائیں جانب کے چار دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کا خود توڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی امت اور دین کی جانب سے افضل و اعلیٰ جزا عطا فرمائی جو اپنے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کو اس کے صبر پر عطا فرمائی اور وہ جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن اعراض کیا تھا وہ عمرو بن قمیئہ لیثی اور عتبہ بن ابی وقاص تھا اور کہا گیا ہے: فقیہ محمد بن مسلم بن شہاب کا دادا عبداللہ بن شہاب وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو زخمی کیا تھا۔ واقدی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک ثابت یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو زخمی کرنے والا ابن قمیئہ تھا۔ اور جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر پتھر مار کر آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تھا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ نافع بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے مہاجرین میں سے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں احد کے دن حاضر تھا اور میں

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 3، صفحہ 226

عليك سلام ربك في جنان   مخالطها نعيم لا يزول

آپ پر آپ کے رب کی طرف سے ان جنتوں میں سلام پہنچے جن میں لازوال نعمتیں باقی رہیں گی۔

ألا يا هاشم الأخيار صبرا   فكل فعالكم حسن جميل

اے قبیلہ ہاشم میں سب سے بہتر فرد صبر کرو تمہارا ہر کام نہایت حسین و جمیل ہے۔

رسول الله مصطبر كريم   بأمر الله ينطق إذ يقول

اللہ کے رسول ﷺ صابر اور کریم ہیں وہ جب بھی کچھ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔

ألا من مبلغ عني لؤيا   فبعد اليوم دائلة تدول

اے کون شخص ہے جو میری طرف سے قبیلہ لؤی کو یہ پیغام پہنچا دے کہ آج کی جنگ کے بعد ایک دوسری جنگ کی نوبت آ کر رہے گی۔

وقبل اليوم ما عرفوا وذاقوا   وقائعنا بها يشفى الغليل

اور آج کی جنگ سے پہلے (غزوہ بدر میں) جو کفار نے ہمیں خوب پہچان لیا اور ہمارے مقابلے کا مزہ چکھ لیا (وہ بھی یاد رہے) اس جنگ میں ہمارے تصادم سے پیاسوں کی پیاس بجھائی جاتی رہی۔

نسيتم ضربنا بقليب بدر   غداة أتاكم الموت العجيل

قلیب بدر کے پاس تم ہماری تیغ زنی کو بھول گئے ہو جس روز موت تمہارے پاس بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔

غداة ثوى أبو جهل صريعا   عليه الطير حائمة تجول

جس روز ابوجہل زخموں سے چور ہو کر ہلاک ہو گیا اور اس کے اوپر پرندے گھوم گھوم کر آ جا رہے تھے۔

وعتبة وابنه خرا جميعا   وشيبة عضه السيف الصقيل

اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں زمین پر گر پڑے اور شیبہ کو بھی صیقل کی ہوئی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

ومتركنا أمية مجلعبا   وفي حيزومه لدن نبيل

اور ہم نے امیہ کو بھی زمین پر دراز کر دیا اور اس کے سینے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا نیزہ داخل تھا۔

وهام بني ربيعة سائلوها   ففي أسيافنا منها فلول

اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے پوچھو ان کو کاٹنے کی وجہ سے ہماری تلواروں میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

ألا يا هند فابكي لا تملي   فأنت الوالة العبرى الهبول

اے ہند! اب خوب رو اور رونے سے نہ اکتا کیونکہ تو ہی شدت غم کی وجہ سے بڑے بڑے آنسو بہانے والی اور اپنے عزیزوں کو کھو دینے والی ہے۔

ألا يا هند لا تبدي شماتا   بحمزة إن عزكم ذليل

ور اے ہند! تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کا اظہار نہ کر کیونکہ تمہاری عزت خاک میں مل چکی ہے۔
اور آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی مرثیہ کہا اور وہ کتب سیرت میں مذکور ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ توکل کا بیان ہے۔ توکل کا لغوی معنی: اظہار العجز والاعتماد علی الغیر ہے (یعنی عجز کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد کرنا) اور واتّکل فلان (کہا جاتا ہے) جب کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا کام ضائع کر دے۔

توکل کی حقیقت میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس حضرت سہل بن عبداللہ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: قالت فرقۃ: الرضا بالضمان، وقطع الطمع من المخلوقین ایک جماعت نے کہا ہے: توکل سے مراد ضمان کے ساتھ راضی ہونا اور مخلوق سے کسی حرص اور لالچ کو ختم کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: التوکل ترک الاسباب والرکون الی مسبب الاسباب کہ توکل سے مراد اسباب کو ترک کرنا ہے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جب کوئی سبب اسے مسبب سے مشغول کر دے گا تو اس سے توکل کا نام بھی زائل ہو جائے گا۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ توکل سبب ترک کرنے کے ساتھ ہوتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں طعن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (پس تم اس سے کھاؤ جو تم نے حلال طیب (مال) پایا) تو اس میں غنیمت یعنی کمائی ہے اور مزید ارشاد فرمایا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (تو یہ بھی عمل ہے)۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ یحب العبد المحترف (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی پیشہ (اور کام) کرنے والے بندے کو پسند فرماتا ہے۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سریہ پر قرض دیتے تھے اور آپ کے سوا کسی اور نے کہا ہے: یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا معنی یہ ہے: ھو الثقۃ باللہ والایقان بان قضاءہ ماض کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ یقین رکھنا اور یہ ایمان رکھنا کہ اس کی قضا اور فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور سعی اور محنت کرنے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا ایسے کاموں میں جن میں اسباب ضروری ہیں مثلاً کھانا، پینا، دشمن سے احتیاط اور بچاؤ کرنا، اسلحہ تیار کرنا اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کرتی ہے اور یہی موقف محققین صوفیہ نے اختیار کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اسم توکل ان اسباب کے ساتھ طمانیت و راحت کے حصول اور دلوں کو ان کی طرف ملتفت کرنے کا تقاضا نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ تو کوئی نفع لا سکتے ہیں اور نہ کوئی ضرر دور کر سکتے ہیں، بلکہ سبب اور مسبب دونوں ہی اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں اور سب اسی کی جانب سے ہے اور اسی کی مشیئت سے ہوتا ہے اور متوکل کی جانب سے ان اسباب کی طرف جھکاؤ اور میلان واقع ہو جائے تو وہ اس اسم (کے مفہوم) سے نکل جاتا ہے۔ پھر توکل کرنے والوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

(۱) توکل کی قدرت رکھنے والے کی حالت: یہ تو ان اسباب میں سے کسی شے کی طرف اپنے دل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ حکم امر کے سوا ان میں مشغول ہوتا ہے۔

(۲) قدرت نہ رکھنے والے کی حالت: اور یہ وہ ہوتا ہے جس کی توجہ ان اسباب کی طرف وقتاً فوقتاً ہو جاتی ہے مگر وہ

طریقوں اور دلائل قطعیہ اور براہین قویہ کے ساتھ ان کو اپنے آپ سے دور رکھتا ہے پس وہ اسی طرح کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جود و عطا کے ساتھ قدرت رکھنے والے متوکلین کے مقام پر فائز فرما دیتا ہے اور اسے مقربین کے درجات کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو۔ (عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرما رہے تھے مومنوں سے کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں۔ ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور (اگر) آ دھمکیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک بروز جمعہ بعد ہجرت کے اٹھارہویں ماہ واقع ہوا اور بدر وہاں پانی کا ایک کنواں ہے اسی سبب سے اس جگہ کا نام بدر ہے اور شعبی نے کہا ہے: بدر قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا کنواں تھا اس کا نام بدر تھا[1] اور اسی وجہ سے اس جگہ کا نام بدر رکھا گیا۔ پہلا قول زیادہ معروف ہے۔ واقدی وغیرہ نے کہا ہے: بدر غیر منقول جگہ کا نام ہے اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر کے ضمن میں سورۃ الانفال میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور اَذِلَّةٌ کا معنی ہے بہت کم تھوڑے، کیونکہ وہ اس دن تین سو تیرہ یا چودہ آدمی تھے اور ان کے دشمن نو سو سے ہزار تک کے درمیان تھے۔ اور اذلۃ ذلیل کی جمع ہے۔ اور اس مقام پر ذلیل کا اسم استعارۃً استعمال کیا گیا ہے اور وہ اپنی ذاتوں میں تو یقیناً عزت والے اور غالب تھے لیکن اپنے دشمنوں کی طرف اپنی نسبت کے اعتبار سے اور زمین میں مختلف جگہوں میں بسنے والے تمام کفار کے مقابلے میں غور و فکر کے وقت ان کی قلت اور کمی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان پر غلبہ پا لیا جائے گا۔ اور النصر کا معنی عون (مدد) ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کے دن ان کی مدد فرمائی اور اس میں مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اسی دن پر اسلام کی بنیاد پڑی اور یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ غزوات میں شرکت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542
2۔ ایضاً

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ غزوہ ذی العشیرہ میں ہونے والے غزوہ عشیرہ میں دونوں دوست (ایک ساتھ) تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ وہاں اترے تو ایک مہینہ تک وہیں مقیم رہے اور وہاں بنی مدلج اور ان کے حلیف بنی ضمرہ وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان سے عداوت ترک کر دی تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا: کیا تیرے لئے ممکن ہے (اے) ابا الیقظان کہ ہم ان کے پاس آئیں؟ بنی مدلج کی ایک جماعت ہے اور وہ کران کے لئے کام کر رہی ہے ہم دیکھیں وہ کیسے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے اور ان کی طرف کچھ وقت تک دیکھتے رہے پھر ہم پر نیند غالب آگئی تو ہم نے زمین کی مٹی میں کھجور کے چھوٹے درختوں کا قصد کیا اور ان میں آکر سو گئے، پھر قسم بخدا! ہمیں رسول اللہ ﷺ نے آکر اپنے قدموں کے ساتھ جگایا تو ہم بیٹھ گئے اور ہم اس مٹی سے لتھڑے پڑے تھے تو اس دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: مالک یا ابا تراب تجھے کیا ہوا ہے اے ابا تراب! تو ہم نے آپ ﷺ کو اس کے بارے خبر دی جو ہمیں پیش آیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: الا احدثکم باشقی الناس رجلین (کیا میں تمہیں ایسے دو آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام لوگوں سے زیادہ بدبخت ہیں؟) ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”قوم ثمود کا احیمر جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ) جو تجھے اے علی! اس پر مارے گا　　اور رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھا　.. یہاں تک کہ یہ اس سے تر ہو گیا“ اور (پھر) آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا(1)۔ پس ابو عمر نے کہا: آپ ﷺ بقیہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الاخریٰ کچھ راتیں وہیں مقیم رہے اور اس میں بنی مدلج سے مصالحت کی، پھر واپس لوٹ آئے اور جنگ تک نوبت نہ آئی، پھر اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں کے فاصلے کے ساتھ غزوہ بدر الاولیٰ ہوا، یہ وہ تفصیل ہے جس میں اہل التواریخ والسیر کوئی شک نہیں کرتے، پس حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے خبر دی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ واللہ اعلم۔

اور کہا جاتا ہے: غزوات السیر سین کے ساتھ بھی ہے اور شین کے ساتھ بھی اور اس پر ھا کا اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: العشیر تو۔ پھر غزوہ بدر الکبریٰ ہوا اور جو بھی اس میں حاضر ہوئے ان کے لئے فضیلت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی اور عظیم جنگ ہے اس میں علماء کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے ساتھ اپنے نبی مکرم ﷺ اور مومنین کی مدد فرمائی اور ظاہر آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ غزوہ احد میں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایسا غزوہ احد میں ہوا تو انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ سے تا قولہ تَشْكُرُوْنَ کو دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ یہ عامر شعبی کا قول ہے۔ اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ ملائکہ غزوہ بدر کے دن حاضر ہوئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے اور اسی کے بارے ابو اسید مالک بن ربیعہ کا قول ہے اور یہ بدر میں حاضر تھے: اگر میں اب تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جس سے ملائکہ نکلے ہوئے تھے مجھے اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں ہے۔ اسے عقیل نے زہری عن ابی حازم سلمہ بن دینار سے روایت کیا

1۔ مسند احمد بن حنبل، کتاب اول مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 263، دار صادر

ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا ہے: اس ایک حدیث کے سوا زہری کی ابو حازم سے کوئی حدیث معروف نہیں اور ابو اسید کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ بدری صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں فوت ہونے والے ہیں ابو عمر نے الاستیعاب وغیرہ میں ذکر کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے آپ نے بیان فرمایا: غزوہ بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو انیس ہے تو نبی کریم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگے: اللھم انجز لی ما وعدتنی اللھم آت ما وعدتنی اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (اے اللہ! میرے لئے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اے اللہ! وہ عطا فرما جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہاتھ پھیلا کر مسلسل اپنے رب کریم سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر اسے ڈال دیا، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو پکڑ لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے مناجات کافی ہے، وہ تمہارا وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے تمہارے ساتھ فرمایا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴿الانفال﴾ (یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔

ابو زمیل نے کہا ہے کہ مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس دن مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی مشرک کے پیچھے تیز دوڑ رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے اس پر کوڑا چلنے کی آواز اور گھوڑ سوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے: اقدم حیزوم (اے حیزوم آگے بڑھ) تو اس نے اپنے سامنے مشرک کی طرف دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے تو اس نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی ناک توڑ دی گئی ہے اور اس کا چہرہ اس طرح پھاڑ دیا گیا ہے جس طرح کوڑے کی ضرب سے ہوتا ہے۔ (اور) وہ تمام کے تمام نیلے ہو گئے تو ایک انصاری آیا اور اس نے اس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت ذالک من مدد السماء الثالثۃ (تو نے سچ کہا ہے، وہ تیسرے آسمان سے مدد آئی ہے) پس اس دن وہ ستر مارے گئے اور ستر قیدی بنائے گئے۔ آگے حدیث ذکر کی (1) اور عنقریب سورہ انفال کے آخر میں مکمل آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت عمر اور قرآن نے اس کی موافقت کی ہے جو کچھ حضرت عمر نے کہا ہے، واللہ اعلم۔

خارجہ بن ابراہیم نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بتایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سے پوچھا: بدر کے دن ملائکہ میں سے کون یہ کہہ رہا تھا: اقدم حیزوم؟ تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر، جامع الصحیح، جلد 2، صفحہ 93، مطبوعہ

یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ما کل اہل السماء اعرف (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اہل آسمان کو نہیں پہچانتا۔)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: اس اثنا میں کہ میں بدر کے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا تھا کہ تیز ہوا آئی جس کی مثل میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر وہ چلی گئی۔ پھر اتنی تیز ہوا آئی کہ میں نے اس کی مثل کبھی نہ دیکھی تھی مگر وہی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ راوی کا بیان ہے: میرا گمان ہے کہ انہوں نے ذکر کیا، پھر انتہائی تیز اور شدید ہوا آئی، پس پہلی ہوا کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اترے اور دوسری ہوا کے وقت حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب اترے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری ہوا کے وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائیں جانب اترے اور میسرہ میں میں تھا۔

اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں نے بذات خود غزوہ بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنی تلوار کے ساتھ مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو تلوار اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا سر اس کے جسم سے کٹ کر گر پڑتا۔

اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ لوگ غزوہ بدر کے دن کفار کے ان مقتولوں کو پہچانتے تھے جنہیں فرشتوں نے قتل کیا تھا انہوں نے انہیں گردنوں کے اوپر ضرب لگا کر قتل کیا تھا اور پوروں پر آگ کے نشان کی مثل نشان تھے وہ اس کے ساتھ جلا دیئے گئے، یہ سب بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے: بے شک ملائکہ قتال کرتے رہے ہیں اور کفار میں ان کی ضرب کی علامت بالکل ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ ان کی ضرب لگی اس جگہ میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ابوجہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ بلاشبہ مجھے اس نے قتل کیا ہے جس کے گھوڑے کے سم تک میرا نیزہ بھی نہیں پہنچ سکا اگرچہ کوشش تو نے کی ہے۔ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوا کہ مومنین کے دلوں کو تسکین اور راحت نصیب ہوئی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو یوم قیامت تک مجاہدین بنا دیا، پس ہر لشکر جس نے صبر کیا اور اخلاص اپنایا فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد نے فرمایا: ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا کبھی جنگ نہیں لڑی۔ اور اس کے سوا میں وہ صرف حاضر ہوئے ہیں لیکن وہ قتال نہیں کرتے بلاشبہ وہ تعداد (میں اضافہ کا سبب) یا مدد ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دعا کرتے رہتے ہیں اور تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے (اجر و ثواب میں) اضافہ کا سبب بنتے ہیں جو اس دن قتال کرتے ہیں، پس اس بناء پر تو ملائکہ نے بدر کے دن بھی قتال نہیں کیا بلکہ وہ صرف ثابت قدم رہنے کی دعا کے لئے حاضر ہوئے، پہلا قول اکثر کا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ بدر کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کے ساتھ ان کی امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئے (1)، پس اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542

اس پر قول باری تعالیٰ یُمْدِدْكُمْ دلالت کرتا ہے یا پھر ضمیر تسویم (نشان لگانا) یا انزال (اتارنا) یا معنوی طور پر عدد کے لئے ہے، کیونکہ خمسۃ آلاف عدد ہے۔ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اس میں لام، لام کی ہے، یعنی ولتطمئن قلوبکم بہ جعلہ (تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ایسا کیا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ ۖ وَ حِفْظًا۔ ای وحفظنا بها جعلنٰها (اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اسے بنایا۔)

وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی مومنین کی مدد و نصرت نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس میں کافروں کی مدد داخل نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ بلاشبہ رسوائی، برے انجام اور خسارے سے بھرا اور گدلا ہوتا ہے۔

لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا (یعنی تا کہ وہ قتل کے ساتھ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے) اور نظم آیت اس طرح ہے: ولقد نصرکم اللہ ببدر لیقطع۔ (تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد فرمائی تا کہ وہ کاٹ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے وما النصر الا من عند اللہ لیقطع (مدد نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تا کہ وہ کاٹ دے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُمْدِدْكُمْ کے متعلق ہو، (یعنی وہ تمہاری مدد کرے گا تا کہ وہ کاٹ دے) اور معنی ہے: مشرکین میں سے جو بدر کے دن قتل کئے گئے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے۔ سدی نے کہا ہے: یعنی اس کے ساتھ جو مشرکین غزوہ احد کے دن قتل کئے گئے اور وہ اٹھارہ آدمی تھے۔

اور یَكْبِتَهُمْ کا معنی ہے یحزنهم (یا وہ انہیں پریشان اور غمزدہ کردے) اور المکبوت کا معنی محزون (غمگین) ہے اور روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو طلحہ کے پاس آئے تو ان کے بیٹے کو پریشان اور غمزدہ دیکھا تو فرمایا: "اسے کیا ہوا ہے؟" تو عرض کی گئی: اس کا اونٹ مر گیا ہے۔ اور اس کی اصل جو کہ بعض اہل لغت نے بیان کی ہے یکبدهم ہے ای یصیبهم بالحزن، الغیظ فی اکبادهم (1) (یعنی وہ انہیں غم واندوہ اور غیظ وغضب ان کے دلوں (کلیجوں) میں پہنچائے۔) پھر دال کو تا سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سبت راسہ اور سبدہ میں دال کو تا سے بدلا گیا ہے یعنی اس نے اس کا سر مونڈ دیا (2)۔ کبت اللہ العدو کبتا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اللہ تعالیٰ دشمن کو پھیر دے اور اسے ذلیل و رسوا کردے، اور کبده کا معنی ہے اصابه فی کبده (یعنی اس نے اس کے دل میں تکلیف پہنچائی) کہا جاتا ہے: قد احرق الحزن کبده (غم نے اس کے دل کو جلا دیا) اور احرقت العداوۃ کبدہ (دشمنی نے اس کا جگر جلا دیا۔) اور عرب دشمن کے لئے کہتے ہیں: اسود الکبد۔ (جگر سیاہ ہو گیا)

بعض نے کہا ہے:

فما أشمت من بادي قوم　هم الأعداء والأكباد سود

اس میں الاکباد سود جگر سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

گویا کہ شدت عداوت کے سبب جب جگر جل جاتا ہے تو وہ سیاہ ہو جاتا ہے اور ابو مجلز نے او یکبدهم دال کے ساتھ پڑھا

1۔ احکام القرآن لابن عربی، جلد 1، صفحہ 545　2۔ ایضاً

ہے۔ اور الخائب سے مراد وہ ہے جس کی امید ٹوٹ چکی ہو (کچھ ہاتھ نہ آئے) خاب یخیب اذا لم ینل ما طلب یعنی جو طلب کیا جب وہ اسے نہ پائے تو اس کے لئے خاب یخیب کا لفظ کہا جاتا ہے۔ اور الخیاب یعنی ایسا عیب ہے جسے چھپانا ممکن ہو۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

"نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو اللہ ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو عذاب دے انہیں، پس بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ غزوہ احد میں حضور نبی کریم ﷺ کے دندان مبارک شہید کردیئے گئے اور آپ کا سر زخمی کردیا گیا تو آپ ﷺ اس سے خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: "وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کردیا اور اس کے دانت توڑ دیئے حالانکہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔" تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (1)۔

ضحاک نے کہا ہے: حضور نبی کریم ﷺ نے مشرکین کے لئے بد دعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے استیصال اور بربادی کے بارے دعا مانگنے کی اجازت طلب کی تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے جان لیا کہ ان میں سے بعض عنقریب اسلام قبول کرلیں گے، چنانچہ پھر بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے ان میں سے حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ افراد ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی کریم ﷺ چار آدمیوں کے لئے بد دعا کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت اور توفیق عطا فرمادی۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے (2)۔

اور قولہ تعالیٰ: أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یہ لِيَقْطَعَ طَرَفًا پر معطوف ہے اور معنی ہے تاکہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کردے یا انہیں شکست و ہزیمت کے ساتھ ذلیل و رسوا کردے یا ان کی توبہ قبول فرمالے یا انہیں عذاب دے۔ اور یہاں أَوْ بمعنی حتیٰ اور إِلَّا أَنْ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

... أو نموت فنعذرا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 108، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 125، اسلام آباد

ہمارے علماء نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: کیف یفلح قوم شجوا رأس نبیھم یہ بعید سمجھتا ہے اس کے لئے توفیق کو جس نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ یہ اسے قریب کرتا ہے جسے آپ نے بعید سمجھا اور ان کے اسلام قبول کرنے میں حرص وطمع کا اظہار ہے۔

اور جب اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طمع دلایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں عرض کی: اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون(1) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔) جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: گویا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ انبیاء میں سے کسی نبی علیہ السلام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ آپ کی قوم نے آپ کو مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ”اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔“

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حکایت کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہی محکی عنہ ہیں اور اس پر صریح اور واضح دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیے گئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا گیا غزوہ احد میں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی شاق گزرا تو انہوں نے عرض کی: اگر آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے(2)، اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔“ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واقعہ احد پیش آنے سے پہلے اس کے بارے وحی کی گئی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے معین نہیں کیا اور جب آپ کو یہ واقعہ پیش آیا تو متعین ہو گیا کہ معنی یہی ہے اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض کلام میں اس بارے میں جو کہا ہے وہ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں بددعا کی اور یہ کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا۝ الآیہ (نوح) (اے رب! زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔) اور اگر آپ ہمارے خلاف اس طرح کی دعا کرتے تو ہم اپنے آخری فرد تک ہلاک ہو جاتے، حالانکہ آپ کی پشت کو روندا گیا، آپ کا چہرہ خون آلود کیا گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید کئے گئے لیکن آپ نے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہا اور یہ دعا کی: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون(3) اور آپ کا قول: اشتد غضب اللہ علی قوم کسروا رباعیۃ نبیھم(4) (اللہ تعالیٰ کا غضب شدید اور سخت ہوا اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے دندان مبارک شہید کر دیے) یہ خاصۃً اس کے لئے ہے جس نے ملاقات کیا اور ہم نے اس کا نام ذکر کر دیا ہے اگرچہ اس کے بارے اختلاف ہے اور ہم نے یہ کہا کہ یہ مباشر (عمل کرنے والے) کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ ان میں سے ایک جماعت نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب الصبر علی البلاء، صفحہ 300۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث 3218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 323، اسلام آباد
3۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 208
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسلام قبول کرلیا جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور خوب اچھی طرح اسلام لائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء کرام نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت اس قنوت کے لئے ناسخ ہے جو حضور نبی کرم ﷺ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی کرم ﷺ کو فجر کی نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا: اللھم ربنا ولک الحمد فی الآخرۃ ... پھر کہا ... اللھم العن فلانا و فلانا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ الآیہ۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے (1) اور امام مسلم نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے یہ اس سے زیادہ مکمل اور اتم ہے (2) اور یہ نسخ کا محل نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کرم ﷺ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ امر ان کے پاس نہیں ہے اور یہ کہ وہ غیب میں سے کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو میں انہیں بتاتا ہوں اور یہ کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ جسے چاہے گا اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور جس کے لئے چاہے گا اسے جلدی عذاب میں مبتلا کردے گا۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: لیس لک من الامر شیء وللہ ما فی السموات وما فی الارض دونک و دونھم یغفر لمن یشاء و یتوب علی من یشاء (آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے نہ آپ کا ہے اور نہ ہی ان کا ہے وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرمالیتا ہے) پس اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ سے یہ بیان کیا ہے کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نماز فجر اور اس کے علاوہ نمازوں میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس کوفیوں نے نماز فجر وغیرہا میں قنوت سے منع کیا ہے اور یہی مذہب لیث اور صاحب مالک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا ہے۔ اور شعبی نے اس کا انکار کیا ہے اور موطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ کسی نماز میں قنوت نہ پڑھتے تھے (3)۔ اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ نے عن خلف عن ابی مالک الاشجعی عن ابیہ کی سند سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے دعائے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہ پڑھی، پھر فرمایا: اے بیٹے! یہ بدعت ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب و السنہ، جلد 2، صفحہ 1091، اسلام آباد۔ ایضاً حدیث نمبر 6800، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ موطا امام مالک، باب القنوت فی الصبح، صفحہ 143، اسلام آباد
4۔ سنن نسائی، باب ترک القنوت، جلد 1، صفحہ 164۔ ایضاً جامع ترمذی، باب ما جاء فی ترک القنوت، حدیث نمبر 368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمیشہ قنوت پڑھی جائے گی اور تمام نمازوں میں (پڑھی جائے گی) جبکہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ امام شافعی اور طبری نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز فجر میں مستحب ہے اور یہ امام شافعی سے مروی ہے اور حسن اور سحنون نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اور یہی علی بن زیاد کی اس روایت کا تقاضا ہے جو امام مالک سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر اسے چھوڑنے والا نماز کا اعادہ کرے گا اور علامہ طبری نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ اسے چھوڑ دینا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ اور حسن سے منقول ہے کہ قنوت کے ترک ہو جانے میں سجدہ سہو لازم ہے اور یہی امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دار قطنی نے سعید بن عبد العزیز سے اس کے بارے بیان کیا ہے جو صبح کی نماز میں قنوت بھول گیا۔ فرمایا: وہ سہو کے دو سجدے کرے گا۔ اور امام مالک نے رکوع سے پہلے کو اختیار کیا ہے اور یہی اسحاق کا قول ہے اور یہی امام شافعی، احمد اور اسحاق کا بھی قول ہے۔ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے اس بارے میں اختیار مروی ہے (یعنی چاہے تو رکوع سے پہلے پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد) اور دار قطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز میں مسلسل قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ابو داؤد نے مراسیل میں خالد بن ابی عمران سے ذکر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ ﷺ مضر کے خلاف دعا کر رہے تھے کہ اچانک جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہیے تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے، پھر انہوں نے کہا: "اے محمد! ﷺ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اس نے آپ کو رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اس نے آپ کو عذاب کے لئے نہیں بھیجا۔ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ راوی نے بیان کیا: پھر انہوں نے آپ ﷺ کو یہ دعائے قنوت سکھائی پس فرمایا: اللهم انا نستعينك و نستغفرك ونؤمن بك ونخضع لك ونخلع ونترك من يكفرك اللهم اياك نعبد ولك نصلي ونسجد واليك نسعى و نحفد ونرجو رحمتك ونخاف عذابك الجد ان عذابك بالكافرين ملحق۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۚ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۚ

"اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچاؤ اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

قولہ تعالیٰ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سود کھانے سے یہ نہی قصہ احد کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مجھے اس بارے میں روایت کردہ کوئی شے یاد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے: وہ ایک مدت تک بیع کرتے تھے اور جب مدت مقررہ گزر جاتی تو وہ اسے مؤخر کرنے کی شرط پر ثمن میں اضافہ کر دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا

كَأَنَّ بِلَادَ اللهِ وَهِيَ عَرِيضَةٌ عَلَى الْخَائِفِ الْمَطْلُوبِ كِفَّةُ حَابِلِ

اس میں وہی عریضۃ وسیع و عریض ہونے کے معنی میں ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مقطع عرب پر کلام بطور استعارہ جاری ہے، پس جب جنت وسعت اور انفساح کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو پھر اسے آسمانوں اور زمین کے عرض کے ساتھ بیان کرنا انتہائی حسین عبارت ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی سے کہتا ہے: ھذا بحر (یہ تو سمندر ہے) اور حیوانوں میں سے کسی بڑے کے لئے یہ کہتا ہے: ھذا جبل یہ پہاڑ ہے تو آیت نے ارضا معہ بیان کرنے کا قصد نہیں کیا، البتہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہر اس شے سے وسیع تر ہے جسے تم نے دیکھا ہے۔ اور عام علماء کا نظریہ ہے کہ جنت تخلیق کر دی گئی ہے اور یہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ اور اس کا بیان حدیث اسراء وغیرہ میں ہے جو صحیحین وغیرہما میں بیان کی گئی ہے۔

اور معتزلہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں (جنت اور جہنم) ہمارے وقت میں موجود نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ جب آسمانوں اور زمین کو لپیٹ دے گا تو پھر وہ جنت اور جہنم کو جہاں چاہے گا بنا دے گا، کیونکہ یہ دونوں ثواب و عقاب کے لئے دار جزا ہیں، لہٰذا انکار کا مکلف بنائے جانے کے بعد جزا کے وقت میں انہیں بنایا جائے گا، تا کہ دار التکلیف اور دار الجزاء دنیا میں جمع نہ ہو جائیں۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: جنت میں قیامت کے دن اضافہ کر دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں منذر بن سعید وغیرہ کا تعلق قائم کیا گیا ہے ان سے جنہوں نے کہا: بلاشبہ ابھی تک جنت تخلیق نہیں کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن فورک کا یہ قول "کہ اس میں اضافہ کیا جائے گا" یہ جنت کے موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ ایک سند کا محتاج ہے جو زیادتی کے قطع میں قطعی ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس بارے میں صحیح کہا ہے کہ جب انہوں نے کہا: جب ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ان دراہم کی طرح ہیں جو زمین کے وسیع بیابان میں ڈال دیئے گئے ہوں اور کرسی عرش کے سامنے اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع زمین میں رکھ دیا گیا ہے تو جنت اب اسی حالت پر ہے جس پر وہ آخرت میں ہوگی کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، کیونکہ عرش اس کی چھت ہے، جیسا کہ اس کے مطابق ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ چھت اپنے نیچے آنے والی ہر شے کو گھیرے ہوتا ہے اور کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے اور جب تمام مخلوقات اس (عرش) کی نسبت ایک انگوٹھی کی طرح ہیں تو پھر کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہو اور اس کے طول و عرض کو جانتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو اس کا خالق ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کی مملکت کی وسعت کی کوئی نہایت اور حد ہے۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾

"(پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور در گزر کرنے

والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ یہ ان متقین کی صفت ہے جن کے لئے جنت تیار کی گئی ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ فعل مندوب الیہ کے ساتھ مدح اور تعریف ہے اور السَّرَّآءِ کا معنی آسانی اور وَالضَّرَّآءِ کا معنی تنگی ہے۔

یہ ابن عباس، کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے اور عبید بن عمیر اور ضحاک نے کہا ہے کہ السَّرَّآءِ اور الضَّرَّآءِ کا معنی خوشحالی اور تنگدستی ہے۔ اور صحت و بیماری کی حالت میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فِي السَّرَّآءِ کا معنی ہے زندگی میں اور فی الضراء سے مراد وہ ہے جس کی وہ موت کے بعد وصیت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد شادی اور ولیموں میں خرچ کرنا ہے اور فی الضراء سے مراد تکالیف اور ماتم میں خرچ کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ نفقہ ہے جو تمہیں خوش کرتا ہے مثلاً اولاد اور قرابتداروں پر خرچ کرنا اور ضراء سے مراد دشمنوں پر خرچ کرنا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ وہ جوان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اسے ہدیہ دیتا ہے اور ضراء وہ ہے جس کو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں پر خرچ کرتا اور اس سے ان پر صدقہ کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں۔ یہ آیت عام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور یہ ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 2۔ اور کظم الغيظ کا معنی ہے غصے کو پیٹ میں لوٹانا، کہا جاتا ہے: کظم غيظه یعنی وہ اس پر خاموش رہا اور اس کا اظہار نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمن پر برسنے اور حملہ آور کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اور کظمت السقاء کا معنی ہے میں نے مشکیزہ بھرا اور اس کا منہ بند کر دیا اور الکظامۃ وہ شے جس کے ساتھ پانی کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اسی سے الکظام اس تسمہ (دھاگے) کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مشکیزے کا منہ بند کیا جاتا ہے اور کظم البعیر جرته جب اونٹ جگالی کو اپنے پیٹ میں لوٹا دے، اور کبھی کظم اس معنی کے لئے بولا جاتا ہے کہ وہ جگالی سے رک جائے قبل اس کے کہ وہ اسے اپنے منہ کی طرف بھیجے۔ اسے زجاج نے بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: کظم البعیر و الناقة جب یہ جگالی نہ کریں۔

اور اسی سے راعی کا قول ہے:

فَأَفَضْنَ بَعْدَ كُظُوْمِهِنَّ بِجِرَّةٍ ... مِنْ ذِي الأَبَارِقِ إِذْ رَعَيْنَ حَقِيْلا

اس میں جگالی سے رکنے کے معنی میں لفظ کظوم استعمال ہوا ہے۔

الحقیل ایک جگہ ہے۔ اور الحقیل ایک بوٹی بھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گھبراہٹ اور مشقت و تھکاوٹ کے وقت ایسا کرتا ہے اور وہ جگالی نہیں کرتا۔

اعشی نے اونٹوں کو ذکر کرنے والے آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا اور وہ اس سے گھبرا گئے تھے:

قد تكظم البزل منه حين تبصره ... حتى تُقَطَّع في أجوافها الجرر

طاقتور اونٹ بھی جب اسے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے یہاں تک کہ جگالی اس کے پیٹ میں ہی کٹ جاتی ہے۔ (یعنی جگالی کے لئے پیٹ سے باہر کوئی شے نہیں لا سکتا۔)

اور اسی سے ہے: رجل کظیم و مکظوم جب کوئی غم زدہ ہو اور وہ حزن و ملال سے بھرا ہوا ہو۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۞ (یوسف) (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے) اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۞ (القلم) (جب آپ نے پکارا اور وہ غم و اندوہ سے بھرے ہوئے تھے) اور غیظ غضب کی اصل اور بنیاد ہے اور اکثر اوقات تو یہ دونوں لازم و ملزوم ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ غیظ جوارح (اعضاء بدن) پر ظاہر نہیں ہوتا بخلاف غضب کے کیونکہ یہ جوارح میں ایسے فعل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے اسی لئے جب غضب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقصود وہ افعال ہوتے ہیں جو الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے غیظ کی تفسیر غضب سے کی ہے اور یہ عمدہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ لوگوں کو معاف کرنا نیکی اور خیر کے افعال میں سے انتہائی عظیم فعل ہے اس حیثیت سے کہ آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دے اور یہ کہ وہ اپنے حق کی طرف متوجہ ہو اور ہر وہ جو سزا کا مستحق ہو لیکن اسے چھوڑ دیا جائے تو تحقیق اسے معاف کر دیا گیا اور عَنِ النَّاسِ کے معنی میں اختلاف ہے پس ابو العالیہ کلبی اور زجاج نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ سے مراد غلاموں کو معاف کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مثال کے طور پر یہ بہت اچھا ہے۔ کیونکہ وہ خادم ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں اور ان پر قدرت آسان ہوتی ہے اور سزا کو نافذ کرنا سہل ہوتا ہے اس لئے مفسر نے اس کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ اور میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ان کی ایک کنیز تھی وہ ایک دن ایک بڑا پیالہ لے کر آئی اس میں گرم شوربا تھا اور آپ کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ پس وہ گر پڑی اور شوربا آپ پر پڑ گیا تو میمون نے اسے مارنا چاہا تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیجئے: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ تو اس نے کہا: تحقیق میں نے کر دیا۔ پھر اس نے کہا: جو اس کے بعد ہے اس پر بھی عمل کیجئے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ تو اس نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پھر اس لونڈی نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو میمون نے کہا: میں نے تجھ پر احسان کر دیا۔ پس تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد ہے۔ احنف بن قیس سے اسی طرح مروی ہے۔

اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کے ظلم اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں [1]۔ یہ حکم عام ہے اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مقاتل بن حیان نے اس آیت میں کہا ہے: ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: "میری امت میں سے یہ قلیل (لوگ) ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ حالانکہ گزشتہ امتوں میں یہ کثیر لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف فرمائی ہے جو غصے کے وقت بخش دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۞ (الشوریٰ) (اور جب وہ غضبناک ہوتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 549

چاہیے تھے۔ ترمذی: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (1)

اور حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا: جس شخص کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اسے چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اور کہا جائے گا: یہ کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؟ تو لوگوں سے درگزر کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔" اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اور ابن مبارک نے کہا ہے: میں منصور کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے ایک آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا تو میں نے کہا: اے امیر المومنین! رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: "جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی ندا دے گا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی احسان ہو تو وہ کھڑا ہو جائے پس کوئی آگے نہیں بڑھے گا سوائے اس کے جس نے معاف کیا اور غلطی سے درگزر کی۔" پس یہ حکم اپنے اطلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے احسان پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ تو امکان کے وقت احسان کرے، کیونکہ ہر وقت تیرے لئے احسان ممکن نہیں ہوگا۔

شاعر نے کہا ہے:

بادر بخیر اذا ما کنت مقتدرا ... فلیس فی کل وقت انت مقتدر

تو خیر اور نیکی کے عمل میں جلدی کر جب تو اس کی قدرت رکھتا ہو، ہر وقت میں تو اس پر قادر نہیں ہوگا۔

اور ابو العباس الجمانی نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

لیس فی کل ساعۃ واوان ... تتھیا صنائع الاحسان

ہر ساعت اور ہر وقت میں احسان کرنے والا (اس کے لئے) تیار نہیں ہوتا۔

واذا امکنت فبادر الیھا ... حذرا من تعذر الامکان

اور جب امکان ہو تو پھر اس کی طرف جلدی کر اس خوف سے کہ کہیں امکان متعذر ہو جائے۔ محسن اور احسان کے بارے میں قول سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام یا ظلم کر لیں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو انہوں نے کیا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں۔"

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب من کظم غیظا، جلد 2، صفحہ 303، اسلام آباد۔ ایضاً حدیث نمبر 4147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں ہوئی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس کے گھر کی دہلیز پر لکھ دیا جاتا تھا" تو اپنی ناک توڑ دے تو اپنا کان کاٹ لے تو اس طرح کر"۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور رحمت فرماتے ہوئے بنی اسرائیل کے اس قول کے عوض یہ آیت نازل فرمائی۔

اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس رو پڑا۔ اور فاحشۃ کا اطلاق ہر معصیت (گناہ) پر کیا جاتا ہے، حالانکہ اکثر طور پر یہ زنا کے ساتھ خاص ہے یہاں تک کہ حضرت جابر بن عبداللہ اور سدی نے اس آیت میں اس کی تفسیر زنا کے ساتھ ہی کی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ میں اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ واؤ کے معنی میں ہے اور مراد وہ (گناہ) ہیں جو کبائر میں شامل نہ ہوں۔

ذَكَرُوا اللّٰهَ اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے اور اس سے حیا کرتے ہوئے اس کا ذکر کرتے ہیں جو ضحاک نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی پیشی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ فکر کرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس کے بارے پوچھے گا؛ اسے کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔

اور مقاتل سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ یعنی وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہر وہ دعا جس میں یہ معنی ہو یا اس کے الفاظ ہوں تو وہ استغفار کہلاتا ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں سید الاستغفار کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ اس کا وقت سحری کا ہے۔ پس استغفار عظیم ہے اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، حتیٰ کہ ترمذی نے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "جس نے یہ کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ (1) تو اسے بخش دیا جائے گا اگرچہ وہ میدان جہاد سے بھاگا ہو"۔

اور مکحول نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: "میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا"۔ اور حضرت مکحول نے کہا ہے: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اور حضرت مکحول خود بھی کثیر الاستغفار تھے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مطلوب استغفار وہ ہے جو اصرار کی گرہ کو کھول دیتا ہے اور اس کا معنی دل میں ثابت ہو جاتا ہے نہ کہ صرف زبان سے تلفظ کرتا ہے۔ پس جس نے اپنی زبان سے کہا: استغفر اللہ اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی پر مصر رہا تو اس کا یہ استغفار بھی استغفار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ کبائر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہمارا استغفار بھی استغفار کا محتاج ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آپ یہ قول اپنے زمانے میں کہتے تھے تو ہمارے اس زمانے میں کیفیت کیا ہو گی جس میں انسان ظلم و ستم پر مصر رہتے ہوئے عمل کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور اس پر ایسا حریص ہے کہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور تسبیح اس کے ہاتھ

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء الضیف، حدیث نمبر 3501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الحق رمیں دائمی غور وفکر کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت اور اطاعت کرنے والوں کے ساتھ وعدوں کی تفصیل ذکر کی ہے اور جو کچھ اس میں عذاب جہنم اور گنہگاروں کو ڈرانے کا بیان کیا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ غور وفکر کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا خوف اور امید قوی ہو جائے اور وہ رغبت رکھتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ رغبت اور رہبت ہی خوف اور رجا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ وہ سزا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی راہ صواب کی توفیق دینے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اس پر ابھارنے والی وہ تنبیہ الٰہی ہے جس کے ساتھ وہ اسے متنبہ کرتا ہے جس کے لئے وہ سعادت کا ارادہ کرے اور گناہوں کے قبح اور ضرر کا کیونکہ وہ تو ہلاک کرنے والا زہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اختلاف لفظ میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں اس کی تنبیہ کے بغیر غور وفکر نہیں کرتا، پس جب بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اپنے آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ان گناہوں سے بھرا ہوا پاتا ہے جو اس نے کمائے ہیں اور ان برائیوں سے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کوتاہی اور سستی پر اس میں ندامت اور شرمندگی کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے سابقہ اعمال کی مثل اعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے تو ایسے آدمی پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ تائب (توبہ کرنے والا) ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر وہ معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور ہلاکت کے اسباب کو لازم پکڑنے والا ہوگا۔

سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: تائب کی علامت یہ ہے کہ گناہ اسے کھانے پینے سے مشغول رکھے جیسا کہ وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس میں کئی اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مغفرت طلب کی تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان (چیزوں) کے بارے جانتے ہیں جو تم نے ان پر حرام کی ہیں، یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مقاتل اور کلبی تمام نے کہا ہے: اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اصرار تکلیف دہ ہے اور اسے چھوڑ دینا سرکشی کی نسبت بہتر ہے۔ اور حسن بن فضل نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ کو بخش دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: انہوں نے یہ معنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے لیا ہے وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اپنے رب کریم سے اسے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے اللہ! میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے ایک گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو معاف فرما

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب بن مالک، حدیث نمبر 4088، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رہتا ہے اور گناہ کے سبب وہ پکڑ لیتا ہے پھر وہ لوٹتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا گناہ بخش دے۔ ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل دوبارہ ذکر کیا اور آخر میں فرمایا: اعمل ماشئت فقد غفرت لک تو جو چاہے عمل کر میں نے تجھے بخش دیا (1)۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دوبارہ گناہ کرنے کے توبہ کو توڑنے کے بعد دوبارہ توبہ کرنا صحیح ہے۔

کیونکہ پہلی توبہ طاعت ہے وہ گزر چکی ہے اور صحیح ہے اور دوسرا گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اب وہ دوسری نئی توبہ کا محتاج ہے اور گناہ کی طرف لوٹنا اگرچہ اس کی ابتدا سے زیادہ قبیح ہے، کیونکہ گناہ کی نسبت توبہ توڑنے کی طرف ہے تو توبہ کی طرف لوٹنا اس کی ابتدا سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ اس کی طرف کریم اور حق کے دروازے کو انتہائی اصرار کے ساتھ لازم پکڑنے کی نسبت ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

اور حدیث کے آخر میں یہ قول اعمل ما شئت یہ امر ہے اور اس کا معنی ایک قول کے مطابق اکرام (عزت کرنا) ہے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہو جائے گا: ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ (ق: 34) (داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے) کلام کا آخر مخاطب کی حالت کے بارے خبر ہے کہ اس کے سابقہ گناہوں سے اس کی مغفرت کر دی گئی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے کاموں میں ان شاء اللہ محفوظ ہوگا۔

آیت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کے اعتراف اور اس سے استغفار کرنے کا عظیم فائدہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان العبد اذا اعترف بذنبه ثم تاب الی اللہ تاب اللہ علیه (2) (بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کرے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔) اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔

اور کسی شاعر نے کہا ہے:

یستوجب العفو الفتی اذا اعترف ۔۔۔ بما جنی من الذنوب و اقترف

نوجوان عفو و درگزر کو واجب کر لیتا ہے جب وہ ان گناہوں کا اعتراف کرے جن کا ارتکاب اس نے کیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

اقرر بذنبك ثم اطلب تجاوزه ۔۔۔ ان الجحود جحود الذنب ذنبان

اپنے گناہ کا اقرار کر پھر اس سے درگزر کرنے کا مطالبہ کر بلاشبہ گناہ کا انکار کرنا دو گناہ ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے (ختم کر دے) اور ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں گے اور استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ (والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب الله

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 357، کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6953، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک، جلد 2، صفحہ 596، اسلام آباد۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، حدیث 2467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مکہ ولعباد بقومٍ یذنبون ویستغفرون فیغفر لھم: (1)) اور اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفار اور تواب کا یہی فائدہ ہے۔ ہم نے اسے "الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ" میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ گناہ وہ ہیں جن سے توبہ کی جا سکتی ہے چاہے وہ کفر ہو یا اس کے سوا کوئی اور۔ پس کافر کی توبہ اس کا ایمان لانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ وہ اپنے سابقہ کفر پر نادم بھی ہو، صرف ایمان لانا نفس توبہ نہیں ہے اور اگر گناہ کفر کے علاوہ ہو تو پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا وہ کسی بندے کا حق ہوگا۔ پس حقوق اللہ میں سے ہونے کی صورت میں توبہ کے لئے اسے چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، سوائے ان کے جن میں شریعت نے صرف ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض کی طرف قضا کی نسبت کی ہے جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جن کی طرف کفارہ کی نسبت کی ہے جیسا کہ قسم توڑ دینا اور ظہار وغیرہ ہیں۔ اور رہے حقوق العباد تو انہیں ان کے مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پائے جائیں تو ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی تنگدستی کے سبب اس کی استطاعت نہ پائے جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے تو پھر معاف فرمانا اللہ تعالیٰ کا معمول ہے اور اس کا فضل وافر ہے۔ پس کتنے تبعات کا وہ ضامن بنا ہے اور کس نے سیئات کو حسنات سے بدل دیا ہے۔ عنقریب اس کا مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب اسے اپنا گناہ یاد نہ ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو کہ وہ ہر معین گناہ کی طرف سے توبہ کرے، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسے گناہ یاد آ جائے تو وہ اس سے توبہ کر لے۔ اور بہت سے لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے جو ہمارے شیخ ابو محمد عبد المعطی الاسکندرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محاسبی رحمۃ اللہ علیہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ اجناس معاصی سے توبہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور یہ کہ ان تمام پر نادم ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جوارح کے ہر فعل سے اور اپنے دل کے ہر عقیدہ سے معین طور پر توبہ کرے۔ انہوں نے ان کے قول سے یہی گمان کیا ہے، حالانکہ یہ ان کی مراد نہیں ہے اور نہ ان کا کلام اس کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ مکلف کا حکم یہ ہے کہ جب وہ اپنے افعال کا حکم پہچان لے اور معصیت کو غیر سے پہچان لے تو اس کے لئے ان تمام سے توبہ کرنا صحیح ہے جنہیں اس نے پہچان لیا، کیونکہ اگر اس نے اپنے ماضی کے فعل کے گناہ ہونے کو نہ پہچانا تو اس کے لئے اس سے توبہ کرنا ممکن نہ ہوگا نہ افراداً اور نہ تفصیلاً۔ اس کی مثال وہ آدمی ہے جو سود کے دروازوں میں سے کسی دروازے کو لے لیتا ہے اور وہ اسے تجارت کی قسم سمجھ رہا ہے، پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ) (اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایماندار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)

تو اس پر یہ تہدید انتہائی شدید ثابت ہوئی اور اس کا گمان تھا کہ وہ سود سے سالم اور محفوظ ہے۔ لیکن اب جب اسے سود کی حقیقت کا علم ہوا پھر وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں متفکر ہوا اور اس نے جان لیا کہ وہ سابقہ دنوں میں سود میں

1۔ صحیح مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 355، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

اور اس سے زیادہ واضح وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے ابو کبشہ انماری کی حدیث سے، اور اسے صحیح مرفوع قرار دیا ہے۔ "بے شک دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لئے ہے: ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا رہتا ہے، اور اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو جانتا ہے تو یہ افضل ترین مقام و مرتبہ پر ہوگا، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اسے مال نہ دیا اور وہ نیت کے اعتبار سے صادق اور سچا ہو [اور وہ یہ کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا، اور اس نے اس کی نیت کی تو ان دونوں کا اجر برابر ہو گا، اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اسے علم نہیں دیا اور وہ [اپنے مال میں بغیر علم کے تصرف کرتا ہے] اور اس میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی حق جانتا ہے تو وہ خبیث ترین درجہ میں ہوگا، اور چوتھا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا فرمایا اور نہ ہی علم، اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یقیناً اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا، اور وہی اس کی نیت ہو تو دونوں کا بوجھ برابر ہو گا۔(1)"

اور یہی وہ ہے جس کی طرف وہ مائل ہوئے ہیں اور اسی پر عام سلف اور اہل علم فقہاء، محدثین اور متکلمین ہیں، اور اس کے خلاف جس نے یہ گمان کیا ہے کہ جس شے کا انسان قصد کرتا ہے اگرچہ وہ اس پر ثابت اور پختہ ہو جائے تو صرف ارادہ کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی، اور اس کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کوئی حجت نہیں ہے: "جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اس کے بارے کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کے مطابق عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا(2)"۔ کیونکہ فلم یعملها کا معنی ہے: اور اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ اور اس کی دلیل وہ ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، اور فان عملها کا معنی ہے: اگر اس نے اسے ظاہر کیا یا اس کا ارادہ کیا۔ اور اس کی دلیل بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾

"یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنتیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں

ہمیشہ رہیں گے اور ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ گناہوں کی بخشش کو ان کے لئے لازم کیا ہے جو اپنی توبہ میں مخلص ہیں اور اپنے گناہ پر مصر نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مقاصد کے ساتھ متصل ہو۔ یعنی جو بھاگے پھر توبہ کر لی اور اصرار نہ کیا تو ان کے لئے مغفرت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ اسلام آباد، صفحہ 57۔

2۔ مسلم، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السموات وفرض الصلوات، جلد 1، صفحہ 91، وزارت تعلیم۔

الْمُكَذِّبِيْنَ ۞

"گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے لیے تسلی ہے اور سنن سنۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد صراط مستقیم ہے۔ (کہا جاتا ہے) فلان علی السنۃ یعنی فلاں سیدھے راستے پر ہے وہ خواہشات نفسانی میں سے کسی شے کی طرف جھکتا نہیں۔

ہذلی نے کہا ہے:

فلا تجزعن من سنۃ انت سرتہا　　فاول راض سنۃ من یسیرھا

تو اس راستے سے خوفزدہ اور پریشان نہ ہو جس پر تو چلا کیونکہ جو اس پر چلتا ہے وہ پہلے اس راستے سے راضی ہوتا ہے۔

اور سنۃ سے مراد وہ امام ہے جس کی اتباع اور اقتدا کی جائے، کہا جاتا ہے: سن فلان سنۃ حسنۃ و سیئۃ جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے اس میں خیر ہو یا شر۔

لبید نے کہا ہے:

من معشر سنت لھم اباؤھم　　ولکل قوم سنۃ وامامھا

اہل خانہ کے لیے ان کے آباء نے طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر قوم کے لیے مقتدا اور ان کا امام ہے۔

اور سنۃ سے مراد امت، اور سنن سے مراد امم ہیں، یہ معنی مفضل سے منقول ہے۔

اور اس نے شعر کہا ہے:

ما عاین الناس من فضل کفضلھم　　ولا راوا مثلھم فی سالف السنن

لوگوں نے ان کے فضل کی طرح کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ان کی مثل سابقہ امتوں میں کوئی دیکھا۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی اہل سنن ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور ابو زید نے کہا ہے: مراد امثال ہیں۔ عطا کا قول ہے: مراد شرائع ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ یعنی ہلاکت کے ساتھ ان میں گزر چکی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے جھٹلایا ہے جیسا کہ قوم عاد و ثمود۔ اور العاقبۃ کا معنی ہے: کسی امر کا آخر یعنی انجام۔ اور یہ احد کے دن شکست ہوا۔ وہ فرماتا ہے: پس میں انہیں مہلت دوں گا اور میں انہیں ڈھیل دیتا رہوں گا اور میں ان کے لیے تدبیر بناتا رہوں گا یہاں تک کہ لکھی ہوئی تقدیر اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گی، یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت و مدد کے ساتھ اور ان کے دشمن کافروں کو ہلاک کرنے کے ساتھ۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞

"یہ ایک بیان ہے لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔"

یعنی یہ قرآن ایک بیان ہے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کی طرف اشارہ ہے: قَدْ

اور ان کے سوا دوسروں کی ارواح جنت تک نہیں پہنچتی ہیں، پس شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جنت کے لئے حاضر ہونے والا۔ آنے والے بیان کے مطابق یہی صحیح معنی ہے۔ اور شہادت کی فضیلت بہت عظیم ہے، اور تیرے لئے اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ (التوبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ... یہی بڑی کامیابی ہے۔)

اور صحیح البستی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف پاتا ہے جتنی تم میں سے کوئی پھوڑے سے پاتا ہے (1)۔" اور نسائی نے بیان کیا ہے کہ راشد بن سعد نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین کو کیا ہوا ہے کہ سوائے شہید کے انہیں اپنی قبروں میں آزمائش اور فتنہ میں ڈالا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے سر پر تلواروں کی چمک فتنہ اور آزمائش کے لئے کافی ہے (2)۔" اور بخاری میں ہے: "مسلمانوں میں سے احد کے دن جو شہید کئے گئے" ان میں سے حضرت حمزہ، یمان، انضر بن انس، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ہیں۔ عمرو بن علی نے مجھے بیان کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے کہا: میرے باپ نے حضرت قتادہ سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم قبائل عرب میں سے کوئی ایسا قبیلہ نہیں جانتے جس میں انصار سے بڑھ کر شہید ہوں اور قیامت کے دن وہ ان سے زیادہ عزت والا ہو۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اور ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ ان میں سے احد کے دن ستر آدمی شہید کئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر اور یمامہ کے دن بھی ستر (آدمی شہید کئے گئے)۔ فرمایا: بئر معونہ کا واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوا اور جنگ یمامہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی (3)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اور آپ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ساٹھ کے قریب زخم تھے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر دست مبارک پھیرنے لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس طرح جڑنے اور مندمل ہونے لگے گویا وہ تھے ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ارادہ امر کا غیر ہے۔ (یعنی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، صفحہ 206، اسلام آباد
2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 289، اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔) جیسا کہ اہل السنہ یہی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنین کے قتل سے منع کیا ہے، یعنی حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کو شہید کرنے سے۔ اور ان کے قتل کا ارادہ فرمایا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے منع فرمایا اور کھانے کا ارادہ فرمایا پس آدم علیہ السلام اس میں واقع ہوئے۔ اور اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا ارادہ نہیں کیا پس وہ اس سے رک گیا، اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول حق کے ساتھ اشارہ بھی واقع ہے: وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبہ: 46) (لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑا ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا انہیں)۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام کو جہاد کا حکم دیا ہے، لیکن سستی، کاہلی اور سفر سے رہ جانے والے اسباب بھی پیدا فرما دیئے پس وہ پیچھے بیٹھ رہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو عرض کی: ”آپ قیدیوں کے بارے میں اپنے اصحاب کو اختیار دے دیجئے اگر وہ چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان کے برابر ان میں سے قتل کیے جائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور ہم میں سے قتل کیے جائیں گے۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اپنے اولیاء کی شہادت کے ساتھ پورا کر دیا اس کے بعد کہ انہیں اختیار دیا تو انہوں نے قتل کو اختیار کیا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو دوست نہیں رکھتا یعنی اگر وہ مومنین کی جانب سے کفار کو کچھ دے تو وہ انہیں پسند نہیں کرتا ہے اور اگر وہ مومنین کے سبب کچھ تکلیف پہنچائے تو بلاشبہ وہ مومنین کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

”اور اس لئے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔“

اس میں تین اقوال ہیں: یُمَحِّصَ بمعنی یختبر (تاکہ وہ آزمائے) دوسرا یطہر (تاکہ وہ انہیں گناہوں سے پاک کرے) اس صورت میں مضاف محذوف ہے، معنی یہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو ختم کر دے جو ایمان لائے، فراء نے یہی کہا ہے اور تیسرا یمحص بمعنی یخلص (تاکہ وہ انہیں نکھار دے اور صاف کر دے) یہ معنی زیادہ غریب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: کہا جاتا ہے محص الحبل یمحص محصا جب رسی کی اون کٹ جائے، اور اسی سے ہے اللّٰھم محص عنا ذنوبنا اے اللہ! ہم سے ہمارے گناہوں کو صاف کر دے (ختم کر دے) یعنی ہمیں ان کی سزا سے نجات عطا فرما۔ اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: میں نے محمد بن یزید کو خلیل پر قرأت کی: التمحیص (بمعنی) التخلیص ہے۔ کہا جاتا ہے: محصہ [یمحصہ] محصا جب وہ اسے نجات دلا دے، صاف کر دے، پس معنی ہوگا: اس پر ہے کہ وہ مومنین کو آزمائے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا فرمائے اور انہیں ان کے گناہوں سے نجات دلائے۔ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی وہ انہیں ہلاک

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 190، اسلام آباد

چیخ کر کہا: قد قتل محمد۔ (تحقیق محمد ﷺ کو شہید کر دیا گیا۔) صاحب الوسیط نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: تحقیق محمد ﷺ کو موت دی گئی ہے پس تم انہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ دو کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض نے کہا ہے: اگر محمد ﷺ کو موت دی گئی ہے تو کیا تم اس حالت پر باقی نہیں رہو گے جس پر تمہارے انبیاء رہے یہاں تک کہ تم آپ سے جا ملو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا: وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (1)۔ اس میں ما نافیہ ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہے، اور ما کا عمل باطل ہو گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح قرأت کی ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ رُسُلٌ یعنی بغیر الف لام کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر آگاہ فرمایا ہے کہ رسل علیہم الصلوات والتسلیمات اپنی قوم میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کو مضبوطی سے تھامنا واجب ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے اگرچہ رسول موت یا قتل کے سبب مفقود ہو۔ اور اپنے نبی کریم ﷺ کی عزت و تکریم فرمائی (آپ کے دو وصفوں) دو اسموں کے ساتھ جو دونوں آپ کے اسم سے مشتق ہیں محمد اور احمد ﷺ عرب کہتے ہیں: رجل محمود و محمد جب اس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

الی الماجد القرم الجواد المحمد

تحقیق یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور عباس بن مرداس نے کہا ہے:

یا خاتم النباء انک مرسل بالخیر کل ھدی السبیل ھداکا

اے خاتم الانبیاء! بلاشبہ آپ خیر و بھلائی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہر راہ ہدایت آپ ہی کی ہدایت ہے۔

ان الالہ بنی علیک محبۃ فی خلقہ و محمدا سماکا

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تجھ پر محبت کی بنیاد رکھی ہے اور تیرا نام محمد ﷺ رکھا ہے۔

پس یہ آیت شکست کھانے والوں کے عتاب کا محل ہے یعنی ان کے لیے شکست کھانا نہیں ہے اگرچہ محمد ﷺ بھی شہید کر دیئے جائیں، اور نبوت موت کو دور نہیں کر سکتی، اور ادیان انبیاء علیہم السلام کی موت سے زائل نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور آپ کی جرأت پر سب سے بڑھ کر دلیل ہے، کیونکہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

شجاعت اور جرأت کی تعریف اور حد مصائب و آلام آنے کے وقت دل کا ثابت رہنا ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ پس اسی وقت آپ کی شجاعت اور آپ کا علم ظاہر ہو۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے، ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی (معاملہ) مخفی رکھا۔ اور معاملہ مضطرب ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کیا جب آپ اپنی رہائش گاہ سنح سے آئے۔

بخاری میں اسی طرح ہے(1) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ جو کہ خارجہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ عوالی میں تھے تو لوگ کہنے لگے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ یہ انہی حالات میں سے ایک حالت ہے جو وحی نازل ہوتے وقت آپ پر طاری ہوتی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس سے (کپڑا) اٹھایا اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور دو بار کہا: انت اکرم علی اللہ من ان یمیتک (آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں کہ وہ آپ کو موت دے)

قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک کونے میں کہہ رہے تھے: قسم بخدا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے، اور نہ وہ فوت ہوں گے یہاں تک کہ منافقین میں سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لم یمت، ومن کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے وہ فوت نہیں ہوا اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فوت ہو چکے ہیں۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْــًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ۝

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: "گویا میں نے تو یہ آیت اس دن کے سوا پڑھی ہی نہیں (2)"۔ اور انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا جو پہلے انہوں نے کہا تھا۔ اسے وائلی ابو نصر عبید اللہ نے اپنی کتاب "الابانۃ" میں ذکر کیا ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت سنا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے شہادت دی اور کہا: اما بعد! میں نے کل تمہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اس طرح نہ تھی جیسے میں نے کہی تھی۔ اور قسم بخدا! میں نے وہ بات جو تمہیں کہی اسے اس کتاب میں نہیں پایا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور نہ ہی اس عہد میں پایا جو عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، البتہ میں یہ امید کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ہم سے بعد آئیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 118، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1615، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کے آپ کے کہنے کی مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ کو موت آخر میں آئے گی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لئے جس چیز کو تمہاری پسند پر ترجیح دی، وہ یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی راہنمائی فرمائی پس تم اسے پکڑو تو تم ہدایت پا جاؤ گے اسی کی طرف جو رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی فرمائی۔(1)

واحدی ابوالمظفر نے کہا: وہ بات جو انہوں نے کہی پھر اس سے رجوع کر لیا وہ یہ ہے: "کہ حضور نبی کریم ﷺ فوت نہیں ہوئے اور وہ فوت نہیں ہوں گے یہاں تک کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور انہوں نے یہ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے کہا جو انہیں لاحق ہوا اور انہیں فتنہ اور منافقین کے ظہور کا خدشہ ہوا اور جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوت یقین کا مشاہدہ کیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اور اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ اور وہ جو انہوں نے اس دن کہا تو یہ آگاہ ہوئے اور یہ بات (ان کے ذہن میں) راسخ ہو گئی۔ اور انہوں نے کہا: گویا میں نے یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے سنی ہی نہیں۔ اور لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نکل پڑے۔ گویا یہ آیت کبھی نازل نہیں ہوئی مگر اسی دن۔(2) اور آپ ﷺ کا وصال بلا اختلاف پیر کے دن ہوا اسی وقت میں جس میں آپ ﷺ ہجرت کے وقت مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے جس وقت دھوپ خوب سخت ہو چکی تھی۔ اور آپ ﷺ کو منگل کے دن دفن کیا گیا اور یہ قول بھی ہے کہ بدھ کی رات کو (آپ کو دفن کیا گیا)(3)

صفیہ بنت عبدالمطلب نے رسول اللہ ﷺ کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

ألا یا رسول اللہ كنت رجاءنا ... وكنت بنا برا ولم تك جافیا

ترجمہ: اے رسول اللہ ﷺ! آپ ہماری امید تھے اور آپ ہمارے محسن تھے اور کبھی اعراض نہ برتتے تھے۔

وكنت رحیما هادیا ومعلما ... لیبك علیك الیوم من كان باكیا

اور بڑے مہربان، راہبر اور معلم تھے چاہیے کہ آج کے دن آپ پر ہر رونے والا روئے۔

لعمرك ما أبكي النبي لفقده ... ولكن لما أخشى من الهرج آتیا

تیری عمر کی قسم! میں نبی کریم ﷺ کے مفقود ہونے کے سبب نہیں روتی لیکن جب مجھے کسی حرج اور مصیبت آنے کا خدشہ ہو گا۔

كأن على قلبي لذكر محمد ... وما جئت من بعد النبي المكاویا

گویا میرے دل پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے اور مجھے نبی کریم ﷺ کے بعد کسی گالیاں دینے والے کا کوئی خوف نہیں۔

أفاطم صلى اللہ رب محمد ... على جدث أمسى بیثرب ثاویا

میں پھوڑتی ہوں اللہ تعالیٰ پر جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب ہے کہ وہ اس قبر پر رحمتیں نازل فرمائے جو یثرب میں آباد ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1165، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فدى لرسول الله أمي و خالتي ... و عمي و آبائي و نفسي و ماليا

رسول اللہ ﷺ پر میری ماں، میری خالہ، میری پھوپھی، میری جان اور میرا مال بھی نثار ہوں۔

صدقت و بلغت الرسالة صادقا ... و مت صليب العود أبلج صافيا

آپ نے سچ بولا اور پیغام رسالت کو صداقت کے ساتھ پہنچایا اور آپ نے لکڑی کی صلیب کو ختم کر دیا اور خوب صاف کر دیا۔

فلو أن رب الناس أبقى نبينا ... سعدنا، و لكن أمره كان ماضيا

پس اگر رب العالمین ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی رکھتا تو ہماری سعادت مندی تھی لیکن اس کا امر فیصلہ کن ہے۔

عليك من الله السلام تحية ... و أدخلت جنات من العدن راضيا

آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ وسلام ہو اور آپ کو جنات عدن میں داخل کیا جائے اس حال میں کہ آپ راضی اور خوش ہوں۔

أرى حسنا أيتمته و تركته ... يبكي و يدعو جده اليوم نائيا

میں دیکھ رہی ہوں آپ نے حسن ہمارے حسب کو مکمل کیا ہے اور اسے رلاتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور آج یہ دور اپنے دادا کو پکار رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو کیوں مؤخر کیا گیا حالانکہ آپ نے اہل بیت کو اپنی میتوں کی تدفین کو مؤخر کرنے پر کہا: "اپنے مردوں کی تدفین میں جلدی کرو اور تم ان میں تاخیر نہ کرو" (1)۔ تو اس کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے۔

(1) ایک تو وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال فرمانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اتفاق نہ تھا۔

(2) اس لئے کہ وہ اس مقام اور جگہ کو نہ جانتے تھے جہاں وہ آپ کو دفن کریں۔ پس ایک جماعت نے کہا: جنت البقیع میں دفن کیا جائے اور دوسرے گروہ نے کہا: مسجد میں، اور ایک قوم نے کہا: آپ کو روکا جائے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اٹھایا جائے، یہاں تک کہ عالم اکبر (مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں) نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ما دفن نبی الا حیث یموت (کسی نبی کو دفن نہیں کیا جاتا مگر اسی جگہ جہاں اس کا وصال ہوتا ہے) اسے ابن ماجہ اور مؤطا وغیرہما نے بیان کیا ہے۔(2)

(3) وہ اس اختلاف میں مشغول ہو گئے جو مہاجرین و انصار کے درمیان بیعت کے بارے میں واقع ہوا پس وہ اس میں غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا اور کام منظم ہو گیا اور حالات پرسکون ہو گئے، اور خلافت اپنے نصاب میں پختہ ہو گئی پس انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر دوسرے دن ان میں سے ایک جماعت نے برضا و رغبت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 108، کراچی۔ ایضاً ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 212، اسلام آباد۔ ایضاً ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری بیعت کی، پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب مرتدین کے فتنہ سے نجات دلائی اور آپ کے سبب دین کو تقویت حاصل ہوئی، والحمد للہ رب العالمین۔ پھر اس کے بعد انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دفن کے بارے میں غور وفکر کی تب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا اور آپ کو کفن پہنایا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، پس بعض نے کہا ہے: کسی نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتا رہا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے اشرف واعلیٰ ہے کہ آپ پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اور علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ کلام ضعیف ہے، کیونکہ سنت یہی ہے کہ آپ پر نماز جنازہ میں کھڑے ہو کر درود پاک پڑھا جائے گا، جیسا کہ آپ پر دعا میں درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہے: اللھم صل علی محمد الی یوم القیامۃ (اے اللہ! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر یوم قیامت تک رحمتیں نازل فرما۔) اور یہ ہمارے لئے بھی باعث نفع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، کیونکہ وہاں کوئی امام نہ تھا۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ وہ جو انہیں فرض نماز پڑھا رہا تھا وہی اس نماز میں ان کی امامت کرا سکتا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر انفرادی طور پر نماز پڑھی، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری عہد تھا، چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہر کوئی آپ کی خصوصی برکتیں حاصل کر لے نہ کہ وہ ان میں کسی غیر کے تابع ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسناد حسن بلکہ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے: جب لوگ منگل کے دن آپ کی تجہیز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں چارپائی پر رکھا گیا، پھر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گروہ در گروہ داخل ہوئے اور آپ پر صلوٰۃ (درود) پڑھتے رہے حتیٰ کہ جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو وہاں حاضری کا موقع دیا، یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوئیں تو پھر بچوں کو حاضری کی اجازت دی گئی، اور کسی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لوگوں کی امامت نہیں کرائی۔ اس حدیث کو انہوں نے نصر ابن علی جہضمی سے اس سند کے ساتھ بیان کیا ہے

أنبأنا وهب بن جرير حدثنا أبي عن محمد بن اسحاق قال حدثني حسين بن عبد الله عن عكرمة عن ابن عباس، الحديث بطوله۔ (1)

مسئلہ نمبر 5۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ہر شے منور وروشن ہو گئی، اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں وصال ہوا تو وہاں کی ہر شے تاریک ہو گئی۔ اور ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ نہیں جھاڑے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کا انکار کر دیا۔

ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے (2) اور کہا ہے: محمد بن بشار، عبد الرحمن بن مہدی، سفیان نے عبد اللہ بن دینار سے اور

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 118۔ ایضاً ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1618، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی عورتوں کے ساتھ کلام کرنے اور دل لگی کرنے سے بچتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نہ نازل ہو جائے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر ہم کلام کرنے لگے۔ (1)

اور ام سلمہ بنت ابی امیہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسند روایت ہے (کہ انہوں نے کہا) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کسی نمازی کی نظر اپنے قدموں سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں میں سے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو ان میں سے کسی کی نظر پیشانی رکھنے کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی۔ پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو کسی کی نظر قبلہ کی سمت سے نہ ہٹتی۔ پھر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (کا عہد) آیا تو فتنے برپا ہو گئے اور لوگ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔ (2)

قولہ تعالیٰ: اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ اس میں: فَاۡئِنۡ مَّاتَ شرط ہے اور اَوۡ قُتِلَ اس پر معطوف ہے اور انۡقَلَبۡتُمۡ جواب شرط ہے اور حرف استفہام جزا پر داخل ہے کیونکہ شرط اس کے ساتھ منعقد ہے اور یہ ایک جملہ اور ایک خبر ہو گیا ہے اور معنی یہ ہے: اتنقلبون علی اعقابکم ان مات او قتل؟ (کیا تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) پھر جاؤ گے اگر آپ انتقال فرما جائیں یا آپ کو شہید کر دیا جائے) اور اسی طرح (حکم ہے) ہر استفہام کا جو حرف جزا پر داخل ہو کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں ہوتا اور اس کا محل یہ ہے کہ وہ جواب شرط سے پہلے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ: انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤى اَعۡقَابِكُمۡ ایک تمثیل ہے اور اس کا معنی ہے: تم اپنے ایمان کے بعد کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ حضرت قتادہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور جو اس حالت کی طرف لوٹ آئے جس پر وہ پہلے تھا اس کے بارے کہا جاتا ہے: انقلب علی عقبیہ۔ اور اسی معنی میں نکص علی عقبیہ بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں انقلاب (لوٹنے) سے مراد شکست کھانا ہے اور یہ حقیقت ہے تاکہ کوئی۔ اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم نے مرتدین کو قتل کیا جیسا کہ چھوڑ دیا (مرتد ہونا) نہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنۡ يَّنۡقَلِبۡ عَلٰى عَقِبَيۡهِ فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا (اور جو الٹے پاؤں پھرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا) بلکہ اپنی ذات کا نقصان کرے گا اور مخالفت کے سبب اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے گا، اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسے کوئی طاعت نفع نہیں دے سکتی اور نہ کوئی معصیت اسے کوئی نقصان اور ضرر پہنچا سکتی ہے۔

وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ (اور اللہ تعالیٰ جلد ہی بدلہ دے گا شکر کرنے والوں کو) یعنی وہ جنہوں نے صبر کیا اور جہاد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ اور وَسَيَجۡزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيۡنَ قول باری تعالیٰ: فَلَنۡ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيۡـًٔا کے بعد آیا ہے اور یہ اس وعدہ کلامیہ کے ساتھ اتصال ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب ایلاز، صفحہ 119۔ ایضاً ابن ماجہ، حدیث نمبر 1621، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119، اسلام آباد۔ ایضاً ابن ماجہ، حدیث نمبر 1623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝

"اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے لکھا ہوا ہے (موت کا) مقررہ وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکر گزار بندوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا یہ جہاد پر ابھارتا ہے اور اس پر آگاہ کرتا ہے کہ موت لازم اور ضروری ہے اور ہر انسان مقتول ہو یا غیر مقتول وہ مرنے والا ہے جب وہ اپنی (موت کی) لکھی ہوئی مقررہ مدت تک پہنچ جائے کیونکہ مُّؤَجَّلًا کا معنی الی اجل (مقررہ مدت تک) ہے۔ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر سے۔ اور كِتٰبًا مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی کتب اللہ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (اللہ تعالیٰ نے موت کا مقررہ وقت لکھ دیا ہے۔) اور اجل الموت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے علم میں ہے کہ زندہ کی روح اس کے جسم سے جدا ہوگی، اور جب بندہ قتل کیا جاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہی اس کی موت کا مقررہ وقت ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا۔ اور قول باری تعالیٰ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا پر دلیل فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (النحل) (پس جب آجاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں) اور فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (العنکبوت: 5) (تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے) اور لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ (الرعد) (ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے)

اور معتزلی کہتا ہے: موت کا وقت مقدم اور متأخر ہوتا رہتا ہے اور یہ کہ جسے قتل کر دیا جائے وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ حیوان جو ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو گیا اسی لئے قاتل پر ضمان اور دیت واجب ہوتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نفس اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کا مزید بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں علم کے لکھنے اور اسے مدون کرنے پر دلیل موجود ہے اور اس کا بیان سورۂ "طٰہٰ" میں اس قول کے تحت آئے گا۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (ثواب الدنیا) سے مراد غنیمت ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غنیمت کی طلب میں مرکز کو چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ہر اس کے بارے میں عام ہے جس نے آخرت کی بجائے صرف دنیا کا ارادہ کیا، اور معنی یہ ہے: ہم اس میں سے اسے وہ دیں گے جو اس کے لئے حصہ مقرر کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء: 18) (جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں۔) وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

کسائی نے اسے روایت کیا ہے۔ اور باقیوں نے خط مصحف کی اتباع کرتے ہوئے نون کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اور آیت کا معنی مومنوں کو تسلی دلانا اور انبیاء علیہم السلام کے بہترین متبعین میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی اقتدا اور پیروی کرنے کا حکم دینا ہے۔ یعنی کثیر انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں کو شہید کیا گیا یا انبیاء علیہم السلام میں سے کثیر شہید کر دیئے گئے اور ان کی امتیں مرتد نہیں ہوئیں، یہ دو قول ہیں: پہلا حسن اور سعید بن جبیر کا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کوئی نبی کسی جنگ میں کبھی شہید نہیں کیا گیا (1)۔ اور ابن جبیر نے کہا ہے: ہم نے نہیں سنا کہ کوئی نبی علیہ السلام جنگ میں شہید کر دیا گیا ہو (2)۔ اور دوسرا قول حضرت قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے۔ اس قول کی بنا پر قُتِلَ پر وقف کرنا جائز ہے، اور یہ قرأت (قُتِلَ) نافع، ابن جبیر، ابو عمرو اور یعقوب کی ہے۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابو حاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ قُتِلَ صرف نبی پر واقع ہو رہا ہے، اور اس صورت میں قُتِلَ پر کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور کلام میں اضمار ہوگا یعنی ومعہ ربیون کثیر، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قُتِلَ الامیر معہ جیش عظیم، اے قتل و معہ جیش عظیم۔ اور خرجت معی تجارۃ، اے و معی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قتل نبی علیہ السلام اور اس کے ساتھ اللہ والوں کو بھی شامل ہو، اور کلام کی توجیہ یہ ہوگی کہ ان میں سے بعض شہید کر دیئے گئے جو اس (نبی علیہ السلام) کے ساتھ تھے، عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم و بنی سلیم، (یعنی) ان میں سے بعض قتل کر دیئے گئے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا ان میں سے باقی کی طرف راجع ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول نزول آیت کے ساتھ زیادہ مشابہت اور زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت شہید کی گئی۔ اور کوفیوں اور ابن عامر نے قٰتَلَ پڑھا ہے۔

اور یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسے ابو عبید نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جب ان کی مدح اور تعریف کی جنہوں نے جہاد کیا تو جو شہید کر دیئے گئے وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور جب مدح ان کی ہوتی جو شہید کر دیئے گئے تو پھر ان کے سوا باقی اس میں داخل نہ ہوتے، پس قٰتَلَ اعم (3) اور زیادہ قابل مدح ہے۔ اور رِبِّيُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت را کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے را کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں تین لغات ہیں۔ اور رِبِّيُّوْنَ سے مراد بہت کی جماعتیں ہیں، یہ حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ سے منقول ہے (4)، ان کا واحد رِبِّی را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ رِبّۃ کی طرف منسوب ہے یہ را کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی۔ اور اس کا معنی ہے جماعت، گروہ۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الرِّبِّيُّوْنَ سے مراد الوف کثیرہ (یعنی کئی ہزار) ہیں (5)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الربیون سے مراد اتباع، پیروی کرنے والے ہیں (6)۔ پہلا معنی لغت میں زیادہ معروف ہے، اور اسی معنی میں (کپڑے کا) وہ ٹکڑا ہے جس میں جوتے کے تیر جمع

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

کئے جاتے ہیں اسے رِبِّیٌّ اور رُبِّیٌّ کہا جاتا ہے۔ اور رِبِّیّون سے مراد وہ قبائل ہیں جو جمع ہوں۔ اور ابان بن ثعلب نے کہا ہے: الربّی دس ہزار ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد صبر کرنے والے علماء ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد الجمع الکثیر (بہت بڑا اجتماع) ہے۔

حسان نے کہا ہے:

وَاِذَا مَعْشَرٌ تَجَافَوْا عَنِ الْحَقِّ حَمَلْنَا عَلَیْهِمْ رِبِّیًّا

جب لوگ حق سے دور ہو گئے تو ہم نے ان پر جم غفیر کو مسلط کر دیا۔

اور زجاج نے کہا ہے: یہاں دو قراتیں ہیں رُبِّیُّوْنَ راء کے ضمہ کے ساتھ اور رِبِّیُّوْنَ راء کے کسرہ کے ساتھ، رہا رُبِّیُّوْنَ تو اس کا معنی ہے جماعت کثیرہ اور کہا جاتا ہے: دس ہزار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رَبِّیُّوْنَ را کے فتحہ کے ساتھ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: ربّی ان بندوں میں سے ایک جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ڈٹے رہے اور صبر کیا اور وہی ربانی ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت، عبودیت اور الوہیت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، وَهَنُوْا وہ کمزور ہو گئے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ الوهن کا معنی ہے خوف کے سبب ہمت اور قوت کا ٹوٹ جانا۔ اور حسن اور ابو السمال نے وَهِنُوْا ھا کے کسرہ اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ابوزید سے منقول ہیں۔ وهن الشئی یهن وهنا۔ اور اوهنته انا و وهنته اس کا معنی ہے میں نے اسے کمزور کر دیا۔ اور اوهنته کا معنی ہے پسلیوں کا نیچے آنا اور ان کا چھوٹا ہونا اور الوهن من الابل سے مراد اونٹ کا بوجھل اور موٹا ہونا ہے اور الوهن سے مراد رات کی وہ ساعت بھی ہے جو گزر جاتی ہے، اور اسی طرح الموهن بھی ہے۔ اور اوهن یعنی ہم اس ساعت میں ہو گئے، مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کے شہید ہونے کی وجہ سے یا ان کے قتل کی وجہ سے جو ان میں شہید کر دیئے گئے ہمت نہ ہاری یعنی ان کے باقی رہنے والوں نے ہمت نہ ہاری، پس اس میں مضاف محذوف ہے۔ وَمَا ضَعُفُوْا اور وہ اپنے دشمن کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئے۔ وَمَا اسْتَكَانُوْا یعنی (انہوں نے ہار نہ مانی) اس تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے جو انہیں جہاد میں پہنچی۔ اور الاستکانۃ کا معنی ذلت اور تضرع ہے (یعنی نہ وہ جھکے اور نہ عجز کا اظہار کیا) اور اس کی اصل واستكنوا، تفعلوا کے وزن پر ہے، پھر کاف کے فتحہ میں اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہوا۔

اور جنہوں نے اسے کون سے بنایا ہے تو پھر یہ استفعلوا کے وزن پر ہے۔ (یعنی باب استفعال ہے) اور پہلا آیت کے معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور فَمَا وَهْنُوْا وَمَا ضَعْفُوْا ھا اور عین کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور کسائی نے ضَعَفُوْا عین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی اس کے بعد کہ ان میں سے کچھ شہید کر دیئے گئے یا ان کے نبی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بھاگے نہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو موت پر

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 563

پس جب انہوں نے اس کا عزم و ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے جو قصد کیا تھا اس سے رجوع کر لیا (1)۔ اور القاء در حقیقت اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ (اور اس نے تختیاں پھینکیں) فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ (الشعراء: 44) (تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں میدان میں) فَأَلْقَى مُوسَى عَصَاهُ (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا) شاعر نے کہا ہے:

فَأَلْقَتْ عَصَاهَا وَاسْتَقَرَّ بِهَا النَّوَى

پس اس نے اپنا عصا پھینکا اور اس کے ساتھ گھر ساکن ہو گیا۔

پھر بھی مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اور اس ارشاد میں: وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِنِّي (طٰہٰ: 39) (اور (اے موسیٰ) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جانب سے) اور القی علیک مسألة (اور اس نے تجھ پر سوال کیا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ یہ علت بیان ہو رہی ہے، یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کا سبب ان کا شرک کرنا ہے، اور یہ ما مصدریہ ہے اور کہا جاتا ہے: اشرک بہ یعنی اس نے اس کے غیر کو اس کے مساوی قرار دیا تاکہ وہ اسے شریک بنائے۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا سلطان سے مراد حجت اور بیان ہے، اور عذر اور برہان (دلیل) ہے، اسی وجہ سے والی کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے، اور کہا جاتا ہے: یہ سلیط سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ہے جس سے چراغ روشن کئے جاتے ہیں، اور وہ تلوں کا تیل ہے۔

جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

أَمَالَ السَّلِيطَ بِالذُّبَالِ الْمُفَتَّلِ

پس سلطان (دلیل) کے ساتھ حق کے اظہار اور باطل کو مٹانے میں روشنی اور نور حاصل کیا جاتا ہے اور کہا گیا ہے: السلیط کا معنی حدید (لوہا) ہے اور السلاطۃ کا معنی الحدۃ (غضب) ہے اور السلاطۃ تسلیط سے ہے اور اس کا معنی قہر اور غلبہ ہے اور سلطان اسی سے ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ پس سلطان کا اصل معنی قوت ہے۔ کیونکہ قوت کے ساتھ اسی طرح غالب پایا جاتا ہے جس طرح دلیل کے ساتھ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور السلیطۃ کا معنی ہے شور و شغب اور چیخ و پکار کرنے والی عورت۔ اور سلیط سے مراد فصیح اللسان آدمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ کسی دین میں بھی بتوں کی عبادت ثابت نہیں، اور اس کے جواز پر عقلی دلیل بھی کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام اور ان کے لوٹنے کی جگہ کے بارے خبر دی اور فرمایا: وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ (اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے) پھر اس کی مذمت بیان کی اور فرمایا: وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ اور المثوی سے مراد وہ جگہ ہے جس میں انہیں رکھا جائے گا، کہا جاتا ہے: ثوی یثوی ثواء اور المأوی: اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس کی طرف کوئی شے رات یا دن کے وقت لوٹ کر آتی ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَ عَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

"اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔"

محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ احد کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے اس حال میں کہ انہیں تکلیف و اذیت پہنچی تھی تو بعض نے بعض کو کہا: کہاں سے یہ اذیت ہمیں پہنچی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا تھا تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ وہ ہے کہ انہوں نے مشرکوں کے علمبردار کو قتل کیا اور اس کے بعد پھر ان میں سے سات افراد کو قتل کیا، اور ابتدا میں مسلمانوں کو کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی مگر یہ کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور بعض تیر اندازوں نے بھی مال غنیمت کی طلب میں اپنا مرکز چھوڑ دیا اور وہی ناکامی کا سبب بن گیا۔ بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب احد کا دن تھا اور ہمارا مشرکین سے آمنا سامنا ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تیر اندازوں میں سے کچھ لوگوں کو (ایک درہ میں) بٹھایا اور ان پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور آپ نے انہیں فرمایا: "تم اپنی جگہ کو قطعاً نہ چھوڑنا اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا اور اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ رہے ہیں تو پھر بھی تم ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرنا۔" راوی کا بیان ہے کہ جب جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا حتیٰ کہ ہم نے عورتوں کی طرف دیکھا وہ بڑی تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگ رہی ہیں، اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے پازیب ظاہر دکھائی دے رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: مال غنیمت لوٹ لو مال غنیمت لوٹ لو، تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ٹھہر جاؤ، رک جاؤ! کیا رسول اللہ ﷺ نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا؟ لیکن وہ چلے گئے پس جب وہ ان کی طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو پھیر دیا (2) اور مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید کر دیے گئے۔ پھر ابوسفیان بن حرب ایک بلند جگہ سے

1۔ جامع البیان، جلد 4، صفحہ 565۔ ایضاً، اسباب النزول، صفحہ 83

2۔ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ احد، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمارے اوپر جھانکا اور اس نے کہا: کیا قوم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے جواب نہ دینا" یہاں تک کہ اس نے تین بار پکارا۔ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ تین بار اس نے یہ پوچھا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے جواب نہ دینا" پھر اس نے کہا: کیا قوم میں عمر [ابن خطاب] ہیں؟ اس نے یہ بھی تین بار پوچھا۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے جواب نہ دینا" پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: یہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکے اور کہا: اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! تو نے جھوٹ بولا ہے! اللہ تعالیٰ نے تجھے باقی رکھا ہے تاکہ وہ اس طرح تجھے ذلیل و رسوا کرے۔ تو اس نے کہا: اعل ھبل، اے ہبل تو بلند ہو گیا (غالب آ گیا) یہ جملہ اس نے دوبارہ کہا۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے جواب دو" تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کیا کہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم کہو اللہ اعلیٰ و اجل" اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا: لنا عزی ولا عزی لکم (ہمارے لئے تو عزیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی عزیٰ نہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اسے جواب دو" صحابہ نے عرض کی: ہم کیا کہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: تم کہو اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور جنگ تو ڈول کی مانند ہے (یعنی اس کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں ہوتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں جس طرح ڈول میں پانی کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم) بلاشبہ تم قوم میں ایسے مقتول پاؤ گے جن کا مثلہ کر دیا گیا ہے میں نے اس کے بارے حکم نہیں دیا البتہ تم مجھے برا نہ کہنا (1)۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شدید ترین جنگ لڑ رہے تھے اور حضرت سعد سے ایک روایت میں ہے: ان دونوں پر سفید لباس تھا میں نے ان دونوں کو نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ بعد میں۔ مراد حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (2)۔ اور دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: یقاتلان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد القتال ما رأیتھما قبل ذالک الیوم ولا بعدہ۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ملائکہ نے مسلمانوں کی معیت میں اس دن جنگ نہیں لڑی، اور نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد سوائے یوم بدر کے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: حضرت مجاہد نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ملائکہ نے احد کے دن اس قوم کی طرف سے جنگ نہیں لڑی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور وہ اس حکم پر قائم نہیں رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر و تقویٰ کی شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور وہ اس نے پورا کر دیا اور جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۂ احد و قول اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 579، قدیمی کتب خانہ کراچی
ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 252، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اپنی جگہوں کو چھوڑ دیا اور تیر اندازوں نے بھی اس عہد کو ترک کر دیا جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں، اور انہوں نے دنیا کا ارادہ کیا تو ان سے ملائکہ کی مدد اٹھا لی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا اور انہیں فتح عطا کر دی، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو اس کے بعد ان پر آزمائش اور بلا کو مسلط کر دیا۔

اور عمر بن اسحاق نے کہا ہے: جب احد کا دن تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے بکھر گئے اور حضرت سعد آپ کے سامنے تیر پھینک رہے تھے اور ایک نوجوان انہیں تیر پکڑا رہا تھا جب بھی کوئی تیر چلا جاتا تو وہ تیر اٹھا کر لاتا اور کہتا: اے ابو اسحاق! تیر چلاؤ، پس جب فارغ ہوئے انہوں نے دیکھا وہ نوجوان کون ہے؟ تو نہ انہوں نے اسے دیکھا اور نہ اسے پہچانا۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: جب مشرکوں کا علمبردار قتل ہو گیا اور ان کا جھنڈا گر گیا تو اسے عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھایا تھا۔

اسی بارے میں حضرت حسان کہتے ہیں:

فلولا لواء الحارثية أصبحوا يباعون في الأسواق بيع الجلائب

پس اگر عمرہ حارثیہ کا جھنڈا نہ ہوتا تو انہیں بازاروں میں سامان تجارت کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔

اور تَحُسُّوْنَهُمْ کا معنی ہے تم انہیں قتل کر رہے تھے اور تم ان کا نام و نشان مٹا رہے تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

حسسناهم بالسيف حسا فأصبحت بقيتهم قد شردوا وتبددوا

ہم نے تلوار کے ساتھ ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے پس ان کے بقیہ بچنے والوں کو بھگا دیا گیا ہے یا وہ بکھر گئے تھے۔

اور جریر نے کہا ہے:

تحسهم السيوف كما تسامى حريق النار في الأجم الحصيد

اس میں بھی تحسهم قتل کر کے ختم کر دینے اور نام و نشان مٹا دینے کے معنی میں ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا ہے: الحس کا معنی ہے قتل کے ساتھ ہلاک و برباد کر دینا (1)، کہا جاتا ہے: جراد محسوس جب سردی اسے قتل و برباد کر دے۔ اور البرد محسة للنبت یعنی سردی نباتات کو جلا کر ختم کر دینے والی ہے۔ اور سنة حسوس یعنی ایسا سال جو ہر شے کو کھا جاتا ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

إذا شكونا سنة حسوسا تأكل بعد الأخضر اليبيسا

جب ہم شکوہ کرتے ہیں ایسے سال کا جو سرسبزی کے بعد خشکی کو بھی کھا جاتا ہے اور اس کی اصل الحس سے ہے جس کا معنی ہے حاسہ کے ساتھ کسی شے کا ادراک کرنا۔ پس حسّہ کا معنی ہے اس نے اس کی حس کو قتل کے سبب ختم کر دیا۔ بِاِذْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے یا اس کی قضا و امر سے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ یعنی جب تم بزدل ہو گئے اور تم کمزور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فشل

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 366

يَنْفَشِلُ فهو فَشِلٌ و فَشْلٌ۔ اور حَتّٰى کا جواب محذوف ہے ای حتی اذا فشلتم امتحنتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے تو تم امتحان میں ڈال دیئے گئے) اور اس کی مثل جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ (الانعام: 35) فافعل۔ (تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ))

اور فراء نے کہا ہے: حَتّٰى کا جواب وَ تَنَازَعْتُمْ ہے اور واؤ مقحمہ زائدہ ہے، جیسے کہ یہ ارشاد گرامی ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ ای ناديناه (یعنی اس میں بھی واؤ مقحمہ زائدہ ہے) اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

فلما اجزنا ساحة الحي وانتحى ای انتحى

اس میں بھی واؤ زائدہ ہے۔ اور ان کے نزدیک وَ عَصَيْتُمْ میں بھی واؤ کو مقحمہ قرار دینا جائز ہے۔ یعنی حتی اذا فشلتم و تنازعتم عصیتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں تو تم نے نافرمانی کی۔) اور اس بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی حتی اذا تنازعتم و عصیتم فشلتم (یہاں تک کہ جب تم جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے۔)

اور ابو علی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ جواب صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ہو اور ثُمَّ زائدہ ہو، اور تقدیر کلام یہ ہو حتی اذا فشلتم و تنازعتم و عصیتم صرفکم عنهم (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو اس نے تم کو ان سے پھیر دیا۔)

اور بعض نحویوں نے اس کے زائدہ ہونے میں شاعر کا قول بیان کیا ہے:

أراني اذا ما بِتُّ بت على هوى فثم اذا أصبحت أصبحت غاديا

اور اخفش نے اس کے زائدہ ہونے کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ (التوبہ: 118) (یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَتّٰى بمعنی الیٰ ہے اور اس وقت اس کا کوئی جواب نہ ہو گا۔ یعنی صدقکم الله وعده الی ان فشلتم، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے) یعنی وہ وعدہ ثابت قدم رہنے کی شرط کے ساتھ تھا۔ اور تَنَازَعْتُمْ کا معنی ہے اختلفتم (تم اختلاف کرنے لگے) یعنی اس وقت تیر اندازوں میں سے بعض نے کہا: ہم تو اب مل جائیں گے (یعنی مال غنیمت جمع کریں گے) اور بعض نے کہا: بلکہ ہم تو اسی جگہ ثابت قدم رہیں گے جہاں ثابت رہنے کا حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ یعنی وہ غلبہ جو احد کے دن مسلمانوں کو ابتدائی مرحلہ میں ہی حاصل ہو گیا اور یہ اس وقت

حاصل ہوا جبکہ مشرکین کا علمبردار بچھاڑ (قتل کر) دیا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور اسے جونہی قتل کیا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منتشر ہو گئے اور وہ متفرق گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے دشمن پر شدید حملے کئے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں اپنے ساز و سامان سے محروم کر دیا۔ اور مشرک گھوڑ سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا ہر بار تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا گیا، پس وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹے اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور انہوں نے ان کو خوب قتل کیا۔ پس جب پچاس تیر اندازوں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائیوں کو فتح عطا فرما دی ہے تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! ہم یہاں کسی کام کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے تحقیق اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے اور ہمارے بھائی مشرکوں کے لشکر میں ہیں۔ اور ان میں سے بعض گروہوں نے کہا: ہم کیوں ٹھہرے رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اپنے ان مقامات کو چھوڑ دیا جن کے بارے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں قطعاً نہ چھوڑیں۔ اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور بزدل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی پس گھوڑ سوار تیز رفتاری کے ساتھ قتال کرتے ہوئے ان میں آ پہنچے۔ آیت کے الفاظ ان کے لئے زجر و توبیخ کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان کو جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مدد و نصرت کی مبادی کو دیکھ لیا تھا، پس ان کے لئے یہ چاہتا تھا جب تو کہ فتح و نصرت کی تکمیل ثابت قدم رہنے میں ہے نہ کہ انہزام میں، پھر جھگڑے کا سبب بیان کیا اور فرمایا: مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا تم میں سے بعض دنیا یعنی مال غنیمت کے طلبگار ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم نہیں جانتے تھے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی دنیا اور مال و ساز و سامان کی خواہش رکھتا ہے یہاں تک کہ احد کا دن آ گیا (تب ہمیں اس کا احساس ہوا) وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ اور تم میں سے بعض آخرت کے طلبگار ہیں(1) اور وہ وہ ہیں جو اپنے مرکز میں ثابت قدم رہے، اور انہوں نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بارے میں اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مخالفت نہ کی، اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے ان پر حملہ کر دیا اس وقت یہ دونوں کافر تھے اور انہوں نے آپ کو اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ رحمہم اللہ۔

اور یہ عتاب ان کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے مقام کو چھوڑا نہ کہ ان کے ساتھ جو ثابت قدم رہے کیونکہ جو ثابت رہے وہ تو ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران تھے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے جب کسی قوم پر عام عذاب نازل ہو تو نیکوکار اور برے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن جو ان پر نازل ہوا وہ عذاب اور سزا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ (پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے) یعنی ان کے بعد کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے تمہیں ان سے ناکامی کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور معتزلہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر تم واپس لوٹ آئے، انصرفتم، پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب اور خوف نکالنے کے اعتبار سے ہے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کافروں کے دلوں سے رعب اور خوف نکالنا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

حقیر سمجھے لیکن صحیح اور درست یہ ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف۔ یہ فعل (رعب) اگر واقع ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا کوئی معنی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں ان کی طلب اور تعاقب کا پابند نہیں بنایا۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس نے تمہیں معصیت اور مخالفت کے بعد جڑ سے ختم نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب تمام کے لئے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ان تیر اندازوں کے لئے ہے جنہوں نے اس حکم کی مخالفت کی جو انہیں دیا گیا۔ اسے نحاس نے اختیار کیا ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کی نظیر یہ قول ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (البقرہ: 52) (پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے) وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ عفو و مغفرت کے ساتھ مومنوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی کریم ﷺ کی کسی جگہ ایسی مدد نہیں کی گئی جیسی احد کے دن مدد کی گئی فرمایا: اور ہم نے اس کا انکار کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا: میرے اور اس کے درمیان جس نے انکار کیا کتاب اللہ ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ یوم احد کے بارے فرماتا ہے: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: الحس سے مراد قتل کرنا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ بلاشبہ اس سے مراد تیر انداز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک جگہ میں کھڑا کیا پھر ارشاد فرمایا: ”تم ہماری پشتوں کی حفاظت کرو پس اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم قتل کر رہے ہیں تو تم ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم مال غنیمت جمع کر رہے ہیں تو تم ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا“ پس جب رسول اللہ ﷺ کامیاب ہو گئے اور مشرکین کے لشکر کو مباح قرار دے دیا تو تمام تیر انداز واپس لوٹ آئے اور لشکر میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے۔ تحقیق حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب کی صفیں گڈمڈ ہو گئیں پس وہ اس طرح ہو گئے اور آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا جال بنایا اور وہ آپس میں مل گئے (یعنی خلط ملط ہو گئے) پس جب تیر اندازوں نے اس درے کو خالی کر دیا جس میں وہ تھے تو گھوڑ سوار اسی راستے سے اصحاب رسول ﷺ پر داخل ہو گئے اور بعض نے بعض کو مارا اور آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے لئے ابتدائے دن کی فتح تھی یہاں تک کہ مشرکین کے سات یا نو علمبردار قتل کر دیئے گئے اور مسلمان پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ اور وہ وہاں تک نہ پہنچے جسے لوگ غار کہتے ہیں بلکہ وہ مہراس (جبل احد کے ساتھ پانی کا چشمہ) کے نیچے رہے اور شیطان چیخ اٹھا: قتل محمد (محمد ﷺ کو شہید کر دیا گیا) اور اس میں کوئی شک نہ کیا کہ وہ حق اور سچ ہے۔ پس ہم اسی طرح رہے اور ہم آپ کے شہید ہونے کے بارے میں شک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ دو سعدوں (حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ) کے درمیان ہم پر ظاہر ہوئے جب آپ چلتے تو ہم آپ

کو اپنے قدموں کی طرف جھکنے کے سبب پہچان گئے۔ تو ہم اتنا خوش ہوئے گویا ہمیں (اس میں سے) کوئی مصیبت پہنچی ہی نہیں جو مصیبت ہمیں آئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف چڑھے اور آپ فرما رہے تھے: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہو جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا (1)"۔ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں میں سے سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا تھا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو خود کے نیچے سے روشن اور ظاہر تھیں تو میں نے اپنی بلند آواز سے ندا لگائی: اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں بشارت ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ تشریف لا چکے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ کیا کہ تو خاموش رہ۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝

"یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تاکہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔"

اِذْ قول باری تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ عام قراءت تُصْعِدُوْنَ تا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ابو رجاء العطاردی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے تا اور عین دونوں کو مفتوح پڑھا ہے (2) یعنی تَصْعَدُوْنَ فِی الجبل (تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے)۔ ابن محیصن اور شبل نے اذ یصعدون ولا یلوون دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن نے تلون ایک واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو بکر بن عیاش نے عاصم سے وَلَا تُلْوُوْنَ تا کے ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ لغت شاذہ ہے اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اصعدت (کہا جائے گا) جب تو اپنے چہرے کو پھیرتے ہوئے گزر جائے اور صعدت (کہا جاتا ہے) جب تو پہاڑ یا کسی اور پر چڑھے، بلند ہو (3)۔

پس الاصعاد کا معنی ہموار زمین میں، وادیوں اور گھاٹیوں کے بطن میں چلنا ہے اور الصعود کا معنی پہاڑوں، چھتوں، سیڑھیوں اور راستوں پر چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا پہاڑ پر چڑھنا وادی میں چلنے کے بعد ہو، پس تُصْعِدُوْنَ اور تَصْعَدُوْنَ دونوں قراءتوں کے مطابق معنی صحیح ہوگا۔

حضرت قتادہ اور حضرت ربیع نے بیان کیا ہے کہ وہ احد کے دن وادی میں چلے۔ اور حضرت ابی کی قراءت اِذْ تُصْعِدُوْنَ فِی الْوَادِی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ احد میں فرار ہو کر چڑھے۔ نتیجۃً دونوں قراءتیں صحیح ہیں، اس دن شکست کھانے والے چلنے اور چڑھنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

مبرد اور قتبی نے کہا ہے: اصعد کا معنی ہے جب وہ جانے میں خوب دور ہو جائے (4)۔ پس اصعاد زمین میں خوب دور

1۔ الجامع الترمذی، کتاب التفسیر، باب آل عمران، جلد 2، صفحہ 324-325، دار الکتب العلمیہ

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567 | 3۔ ایضاً | 4۔ ایضاً

کی خبر نے ان میں اضطراب پیدا کر دیا جبکہ شیطان نے اس کے بارے چیخ کر کہا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: پہلا غم وہ ہے جو فتح و کامرانی اور مال غنیمت ان سے کھو گیا اور دوسرا وہ جو انہیں ہزیمت و شکست کا سامنا ہوا۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلا غم ہزیمت ہے، اور دوسرا ابو سفیان اور خالد بن ولید کا ان پر پہاڑ سے جھانکنا ہے۔ پس جب مسلمانوں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غمزدہ کر دیا، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ ان پر جھانک رہے ہیں اور وہ انہیں قتل کر دیں گے پس اس نے انہیں وہ سب کچھ بھلا دیا جو انہیں حاصل ہوا تھا تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے یہ دعا مانگی: اللھم لا یعلن علینا (اے اللہ! کوئی بھی ہم پر غالب نہ آئے) جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بنا پر بغم میں باء بمعنی علی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اپنے باب (اصل معنی) پر ہے اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی مخالفت کے سبب غمزدہ کیا پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پہنچایا اس غم کے بدلے جو ان کی طرف سے آپ ﷺ کو پہنچایا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّا یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں احد کے دن غم پہنچایا بِغَمٍّ اس کے بدلے جو غم بدر کے دن مشرکین کو پہنچا۔ اور غم کو ثواب کا نام دیا گیا ہے جس طرح کہ گناہ کی جزا کو ذنب کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہ پر آگاہ کر دیا پس وہ اس کے سبب اس مصیبت میں مشغول ہو گئے جو انہیں پہنچی تھی۔ قولہ تعالیٰ: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝ اس میں لام قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ اور یہ قول بھی ہے یہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ کے متعلق ہے یعنی یہ غم اس غم کے بعد تھا تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو مال غنیمت تم سے کھو گیا اور نہ اس مصیبت پر جو ہزیمت اور شکست کی صورت میں انہیں پہنچی۔

پہلا قول زیادہ اچھا ہے اور قول باری تعالیٰ: مَآ اَصَابَكُمْ میں مَا محل جر میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا صلہ ہے۔ یعنی لکی تحزنوا علی ما فاتکم و ما اصابکم عقوبۃ لکم علی مخالفتکم رسول اللہ ﷺ۔ (تاکہ تم اس پر غمگین ہو جو تم سے (مال غنیمت) کھو گیا اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس بنا پر کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی)

اور یہ اس قول کی مثل ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) ای ان تسجد (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) اور اس قول کی مثل ہے لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (الحدید: 29) ای لیعلم (تم پر یہ خصوصی کرم اس لئے کیا تاکہ جان لیں اہل کتاب) یہ مفضل کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ سے مراد یہ ہے کہ تم پر لگاتار غم آئے تاکہ تم اس کے بعد غنائم کے بارے میں (کسی فکر میں) مشغول نہ رہو۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس میں تہدید اور وعید کا معنی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ
اَهَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ
الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ

لَبَرَزَ آپ فرما دیجئے: اگر تم اپنے گھروں میں (بیٹھے) ہوتے تو (وہاں سے) ضرور نکل آتے (وہ لوگ) الَّذِيْنَ كُتِبَ جن کے بارے لکھا جا چکا ہے (یعنی جن کا مقدر بنا دیا گیا ہے) عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ قتل یعنی لوح محفوظ میں۔ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ یعنی اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ یعنی ان پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے پس اسے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اسے اسی کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

ابو حیوہ نے لَبُرِّزَ با کے ضمہ اور را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی يُجْعَلُ يُخْرَجُ (یعنی نکال لیا جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اے منافقین! اگر تم پیچھے رہ جاتے تو تم اس کے علاوہ کسی دوسرے میدان جنگ کی طرف نکل پڑتے اس میں تم قتل کر دیئے جاتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آزمالے گا جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اسے مومنین کے لئے ظاہر کر دے گا۔

اور قول باری تعالیٰ وَلِيَبْتَلِيَ میں واؤ مقحم ہے جیسا کہ اس قول میں ہے: وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ یعنی لیکون۔ اور اس فعل کو حذف کر دیا گیا ہے جو لام کی کے ساتھ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ نے تم پر قتال اور جنگ مقدر کر دی ہے اور احد کے دن اس نے تمہاری مدد نہیں کی تاکہ وہ تمہارے صبر کو آزمائے۔ اور تم سے تمہارے گناہ معاف کر دے اگر تم توبہ کر دو اور مخلص ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لیبتلی کا معنی ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ مختبر کا معاملہ کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: تاکہ تم سے مشاہدہ واقع ہو جس کا اسے غیبا علم ہے۔ اور کہا گیا ہے: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے اور تقدیر عبارت ہے لِيَبْتَلِيَ اولیاء اللہ تعالیٰ تاکہ وہ اولیاء اللہ کو آزمائے۔ اور تمحیص کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی سینوں میں خیر و شر میں سے جو ہے (اللہ اسے جانتا ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ذات الصدور سے مراد سینے ہی ہیں، کیونکہ ذات الشئ سے مراد اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

"بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابل ہوئے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا یہ جملہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا کی خبر ہے۔ اور مراد وہ ہیں جو مشرکین سے احد کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے، حضرت عمر بن خطاب وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو ہزیمت کے وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھاگ گئے نہ کہ وہ جو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس قوم کے ان معین افراد کے بارے ہے جو اپنی ہزیمت کے وقت تین دن تک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے اور پھر لوٹ آئے۔ اور اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے ان کے پھسلنے کا تقاضا کیا اس طرح کہ انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں تو وہ ثابت رہنے پر مجبور ہو گئے تاکہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ اور بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا کا یہی معنی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اسْتَزَلَّهُمُ کا معنی ہے: اس نے انہیں پھسلاہٹ پر ابھارا، یہ باب استفعال ہے اور الزلة سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی خطا اور گناہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زل اور ازل دونوں کا معنی ایک ہے۔ پھر کہا گیا: انہیں اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے سے پہلے قتال (جنگ) پر مجبور کیا گیا تو اسی وجہ سے وہ پیٹھ پھیر گئے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کو چھوڑ کر اور مال غنیمت کی طرف مائل ہو کر حضور نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کی۔

اور حسن نے کہا ہے: مَا كَسَبُوا (یعنی اس کے عوض) جو انہوں نے ابلیس کا قول قبول کیا جو اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ اور کلبی نے کہا ہے: شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال آراستہ اور مزین کیے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہزام معصیت نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہونے کا ارادہ کیا، پس دشمن نے ان میں اپنا طمع اور حرص ختم کر دی جب انہوں نے یہ سن لیا کہ حضور نبی کریم ﷺ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کہا جانا بھی جائز ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی پکار کو اس خوف کی وجہ سے سنا ہی نہیں جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ دشمن کی تعداد کئی گنا زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ سات سو تھے اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور اسی حالت میں بھاگنا جائز ہوتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ سے بھاگنا خطا اور گناہ ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور شاید انہیں یہ وہم بھی ہو گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے پہلا قول احسن ہے۔ المختصر اگر معاملہ کو ثابت شدہ گناہ پر محمول کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔ اور اگر اسے انہزام جائز پر محمول کیا جائے تو آیت ان کے بارے میں ہے جو ہزیمت سے بہت دور ہیں اور اتنی مقدار پر زائد ہے جو جائز قرار دی گئی ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نصر بن محمد بن ابراہیم نے کہا ہے: خلیل بن احمد، سراج، قتیبہ، ابو بکر بن غیلان نے جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین گفتگو ہوئی، تو حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کیا تم مجھے برا بھلا کہتے ہو حالانکہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، اور میں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی (یعنی بیعت رضوان میں بھی حاضر تھا) اور تم نے بیعت نہیں کی۔ اور احد کے دن تم نے بھی پیٹھ پھیرنے والوں کے ساتھ پیٹھ پھیر لی تھی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا: جہاں تک تمہارا یہ قول ہے کہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے تو میں کسی ایسے کام سے غائب نہیں ہوا جس میں رسول اللہ ﷺ حاضر ہوئے ہوں، مگر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی بیمار تھی اور میں ان کے پاس ان کی تیمارداری کے لئے رہا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے مسلمانوں کے حصص کے ساتھ برابر کا حصہ دیا، اور رہا بیعت الشجرہ کا مسئلہ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے مشرکین مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا: هذه لعثمان یہ عثمان کے لئے ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کا دایاں اور آپ کا بایاں میرے دائیں اور بائیں سے میرے لئے انتہائی بہتر ہے اور رہا یوم الجمع (احد کا دن) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ تو میں بھی ان میں شامل ہو گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دلیل سے غالب آ گئے۔ (1)

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل صحابہ، باب مناقب عثمان بن عفان، جلد 1، صفحہ 523، اسلام آباد

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے انہوں نے بیان کیا: عبدان، ابوحمزہ نے عثمان بن موہب سے بیان کیا۔ انہوں نے کہا: ایک آدمی آیا اور اس نے بیت اللہ شریف کا حج کیا تو اس نے ایک قوم کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے پوچھا: یہ بیٹھنے والے لوگ کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ قریش ہیں۔ اس نے پوچھا: شیخ کون ہے؟ انہوں نے بتایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما۔ وہ ان کے پاس آیا اور کہا: میں ایک شے کے بارے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا مجھے بتاؤ گے؟ اس نے کہا: میں تجھے اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں کیا تو یہ جانتے ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد کے دن فرار ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا آپ ان کے بارے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بدر کے دن اس میدان سے غائب تھے وہ اس میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

پھر اس نے پوچھا: کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بیعت رضوان سے بھی پیچھے رہ گئے اور اس میں وہ حاضر نہ ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پس اس آدمی نے نعرہ تکبیر بلند کیا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آؤ میں تجھے ان امور کے بارے جو تو نے مجھ سے سوال کیا ہے میں تیرے لئے اس کی وضاحت کروں۔ جہاں تک احد کے دن آپ کے فرار کا تعلق ہے تو میں یہ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا ہے اور غزوہ بدر سے ان کے غائب ہونے کا معاملہ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: إن لك أجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه (یقیناً تمہارے لئے اس آدمی کے برابر اجر اور (مال غنیمت سے) حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔) اور جہاں تک بیعت رضوان سے غائب ہونے کا تعلق ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ اگر بطن مکہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا کوئی موجود ہوتا تو یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا: ھذہ ید عثمان یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: ھذہ لعثمان یہ بیعت عثمان کے لئے ہے۔ اب اسے تو اپنے ساتھ لے جا (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول فرمانا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فحج آدم موسیٰ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام دلیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کے سبب اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے پر زجر و توبیخ اور ملامت کریں تو حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے مجھ پر مقدر بنا دیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اس لئے

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 581، اسلام آباد

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلم اللہ موسیٰ تکلیما، جلد 2، صفحہ 1119، اسلام آباد۔ ... جلد 2، صفحہ 335 ...

ایضاً صحیح بخاری، کتاب القدر، حدیث نمبر 6124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی توبہ قبول ہو جائے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی، اور اسی طرح وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور بلاشبہ وہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اور ان دونوں کے سوا توبہ کرنے والے گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں، پس وہ اس پریشانی اور خوف میں رہتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے، اور اگر قبول کر لی جائے تو بھی خوف ان پر غالب ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے بارے علم نہیں ہوتا۔ فاعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ بنا دے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (در حقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا مراد منافقین ہیں۔

وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ یعنی جو نفاق میں یا نسب میں (ان کے بھائی تھے) اور ان سرایا میں گئے جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بئر معونہ کی طرف بھیجا (انہیں کہتے تھے) لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے) تو اس میں مسلمانوں کو ان کی مثل قول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِذَا ضَرَبُوْا یہ زمانہ ماضی کے لئے ہے، یعنی اذ ضربوا (جب انہوں نے سفر کیا) کیونکہ کلام میں شرط کا معنی ہے اس حیثیت سے کہ الَّذِيْنَ مبہم غیر موقت ہے، پس اِذَا اِذْ کے محل میں واقع ہے۔ جیسا کہ ماضی جزا میں مستقبل کے محل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے انہوں نے زمین میں سفر کیا اور تجارت یا دیگر کاموں کے لئے چلے اور مر گئے۔ اَوْ كَانُوْا غُزًّى یا وہ جہاد میں گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ اور الغزّی جمع منقوص ہے اس کا لفظ حالت رفع اور جر میں تبدیل نہیں ہوتا، اور اس کا واحد غاز ہے جیسا کہ راکع کی جمع رُکّع، صائم کی جمع صُوَّم، نائم کی جمع نُوَّم، شاہد کی جمع شُہَّد اور غائب کی جمع غُیَّب ہے۔ اور جمع میں غزاۃ بھی جائز ہے جیسا کہ قضاۃ اور غزّاء مد کے ساتھ بھی مثلاً ضُرّاب اور صوّام اور کہا جاتا ہے غَزِیّ، الغزاۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قُل للقوافل والغزِیِّ اذا غزوا

اس میں الغزی الغزاۃ کی جمع کے طور پر مذکور ہے۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے غزی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور المُغْزِیَۃُ کی عورت جس کا خاوند جہاد پر ہو۔

میرا قول: کان یکون اور قال یقول۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ یہ وعظ و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قول کے ساتھ نصیحت کی ہے، یعنی تم جنگ سے بھاگو نہیں اور نہ اس سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بلکہ تم اس کی سزا اور اس کے دردناک عذاب سے بھاگو، کیونکہ تمہیں اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارے لئے نہ نقصان اور ضرر کا مالک ہے اور نہ ہی نفع کا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝

"پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تند مزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ درگزر فرمایئے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔"

ما صلہ ہے اس میں تاکید کا معنی ہے، ای فبرحمۃ، جیسا کہ اس قول میں ہے: عَمَّا قَلِيْلٍ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ۔ اور یہ علی الاطلاق زائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر زائدہ ہونے کا اطلاق سیبویہ نے کیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کا عمل زائل ہو چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ما نکرہ ہے اور با کے سبب محل جر میں ہے اور رحمۃ اس سے بدل ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کے دن پیٹھ پھیرنے والوں سے نرمی کی اور ان سے کوئی سختی نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آپ نے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا کردہ توفیق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ما استفہامیہ ہے اور معنی یہ ہے: پس کتنی رحمت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہ آپ ان کے لئے نرم ہو گئے ہیں، تو یہ بطور تعجب ہے۔ اور اس میں حقیقت سے دوری ہے، کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو یہ فبم بغیر الف کے ہوتا۔ لِنْتَ یہ لَانَ يَلِيْنُ لِيْنًا وَلِيَانًا فتحہ کے ساتھ سے ماخوذ ہے۔ اور الفظ الغلیظ کا معنی ہے تند خو، ترش مزاج۔ فَظِظْتَ تَفَظُّ فَظَاظَةً و فَظَاظًا فَأَنْتَ فَظٌّ۔ (تو تند خو ہے) اس کی مونث فَظَّةٌ ہے اور جمع اَفْظَاظٌ ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے یہ ہے کہ نہ آپ تند خو ہیں، نہ سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں ساتھیوں کے ہمراہ چیخنے والے ہیں۔(1)

مفضل نے اشعار کہے ہیں جن سے فظ کے مذکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

وليس بفظ في الأداني والألى ... يؤمون جدواه ولكنه سهل

وفظ على أعدائه يحذرونه ... فسطوته حتف ونائله جزل

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1981، ایضاً کتاب تفسیر، حدیث نمبر 4461، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں لفظ فظ دونوں جگہ مذکر ہوا ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے اس کے مؤنث ہونے کے بارے کہا ہے:

أموت من الضُّرِّ في منزلي　　وغيري يموت من الكِظَّة

ودنيا تجود على الجاهلين　　وهي على ذي النُّهى فظَّة

اس میں لفظ فظۃ مؤنث ذکر کیا گیا ہے۔

اور غلیظ القلب سے مراد چہرے پر تیوری چڑھانا ہے (اور کرخت چہرے کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ ہونا ہے) اور غائب سے بہت کم متاثر ہونا اور شفقت و رحمت کا بہت کم ہونا ہے۔

اور اسی کے بارے شاعر کا قول ہے:

يُبكى علينا ولا نبكي على أحدٍ　　لنحن أغلظ أكبادًا من الإبل

ہم پر رویا جائے گا اور ہم کسی پر نہیں روئیں گے یقیناً ہم اونٹ سے زیادہ سخت دل ہیں۔

اور لانفضوا کا معنی ہے لتفرقوا (تو وہ بکھر جاتے) فضضتهم فانفضوا یعنی میں نے انہیں منتشر کیا تو وہ منتشر ہو گئے، اور اسی بارے میں ابو النجم کا قول ہے۔

وہ اونٹ کا وصف بیان کرتا ہے:

مستعجلات القيض غير جُرَّد　　ينفض عنهن الحصى بالصمد

الفض کا اصل معنی توڑنا ہے، اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: لا يفضض الله فاك۔

(اللہ تیرے منہ کو سلامت رکھے "یعنی نہ توڑے") اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کی نرمی نہ ہوتی تو حیا (حجابات) اور خوف انہیں تمہارے قریب آنے سے روکتا اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر چکے تھے۔

قولہ تعالیٰ: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان کاموں کا حکم فرمایا ہے جو انتہائی تدریج کے ساتھ اور آہستہ آہستہ ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں معاف فرما دیں جو خاص کر آپ کو ان کی طرف سے اذیت پہنچی ہے، پس جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اس فعل کے بارے مغفرت طلب کریں جو ان سے صادر ہوا، جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو وہ اس اہل ہو گئے کہ امور میں ان سے مشورہ کیا جائے۔ اہل لغت نے کہا ہے: الاستشارۃ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: شرت الدابۃ و شورتها جب تو اس کے بارے دوڑنے وغیرہ کی خبر جان لے۔ اور وہ جگہ جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں اسے مشوار کہا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے اس قول سے ہوتا ہے: شرت العسل و اشتته فهو مشور و مشتار جب تو اسے اس کی جگہ سے لے لے۔ عدی بن زید نے کہا ہے:

فِي　نَسْأَمُ　يَأْتِي　الشَّيْءَ　لَهُ　　وَحَدِيثٌ　مِثْلِي　تَقَدِّي　ذِي　مُشْتَار

اس میں مشورہ کو معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شوریٰ (مشاورت) قواعد شریعت اور پختگی احکام میں سے ہے، جو اہل علم اور اہل دین سے مشاورت نہیں کرتا تو اس کا معزول ہونا واجب ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مومنین کی مدح اور تعریف کی ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔

اعرابی نے کہا ہے: ما غُبِنْتُ قطّ حتی یُغْبَنَ قومی (مجھ سے کبھی غبن اور دھوکہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ میری قوم سے دھوکہ کیا جائے۔) کہا گیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں کوئی کام بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ میں ان سے مشاورت کر لوں۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: حکمرانوں پر لازم ہے ان معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہے جنہیں وہ نہیں جانتے اور امور دین میں سے جن میں انہیں مشکل درپیش ہو اور فوجی ماہرین سے ان امور میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں سے جو مصالح سے تعلق رکھتے ہیں اور کاتب، وزراء اور عمال کے سربراہوں سے ان امور میں جو شہروں کے مصالح، منافع اور ان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے: ما ندم من استشار (جس نے مشاورت کی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہوا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جو اپنی رائے پر اترایا وہ گمراہ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ یہ آیت کا حصہ ہی اجتہاد اور امکان وحی کے ساتھ ظنوں کو لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں اجازت عطا فرمائی ہے اور اہل تاویل نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں۔ پس ایک گروہ نے کہا ہے: یہ جنگوں کی تدبیر کے بارے میں ہے اور دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کے وقت کے بارے ہے اور اپنے نفوس کو مطمئن اور پاکیزہ رکھنے کے لئے اور ان کی قدر کو بلند کرنے کے لئے اور اپنے دین پر جمع کرنے کے لئے (مشاورت ہے) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ساتھ آپ کو ان کی رائے سے غنی کر دیا ہے۔ یہ حضرت قتادہ، ربیع، ابن اسحاق اور شافعی رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے: یہ اس قول کی طرح ہے والبکر تستامر (باکرہ عورت سے اس کے دل کی پاکیزگی کے لئے اجازت لی جائے گی) (مشاورت کی جائے گی۔) ایسا اس لئے نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اور مقاتل، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا ہے: عربوں کے سرداروں سے جب کسی معاملہ میں مشاورت نہ کی جاتی تو وہ ان پر شاق اور گراں گزرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے معاملات میں مشاورت کریں، کیونکہ یہ ان کے لئے انتہائی مہربانی اور کرم ہے اور ان کے حسد و کینہ کو بہت دور کرنے والا ہے (1) اور ان کے دلوں کو پاک کرنے والا ہے۔ پس جب آپ ان سے مشاورت کریں گے تو وہ اپنے لئے آپ کی عزت و تکریم کو پہچان جائیں گے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ اس بارے میں ہے جس میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری اور ضحاک رحمہما اللہ سے کہا

1۔ [illegible] جلد 2، صفحہ 343

میں مشاورت برکت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما ندم من استشار ولا خاب من استخار (وہ نادم نہ ہو گا جس نے مشورہ کیا اور وہ خائب و خاسر نہ ہوگا جس نے استخارہ کیا۔) اور حضرت سہل بن سعد الساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: "کوئی بندہ کبھی مشورہ کے سبب شقی اور بدبخت نہیں ہوا اور کوئی رائے کے استغناء کے ساتھ سعید اور خوش بخت نہیں ہوا" اور بعض نے کہا ہے: اس سے مشاورت کر جو امور کا تجربہ رکھتا ہو، کیونکہ وہ تجھے اپنی اس رائے دے گا جو اس پر بہت مہنگی واقع ہوئی اور تو اسے مفت حاصل کرے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے مجلس شوریٰ مقرر فرمائی حالانکہ یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ کرام اہل علم امناء سے امور مباحہ میں مشاورت کرتے تھے تاکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ وہ ان پر عمل پیرا ہو سکیں (1)۔ حضرت سفیان ثوری نے بیان کیا ہے: چاہیے کہ تمہارے مشیر متقی اور امانتدار ہوں اور ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔ اور حسن نے کہا ہے: بخدا جو قوم آپس میں مشورہ کر لیتی ہے تو جو وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ ان کی راہنمائی افضل کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کوئی قوم نہیں جن کا مشورہ ہو اور ان کے ساتھ احمد یا محمد نامی کوئی بھی حاضر ہو اور وہ اسے اپنے مشورہ میں شامل کریں مگر اسے ان کے لئے پسند کر لیا جائے گا۔"

مسئلہ نمبر 6۔ شوریٰ کی بنیاد اختلاف آراء پر ہے اور مشورہ لینے والا اس اختلاف میں غور و فکر کرتا ہے اور ایسے قول کو دیکھتا ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اگر اس کے لئے ممکن ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس میں سے جہاں تک چاہے راہنمائی فرما دے تو وہ اس پر پختہ ہو جائے اور اسے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نافذ کر دے، کیونکہ مطلوب تک پہنچنے کی یہی انتہائی کوشش ہے اور اسی آیت میں اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ جب آپ کسی کام کا ارادہ کر لیں تو اس میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، نہ کہ آپ ان کی مشاورت کا ارادہ کریں۔ اور عزم سے مراد ایسا امر ہے جس میں خوب غور و فکر کی گئی ہو اور اسے مہذب بنا دیا گیا ہو وہ بغیر غور و فکر کے صرف رائے سے عزم نہیں ہے۔ مثلاً عرب کے بہادروں کے بارے طویل قصائد کے قطعہ میں۔

جیسے کہ کسی نے کہا:

اذا ھم ألقی بین عینیہ عزمہ ... و نکب عن ذکر العواقب جانبا

جب وہ قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور انجام کے ذکر کو ایک جانب ڈال دیتا ہے۔

ولم یستشر فی رأیہ غیر نفسہ ... ولم یرض إلا قائم السیف صاحبا

اور وہ اپنی رائے میں اپنے سوا کسی سے مشورہ نہیں کرتا اور تلوار اٹھانے والے کے سوا کسی ساتھی سے راضی نہیں ہوتا۔

اور نقاش نے کہا ہے: العزم اور الحزم دونوں کا معنی ایک ہے، اور حاء کو عین سے بدلا گیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1095، اسلام آباد

اپنے ہتھیار دیکھ لے اگر پھر انہیں قتل کرنے سے پہلے اتار دے۔"(1)

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ توکل کا معنی عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے اور اس کا اسم التکلان ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اتکلت علیہ فی امری (میں نے اپنے کام میں اس پر اعتماد کیا ہے) اور اس کی اصل اوتکلت ہے واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدلا گیا ہے پھر یاء کو تاء سے بدل دیا گیا اور پھر اسے تاء اصلی میں مدغم کر دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: وکلتہ بامری توکیلا (میں نے اسے اپنے کام کا وکیل بنایا) اس کا اسم وکالۃ ہے۔ واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔

علماء نے توکل کے بارے میں اختلاف کیا ہے، متصوفین میں سے ایک گروہ نے کہا ہے: اس کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کے دل میں غیر اللہ یعنی درندے وغیرہ کسی اور شے کا خوف نہ ہو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ضمانت کی وجہ سے رزق کی تلاش میں سعی اور جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور عام فقہاء نے کہا ہے: وہ ہے جس کا ذکر قول باری تعالیٰ: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ کے تحت ہو چکا ہے۔ اور وہی صحیح ہے جیسے کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول میں خبر دی ہے لَا تَخَافَا اور فرمایا ہے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہٰ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو) اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس قول سے خبر دی ہے: فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ہود: 70) (پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ فرشتوں نے کہا ڈریے نہیں) پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہما السلام خوفزدہ ہوئے تو یہ دونوں مثالیں تیرے لئے کافی ہیں تو ان دونوں کے سوا اور تو بدرجہ اولیٰ ہے۔ اور اس معنی کا بیان آگے آئے گا۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ یعنی تم اسی پر توکل کرو کیونکہ اگر وہ تمہاری مدد فرمائے اور تمہارے دشمن سے تمہاری حفاظت کرے تو تم ہرگز مغلوب نہ ہو گے۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور اگر وہ اپنا تعاون تمہارے ساتھ چھوڑ دے۔ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ یعنی اس کے بعد کوئی بھی تمہاری مدد نہ کرے گا یعنی اس کے تمہیں چھوڑنے کے بعد، کیونکہ اس نے فرمایا ہے: وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور الخذلان کا معنی ہے مدد اور تعاون چھوڑ دینا۔ اور المخذول: جسے چھوڑ دیا گیا ہو جس کی پرواہ نہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 540

کی جائے۔ اور خذلت الوحشیۃ یعنی وحشی جانور پیچھے رہ گیا اور اپنے بچے کے پاس ٹھہر گیا اور اس نے اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا۔ یہی وہ خذول ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

خذول تراعی ربربا بخمیلۃ　　تناول اطراف البریر و ترتدی

اور یہ بھی کہا ہے:

نظرت الیک بعین جاریۃ　　خذلت صواحبها علی طفل

اس نے تیری طرف جاری آنکھ کے ساتھ دیکھا اور اس نے بچے کے سبب اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مقلوب میں سے ہے کیونکہ جب اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ خذول ہوتی ہے اور تخاذلت رجلاہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ دونوں (ٹانگیں) کمزور ہو چکی ہوں۔ اور کسی نے کہا: وخذول الرجل من غیر کسح (اور آدمی کی کمزوری جو بغیر عاجزی کے ہو) اور رجل خذلۃ ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦١﴾

"اور ممکن نہیں کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب احد کے دن تیر اندازوں نے اپنے مرکز کو خالی کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس خوف سے کہ مسلمان مال غنیمت کے والی بن جائیں گے اور انہیں کوئی شے بھی نہیں دی جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نبی مکرم ﷺ تقسیم میں زیادتی نہیں کرتے ہیں۔ پس تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم انہیں متہم کرو۔ اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض غزوات میں لشکر بھیجے پھر ان کے آنے سے پہلے ہی غنیمت حاصل کر لی گئی اور آپ نے اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور لشکریوں کے لئے تقسیم نہ کیا۔ (یعنی انہیں کوئی حصہ نہ دیا) تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ یعنی نبی کی یہ شان نہیں ہے وہ بعض کو عطا کرے اور بعض کو چھوڑ دے۔ اور اسی قول کی طرح حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس نے بھی، عکرمہ اور ابن جبیر وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک سرخ کپڑے کے سبب نازل ہوئی جو بدر کے دن مال غنیمت میں سے گم ہو گیا (1) تو بعض لوگ جو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے ان میں سے بعض نے کہا: شاید حضور نبی کریم ﷺ نے اسے لے لیا ہو۔ پس یہ آیت نازل ہوئی اسے ابو داؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 574

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث 3457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عطیہ نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ قول مومنین کی جانب سے تھا انہوں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول منافقین کی جانب سے تھا اور یہ روایت بھی ہے کہ گم ہونے والی شے تلوار تھی۔ یہ اقوال بیان کئے جا سکتے ہیں اس بنا پر کہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہو۔

ابو جعفر نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ فرمایا: یہ آیت کہہ رہی ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ میں سے کوئی شے چھپائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں لام منقول ہے، یعنی وما کان نبی لیغل جیسا کہ یہ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ای ما کان اللہ لیتخذ ولدا (یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لے۔) (تو اس میں بھی لام منقول ہے۔) اور یُغَلَّ یعنی یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ابن السکیت نے کہا ہے: [ہم نے غنیمت کے بارے میں نہیں سنا مگر غَلَّ غلولا اور اسی طرح بھی پڑھا گیا ہے] وما کان لنبی ان یغل ویُغَل۔ فرمایا: یَغُلَّ کا معنی ہے یخون خیانت کرنا اور یُغَلَّ کا معنی ہے یُخَوَّنُ اور یہ لفظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک یُخَانُ ہے، یعنی وہ شے جو مال غنیمت سے لی جاتی ہے اور دوسرا یُخَوَّنُ ہے۔ یعنی جسے غلول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: پھر کہا جاتا ہے ہر وہ جس نے کوئی شے چھپ کر لے لی تو اس نے غَلَّ یَغُلُّ غُلُوْلًا کا ارتکاب کیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے اس کا نام غلول اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا ہے، یعنی روک دیا گیا ہے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: الغلول (خیانت) مال غنیمت کے ساتھ ہی خاص ہے اور ہم اسے نہ خیانت گمان کرتے ہیں اور نہ ہی کینہ اور حقد۔ اور جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے خیانت کہا جائے وہ اَغَلَّ یُغِلُّ ہے اور اسے حقد کہا جائے اس کے لئے غَلَّ یَغِلُّ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسے غلول کہا جائے وہ غَلَّ یَغُلُّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور غَلَّ الْبَعِيْرُ بھی کہا ہے [یَغُلُّ غُلَّةً] یعنی ہے جب وہ اپنا کثیر پانی پورا نہ کرے۔ اور اَغَلَّ الرجل کا معنی ہے آدمی نے خیانت کی۔ النمر نے کہا ہے:

جزى الله عنا حمزة ابنة نوفل — جزاء مغل بالأمانة كاذب

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے حمزہ بنت نوفل کو جزا دے (جیسا کہ) امانت میں خیانت کرنے والے جھوٹے کی جزا۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: لا اغلال ولا اسلال(1) یعنی نہ کوئی خیانت ہے اور نہ کوئی سرقہ (چوری) ہے(2) اور کہا جاتا ہے: لا رشوة (اور نہ ہی کوئی رشوت ہے۔)

اور شریح نے کہا ہے: خیانت کرنے والے کے سوا کسی مستعیر (ادھار لینے والا) پر ضمان نہیں ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین (چیزیں) ہیں جن پر مومن کا دل حقد و کینہ نہیں کرتا(3)۔" جس نے اسے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کا معنی حقد اور کینہ ہے۔ اور غَلَّ [بمعنی دخل] بھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا کہا جاتا ہے:

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2365، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 300
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الخطبۃ یوم النحر، صفحہ 226، وزارت تعلیم اسلام آباد
ایضاً، ابن ماجہ، کتاب فضائل اصحاب رسول، باب من بلغ علما، حدیث 225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غلّ فلان المفاوز، یعنی فلاں جنگل میں داخل ہوا اور اس کے وسط تک پہنچا۔ اور غلّ من المغنم غلولا یعنی اس نے مالِ غنیمت میں خیانت کی۔ اور غل الماء بین الاشجار (تب کہا جاتا ہے) جب پانی درختوں میں داخل ہو جائے (جاری ہو جائے) ان تمام میں یغلّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: الغلول کا لغوی معنی یہ ہے کہ وہ مالِ غنیمت سے کوئی شے لے لے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے اور اسی سے تغلغل الماء فی الشجر بھی ہے جب پانی اس میں داخل ہو جائے اور الغلل کا معنی درخت کی جڑوں میں جاری پانی ہے، کیونکہ وہ درختوں کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہوتا ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لعب السیول به فاصبح ماؤه ... غللاً یقطع فی اصول الخروع

اور اسی سے غلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے اور الغال اس سے مراد وہ زمین ہموار زمین ہے، اور سلم اور طلح کے درخت اگنے کی جگہ کو غال کہا جاتا ہے اور غال بھی ایک بولی ہے۔ اور اس کی جمع غلان غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یغلّ کا معنی ہے یوجد غالا (اسے غال پایا جاتا ہے) جیسا کہ آپ کہتے ہیں: احمدت الرجل وجدته محمودا یعنی میں نے فلاں آدمی کی تعریف کی (تو میں نے اسے محمود پایا)۔ پس ان دونوں بنا پر یہ قرات یغلّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ اسی کی طرف راجع ہوتی ہے اور یغلّ کا معنی جمہور اہل علم کے نزدیک اس طرح ہے لیس لاحد ان یغلّ یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مالِ غنیمت میں خیانت کرے۔

پس آیت میں مقصود لوگوں کو مالِ غنیمت میں خیانت کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ اور اس پر وعید بتانا ہے۔ اور جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے خیانت کی جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ آپ کے سوا کسی اور سے خیانت کی جائے۔ لیکن ذکر خاص طور پر آپ کا کیا گیا ہے کیونکہ آپ ﷺ کے ساتھ خیانت کرنا از روئے وعید کے زیادہ شدید اور سخت ہے اور از روئے بوجھ اور گناہ کے بہت بڑی اور بھاری ہے، کیونکہ آپ کی موجودگی میں معصیت کا ارتکاب کرنا بہت بڑا جرم ہے کیونکہ آپ کی عزت و توقیر کرنا لازم ہے اور ایسے والی جو حضور نبی کریم ﷺ کے حکم پر ہوں تو ان کے لئے بھی عزت و توقیر میں سے حصہ ہے۔ اور کہا گیا ہے: یغلّ کا معنی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے کبھی بھی خیانت نہیں کی اور مقصود یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی وہ اس (خیانت کی ہوئی شے) کے ساتھ آئے گا درآنحالیکہ وہ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر اٹھائے ہوئے ہو گا۔ اور وہ اسے اٹھانے اور اس کے بوجھ کے سبب عذاب میں ہو گا اور اس کی آواز سے خوفزدہ ہو گا اور تمام کے سامنے اس کی خیانت کا اظہار کر کے اسے زجر و توبیخ کی جائے گی جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہ بھی وہ رسوائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو واقع کرے گا اور یہ اسی رسوائی اور ذلت کی مثل ہے جس میں وہ دھوکہ دینے اور عہد توڑنے والے کو واقع کرے گا۔ اس طرح کہ اس کی سرین (بیٹھنے کی جگہ) کے پاس اس کے غدر اور خیانت کی مقدار جھنڈا نصب کیا جائے گا۔(1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں ان کے بارے جن کا زمانہ اس سے عہد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتا ہے اور وہ اسے دیکھتے ہیں۔

کیا آپ شاعر کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے:

أَسُمَيَّ وَيْحَكِ هَلْ سَمِعْتِ بِغَدْرَةٍ　　رُفِعَ اللِّوَاءُ لَنَا بِهَا فِي الْمَجْمَعِ

اے سُمیّ تیری ہلاکت ہو کیا تو نے غدر اور خیانت کے بارے سنا ہے کہ ہمارے لئے اس کے سبب جمع ہونے کی جگہ (میدان حشر) میں جھنڈا کھڑا کیا جائے گا۔

عرب لوگ معاہدہ توڑنے والے کے لئے جھنڈا بلند کرتے تھے اور اسی طرح جرم کرنے والے کو اس کی جنایت سمیت پھرایا جاتا تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور غلول (خیانت) کا ذکر کیا اور اسے بہت بڑا (جرم) قرار دیا اور اس کے امر کو عظیم اور شدید قرار دیا پھر فرمایا: "میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر اونٹ اپنی آواز نکال رہا ہو گا وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر گھوڑا اپنی آواز نکال رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اس کی گردن پر بکری اپنی آواز نکال رہی ہو گی تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر ایک آدمی چیخ وپکار کر رہا ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر لکھے ہوئے کاغذ حرکت کر رہے ہوں گے (مراد وہ کاغذ ہیں جن پر اس کے ذمے واجب الادا حقوق لکھے ہوں گے) اور وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھ تک (پیغام) پہنچا دیا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر سونا چاندی ہو گا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا"[1] اور ابوداؤد نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مال غنیمت پاتے تھے تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تو وہ لوگوں میں اعلان کر دیتے اور وہ اپنے غنائم لے کر آ جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خمس نکال لیتے تھے اور اسے تقسیم کر دیتے، پس ایک دن اعلان کے بعد ایک آدمی بالوں کی رسی لے کر آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس مال میں سے تھی جو ہم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ تو آپ

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 122-123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ادوا الخیاط والمخیط (1) (دھاگہ اور سوئی ادا کرو) اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غزوہ میں تقسیم سے پہلے تھوڑا اور زیادہ دونوں لینا
حلال نہیں ہے مگر وہ جس پر تمام کا اجماع ہو جائے مثلاً جنگ کی زمین میں کھانے کی اشیاء اور ایندھن کی لکڑیاں اور شکار وغیرہ۔
اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: دشمن کی زمین میں امام کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی شے نہیں لی
جائے گی۔ اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ آثار اس کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ حسن نے کہا ہے: رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب کوئی شہر یا قلعہ فتح کرتے تھے تو ستو، آٹا، گھی اور شہد کھا لیا کرتے تھے۔ اور ابراہیم نے کہا ہے: وہ
دار الحرب میں دشمن کی زمین سے خمس نکالنے سے پہلے کھانے کی اشیاء اور جانوروں کا چارہ وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ اور عطا
نے کہا ہے: الشکری سریہ میں ہوتے تھے اور وہ گھی کے مشکیزے، شہد اور طعام پاتے تھے اور انہیں کھاتے تھے اور جو کچھ باقی رہ
جاتا وہ اسے اپنے امیر کے پاس لوٹا دیتے تھے اور جماعت علماء کا نظریہ یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ غلول کرنے والے کا سامان جلایا نہیں جائے گا، کیونکہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا سامان نہیں جلایا جس نے چادر اٹھائی تھی اور نہ ہی آپ نے ان موتیوں والے کا سامان جلایا تھا جس پر
آپ نے نماز جنازہ چھوڑ دی تھی۔ اگر اس (خیانت کرنے والے) کا سامان جلانا واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اس پر عمل
کرتے۔ اور اگر آپ ایسا کرتے تو یقیناً وہ حدیث میں نقل کیا جاتا (2)۔ اور رہی وہ روایت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے
مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم کسی آدمی کو پاؤ اس حال میں کہ اس نے (مال غنیمت میں) خیانت کی ہو
تو تم اس کا سامان جلا دو اور اسے مارو (3)"۔ تو اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صالح بن محمد بن زائدہ کی حدیث سے روایت
کیا ہے اور یہ ضعیف راوی ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ترمذی نے کہا ہے: میں نے اس حدیث کے بارے محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اسے
صرف صالح بن محمد نے روایت کیا ہے اور وہ ابو واقد اللیثی ہے اور وہ منکر الحدیث ہے اور ابو داؤد نے بھی اس سے روایت کیا
ہے اس نے کہا ہے: ہم نے ولید بن ہشام کی معیت میں جنگ لڑی اور ہمارے ساتھ سالم بن عبد اللہ بن عمر اور عمر بن
عبد العزیز رحمہما اللہ بھی تھے۔ پس ایک آدمی نے سامان (غنیمت) میں خیانت کی۔ پس ولید نے اس کے سامان کے بارے حکم
دیا اور اسے جلا دیا گیا اور اسے پھرایا گیا اور اسے اس کا حصہ بھی نہ دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثوں میں سے زیادہ صحیح
ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر
رضی اللہ عنہما نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلا دیا اور انہوں نے اسے مارا (4)۔

1۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2335، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، باب ما جاء فی الغال، جلد 2، صفحہ 15، اسلامی کتب خانہ۔ ایضاً ابی داؤد، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اور حسن نے بھی کہا ہے مگر یہ کہ وہ حیوان یا مصحف ہو (تو پھر یہ سزا نہیں دی جائے گی)۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں نے غلول کرنے والے کو مارا اور اس کا سامان جلا دیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے: جنہوں نے یہ کہا ہے کہ غلول کرنے والے کا کجاوہ اور اس کا سامان سب جلا دیا جائے گا ان میں سے مکحول اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے ان کی دلیل صالح مذکور کی حدیث ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ ایسی حدیث ہے جس کے ساتھ تیرا کسی حرمت کو ختم کرنا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرنا (ثابت ہوتا ہے)؛ کیونکہ اس کے معارض ایسے آثار ہیں جو اس کی نسبت زیادہ قوی ہیں۔ اور یہ موقف امام مالک اور آپ کے متبعین نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ نظر و فکر اور اثر کے صحیح ہونے کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بدنی سزا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مختلف نہیں ہے، اور رہی مالی سزا تو انہوں نے اس ذمی کے بارے میں کہا ہے جو شراب کسی مسلمان کو فروخت کرتا ہے کہ مسلمان کے پاس شراب کو بہا دیا جائے گا اور ذمی سے بطور سزا ثمن چھین لئے جائیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو شراب کی فروخت نہ کرے تو اسی بنا پر یہ کہنا چاہئے کہ مال میں سزا دینا جائز ہوتا ہے۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ بہا دیا جس میں پانی ملایا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ (مال غنیمت سے) خیانۃً مال لینے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام مال جو بطور خیانت اس نے اٹھایا اسے لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دے اگر وہ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ پائے۔ اور بلاشبہ جب اس نے ایسا کر دیا تو یہی اس کی توبہ ہوگی اور گناہ سے بچ نکلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور جب اہل لشکر منتشر ہو جائیں اور وہ اس تک نہ پہنچ سکے تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جائے گا اس میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ اس کا خمس امام کو دے دے اور باقی صدقہ کر دے گا۔ یہ امام زہری، مالک، اوزاعی، لیث اور ثوری رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور حضرات عبادہ بن صامت، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ مال صدقہ کر دیا جائے جس کے مالک کا علم نہ ہو، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے غیر کا مال صدقہ کرنا درست نہیں۔ ابو عمر نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ایسی صورت میں ہے جب اس کے مالک کا پتہ ہو، اس تک پہنچنا یا اس کے ورثاء تک پہنچنا ممکن ہو اور اگر ان میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو اس صورت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی صدقہ کرنے کو مکروہ نہیں قرار دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ لقطہ (گری ہوئی چیز جو مل جائے) کا صدقہ کرنا جائز ہے جبکہ پہلے اس کی تشہیر کی جائے اور اس کے مالک کا علم نہ ہو سکے، اور پھر اس کے بارے یہ حکم لگایا ہے کہ اگر وہ (مالک) آ جائے تو اسے اجرت اور ضمان کے درمیان اختیار دیا جائے گا، اور اسی طرح غصب کی ہوئی شے کا حکم بھی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اور غلول کے ممنوع ہونے میں اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت میں تمام غانمین (لشکری) شریک ہیں، پس کسی کے لئے یہ

حلال نہیں کہ وہ اس میں سے کوئی شے دوسرے (کی اجازت) کے بغیر لے لے پس جس نے بھی اس میں سے کوئی شے غصب کی تو بالاتفاق اسے تادیبی سزا دی جائے گی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے کسی لونڈی کے ساتھ وطی کی یا نصاب کے برابر (دس درہم) مال چوری کیا تو اس پر حد قائم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس پر قطع ید نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 9۔ عمال کے ہدایا اور تحائف بھی غلول میں سے ہیں اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے اعتبار سے اس کا حکم غلول کرنے والے کے حکم کی طرح ہے۔ ابو داؤد نے اپنی سنن میں (1) اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو حمید ساعدی سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا [ابن سرح نے ابن الاتبیہ کہا ہے] پس وہ آیا اور اس نے کہا: یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: "عامل کو کیا ہو گیا ہے جسے ہم بھیجتے ہیں اور وہ آ کر یہ کہتا ہے یہ تمہارے لئے ہے اور یہ (مال) مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے خبردار! سنو! وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے اور پھر دیکھے کیا اسے کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں؟ تم میں سے کوئی بھی ان میں سے جو شے بھی لے گا قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ آئے گا اگر وہ اونٹ ہوا تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ گائے ہوئی تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوئی تو وہ اس کی آواز نکالے گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی، پھر آپ نے کہا: اللھم ھل بلغت اللھم ھل بلغت (2) (اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے؟)

اور ابو داؤد نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: "جسے ہم کسی عمل پر عامل مقرر کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں پس اس کے بعد اس نے جو لیا تو وہ غلول (خیانت) ہوگا۔" (3)

اور انہوں نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساعی (عامل) بنا کر بھیجا اور پھر فرمایا: "اے ابا مسعود! تو جا اور میں تجھے قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ تیری پشت پر صدقے کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ آئے اور وہ بلبلا رہا ہو (آواز نکال رہا ہو) کہ تو نے اسے بطور خیانت حاصل کیا تھا" انہوں نے عرض کی: تب میں نہیں جاؤں گا تو آپ نے فرمایا: "سو میں تجھے مجبور نہ کروں گا۔" (4) جو روایت ابو داؤد نے ہی مستورد بن شداد سے نقل کی ہے اس نے ان احادیث کو مقید کر دیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "جو ہمارا عامل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ بیوی حاصل کر لے (یعنی نکاح کرے) اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم حاصل کر لے اور اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، ہدایا العمال، حدیث 2557، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6639، ضیاء

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، العلمین جلد 2، صفحہ 53، اسلام آباد

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، العلمین جلد 2، صفحہ 52، اسلام آباد

4۔ ایضاً صفحہ 53، اسلام آباد

کے پاس مسکن (رہنے کے لئے گھر) نہ ہو تو رہائش گاہ بنا لے (1)"۔ فرمایا: ہمیں ابو بکر نے بیان کیا ہے: مجھے خبر دی گئی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "جس نے اس کے سوا کچھ لیا تو وہ غلول کرنے والا اور سارق (چوری کرنے والا) ہے۔" واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ کتب کو ان کے مالکوں سے روک کر رکھنا بھی غلول میں سے ہے، اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں بھی ان کے معنی میں داخل ہیں۔ زہری نے کہا ہے: کتب کی خیانت سے بچ، پرہیز کر۔ تو انہیں کہا گیا: کتب کا غلول کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: انہیں ان کے اصحاب سے روک کر رکھنا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل میں کہا گیا ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ یعنی نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ بطور رغبت یا رہبہ یا مداہنت کے وحی میں سے کوئی شے چھپا لے۔ اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم میں ان کے دین کے عیب بیان کئے گئے ہیں اور ان کے معبودان باطلہ کو جو برا کہا گیا ہے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ تو انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ اسے لپیٹ دیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ محمد بن بشار نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کے بارے جو ابتداءً بیان کیا ہے وہ جمہور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

"تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہو سکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ یعنی جو غلول کو ترک کرنے کا اور جہاد پر صبر کرنے (ڈٹے رہنے) کا ارادہ کرتا ہے۔ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ (اس کی طرح ہو سکتا ہے) جو کفر یا غلول یا جنگ میں حضور نبی کریم ﷺ سے پیٹھ پھیرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ یعنی اس کا ٹھکانا جہنم ہے، یعنی اگر اس نے توبہ نہ کی یا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف نہ کیا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ یعنی لوٹنے کی جگہ بہت بری ہے۔ اور رِضْوَان کو را کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ عُدْوَان اور عِدْوَان۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی اور اتباع کی وہ اس کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا ہے۔ کہا گیا ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ متفاوتۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات اور منازل مختلف ہیں، پس جس نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اس کے لئے عزت و کرامت اور ثواب عظیم ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا اس کے لئے ذلت، رسوائی اور دردناک عذاب ہے اور هُمْ دَرَجٰتٌ کا معنی ہے ذوو درجات (وہ صاحب درجات ہیں) یا علی درجات (وہ درجات پر ہیں) اور ذو درجات (یا وہ درجات میں ہیں) یا لھم درجات (یا ان کے لئے درجات ہیں) اور اہل نار بھی درجات والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: وجدتہ فی غمرات من النار

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیء، جلد 2، صفحہ 52-53، اسلام آباد

فاخرجته الی ضحضاح (1) (میں نے اسے آگ کی تکالیف میں پایا تو میں نے اسے تھوڑے سے پانی کی طرف نکال دیا)۔

پس مومن اور کافر درجہ میں برابر اور مساوی نہیں ہوں گے، پھر مومنین بھی مختلف ہوں گے، پس ان میں سے بعض، بعض سے بلند رتبہ پر ہوں گے اور اسی طرح کفار بھی۔ درجہ کا معنی رتبہ ہے اور اسی سے الدرج ہے (لپیٹا جانے والا کاغذ) کیونکہ اسے درجہ بدرجہ لپیٹا جاتا ہے۔ اور جہنم کے مراتب میں مستعمل درکات ہیں۔

جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافقین جہنم کے نیچے والے درکہ (گڑھے) میں ہوں گے) پس جس نے غلول نہیں کیا ان کے لئے جنت میں درجات ہوں گے اور جس نے غلول کیا اس کے لئے جہنم میں درکات ہوں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: جہنم کی کئی منازل ہیں اور ان میں سے ہر منزل کو درک اور درکہ کہا جاتا ہے اور درک نیچے کی طرف ہوتا ہے اور درج اوپر بلندی کی جانب ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

"یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں سے ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن و سنت، اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرما کر ان پر اپنے احسان عظیم کو بیان فرمایا ہے اور اس میں احسان کرنے کے معنی میں کئی اقوال ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہو بَشَرٌ مِّثْلُهُمْ یعنی آپ ان کی مثل بشر ہیں، پس جب دلائل واضح ہیں کہ آپ ان کی مثل بشر ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ای منهم۔ یعنی آپ ان میں سے ہیں۔

پس وہ آپ ﷺ کے ساتھ مشرف و مکرم ہوئے ہیں، پس یہ بھی ایک احسان ہے اور یہ قول بھی ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ تا کہ وہ آپ کی حالت کو پہچان لیں اور ان پر آپ کا طریقہ اور سنت مخفی نہ رہے، اور جب ان میں آپ کا مقام یہ ہے تو وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ آپ ﷺ کی طرف سے قتال اور جنگ کریں اور قطعاً آپ سے دور نہ بھاگیں۔ اور قرأت شاذہ میں مِّنْ اَنْفَسِهِمْ فا کے فتح کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ان میں اشرف (اعلیٰ) (خاندان) میں سے ہیں، کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش بقیہ عربوں سے افضل ہیں اور عرب غیر عربوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لفظ مومنین عام ہے اور اس کا معنی عرب کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ عرب قبائل میں سے کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے آپ ﷺ کو جنم دیا ہے اور اس کی آپ کے ساتھ نسبت موجود ہے سوائے بنی تغلب کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے اور اللہ تعالیٰ نے نصرانیت کی میل سے آپ کو پاک صاف رکھا اور اس تاویل کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 115، اسلام آباد

(الجمعہ:2) (وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے)

اور ابو محمد عبد الغنی نے بیان کیا ہے کہ ابو احمد البصری، احمد بن علی بن سعید القاضی، ابو بکر المروزی، یحییٰ بن معین، ہشام بن یوسف نے عبد اللہ بن سلیمان نوفل سے انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ صرف عرب والوں کے لئے ہے (1) اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام کے تمام مومنین مراد لئے ہیں (2)۔ اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک ہیں اور انہیں کی مثل بشر ہیں اور بلاشبہ آپ وحی کے سبب ان سے ممتاز ہیں اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ:128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے)۔ اور مومنین کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ وہی آپ سے نفع اٹھانے والے ہیں، پس ان پر احسان عظیم تر ہوا۔

اور قول باری تعالیٰ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ میں يَتْلُوْا۔ رَسُوْلًا کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا معنی ہے یقرأ (وہ پڑھتا ہے) اور تلاوت بمعنی قراءت ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے: تقدیر کلام ہے کانوا من قبل محمد تحقیق وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ اِنْ بمعنی ما ہے اور خبر میں لام بمعنی الا ہے یعنی وما کانوا من قبل الا فی ضلال مبین (وہ اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی وما کنتم من قبله الا من الضالین (اور تم اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور یہ کوفیوں کا مذہب ہے اور اس آیت کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

"کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آپڑی یہ مصیبت؟ فرمایئے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس میں الف استفہام کے لئے ہے اور واؤ عطف کے لئے۔ مُّصِيْبَةٌ اس سے مراد غلبہ ہے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا یعنی بدر کے دن تم اس سے دگنی پہنچا چکے ہو، اس طرح کہ تم نے ان میں سے ستر افراد قتل کئے اور ستر کو تم نے قیدی بنایا۔ اور قیدی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ قید کرنے والا اگر چاہے تو اپنے قیدی کو قتل کر سکتا ہے، یعنی تم نے انہیں بدر کے دن اور احد کے دن بھی ابتدا میں شکست سے دوچار کیا اور اس میں تم نے تقریباً بیس افراد قتل کئے۔ (گویا) تم نے ان میں سے دونوں دنوں میں افراد قتل کئے اور انہوں نے تم سے احد کے دن (ستر افراد) شہید کئے۔

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا یہ شکست اور قتل (کی مصیبت) ہمیں کہاں سے آپہنچی ہے، حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے تھے اور ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577
2۔ ایضاً

مسلمان ہیں اور تم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں اور وحی بھی اور وہ مشرک ہیں۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (فرما دیجئے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے) یعنی تیر اندازوں کی مخالفت کے سبب اور کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی جنگ میں اطاعت و فرمانبرداری کی مگر ان کی مدد کی گئی، کیونکہ جب وہ اطاعت کرتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اور حضرت قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: مراد ان کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدینہ طیبہ سے (دشمن کے مقابلے کے لئے) باہر نکلنے کا سوال کرنا ہے اس کے بعد کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ٹھہرنے کا ارادہ فرما چکے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تاویل اس خواب کی فرمائی تھی جس میں آپ نے اسے محفوظ قلعہ دیکھا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا بدر کے دن (قیدیوں کے قتل پر فدیہ لینے کو اختیار کرنا ہے[1]) حالانکہ انہیں کہا گیا تھا اگر تم نے قیدیوں کے بدلے فدیہ لیا تو ان کی تعداد کے برابر تم سے لوگ شہید کئے جائیں گے۔ اور بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا: "اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دو اور اگر تم چاہو تو ان کا فدیہ لے لو اور تم نے فدیہ سے مفاد حاصل کیا اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید کر دیئے گئے۔" اور ستر تو یں نمبر پر آخر میں شہید ہونے والے صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے انہیں جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا۔ پس مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا معنی پہلے دو قولوں کے مطابق ہو گا بذنوبکم (یعنی تم اپنے گناہوں کے سبب اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو) اور آخری قول کے مطابق ہو گا باختیارکم (یعنی یہ مصیبت تمہارے اپنے اختیار کے سبب آئی ہے۔)

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

"اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابل ہوئے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو منافق کرتے تھے اور جب کہا گیا ان سے آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔"

یعنی (وہ مصیبت) جو احد کے دن قتل، زخم اور ہزیمت کی صورت میں پہنچی۔ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ پہنچی۔ قفال نے کہا ہے: یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے تمہارے اور ان کے درمیان

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577

معاملہ آزاد چھوڑنے کے سبب پہنچی، اور جس نے اس کا ارادہ کیا اور یہ معتزلہ کی تاویل ہے۔ اور فَبِاِذۡنِ اللّٰهِ میں فا داخل ہے کیونکہ ما بمعنی الذی ہے۔ یعنی وہ مصیبت جو تمہیں اس دن پہنچی جب دونوں لشکر مقابلے کے لئے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقاضا سے پہنچی۔ پس کلام شرط کے معنی کے مشابہ ہو گیا جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے: الذی قام فلہ درھم (جو کھڑا ہوا تو اس کے لئے ایک درہم ہے) وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا یعنی تاکہ وہ (مومنین اور منافقین کو) الگ الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ مومنین کا ایمان جنگ میں ان کے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور تاکہ منافقین کا کفران کے (مصیبت پر) خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے پس وہ اسے جان لیں گے۔ اور قول باری تعالیٰ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ سے اشارہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کی طرف ہے جو اس کی معیت میں حضور نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت سے واپس لوٹ گئے تھے اور وہ تین سو تھے اور ان کے پیچھے عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری اور ابو جابر بن عبداللہ بھی چلے تو آپ نے انہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے نبی کو نہ چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کرو یا بچاؤ کرو اور اسی طرح کی بات کہی۔ ابن ابی نے آپ کو کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ جنگ ہوگی اور اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہوتے۔ پس جب عبداللہ ان سے مایوس ہو گیا تو اس نے کہا: (اے) اللہ کے دشمنو! تم جاؤ پس اللہ تعالیٰ اپنے رسول معظم ﷺ کو تم سے مستغنی کر دے گا۔ اور وہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلا گیا اور شہید کر دیا گیا رضی اللہ عنہ۔ (1)

قول باری تعالیٰ: أَوِ ادْفَعُوْا کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ پس سدی اور ابن جریج وغیرہما نے کہا ہے: تم ہماری تعداد میں اضافہ کرو اگرچہ تم ہمارے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو۔ تو یہ دشمن کو روکنے اور اسے دور ہٹانے کا (سبب بن) جائے گا۔ (2) کیونکہ تعداد جب بڑھ جائے تو دشمن کو دور ہٹانے اور دفاع کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے جنگ قادسیہ کے دن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم الاعمی کو دیکھا وہ زرہ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اطراف کھینچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا جھنڈا ہے۔ تو ان کو کہا گیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن میں اپنی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اور انہی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا وجود کیا ہے؟ (3)

اور ابو عون انصاری نے کہا ہے: أَوِ ادْفَعُوْا کا معنی ہے رابطوا (سرحد کے پاس دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو) اور یہ معنی پہلے کے قریب ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ مقابلے میں پڑاؤ ڈالنے والا دفاع کرنے والا ہی ہوتا ہے، کیونکہ اگر سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں کی جگہ نہ ہو تو یقیناً وہاں تک دشمن آ جائے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن حرام کا قول ہے کہ أَوِ ادْفَعُوْا یہ جنگ کی طرف دعوت ہے اور دعوت حمیت کے لئے ہے کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے کی دعوت دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہوگا۔

پس جب آپ نے دیکھا کہ وہ اس پر نہیں آ رہے تو آپ نے ان پر ایک ایسی وجہ پیش کی جو انہیں غضب دلائے

1۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 538-539　2۔ معالم التنزیل، جلد، صفحہ 576　3۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں اللہ کی راہ میں مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور) رزق دیے جاتے ہیں۔ شاداں ہیں ان (نعمتوں) سے جو عطا فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ جو کچھ احد کے دن ہوا وہ امتحان تھا جو منافقین وصادقین (سچ بولنے والے) کے درمیان امتیاز اور فرق کرتا ہے تو پھر اس نے یہ بیان فرمایا کہ جو قتل ہوئے وہ شکست خوردہ نہیں ہوئے اور شہید کر دیئے گئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ معزز اور زندہ ہیں۔ اور یہ آیت شہداء احد کے بارے میں ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے نازل ہوئی ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام شہداء کے بارے میں عام ہے۔ اور مصنف ابی داؤد میں اسناد صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "جب میدان احد میں تمہارے بھائی شہید کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں رکھ دیا جو جنت کی نہروں پر آتے ہیں ان کے پھلوں میں سے کھاتے ہیں اور سونے کی ان قندیلوں میں رہتے ہیں جو عرش کے سائے میں معلق ہیں تو جب انہوں نے اپنا کھانا، پینا اور آرام کی جگہ کو اچھا پایا تو انہوں نے کہا: کون ہماری جانب سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور ہمیں رزق دیئے جا رہے ہیں تاکہ وہ جہاد سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور نہ وہ جنگ کے وقت بزدلی دکھائیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری جانب سے انہیں یہ پیغام پہنچا دوں گا۔" آپ نے فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا (2)۔۔۔ الی آخر الآیات۔

اور بقی بن مخلد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ملے اور فرمایا: "اے جابر! کیا بات ہے کہ میں تجھے پریشان حال اور غمزدہ دیکھ رہا ہوں؟" میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میرے والد محترم شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے پیچھے اہل وعیال بھی چھوڑے ہیں اور ان پر قرض بھی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تجھے اس (حالت) کے بارے بشارت نہ دوں جس میں اللہ عزوجل نے تیرے باپ سے ملاقات کی ہے؟" میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ احیا اباک وکلمہ کفاحا وما کلم احدا قط الا من

1۔ [illegible] جلد 1-2 صفحہ 399۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3781، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 341۔ ایضاً ابی داؤد، حدیث نمبر 2158، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارواح زندہ ہیں جیسا کہ تمام مومنین کی ارواح اور انہیں قتل کے وقت سے جنت میں رزق دیئے جانے کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہاں تک کہ گویا ان کے لئے دنیوی حیات دائمی ہو گئی۔

تحقیق علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے اور وہ معنی جس پر عظیم علماء ہیں وہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ کہ شہداء کی حیات محقق اور ثابت شدہ ہے پھر ان میں سے بعض کہتے ہیں: ارواح جنت کی طرف ان کی قبروں میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہ نعمتوں سے شاد کام ہوتے ہیں، جیسا کہ کفار کو ان کی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور انہیں عذاب دیا جاتا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: انہیں جنت کے پھلوں سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی وہ اس کی مہک پاتے ہیں حالانکہ وہ اس میں نہیں ہوتے (1)۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ مجاز ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جنت میں راحت و سکون اور نعمتوں کے مستحق ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ما مات فلان (فلاں نہیں مرا) یعنی زندہ اسے یاد کرتا رہا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:

موت التقی حیاۃ لا انقطاع لہا قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

متقی کی موت ایسی حیات ہے جس کے لئے فنا نہیں تحقیق قوم مر چکی ہے حالانکہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

پس معنی یہ ہے کہ انہیں اچھی تعریف کے ساتھ نوازا جاتا ہے اور وہ مردوں سے نہا ہے: ان کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں اور اجسام آسودہ اور عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ اقوال میں سے یہی صحیح ہے۔ کیونکہ دلیل نقلی کے مطابق جو صحیح ہے وہی واقع ہونے والا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اختلاف کو ختم کر رہی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور ہم نے اس بارے میں واضح اور تفصیلی ذکر کتاب التذکرۃ باحوال الموتی والامور الآخرۃ میں کیا ہے۔ والحمد للہ۔

تحقیق ہم نے وہاں ذکر کیا ہے کہ شہداء کتنے ہیں اور یہ کہ ان کا حال مختلف ہے اور رہے وہ جنہوں نے شہداء کے بارے میں یہ تاویل کی ہے کہ وہ زندہ ہیں اس معنی میں کہ وہ عنقریب زندہ کئے جائیں گے تو یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے اور قرآن و سنت اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بَلْ اَحْيَآءٌ ان کی حیات پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور رزق نہیں دیا جاتا مگر زندہ کو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے لئے ہر سال میں غزوہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ ہر جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے جو بھی ان کے بعد یوم قیامت تک ہوگا کیونکہ وہ حکم جہاد پر عمل پیرا ہوئے (اور یہ سنت قائم کی) اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا (المائدہ: 32) (اسی وجہ سے (قسم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو...) اس کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ارواح یوم قیامت تک عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی رہیں گی ان زندہ مومنین کی ارواح کی طرح جو باوضو کی حالت پر رات گزارتے ہیں۔

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 2-400، دار الکتب العلمیہ بیروت

اور یہ قول بھی ہے کیونکہ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے زمین کھا سکتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر بھی التذکرہ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ زمین انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، نیکوکار اور مخلص موذن اور حفاظ قرآن کو نہیں کھا سکتی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب شہید حکماً زندہ ہے تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ وہ زندہ جس میں قوت حس موجود ہو (اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی۔ علماء نے شہداء کے غسل اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت امام مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور ثوری رحمہم اللہ نے یہ کہا ہے کہ تمام شہداء کو غسل دیا جائے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے سوائے اس کے جو خاص دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے میدان جنگ میں قتل ہو جائے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم انہیں ان کے خون سمیت دفن کر دو۔“ مراد احد کا دن ہے۔ اور آپ نے انہیں غسل بھی نہ دلایا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

ابو داؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ ان سے ہتھیار اور زرہیں اتار لی جائیں اور انہیں خون اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے(2) اور اسی کے مطابق امام احمد، اسحاق، اوزاعی، داؤد بن علی، فقہاء امصار کی جماعت، اہل حدیث اور ابن علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب اور حسن نے کہا ہے: انہیں غسل دیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ہے: شہداء احد کو ان کی کثرت کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا اور (اسی زیادتی نے) اس سے مشغول رکھا۔ ابو عمر نے کہا ہے: حضرت سعید اور حسن کے اس قول کے مطابق عبید اللہ بن حسن عنبری کے سوا فقہاء امصار میں سے کسی نے بھی قول نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے شہداء احد کو غسل نہ دینے کی یہ علت ذکر کی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ولی اور وارث تھا جو اس کے ساتھ مشغول ہو کر اس کے معاملات کو سرانجام دے سکتا تھا۔ اس میں علت ... واللہ اعلم ... وہ ہے جس کا مفہوم اس حدیث میں ہے ”کہ وہ (خون) قیامت کے دن کستوری کی خوشبو کی طرح ہو گا(3)۔“ تو اس سے ظاہر ہوا کہ (غسل نہ دینے کی) علت شغل نہیں ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے جس نے اس بارے میں کہا اور نہ ہی اس مسئلہ کا قیاس اور نظر و فکر میں کوئی دخل ہے، بلکہ یہ تو خالصۃ اس اثر کی اتباع اور پیروی کا مسئلہ ہے جسے تمام نے شہداء احد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ بعض متاخرین نے جنہوں نے حسن کا مذہب اختیار کیا ہے انہوں نے شہداء احد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: انا شہید علی ھولاء یوم القیامۃ (میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا) فرمایا(4): یہ ان کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ان کے سوا کوئی اور شریک نہ ہو گا۔ ابو عمر نے کہا ہے: یہ شذوذ سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کے غسل کو ترک کرنے کے بارے قول زیادہ اولی ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1503، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 393۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2593، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، باب الصلاۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ وہ شہداء احد اور ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کو اس کے سینہ یا اس کے حلق میں تیر مارا گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ جیسے تھا اسی طرح اسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ فرمایا: اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔(1)

مسئلہ نمبر 3۔ رہی شہداء پر نماز جنازہ! تو اس کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک، لیث، امام شافعی، امام احمد اور داؤد رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر آپ فرماتے: "ان میں سے قرآن کریم زیادہ جمع کرنے والا کون ہے؟" پس جب آپ ﷺ کے لیے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے رکھتے اور آپ نے فرمایا: میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا۔"

اور آپ نے انہیں ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور انہیں غسل نہ دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی(2)۔ اور کوفہ، بصرہ اور شام کے فقہاء نے کہا ہے: ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور انہوں نے بہت سے آثار روایت کئے ہیں ان میں سے اکثر روایات مرسل ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔(3)

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ شہید کو جب زندہ اٹھا لیا جائے اور وہ میدان جنگ میں نہ مرے اور کچھ دیر زندہ رہے اور کچھ کھائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے جسے ظلماً قتل کیا گیا جیسا کہ وہ جسے خارجیوں اور ڈاکوؤں وغیرہ نے قتل کر دیا ہو، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمہما اللہ نے کہا ہے: ہر وہ جسے ظلماً قتل کیا گیا اسے غسل نہ دیا جائے لیکن اس پر اور ہر شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور یہی قول تمام اہل عراق کا ہے۔ اور انہوں نے بہت سے صحیح طرق سے زید بن صوحان سے روایت کیا ہے اور یہ جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ تم مجھ سے کپڑے نہ اتارنا اور نہ ہی مجھ سے خون کو دھونا۔ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زید بن صوحان کے قول کی مثل ہی کہا ہے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید کئے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل نہیں دیا۔ اور امام شافعی کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے (شہید کو) دیگر تمام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا سوائے اس کے جسے اہل حرب نے قتل کیا ہو اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: اسے غسل نہیں دیا جائے گا جسے کفار نے قتل کیا اور وہ میدان جنگ میں ہی فوت ہو گیا۔ اور ہر وہ مقتول جو میدان جنگ میں قتل نہ کیا گیا ہو   لیکن اسے کفار نے قتل کیا ہو   تو اسے غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 81۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 92۔ صحیح بخاری، باب الصلاۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1267، ایضاً
3۔ صحیح بخاری، باب الصلاۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہوگی۔ پس انہیں ایسی آواز کے ساتھ ندا دی جائے گی جسے ہر قریب و بعید والا سنے گا: میں بادشاہ ہوں، میں حاکم (اور) حساب لینے والا ہوں اہل جنت میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل نار میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو اور اہل نار میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جہنم میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل جنت میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو حتی کہ ایک تھپڑ ہی ہو۔ راوی نے کہا ہم نے عرض کی: کیسے ممکن ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون۔

آپ نے فرمایا: "نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ (1)"۔ اسے حارث بن ابی اسامہ نے نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟" انہوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ہی ساز و سامان۔ تو آپ نے فرمایا: "بلاشبہ میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ (نیک اعمال) ساتھ لے کر آئے گا اور پھر ایک (آدمی) آئے گا (اور کہے گا) اس نے گالیاں دی ہیں (دوسرا آئے گا اور کہے گا) اس نے تہمت لگائی ہے (ایک اور آئے گا اور کہے گا) اس نے اس کا مال کھایا ہے، (ایک اور آکر کہے گا) اس نے اس کا خون بہایا ہے۔ (ایک اور آکر کہے گا) اس نے اسے مارا ہے۔ پس اسے اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر اس کی نیکیاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے وہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہو گئیں تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2)"۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر اسے زندہ کیا جائے، پھر اسے قتل کیا جائے، پھر اسے زندہ کیا جائے پھر اسے قتل کیا جائے درآنحالیکہ اس پر قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔ (3)" اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بندہ مومن کا نفس اس کے ساتھ معلق ہے جو اس پر قرض ہے۔ (4)" اور احمد بن زہیر نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ اور اگر کہا جائے یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بعض شہداء قتل کے وقت سے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ان کی ارواح پرندے کے پیٹ میں ہوں گی جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے اور نہ ہی وہ اپنی قبروں میں ہوں گے تو پھر وہ کہاں ہوں گے؟ تو ہم نے کہا: حضور نبی کریم ﷺ سے یہ حدیث موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے ساتھ ایک نہر پر ہوں گی اسے بارق کہا جاتا ہے۔ ان پر ان کا رزق صبح و شام جنت سے نکالا جاتا ہے (5)"۔

1۔ [illegible]، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 475، حدیث نمبر 3638

2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 320

3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 53

4۔ [illegible]، جلد 4، صفحہ 401، حدیث نمبر 5543

5۔ مسند امام احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ بن عباس، جلد 1، صفحہ 266

فرحت و انبساط میں چلتی ہیں تو وہ ان چیزوں کا ادراک رکھتی ہیں جو ارواح کے لائق اور مناسب ہوتی ہیں، ان میں سے جن میں نفع اٹھایا جا سکتا ہے اور ان کے سبب زندہ اور باشعور رہا جا سکتا ہے۔ اور رہیں لذات جسمانیہ تو ان ارواح کو جب ان کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ ان تمام نعمتوں سے پوری ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں۔ اور یہ اچھا قول ہے، اگرچہ اس میں مجاز کی نوع بھی ہے، اور یہ اس کے موافق ہے جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے۔ واللہ الموفق الاالٰہ اور فَرِحِيْنَ، يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور کلام میں اَحْيَآءٌ کی صفت ہونے کی بنا پر "فرحون" بھی جائز ہے اور یہ فرح بمعنی سرور سے ماخوذ ہے۔ اور اس آیت میں فضل سے مراد وہی مذکورہ نعمتیں ہیں۔ اور ابن السمیقع نے فارحین کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ الفرہ اور الفارہ، الحذر اور الحاذر، الطمع اور الطامع اور البخل اور الباخل۔ نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں اس کا رفع پڑھنا جائز ہے، کیونکہ یہ احیاء کی صفت ہو سکتی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس کا معنی ہے جو فضل میں ان سے نہیں آ ملے، اگرچہ ان کے لئے فضل (اور مرتبہ) ہے۔ اور (يَسْتَبْشِرُوْنَ) کی اصل البشرۃ سے ہے، کیونکہ انسان جب فرحت و انبساط میں ہوتا ہے تو خوشی اور سرور کا اثر اس کے چہرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: شہید کے پاس ایک کتاب لائی جاتی ہے جس میں اس کے بھائیوں میں سے اس کے پاس آنے والوں کا ذکر ہوتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے جیسے کہ اہل غائب دنیا میں اس کے آنے کے ساتھ خوش ہوتا ہے(1)۔

اور حضرت قتادہ، ابن جریج اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے: ان کا خوش ہونا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے وہ بھائی جنہیں ہم نے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑا وہ اپنے نبی کی معیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں پس وہ بھی ہماری طرح کی عزت و کرامت پا رہے ہیں، پس وہ اسی کے سبب مسرور اور خوش ہو رہے ہیں(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ لوگ ابھی پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کے لئے خوشی کے اظہار سے اشارہ تمام مومنین کی طرف ہے اگرچہ وہ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب کو دیکھتے ہیں تو انہیں یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ دین اسلام ہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر و ثواب عطا فرمائے گا، پس وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان پر خوش ہوتے ہیں جو اس نے انہیں عطا فرمایا ہے اور وہ مومنین کے لئے بھی خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس معنی کو زجاج اور ابن فورک نے اختیار کیا ہے(3)۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

"خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا۔"

یعنی وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت (کے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 219
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 541، دار الکتب العلمیہ
3۔ ایضاً

ان میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر بن عوام بھی تھے جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے (1)، یہاں تک کہ آپ حمراء الاسد پہنچ گئے، دشمن کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے۔ ان میں ایسا بھی تھا جو زخم لگنے کے سبب شدید تکلیف میں تھا وہ چلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اور وہ کوئی سواری بھی نہ پاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور یہ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی اور جہاد کی رغبت میں تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی عبدالاشہل کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دونوں زخم لگنے کے سبب انتہائی کمزور اور نحیف تھے، ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی پر ٹیک اور سہارا لگا کر چلتا تھا اور یہ دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، پس جب حمراء الاسد پہنچے تو نعیم بن مسعود ان سے ملا اور اس نے انہیں یہ خبر دی کہ ابوسفیان ابن حرب اور جو قریش کے افراد اس کے ساتھ ہیں وہ لشکر جرار کی صورت میں اکٹھے ہیں اور انہوں نے اپنی رائے کو اس پر پختہ کر لیا ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ کر آئیں اور وہاں کے باسیوں کو ہلاک و برباد کر دیں تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے بارے خبر نہیں دی ہے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ۔ اور اسی اثنا میں کہ قریش اس رائے پر متفق ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے پاس معبد الخزاعی آ گیا اور قبیلہ خزاعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف اور آپ کی نصیحتوں کا راز دان تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا حال اور جس کیفیت پر وہ تھے اسے دیکھ چکا تھا اور جب اس نے قریش کے واپس پلٹنے کے عزم کو دیکھا تاکہ وہ اہل مدینہ کو تباہ و برباد کر دیں تو اسے اس کا خوف لاحق ہو گیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کے اصحاب کے لئے جس کے اخلاص نیت نے اسے اس سے برانگیختہ کیا کہ وہ قریش کو ڈرائے چنانچہ اس نے انہیں کہا: میں نے ابھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حمراء الاسد کے مقام پر بہت بڑے لشکر کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو کوئی ان سے پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ مل چکا ہے اور وہ تم پر (غصہ سے) جلے ہوئے ہیں پس تم بچ جاؤ بچ جاؤ، ایسا بھی مجھے اس سے روک رہا ہوں، قسم بخدا جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے اس پر ابھارا ہے کہ میں ان کے بارے کچھ اشعار لکھوں۔

پس (ابوسفیان) نے پوچھا: تو نے کیا کہا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تُهَدُّ مِنَ الْأَصْوَاتِ رَاحِلَتِي … إِذْ سَالَتِ الْأَرْضُ بِالْجُرْدِ الْأَبَابِيلِ

قریب تھا کہ میری سواری کا جانور لشکر ان کے شور و غل کی بلند آوازوں کی وجہ سے گر پڑتا جب زمین پر جوق در جوق کم مو گھوڑوں کا سیلاب آ گیا۔

تَرْدِي بِأُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ … عِنْدَ اللِّقَاءِ وَلَا مِيلٍ مَعَازِيلِ

جو ایسے عالی شان شیروں کو اٹھائے دوڑ رہے تھے جو مقابلہ کے وقت نہ سست اور بزدل ہوں گے اور نہ ہتھیاروں سے خالی ہوں گے۔

فَظَلْتُ عَدْوًا أَظُنُّ الْأَرْضَ مَائِلَةً … لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيسٍ غَيْرِ مَخْذُولِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب مغازی، جلد 2، صفحہ 584۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جب وہ گھوڑے ایک ایسے سردار کے ساتھ بلند ہوئے جو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا گیا تھا۔

تو میں تیز دوڑنے لگا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جھکی ہوئی ہے۔

فَقُلْتُ وَيْلُ ابْنِ حَرْبٍ مِنْ لِقَائِكُمْ　　إِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بِالْخَيْلِ

میں نے کہا تمہاری ملاقات سے ابوسفیان بن حرب کے لئے ہلاکت ہے جب وادی بطحا گھوڑوں سے تھرتھرا اٹھے گی۔

إِنِّي نَذِيرٌ لِأَهْلِ السَّيْلِ ضَاحِيَةً　　لِكُلِّ ذِي إِرْبَةٍ مِنْهُمْ وَ مَعْقُولِ

بے شک میں سورج کی دھوپ میں چمکنے والی سرزمین کے رہنے والوں (یعنی قریش مکہ) میں سے ہر صاحب عقل و دانش کو ڈرانے والا ہوں۔

مِنْ جَيْشِ أَحْمَدَ لَا وَحْشٍ قَنَابِلُهُ　　وَلَيْسَ يُوصَفُ مَا أَنْذَرْتُ بِالْقِيلِ (1)

(سیدنا) احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لشکر سے جو سست اور کوتاہ قد نہیں ہیں اور جس بات سے میں نے ڈرایا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پس اس طرح اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور وہ ڈرتے ہوئے تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس حال میں مدینہ منورہ کی طرف لوٹے کہ آپ کی مدد و نصرت فرمائی گئی تھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ تو اس میں سوء سے مراد قتال اور رعب ہے (آل عمران: 174) ("ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ" واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی معیت میں نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرما دی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس واپس پلٹنے کے ساتھ انہیں اجر عظیم حاصل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ یہ غزوہ ہے۔"

یہی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور حضرت مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہما کا قول شاذ ہے ان دونوں نے کہا ہے: بے شک یہ آیت اس قول میں سے ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ۔۔۔ تا قولہ ۔۔۔ عَظِيْمٌ ۞ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر صغریٰ کی جانب خروج کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ابوسفیان کے اس وعدہ کے مطابق جو اس نے میدان احد میں کیا تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: آنے والے سال ہمارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم جواب کہو: ہاں (ہمیں منظور ہے۔)" پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت بڑی منڈی لگی ہوئی تھی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دراہم عطا فرمائے۔" اور آپ بدر کے قریب جا پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نعیم بن مسعود اشجعی آیا اور اس نے آپ کو خبر دی کہ قریش جمع ہو چکے ہیں اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 224

میں تصدیق اور یقین، باہمی مدد و نصرت پر پختہ وثوق اور قوت وجرأت اور استعداد کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہو گیا۔ پس ان معنی کی بنا پر ایمان میں زیادتی سے مراد اعمال میں زیادتی ہے۔ علماء کا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں اور اس بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان جو کہ ایک تاج ہے اور کسی بھی شے کی ایک تصدیق ہے بلاشبہ یہ منفرد معنی ہے جب یہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی زیادتی اور اضافہ داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں سے کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جب یہ زائل ہو جائے۔ پس کچھ باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ زیادتی اور کمی ایمان کے متعلقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی ذات میں۔ پس علماء کی ایک جماعت نے یہ موقف اپنایا ہے کہ ایمان ان اعمال کے اعتبار سے زیادہ و کم ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں، بالخصوص بہت سے علماء اسم ایمان کا اطلاق طاعات پر کرتے ہیں اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں ان میں سے اعلیٰ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے اور ان میں سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے(1)'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے: ''اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے(2)''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ایمان دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا قول لُمْظَةٌ اس کے بارے اصمعی نے کہا ہے: نقطہ اور اس کی طرح کی سفیدی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے: فرس المظ جب گھوڑے کے ہونٹ میں سفیدی ہو اور محدثین کہتے ہیں لَمْظَة ظا کے ساتھ۔ البتہ کلام عرب میں یہ ضمہ کے ساتھ ہے، مثلاً شبهة، دهمة اور خمرة۔ اور اس میں ان کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ نہیں رہے وہ کہتے ہیں جب بھی ایمان بڑھتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفاق دل میں ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب بھی نفاق بڑھتا ہے تو دل سیاہ ہوتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان عرض ہے اور یہ دو زمانوں میں ثابت نہیں رہتا اور یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صلحاء کے لئے یکے بعد دیگرے قائم رہتا ہے، پس مومن کے دل میں اس کی امثال کے لگاتار اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے اعتبار سے اور بالدوام اس کے موجود رہنے کے اعتبار سے یہ بڑھتا ہے۔ اور مومن کے دل پر لگاتار اور مسلسل غفلتیں پڑنے کے سبب یہ کم ہو جاتا ہے۔ اس کی طرف ابو المعالی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یہ معنی حدیث شفاعت میں موجود ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جسے مسلم نے نقل کیا ہے(3)۔ اس میں ہے: ''پس مومنین عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے بھائی روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا جنہیں تم پہچانتے ہو نکال لاؤ پس ان کی صورتیں آتش جہنم پر حرام کر دی جائیں گی اور مخلوق کثیر نکال لی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً جامع ترمذی، حدیث 2539، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47
3۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گی اور آگ نے لیا ہے آدھی پنڈلی اور اس کے گھٹنے تک پکڑے ہوئے ہوں گے پھر وہ کہیں گے اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو رب کریم فرمائے گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں تم ایک دینار برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی اس میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ہے پھر رب کریم فرمائے گا تم لوٹ کر جاؤ اور تم جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر و نیکی پاؤ تو اسے نکال لو چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے وہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا پھر رب کریم فرمائے گا تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم ذرہ برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ(1)۔ اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس حدیث میں ایمان سے مراد دلوں کے اعمال ہیں مثلاً نیت، اخلاص، خوف اور نصیحت اور ان کے مشابہ اعمال۔ اور ان کا نام ایمان رکھا ہے کیونکہ یہ محل ایمان میں ہیں یا ایمان سے مراد عادت عرب کے مطابق تسمیۃ الشئ باسم الشئ ہے جبکہ یہ اس کے مشابہ اور مجاور ہو یا اس کے سبب ہو۔ اس کی دلیل شفاعت کرنے والوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو نکالنے کے بعد کہا جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی ہوگی: لم نذر فیہا خیرا (ہم نے اس میں کوئی خیر نہیں چھوڑی) باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان میں سے بہت کثیر کو نکالے گا جو لا إلٰہ إلا اللہ کہتے تھے اور وہ قطعاً یقیناً مومن تھے اور اگر وہ مومن نہ ہوتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں نہ نکالتا۔

پھر اگر وہ وجود اول معدوم ہو جائے جس پر اس کی مثل مرتب ہوتا ہے تو یہ نہ زیادتی ہے اور نہ نقصان۔ اور اس کا اندازہ حرکت میں لگایا گیا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علم مفرد پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا اس کی معلومات پیدا کیں تو اس کا علم زیادہ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ امثال کو معدوم کر دے تو وہ کم ہو گیا یعنی زیادتی زائل ہو گئی اور اسی طرح جب اس نے حرکت کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کو پیدا کیا۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ایمان کی زیادتی اور کمی دلائل کے اعتبار سے ہے پس ایک کے پاس دلائل زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایمان میں زیادتی ہے اور اسی کے معنی کے مطابق کی اقوال میں ہے انبیاء علیہم السلام کو دوسری مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ اسے وجوہ کثیرہ سے جانتے ہیں اور وہ ان وجوہ سے کہیں زیادہ ہیں جن کے سبب مخلوق اسے جانتی ہے اور یہ قول آیت کے مقتضی سے خارج ہے۔ کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں زیادتی ادلہ کے اعتبار سے ہو۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ایمان میں زیادتی حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فرائض و اخبار کے نازل ہونے کے اعتبار سے ہے اور گزر رہے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جہالت کے بعد ان کی معرفت کے اعتبار سے ہے اور یہ بھی ایمان کی زیادتی ہے پس اس بارے میں یہ قول کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے یہ قول مجازی ہے اور اس تعریف پر اس میں کمی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103

بلکہ معلوم کی طرف اضافت کے اعتبار سے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ یعنی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور حسب یہ احساب سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کفایت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فتملأ بیتنا اقطا و سمنا و حسبک من غنی شبع و ری

اس میں حسبک کا معنی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت کہا جب انہیں لوگوں نے کہا: بے شک کافر تمہارے لئے بہت سے لوگوں کو (لشکر جرار کو) جمع کئے ہوئے ہیں (1)۔ واللہ اعلم۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

"(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) لوٹ آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔"

ہمارے علماء نے کہا ہے: جب انہوں نے اپنے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اپنے دلوں سے اس پر اعتماد کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار طرح کی جزا عطا فرمائی: (یعنی) نعمت، فضل، برائی کو ان سے پھیر دینا اور رضا کی پیروی کرنا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا عطا فرمائی اور وہ ان سے راضی ہو گیا۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

"یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے سو نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یخوفکم اولیاءہ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنے دوستوں سے (2)، پس حرف جر (باء یا من) حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو اسم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسے (اسم کو) نصب دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا، ای لینذرکم بباس شدید (تا کہ وہ تمہیں ڈرائے شدید قوت کے ساتھ) یعنی وہ مومن کو کافر سے ڈراتا ہے۔ اور حسن اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے تا کہ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے بیٹھ جائیں (3) اور رہے اللہ تعالیٰ کے دوست تو وہ اس سے نہیں ڈرتے جب وہ انہیں ڈرائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ جو تمہیں کفار کے اجتماع سے ڈرا رہا ہے وہ انسانی

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر، جلد 2، صفحہ 655 2۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 403 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 404

شیطانوں میں سے ایک شیطان ہے یہ وہ ہے جو نعیم بن مسعود یا کوئی اور ہے اس اختلاف کی بنا پر جو پہلے گزر چکا ہے۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ یعنی تم ان کافروں سے نہ ڈرو جن کا ذکر اس قول میں آیا ہے: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ یا (ھ ضمیر) اولیاء کی طرف لوٹ رہی ہے اگر تو کہے کہ معنی یہ ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈراتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ خَافُوْنِ یعنی میرا حکم چھوڑنے میں تم مجھ سے ڈرو اگر تم میرے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو اور کلام عرب میں خوف سے مراد گھبراہٹ ہے۔ اور خاوفنی فلان فخفتہ (ڈرانے میں فلاں نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں اس پر ڈرانے میں غالب آ گیا) یعنی میں اس کی نسبت زیادہ ڈرانے والا ہوں۔ اور مخوف ایسا جنگل جس میں پانی نہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے: ناقۃ مخیفۃ یعنی ایسی اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو جائے اور الخافۃ سے مراد چمڑے کا وہ تھیلا ہے جس میں شہد حاصل کیا جاتا ہے۔ (یا چمڑے کا وہ لباس جو شہد اتارتے وقت پہنا جاتا ہے)

حضرت سہل بن عبد اللہ نے بیان کیا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس ایک صدیق تشریف لائے اور پوچھا: خوف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: تو امن سے نہ رہے یہاں تک کہ تو امن والی جگہ پہنچ جائے۔ حضرت سہل نے کہا ہے: حضرت ربیع بن خثیم جب لوہاروں کی بھٹی کے پاس سے گزرتے تو ان کو بے ہوش کر دیا جاتا تھا تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس بارے بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: جب ان پر یہ کیفیت طاری ہو تو مجھے آگاہ کرنا۔ وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے آپ کو بتلا دیا چنانچہ آپ وہاں آئے اور اپنا ہاتھ ان کی قمیص میں داخل کیا تو آپ نے ان کی (رگوں کی) حرکت کو بڑا تیز اور شدید پایا تو فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ تمہارے اہل زمانہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ وہ اس سے ڈرے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا یا تو دنیا میں یا آخرت میں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو روتا ہے اور اپنی آنکھیں پونچھتا ہے بلکہ ڈرنے والا وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس کے بارے وہ خوف رکھتا ہو کہ اس سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا ہے کہ وہ اس سے ڈریں چنانچہ ارشاد فرمایا: وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور فرمایا: وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (البقرہ) (اور صرف مجھی سے ڈرا کرو) اور مومنین کی خوف کے سبب مدح کرتے ہوئے فرمایا: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (النحل: 50) (ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے) اور ارباب اشارات کی خوف کے بارے میں کئی عبارات ہیں جن کا مرجع وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

استاذ ابو علی الدقاق نے کہا ہے: میں ابو بکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کرنے کے لئے گیا پس جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو میں نے ان سے کہا: یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت اور شفا عطا فرمائے گا تو انہوں نے مجھے کہا: کیا تو یہ گمان کر رہا ہے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں؟ بلاشبہ میں تو موت کے بعد والی کیفیت سے ڈر رہا ہوں۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے اور میں وہ سن رہا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چرچراتا ہے اور اس کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ وہ چرچرائے اس میں چار انگلیاں رکھنے کے برابر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہوئے اپنی

پیشانی رگڑے ہوئے ہیں قسم بخدا! اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت تھوڑا ہنسو اور تم بہت زیادہ رو۔ اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو اور یقیناً تم دشوار گزار گھاٹیوں کی جانب نکل جاؤ جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کرتے ہوئے دعا کرو قسم بخدا! میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ہے(1)۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن غریب (یہ حدیث حسن غریب ہے) اور اس سند کے علاوہ اور سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: لَوَدِدْتُ اَنِّی کُنْتُ شَجَرَۃً تُعْضَدُ،(2) واللہ اعلم۔

وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

''اور (اے جانِ عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوتے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے کوئی حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ یہ ایک قوم تھی جو اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے مشرکین کے خوف سے تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ اور کلبی نے کہا ہے: اس سے مراد منافقین اور یہود کے سردار ہیں، انہوں نے کتاب میں موجود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپا لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جب اہل کتاب ایمان نہ لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شاق گزرا، کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے اور یہ کہتے: بلاشبہ یہ اہل کتاب ہیں، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہوتا تو یقیناً یہ آپ کی اتباع اور پیروی کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا یَحْزُنْكَ حضرت نافع کی قرأت میں یاء مضموم اور زاء مکسور ہے، جہاں بھی واقع ہو سوائے (سورۃ) انبیاء کے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ۔ کیونکہ اس میں یاء مفتوح اور زاء مضموم ہے(3)۔ اور ابو جعفر نے اس کا برعکس کیا ہے۔ ابن محیصن نے تمام جگہوں پر یاء کو ضمہ کے ساتھ اور زاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے یاء کو فتحہ اور زاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حَزَنَنِی الْاَمْرُ یَحْزُنُنِی اور اَحْزَنَنِی بھی ہے اور یہ قلیل لغت ہے اور دونوں میں سے پہلی افصح ہے، نحاس نے یہی کہا ہے۔

اور شاعر نے احزن کے بارے کہا ہے:

مَضٰی صَحْبِی وَاَحْزَنَنِی الدِّیَارُ

(میرے ساتھی چلے گئے اور گھروں نے مجھے غمزدہ کر دیا)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 319۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 404

اور عام قرأت یُسَارِعُوْنَ ہے اور طلحہ نے یُسْرِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ پڑھا ہے۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں (1)۔ اور ان کے سوا نے کہا ہے: وہ منافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ تمام کفار کے لئے عام ہے۔ اور ان کا تیزی کے ساتھ کفر میں جانا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرہ کرتا ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے کفر پر بہت زیادہ غمزدہ ہوتے تھے، تبھی آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (فاطر: 8) (پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے) اور فرمایا: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (الکہف) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔)

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی سلطنت اور اقتدار میں سے کسی شے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی ان کے کفر کے سبب کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان روایات میں نقل کی ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم اپنی ذات پر حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام گمراہ ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے ہدایت دی پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت عطا فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا پس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا (یعنی رزق عطا فرماؤں گا) اے میرے بندو! تم تمام کے تمام ننگے ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے لباس پہنایا پس تم مجھ سے لباس کا مطالبہ کیا کرو تاکہ میں تمہیں لباس پہناؤں۔

اے میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن گناہ اور خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! بلاشبہ تم میرے نقصان تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم میرے نفع تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول، تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن تمام تم میں سے ایک انتہائی متقی دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو اس طرح وہ میرے ملک میں کسی شے کا کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن سارے کے سارے ایک فاجر ترین دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو وہ میرے ملک اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی اور نقصان نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک ہی سرزمین میں کھڑے ہو جائیں اور وہ مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب اور حاجت کے مطابق عطا کروں تو جو کچھ

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 405

یہ ویسے ہی کمی نہیں کی جاتی جیسے سوئی کمی کرتی ہے جب اسے سمندر میں داخل کیا جائے۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہی ہیں انہیں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔ پس جو کوئی خیر اور بھلائی پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے (1)۔ اسے مسلم نے اپنی صحیح میں اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور یہ عظیم حدیث ہے اس کی طوالت ہے تمام کی تمام لکھی جاتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لن یضروا اللہ شیئا کا معنی ہے یعنی وہ اولیاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب وہ ان کی مدد ترک کر دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر اور مددگار ہے (2)۔

قولہ تعالیٰ: یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ حظ کا معنی حصہ ہے اور الحظ کا معنی النصیب والجد (حصہ) ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان حظ من فلان، وھو محظوظ۔ فلاں فلاں کی نسبت حصہ کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اسے حصہ دیا گیا ہے اور حظ کی جمع خلاف قیاس حظوظ آتی ہے۔ ابو زید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے: رجل حظیظ اور جدید جب وہ رزق میں حصہ دار ہو۔ اور حظظت فی الامر احظ۔ تبھی کے کام میں خوب حصہ لینا۔ بسا اوقات حظ کی جمع احظا بھی آتی ہے۔ (معنی یہ ہے) اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھے گا۔ اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْــًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

"بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْــًٔا سے تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ایمان کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنا ... کے عوض اسے خرید لیا برائی کی بڑی تدبیر میں سے ہے (اور اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) یعنی اسے اس کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ کسی اس کی تدبیر کا کوئی خوف ہے۔ اور شیئا دونوں آیتوں میں مصدر کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا: لن یضروا اللہ ضررا قلیلا ولا کثیرا (وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز تھوڑا یا زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ باء کو حذف کرنے کی تقدیر پر منصوب ہو۔ گویا کہ فرمایا: لن یضروا اللہ بشیء۔

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 319۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب صفۃ القیامۃ، حدیث 2418، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 405

لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝

"اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل وخوار کرنے والا"۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ املاء سے مراد عمر کا طویل ہونا اور زندگی کا کشادہ اور خوشحال ہونا ہے اور معنی یہ ہے: وہ لوگ خیال نہ کریں جو مسلمانوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اور بلاشبہ وہ انہیں طویل عمریں عطا کر رہا ہے تا کہ وہ معاصی اور گناہ کے اعمال کریں، اس لئے نہیں کہ وہ ان کے لئے باعث خیر و نفع ہے اور کہا جاتا ہے: اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ سے مراد وہ فتح اور کامیابی ہے جو انہوں نے غزوہ احد میں حاصل کی وہ ان کے نفسوں کے لئے باعث خیر و نفع نہیں، بلکہ وہ اس لئے ہے تا کہ وہ سزا پائیں اور اضافہ کر لیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوئی نیکوکار و بدکار نہیں ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے، کیونکہ اگر وہ نیکوکار ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔

اور اگر وہ فاجر ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا (1) (ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ اور زیادہ کر لیں)۔ ابن عامر اور حمزہ نے لا یحسبن یا کے ساتھ اور سین کے نصب کے ساتھ قراءت کی ہے (2) اور حمزہ نے تا کے ساتھ اور سین کو منصوب پڑھا ہے (3) (یعنی و لا تحسبن) اور باقیوں نے یا کے ساتھ اور سین کو مکسور پڑھا ہے۔ پس جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے تو ان کے مطابق الذین فاعل ہے۔ یعنی کافر یوں نہ گمان کریں، اور انما نملی لھم خیر لانفسھم دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ما بمعنی الذی ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اور خیر ان کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مصدریہ ہو اور فعل مصدر ہو، اور تقدیر کلام اس طرح ہو: ولا یحسبن الذین کفروا ان املاءنا لھم خیر لانفسھم (اور کافر لوگ خیال نہ کریں کہ ہمارا انہیں مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں فاعل ضمیر خطاب ہے اور مخاطب حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور الذین کو تحسب کا مفعول اول ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور ان اور اس کا مابعد الذین سے بدل ہے اور یہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہو جائے گا جیسا کہ یہ بدل نہ ہونے کی صورت میں قائم مقام ہے۔ اور ان اور اس کا مابعد تحسب کا مفعول ثانی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس باب میں مفعول ثانی معنی میں اول ہوتا ہے کیونکہ حسب اور اس کے اخوات مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ پس تقدیر کلام ہوگی: ولا تحسبن الذین کفروا املاءنا خیر۔ یہ زجاج کا قول ہے اور ابوعلی کا قول ہے: اگر یہ صحیح ہوتا تو کہا جاتا: خیرا یعنی نصب کے ساتھ: کیونکہ ان: الذین کفروا سے بدل ہو جائے گا تو گویا یہ کہا: لا تحسبن املاء الذین کفروا خیرا (تم کافروں کی مہلت کو بہتر اور خیر خیال نہ کرو) تو اس میں قولہ خیرا تحسب کے لئے مفعول ثانی ہے۔ تب یہ جائز نہیں ہے کہ لا تحسبن تا کے ساتھ پڑھا جائے مگر اس صورت میں کہ انما میں ان کو کسرہ دیں اور خیرا کو نصب دیں (4) اور حمزہ سے یہ مروی نہیں ہے اور حمزہ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545

قراءت تا کے ساتھ ہے، نتیجتاً قراءت صحیح نہ ہوگی۔

اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: حمزہ کی قراءت تکریر کی بنا پر جائز ہے، اس کی تقدیر عبارت ہے ولا تحسبن الذین کفروا، ولا تحسبن انما نملی لہم خیرا لیکن اس میں ان دوسرے تحسب کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، اور ریا اور جس نے عمل کیا ہے (مراد ما عامل تحسب ہے) وہ پہلے تحسب کا مفعول ثانی ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زجاج نے بدل کے دعویٰ میں ذکر کیا ہے، اور قراءت صحیح ہے، جبکہ ابو علی کا مقصود زجاج کو غلط قرار دینا ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ یہاں حمزہ کی قراءت تا کے ساتھ ہے، اور ان کا قول: ولا یحسبن الذین یبخلون لحن (غلطی) ہے جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان کی اتباع ایک جماعت نے کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کوئی شے نہیں ہے جیسا کہ اس کا ذکر بھی بیان پہلے گزر چکا ہے اور قراءت کا صحیح ہونا اور اس کا ثابت ہونا بھی گزر چکا ہے اور یحییٰ بن وثاب نے اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ یعنی دونوں جگہ پر الف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کہا ہے: یحییٰ کی قراءت اچھی ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: حسبت عمرا ابوہ خالد (اس میں عمرا مفعول اول اور ابوہ خالد مفعول ثانی ہے۔) ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اخفش سے سنا ہے وہ ان کو مکسورہ ذکر کرتے ہیں اور اس سے قدریہ کے لئے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان میں سے تھے اور وہ تقدیم و تاخیر پر محمول کرتے ہیں ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لہم لیزدادوا اثما انما نملی لہم خیر لانفسہم۔

بیان کیا: میں نے جامع مسجد میں ایک مصحف میں دیکھا انہوں نے اس میں ایک حرف زائد کیا تھا تو وہ اس طرح ہو گیا تھا نملی لہم ایمانا۔ پس اس کی طرف یعقوب القاری نے دیکھا تو غلطی واضح ہو گئی چنانچہ انہوں نے اسے مٹا دیا۔ اور یہ آیت قدریہ مذہب کے بطلان میں نص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی عمروں کو طویل کرتا ہے تاکہ وہ معاصی کا عمل کر کے کفر میں اضافہ کریں، اور اس کی امثال تو دل پر مرتب ہوتی ہیں، جیسا کہ اس کی ضد جو کہ ایمان ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کوئی نیکوکار نہیں اور نہ ہی کوئی فاجر ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا اور یہ آیت پڑھی۔ وما عند اللہ خیر للابرار (1) اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

"نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کر

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 233

دے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔"

ابوالعالیہ نے کہا ہے: مومنین نے عرض کی کہ انہیں ایسی علامت اور نشانی عطا کی جائے جس کے ساتھ وہ مومن اور منافق کے درمیان فرق کر سکیں، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ الآیہ (1)۔ اس آیت کا مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، مقاتل، کلبی اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے: اس میں خطاب کفار اور منافقین کو ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو اس حال پر چھوڑے رکھے جس حال پر کفر، نفاق اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں سے تم اب ہو۔ کلبی نے کہا ہے: اہل مکہ میں سے قریش نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ آتش جہنم میں ہے، اور یہ کہ جب اس نے ہمارا دین چھوڑ دیا اور تمہارے دین کی اتباع و پیروی کر لی تو تم نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہے، پس اس کے بارے ہمیں بتلائیے یہ کہاں سے ہوا؟ اور اس کی بھی خبر دیجئے ہم میں سے کون تمہارے پاس آئے گا؟ اور کون تمہارے پاس نہیں آیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی کفر اور نفاق میں سے جس حال پر تم ہو۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (یہاں تک کہ وہ پلید کو پاک سے الگ الگ کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور قول باری تعالیٰ: لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں مومنین سے مراد وہ ہیں جو ابھی صلبوں اور رحموں میں ہیں ان میں سے جو ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہاری اس اولاد کو جن کے لئے ایمان کا حکم ہے اس حال پر چھوڑ دے جس حال پر شرک میں سے اب تم ہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے اور ان کے درمیان تفریق کر دے گا، اور اس بنا پر وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ نیا کلام ہوگا۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب مومنین کو ہے (3)، یعنی اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے اے گروہ مومنین! اس حال پر جس پر تم اب ہو کہ مومن اور منافق باہم مخلوط اور ملے جلے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے درمیان آزمائش اور (احکام کا) پابند بنا کر تفریق ڈال دے کہ تم پلید منافق اور پاک مومن کو پہچان لو۔ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو احد کے دن الگ الگ کر دیا۔ یہ قول اکثر اہل معانی کا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے) اے گروہ مومنین! یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ تمہارے لئے منافقین کو معین کر دے تاکہ تم انہیں پہچان لو، البتہ وہ انہیں تمہارے لئے احکام کا پابند بنا کر اور آزمائش میں ڈال کر ظاہر کر دے گا، اور پھر وہ احد کے دن ظاہر ہو گئے، کیونکہ منافقین پیچھے رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تکلیف اور اذیت پر خوشی کا اظہار کیا، یعنی تم اس سے پہلے اس غیب کو نہ جانتے تھے، پس اب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405 2۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 407 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 545، دار الکتب العلمیہ

اور آپ کے اصحاب کو اس پر آگاہ فرما دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ لِيُطْلِعَكُمْ کا معنی ہے یعنی اور اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے جو ان سے ہوگا۔ پس قول باری تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اس قول کے مطابق (ماقبل کلام سے) متصل ہے، اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر منقطع ہے اور وہ یہ کہ کفار نے جب کہا: ہماری طرف وحی کیوں نہیں کی گئی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یعنی اس پر جو نبوت کا مستحق ہوتا ہے کہ وحی تمہارے اختیار (اور پسند) کے مطابق ہو (1)۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ اجتبی اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے یعنی منتخب فرما لیتا ہے مِنْ رُّسُلِهٖ اپنے رسولوں میں سے اپنے غیب پر اطلاع دینے اور آگاہی کے لیے مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے: طلعت علی کذا اور اطلعت علیہ (میں اس پر آگاہ ہوا) اور اطلعت علیہ غیری (میں نے اس پر اپنے سوا دوسرے کو آگاہ کیا) پس یہ لازم اور متعدی (دونوں طرح استعمال ہوتا) ہے۔ اور حَتّٰى يُمَيِّزَ مُمَيِّزَ سے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے، اور یہی حمزہ کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے يَمِيْزَ تخفیف کے ساتھ ماز یمیز سے پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: مزت الشئی بعضہ من بعض امیزہ میزا اور میزتہ تمییزا (میں نے ایک شے کے بعض کو بعض سے الگ الگ کر دیا)

ابو معاذ نے کہا ہے: مزت الشئی امیزہ میزا (کہا جاتا ہے) جب تو دو چیزوں کو الگ الگ کرے اور اگر اشیاء زیادہ ہوں تو تو کہے گا: فرقت بینہا، یعنی یہ تخفیف کے ساتھ ہوگا۔ اور اسی سے فرق الشعر (بالوں کی مانگ) بھی ہے اور اگر ایک شے کو دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کرے تو تو کہے گا: فرقتہ تفریقا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ اسی سے امتاز القوم ہے، یعنی ان کے بعض بعض سے جدا ہو گئے الگ ہو گئے۔ اور یکاد یتمیز کا معنی ہے یتقطع (قریب ہے کہ وہ کٹ جائے) اور اسی کے ساتھ اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر بیان کی گئی ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک: 8) (ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مارے غضب کے پھٹ جاتی ہے) اور حدیث میں ہے: من ماز اذی عن الطریق فهو له صدقة (جس نے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کی تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ کہا جاتا ہے کہ کفار نے جب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ انہیں ان کے بارے بتائیں جو ان میں سے ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ یعنی تم ایسے کاموں میں مشغول نہ ہو جو تمہارا مقصود نہیں ہیں، بلکہ تم ایسے کام میں مشغول ہو جو تمہارا مقصود ہے (اور تمہارے لیے نفع بخش ہے) اور وہ ایمان لانا ہے۔ فَاٰمِنُوْا یعنی تم تصدیق کرو۔ یعنی تم پر تصدیق کرنا واجب اور لازم ہے نہ کہ اطلاع غیب کی طرف جھانکنا (2)۔ اور اس سے آراستہ ہونا لازم ہے وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لیے اجر عظیم یعنی جنت ہے اور ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس نجومی تھا، تو حجاج نے اپنے ہاتھ میں چند کنکریاں لیں اور ان کی تعداد معلوم کر لی اور پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ تو اس نے حساب لگایا اور نجومی اس تعداد تک پہنچ گیا۔ پھر حجاج نے اسے غافل رکھا اور کچھ کنکریاں ہاتھ میں لیں اور انہیں گنا نہیں اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 548، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

پھر بیوی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور اس میں غلطی اور خطا کی، پھر اس نے حساب لگایا اور پھر غلطی کی۔ پس اس نے کہا: اے امیر! میرا خیال ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تعداد کو نہیں جانتا؟ اس نے کہا (ہاں) نہیں جانتا۔ تو اس نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر تو نے اسے گنا ہوتا تو یہ غیب کی تعریف سے نکل جاتا، اور میں حساب لگاتا تو اس تک پہنچ جاتا اور چونکہ مجھے اس کی تعداد معلوم نہیں اس لئے یہ غیب ہے، اور غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باب سورۃ الانعام میں عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

"اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے، بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن، اور اللہ کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ اس میں الَّذِينَ محل رفع میں ہے اور مفعول اول محذوف ہے۔ خلیل، سیبویہ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے البخل خیرا لہم، یعنی بخل کرنے والے یہ گمان نہ کریں (کہ) بخل ان کے لئے بہتر ہے(1) اور چونکہ یبخلون بخل پر دلالت کر رہا ہے اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: من صدق کان خیرا لہ ای کان الصدق خیرا لہ (جس نے سچ بولا تو سچ اس کے لئے بہتر ہے۔)

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

اذا نُهِيَ السَّفِيهُ جَرَى إِلَيْهِ   وَخَالَفَ وَالسَّفِيهُ إِلَى خِلَافِ

یعنی معنی ہے: جری الی السفہ، پس سفیہ سفہ پر دلالت کرتا ہے۔

(جب سفیہ (احمق) کو منع کیا گیا تو وہ اسی کی طرف چلا اور اس نے مخالفت کی اور سفیہ خلاف کی طرف گیا۔)

اور رہی حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ تو وہ (حقیقت سے) بہت دور ہے، نحاس نے یہی کہا ہے اور اس کا جواز اس صورت میں ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: لا تحسبن بخل الذین یبخلون هو خیرا لہم (2)۔ (تو ان لوگوں کے بخل کے بارے جو بخل کرتے ہیں گمان بھی نہ کر کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے۔)

زجاج نے کہا ہے: یہ واسئل القریۃ کی مثل ہے(3) (یعنی مضاف محذوف ہے) اور قول باری تعالیٰ: هُوَ خَيْرًا لَّهُم میں

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236   2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236   3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547

ھُوَ بصریوں کے نزدیک ضمیر فصل ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہی ضمیر عماد ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں مبتدا خبر ہونے کی حیثیت سے ھُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی البخل شرلھم (بخل ان کے لئے بہت برا ہے) اور سَيُطَوَّقُوْنَ میں سخت وعید کا بیان ہے، یعنی سوف یطوقون (انہیں طوق پہنایا جائے گا)، مبرد نے یہی کہا ہے۔ یہ آیت مال واتفاق فی سبیل اللہ، اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنے کے بارے نازل ہوئی ہے(1) اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الآیہ (التوبہ: 34)

تاویل کرنے والوں کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابو وائل، ابو مالک، سدی اور شعبی رحمہم اللہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ کا معنی وہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے(2) کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی قیامت کے دن وہ اس کے لئے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے قیامت کے دن اسے اس کا طوق پہنایا جائے گا پھر وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں کے ساتھ پکڑے گا اور پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ (کنز) ہوں۔ پھر آیت تلاوت فرمائی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الآیہ۔ (3)

اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: "کوئی بھی جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے لئے اسے ایک زہریلے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی گردن میں اس کے ساتھ طوق پہنایا جائے گا" پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر کتاب اللہ میں سے اس کا مصداق یہ آیت پڑھی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ الآیہ (4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی ذی رحم (رشتہ دار) نہیں ہے جو اپنے ذی رحم کے پاس آتا ہے اور اس سے اس فضل واحسان (مراد مال) میں سے کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس ہے پس وہ اس کے بارے اس پر بخل کرتا ہے مگر قیامت کے دن اس کے لئے جہنم سے ایک اژدھا نکالا جائے گا جو زبان (باہر نکال کر) ادھر ادھر پھیر رہا ہوگا تاکہ اسے اس کا طوق پہنا دے (5)۔" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب اور ان کے بخل کے بارے میں اس کے بیان سے جو کچھ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے نازل ہوئی (6)۔ اور حضرت مجاہد، اور اہل علم کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے عنقریب وہ اس کی سزا برداشت کریں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ — 2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 343۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اثم مانع الزکوٰۃ، حدیث 1315، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 128۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1773، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 2343 — 6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

کے جو انہوں نے آپ کے ساتھ بخل کیا اور یہ طاقت سے ماخوذ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (البقرہ:184) (اور جو لوگ اسے مشکل سے ادا کر سکیں) اور یہ تطویق سے ماخوذ نہیں ہے(1)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے کہ ان کے لئے قیامت کے دن آگ کا طوق بنایا جائے گا(2) اور یہ پہلی تاویل کے ساتھ یعنی سدی کے قول کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اعمال گردن کے ساتھ چمٹا دیئے جائیں گے جیسا کہ طوق گردن کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، کہا جاتا ہے: طُوِّقَ فُلَانٌ عَمَلَهٗ طَوْقَ الْحَمَامَةِ یعنی اس کے عمل کا طوق پہنا دیا گیا کبوتری کے طوق کی طرح یعنی اسے اس کا لازم بنا دیا گیا۔ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء:13) (اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے)

اور اسی معنی میں ابو سفیان کے لئے حضرت عبداللہ بن جحش کا قول بھی ہے:

أبلغ　أبا　سفيان　عن　أمر　عواقبه　ندامة

تو ابو سفیان کو اس امر کا پیغام پہنچا دے جس کا انجام ندامت اور شرمندگی ہے۔

دار　ابن　عمك　بعتها　تقضي　بها　عنك　الغرامة

تو نے اپنے چچا کے بیٹے کا گھر بیچ دیا ہے اس کے عوض تجھ سے تاوان لیا جائے گا۔

وحليفكم　بالله　رب　الناس　مجتهد　القسامة

اور قسم ہے اللہ کی جو لوگوں کا رب ہے تمہارا حلیف قسامہ کی کوشش کر رہا ہے۔

اذهب　بها　اذهب　بها　طوقتها　طوق　الحمامة

تو اسے لے جا تو اسے لے جا تجھے کبوتری کے طوق کی طرح اس کا طوق پہنا دیا جائے گا۔

اور یہ دوسری تاویل کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ البخل اور البُخْل کا لغت میں معنی یہ ہے کہ انسان کا اس حق کو (ادا کرنے) سے باز رہنا جو (حق) اس پر واجب ہو۔

جب کوئی اس سے باز رہا جو اس پر واجب نہیں ہے تو وہ بخیل نہیں ہے، کیونکہ اس پر مذمت نہیں کی جاتی ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: يَبْخُلُوْنَ وَقَدْ بَخُلُوْا (وہ بخل کرتے ہیں اور تحقیق انہوں نے بخل کیا)۔ اور تمام عرب کہتے ہیں: بَخِلُوْا يَبْخَلُوْنَ۔

اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور بَخِلَ يَبْخَلُ بُخْلًا وَبَخَلًا یہ ابن فارس سے منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ تیسرا مسئلہ بخل کے ثمرہ اور اس کے فائدہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کی: جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور کون سی بیماری (عیب) ہے جو بخل سے بڑھ کر ہو" (یعنی جو بخل سے زیادہ قبیح ہو) انہوں نے عرض کی: وہ کیسے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا: "ایک قوم ساحل سمندر کے قریب اتری پس وہ اپنے بخل کے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 409　　2۔ ایضاً

کی خبر دی ہے اور یہ کہ وہ باقی ہے اسی طرح ہے جیسے وہ ازل میں تھا اور وہ العالمین سے غنی (اور بے نیاز) ہے، پس وہ زمین کا وارث ہوگا یعنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور ان کی املاک زائل اور ختم ہونے کے بعد وہی مالک ہوگا اور اموال باقی رہیں گے لیکن ان کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو یہ مخلوق کی عادت اور عرف کے مطابق وراثت کے جاری ہونے کی طرح ہی یہ (حکم) جاری ہو گیا حالانکہ حقیقت میں یہ میراث نہیں ہے کیونکہ حقیقت میں وارث وہ ہے جو کسی (شئی) کا وارث بنتا ہے جس کا وہ اس سے قبل مالک نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ تو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کا ہے، اور اموال اپنے مالکوں کے پاس عاریۃً (ادھار) ہیں، پس جب وہ مر جاتے ہیں تو عاریہ کو اس کے اس مالک کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کا وہ اصل میں ہوتا ہے، اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَیْهَا الآیہ (مریم:40) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔)

اور دونوں آیتوں میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خرچ کریں اور وہ بخل نہ کریں اس سے قبل کہ وہ مر جائیں اور وہ اسے بطور میراث اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ جائیں اور انہیں کوئی نفع نہ دے گا سوائے اس کے جو انہوں نے خرچ کر دیا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝

"بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا اللہ مفلس ہے اور ہم غنی ہیں، ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اللہ تعالیٰ نے کفار بالخصوص یہود کے قول کی قباحت (اور برائی) ذکر فرمائی۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ:245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن) تو یہودیوں میں سے ایک گروہ نے کہا، ان میں سے حیی بن اخطب تھا، یہ حسن کے قول کے مطابق ہے اور حضرت عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ فنحاص بن عازوراء تھا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ (1) (بے شک اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم غنی (اور دولت مند) ہیں، وہ ہم سے قرض مانگتا ہے۔ بلاشبہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 548، دار الکتب العلمیہ

انہوں نے اپنے ضعفاء اور کمزوروں پر اظہار برتری کے طور پر جتانے کے لئے یہ کہا، نہ کہ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے، کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ لیکن انہوں نے اس قول کے ساتھ کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اس سے اپنے ضعفاء کو اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو شک میں ڈالنے اور حضور نبی کریم ﷺ کی تکذیب کا ارادہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ محمد ﷺ کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے؛ کیونکہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا یعنی ہم انہیں اس پر جزا اور بدلہ دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال ناموں میں لکھ لیں گے، یعنی ہم کراما کاتبین کو ان کا قول لکھ لینے اور ثابت رکھنے کا حکم دیں گے تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے انہی اعمال ناموں میں اسے پڑھیں جو انہیں دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ ان کے خلاف حجت کو اور پختہ اور موکد کرنے والا ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿﴾ (الانبیاء) (اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لکھنے سے مقصود محفوظ رکھنا ہے، یعنی ہم اسے محفوظ رکھیں گے جو انہوں نے کہا تا کہ ہم انہیں بدلہ اور جزا دیں۔ اور مَا قَالُوْا میں مَا، سَنَكْتُبُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اور اعمش اور حمزہ نے سیکتب پڑھا ہے۔ یعنی یا کے ساتھ تو اس صورت میں ما، اسم ما لم یسم فاعلہ (نائب الفاعل) ہو گا۔ اور حمزہ نے اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت کا اعتبار کیا ہے: وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔

قولہ تعالیٰ: وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ یعنی ہم ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عمل کو لکھ لیں گے یعنی ان کے قتل کے ساتھ رضامند ہونے کو۔ اور ان سے مراد ان کے اسلاف کا انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا ہے لیکن جب وہ اس پر راضی اور خوش ہیں تو اس کی اضافت ان کی طرف کرنا صحیح ہے۔ ایک آدمی نے حضرت شعبی رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا اقدام قرار دیا تو حضرت شعبی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا: تو بھی ان کے خون میں شریک ہے، پس آپ نے رضا بالقتل کو قتل ہی قرار دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس حیثیت سے کہ رضا بالمعصیۃ معصیت ہوتی ہے۔ ابو داؤد نے عرس بن عمیرہ الکندی سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "جب تو نے زمین میں خطا اور گناہ کا عمل کیا تو جو وہاں حاضر تھا اس نے اسے ناپسند کیا ... اور ایک بار فرمایا پس اس نے اس کا انکار کیا ... تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ تھا اور جو وہاں سے غائب تھا لیکن اس نے اسے پسند کیا تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود اور حاضر تھا (1)۔" اور یہ نص ہے۔ قولہ تعالیٰ: بِغَيْرِ حَقٍّ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ یعنی جہنم میں ان کو کہا جائے گا یا موت کے وقت یا حساب کے وقت یہ کہا جائے گا۔ پھر یہ قول یا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا یا فرشتوں کی جانب سے، دونوں قول ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں ویقال ہے۔ اور الحریق شعلہ نکالنے والی آگ کا اسم ہے، اور النار کا لفظ شعلہ نکالنے والی اور شعلہ نہ نکالنے والی آگ دونوں کو شامل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یعنی وہ عذاب ان گناہوں کے عوض ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور الایدی کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے تا کہ وہ فعل کے بذات خود کرنے پر دلالت کرے، کیونکہ کبھی فعل کی نسبت انسان کی طرف

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 241

کر دی جاتی ہے اس معنی میں کہ اس نے وہ کام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے بَنْذِیرٍ اِذْ یَشَاءُ ہے اور آتیونکم اصل میں آتیینکم تھا ضمہ کو یاء پر ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۞ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ۞

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھا لے اس کو آگ آپ فرمائیے آ چکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو۔ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۔"

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ محل جر میں ہے اور یہ اس الَّذِیْنَ سے بدل ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا یا یہ لِلْعَبِیْدِ کی صفت ہے، یا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ہم الذین قالوا۔ اور کلبی وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا، فنحاص بن عازوراء اور ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور آپ سے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، حالانکہ اس نے ہم پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جو گمان کرتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھا لے، پس اگر تم ہمارے لئے وہ (دلیل) لے آئے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تورات میں ہے، لیکن مکمل کلام یہ ہے: یہاں تک کہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آ جائیں پس جب وہ دونوں تمہارے پاس آ گئے تو ان دونوں کے ساتھ بغیر قربانی کے ایمان لاؤ۔

اور یہ قول بھی ہے: قربانی دینے والوں کا امر ثابت اور قائم تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کی زبان پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ ان میں سے نبی علیہ السلام قربانی ذبح کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے تو پھر سفید رنگ کی آگ نازل ہوتی، اس کی آواز ہوتی اور وہ گھیر لیتی، اس کا دھواں نہ ہوتا، اور وہ قربانی کو کھا جاتی۔ پس یہ قول یہود کی طرف سے دعویٰ ہے۔ اور جب وہاں استثنا ہوئی یا نسخ تو انہوں نے اسے چھپا دیا، اور وہ اس سے اپنے استدلال میں سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان کے دعویٰ کو باطل کرنے میں دلیل قاطع ہیں، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

اسے واضح اور روشن کر دیا۔ کہا جاتا ہے: نار الشیٔ و انارہ و نورہ و استنار۔ یہ ہم معنی ہیں اور ان دونوں میں سے ہر ایک لازم اور متعدی ہے۔ اور زبر اور کتاب کو جمع کیا حالانکہ یہ دونوں بھی ہم معنی ہیں اس لئے کہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں اور ان کی اصل وہی ہے جسے ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

"ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری پوری دی جائیں گی تمہیں تمہاری مزدوریاں قیامت کے دن پس جو شخص بچا لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر سامان دھوکے میں ڈالنے والا"

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والوں اور ان کے کفر کے بارے میں اس قول میں خبر دی: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ اور مومنین کو ان کی اذیت پر صبر کرنے کے بارے اپنے اس قول میں حکم ارشاد فرمایا: لَتُبْلَوُنَّ الآیہ (تو پھر) بیان کیا کہ وہ ختم ہو جانے والی چیزوں میں سے ہے اور وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، کیونکہ دنیا کی انتہا اور اختتام قریب ہے اور قیامت کا دن یوم جزا (بدلے کا دن) ہے۔ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یہ ذوق سے ماخوذ ہے اور یہ (موت) ایسی شے ہے جس سے انسان کو چارہ نہیں اور نہ ہی اس سے کوئی حیوان الگ اور جدا ہے (یعنی ہر ذی روح کو موت آنا یقینی ہے۔)

امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

من لم یمت عبطة یمت هرما　　للموت کأس والمرء ذائقها

جو عین عالم شباب میں نہیں مرتا اسے بڑھاپے میں موت آ جاتی ہے موت تو (شراب سے بھرا ہوا) ایک جام ہے اور آدمی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

الموت باب وکل الناس داخله　　فلیت شعری بعد الباب ما الدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام لوگ اس سے داخل ہونے والے ہیں اے کاش مجھے علم ہوتا اس دروازے کے بعد گھر کون سا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عام قرأت ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اضافت کے ساتھ ہے اور اعمش، یحییٰ اور ابن ابی اسحاق نے ذائقة الموت یعنی ذائقة کو تنوین کے ساتھ اور الموت کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ موت کے بعد تو کوئی ذائقہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم فاعل کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بمعنی ماضی ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ بمعنی استقبال ہو پس اگر تو پہلا معنی مراد لے تو اس میں تو صرف ما بعد کی طرف اضافت ہی ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: هذا ضاربُ زيدٍ امس اور قاتلُ بكرٍ امس کیونکہ اسے اسم جامد کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور وہ علم ہے جیسے غلام زید اور صاحب بکر۔

شاعر نے کہا ہے:

الحافظو عورة العشيرة لا يأتيهم من ورائهم وكف

(اس میں الحافظو اسم ما بعد کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہو رہا ہے۔)

اور اگر وہ دوسرا معنی مراد لیں تو یہ جائز ہے اور نصب اور تنوین کی بھی یہی صورت ہے اور یہی اصل ہے، کیونکہ یہ (اسم فاعل) قائم مقام فعل مضارع کے ہوتا ہے اور اگر فعل غیر متعدی ہو تو پھر یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے قائم زید اور اگر وہ متعدی ہو تو اسے متعدی بنانے اور اس کے ساتھ نصب دے اور یہ کہے: زیدٌ ضاربٌ عمروا بمعنی یضرب عمروا۔ اور تخفیف کے لئے تنوین کا حذف اور اضافت جائز ہوتی ہے۔

جیسا کہ الفرزدق نے کہا ہے:

ضخم الهموم بكل معصبٍ رأسه فاهٍ مخالبه مهبوة مكتفس
مفتال خشيته مجيبِ مفنعهِ في منكب زبن المطي عنافس

تنوین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اصل میں: معصبٍ رأسه تنوین اور نصب کے ساتھ ہے۔ اور اس کی مثل قرآن کریم میں بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اور یہ اسی کی مثل ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ پھر تو بیان کر موت کے کچھ اسباب ہیں اور اس کی کچھ علامات ہیں، وہیں بندہ مومن کی موت کی علامات میں سے پیشانی پر پسینہ کا آنا ہے۔ اسے نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بندہ مومن پیشانی کے عرق آلود ہونے کے ساتھ فوت ہوتا ہے (1)"۔ اور ہم نے اسے "التذکرۃ" میں بیان کیا ہے اور جب وہ قریب المرگ ہو تو اسے شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ (2) (اپنے مرنے والوں کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تلقین کرو) تاکہ یہ اس کا آخری کلام ہو اور اس کی زندگی کا اختتام کلمہ شہادت کے ساتھ ہو اور اس پر بار بار اس کا اعادہ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان اور تنگ نہ ہو جائے۔

اور اس وقت سورۃ یٰسین پڑھنا مستحب ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اقرءوا یٰس علی موتاکم (3) (اپنے مرنے والوں پر یٰسین پڑھو)۔ اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور علامہ الآجری نے کتاب النصیحہ میں حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من میت یقرء عندہ سورۃ یٰس الا ھون

1۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 259
2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 300
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 89

حدث لاحق ہو جائے جب میت کے غسل سے فارغ ہو جائے تو اسے اس کے کپڑوں میں کفن دو اور وہ یہ ہیں۔

جمہور کے نزدیک کفن دینا واجب ہے، پس اگر اس کا مال ہو تو پھر عام علماء کے نزدیک اس کے راس المال سے کفن دیا جائے گا مگر طاؤس نے یہ کہا ہے کہ اس کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے تیسرے حصے سے ہی کفن دیا جائے گا۔

اور اگر میت ان میں سے ہو کہ اس کا نفقہ اس کی زندگی میں ہی کسی اور کے ذمہ لازم ہو مثلاً آقا کے ذمہ، اگر وہ غلام ہو یا باپ یا خاوند یا بیٹے کے ذمہ تو بالاتفاق (کفن) ان پر ہی ہوگا، پھر بیت المال پر یا مسلمانوں کی جماعت پر کفن کفایہ ہو کا ورود ہے جو ان میں سے تعین فرض کے ساتھ متعین ہوتی ہے وہ ستر عورت (شرمگاہ کو ڈھانپنا) ہے اور اگر اس میں فاضل اور اضافی کپڑا ہو لیکن وہ سارے بدن کو نہ ڈھانپ سکتا ہو تو پھر اس کے چہرے کی تکریم میں اس کے سر اور چہرے کو ڈھانپا جائے گا اور اس کے خاص کی تبدیلی میں سے جو ظاہر ہوا سے ڈھانپ دیا جائے گا اور اس میں اصل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کیونکہ انہوں نے احد کے دن ایک کمبل چھوڑا جب آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو آپ کے پاؤں اس سے نکل جاتے اور جب آپ کے پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو آپ کا سر باہر نکل جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اسے ان کے سر پر ڈال دو اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دو (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

اور تمام جمہور کے نزدیک کفن میں کپڑوں کا طاق (وتر) ہونا مستحب ہے اور تمام کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں کوئی مخصوص حد نہیں ہے اور پھر کپڑوں کا سفید ہونا مستحب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: البسوا من ثیابکم البیاض فانھا من خیر ثیابکم و کفنوا فیھا موتاکم (2) (تم اپنے سفید کپڑے پہنو کیونکہ یہ لباس تمہارے کپڑوں میں سے بہترین ہے اور ان میں تم اپنے مردوں کو کفن دو) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سحول کے بنے ہوئے روئی کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا اور کسی دوسرے رنگ کے کپڑے میں بھی کفن دینا جائز ہے مگر یہ کہ وہ خالص ریشم یا ایسا طلائی ریشمی کپڑا ہو۔ اور اگر ورثاء کفن میں بخل سے کام لیں تو پھر ان پر جمعہ اور عیدین کے دنوں میں پہنے جانے والے لباس کی مثل کپڑا لازم کر دیا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ (3) (جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اچھے کپڑے میں کفن دے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ مگر یہ کہ وہ اس سے کم کے بارے وصیت کرے۔ اور اگر اس نے اسراف (فضول خرچی) کی وصیت کی تو کہا گیا ہے: (ضرورت سے) زائد میں (اس کی وصیت) باطل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ (لیکن) پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسراف کو ناپسند فرمایا ہے ولا تسرفوا (اور تم فضول خرچی نہ کرو) اور عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بے شک میت کے بدن سے نکلنے والی پیپ کے لئے ہے۔ اور جب وہ اس کے غسل اور اسے کفن پہنانے سے فارغ ہو جائیں اور اسے چارپائی پر رکھ دیا جائے اور اسے آدمی اپنے کندھوں پر اٹھائیں تو اس کا حکم یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے بعد جلدی چلنے کا ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ فان تک

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 305۔ ایضاً، صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، جلد 2، صفحہ 185

3۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 306

صالحۃ فخیر تقدمونها الیہ وان تکن غیر ذالک فشر تضعونہ عن رقابکم (1) (تم میت کو لے کر تیز چلو پس اگر وہ نیک
اور صالح ہے تو اچھا اور بہتر ہے تم اسے اس تک جلدی پہنچا دو گے اور اگر وہ اس کے سوا ہے تو وہ برا ہے تم اسے جلدی اپنی
گردنوں سے اتار دو گے)(2) اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آج جاہل لوگ آہستہ آہستہ لے کر چلتے ہیں اور بار بار راستے میں
ٹھہرتے ہیں، اور اس کی مراد آواز کے ساتھ قرآن کریم کی قرآت کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے اور وہ بھی جائز نہیں ہے جو مصری
شہروں کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ نسائی نے روایت کیا ہے کہ محمد بن عبدالاعلی نے ہمیں خبر دی ہے انہوں
نے کہا کہ خالد نے اور اسے عیینہ بن عبدالرحمن نے خبر دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا ہے کہ میں حضرت
عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں حاضر ہوا اور زیاد نکل کر چارپائی کے آگے آگے چلنے لگے اور عبدالرحمن کے خاندان کے
لوگ اور ان کے موالی چارپائی اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر چل رہے تھے اور کہتے تھے: آہستہ آہستہ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا
فرمائے: پس وہ رینگ رینگ کر چل رہے تھے (یعنی انتہائی آہستہ رفتار سے) یہاں تک کہ جب ہم مربد کا کچھ راستہ طے کر
چکے تو ہمیں پیچھے سے خچر پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ آکر ملے۔ پس جب آپ نے انہیں وہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان پر اپنے خچر سے
حملہ کر دیا اور ان پر کوڑا برسایا اور فرمایا: تم چھوڑ دو! قسم ہے سب سے مکرم و محترم ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کی ہم رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور ہم میت کو لے کر دوڑتے چلے جاتے تھے تو اس سے تو مخوش ہو گی (3)۔

اور ابوماجد نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے
جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ دوڑ کی چال سے قدرے کم ہو اگر وہ میت نیک اور صالح ہوئی تو
بہتر ہے اسے اس تک جلدی پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ اس کے سوا ہوئی تو پھر اہل نار سے دور رہو (4)۔" الحدیث۔ ابو عمر نے کہا
ہے: اس مسئلہ میں جس پر علماء کی جماعت ہے (وہ یہ ہے) کہ عام عادت سے چال تھوڑی تیز ہو اور تیزی ان کے نزدیک آہستہ
چلنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور اس کی تیزی جان کمزور اور ضعیف لوگوں کے لئے باعث مشقت ہو جو جنازہ کے پیچھے چل رہے
ہیں وہ مکروہ ہے۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: میت کو لے کر تھوڑا آہستہ چلو (لیکن) یہود و نصاریٰ کی طرح رینگ رینگ کر
نہ چلو۔ اور ایک قوم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں "الاسراع" کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد دفن میں جلدی کرنا ہے
نہ کہ چلنے میں، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور رہی میت پر نماز جنازہ تو یہ جہاد کی طرح واجب (فرض) علی الکفایہ ہے۔ یہی علماء کا مشہور
مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کا بھی، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے بارے میں فرمایا: قوموا فصلوا علیہ
(تم اٹھو اور اس پر نماز پڑھو) اور اصبغ نے کہا ہے: نماز جنازہ سنت ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ اس
بارے میں مزید بیان سورۂ براءۃ میں آئے گا۔

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 306-307
2۔ صحیح بخاری، باب السرعۃ بالجنازۃ، حدیث 1231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 271
4۔ ابوداؤد، باب الاسراع بالجنازۃ، حدیث 2769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 7۔ میت کو مٹی میں دفن کرنا، اس میں چھپانا اور اسے مٹی کے ساتھ ڈھانپ دینا یہ واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ (المائدہ: 31) (پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تا کہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی)

اس آیت کے تحت قبر بنانے کا حکم اور جو کچھ اس میں سے مستحب ہوتا ہے اور اس میں میت کو رکھنے کی کیفیت ذکر کی جائے گی اور اس پر مسجد بنانے کا حکم سورۃ "الکہف" میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس یہ مردوں سے متعلق احکام ہیں اور وہ جو زندوں پر ان کے لئے واجب ہوتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مردوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے (1)۔" اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور سنن نسائی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ام المومنین نے فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرنے والے کا ذکر برائی کے ساتھ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنے ہلاک ہونے والوں کا ذکر نہ کرو مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ (2)۔"

قولہ تعالیٰ: وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی مومن کا اجر ثواب ہے اور کافر کا اجر عقاب (سزا) ہے دنیا میں نعمتوں اور آزمائش و مصائب کو اجر اور جزا میں شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ فنا ہونے والی ہیں۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ یعنی جسے آتش جہنم سے دور رکھا گیا۔ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ اس کے ساتھ کامیاب ہو گیا جس کی وہ آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور اس سے وہ نجات پا گیا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اعمش نے زید بن وہب سے، انہوں نے عبدالرحمن بن عبد رب الکعبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سرہ ان یزحزح عن النار وان یدخل الجنة فلتاتہ منیتہ وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ ویاتی الی الناس الذی یحب ان یوتی الیہ (3) (جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ اسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کیا جائے تو چاہیے کہ اس کی موت اسے اس حال میں آئے کہ وہ شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگوں کے پاس وہ (شے) لے کر آئے جسے وہ پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس لائی جائے۔) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنت میں کوڑے (برابر) جگہ دنیا اور اس میں موجود تمام چیزوں کی نسبت بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ پڑھو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (4)۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی دنیا مومن کے ساتھ مکر کرتی ہے اور اسے دھوکہ دیتی ہے اور وہ اس کے طویل

1۔ سنن نسائی، ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 274۔ صحیح بخاری، باب ما ینہی من سب الاموات، حدیث 1308، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً

3۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ابواب الصفۃ، جلد 8، صفحہ 340، حدیث نمبر 13860

4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 327، حدیث نمبر 3170۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، حدیث 2930، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرصہ تک باقی رہنے کا گمان کرنے لگتا ہے حالانکہ وہ فانی ہے۔ اور متاع سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے لطف اندوز ہوا جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے جیسا کہ کلہاڑا، ہانڈی اور پیالہ پھر یہ زائل اور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔

حسن نے کہا ہے: جیسا کہ سرسبز و شاداب نباتات اور کھیل سے دل بہلانا اس کا کوئی حاصل اور نتیجہ نہیں۔ اور حضرت قتادہ نے کہا: یہ چھوڑا ہوا متاع و سامان ہے قریب ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت برباد اور تباہ ہو جائے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس سامان سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے اتنا لے جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

تحقیق کسی نے کتنا خوب اور اچھا کہا ہے:

هي الدار دار الأذى والقذى ودار الفناء ودار الغِيَر

یہ (دنیا) اذیتوں اور تکلیفوں کا گھر ہے اور یہ فنا ہونے والا اور تغیرات کا گھر ہے۔

فلو نلتها بحذافيرها لمُتَّ ولم تقض منها الوطر

پس اگر تو اسے مکمل طور پر بھی پالے تو یقیناً تجھے موت آئے گی اور تیرا مطلوب حاصل نہ ہوا ہوگا۔

أيا من يؤمل طول الخلود وطولُ الخلود عليه ضرر

اے وہ جو اس سے طویل آرزو کی وابستہ رکھتا ہے اس پر ہمیشگی کی آرزو رکھنا باعث ضرر ہے۔

إذا أنت شبت وبان الشباب فلا خير في العيش بعد الكبر

جب تو بوڑھا ہو جائے گا اور جوانی ڈھل جائے گی تو پھر بڑھاپے کے بعد زندگی میں کوئی مزہ اور خیر نہیں۔

اور الغُرُوْرِ (غین کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی شیطان ہے وہ لوگوں کو جھوٹے وعدوں اور تمناؤں کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: غرور سے مراد وہ شے ہے جسے تو ظاہراً دیکھے تو تو اسے پسند کرے اور اس کا باطن مکروہ (ناپسندیدہ) یا مجہول ہو۔ اور شیطان غرور ہے کیونکہ وہ نفس کی محبت پر ابھارتا ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ برا ہوتا ہے۔ فرمایا: اسی سے بیع الغرر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع کا ظاہر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

"یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں اور اگر تم (ان حالات میں) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔"

یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے اور معنی یہ ہے: تم آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تمہارا امتحان لیا جائے

گا اپنے مالوں میں مصائب کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تکلیف کے ساتھ اور تمام شرعی پابندیاں لگانے کے ساتھ۔ اور جانوں میں آزمائش موت، امراض میں مبتلا کرنے اور دوست احباب کے فوت ہونے کے ساتھ ہوتی ہے چونکہ مالوں کے سبب مصائب زیادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے ذکر اموال کا فرمایا۔ وَلَتَسْمَعُنَّ اگر کہا جائے: لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کیوں ثابت رہی اور وَلَتَسْمَعُنَّ سے کیوں حذف کر دی گئی؟ تو جواب یہ ہے کہ لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کا ماقبل مفتوح ہے پس اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دے دی گئی، اور حرکت بھی ضمہ دی گئی اس لئے کہ یہ واؤ جمع ہے، اور اس کا حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت نہیں کرتی، اور وَلَتَسْمَعُنَّ میں واؤ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت کر رہی ہے۔ (اور وہ حرکت ماقبل کا ضمہ ہے) اور لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کو ہمزہ سے بدلنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کی حرکت عارضی ہے؛ نحاس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور واحد مذکر کے لئے کہا جائے گا: لَتُبْلَيَنَّ یا رَجُلُ اور تثنیہ کے لئے: لَتُبْلَيَانِّ یا رجلان اور جمع مذکر کے لئے لَتُبْلَوُنَّ کہا جائے گا۔ اور اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) اس نے یہ کلمات قرآن کریم کا رد کرتے ہوئے اور اس کو حقیر سمجھتے ہوئے اس وقت کہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے تھپڑ دے مارا، اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی شکایت کی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ وہ کہنے والا فنحاص یہودی تھا؛ یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اور زہری نے کہا ہے: وہ کعب بن اشرف تھا، اس کے سبب یہ آیت نازل ہوئی، وہ شاعر تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار قریش کو جمع کرتا تھا، اور مسلمان عورتوں کے ذکر سے اپنے قصیدہ کو مزین کرتا تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو بھیجا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ کتب سیر اور صحیح اخبار میں اس کا قتل مشہور ہے، اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں (2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں یہودی اور مشرک تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام بہت زیادہ اذیت ناک باتیں سنتے تھے۔ اور صحیحین میں ہے (3) کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ابی کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گدھے پر سوار تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ابن ابی نے کہا: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر وہ حق ہے تو آپ اس کے ساتھ ہماری مجالس میں ہمیں تکلیف اور اذیت نہ دیں! آپ اپنی سواری کی طرف لوٹ جائیں پس جو آپ کے پاس آئے تو اس پر اسے بیان کیجئے اور اس نے اپنی ناک پکڑ لی تاکہ گدھے کا غبار اس تک نہ پہنچے تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیے کیونکہ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ۔ صحیح بخاری، باب قتل کعب بن الاشرف، حدیث نمبر 3731، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورہ آل عمران، حدیث نمبر 4200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاتا ہے (1)۔ اور حضرت محمد بن کعب نے کہا ہے: کسی عالم کے لئے یہ حلال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علم پر خاموش رہے اور نہ کسی جاہل کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جہالت پر خاموش رہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اور ارشاد فرمایا: فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (النحل) (پس دریافت کرو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کتاب کا علم رکھنے والوں سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی شے نہ بتاتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔(2)

اور حضرت حسن بن عمارہ نے کہا ہے: میں حضرت زہری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس کے بعد کہ انہوں نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا تھا تو میں نے انہیں اپنے دروازے پر پالیا، میں نے عرض کی: اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو مجھے حدیث بیان فرمائیے۔

تو انہوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے؟ میں نے عرض کی: یا آپ مجھے حدیث بیان کریں اور یا میں تم سے حدیث بیان کروں گا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے بیان کرو۔ تو میں نے کہا: مجھے حکم ابن عتیبہ نے یحییٰ بن جزار سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے وعدہ نہیں لیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں بلکہ اس نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ وہ علم سکھائیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر انہوں نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ اس میں ضمیر حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ آپ کا ذکر جاری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر) کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا بیان داخل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب میں ہے۔ اور فرمایا: وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ یہاں تکتمنہ نہیں فرمایا کیونکہ یہ حال کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اسے بغیر چھپائے کھول کر بیان کرتے ہو۔ اور ابو عمرو اور عاصم نے ابوبکر اور اہل مکہ کی ایک روایت میں لَیُبَیِّنُنَّهٗ خطاب کی حکایت کے طور پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ کیونکہ وہ غائب تھے (3)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَیُبَیِّنُنَّهٗ پڑھا ہے اور قولہ تعالیٰ: فَنَبَذُوْهُ ان لوگوں کی طرف لوٹتے ہوئے آرہا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَیُبَیِّنُوْنَهٗ بغیر نون تاکید ثقیلہ کے ہے اور النَّبْذُ کا معنی پھینکنا ہے اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ یہ پھینکنے میں اظہار مبالغہ ہے، اور اسی سے وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِیًّا ہے۔ اور اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور قولہ تعالیٰ: وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا کا معنی و مفہوم بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 252　　2۔ محرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ　　3۔ ایضاً

وہ اپنے بادشاہوں کے پاس ایسی چیزوں کا علم لے کر آتے تھے جو ان کے ساتھ ان کے باطل نظریات میں موافقت کرتا تھا تو اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور انہوں نے اس کے عوض تھوڑی سی قیمت خرید لی) یعنی اس کے عوض انہوں نے وہ دنیا خرید لی جو بادشاہوں نے انہیں عطا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس کے بدلے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں دین کے بارے فساد برپا کیا اور ضحاک نے کہا ہے: یہود بادشاہوں کو کہتے تھے بلاشبہ ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک نبی مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ (سلسلۂ) نبوت ختم ہو جائے گا، پس جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو بادشاہوں نے ان سے پوچھا: کیا یہی وہ نبی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ تو یہودیوں نے بادشاہوں کے سوال میں حرص اور لالچ رکھنے کی بنا پر کہا: وہ اس کے سوا ہے، (یعنی یہ وہ نہیں ہے) تو بادشاہوں نے انہیں خزانے عطا کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا یعنی وہ خوش ہوتے ہیں اس جھوٹ سے جو انہوں نے بادشاہوں کے سامنے بولا یہاں تک کہ انہوں نے دنیوی ساز وسامان حاصل کر لیا(1)۔ پہلی حدیث دوسری حدیث کے خلاف ہے اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں سببوں کی بنا پر ہو کیونکہ وہ دونوں ایک ہی زمانہ میں جمع تھے اور یہ دونوں فریقوں کا جواب ہو۔ واللہ اعلم۔

اور آپ کا قول: بما استحمدوا الیہ کا معنی ہے جو انہوں نے آپ سے مطالبہ اور خواہش کی کہ ان کی تعریف کی جائے اور مروان کا قول: لئن کان کل امرئ منا الخ اس پر دلیل ہے کہ عموم کے لئے مخصوص صیغے ہیں، اور یہ کہ الَّذِیْنَ ان میں سے ہے(2)۔ اور یہ صحیح اور قطعی بات ہے جس نے اسے قرآن و سنت سے لیا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے نہ کہ پیچھے رہنے والے منافقین کے بارے میں، کیونکہ وہ کہتے تھے: ہم دین ابراہیم پر ہیں حالانکہ وہ آپ کے دین پر نہ تھے، اور وہ کہتے تھے: ہم نماز، روزے اور کتاب والے ہیں، وہ اس سے ارادہ رکھتے تھے کہ اس کے سبب ان کی تعریف کی جائے۔ اور الذین یحسبن یا یاء سے فاعل ہے۔ اور یہی نافع، ابن عامر، ابن کثیر اور ابو عمرو کی قرأت ہے، یعنی خوش ہونے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی خوشی انہیں عذاب سے نجات دلانے والی ہے، اور کہا گیا ہے کہ پہلا مفعول محذوف ہے اور وہ انفسہم ہے۔ اور دوسرا بمفازۃ ہے۔ اور کوفیوں نے تحسبن تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے یعنی اے محمد ﷺ آپ گمان نہ کریں کہ خوش ہونے والے عذاب سے امن میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد فلا تحسبنهم تاء اور باء کے ضمہ کے ساتھ ہے، اور یہ تاکید کے لئے دوبارہ مذکور ہے۔ اس کا پہلا مفعول ھم ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول محذوف ہے، اور وہ کذالک ہے، اور فاء عاطفہ ہے یا زائدہ ہے اس بنا پر کہ دوسرا فعل پہلے سے بدل ہے۔ ضحاک اور عیسیٰ بن عمر نے تاء کے ساتھ اور باء

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 4، صفحہ 256

4۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 258

نجات) ہے، یہ مَفعلة کے وزن پر فاز یفوز سے ہے جب کوئی نجات پا جائے یعنی وہ نجات پانے والے نہیں۔ اور خوف اور ڈر کی جگہ کو بھی فال لینے کے طور پر مفازۃ کا نام دیا گیا ہے، اصمعی نے یہی کہا ہے(1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ یہ موت کی جگہ ہے اور ہلاکت کا محل غالب ہے، عرب کہتے ہیں فوّز الرجل جب آدمی مر جائے۔ ثعلب نے کہا ہے: میں نے ابن اعرابی کے سامنے اصمعی کا قول بیان کیا تو اس نے کہا: انہوں نے غلطی کی ہے۔ مجھے ابوالمکارم نے کہا ہے: اسے مفازۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جس نے اسے طے کر لیا وہ کامیاب ہو گیا(2) نجات پا گیا اور اصمعی نے کہا ہے: السلیم (جس کو ڈس لیا ہو) کو بطور نیک فال کے سلیم کا نام دیا گیا ہے(3)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: کیونکہ وہ اس تکلیف اور مصیبت سے بچ نکلنے والا ہے جو اسے پہنچی ہے(4) اور یہ بھی کہا گیا ہے آپ انہیں عذاب سے کسی دور جگہ میں نہ دیکھیں کیونکہ فوز (کامیابی اور نجات) مکروہ (عذاب اور تکلیف) سے دور ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے"

یہ ان کے خلاف استدلال اور حجت ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور ان کی تکذیب ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے آپ خوش ہونے والوں کے بارے یہ گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور وہ قدرت رکھنے والے رب کے قبضہ میں ہیں، تو یہ پہلے کلام پر معطوف ہے، یعنی بلاشبہ وہ اس کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتے، وہ انہیں پکڑ لے گا جب چاہے گا۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے، اس پر بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 553، دارالکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾
لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ
بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ وہ عقلمند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بیکار۔ پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔ اے ہمارے رب! سنا ہم نے ایک منادی کرنے والے کو بلند آواز سے پکارتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے مالک! بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کرنا ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو قبول فرما لی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت۔ بعض تمہارا جز ہے بعض کی۔ تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لئے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور بالضرور مٹا دوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزا ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (اے سننے والے!) نہ دھوکے میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں۔ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ

تو یہ مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکوں کے لیے۔ اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیاز مندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ"

اس میں تین مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ان آیات میں نظر و استدلال کے حکم کے ساتھ کیا، کیونکہ یہ پیدا نہیں ہو سکتے مگر اسی کی جانب سے جو حی و قیوم ہے قدرت والا ہے، پاک ہے، سلامت و محفوظ ہے (ہر عیب اور کمزوری سے) اور کل جہان سے بے نیاز اور غنی ہے، تاکہ ان کا ایمان یقین کے ساتھ مستند ہو جائے نہ کہ فقط تقلید (پر اس کا انحصار ہو)۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقلوں کو دلائل میں غور و فکر کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی آپ اٹھے نماز پڑھنے لگے تو اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے وہ آپ کو نماز کے بارے (مراد جماعت کے لئے) عرض کرنے لگے تو انہوں نے آپ ﷺ کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ رو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے ہیں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے بلال! کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آج کی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ پھر آپ نے فرمایا: اس کے لئے ہلاکت ہے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا (1)۔"

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے بیان کیا ہے نیند سے بیدار ہونے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے چہرے پر (ہاتھ) پھیرے، اور حضور نبی رحمت ﷺ کی اقتدا کرتے ہوئے ان دس آیات کی قرأت سے اپنے قیام کا آغاز کرے، یہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ نماز ادا کرے جو اس کے لئے مقدر ہے تو اس طرح وہ فکر اور عمل دونوں کو جمع کرے گا، اور یہی افضل عمل ہے جیسا کہ اس کا بیان اس کے بعد کی آیت میں آئے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورۃ "آل عمران" کی آخری دس آیات پڑھتے تھے۔ اسے حافظ ابو نصر وائلی سجستانی نے کتاب "الابانہ" میں سلیمان بن موسیٰ عن مظاہر بن اسلم مخزومی عن المقبری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور سورۃ کی ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے آل

1۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 453، مکتب الاعلام۔ ملاحظہ، ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ الفتح، حدیث نمبر 4480، حدیث ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمران کی آخری آیات ہر رات پڑھیں اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کا ثواب لکھ دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ اللہ تعالیٰ نے تین حالتیں ذکر فرمائی ہیں انسان اپنے غالب معاملات میں ان سے خالی نہیں ہوتا تو گویا کہ یہ کیفیات اس کے جملہ اوقات کو محیط ہیں۔ اور اس معنی کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل احیانہ۔ (1)

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ پس اس میں بیت الخلا میں اور دوسرے مقامات پر ہونا بھی داخل ہے۔ حالانکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، ابن سیرین اور نخعی رحمہم اللہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ آیت اور حدیث کے عام ہونے کی بنا پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: بیت الخلا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ملائکہ اس ذکر کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان کے صحف میں لکھا ہوتا ہے، پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ۝ (ق) (نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) اور مزید فرمایا: وَ اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ۝ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ۝ (الانفطار) (حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں) اور اس لئے بھی کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو ہر حال میں ذکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور کوئی استثنیٰ نہیں کی۔ پس فرمایا: اُذۡکُرُوا اللّٰہَ ذِکۡرًا کَثِیۡرًا ۝ (الاحزاب) (یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے) مزید فرمایا: فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ (البقرہ:152) (سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا) اور پھر فرمایا: اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ مَنۡ اَحۡسَنَ عَمَلًا ۝ (الکہف) ((تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے) پس یہ سب عام ہے۔ پس ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ماجور ہوگا اور اسے ثواب دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابو نعیم نے ذکر کیا ہے کہ ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے ہمیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے میرے باپ (مراد احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ) نے بتایا کہ وکیع نے بیان کیا کہ سفیان نے عطا بن ابی مروان سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا (کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: "اے میرے پروردگار! کیا تو قریب ہے کہ میں تیرے ساتھ سرگوشی کروں یا تو بعید ہے کہ میں تجھے ندا دوں تو رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ انا جلیس من ذکرنی (اے موسیٰ! علیہ السلام میں اس کا ہمنشیں ہوتا ہوں جو میرا ذکر کرے) عرض کی: اے میرے رب! بلاشبہ ہم تو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں (اور اس میں) ہم تجھے اس سے برتر اور عظیم تر سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں تیرا ذکر کریں۔ رب کریم نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: وہ جنابت اور قضائے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 162۔

حاجت کی حالت ہے۔ رب کریم نے فرمایا: یاموسیٰ اذکرنی علی کل حال (اے موسیٰ! تو ہر حال میں میرا ذکر کر۔)
اور جنہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک کراہیت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بلند اور منزہ ہے کہ وہ ایسی جگہوں میں کیا جائے جن میں اس کے ذکر سے اعراض برتا گیا ہے جیسے کہ حمام میں قرآن کریم کی قرأت کا مکروہ ہونا، یا پھر کراما کاتبین پر اس بناء پر رحم کھانا ہے کہ وہ انہیں قاذورات اور نجاست کی جگہ پر اتارے تاکہ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لکھیں۔ واللہ اعلم۔

اور قِيَامًا وَّقُعُوْدًا ترکیب کلام میں حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔ وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ یہ بھی حال کے محل میں ہے۔ یعنی کہ وہ مضطجعین ہیں۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: دعانا لجنبه او قاعدا او قائما اس میں ترتیب پہلی آیت کے برعکس ہے، یعنی دعانا مضطجعا علی جنبه (اس نے ہم سے دعا کی اس حال میں کہ وہ اپنے پہلو کے بل لیٹے ہوئے تھا۔)

مفسرین کی ایک جماعت جن میں سے حسن وغیرہ ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ آخر تک اس میں ذکر سے مراد نماز ہے، یعنی وہ نماز ضائع نہیں کرتے، پس وہ عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا اپنے پہلوؤں کے بل لیٹ کر نماز پڑھتے ہیں (1)۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (النساء: 103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے))

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس کا بیان آ رہا ہے اور جب آیت نماز کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے کھڑے ہو کر، اور اگر وہ استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھتا ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین سے ثابت ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے بواسیر تھی تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اور اگر تو اس کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر تو اس کی استطاعت بھی نہ رکھے تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر (نماز پڑھ لے)۔" (2) اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے ایک سال پہلے نفل نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (3)۔ ابو عبدالرحمن نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو سوائے ابو داؤد حفری کے اور وہ ثقہ راوی ہے اور میں اس حدیث کو خطا گمان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے مریض اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے۔ پس ابن عبدالحکم نے مالک سے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے قیام میں چار زانو بیٹھ سکتا ہے۔ البویطی نے امام شافعی سے بھی بیان کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصلاۃ، جلد 1، صفحہ 87۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، ... 245 [illegible] ٭ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم، جلد 8، صفحہ 42

ہے۔ اور جب وہ سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ جس قدر طاقت رکھتا ہو وہ سجدہ کرنے کی تیاری اور کوشش کرے۔ فرمایا: اسی طرح نفل پڑھنے والے کا حکم بھی ہے۔ اور یہی حضرت ثوری کا قول بھی ہے، اور اسی طرح ثابت ہے امام احمد، اسحاق، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے مزنی کی روایت میں کہا ہے: وہ اپنی ساری نماز میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے روایت کیا گیا ہے، پہلا قول مشہور ہے اور یہی مدونہ کا ظاہر ہے۔1 اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام زفر رحمہما اللہ نے کہا ہے: وہ تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے گا، اسی طرح وہ رکوع اور سجود بھی کرے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فرمایا: اگر وہ بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھے تو وہ اپنے پہلو کے بل یا اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے یہ اسے اختیار ہے، یہی مدونہ کا مذہب ہے اور ابن حبیب نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر (اور اگر اس پر قادر نہ ہو) تو پھر اپنے بائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور ابن المواز کی کتاب میں اس کے برعکس ہے۔ (یعنی) وہ اپنے دائیں پہلو پر نماز پڑھے ورنہ اپنے بائیں پہلو پر نماز پڑھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور سحنون نے کہا ہے: وہ دائیں پہلو پر نماز پڑھے گا جس طرح اسے اپنی لحد میں رکھا جائے گا، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنی پیٹھ پر لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر بائیں پہلو پر نماز پڑھے گا۔2 اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ نے کہا ہے: جب وہ چت لیٹ کر نماز پڑھے تو اس کے دونوں پاؤں قبلہ سمت ہوں گے اور امام شافعی اور ثوری رحمہما اللہ نے کہا ہے: وہ اپنے پہلو پر نماز پڑھے گا اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر وہ مرض کم ہونے کی وجہ سے قوی اور طاقتور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نماز میں ہو تو اس کے بارے ابن القاسم نے کہا ہے: وہ اپنی باقی نماز میں کھڑا ہو جائے گا اور وہ پہلی نماز پر ہی بنا کرے گا، یہی قول امام شافعی، مزنی اور طبری رحمہم اللہ کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے صاحبین یعقوب اور امام محمد رحمہم اللہ نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے ایک رکعت لیٹ کر نماز پڑھی پھر وہ تندرست ہو گیا تو وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے گا۔ اور اگر وہ بیٹھ کر رکوع و سجود کر رہا ہے پھر وہ تندرست ہو جائے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ اسی پر بنا کرے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ بنا نہ کرے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمہم اللہ نے کہا ہے: جب کسی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر وہ بیماری کی حد تک پہنچ گیا تو اسے بیٹھ کر مکمل کرنی چاہیے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مریض کے بارے میں کہا ہے جو رکوع اور سجود کی استطاعت نہ رکھتا ہو حالانکہ وہ کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اور رکوع کے لئے اشارہ کرے گا اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹھ جائے اور سجود کے لئے اشارہ کرے۔ اور یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور امام شافعی کے قول کا قیاس ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور جہاں تک تندرست لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز کا تعلق ہے تو عمران بن حصین کی حدیث سے یہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً

اور خالق میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی قدرت اور عظمت (کو پہنچانے) کی قدرت نہیں رکھتے۔) بلاشبہ تفکر مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور ذہن کو اس میں گھمانا ہے جیسے کہ فرمایا: وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے مقام کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، پھر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور جب ستاروں کو دیکھا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی، اور انتہائی حزن و غم اور فکر کی وجہ سے پیشاب میں خون بہنے لگا۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اثنا میں کہ آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہو اور وہ ستاروں اور آسمان کی طرف دیکھے اور پھر یہ کہے اشهد ان لك ربا و خالقا اللهم اغفرلي فنظر الله اليه فغفر له (1) (میں شہادت دیتا ہوں کہ تیرا رب اور خالق ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما) پس اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرماتا ہے اور اسے بخش دیتا ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا عبادة كتفكر (2) (فکر کرنے کی طرح کوئی عبادت نہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تفكر ساعة خير من عبادة سنة (3) (ایک ساعت کی غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے)

اور ابن القاسم نے حضرت امام مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا: ان کا اکثر عمل غور و فکر میں مشغول رہنا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا: کیا آپ تفکر کو اعمال میں سے ایک عمل گمان کرتے ہیں؟! انہوں نے فرمایا: ہاں، یہ تو یقینی ہے۔ حضرت ابن مسیب سے ظہر اور عصر کے درمیان نماز کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: یہ عبادت نہیں ہے، بلاشبہ عبادت اس عمل سے بچنا اور دور رہنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اور تفکر (غور و فکر کرنا) اللہ تعالیٰ کے امر میں داخل ہے۔

اور حسن نے بیان کیا ہے: ایک ساعت کی غور و فکر رات بھر قیام کرنے سے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم نے بھی کہا ہے (4)۔

اور حسن نے کہا ہے: فکر کرنا مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی نیکیوں اور اپنی برائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان میں سے جن میں وہ غور و فکر کرتا ہے آخرت کے خوف ہیں مثلاً حشر و نشر، جنت اور اس کی نعمتیں، اور جہنم اور اس کا عذاب اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن اٹھایا تاکہ آپ رات کی نماز کے لئے وضو کریں اور ان کے پاس ایک مہمان بھی تھا تو اس نے آپ کو دیکھا کہ جب اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے کھڑے رہے یہاں تک فجر طلوع ہو گئی تو اس نے ان سے کہا: اے ابا سلیمان یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب میں نے اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور و فکر کرنے لگا إِذِ الْأَغْلٰلُ فِيْٓ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ (المومن) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا) تو میں اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگا میں طوق سے کیسے ملوں گا اگر قیامت کے دن میری گردن میں ڈال دیا گیا، میں یہی سوچتا رہا یہاں تک

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 454
2۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 221، دار المسیرہ بیروت
3۔ الاسرار المرفوعة، الاخبار الموضوعة، صفحہ 175، حدیث نمبر 114
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیة

ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (التحریم: 8) (اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے مردود ہے کیونکہ اس پر دلائل قائم ہیں کہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اس سے ایمان کا اسم زائل نہ ہوگا۔ (یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن باقی رہتا ہے۔) جیسا کہ اس کے بارے پہلے گزر چکا ہے اور جیسا کہ آگے آئے گا۔ تو قول باری تعالیٰ: مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ سے مراد وہ ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا (1)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تُدْخِلِ، تُخَلِّدْ کا مقلوب ہے (2)۔ اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح اہل حرورا نے کہا۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے جنہیں آگ سے نہیں نکالا جائے گا (3)۔ اسی لئے یہ فرمایا ہے: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ یعنی کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اور اہل معانی نے کہا ہے: الخزی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ حیاء کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خَزَايَةً جب وہ شرم اور حیا محسوس کرے، فهو خزيان (شرمندہ ہونے والا)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

خَزَايَةً أَدْرَكَتْهُ بَعْدَ جَوْلَتِهِ   مِنْ جَانِبِ الْحَبْلِ مَخْلُوطًا بِهَا الْغَضَبُ

اس میں خزایۃ شرم و حیاء کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

پس اس دن خزی المومنین سے مراد تمام اہل ادیان کے سامنے ان کا خوف اور شرم و حیاء محسوس کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے باہر نکل آئیں۔ اور خزی الکافرین سے مراد اللہ تعالیٰ کا انہیں بغیر موت کے جہنم میں ہلاک اور برباد کرنا ہے اور مومنین مر جائیں گے تو اس طرح دونوں فریق جدا جدا ہو گئے۔ صحیح سنت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح ثابت ہے جسے مسلم نے روایت کیا ہے، یہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اس میں منادی سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے (4)۔ اور حضرت قتادہ اور محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن ہے۔ کیونکہ ان تمام نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا (5)۔ اس قول کی دلیل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے جنوں کے بارے میں خبر دی ہے جب انہوں نے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ (الجن: 1-2) (کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو رہنمائی کرتا ہے ہدایت کی) اور پہلے قول والوں نے جواب دیا اور کہا: جنہوں نے قرآن کریم سنا گویا انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور یہ معنوی طور پر صحیح ہے۔

اور اَنْ اٰمِنُوْا میں اَنْ حرف جر حذف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی یہ اصل میں بِاَنْ اٰمِنُوْا ہے۔ اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی سمعنا منادیا للایمان ینادی، یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی الی ہے۔ یعنی

1۔ محرر وجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ 2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 418 3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 287
4۔ محرر وجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ 5۔ ایضاً

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے تو وہ بطور رحمت کے اس کے لئے اسے پورا کرے گا اور جس کے لئے کسی عمل پر سزا کا وعدہ کیا ہے تو اس میں اس کو اختیار اور مرضی ہے“۔(1) عرب وعدہ خلافی پر مذمت کرتے ہیں اور وعید خلافی میں مدح اور تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے کہا ہے:

ولا یرهب ابن العم ما عشت صولتی　　　ولا اختتی من خشیة المتهدد

ابن العم کو کوئی خوف نہ ہوگا جب تک میں رعب و سطوت کے ساتھ زندہ رہا اور میں کسی ڈرانے والے کے خوف سے نہیں چھپتا۔

وانی متی اوعدته او وعدته　　　لمخلف ایعادی و منجز موعدی

اور میں نے جب اسے دھمکایا یا اس سے وعدہ کیا تو وہ میری وعید کے خلاف کرتا ہے اور وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول کرلیا۔

حسن نے کہا ہے: وہ مسلسل کہتے رہے ربنا، ربنا (اے ہمارے رب، اے ہمارے رب) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: جسے کوئی امر درپیش ہو (یا کوئی غم لاحق ہو) تو وہ پانچ مرتبہ کہے ربنا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے نجات عطا فرما دے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے اور وہ چیز اسے عطا فرما دے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے۔ آپ سے عرض کی گئی: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: اَنِّیْ یہ اصل میں بانی تھا۔ اور عیسیٰ بن عمر نے اِنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نے کہا۔(2) امام حاکم ابو عبد اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ام سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بارے میں کسی شے کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى الآیہ (3) اور اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اور مِنْ تاکید کے لئے داخل ہے، کیونکہ اس سے پہلے حرف نفی ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ تفسیر کے لئے ہے اور اس کا عطف

1۔ مسند ابو یعلیٰ، مسند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 180، حدیث نمبر 3303

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

3۔ مستدرک حاکم، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 328، حدیث نمبر 3174۔ ایضاً جامع ترمذی، باب من سورۃ النساء، حدیث 2949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں ہے، کیونکہ یہاں نفی کے لئے داخل ہے جو اس کے بغیر کلام ادا نہیں کر سکتی اور اسے حذف کیا جا سکتا جب یہ نفی کی تاکید کے لئے ہو۔ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ یہ مبتدا خبر ہے۔ یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میں سے بعض، بعض کی جز ہیں ثواب میں، احکام میں، اور مدد و نصرت اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: تمہارے مرد طاعت میں تمہاری عورتوں کی مثل ہیں، اور تمہاری عورتیں طاعت (وعبادت) میں تمہارے مردوں کے مشابہ ہیں، اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔) اور کہا جاتا ہے: فلان منی، یعنی فلاں میرے مذہب اور میرے اخلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی جنہوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے۔ وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ اور وہ اللہ عزوجل کی طاعت وعبادت کے سبب اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ وَقٰتَلُوْا اور انہوں نے میرے دشمنوں کے خلاف جنگ کی۔ وَقُتِلُوْا اور میری راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ابن کثیر اور ابن عامر نے پڑھا ہے وقاتلوا وقتّلوا (1) کثرت کی بنا پر۔ اور اعمش نے قرأت کی ہے وقتلوا وقاتلوا کیونکہ واؤ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں تقدیر ہے یعنی وقتلوا وقد قاتلوا۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تصابي و أمسى علاه الكبر

یہ اصل میں وقد علاہ الکبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وقد قتل من بقی منہم (جو ان سے باقی بچا اس نے قتال کیا۔) عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم، ہم نے بنی تمیم کو قتل کیا، اور یا شہران میں سے بعض قتل کئے گئے اور امرؤ القیس نے کہا ہے: فإن تقتلونا نقتلکم (پس اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے)

اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے وقتلوا وقتلوا بغیر الف کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ یعنی میں آخرت میں ان پر ان کے گناہوں کو چھپا دوں گا، پس میں انہیں ان کے سبب زجر وتوبیخ نہ کروں گا اور نہ ان پر انہیں کوئی سزا دوں گا۔ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ "میں انہیں ضرور داخل کروں گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی" کا معنی یہ ہے میں انہیں ضرور ضرور ثواب عطا کروں گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ قطعاً منصوب ہے اور فراء نے کہا ہے: یہ بطور تفسیر منصوب ہے۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ یعنی یہ اچھی جزا ہے اللہ تعالیٰ کے پاس اور اس سے مراد وہ (اجر و ثواب) ہے جو عامل کی طرف اس کے عمل کی جزا کے طور پر لوٹے گا، اور یہ ثاب یثوب سے ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب تمام کو ہے، اور وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے کہا: یہ کفار ہیں ان کے لئے سامان تجارت بھی ہے اور اموال بھی، اور ان کا ملکوں میں گھومنا پھرنا بھی ہے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم بھوک سے ہلاک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 558

ہو گئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہیں ان کا علاقوں کے ساتھ اپنے سفروں میں گھومنا پھرنا دھوکہ میں نہ ڈالے۔ مَتَاعٌ قَلِيلٌ یعنی ان کا یہ گھومنا پھرنا تھوڑی مدت کے لئے ہے۔ اور یعقوب نے نون ساکن کے ساتھ یغرنک پڑھا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لا یغرنک عشاء ساکن　　قد یوافی بالمنیات السحر

اس میں بھی لا یغرنک نون ساکن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ﴿۴﴾ (المومن) (پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا آزادی سے گھومنا پھرنا (آنا جانا مختلف شہروں میں) اور متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے جلدی نفع حاصل کیا جا سکتا ہو، اور اس کا نام قلیل اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ (سامان دنیا) فنا ہونے والا ہے اور ہر فنا ہونے والی شے اگرچہ کثیر ہو قلیل ہوتی ہے۔ اور صحیح ترمذی میں مستورد فہری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "آخرت میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے پھر وہ اس (پانی) کی طرف دیکھے جو وہ اس کے ساتھ لاتا ہے" (یعنی اس انگلی کے ساتھ لگنے والے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے) کہا گیا ہے: کہ اس حدیث میں اشارہ یا دونوں کے ساتھ ہے۔ (حدیث طیبہ کے الفاظ یہ ہیں)

ما الدنیا فی الآخرۃ الا مثل ما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم، فلینظر بم یرجع (1)

وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی وہ بہت برا ٹھکانا جو انہوں نے اپنے کفر کے سبب اپنے لئے بنایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جہنم میں سے بچھونا بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اس آیت میں اور اس طرح کی دیگر آیات میں مثلاً قول باری تعالیٰ: اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَ (آل عمران: 178) (کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے) وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ (القلم) (اور میں نے (مہلت) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری (خفیہ) تدبیر بڑی پختہ ہے۔) اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ (المومنون) (کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال اور اولاد سے) سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ (الاعراف) (تو ہم آہستہ آہستہ تباہی کی طرف لے جائیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) اس پر دلیل موجود ہے کہ کفار پر دنیا میں کوئی انعام نہیں کیا گیا، کیونکہ حقیقی نعمت وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے ضرر کی آمیزش سے پاک ہو، اور کفار کی نعمتیں ان میں موجود ہیں وہ عذاب و سزا کی آمیزش سے ہیں پس یہ اس آدمی کی طرح ہیں جس کے سامنے کسی کی طرف سے شہد کا حلوہ رکھا جائے جس میں زہر کی آمیزش ہو پس اگرچہ کھانے والا لطف اندوز ہوا لیکن اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر انعام کیا گیا، کیونکہ اس میں اس کی جان کی ہلاکت ہے۔ علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہی شیخ ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور ان میں سے ایک جماعت سیف السنۃ ولسان الامۃ القاضی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو بکر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: نعمت کا اصل نَعمۃ (فتح النون) سے ہے، اور اس کا معنی ہے خوشحال زندگی، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (الدخان) (اور بہت سے ساز و سامان جس سے وہ عیش کیا کرتے تھے) کہا جاتا ہے: دقیق ناعم، جب آٹا بہت باریک پیسا ہوا ہو اور اچھی طرح پیسے سے گوندھا جا سکتا ہو۔ یعنی معنی صحیح ہو، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور تمام مکلفین پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور فرمایا ہے: فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ (الاعراف: 69) (پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو) یعنی شکر ادا کرنے کے لئے۔ اور فرمایا: واشکروا للہ (اور تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو) اور شکر صرف نعمت پر ہی ہوتا ہے۔

اور فرمایا: وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ (القصص: 77) (اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جیسے احسان اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے) یہ خطاب قارون کو ہے۔ اور ارشاد فرمایا: وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً (النحل: 112) (اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی۔) پس اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اس نے انہیں دنیوی نعمتیں عطا فرمائیں تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور مزید فرمایا: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (النحل: 83) (وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا) اور مزید فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (فاطر: 3) (اے لوگو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی۔) یہ (حکم) کفار اور دوسروں کے لئے عام ہے۔ لیکن جب کوئی کسی دوسرے کو کھانا پیش کرے جس میں زہر کی آمیزش ہو تو فی الحال اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، کیونکہ اس نے اسے خالص زہر نہیں پلایا، بلکہ اس نے اسے حلاوۃ (مٹھاس) میں چھپا دیا، لہٰذا یہ بعید نہیں کہ یہ کہا جائے: تحقیق اس نے اس پر انعام کیا، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر نعمت کی دو قسمیں ہیں: نفع پہنچانے والی نعمتیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں، پس نفع بخش نعمتیں وہ ہیں جو فنون لذات میں سے ان تک پہنچیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں وہ ہیں جو ان سے طرح طرح کی آفات کو پھیر دیں تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کو دفاع کی نعمتیں عطا فرمائیں یہ ایک قول ہے، اور وہ یہ کہ ان سے درد و آلام اور بیماریوں کو دور ہٹا دیا گیا، اور ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو نعمت دینیہ عطا نہیں فرمائی۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ یہ استدراک ہے اس کلام کے بعد جس میں نفی کا معنی پہلے گزر چکا ہے کیونکہ سابقہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے شہروں میں چکر کاٹنے اور گھومنے پھرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے، لیکن متقی لوگوں کے لئے بہت بڑا نفع ہے اور ہمیشہ کی بقا ہے۔ پس لٰكِنِ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور یزید بن قعقاع نے لٰکنّ کی نون کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک مصدر مؤکد ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور کسائی کے نزدیک یہ مصدر ہوگا۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ مفسر ہے۔ اور حسن اور نخعی نے نُزْلًا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ دونوں سے ثقیل ہوتے ہیں اور باقیوں نے اسے ثقیل قرار دیا ہے۔ اور النُّزُلُ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ نزیل کا معنی

مہمان ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

نزیل القوم اعظمھم حقوقا و حق اللہ فی حق النزیل

قوم کا مہمان حقوق کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ کر ہے اور مہمان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

اس کی جمع انزال ہے اور حسنہ نزیل کا معنی: کثیر اور اجتماع ہے اور النزل کا معنی بھی کثرت اور زیادتی ہے کہا جاتا ہے: طعام کثیر النزل و النزل۔ (وافر مقدار کھانا)

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید النزل ۔ ۔ واللہ اعلم وہی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے اس عالم کے قصہ میں آیا ہے جس نے حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اس دن لوگ کہاں ہوں گے جس دن زمین کو غیر ارض سے اور آسمانوں کو بدل دیا جائے گا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ پل کے قریب اندھیرے میں ہوں گے۔" تو اس نے پوچھا: لوگوں میں سے پہلے کس کو اجازت ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "مہاجرین فقراء کو" یہودی نے کہا: "ان کا کیا تحفہ ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟" آپ نے فرمایا: "مچھلی کے جگر کی کثیر مقدار"۔ پھر پوچھا: اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو اس کی اطراف سے کھاتا رہتا ہے۔" پھر عرض کی: اس پر ان کا مشروب کیا ہوگا؟ فرمایا: "جنت کے ایک چشمہ سے (وہ سیراب ہوں گے) جس کا نام سلسبیل ہے (1)" اور آگے حدیث ذکر کی۔ اہل لغت نے کہا ہے: التحفۃ سے مراد وہ شے ہے جسے پھلوں وغیرہ میں سے انسان بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہے اور طرف سے مراد اس کے محاسن اور لطف اندوز ہونے کی چیزیں ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مطابق ہے جو ہم نے نزل کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اور زیادۃ الکبد سے مراد جگر کا ٹکڑا ہے جو انگلی کی طرح ہو۔ ہروی نے کہا ہے: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی رزق ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝ اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس نیکوکاروں کے لئے ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ کفار دنیا میں لوٹ پوٹ (اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں)۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ۔ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن رحمہم اللہ نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ فوت ہوا اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے اس کی موت کی خبر رسول اللہ ﷺ کو دی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو ارشاد فرمایا: قوموا فصلوا علی اخیکم النجاشی (اٹھو اور اپنے بھائی نجاشی کی نماز جنازہ ادا کرو) تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: آپ ﷺ ہمیں حکم ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم حبشہ کے کافروں میں سے ایک بڑے کافر پر نماز جنازہ پڑھیں (2) تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 600

نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "ایک دن اور ایک رات سرحد پر ثابت قدم رہنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کر رہا تھا اور اس کا رزق بھی اسے عطا کیا جائے گا اور شیاطین سے محفوظ رکھا جائے گا(1)۔"

ابو داؤد نے نقل کی حسن کی حضرت فضالہ بن عبید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے سوائے سرحد پر ثابت قدم رہنے والے کے کیونکہ اس کا عمل یوم قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون (محفوظ) رہے گا(2)"۔ ان دونوں حدیثوں میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رباط افضل ترین اعمال میں سے ہے جن کا ثواب موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت علاء بن عبدالرحمن کی حدیث میں ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له(3) (جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (اور) سوائے صدقہ جاریہ کے یا اس علم کے جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا نیک اور صالح بچے کے جو اس کے لئے دعا کرتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اور اسے روایت کرنے میں مسلم منفرد ہیں۔ پس بلاشبہ صدقہ جاریہ، نفع دینے والا علم اور وہ صالح بیٹا جو اپنے والدین کیلئے دعا کرتا ہے یہ (اعمال) صدقات کے ختم ہو جانے، علم کے ضائع ہو جانے اور بیٹے کی موت کے سبب منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور رباط کا اجر یوم قیامت تک بڑھتا رہتا ہے کیونکہ نمو کا معنی سوائے زیادتی کے اور کوئی نہیں ہے اور یہ کسی سبب پر موقوف نہیں کہ اس کے منقطع ہونے کے سبب یہ بھی منقطع ہو جائے، بلکہ یہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دائمی فضل ہے۔ اور یہ اس لئے ہے کیونکہ تمام اعمال پر قدرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دشمن سے امن و سلامتی حاصل ہو اور دین کی حفاظت اور شعائر اسلام کو قائم کرنے کے سبب دشمن سے تحفظ اور بچاؤ حاصل ہو اور یہ وہ عمل ہے جس پر ثواب جاری رہتا ہے (اور) یہ ان اعمال صالحہ میں سے ہے جو جاری رہتا ہے۔ ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من مات مرابطا في سبيل الله اجرى عليه اجر عمله الصالح الذي كان يعمل واجرى عليه رزقه وامن من الفتان وبعثه الله يوم القيامة آمنا من الفزع(4) (جو آدمی اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو گیا تو اس پر اس عمل صالح کا اجر جاری رہتا ہے جو وہ کرتا تھا اور اس پر اس کا رزق بھی جاری رکھا جاتا ہے اور اسے شیاطین سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اٹھائے گا اس حال میں کہ وہ گھبراہٹ سے پر امن اور محفوظ ہوگا۔) اس حدیث میں ایک دوسری قید ہے اور وہ ہے حالت رباط میں موت کا آنا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 142
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، جلد 2، صفحہ 41
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 203

تمہیں بشارت ہو یہ تمہارا رب ہے اس نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ملائکہ پر اظہار فخر کر رہا ہے وہ کہہ رہا ہے اے میرے ملائکہ! تم میرے ان بندوں کی طرف دیکھو یہ ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں (1)۔" اور اسے حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے اور انہوں نے مطرف بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نوف اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں اکٹھے ہوئے تو نوف نے تورات سے (یہ) بیان کیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث بیان کی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تمہیں بغیر تقویٰ کے جہاد کے بارے حکم نہیں دیا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم فلاح و کامرانی کے امیدوار ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے: کہ لعل بمعنی کی (تاکہ) ہے اور فلاح بمعنی بقاء (باقی رہنا) ہے۔ یہ سب سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور رب کے فضل و احسان سے آج مورخہ 22 جنوری 2007ء بمطابق 2 محرم الحرام 1428ھ بروز پیر دس بجے شب سورۂ آل عمران کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ بندۂ حقیر اپنے کریم رب کی بارگاہ میں سراپا التجا ہے کہ میرے کریم پروردگار! اس مرحم اور عنایت کو بار بار فرما، اپنی توفیقات سے نوازتے رہنا اور تادم واپسیں اپنی بندگی کا ذوق، اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف اور اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے رکھنا۔ آمین بجاہ نبیک الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ثم الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

محمد انور مگھالوی

1۔ جامع البیان، الطبقات ... جلد 6، صفحہ 54، مطبعہ البابی مصر